پاکستان کے سیاسی اتحادوں میں

مولانا شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ کا کردار

"قومی اتحاد" سے "متحدہ مجلسِ عمل" تک



تحقیق: مظہر حسین

پیش کش:
ملک محبوب الرسول قادری



علامہ شاہ احمد نورانی ریسرچ سنٹر پاکستان





بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین
الرحمن الرحیم مالک یوم
الدین ایاک نعبد و ایاک
نستعین اھدنا الصراط
المستقیم صراط الذین
انعمت علیھم غیر المغضوب
علیھم و لا الضالین

برائے ایصال ثواب

شیخ الاسلام قائد اہل سنت
مولانا شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ تعالیٰ

غازیٔ اسلام جانثارِ پاکستان
ملک عبدالرسول قادری رحمہ اللہ تعالیٰ

پاکستان کے سیاسی اتحادوں میں
مولانا شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ کا کردار

قومی اتحاد سے متحدہ مجلسِ عمل تک

تحقیق

مظہر حسین

پیش کش

ملک محبوب الرسول قادری

سہ ماہی انوارِ رضا جوہر آباد

علامہ شاہ احمد نورانی ریسرچ سنٹر پاکستان
0321/0300-9429027 mahboobqadri787@gmail.com

شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

دینی، سماجی، اخلاقی اور ملی اقدار کا محافظ — جوہرآباد

سہ ماہی
انوارِ رضا
ملک محبوب الرسول قادری

جلد نمبر 3 شمارہ نمبر 4

ایڈیٹر: ملک محمد قمر الاسلام قمر

چیف ایڈیٹر: مفتی آصف محمود قادری

معاون ایڈیٹر: علامہ محمد شاہد جمیل اویسی

اشاعت خاص: سید غفران اشرف گیلانی، سید ظہیر عباس کھرل قادری

قیمت فی شمارہ
400 روپے

سالانہ رکنیت فیس
1000 روپے

انٹرنیشنل غوثیہ فورم انوار رضا لائبریری بلاک نمبر ۴ جوہرآباد ضلع خوشاب 0300/0321-9429027 Ph: 0454-721787

حسنِ ترتیب

اپنی بات

امام نورانیؒ کا مشن جاری رکھا جائے گا

وقت بڑی تیزی سے بیت رہا ہے اس معاشرے کے ہر ذی شعور کے لیے یہاں کام بہت زیادہ اور وقت بہت کم ہے اس لیے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر جو کچھ بن پڑے کر گزرنا چاہیے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا شاہ احمد نورانی قدس سرہ نے ہمیں ہمیشہ یہی درس دیا اور خود بھی اسی عمل پر سختی سے کاربند رہے حتیٰ کہ انہوں نے اسی حسین راہ میں جدوجہد کے دوران ہی اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کردی۔

اظہار محبت کے بہت سارے طریقے ہیں مگر دینی و محب وطن طبقات کے لیے سب سے زیادہ موثر دیرپا اور مستحسن طریق یہ ہے کہ مشن کو قبلہ بنا کر سفر جاری رکھا جائے تا کہ قافلہ وکاروان، سوئے منزل رواں دواں رہے یعنی

میری محفل میں آ میرا مزار نہ پوچھ

قائد اہل سنت رحمہ اللہ تعالیٰ کی جدائی کی کسک ہنوز موجود ہے اور انکے اٹھ جانے سے پیدا ہوجانے والا خلا ابھی تک پر نہیں ہوسکا۔ جو سخت پریشانی کا باعث ہے کسی نے کہا تھا

بجھا چراغ، اٹھی بزم، کھل کے رو اے دل
وہ چل بسے جنہیں عادت تھی مسکرانے کی

مگر حضرت قائد اہل سنت رحمہ اللہ تعالیٰ کو ہم سے جدا ہوئے چھ برس بیت گئے مگر ان کی شفقتوں، محبتوں اور عقیدتوں کے چراغ آج بھی اسی طرح روشن ہیں۔

علامہ شاہ احمد نورانی ریسرچ سنٹر پاکستان، ۲۰۰۴ء کے آغاز سے اب تک ایک ایسے نقطے پر اپنی کامل توجہ مرتکز کئے ہوئے ہے جس کا ثمر جاگتی آنکھوں نظر آرہا ہے۔ حضرت قائد اہلسنّت کے خطبات کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں اور تین تشنۂ اشاعت ہیں۔ 'انوار رضا'

نے دو مختلف ضخیم و تاریخی نمبر شائع کر دیئے اور اب تیسرا آپ کے ہاتھوں میں ہے اس کے علاوہ تقریباً نصف درجن چھوٹے کتابچے صرف حضرت قائد اہلسنّت رحمہ اللہ تعالیٰ کی جدوجہد کے حوالے سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ۲۰۰۴ء سے اب تک ہر سال......نورانی ڈائری...... بڑی باقاعدگی سے شائع کی جاتی ہے جبکہ گزشتہ سال (۱۴۲۹ھ) میں ہجری تقویم کی فوقیت کے ساتھ......اسلامک نورانی ڈائری......بھی شائع کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ الحمدللہ مزید سفر جاری ہے۔ یہ سفر انشاء اللہ جاری رہے گا اور باذوق حضرات جلد ہی بہت ساری خوشخبری پائیں گے۔ ہماری اپنے پیارے پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ جہاں کہیں علمی، تاریخی یا فنی حوالے سے کوئی سقم دیکھیں تو ہمیں اس سے ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کی جاسکے۔ اللہ کریم حضرت قائد اہلسنّت رحمہ اللہ تعالیٰ کے درجات کو بلند سے بلندتر فرما کر ہمیں پاکستان میں انقلابِ نظام مصطفیٰ کے لیے جدوجہد کی توفیق بخشے۔ یادرکھئے! حضرت کا محبّ صادق وہی ہے جو ان کے مشن کا نمائندہ اور سفیر بن کر جدوجہد جاری رکھے۔

والسلام

غبارِ راہِ حجاز
محمد محبوب الرسول قادری
چیف ایڈیٹر: سہ ماہی 'انوارِ رضا' جوہرآباد
انوار رضا لائبریری 198/4 جوہرآباد (41200)
پاکستان

برائے رابطہ
0321/0300-9429027
042-37214940
mahboobqadri787@gmail.com

فلیپ

اسلامیانِ پاکستان کا متفقہ قائد[1]

برصغیر پاک و ہند کے علماء میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو سیاست کے میدان میں آیا ہو اور اسکا دامن داغدار ہونے سے بچ گیا ہو البتہ مولانا شاہ احمد نورانی ایک استثناء ہیں وہ چار دہائیوں تک پاکستان کے سیاسی میدان میں سرگرم رہے لیکن سیاست کا کوئی دھبہ، کوئی ڈیل، کوئی وزارت یا رشوت انکے کردار کی سفید چادر کو میلا نہ کرسکی۔ کوئی واقعہ، حادثہ یا اہم قدم کا معاملہ درپیش آتا تو انکے مخالف بھی انتظار کرتے کہ مولانا نورانی کیا کہتے ہیں کیا کرتے ہیں؟ انکی دانش کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ سالوں سے محاذ آراء دیوبندی، بریلوی، شیعہ اور جماعت اسلامی مکاتیب فکر نے انہیں متفقہ طور پر اپنا سربراہ بنایا اور آپس کے نزاعی فیصلوں میں انہیں جج مان کر انکی باتوں اور فیصلوں پر عمل کرتے رہے۔

پاکستان میں بدقسمتی سے سیاست اور ریاکاری کو ہم معنی اور ہم پلہ قرار دیا جانے لگا ہے جبکہ مولانا شاہ احمد نورانی کے لیے سیاست، عبادت کا درجہ رکھتی تھی انہوں نے ہمیشہ سچ کا دامن پکڑے رکھا ان سے اگر کوئی ایسی چیز پوچھی جاتی جو ان کے خلاف بھی جاتی تھی تو وہ برملا اسکا اعتراف کرلیتے تھے۔ سیاست سے پیسہ کمانا ہمارا قومی شعار بن چکا ہے لیکن مولانا نورانی سالہا سال تک مسجد کے اوپر حجرے میں مقیم رہے خود سودا سلف لاتے رہے۔ وہ جرأت اور بہادری کا پیکر تھے وہ سچے مومن کی طرح مصلحت سے کام نہیں لیتے تھے کیا کوئی سیاست دان تصور کرسکتا ہے کہ وہ ایم کیو ایم کے گڑھ، کراچی میں رہے اور ہر روز ان کی سیاست سے برملا اختلاف کرے۔ مولانا نورانی نے یہ کرکے دکھایا۔

---

[1] یہ فلیپ پاکستان کے نامور اور سینئر صحافی جناب سہیل وڑائچ نے بڑی محبت اور نہایت عجلت میں ہمارے اصرار پر لکھا ہے جس پر ہم اُن کے شکرگزار ہیں۔ یہی سہیل وڑائچ الیکٹرانک میڈیا میں "ایک دن جیو کے ساتھ" اپنا مقبول پروگرام کرتے ہیں۔ (ادارہ)

مولانا شاہ احمد نورانی کو یہ کریڈٹ بھی جاتا ہے کہ وہ ملکی وغیر ملکی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے چکر میں کبھی نہیں آئے ورنہ یہاں کے بڑے بڑے جبہ و دستار والے نام نہاد جہاد کے چکر میں ڈالر لیتے رہے آج جب نقاد گذرے ہوئے لمحوں پر نظر ڈالتے ہیں تو مولانا نورانی کی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ انہوں نے زبردست دباؤ، ترغیب وتحریص کے ہتھکنڈوں کے باوجود جہاد افغانستان اور کشمیر میں یہاں کے نوجوانوں کو بھیجنے کی ہمیشہ مخالفت کی اور آج وہ، جو سب کچھ کرتے رہے تھے انہیں کوئی راستہ نظر نہیں آرہا کہ وہ ماضی کے ان ''کارناموں'' سے چھٹکارا کیسے پائیں۔

مولانا نورانی کی سیاست اور خوبیاں تو بہت ہیں لیکن ان کی ایک کمی جسکا وہ خود بھی اعتراف کرتے تھے یہ تھی کہ وہ اپنی وفات کے بعد کوئی مضبوط پارٹی یا ادارہ چھوڑ کر نہیں گئے۔ لیکن وہ اپنے کردار سے، عمل سے، لوگوں کے لیے ایسی مثال ضرور چھوڑ کر گئے ہیں جس پر عمل کر کے سیاستدان ملک کو آگے لیجا سکتے ہیں۔

زیر نظر مقالہ ''پاکستان کے سیاسی اتحادوں میں مولانا شاہ احمد نورانی کا کردار...... 1977ء......2003ء'' ایک انتہائی خوبصورت کاوش ہے مقالہ نگار مظہر حسین نے بڑی کاوش سے ایم فل کے لیے یہ تحقیق مکمل کی ہے۔ سہ ماہی ''انوار رضا'' جوہر آباد کے چیف ایڈیٹر ملک محبوب الرسول قادری میرے ہم وطن ہیں ہم دونوں جوہر آباد کی فضاؤں میں پلے بڑھے یہ میرے سے عمر میں چھوٹے ہیں لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ مسلسل محنت نے انہیں مذہبی میدان میں کافی قد آور بنا دیا ہے۔ محبوب الرسول قادری انوار رضا کی اشاعتِ خاص میں یہ مقالہ پورے کا پورا شائع کر رہے ہیں جو کہ روایت سے ہٹ کر بات ہے کیونکہ روایت تو یہی ہے کہ رسالہ جات بہت سارے مضمون نگاروں کو ممنون کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی لیے تحقیقی مقالہ کو شائع کرنا کسی رسالہ کے لیے کافی مشکل کام ہوتا ہے لیکن میرا یقین ہے مولانا شاہ احمد نورانی کے بارے میں یہ مقالہ شائع کرنے سے ''انوار رضا'' کا رتبہ بلند ہوگا اور اسے تحقیقی حلقوں میں بنظر تحسین دیکھا جائے گا۔

سہیل وڑائچ

میزان حروف

کچھ مقالہ اور مقالہ نگار کے بارے میں

......''پاکستان کے سیاسی اتحادوں میں مولانا شاہ احمد نورانی کا کردار'' (قومی اتحاد سے متحدہ مجلس عمل تک)...... ہمارے پیارے دوست عزیز گرامی مظہر حسین کی محنت شاقہ کا خوبصورت ثمر ہے جس کا دورانیہ (۱۹۷۷ء......۲۰۰۳ء) ہے اور یہ مقالہ برادرم مظہر حسین نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے اپنے ایم فل کے تعلیمی سیشن (۲۰۰۳ء......۲۰۰۵ء) میں نامور ماہر تعلیم اور یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ ومطالعہ پاکستان کے ایسوسی ایٹ پروفیسر جناب ڈاکٹر سید شاہد حسن رضوی کی زیر نگرانی کامیابی کے ساتھ مکمل کیا ہے۔ محترم ڈاکٹر سید شاہد حسن رضوی ایک غیر جانبدار محقق اور ایک عظیم استاذ کے حوالے سے ملک بھر میں اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں اور جہالت کے خلاف ان کا علمی جہاد ہماری معاشرتی زندگی میں اپنا ایک مرتبہ و رسوخ رکھتا ہے۔ جہاں تک برادرم مظہر کا تعلق ہے وہ انتہائی نیک نیت، مخلص، محنتی، خلیق اور انصاف پسند و دیانتدار مزاج کے حامل صالح نوجوان ہیں انہوں نے جمعیت علما پاکستان کے سربراہ حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی قدس سرہ کے حوالے سے اپنا تحقیقی مقالہ جس محنت، شوق اور دل جمعی سے مکمل کیا ہے اس پر ان کی سطر سطر گواہی کی سند اور مہر شہادت ثبت کر رہی ہے۔ برادرم مظہر حسین کی خواہش کے احترام اور محبت بھرے اصرار کے پیش نظر ہم نے نہایت ہنگامی حالات میں اسے اپنے سہ ماہی رسالہ 'انوار رضا' جوہر آباد (پاکستان) کے خاص نمبر کے طور پر شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ خوش آئند امر ہے کہ سال رواں کے دوران ہمارے رسالہ کا آخری شمارہ (۱۴ اکتوبر ۲۰۰۹ء) کو امیر خسرو پارک کلفٹن کراچی میں منعقد ہونے والے حضرت مولانا

شاہ احمد نورانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے چھٹے سالانہ عرس کے موقع پر بروقت منصۂ شہود پر آرہا ہے......
اس کو دیکھ کر اہل محبت کی نگاہیں خیرہ ہوں گی اہل ذوق کے دل مسرور ہوں گے اہل علم کے
ذہنوں میں نئی روشنی چمک اٹھے گی اور تمام ارادت مندوں و مریدین کے لیے یہ مقالہ
''ارمغانِ محبت'' اور ''تبرک عرس مبارک'' قرار پائے گا۔

میں دل کی گہرائیوں سے برادرم مظہر حسین کے روشن مستقبل کا خواہش مند ہوں
اوران کی شبانہ روز ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

ملک محبوب الرسول قادری
چیف ایڈیٹر
سہ ماہی 'انوار رضا' جوہر آباد

رفتید و لے نہ از دلِ ما

مادہ ہائے تاریخ وقطعہ تاریخ وصال......امام نورانی

استخراج شدہ.........محمد عبدالقیوم خان طارق سلطان پوری

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی......(سال وصال ۲۰۰۳ء......۱۴۲۴ھ)

............قرآنی مادہ ہائے تاریخ (سال وصال)............

"رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ"
۱۴۲۴ھ

"لَانُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ" (الاعراف)
۱۴۲۴ھ

"اِنَّهُم لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ o وَاِنَّا جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ" (الصٰفٰت)
۲۰۰۳ء

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْم

بمناسبت عرس مبارک (چھٹا)..........۱۴ اکتوبر ۲۰۰۹ء......۱۴ شوال ۱۴۳۰ھ

......ہدیہ اخلاص......منجانب: محمد عبدالقیوم طارق سلطانپوری

............مادہ ہائے تاریخ (سال وصال)............

۱۴۲۴ھ	۲۰۰۳ء
''یمن باغ مصطفیٰ''	''منہاجِ فیضِ حضور''
''تجمل عشق سرکار''	''عظمت وشانِ انجمن محمد''
''کشتۂ عشق مصطفیٰ''	''باغ صداقتِ صدیق''
''مجد غلامی رسول''	''جہانِ فیضِ احمد رضا''
''مداح ذات کریم''	''زیبِ چمنِ فیضِ رضا''
''فیض بارگاہ قادر''	''شانِ مجلس اعلیٰ حضرت''
''بابِ مرکزِ تجلیات حرمین''	''اسلام کا ضیغم''

"زیب وفروغ باب حق" — "قصرِ عظمت دین الحق"
"زیب وفروغ عجم" — "قندیل منارِ عظمتِ حق"
"زیب جاوداں، رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ" — "فروغ مجلس عشق وحق"
"رضی اللہ اکبر عنہ" — "غم خوار حزب الحق"

☆ ☆

......ہدیہ اخلاق ومحبت...... "ذرہ راہِ رسول پاک" (۱۴۳۰ھ)

محمد عبدالقیوم طارق سلطانپوری

"آسمانِ عظمت الاحرار" (۲۰۰۳ء)

مردِ مومن، مردِ حق تھا واقعی — زندگی بھی اک نمونہ، موت بھی
کی نہ پروا اس نے اپنی جان کی — ہر ستمگر کے مقابل وہ جری
عزم و استقلال کی تصویر خوب — عظمت کردار کا نقشِ جلی
ہر محاذ حق پہ تھا وہ پیش پیش — اُس نے حق گوئی میں کوتاہی نہ کی
اُس کی صورت اُس کی سیرت نُور نُور — ایک پیکر، روشنی ہی روشنی
فقر و عرفاں کا وحیدِ روزگار — وہ فریدِ ملکِ علم و آگہی
عظمتِ دینِ محمد ﷺ کے لیے — جہد میں اُس نے گزاری زندگی
مصلحت کیشی سے کوسوں دُور تھا — وہ مجاہد وہ بہادر آدمی
کاروانِ حق کی، ہر بحران میں — رہنمائی اُس نے کی اور خوب کی

لے کے نام "اللہ" کا، تاریخ وصل

۶۶

"سنیوں کا قائداعظم کہی"

۶۶+۱۳۵۸=۱۴۲۴ھ

کلماتِ تشکر

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے بھائی مظہر حسین کو، جنہوں نے سال ہا سال کی مسلسل محنت سے اپنا مقالہ مکمل کیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے شبانہ روز جدوجہد کی، ملک بھر کے طول وعرض کے سفر کیئے ذی علم و ذی شعور شخصیات سے رابطے اور ملاقاتیں کیں، نہ جانے کتنے کتب خانے اور لائبریریاں چھانیں، صحافیوں سے ملے، اخبارات کے ریکارڈ رومز سے استفادہ کیا تب جا کر ان کا یہ مقالہ تکمیل کو پہنچا۔ جب یہ مقالہ زیر ترتیب تھا بھائی مظہر سے ہمارا تعلق وتعارف انہی دنوں میں کراچی میں ہوا پھر انہوں نے پورے تسلسل سے رابطہ استوار رکھا۔ اب الحمدللہ یہ مقالہ نہ صرف یہ کہ مکمل ہو چکا ہے بلکہ منظور بھی ہو چکا ہے اور اس پر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور نے انہیں ایم فل کی ڈگری بھی الاٹ کر دی ہے۔ اور اب یہ 'انوار رضا' کی اشاعت خاص کی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے اس عظیم کام کی تکمیل پر ہم انہیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور دعا گو ہیں کہ اللہ پاک پی ایچ ڈی کی تکمیل کے حوالے سے بھی ان کی مدد ونصرت فرمائے۔

دوسرے ہمارے فکری ونظری رفیق گرامی قدر بھائی محمد طاہر فاروق اور روحانی طبیب علامہ محمد ظہیر عباس قادری خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے تعاون کے ذریعے اس ضخیم مقالہ کی اشاعت کو یقینی بنایا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اگر وہ دست تعاون دراز نہ کرتے تو شاید یہ مقالہ حضرت قائد اہلسنت رحمہ اللہ تعالیٰ کے چھٹے عرس مبارک (۶ اکتوبر ۲۰۰۹ء کے موقع پر منظر عام پر نہ آسکتا۔ اول الذکر کی معاونت اور ثانی الذکر کی پروف ریڈنگ کو ہم نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تیسرے روزنامہ "جنگ" کے سینئر صحافی اور......ایک دن جیو کے ساتھ...... کے میزبان جناب برادر سہیل وڑائچ کا بہت بہت شکریہ کہ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہماری خواہش پر اس مقالہ کا فلیپ لکھا۔

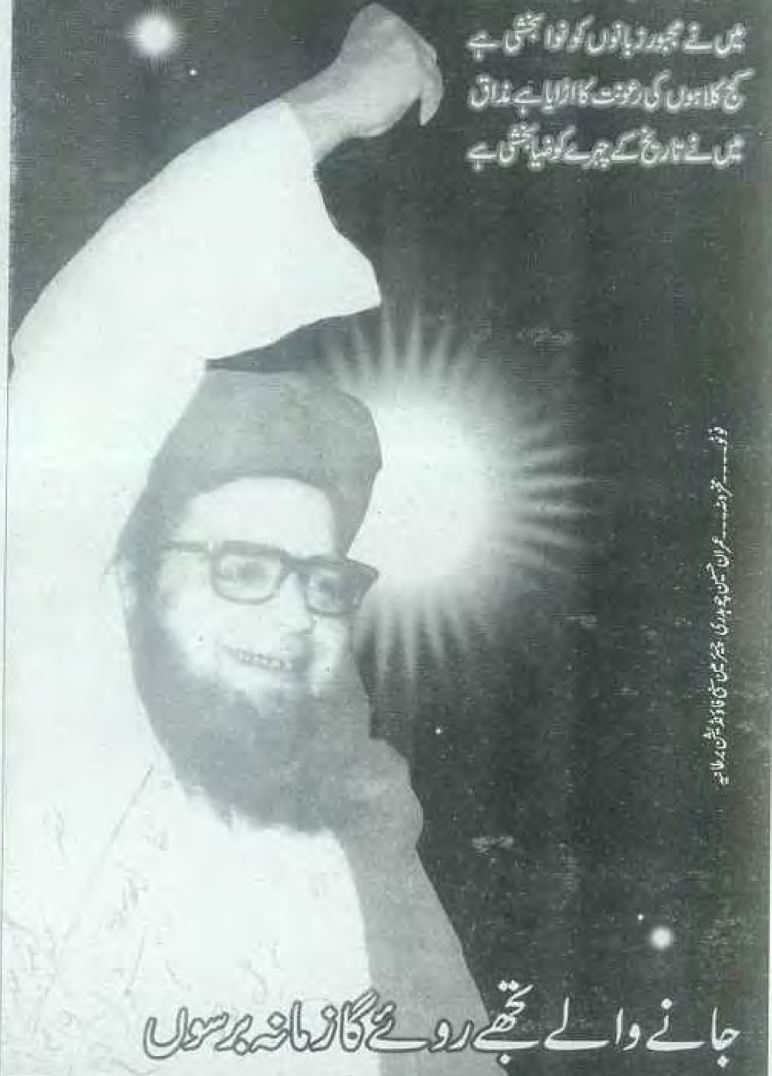
چوتھے وہ تمام حضرات جنہوں نے اس پرچہ میں اشتہارات یا خریداری کے حوالے

سے تعاون کیا وہ اور جنہوں نے اہم تاریخی تصاویر و دستاویزات کی فراہمی میں تعاون کیا ہم ان سب کے ممنون ہیں۔

ہمیں اس اعتراف کے بعد ان تمام حضرات کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرنا ہے ہم دعا گو ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کو اس کار خیر کی بہتر جزا عطا فرمائے اور اس کو دارین میں ان کے لیے نفع اور خیر کا باعث ہے۔ اس اہم تاریخی دستاویز کی اشاعت سے اگر ہمارے معاشرے کا قبلہ درست ہو جائے اور انتشار و انار کی وحدت و اخوت میں بدل جائے تو یقیناً ہمارا معاشرہ جنت نظیر بن جائے گا اور یہی حضور شیخ الاسلام قائد اہلسنت مولانا شاہ احمد نورانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مشن تھا اس سے یقیناً ان کی روح مبارکہ مسرور ہوگی اللہ کریم ہمیں ان کے حقیقی فیضان سے مستنیر و مستفیض فرمائے۔ آمین

۳۰ ستمبر ۲۰۰۹ء

محمد قمر الاسلام
(ایڈیٹر)





شیخ الاسلام، قائدِ اہلِ سنت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کے

جدِ امجد حضرت مولانا شاہ محمد عبدالحکیم صدیقی



شیخ الاسلام قائد اہل سنت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقیؒ کے
والد گرامی حضرت سفیر اسلام
مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ



شیخ الاسلام قائد اہل سنت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقیؒ کے فرزندان گرامی

علامہ حضرت شاہ محمد انس نورانی اور علامہ حضرت شاہ محمد اویس نورانی



شیخ الاسلام قائد اہل سنت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقیؒ
اور
مجاہد ملت مولانا محمد عبدالستار خاں نیازیؒ



شیخ الاسلام قائد اہل سنت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقیؒ اپنے رفیق خاص اور
جمعیت علماء جموں و کشمیر کے سربراہ حضرت پیر محمد عتیق الرحمان نقشبندی قادری

میرا قائد


JUP
قومی جماعتی سربراہی کانفرنس
زیر اہتمام جمعیت علماء پاکستان









عراقی صدر سید صدام حسین کاظمی کے ساتھ — لیبیا کے سربراہ کرنل معمر قذافی کے ہمراہ

یادگار لمحات جو کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کر لئے



محمود علی قصوری کے ساتھ،



نواب زادہ نصر اللہ کے ساتھ



سابق صدر فاروق احمد لغاری کے ساتھ



ایم ایم اے کے جلسہ کے بعد وحدت کا اظہار

قائد اہلسنت مولانا شاہ احمد نورانی کے چند یادگار لمحات

حیدرآباد میں غلاف کعبہ کی زیارت کے موقع پر مولانا عبدالحامد بدایونی تقریر کر رہے ہیں۔
اسٹیج پر کمشنر حیدرآباد جناب ابو نصر، ڈپٹی کمشنر جناب وسیم غلاف کعبہ کمیٹی کے اراکین اور حیدرآباد کے معززین بیٹھے ہوئے ہیں۔





قائد اہلسنت ٹاؤن ہال راچڈیل (برطانیہ) میں پہلی بار پاکستانی پرچم لہرا رہے ہیں قاری محمد زوار بہادر، مفتی منیر الزمان، مولانا محمد اعظم، قاری محمد خان اور دیگر زعما بھی ہمراہ ہیں



دربار بری امام سرکار ۔۔۔ قائد اہلسنت مولانا شاہ احمد نورانی، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی پیر سید برکات احمد شاہؒ اور دیگر زعماء ملک وملت کے استحکام کیلئے دعا کر رہے ہیں



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



ملحقہ تنظیم المدارس

جامعہ البنات

امام اعظمؒ ایجوکیشن اکیڈمی

12 کلو میٹر ڈنگہ کھاریاں روڈ نونانوالی (گجرات)

بچیوں کی اچھی تعلیم وتربیت جنت کی ضمانت ہے اپنی بچیوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کیجئے اور اپنی بخشش کا سامان کیجئے ایسا ادارہ جہاں پر کسی بچی پر کسی قسم کی کوئی سختی نہیں کی جاتی اور بچی اپنے گھر جیسا ماحول پائے گی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر چادر وچار دیواری کا تحفظ

تمام شعبہ جات میں داخلے جاری ہیں

ہر کورس کی تکمیل پر مدرسہ کی طرف سے سند عطا کی جائے گی

نوٹ: **غریب اور مستحق طالبات کے لئے کتابیں مفت ہونگی**

جاری شعبہ جات درج ذیل ہیں

☆ حفظ ناظرہ ☆ تجوید قرأت ☆ درس نظامی ثانویہ عامہ وثانویہ خاصہ

☆ ترجمہ قرآن وحدیث اور اسلامی معلوماتی کورسز

نیز تلاوت ونعت وتقریر نقابت کی علمی ٹریننگ بھی شامل ہے

سہولیات

باپردہ اسلامی ماحول | اعلیٰ تربیت یافتہ سٹاف | دیدہ زیب عمارت | صفائی کا اعلیٰ انتظام | ٹرانسپورٹ کا انتظام

منجانب

رابطہ: قاری محمد افضل مجددی

چوہدری محمد افضال رضوی

امام اعظم ایجوکیشن ویلفیئر سوسائٹی

نونانوالی تحصیل کھاریاں ضلع گجرات 0300-5442246,053-7522520

ہم اپنے عظیم قائد، مفکرِ اسلام، پیکرِ حق گوئی،

حضرت علامہ امام شاہ احمد نورانی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ

کی تحریک ختم نبوت، تحریکِ نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

اور استحکامِ پاکستان کیلئے گراں قدر خدمات کو

خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں

اور دعا گو ہیں کہ اللہ کریم ہمیں اُن جیسا بے مثال قائد ایک بار پھر عطا فرمائے تاکہ ہم جاگتی آنکھوں وطنِ عزیز پاکستان میں نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رائج دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان جذبات کو اپنی قدرتِ کاملہ سے عملی جامہ پہنائے۔ آمین

منجانب

رانا محمد اقبال توگیروی صدر وارا کین

بزم ذکر حبیب سکھیکی، (حافظ آباد)

0300-4666486

حرفِ چند

مولانا شاہ احمد نورانی (۱۹۲۶ء۔۲۰۰۳ء) وطن عزیز کے ان معدودے چند سیاستدانوں میں سے ایک تھے جنھوں نے اصولی سیاست کو فروغ دیا۔ مولانا نورانی کا تعلق علمائے ملت سے تھا اور انھوں نے دین اور دنیا کے معاملات کو اس متوازن انداز سے چلایا کہ کامیابیاں ان کا مقدر ٹھہریں۔ تحریک پاکستان کے تناظر میں ان کی اور ان کے خاندان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا نورانی نے بنفسِ نفیس انتخابات ۴۶۔۱۹۴۵ء کی کامیابی کے لیے جدوجہد کی۔ اس طرح وہ اوائل عمری سے ہی میدان سیاست اور اس کی رمزکاریوں سے آگاہ تھے۔ مزید برآں چونکہ ان کے زیرنظر اپنے اسلاف کی سیاسی جدوجہد اور بالخصوص قائداعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء۔۱۹۴۸ء) کا اندازِ سیاست بھی تھا، اس لیے ان کے یہاں اصول پسندی اور دستوریت (Constitutionalism) ایک طرۂ امتیاز کے طور پر موجود تھے۔ جسے انھوں نے تمام عمر ایک نمایاں ضابطہ اخلاق کے طور پر اپنائے رکھا۔ اس طرح انھوں نے جس سیاسی نظم وضبط کا مظاہرہ کیا، اس کی مثال کم از کم تاریخ پاکستان میں ملنا مشکل ہے۔

مولانا نورانی نے ملکی و مذہبی سیاست میں ''حصول اقتدار کے بغیر سیاست'' کی نئی اور منفرد روش کو متعارف کرایا۔ جس کے دم بہ قدم انھوں نے علماء اور مشائخ کو مساجد اور خانقاہوں سے نکل کر میدانِ عمل میں آنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے ایوانِ اقتدار سے کنارہ کشی کے ضمن میں خود کو ایک مثال کے طور پر پیش کیا اور علماء و مشائخ کے طبقات کو بھی قربانی ذات (Self Sacrifice) کا سبق دیا۔ اصول پسندی، دستوریت اور قربانی ذات کے ساتھ ساتھ ان کے اندازِ سیاست کا چوتھا ستون بے باکی و حق گوئی تھا۔ ان کی نجی و سیاسی زندگی کے محض سرسری جائزے سے ہی آسانی اس نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ وہ اصولوں کی خاطر ہر جابر سلطان کے سامنے ڈٹ گئے۔

مولانا نورانی کی سیاسی زندگی کو دو بڑے ادوار غیر پارلیمانی دور (۱۹۴۵ء۔۱۹۶۹ء)

اور پارلیمانی دور (۱۹۷۰ء-۲۰۰۳ء) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ باب اوّل میں ان دونوں ادوار کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جن میں ان کی تحریک پاکستان میں خدمات، اسلامی آئین کے لیے ابتدائی جدوجہد، تحریک ہائے ختم نبوت ۱۹۵۳ء و۱۹۷۴ء آئین ۱۹۷۳ء کے لیے ان کی خدمات اور ان کی پارلیمانی زندگی کے دیگر پہلو زیر بحث لائے گئے ہیں۔

مولانا نورانی نے اپنی سیاسی زندگی کے دوسرے (یعنی پارلیمانی) دور میں متعدد انتخابی و سیاسی اتحاد بنائے۔ جن میں پاکستان قومی اتحاد اور متحدہ مجلس عمل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ پاکستان قومی اتحاد اور تحریکِ نظام مصطفیٰ سے انھیں ملکی سیاسی حلقوں میں شہرت ملی۔ یہی وجہ ہے کہ موضوع مقالہ "پاکستان کے سیاسی اتحادوں میں مولانا شاہ احمد نورانی کا کردار (۱۹۷۷ء-۲۰۰۳ء)" منتخب کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ان کی پاکستان قومی اتحاد اور تحریک نظام مصطفیٰ کے حوالے سے سیاسی خدمات زیر بحث لائی گئی ہیں۔

مولانا نورانی نے اپنی ہمہ پہلو زندگی کو مقام مصطفیٰ ﷺ کے تحفظ اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ مقام مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ چونکہ آئین پاکستان ۱۹۷۳ء میں مسلمان کی جامع تعریف کی شمولیت سے ہو چکا تھا۔ اس لیے انھوں نے ۱۹۷۳ء و مابعد اپنی جملہ توانائیاں نفاذِ نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے وقف کر دیں۔ ذوالفقار علی بھٹو مولانا نورانی کی اصول پسندی اور جرأت و بے باکی سے خائف تھے۔ اسی لیے تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران وہ حکومتی جبر و استبداد کا خصوصی نشانہ بنے۔ تاہم مولانا نورانی نے جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کی روش کو ترک نہ کیا اور اس کا تسلسل ضیاء مارشل لاء کے دوران بھی اسی شدو مد سے جاری رہا۔

ضیاء مارشل لاء کے دوران بحالیِ جمہوریت کے سلسلے میں ایم آر ڈی اور تحریک تحفظ پاکستان کے نام سے دو تحریکیں چلائی گئیں۔ مولانا نورانی نے ایم آر ڈی میں شمولیت اختیار کیے بغیر اس کی غیر مشروط حمایت جاری رکھی جبکہ انھوں نے مسلم لیگ سے مل کر مؤخر الذکر سیاسی اتحاد تشکیل دیا۔ تیسرے اور چوتھے باب میں انھی دو تحاریک کے حوالے سے مولانا نورانی کی سیاسی خدمات کا تذکرہ شامل ہے۔

مولانا نورانی کو اپنی حق گوئی اور بے باکی کا نتیجہ یوں بھگتنا پڑا کہ ان کے کئی قریبی ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ کر مارشل لاء کے زیر سایہ چلے گئے۔ تاہم جب مسلم لیگ کے روح

رواں پیر پگاڑا نے مارشل لاء کی حمایت کا فیصلہ کیا تو تحریک تحفظ پاکستان ختم ہو کر رہ گئی۔ مولانا نورانی نے نہ صرف مارشل لاء اقدامات پر تنقید کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ انھوں نے ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ سیاسی لحاظ سے ان کا فیصلہ غلط تھا کیونکہ کوئی سیاسی جماعت بھی سیاسی و انتخابی عمل سے کنارہ کشی کر کے سیاسی میدان میں زندہ نہیں رہ سکتی لیکن ان کی اصول پسندی نے ایک غیر جمہوری روایت کا حصہ بننا گوارہ نہ کیا۔

پانچویں باب میں پاکستان عوامی اتحاد کی تشکیل اور سیاسی جدوجہد کا ذکر ہے۔ ضیاء مارشل لاء کے خاتمے کے بعد جب ملک میں جمہوری سرگرمیاں دوبارہ بحال ہوئیں اور نئے انتخابات کا اعلان کیا گیا تو مولانا نورانی نے مسلم لیگ کے محمد خان جونیجو سے مل کر مذکورہ سیاسی اتحاد تشکیل دیا۔ تاہم جب محمد خان جونیجو اپنی سیاسی ترجیحات میں تبدیلی کر کے اسلامی جمہوری اتحاد میں چلے گئے تو پاکستان عوامی اتحاد بھی بحران کا شکار ہو گیا۔

چھٹے باب "مولانا نورانی اور اسلامی جمہوری محاذ" بے نظیر، نواز شریف گٹھ جوڑ کے خلاف مولانا نورانی کی سیاسی جدوجہد سے متعلق ہے۔ یہ اتحاد جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمٰن گروپ کے درمیان ۱۹۹۲ء میں تشکیل پایا۔ ان دنوں ملکی صورتحال افغانستان میں امریکی اثر و رسوخ میں اضافے اور ملک میں دہشت گردی بالخصوص سندھ میں غیر ملکی مداخلت کی وجہ سے گھمبیر ہو چکی تھی جبکہ خارجہ پالیسی میں ناکامی کی انتہا یہ تھی کہ بھٹو دور میں فرانس کے ساتھ کیا جانے والا ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کا سودا منسوخ ہو گیا۔ بابری مسجد شہید کر دی گئی جبکہ سندھ میں دہشت گردی پر قابو کے لیے فوج کو بلانا پڑا۔

ان حالات میں ضروری تھا کہ محب وطن سنجیدہ سیاسی حلقے اپنا کردار ادا کرتے۔ چنانچہ مولانا شاہ احمد نورانی نے مولانا فضل الرحمٰن سے مل کر اسلامی جمہوری محاذ کے پلیٹ فارم سے مشترکہ سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا۔ مولانا نورانی اس ہم خیال کی کوشش کا دائرہ بڑھانا چاہتے تھے تاکہ انتخابات ۱۹۹۳ء میں دینی ووٹ کو مرتکز کیا جاسکے لیکن اسلامک فرنٹ اور متحدہ دینی محاذ کے قیام کی وجہ سے دینی ووٹ تقسیم ہو گیا اور مذہبی جماعتیں ناکامی سے دوچار ہو گئیں۔ انتخابات ۱۹۹۳ء کے بعد بے نظیر بھٹو اقتدار میں آئیں لیکن انھیں بھی جلد ہی ایوانِ اقتدار سے رخصت ہونا پڑا۔

بے نظیر بھٹو کے دوسرے عہدِ اقتدار (۱۹۹۳ء۔۱۹۹۶ء) میں ملک میں فرقہ وارانہ دہشت گردی اپنے عروج پر تھی۔ مذہبی جماعتوں نے جاری حالات کی نزاکت کے تحت مشترکہ جدوجہد کی ضرورت کو محسوس کیا اور یوں ۱۹۹۵ء میں مولانا نورانی کی کوششوں سے ''ملی یکجہتی کونسل'' کا قیام عمل میں آیا اور بعدازاں یہی ہم خیالی ۲۰۰۱ء میں ''متحدہ مجلسِ عمل'' کی بنیاد بنی۔ مقالہ کے آخری باب میں مولانا نورانی کی سیاسی زندگی کے آخری دور (۱۹۹۵ء۔۲۰۰۳ء) کا مبسوط مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

ملی یکجہتی کونسل کے قیام سے نہ صرف فرقہ واریت میں شدید کمی ہوئی بلکہ دینی جماعتوں کو منظم و متحدہ ہونے کا موقع بھی ملا۔ یہ مولانا نورانی کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ ملی یکجہتی کونسل نے اپنے قیام کے مقاصد کو پورا کیا۔ اگرچہ مولانا شاہ احمد نورانی اس دوران پارلیمانی محاذ پر شکستوں سے دوچار ہوتے رہے۔ تاہم انھوں نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو ماند نہ پڑنے دیا۔ اِن کے نزدیک ''انتخابات بلا احتساب! کا عمل چونکہ ایک سعی لاحاصل کے سوا کچھ نہیں تھا اس لیے انھوں نے آئندہ انتخابات ۱۹۹۷ء کا بائیکاٹ کیا۔ بعدازاں جب سیاسی حالات نواز شریف کی شخصی آمریت کی وجہ سے جنرل پرویز مشرف کی ایوانِ اقتدار میں آمد کا باعث بنے تو مولانا نورانی ایک بار پھر میدانِ سیاست میں سرگرم عمل ہو گئے۔ چنانچہ ان کی مساعی سے ملک کی چھ بڑی دینی جماعتوں کے اشتراک سے ''متحدہ مجلس عمل'' کا قیام عمل میں آیا۔ انتخابات ۲۰۰۲ء میں مجلس عمل ملک کی دوسری بڑی جماعت بن کر ابھری جبکہ ملک کی دونوں بڑی سیاسی جماعتیں پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) شکست سے دوچار ہوئیں۔

متحدہ مجلس عمل کی کامیابی، مولانا شاہ احمد نورانی اور ان کے رفقاء کی پرخلوص اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ عام انتخابات ۲۰۰۲ء میں مولانا نورانی نے حصہ ہی نہ لیا اور اپنی تمام تر صلاحیتیں متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کے لیے وقف کر دیں۔ تاہم متحدہ مجلس عمل میں شامل جماعتوں کے رہنماؤں بالخصوص قاضی حسین احمد کے اصرار پر مولانا نورانی نے بعدازاں سینٹ کے انتخابات میں شریک ہونے کے لیے نہ چاہنے کے باوجود حامی بھر لی۔ ۲۰۰۳ء میں جنرل پرویز مشرف کے لیگل فریم ورک آرڈر بالخصوص وردی کے مسئلہ پر مولانا نورانی کا رویہ دوٹوک اور سخت تھا اور وہ اس مسئلہ پر کسی قسم کی لچک دکھانے کو تیار نہ تھے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد متحدہ مجلس عمل کی قیادت حکومتی، دباؤ برداشت نہ کر سکی

اور یوں لیگل فریم ورک آرڈر پر حکومتی موقف کو تھوڑی سی ردوقدح کے بعد تسلیم کر لیا گیا۔

مولانا نورانی کی زندگی ایک کھلی کتاب کی مانند تھی جس کے ہر ورق پر ایک سرگرمئ عمل، تحریک، سچائی و بے باکی روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ وہ رواں سیاسی نظام میں ایک نادر الوجود مثال تھے۔ انھوں نے ہر قدم خوب سوچ سمجھ کر اٹھایا اور پھر جو بھی فیصلہ کیا اس پر کامل حق الیقین کے ساتھ ڈٹ گئے۔ علامہ مشرقی ؒ کے بقول ''دنیا کی مکر کی تاریخ میں سیاست صرف اپنے نقطہ نظر سے کامیاب حکومت کا نام ہے۔ سیاست کے سب چالباز اپنے حریف کی چال کو کم و بیش صاف طور پر دیکھتے ہیں۔ لیکن کیونکہ سب چور ہوتے ہیں اور سب کا مقصد بے بس اور بے خبر رعیت کا کامیاب شکار کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے ہر چور اپنے حریف کی چال کو روایتی احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اور سیاست کے تمام کھیل کو سرِ مکتوم بنا دینا اپنی سیاسی شرافت سمجھتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے راعی کی رعایا کے خلاف ہمیشہ ایک سازش رہی ہے۔ جس کا پورا انکشاف اس لیے نہیں ہو سکا کہ راعیوں کی ٹولی دنیا میں ایک مستقل گروہ رہا ہے۔ جس کی سیاسی شرافت اور آداب جماعت اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ چوروں کی منڈلی کے راز فری میسوں کی طرح فاش کر کے رکھ دے۔''

مقامِ صد شکر ہے کہ تاریخ پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح کے بعد مولانا شاہ احمد نورانی کی صورت میں ایک ایسی سرگرم عمل اور تحریکی شخصیت کارزارِ سیاست میں سرگرم عمل رہی جس نے اوّل الذکر کی طرح بااصول، شفاف اور جرأت مندانہ طرزِ سیاست کو فروغ دیا اور جنھوں نے رعایا کے خلاف ہونے والی ہر سازش کو کھلے بندوں بے نقاب کیا۔ مقالہ میں مولانا نورانی کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالہ کی تیاری کے دوران میری کوشش رہی ہے کہ ثانوی ذرائع پر کم سے کم انحصار کیا جائے۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے مولانا نورانی کے عزیز و اقارب، اکابرین جمعیت علمائے پاکستان اور دیگر سیاستدانوں سے رابطہ کر کے اپنی معلومات میں استناد کو ممکن بنایا۔ مزید برآں قومی اخبارات و جرائد جیسے بنیادی ذرائع سے استفادہ کیا۔ مقالہ کی تیاری کے دوران معلومات کی صحت، تاریخیت، حقیقت بیانی اور غیر جانبدارانہ بیان کا خصوصی التزام کیا۔

اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم اور احسان ہے کہ اس ذاتِ باری تعالیٰ نے مجھے اس مقالہ کی تیاری کی توفیق بخشی۔ بعدازاں شکر خدا میں اپنے استاد ڈاکٹر سید شاہد حسن رضوی، اپنے

بھائی اے ڈی ندیم، اپنے رفقاء طاہر محمود سردار اور محمد عمر کا شکر گزار ہوں جن کی شبانہ روز رہنمائی سے میں مقالہ کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکا۔

میں اپنے اساتذہ شعبہ تاریخ بالخصوص چیئرمین شعبہ پروفیسر ڈاکٹر سید آصف علی رضوی کا شکر گزار ہوں اور اپنے تمام اساتذہ کا، جنھوں نے ہر مرحلۂ علم پر میری رہنمائی اور معاونت فرمائی۔ میں ان تمام شخصیات کا جنھوں نے مجھے اپنے قیمتی وقت سے نوازا۔ خصوصاً مولانا مفتی جمیل احمد نعیمی، مولانا مفتی منیب الرحمٰن چیئرمین مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی، پروفیسر شاہ فرید الحق، قاری زوار بہادر قادری، جنرل خواجہ محمد اظہر، علامہ سید شبیر احمد ہاشمی اور سید حفیظ قیصر کا شکر گزار ہوں۔ میں خاص طور پر چیف لائبریرین سنٹرل لائبریری بہاول پور جناب جاوید اقبال اور عملہ لائبریری محمد مشتاق، عملہ لائبریری بغداد الجدید اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، لاہور و کراچی کی لائبریریوں کے اسٹاف، عملہ دفتر ورلڈ اسلامک مشن کراچی اور ساہیوال میں علامہ شیر محمد فریدی، استادِ گرامی چوہدری بیعت اللہ، مہر ریاست علی اور علامہ منور نورانی کا شکر گزار ہوں جن کی خصوصی مہربانی سے قیمتی معلومات کا حصول ممکن ہوا۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے معاون خصوصی ڈاکٹر محمد صفدر جاوید کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی شبانہ روز محنت سے یہ مقالہ سپردِ قرطاس ہوا۔

تاریخ نویسی میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی۔ اس بناء پر مقالہ ہذا میں یقیناً کوتاہیاں موجود ہیں تاہم بطور طالب علم میں نے مقالہ کو زیادہ سے زیادہ جامع اور مستند بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ یقیناً میری اس کوشش کو تحسین کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

مظہر حسین

بابِ اوّل

مولانا شاہ احمد نورانی...... حیات وخدمات ایک اجمالی جائزہ

خاندانی پس منظر

مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی (۱۹۲۶ء۔۲۰۰۳ء) میرٹھ (بھارت) کے ایک ممتاز روحانی و علمی خاندان میں پیدا ہوئے (۱)۔ ان کے دادا علامہ شاہ عبدالحکیم صدیقی میرٹھی اپنی بزرگی و علمیت کی بناء پر شاہی مسجد میرٹھ کے شاہی خطیب کے منصب پر فائز تھے۔ وہ ممتاز شاعر بھی تھے اور جوش تخلص فرماتے تھے۔ (۲)

مولانا نورانی کے دادا کے بھائی مولانا محمد اسماعیل میرٹھی تھے جن کی نظمیں آج بھی مشہور و معروف ہیں جبکہ ان کے والد کے بڑے بھائی مولانا احمد مختار صدیقی کو امام اہلسنت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ (۱۸۵۶ء۔۱۹۲۱ء) نے خلافت بھی عطا کی۔ وہ عمر کے آخیر حصے میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے مگر اس کے باوجود ایسا پاکیزہ لکھتے کہ ہر حرف اپنی جگہ، نہ لائن ٹیڑھی اور نہ عبارت میں کوئی سقم ہوتا تھا (۳)۔ انھوں نے افریقہ کے متعدد تبلیغی سفر فرمائے اور ان کی تحریک پر کئی طلباء افریقہ سے ہندوستان آ کر علم دین حاصل کرتے رہے۔ (۴)

آپ کے دوسرے تایا مولانا نذیر احمد صدیقی خوجندی کو بھی مولانا شاہ احمد رضا خان بریلویؒ سے منصب خلافت حاصل ہوا۔ (۵) مولانا نذیر احمد بمبئی کی جامع مسجد کے خطیب تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء۔۱۹۴۸ء) بھی دینی معاملات میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے۔ (۶) عیدین کی نمازیں آزاد میدان پارک بمبئی میں آپ ہی کی امامت میں ادا کرتے تھے اور جب قائداعظم نے رتن بائی (۱۹۰۰ء۔۱۹۲۹ء) سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے مولانا نذیر احمد صدیقی ہی سے مشورہ کیا اور رتن بائی کو انہی کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام کرایا اور مولانا نذیر احمدؒ ہی نے قائداعظم کا نکاح پڑھایا۔ (۷)

والد ماجد شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ

مولانا نورانی کے والد ماجد شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی ؒ (۱۸۹۲ء۔۱۹۵۴ء) ہندوستان میں مبلغ اسلام، سفیر اسلام، سفیر پاکستان، سیاح عالم جبکہ افریقہ و یورپ اور عرب ممالک میں ''الطبیب الہندی'' کے لقب سے مشہور تھے (۸)۔ وہ بیک وقت عالم و فاضل، صوفی کامل، مقرر و خطیب، مصنف و ادیب، حکیم و طبیب تھے۔ انھیں کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا، بے مثل مناظر اور بلند پایہ مفکر تھے (۹)۔ نعت گوئی انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ وہ قوم کے ایک نبض شناس سیاستدان اور تحریک پاکستان کے ہراوّل دستہ کے سالار تھے۔ (۱۰)

شاہ عبدالعلیم صدیقی ؒ ابتدائی تعلیم والد بزرگوار سے حاصل کرنے کے بعد میرٹھ کی مشہور دینی و علمی درسگاہ مدرسہ عربیہ قومیہ میں داخل ہوئے اور سولہ برس کی عمر میں امتیازی حیثیت سے درس نظامی کی سند حاصل کی اور اس کے بعد علوم جدیدہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۹۱۷ء میں میرٹھ کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے روحانی فیض والد ماجد حضرت علامہ شاہ عبدالحکیم صدیقی ؒ ، برادر اکبر مولانا احمد مختار صدیقی ؒ ، مولانا احمد رضا خانؒ، حضرت اشرفی میاں (۱۸۹۴ء۔ ۱۹۶۱ء)، مولانا عبدالباری فرنگی محلی (۱۸۷۸ء۔۱۹۲۶ء)، حضرت شیخ احمد الشمس اور لیبیا کے مشہور اور ممتاز روحانی بزرگ حضرت شیخ السوسی جیسے بزرگوں سے حاصل کیا۔ (۱۱)

وہ سلسلہ قادریہ میں مولانا احمد رضا خانؒ سے بیعت ہوئے اور خلافت حاصل کی اور اس کے علاوہ مذکورہ بالا بزرگوں نے بھی انھیں خلافت سے نوازا (۱۲)۔ یوں مولانا نورانی کا خاندان دنیا کا وہ واحد خانوادہ ہے جس میں تین بھائیوں کو مولانا احمد رضا خانؒ بریلوی سے خلافت و اجازت حاصل ہوئی۔ شاہ عبدالعلیم صدیقی نے ۱۹۱۹ء میں حج بیت اللہ شریف کی سعادت حاصل کی۔ حج بیت اللہ سے واپسی پر اپنے مرشد مولانا احمد رضا خان بریلوی کے حکم پر بیرون ملک تبلیغ کا آغاز کر دیا۔ وہاں مرتے دم تک ان کا سلسلۂ تبلیغ جاری رہا۔ (۱۳)

شاہ عبدالعلیم صدیقی نے تقریباً چالیس سال تک دنیا کے گوشے گوشے میں اسلام کا پیغام پہنچایا اور شاید ہی دنیا کا کوئی ملک ہو جہاں وہ تشریف نہ لے گئے ہوں (۱۴)۔ افریقہ، یورپ اور ایشیاء کے دور دراز علاقوں میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ ان کی تبلیغی

کاوشوں سے تقریباً ستر ہزار افراد نے ان کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا۔ جن میں نائیجیریا کے وزیر اعظم احمد ڈبلیو شہید، بورنیو کی شہزادی، ماریشس کے فرانسیسی گورنر، ٹرینی ڈاڈ کی خاتون وزیر، سیلون کے وزیر ایف گنگن بری، امریکی سائنسدان جارج اینٹونوف، ڈاکٹر صادق، فلپائن کے نامور اسکالر ڈاکٹر احمد ہارون قابل ذکر ہیں (۱۵)۔ انھوں نے تبلیغ اسلام کو ایک نئے اسلوب اور جدید تقاضوں سے روشناس کرایا چنانچہ انھوں نے ہر ملک میں مساجد، مدارس اور اسلامی مراکز قائم کیے جن میں سنگاپور کی سلطان مسجد اور دارالعلوم، جاپان مسجد ٹوکیو، حنفیہ مسجد کولمبو، اسلامی کتب خانہ، مسجد نائیجیریا، عربی یونیورسٹی ملایا، اسلامک سروس سنٹر ڈربن، ہانگ کانگ میں یتیم خانہ، اسلامی مشن سربیا، جاوا، نیشنل ہائی اسکول پونا قابلِ ذکر ہیں۔ (۱۶)

اسی طرح انھوں نے مختلف ممالک میں رسالے، جرائد وغیرہ شائع کرائے، سنگاپور سے انگریزی ماہنامہ ریئل اسلام، سیلون سے اسٹار آف اسلام، ڈربن سے دی مسلم ڈائجسٹ، ٹرینی ڈاڈ سے مسلم اینول وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مختلف ممالک میں اسلامی تبلیغی تنظیمیں قائم کیں اور اپنے مریدین و شاگردوں کو اس کے ذریعے تبلیغ دین کے لیے تیار کیا (۱۷)۔

شاہ عبدالعلیم صدیقی اپنے تبلیغی مشن کے ساتھ ساتھ سماجی شعبہ میں بھی سرگرم رہتے تھے چنانچہ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے مکہ مکرمہ میں شاہ ابن سعود (۱۸۸۰ء۔۱۹۵۳ء) سے ملاقات کر کے نومسلم یورپین کو دوران حج درپیش مشکلات پر بحث کی ☆ (۱۸)۔

انھوں نے کمیونزم اور دہریت کے خلاف دنیا کے تمام مذاہب پر مشتمل ایک کانفرنس بلائی جس میں ایک تنظیم بنام تنظیم بین المذاہب تشکیل دی گئی (۱۹) اور اسی میں انھیں فضیلت المآب کا متفقہ خطاب دیا گیا (۲۰)۔ اسی دوران وہ دنیا کے ایک مشہور ترین فرد بن چکے تھے کہ جس نے اپنی زندگی اسلام کے لیے وقف کر دی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں مشہور فلاسفر جارج برناڈ شاہ نے ممباسا (کینیا) میں ان سے ملاقات کی اور اسلام اور عیسائیت پر بھرپور مکالمہ کیا اور آخر میں یہ تاثرات بیان کیے کہ تعلیم یافتہ مہذب اور شائستہ لوگوں کے مستقبل کا مذہب ''اسلام'' ہے۔ (۲۱)

☆ بعد ازاں ۱۹۴۶ء میں شاہ عبدالعلیم ابن سعود سے دوبارہ ملے اور مذاکرات کر کے حجاج پر عائد ٹیکس معاف کرایا۔

اسی دوران وہ اپنے وطن ہندوستان سے بھی بے خبر نہیں تھے بلکہ برصغیر کی تاریخ کی ہر تحریک میں بھی آپ بھرپور طور پر حصہ لیتے رہے۔ انھوں نے تحریک خلافت میں مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء۔۱۹۳۱ء) اور مولانا شوکت علی (۱۸۷۳ء۔۱۹۳۸ء) کے شانہ بشانہ کام کیا اور اسی دوران (۱۹۲۲ء) چھ ماہ تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں (۲۲)۔ اسی طرح ہندوؤں کی طرف سے چلائی گئی شدھی تحریک میں انھوں نے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ہندوؤں کے گڑھ بمبئی، کرناٹک، احمد آباد، گجرات وغیرہ میں مراکز قائم کیے۔ آپ کا شمار تحریک پاکستان کے صف اوّل کے رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ (۲۳)

شاہ عبدالعلیم صدیقی نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان (۱۹۴۰ء) کی منظوری سے پہلے ہی مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ (ق ۱۹۰۶ء) اور مسٹر جناح کی سیاسی بصیرت سے فائدہ اٹھائیں کیونکہ فی زمانہ علماء کرام انگریزوں اور ہندوؤں کی سیاہ کاریوں کو سمجھنے سے قاصر تھے اور یہ کام وہی کر سکتا تھا جو انگریز اور کانگریس (ق ۱۸۸۵ء) دونوں کے ہتھکنڈوں سے واقف ہو۔ (۲۴)

قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد آپ نے قیام پاکستان کی تحریک میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا اور اندرون ملک و بیرون ملک پاکستان کے مطالبہ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے دورے کیے (۲۵)۔ متعدد بار قائد اعظم نے انھی کو بیرون ممالک کے دورہ پر بطور خاص روانہ کیا حتیٰ کہ قیام پاکستان کے بعد بھی آپ کو اسلامی ممالک میں پاکستان کی نمائندگی کا فریضہ سونپا گیا جبکہ آپ کو قائد اعظم نے مصر میں سفیر بننے کی پیش کش بھی کی مگر اپنے تبلیغی مشن کی وجہ سے انھوں نے معذرت کر لی (۲۶)۔ آپ نے مفتی اعظم فلسطین امین الحسنی، اخوان المسلمین مصر کے بانی حسن البناء، اردن کے شاہ عبداللہ، سعودی عرب کے شاہ ابن سعود اور دیگر عرب لیڈروں سے ملاقاتیں کیں اور انھیں مطالبہ پاکستان کی حیثیت سے روشناس کرایا۔ (۲۷)

۱۹۴۰ء کے آخر میں وہ حج کے لیے روانہ ہوئے انھوں نے اس وقت بھی مسلمانوں کو ایک موثر پیغام دیا۔ انھوں نے کہا کہ تمام برادران ملت کو علی العموم سفر حجاز مقدس میں آخری وصیت کرتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں کہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ انتخابات جدیدہ میں تمام اختلافات باہمی کو مٹا کر آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت میں ہمہ تن سرگرم رہیں اور ابنائے وطن کے دام تزویر میں آ کر اپنے شیرازے کو ہرگز منتشر نہ ہونے دیں اور ثابت کر دکھائیں کہ

مسلمان متحد و متفق ہیں۔ (۲۸)

شاہ عبدالعلیم صدیقی نے تحریک پاکستان میں جس قائدانہ انداز سے حصہ لیا وہ تاریخ پاکستان کا ایک روشن باب ہے۔ مولانا صدیقی سواد اعظم اہل سنت کی نمائندہ تنظیم آل انڈیا سنی کانفرنس کے بنیادی رکن بھی تھے۔ چنانچہ سنی کانفرنس بنارس ☆ کے انعقاد کے لیے جب آل انڈیا سنی کانفرنس کا ایک اجلاس جامعہ نعیمیہ مراد آباد میں ہوا تو وہ اس میں شریک تھے۔ اس کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سنی کانفرنس ☆☆ بنارس کو کامیاب بنانے کے لیے پورے ہندوستان کا دورہ کیا جائے اور علماء اپنے پروگراموں میں اس کی تشہیر کریں۔ چنانچہ انھوں نے ملک کے طول و عرض میں جا کر اس مہم کو کامیاب بنایا۔ ☆☆☆ (۲۹)

شاہ عبدالعلیم صدیقی '' کو اس کانفرنس میں بنائی جانے والی کمیٹیوں میں سب سے اہم کمیٹی، کمیٹی برائے اصول پاکستان یعنی اسلامی حکومت کے لائحہ عمل مرتب کرنے والی کمیٹی میں شامل کیا گیا (۳۰)۔ اسی طرح دارالمبلغین کے نام سے ایک ادارہ قیام کرنے کا فیصلہ ہوا جس میں شاہ عبدالعلیم صدیقی '' شامل کیے گئے۔ (۳۱)

انھوں نے اس کانفرنس میں ایک قرارداد سعودی حکومت کے خلاف بھی پیش کی جس میں ان حکومتی اقدامات کی شدید مذمت کی گئی جو اس نے حرمین شریفین میں کیے اور حاجیوں پر لاگو کیے گئے ناجائز ٹیکس پر احتجاج کیا گیا چنانچہ اس سلسلے میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کا مقصد سعودی سلطان سے ملاقات کرنا اور مسلمانان ہند کے جذبات سے ان کو آگاہ کرنا تھا۔ انھیں اس کمیٹی کا سربراہ مقرر کیا گیا (۳۲)۔ علاوہ ازیں وہ آل انڈیا سنی کانفرنس کے دستور و منشور مرتب کرنے کے لیے بنائی جانے والی کمیٹی میں بھی شامل تھے۔ بنارس کی سنی

☆ تفصیل کے لیے دیکھئے ضمیمہ نمبر ۱، سنی کانفرنس مراد آباد۔

☆☆ اس کانفرنس اور اس سلسلہ میں مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی '' کی کیا خدمات تھیں اس کا اعتراف پاکستان کے سابق صدر جنرل ضیاء الحق نے بھی ستمبر ۱۹۸۰ء میں مشائخ کانفرنس میں کیا۔ (انٹرویو محمد احمد صدیقی)

☆☆☆ سنی کانفرنس بنارس منعقدہ ۲۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۴۶ء پاک و ہند کی تاریخ کا دھارا بدلنے والی کانفرنس ہے کہ جس میں پورے ہندوستان سے ہزاروں علماء و مشائخ اور لاکھوں عوام اہلسنت نے شرکت کر کے قیام پاکستان کی راہ ہموار کی جس میں یہ نعرہ لگایا گیا کہ اگر مسلم لیگ اور جناح صاحب بھی اب قیام پاکستان کے مطالبہ سے دست بردار ہو جائیں تو اب ہم تحریک پاکستان کو کامیاب بنائیں گے۔

(پروفیسر محمد احمد صدیقی سے مؤلف کا انٹرویو)

کانفرنس میں یہ طے ہوا کہ علماء و مشائخ اپنے اپنے محاذ پر نظریہ پاکستان کو لوگوں میں روشناس کرائیں (۳۳)۔ چنانچہ شاہ عبدالعلیم صدیقی نے اس سلسلے میں بھرپور کام کیا۔

سعودی حکومت سے ملاقات کے لیے تشکیل دیا جانے والا وفد دسمبر ۱۹۴۶ء کو حجاز مقدس گیا (۳۴)۔ جس میں شامل اراکین نے شاہ ابن سعود سے ملاقات کی۔ نظریہ پاکستان کی وضاحت کی اور حجاج کرام پر ناجائز ٹیکس ختم کرایا (۳۵)۔ دوبارہ اس وفد نے ۱۹۴۷ء کو مصر، شام، فلسطین، عراق اور دیگر اسلامی ممالک کا دورہ کیا اور ان ممالک کے سربراہان اور باثر علماء کرام اور عوام کو نظریہ پاکستان سے آگاہی بخشی۔ (۳۶)

شاہ عبدالعلیم صدیقی جب اس دورے سے واپس آئے تو آپ کے اعزاز میں اہل کراچی نے ایک استقبالیہ دیا۔ اس کے علاوہ حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کے موقع پر ۷، ۸ جون ۱۹۴۶ء کو اجمیر شریف میں ایک عظیم الشان جلسہ عام منعقد ہوا جس میں دیگر علماء کے علاوہ بھی شریک ہوئے (۳۷)۔ اسی دوران ۱۲، ۱۳، ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں کراچی میں جلسۂ عام سے خطاب فرمایا (۳۸)۔ انھوں نے ہندوؤں کے مسلمانوں کے ساتھ غلط طرز عمل پر احتجاج کرتے ہوئے ہندوؤں کے لیڈر کانگریس کے راہنما پنڈت جواہر لعل نہرو (۱۸۸۹ء۔۱۹۶۴ء) سے ۱۹۴۵ء میں ملاقات کی اور ہندوؤں کے توہین آمیز رویے پر شدید احتجاج کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ ہی کی امامت میں قائداعظم محمد علی جناح نے مرکزی عیدگاہ کراچی میں پہلی عید کی نماز ادا کی۔ (۳۹)

شاہ عبدالعلیم صدیقی نے قیام پاکستان کے بعد خاموش تماشائی کا کردار ادا نہیں کیا بلکہ ملک میں نظام اسلامی کے نفاذ کے لیے جمعیت علمائے پاکستان کے پلیٹ فارم کو متحرک کیا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے ایک وفد کے ساتھ جس میں مولانا عبدالحامد بدایونی (۱۹۰۰ء۔۱۹۷۰ء)، علامہ ابوالحسنات محمد احمد قادری (۱۸۹۶ء۔۱۹۶۱ء)، مفتی صاحب داد خان (۱۸۹۸ء۔۱۹۶۵ء)، علامہ سید احمد سعید کاظمی (۱۹۱۳ء۔۱۹۸۶ء) اور خواجہ قمر الدین سیالوی (۱۹۰۶ء۔۱۹۸۱ء) شامل تھے، قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کی اور ایک جامع آئین اسلامی کا مسودہ پیش کیا (۴۰)۔ جس پر قائداعظم نے جواب دیا کہ ان شاء اللہ اسے جلد ہی

دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا جائے گا لیکن اس سے پیشتر ہی قائداعظم کا انتقال ہو گیا اور یوں نفاذ نظام اسلام معرض التوا میں چلا گیا۔ اگر یہ کام اس وقت ہو جاتا تو آج اس ملک کی تقدیر بدلی ہوئی ہوتی۔ بالفاظ دیگر آج یہ ملک نظام مصطفیٰ ﷺ کا گہوارہ ہوتا۔ (۴۱)

بعدازاں وہ اپنے تبلیغی مشن پر روانہ ہو گئے اور مختلف ممالک کے دورے کرتے رہے۔ اس قدر مصروف ترین شخصیت کو تصنیف و تالیف کے لیے بہت کم وقت ملا مگر انھوں نے کئی کتب اردو، انگریزی اور عربی میں تحریر کیں جن میں کتاب التصوف، بہار شباب، احکام رمضان، اسلام کی ابتدائی تعلیم، اسلام کے اصول، اسلام اور اشتراکیت، اسلام میں عورت کے حقوق، مرزائی حقیقت کیا ہے، مکالمہ جارج برنارڈ شاہ (انگریزی میں) شامل ہیں۔ (۴۲)

شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ نے فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی کے لیے مؤثر کام کیا چنانچہ تحریر و تقریر کے ذریعے انھوں نے قادیانیت کے فتنے سے لوگوں کو آگاہ کیا، عربی، انگلش اور اردو میں مرزائیوں کے خلاف کتب لکھیں جن کا دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوا اور شائع کرائیں (۴۳)۔ وہ اردو کے ایک اچھے شاعر بھی تھے مگر انھوں نے صرف حمد و نعت ہی میں طبع آزمائی کی۔ شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ ۱۹۵۴ء میں تبلیغی دورہ کے بعد حج و زیارت کے لیے حاضر ہوئے مناسک حج کے بعد مدینہ طیبہ میں حاضری دی اور ۲۲ اگست ۱۹۵۴ء کو وہیں انتقال فرمایا۔ (۴۴)

والدہ ماجدہ شاہ احمد نورانی

مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی والدہ ماجدہ (۱۸۹۸ء۔۲۰۰۱ء) کا تعلق بھی ایک علمی خاندان سے تھا آپ بھی نسلاً صدیقی تھیں۔ وہ مظفر نگر انڈیا میں پیدا ہوئیں۔ (۴۵)

مولانا نورانی کی والدہ ماجدہ اپنے صاحبزادے سے بے پناہ محبت کیا کرتی تھیں حتیٰ کہ شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ کی وفات کے بعد انھوں نے اپنی تمام اولاد کے مقابلے میں مولانا نورانی کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی اور تادم وصال انہی کے پاس رہیں (۴۶)۔ مولانا نورانی کے بارے میں انھوں نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مولانا نورانی کے والد تبلیغی دوروں پر ہوتے تھے اس لیے زیادہ تربیت میں نے کی (۴۷)۔ میرا بیٹا ماشاء اللہ بہت خدمت گزار اور اچھا ہے اس کی ایک محبت بھری نظر سے ہی میری طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ (۴۸)

والدہ ماجدہ آخر عمر تک سوائے سخت حاجت کے گھر سے باہر نہ نکلتی تھیں اور اخبارات اور دنیاوی جھمیلوں سے بہت دور رہتی تھیں۔ سوائے ۱۹۷۳ء ☆ (۴۹) اور ۱۹۷۷ء (۵۰) ☆☆ کے جب انھیں میڈیا نے بھرپور کوریج دی۔ ☆☆☆

مولانا نورانی کی والدہ محترمہ کا انتقال ۲۱ مئی ۲۰۰۱ء کو ۱۰۳ سال کی عمر میں کراچی میں ہوا (۵۱)۔ انھیں حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار مبارک کے احاطے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ (۵۲)

مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی ؒ کے چار صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں ہیں۔ صاحبزادگان کے نام یہ ہیں: (۱) مولانا شاہ محمد جیلانی، (۲) قائد اہلسنّت علامہ شاہ احمد نورانی، (۳) حامد ربانی اور (۴) حماس سبحانی جبکہ صاحبزادیوں میں (۱) لمۃ الصبوح جو کہ مولانا ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاریؒ کی اہلیہ تھیں، (۲) ڈاکٹر عزیزہ اور (۳) ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی شامل ہیں۔ (۵۳)

☆ ۱۹۷۳ء میں بھٹو کے دور حکومت میں ان کے بیٹے مولانا نورانی آئین ساز کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے آئین کو اسلامی بنانے اور پھر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دلوانے کے بعد ٹرین کے ذریعے کراچی پہنچے تو وہ ریلوے اسٹیشن پر اپنے لخت جگر کے استقبال کے لیے تشریف لے آئیں تو حسب معمول ان کے قدموں کو بوسہ دیا۔ ماں نے جو الفاظ ارشاد فرمائے تو وہ تاریخ کا ایک اہم ترین حصہ بن گئے کہ بیٹا میں نے تجھے اسی مقصد کے لیے پالا تھا۔ آج تم نے نبی کریم ﷺ کے دشمن قادیانی کو قانونی طور پر کافر قرار دلوایا ہے۔ تم نے اپنے والد کے مشن کو پورا کر دیا ہے۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔

☆☆ دوسری مرتبہ ۱۹۷۷ء کو مولانا نورانی کو بھٹو حکومت نے پاکستان کے گرم ترین علاقے گڑھی خیرو میں قید کر دیا اور آپ کو انتہائی اذیت ناک ماحول میں رکھا گیا۔ جب عوام کو اس اذیت ناک صورتحال کا اخبارات کے ذریعے انکشاف ہوا تو لوگوں نے پُرزور احتجاج کرنے کے ساتھ ساتھ اظہار ہمدردی کے طور پر آپ کی ۸۰ سالہ والدہ محترمہ کے نام پیغامات بھیجے۔ والدہ نے پریشان ہونے کی بجائے فرمایا کہ مجھے گذشتہ چند روز کے اندر سینکڑوں ٹیلی فون اور پیغامات ملے ہیں جن میں میرے لڑکے نورانی کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے سلسلے میں استفسار کیے گئے تھے اور اظہار ہمدردی کیا گیا تھا۔ میں ان تمام لوگوں کو جو نورانی میاں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی پر آزردہ ہیں انھیں یہ ہدایت کرنا چاہتی ہوں کہ وہ اظہار افسوس کی بجائے خدا کا شکر ادا کریں کہ اس نے ان کے راہنما کو حق بات کہنے اور پھر حق بات کے لیے سختیاں جھیلنے کی سعادت عطا کی۔

☆☆☆ قومی اتحاد کی تحریک کے دوران مولانا نورانی کی والدہ کے خط کا بڑا چرچا رہا۔ خط کے عکس کے لیے دیکھیے ضمیمہ نمبر ۵۔

مولانا شاہ محمد جیلانی کا انتقال لندن میں ہوا اور وہیں مدفون ہیں جبکہ آپ کی بڑی ہمشیرہ لمۃ الصبوح کا انتقال کراچی میں ہوا اور اسلامک سنٹر نارتھ ناظم آباد میں اپنے شوہر نامدار کے ساتھ مدفون ہوئیں۔ اس وقت آپ کے دو برادر شاہ حامد ربانی اور حماد سبحانی اور دو بہنیں ڈاکٹر عزیزہ اور ڈاکٹر فریدہ احمد بقید حیات ہیں۔ مولانا نورانی کی شادی سعودی عرب کے مشہور عالم دین مولانا ضیاء الدین مدنی کے جانشین مولانا فضل الرحمٰن مدنیؒ کی صاحبزادی سے مدینہ منورہ میں ہوئی۔ (۵۴)

ان کی اولاد میں دو صاحبزادے شاہ محمد انس نورانی (پ ۱۹۴۴ء) اور شاہ اویس نورانی (پ ۱۹۷۰ء) جبکہ دو صاحبزادیاں اناس (پ ۱۹۶۸ء) اور ایمان (پ ۱۹۶۹ء) ہیں۔ (۵۵)

آپ اپنے افعال و اعمال، طرز رہن سہن میں بے جان نمود و آرائش کے سخت خلاف تھے آپ کی نجی زندگی انتہائی سادہ اور پروقار تھی۔

مولانا نورانی کی تعلیم و تربیت

مولانا شاہ احمد نورانی کی تعلیم و تربیت ایک علمی و فکری خاندان میں ہوئی (۵۶) ان کی رسم بسم اللہ شریف بزرگوں کے طریقہ کے مطابق چار سال چار ماہ اور چار دن کی عمر میں کی گئی اور آٹھ سال کی عمر میں آپ نے قرآن کریم مکمل طور پر اپنے سینہ میں محفوظ کر لیا تھا (۵۷)۔ حفظ قرآن کریم کے بعد میرٹھ میں ہی آپ نے اپنی ثانوی تعلیم نیشنل عربک کالج سے مکمل کی جہاں ذریعہ تعلیم عربی زبان تھی۔ بعدازاں الٰہ آباد کالج سے گریجویٹ کیا اسی دوران میرٹھ کے مشہور مدرسہ، مدرسہ اسلامیہ قومیہ میں مولانا غلام جیلانی میرٹھیؒ سے درس نظامی کی تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانہ میں مولانا غلام جیلانی نے اپنی شہرۂ آفاق کتب البشیر الکامل، بشیر الناجیہ وغیرہ تحریر فرمائیں۔ جن کو مرتب کرنے اور بارہا مرتبہ املا کرنے کا فیض بھی مولانا نورانی نے انجام دیا۔ (۵۸)

ان کی دستار بندی کے موقع پر ایک پروقار تقریب کا انعقاد ہوا جس میں ان کے استاد علامہ غلام جیلانی میرٹھیؒ، والد ماجد شاہ عبدالعلیم صدیقی، مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی (۱۸۸۳ء۔۱۹۴۸ء) کے علاوہ مولانا مصطفیٰ رضا خانؒ (۱۸۹۲ء۔۱۹۸۱ء) نے خصوصی

شرکت کی (۵۹)۔ اسی دوران والد ماجد انھیں مدینہ منورہ لے گئے جہاں انھوں نے قرأت و تجوید کی تعلیم ایک سال تک مشہور قاری الشیخ حسن الشاعر سے حاصل کی اور خالص عربی طرز میں قرآن پاک پڑھنا سیکھا۔ یہ ان پر اپنے بزرگوں اور اساتذہ ہی کا فیض تھا کہ انھوں نے بیس سال کی عمر میں گریجویشن اور درس نظامی سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ (۶۰)

چنانچہ روزنامہ اخبار دبدبہ سکندری، رام پورہ نے اپنی ۱۷ ستمبر ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں سنی کانفرنس ضلع مین پوری کی روداد شائع کی تو آپ کا نام مولانا قاری احمد نورانی میرٹھی شائع کیا (۶۱)۔ بعدازاں مولانا نورانی نے اپنے والد ماجد کے حکم پر بین الاقوامی زبانیں سیکھنا شروع کیں، اسی لیے آپ کو تقریباً سترہ زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ مولانا نورانی نے اپنی تمام تر رسمی تعلیم میرٹھ میں حاصل کی سوائے فرانسیسی زبان کے چھ ماہ کے کورس کے جو انھوں نے کراچی آ کر کیا (۶۲)۔ ان کا پسندیدہ مضمون حدیث شریف تھا اور ان کی یادداشت میں احادیث طیبہ کا ایک ذخیرہ موجود تھا جسے جا بجا تقاریر اور گفتگو میں استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ پوچھنے پر بتایا کہ میری پسندیدہ کتاب ریاض الصالحین (مشہور مجموعۂ احادیث) ہے۔ (۶۳)

بیعت و ارشاد

شاہ احمد نورانی کو اپنے والد ماجد سے بیعت و خلافت کا شرف حاصل ہوا۔ انھیں سلسلۂ عالیہ قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، شاذلیہ سمیت دیگر سلاسل طریقت میں خلافت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ انھیں مولانا ضیاء الدین مدنی، مولانا فضل الرحمٰن مدنی اور دیگر عربی شیوخ سے بھی اجازت و خلافت حاصل تھی (۶۴)۔ وہ اپنے اوراد و وظائف کے پابند تھے۔ دعائے حزب البحر، قصیدہ بردہ شریف، دلائل الخیرات اور دیگر معمولات پابندی سے ادا کیا کرتے تھے۔ وہ بہت کم لوگوں سے بیعت لیا کرتے تھے بلکہ اکثر و بیشتر ٹال دیا کرتے تھے مگر ان تمام باتوں کے باوجود ان کے مریدین لاکھوں کی تعداد میں دنیا بھر میں موجود ہیں۔ (۶۵)

تحریک پاکستان اور مولانا شاہ احمد نورانی

مولانا نورانی فراغت تعلیم کے بعد ہی سے اپنے والد کی طرح تبلیغ اور ملکی سیاست میں سرگرم ہو گئے اس زمانے میں تحریک پاکستان اپنے عروج پر تھی چنانچہ انھوں نے میرٹھ میں نوجوانوں کی ایک تنظیم نیشنل گارڈز کے نام سے بنائی جو علاقے میں ہندوؤں سے مقابلہ کرنے

مسلم لیگ اور سنی کانفرنس کے جلسوں کا انتظام سنبھالنے پر مامور تھی (۶۷)۔ اسی دوران آپ ہندوستان کے سنیوں کی نمائندہ تنظیم آل انڈیا سنی کانفرنس کے پلیٹ فارم سے عملی طور پر تحریک پاکستان میں شامل ہوئے چنانچہ آل انڈیا سنی کانفرنس نے ضلع مین پوری میں ۲۱ تا ۲۵ نومبر ۱۹۴۵ء کو خانقاہ رشیدیہ میں سنی کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں آپ نے شرکت کی اور اخبارات نے آپ کا نام واضح طور پر شائع کیا۔ (۶۸)

اس کانفرنس میں مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی، مولانا امجد علی الاعظمی (۱۸۷۸ء۔۱۹۴۸ء) سید محمد شاہ کچھوچھوی، مولانا ابراہیم رضا خان بریلوی، مولانا عارف اللہ شاہ قادری میرٹھی، مفتی احمد یار خان نعیمی، مولانا مصباح الحق پھپھوندوی، مفتی آگرہ عبدالحفیظ حقانی جیسے اکابرین شریک تھے۔ (۶۹)

۱۹۴۶ء میں حکومت برطانیہ نے مسلمانوں کے لیے ایک زکوٰۃ بل نافذ کیا جس کی رو سے مسلمانوں سے جبراً زکوٰۃ وصول کی جاتی اور اپنی مرضی سے خرچ کی جاتی جس پر علماء اہلسنّت نے ہندوستان بھر میں بھرپور احتجاج کیا اس سلسلہ میں مولانا نورانی نے مدرسہ مسکینیہ دھوراجی کاٹھیاواڑ میں ۱۳ نومبر ۱۹۴۶ء کو منعقدہ ایک اجلاس میں خصوصی شرکت کی اور اپنی تقریر میں اس بل کو مداخلت فی الدین قرار دیا اور اسے واپس لینے کا بھرپور مطالبہ کیا (۷۰)۔ مولانا نورانی نے ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں، جب پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان (۱۸۹۸ء۔۱۹۵۱ء) میرٹھ ڈویژن میں ضلع مظفر نگر کی نمائندگی کرتے ہوئے مرکزی اسمبلی کے امیدوار تھے تو ان کی انتخابی مہم میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا اور نیشنل گارڈز تنظیم کے رضا کاروں کے ساتھ گاؤں گاؤں، قریہ قریہ الیکشن مہم چلائی۔ (۷۱)

مولانا شاہ احمد نورانی اور تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء

قادیانی فتنہ کا آغاز ہندوستان کے ایک ضلع قادیان سے ہوا (۷۲)۔ انگریزوں نے مسلمانانِ برصغیر کی اجتماعی قوت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے ایک حقیر اور عامیانہ شخصیت کے حامل مرزا غلام احمد (۱۸۴۰ء۔۱۹۰۸ء) نامی شخص کی پشت پناہی کی جس نے قادیانی مذہب کی بنیاد رکھی اور بتدریج نبی بن بیٹھا (۷۳)۔ اس نے دعویٰ نبوت سے قبل ۱۸۸۰ء میں اپنی کتاب "براہین احمدیہ" کے دو حصے شائع کرائے تاکہ رائے عامہ کا تاثر لیا جا سکے۔ اسی سال

اس نے ''ملہم من اللہ'' اور ''مجدد'' ہونے کا دعویٰ کر دیا (۷۴)۔ ابھی تک چونکہ اس کے حقیقی خیالات سامنے نہیں آئے تھے۔ اس لیے عامۃ المسلمین نے اسے ایک عالم دین کے طور پر لیا۔ بعدازاں اس نے اپنی منصوبہ بندی کو آگے بڑھاتے ہوئے ۱۸۸۸ء میں یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیعت لینے کا حکم دیا ہے (۷۵)۔ ۱۸۹۱ء میں اس نے اپنے ''مسیح موعود'' ہونے کی خبر دی اور ''ظلی نبی'' ہونے کی درفنطنی چھوڑی (۷۶)۔ ابھی تک اس کے خیالات چونکہ بہت تھوڑے لوگوں تک محدود تھے، اس لیے اسے اپنے مشن کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہ ہوئی تاہم اس کے حوصلے بڑھ گئے اور اس نے اپنی ۲۱ برس کی محنت کو بارآور کرنے کے لیے ۱۹۰۱ء میں حقیقی معنوں میں نبی ہونے کا اعلان کر دیا۔ جسے اس کے حلقہ احباب نے خاصی پذیرائی بخشی (۷۷)۔

دراصل برطانوی اقتدار کو برصغیر میں خطرہ صرف اور صرف مسلمانوں کے جذبہ جہاد سے تھا، جس کی بیخ کنی کے لیے قادیانی فتنہ تراشا گیا اسی لیے ابتدائی ایام میں ہی مرزا قادیانی نے حکم جہاد کی تنسیخ کر دی۔ جس پر مسلم رائے عامہ کا ماتھا ٹھنکا (۷۸)۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں برصغیر میں پہلی بار مجلسِ احرار اسلام (ق ۱۹۲۹ء) نے اس فتنہ کے خلاف آواز اٹھائی جس کی پاداش میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری (۱۸۹۱ء۔۱۹۶۱ء) کو مرزائی رہنما مرزا بشیر الدین محمود (پ ۱۸۸۹ء) اور سر ظفر اللہ (۱۸۹۳ء۔۱۹۸۵ء) کے ایماء پر حکومت برطانیہ نے گرفتار کر لیا اور ان پر مقدمہ بھی چلا تاہم عوامی دباؤ پر انھیں رہا کر دیا گیا (۷۹)۔ تقسیم ہند کے بعد قادیانیوں نے لاہور میں ڈیرے جما لیے۔ انھیں مرزا بشیر الدین محمود اور وزیر خارجہ سر ظفر اللہ کی مکمل سرپرستی اور رہنمائی حاصل رہی۔ (۸۰)

قیام پاکستان کے بعد قادیانیوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے خلاف پہلی آواز مئی ۱۹۵۱ء میں اٹھی جب لاہور میں برکت علی محمڈن ہال (ق ۱۹۰۵ء) میں مختلف علماء کی طرف سے ایک کنونشن کا اہتمام کیا گیا (۸۱)۔ جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شریک ہوئے۔ اسی کنونشن میں مرزائی گروہ کے عزائم کا جائزہ لیا گیا۔ مرزا بشیر نے جوابی وار کے طور پر علماء کرام کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا تاکہ قادیانیوں کے خلاف علماء کرام متحد نہ ہوسکیں۔ (۸۲)

لیکن حقیقت یہ تھی کہ علمائے کرام کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے مرزائی سہم گئے اور انھوں نے کچھ عرصہ تک اپنی کارروائیاں کھلے بندوں انجام دینے سے گریز کیا۔ چنانچہ ڈیڑھ

سال تک خاموشی اختیار کرنے کے بعد ۱۸ مئی ۱۹۵۲ء کو احمدیوں نے کراچی میں ایک جلسہ عام کا انعقاد کیا جسے مکمل سرکاری سرپرستی حاصل رہی (۸۳)۔ اس جلسہ سے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ نے بھی خطاب کیا۔ سرکاری حمایت نے عامۃ الناس کے جذبات کو انتہائی مجروح کر دیا۔ چنانچہ ردعمل کے طور پر لوگ احتجاج کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ حکومت نے وسیع پیمانے پر لوگوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ احتجاج کے ابتدائی روز ہی پچاس سے زائد افراد کو گرفتار کر لیا گیا جس نے عوامی جذبات کو مشتعل کر دیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر بندر روڈ پر واقع احمدی کتب خانے کو شدید نقصان پہنچایا گیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ قادیانی سیلاب کے آگے بند باندھا جائے چنانچہ ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو علمائے کرام نے لاہور میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی تاکہ ایک مشترکہ لائحہ عمل کے ذریعے اس فتنے کا سدباب کیا جا سکے (۸۴)۔ اس کانفرنس کی صدارت سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) نے کی اور آئندہ ایک عظیم الشان کنونشن کے انعقاد کے لیے ایک بورڈ تشکیل دیا (۸۵)۔ اس کے اراکین میں سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع اوکاڑوی (۱۹۲۹ء۔۱۹۸۴ء)، مولانا حامد بدایونی، علامہ یوسف کلکتوی، مفتی صاحب داد خان، مولانا سلطان احمد، مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی، مولانا لال حسین اختر، الحاج ہاشم گزدر، مفتی جعفر حسین مجتہد اور مولانا احتشام الحق تھانوی (۱۹۱۵ء۔۱۹۸۰ء) شامل تھے (۸۶)۔ جبکہ کنونشن میں درج ذیل ۱۲ مذہبی سیاسی جماعتوں نے شرکت کی:

(۱) جمعیت علمائے پاکستان (۲) جمعیت علمائے اسلام
(۳) جماعت اسلامی (۴) تنظیم اہل سنت والجماعت
(۵) جماعت اہل سنت پاکستان (۶) جمعیت اہل حدیث
(۷) موتمر اہل حدیث پنجاب (۸) ادارہ تحفظ حقوقِ شیعہ پنجاب
(۹) مجلس تحفظ ختم نبوت پنجاب (۱۰) مجلس احرار اسلام
(۱۱) جمعیت العربیہ (۱۲) جمعیت الفلاح۔ (۸۷)

علمائے کرام نے حکومت کے سامنے متفقہ مطالبات پیش کیے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے۔
۲۔ مسٹر ظفر اللہ کو وزارت خارجہ سے ہٹایا جائے۔

۳۔ ربوہ میں جو سرکاری زمین قادیانیوں کو کوڑیوں کے بھاؤ دی گئی ہے، واپس لی جائے اور ربوہ کو خالص قادیانی بستی بننے سے روکا جائے۔(۸۸)

حکومت پر دباؤ بڑھانے کی غرض سے علمائے کرام نے جلسے منعقد کرنے اور جلوس نکالنے کا آغاز کر دیا۔ اِن جلسے جلوسوں کی قیادت نمایاں اور مدبر شخصیات نے کی۔ ان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۷۹ء)، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا شاہ احمد نورانی، علامہ احمد سعید کاظمی، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، مفتی محمد حسین نعیمی (پ ۱۹۲۳ء)، علامہ سید محمود احمد رضوی، مولانا محمد داؤد غزنوی، خواجہ غلام نظام الدین تونسوی، مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مولانا عبدالستار نیازی (۱۹۱۵ء۔ ۲۰۰۲ء)، میاں جلیل احمد شرقپوری، شیخ حسان الدین، مسٹر تاج دین، مفتی اعجاز ولی خان (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۷۳ء)، مولانا منظور احمد ہاشمی، مولانا ابراہیم علی چشتی، مولانا غلام قادر اشرفی، پیر سید محمد غلام محی الدین گولڑوی، پیر محمد فضل شاہ جلال پوری، مولانا الحامد بدایونی، خواجہ قمر الدین سیالوی، صوفی ایاز خان نیازی، مولانا عارف اللہ شاہ قادری، مولانا اختر علی، علامہ عبدالغفور ہزاروی، مولانا غلام محمد ترنم (۱۹۰۰ء۔ ۱۹۵۹ء) قابل ذکر ہیں۔(۸۹)

ان دنوں مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری مجلس تحفظ ختم نبوت کے صدر تھے۔ تحریک ختم نبوت نے فروری ۱۹۵۳ء میں خاصا زور پکڑا، اس سلسلے میں ۱۴۰ افراد گرفتار ہوئے (۹۰)۔ یکم مارچ کو لاہور میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا گیا اور اسی دن قادیانی مخالف جلوس پر پولیس کے وحشیانہ تشدد کی وجہ سے کئی افراد زخمی ہوئے (۹۱)۔ مولانا اختر علی اور دو سو کے قریب رضا کار گرفتار کر لیے گئے (۹۲)۔ ☆

۴ مارچ کو ہنگاموں میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب مسجد وزیر خاں لاہور کے باہر ڈی ایس پی فردوس شاہ کو گولی مار دی گئی، ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے پولیس کی جوابی فائرنگ سے ایک شخص ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے۔(۹۳) تحریک میں بڑھتی ہوئی شدت کے پیش نظر پنجاب حکومت نے اسے کچلنے کا فیصلہ کر لیا۔(۹۴)

☆ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے دوران عوامی جذبات کا عالم یہ تھا کہ منیر تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق ۶ مارچ ۱۹۵۳ء سے پہلے صوبہ بھر میں ۳۹۰ جلسے منعقد ہوئے جن میں سے ۱۶۷ کا اہتمام مجلس احرار کی مختلف شاخوں نے کیا۔ (خلاصہ منیر تحقیقاتی عدالتی رپورٹ، لاہور، س ن، ص ۱۹۲۔۱۹۶)

چنانچہ پنجاب میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا (۹۵) مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل اعظم خان نے احتجاجی مظاہرین سے غیر ملکی فاتح جرنیل کی طرح سلوک کیا (۹۶) اور طاقت کے استعمال سے تحریک کو سختی سے کچل دیا۔ بڑے بڑے علمائے کرام کو گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا عبدالستار خان نیازی پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور انھیں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ دیگر علماء کو قید کی سزا ہوئی۔ یوں وقتی طور پر یہ تحریک دبا دی گئی (۹۷)۔ مولانا نورانی اگرچہ ان دنوں مذہبی اور سیاسی محاذ پر نمایاں نہ تھے۔ تاہم انھوں نے تحریک ختم نبوت میں اپنی سرگرم شرکت سے اپنے محافظ ختم نبوت اور عاشق رسول ہونے کا عملی ثبوت دیا۔ انھوں نے ارتداد فتنہ ''قادیانیت'' کے لیے نہ صرف یہ کہ نعرہ کلمہ حق بلند کیا بلکہ گرفتاری بھی پیش کی۔ آپ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ذکر جسٹس منیر انکوائری رپورٹ میں موجود ہے۔(۹۸)

مولانا شاہ احمد نورانی اور میدانِ سیاست (۱۹۵۳ء......۱۹۷۰ء)

مولانا شاہ احمد نورانی نے ملکی سیاست کی ابتداء جمعیت علماء پاکستان کے پلیٹ فارم سے کی اور تادم واپسیں اسی پلیٹ فارم سے سیاست کرتے رہے۔ انھوں نے دوسروں کی طرح جمعیت میں کوئی دھڑا نہ بنایا نہ ہی کبھی گروپ بندی کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ ۱۹۵۳ء میں جمعیت کراچی شاخ کے عہدیدار رہے۔ ☆ (۹۹)

۱۱ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو جمعیت علماء پاکستان کی طرف سے یوم حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جمعیت علماء پاکستان کی چھٹی سالانہ کانفرنس بلائی گئی۔ اس وقت مولانا نورانی جمعیت علمائے پاکستان کے آفس سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے اور اس کانفرنس کی نشر و اشاعت کمیٹی کے کنوینر تھے۔ انھوں نے اس کی نشر و اشاعت اور پبلسٹی میں بھرپور کردار ادا

☆ ۱۹۷۰ء میں مولانا نورانی مرکزی سینئر نائب صدر بنائے گئے انتخابات کے بعد آپ کو پارلیمانی پارٹی کا سربراہ مقرر کیا گیا اور پھر جب ۱۹۷۳ء میں صدر جمعیت خواجہ قمر الدین سیالویؒ نے علالت کی وجہ سے جمعیت کی صدارت سے استعفیٰ دیا تو آپ کو خانیوال کنونشن میں جمعیت کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس اجلاس میں خواجہ قمر الدین سیالویؒ نے فرمایا تھا کہ مولانا نورانی ایک عاشق رسول ہیں اور قیادت و سیادت کا عمامہ انہی کے سر پر سجتا ہے۔

کیا۔☆ (۱۰۰) ۱۹۵۵ء میں جب ملک کو دو یونٹوں میں تقسیم کیا گیا تو آپ کو مغربی پاکستان میں جمعیت علماء پاکستان کا سینئر نائب صدر منتخب کیا گیا۔☆☆ (۱۰۱)

ان دنوں مولانا نورانی کے معمولات یوں تھے کہ وہ کچھ عرصہ اپنے وطن پاکستان میں گزارتے تھے اور کچھ عرصہ بیرون ملک تبلیغ میں مصروف رہتے (۱۰۲)۔ جب وہ وطن تشریف لاتے تو خاموش تماشائی بن کر تو بیٹھ نہیں سکتے تھے کہ یہ ان کی متحرک اور فعال زندگی اور مقصد دینی کے خلاف تھا۔ اس لیے یہاں رہ کر وہ مذہبی و نیم سیاسی طور پر کام کرتے رہتے۔ چنانچہ ابتداء ہی سے جمعیت علماء پاکستان سے وابستہ رہے لہٰذا اسی پلیٹ فارم سے کام کرتے رہے۔ اسی دوران میں جب ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء نافذ کیا گیا اور تمام سیاسی جماعتیں کالعدم قرار دے دی گئیں تو اس کی زد میں جمعیت علماء پاکستان بھی آ گئی۔☆☆☆ (۱۰۳)

لیکن ۱۹۶۴ء میں جب سیاسی جماعتیں بحال کر دی گئیں تو وہ دوبارہ جمعیت کے پلیٹ فارم پر آ گئے جبکہ مذہبی طور پر انجمن تبلیغ اسلام کے لیے کام کرتے رہے (۱۰۴)۔ علماء اہلسنّت اس سوچ میں تھے کہ کوئی ایسی مستقل تنظیم ہونی چاہیے جو جمعیت علماء پاکستان کے متبادل ہو، تاکہ جب کبھی ملک میں سیاسی طور پر کوئی بحران ہو، سیاسی تنظیموں پر پابندی عائد کی جائے تو اس متبادل قوت کو استعمال کیا جا سکے (۱۰۵)۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء میں مولانا نورانی اور ان کے دیگر رفقاء نے مل کر قصاباں مسجد کراچی صدر میں جماعت اہلسنّت پاکستان کے نام سے

☆ جب ۱۹۵۴ء میں مولانا نورانی کے والد ماجد کا انتقال ہوا تو آپ نے اپنے والد ماجد کے مشن تبلیغ دین کا بیڑہ اٹھایا جس کی وجہ سے آپ اکثر و بیشتر مختلف ممالک کے تبلیغی دوروں پر ہوتے مگر آپ بیرون ممالک قادیانیوں کی سرگرمیوں پر پوری توجہ رکھتے اور مسلمانوں کو ان کے خطرناک عزائم سے آگاہ کرتے رہے۔ ۱۹۶۸ء میں آپ نے اسلامک ریویو لندن کے قادیانی ایڈیٹر سے ٹرینی ڈاڈ میں ساڑھے پانچ گھنٹے کا طویل مناظرہ کیا جس میں قادیانی ایڈیٹر اپنی کتابیں چھوڑ کر بھاگ گیا اور اس میں فتنہ قادیانیت کو زبردست ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی قادیانی مشرف بہ اسلام ہوئے۔

☆☆ اس کانفرنس میں اس وقت تقریباً ۷۰ ہزار افراد نے شرکت کی اور اس کی پوری کارروائی ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی جو کہ آپ کی حسن کارکردگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

☆☆☆ اس دوران مجاہد ملت حضرت علامہ عبدالحامد بدایونی، مولانا نورانی، عبدالمصطفیٰ الازہری، علامہ شفیع اوکاڑوی، مفتی شجاعت علی قادری، مولانا سعادت علی قادری، مولانا محمد حسن حقانی وغیرہ نے مل کر ایک تنظیم بنام انجمن تبلیغ اسلام کی بنیاد ڈالی۔

ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی جس کا کام مذہبی طور پر عوام اہلسنّت کو منظم کرنا اور دینی لٹریچر کی اشاعت وغیرہ تھا جبکہ سیاسی طور پر جمعیت علماء پاکستان موجود تھی۔ جو کئی دھڑوں میں بٹ جانے کی وجہ سے فعال سیاسی کردار ادا نہیں کر پا رہی تھی لہٰذا مولانا نورانی اور ان کے رفقاء نے ان اختلافات سے اپنے آپ کو دور رکھنے کے لیے بھی جماعت اہلسنّت کے قیام کا فیصلہ کیا۔☆ (۱۰۶)

اسی دوران میں مولانا نورانی کی مدینہ منورہ میں شادی ہوگئی تو انھوں نے وہیں رہائش اختیار کر لی اور پاکستان آنا بہت ہی کم کر دیا چونکہ آپ کی والدہ ماجدہ اور دیگر افراد کراچی ہی میں مقیم تھے اور پھر پاکستان سے علماء کرام جب زیارت مدینہ منورہ کے لیے حاضر ہوتے تو آپ سے اصرار کرتے کہ آپ کی پاکستان میں ضرورت ہے آپ وہاں چلے چلیں یہ اصرار بڑھتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ شرق پور شریف کے سجادہ نشین میاں جمیل احمد شرقپوری (پ ۱۹۳۵ء) جو کہ مولانا نورانی کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور پیر سید حامد حسین شاہ اور دیگر علماء اہلسنّت نے بہت اصرار کیا تو مولانا نورانی نے اپنے سسر مولانا ضیاء الدین مدنیؒ (۱۹۲۵ء۔۲۰۰۱ء) کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا تو پھر انھوں نے بھی یہی حکم دیا کہ آپ بالکل پاکستان تشریف لے جائیں اور وہاں آپ کی اشد ضرورت ہے آپ وہاں جا کر دینی و ملی خدمات سرانجام دیں۔ (۱۰۷)

چنانچہ پھر آپ ۱۹۶۸ء میں مستقل طور پر پاکستان تشریف لے آئے اور واپس آ کر جماعت اہلسنّت کے تحت کام کرنا شروع کر دیا اس وقت جمعیت علماء پاکستان اپنی تاریخ کے انتہائی نازک دور سے گزر رہی تھی اور اس وقت اس کے درج ذیل گروپ کام کر رہے تھے۔ (۱۰۸)

(۱) صاحبزادہ فیض الحسن گروپ، (۲) علامہ عبدالحامد بدایونی گروپ، (۳) علامہ عبدالغفور ہزاروی گروپ، (۴) علامہ محمود رضوی گروپ، (۵) مولانا خلیل احمد قادری گروپ اور (۶) مولانا سید محمود احمد شاہ گجراتی گروپ۔ ہر گروپ اپنے نہج پر کام کر رہا تھا، انتشار و

☆ اس کے مؤسسین میں مولانا نورانی، مولانا سعادت علی قادری، مولانا محمد شفیع اوکاڑوی، علامہ محمد حسن حقانی، قاری نثار الحق، مولانا جمیل احمد نعیمی (پ ۱۹۳۷ء)، علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری (۱۹۱۸ء۔۱۹۸۹ء)، قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی، قاری مصلح الدین صدیقی، مفتی سید شجاعت علی قادری، مفتی غلام قادر صابری کشمیری شامل تھے۔ جماعت اہلسنّت کے پہلے صدر مولانا شفیع اوکاڑوی اور پہلے ناظم اعلیٰ مولانا سید سعادت علی قادری نامزد کیے گئے۔

اختلاف موجود تھا مگر اس دوران ایسی شخصیات بھی تھیں جن کی خواہش تھی کہ وہ اہلسنّت کو کسی طرح متحد کر سکیں ان میں حضرت علامہ ابوالبرکات سیّد احمد قادری (۱۹۰۶ء۔۱۹۷۸ء) اور شیخ الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (۱۰۹)

چنانچہ علامہ سید ابوالبرکات نے دفتر حزب الاحناف لاہور میں ۴ اپریل ۱۹۷۰ء کو تمام گروپوں کے رہنماؤں کا ایک تاریخی اور یادگار اجلاس طلب فرمایا اور بذات خود تمام صدور سے رابطہ کر کے ان کو اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی (۱۱۰)۔ آپ کی بزرگی اور علمی وقار کی تعظیم کرتے ہوئے تمام قائدین اجلاس میں شریک ہوئے سوائے مولانا عبدالحامد بدایونی کے۔ جنھوں نے نجی مصروفیات کی بناء پر اجلاس میں شرکت سے معذوری کا اظہار کیا اور ابوالبرکات کو مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ اجلاس کا انتہائی منظم اور خوبصورت انتظام کیا گیا۔ اس یادگار اجلاس کی صدارت کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی کا نام پیش کیا گیا۔ جس کی تمام افراد و قائدین نے تائید کی اور ان پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ اس طرح انھیں متفقہ طور پر جمعیت علمائے پاکستان کا مرکزی سینئر نائب صدر چن لیا گیا۔ (۱۱۱)

مولانا نورانی نے اتنے اکابرین کی موجودگی میں انہی بزرگوں کے ارشاد پر اجلاس کی صدارت سنبھالی۔ اجلاس کی کارروائی انھوں نے اس طرح چلائی کہ کسی کی حق تلفی نہ ہوئی، کوئی یہ اعتراض نہ کر سکا کہ کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ اختلافات ونفرت کو مولانا نورانی نے اپنے سحر انگیز خطاب اور اپنے بھرپور تجزیوں اور تبصروں سے ختم کر دیا۔ تمام گروپوں کے رہنماؤں نے وہاں استعفیٰ دیا اور مسلک وملت کے وسیع تر مفاد میں اپنے اپنے گروپوں کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا (۱۱۲)۔ اسی اجلاس میں علامہ محمود احمد رضوی کو کنوینر نامزد کر دیا گیا اور ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جسے جمعیت علماء پاکستان کے دستور ومنشور کو مرتب کرنے کا فریضہ سونپا گیا (۱۱۳)۔ اس کمیٹی کا چیئرمین مولانا نورانی کو بنایا گیا جبکہ دیگر ارکان مولانا سید محمود احمد رضوی، مولانا غلام علی اوکاڑوی، مولانا محمد حسن حقانی، علامہ غلام مہر علی اور مولانا سید شجاعت علی قادری تھے۔ اس اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ جمعیت علماء پاکستان کو سیاسی سطح پر مضبوط ترین ہونا چاہیے اور غیر اسلامی نظریات کا بھرپور توڑ کیا جائے (۱۱۴)۔ اس وقت ملک کمیونزم اور سوشلزم کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ نظریات کے حامل سیاستدان ملک میں اپنا اپنا نظام لانے کے لیے سرگرداں تھے۔ چنانچہ ان دنوں باطل نظریات کے توڑ کے لیے ٹوبہ

ٹیک سنگھ میں سنی کانفرنس کرنے کا اعلان کیا جہاں کچھ عرصہ قبل نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر عبدالحمید بھاشانی (۱۸۷۹ء۔۱۹۷۶ء) نے کمیونسٹ نظام کو ملک میں نافذ کرنے کا عہد کر لیا تھا اور ملک میں سرخ انقلاب لانے کا اعلان کیا تھا اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کا نام لینن گراڈ رکھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ (۱۱۵)

۴ اپریل ۱۹۷۰ء کو اعلان ہوا کہ دو ماہ ۱۳، ۱۴ جون کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں سنی کانفرنس کا انعقاد کیا جائے گا۔ تمام علماء اہلسنّت نے ایک مربوط ومنظم شکل میں اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں، مولانا نورانی نے بھی اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کی بھرپور کوششیں کیں۔ (۱۱۶) سنی کانفرنس ٹوبہ ٹیک سنگھ میں جمعیت علماء پاکستان کے مرکزی انتخابات کرائے گئے، جس کی رو سے خواجہ قمر الدین سیالوی صدر، مولانا نورانی سینئر نائب صدر اور پیر کرم شاہ الازہری (پ ۱۹۱۸ء) نائب صدر جبکہ مولانا سید محمود احمد رضوی ناظم اعلیٰ قرار پائے (۱۱۷)۔ اسی کانفرنس میں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اب جمعیت علماء پاکستان مکمل طور پر ایک سیاسی جماعت ہوگی اور چھ ماہ بعد ملک میں ہونے والے عام انتخابات میں بھرپور حصہ لے گی (۱۱۸)۔ مولانا نورانی اس کانفرنس میں اپنی حقیقی شکل میں عوام اہلسنّت کے سامنے آئے یہ پہلا موقع تھا کہ جب لوگوں نے انھیں کو کسی جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا ان کی تقریر دیگر تمام تقریروں پر بھاری تھی (۱۱۹)۔

اس موقع پر انھوں نے کہا:

"اے لوگو! یہ اصطلاح بدل دو کہ کمیونزم اور سوشلزم ہماری لاشوں پر آئے گا بلکہ یوں کہو کہ ہم نظام مصطفیٰ ﷺ کو کمیونسٹوں کی لاشوں پر تعمیر کریں گے اور سوشلزم کے نام پر جو فتنہ بھٹو کی شکل میں نمودار ہوا ہے وہ اپنے عبرتناک انجام سے دوچار ہوگا اور ہم انشاء اللہ نظام مصطفیٰ ﷺ کا آفتاب اپنی آنکھوں سے طلوع ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔" (۱۲۰)

انتخابات ۱۹۷۰ء اور سیاسی بحران ۱۹۷۱ء

دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں ملک میں ایک حیرت انگیز تبدیلی رونما ہوئی کہ صرف چھ ماہ قبل سیاسی منظر پر ابھرنے والی جماعت ایک بڑی سیاسی پارٹی بن کر منصہ شہود پر نمودار ہوئی جس نے قومی اسمبلی کی سات نشستیں پنجاب اسمبلی کی چار نشستیں اور سندھ اسمبلی کی

چھ نشستیں حاصل کیں (۱۲۱)۔ مولانا نورانی کو قومی اسمبلی میں جمعیت علماء پاکستان کی سات رکنی پارلیمانی پارٹی کا سربراہ بنایا گیا اور اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ جمعیت علماء پاکستان حزب اختلاف کا کردار ادا کرے گی اور بھٹو کے استعماری نظریات و کردار کی بھرپور اور مؤثر مخالفت کرے گی۔ (۱۲۲)

اسی دوران جمعیت کے ارکان اسمبلی کا تعارف کرانے کے لیے مقامی ہوٹل میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کو دعوت دی گئی اس تعارفی اجلاس میں مولانا شاہ احمد نورانی بھرپور انداز میں سامنے آئے۔ ☆ (۱۲۳)

مولانا نورانی نے اسمبلی کے اجلاس سے قبل ہی اپنی قابلیت اور خداداد صلاحیت کا لوہا منوالیا۔ ادھر دوسری جانب ملک کی یکجہتی اور وحدت سخت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان سیاسی سطح پر خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ اقتدار پرست افراد اپنے غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر اس ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی منصوبہ بندی کرنے لگے اور نظریہ پاکستان کو ختم کرنے کے درپے ہونے لگے تو آپ نے اس مشکل صورت حال میں ملک کے تمام سیاستدانوں سے گفت وشنید اور تبادلہ خیال کا سلسلہ شروع کر دیا تا کہ ملک دشمن عناصر کی سازشوں کو ناکام بنایا جاسکے۔ (۱۲۴)

اللہ تعالیٰ نے مولانا نورانی کو دیگر خصوصیات کے علاوہ دوسروں کو قائل کرنے کی بھی بے پناہ صلاحیت بخشی تھی۔ وہ سلجھے ہوئے سیاستدان تھے بلاوجہ ضد اور ہٹ دھرمی آپ میں نہیں تھی لیکن اپنے ٹھوس موقف اور اپنے واضح اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہتے تھے اور مذاکرات چونکہ سیاست کا اہم حصہ ہیں اسی لیے آپ ۲۸ جنوری ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمٰن سے تبادلہ خیال کے لیے ڈھاکہ گئے اور شیخ مجیب الرحمٰن (۱۹۲۲ء۔۱۹۷۵ء) سے مذاکرات کیے۔

☆ اسی تقریب میں پریس ٹرسٹ کے ایک سرخ (کمیونسٹ) چیف رپورٹر موجود تھے جو قومی اسمبلی میں منتخب ہونے والے باریش ارکان کی گنتی کر رہے تھے بالخصوص اس پر تاسف کا اظہار کر رہے تھے کہ یہ داڑھیوں والے انگریزی نہیں جانتے اس لیے کارروائی کے دوران خاموش رہ کر، نہ صرف اسمبلی کی سطح پست رکھیں گے بلکہ اپنے حلقوں کے بدقسمت عوام کی ترجمانی بھی نہیں کر سکیں گے۔ مولانا نورانی پہلے مقرر تھے انھوں نے آتے ہی امریکی لہجے میں شستہ انگریزی کو ذریعہ کلام بنایا تو وہ سرخ رپورٹر چند لمحوں تک منہ کھولے آنکھیں پھاڑے اپنی سماعت پر زور دیتا رہا لیکن جلد ہی دوسرے رپورٹروں کے ہلکے ہلکے قہقہوں نے اسے حالات کی سنگینی کا احساس دلایا۔ (ہفت روزہ زندگی ۲۴۔۳۰ ستمبر ۱۹۷۳ء)

جس کے بعد مولانا نورانی کے سامنے پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ شیخ مجیب اس وقت تک ملک توڑنا نہیں بلکہ بچانا چاہتے تھے جبکہ صدر یحییٰ خان (۱۹۱۷ء۔۱۹۸۰ء) جان بوجھ کر اسمبلی کے اجلاس کو بلانے میں تاخیر کر کے ملک کو خانہ جنگی میں جھونکنا چاہتے تھے۔ (۱۲۵)

چنانچہ مولانا نورانی نے تمام سیاستدانوں سے تبادلہ خیال کے بعد یحییٰ خان سے فروری ۱۹۷۱ء میں ملاقات کی اور انھیں حالات کی سنگینی کا احساس دلایا اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ فی الفور اسمبلی کا اجلاس طلب کریں اور اقتدار کو عوام کے نمائندوں کے حوالے کریں تا کہ ملک میں سیاسی استحکام پیدا ہو اور ملک خانہ جنگی سے محفوظ رہ سکے۔ اس ملاقات کے بعد انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ جنرل یحییٰ خان اسمبلی کے بلائے گئے اجلاس کو ملتوی کرنا چاہتا تھا مگر مولانا نورانی نے اس پر بھرپور طریقے سے دباؤ ڈالا اور اسے حالات کی سنگینی کا احساس دلایا کہ یہ عمل ملک پاکستان کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوگا۔ (۱۲۶)

جنرل یحییٰ خان سے مولانا نورانی کی ملاقات ان کی سیاسی بصیرت، جرأت و بہادری، بے خوفی اور مذہبی حمیت کا بھرپور اظہار ہے۔ انھوں نے جس انداز سے یحییٰ سے گفتگو کی تھی اس طرح گفتگو کرنے کا کوئی سیاستدان سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا اعتراف یحییٰ خان نے بھی کیا (۱۲۷)۔ اس کے بقول ”جب مشرقی پاکستان کے لیڈروں سے مذاکرات کے دوران مغربی پاکستان کے تمام لیڈر خاموش رہتے تھے تو شاہ احمد نورانی وہ واحد شخص تھا جو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا اور حالات کا صحیح تجزیہ اس نے پیش کیا تھا۔“ (۱۲۸)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں قادیانی کردار اور مولانا شاہ احمد نورانی

سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں جہاں کئی افراد اور ادارے ملوث تھے وہاں قادیانیوں نے بھی اپنا گھناؤنا کردار ادا کیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے اس سلسلے میں قادیانیوں کے گھناؤنے کردار کو ہر پلیٹ فارم پر واضح کیا۔ مولانا نورانی کے خیال میں ”سقوطِ مشرقی پاکستان کا جہاں تک تعلق ہے اس کے ذمہ دار سو فیصدی قادیانی ہیں اس کے دلائل یہ ہیں کہ پاکستان کا بجٹ بھی تیار کیا جاتا ہے اور جو بھی پلاننگ ہوتی رہتی ہے اس کے چیئرمین ہمیشہ ایم ایم احمد رہے اور مشرقی پاکستان کو ہمیشہ شکایت رہی کہ بجٹ میں ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ مرزائی جان بوجھ کر یہ کوشش کرتے رہے کہ جس قدر غلط فہمیاں مسلسل بڑھتی چلی جائیں

اور جتنی غلط فہمیاں بڑھیں گی اتنی ہی دوریاں بڑھیں گی۔ اس سلسلہ میں ایم ایم احمد کا کردار بہت گھناؤنا ہے۔ اس شخص نے انتہائی باغیانہ کردار ادا کیا۔ ڈھاکہ جانے کے بعد مزید اندازہ ہوا کہ قادیانی واقعی بڑا گھناؤنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ مثلاً ڈھاکہ میں کسی بھی سمجھدار شخص سے بات کی جائے تو وہ ایم ایم احمد کی شکایت کرتا تھا۔ جن دنوں ۲۳ مارچ کو صدر یحییٰ ڈھاکہ میں موجود تھے اس زمانے میں ایم ایم احمد بھی وہاں موجود تھا۔ چنانچہ تمام اخبارات نے اس بات پر احتجاج کیا کہ اقتصادی مشیر کا اس موقع پر کیا کام ہے۔ مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۰ء کے سیلاب میں بہت زبردست نقصان ہوا۔ اپیل پر دنیا بھر کے ممالک سے امداد آنا شروع ہوئی۔ پوری امداد کے خرچ کرنے کا انتظام ایم ایم احمد کے سپرد کیا گیا۔ اس سے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو بہت نفرت ہوئی اور انھیں اس بات سے سخت افسوس ہوا کہ ایسے شخص کے سپرد امداد کا کام سونپا گیا ہے جو ہمیشہ ان کے ساتھ ناانصافیاں کرتا رہا ہے۔ بہت سارا امدادی سامان دنیا بھر سے بھیک مانگتے رہیں ملک قرضوں کے نیچے دبا رہے اور قرضہ استعمال بھی نہ ہو۔ پیپلز پارٹی کے مرکزی وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن کا بیان اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ماضی میں اقتصادیات پر بھی قابض ہیں اور اس کی غلط منصوبہ بندی کو تسلیم بھی کر لیا گیا ہے۔ پھر بھی وہ اپنی جگہ برقرار ہیں۔ ملک تباہ ہوتا ہے ہوتا رہے لیکن ان کو کوئی آنچ نہیں آتی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی جڑیں بہت مضبوط ہیں اور یہ اس قسم کا گھناؤنا کردار ادا کر رہے ہیں جو امریکہ میں بیٹھ کر یہودی کرتے ہیں۔ انھوں نے بڑی منظم سازش کے ذریعے پاکستان کے اہم عہدوں پر قبضہ کیا۔ جس سے ان کا مقصد واضح تھا کہ اس اسلامی مملکت کے ٹکڑے کر دیے جائیں کیونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کسی بھی طرح اس ملک کے حکمران تو نہیں بن سکتے یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور مسلمان ہرگز ہمیں برداشت نہیں کریں گے چنانچہ انھوں نے ملک کا ایک حصہ تو تباہ کر دیا اگر وہ اس میں پروان چڑھتے رہیں تو وہ اس کے بھی ٹکڑے کر دیں گے...... مشرقی پاکستان کے علیحدہ کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مشرقی پاکستان میں ان کے لیے پھلنے اور پھولنے کا موقع میسر نہیں ہے۔ جیسا کہ مغربی پاکستان میں میسر ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوام قادیانیوں کے سلسلے میں حد درجہ جذباتی اور ان سے متنفر ہیں جیسا کہ مسلمانوں کو ہونا چاہیے۔ مشرقی پاکستان کے عوام کسی طرح مرزائیوں کو قبول نہیں کر سکتے اور سب سے بڑا مقصد تو یہ تھا کہ سب سے بڑی اسلامی مملکت کے ٹکڑے کر دیے جاتے اور

مسلمانوں کو شیرازہ بکھیر دیا جاتا اور خاص طور پر سے اس خطے میں سو فیصد مسلمان صحیح العقیدہ یعنی اہلسنت و جماعت حنفی مسلمان ہیں...... چونکہ مشرقی پاکستان اکثریت میں تھا اور اگر وہ آ جاتے تو ان کو سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ سخت رویہ اختیار کرتے۔ اس کے مشاہدہ کا موقع مجھے مجیب الرحمٰن سے ملاقات میں ہوا۔ دوران گفتگو مجیب الرحمٰن نے مجھ سے کہا کہ دیکھئے ایم ایم احمد ڈھاکہ میں مارا مارا پھرتا ہے۔ یہاں پر اس کا کوئی کام نہیں اور کوئی مقصد نہیں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کر دیا لیکن بعد میں اس کی درخواستوں پر ملاقات ہو گئی۔ ساتھ ہی مجیب نے کہا کہ قادیانیت اور مرزائیت مغربی پاکستان کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مشرقی پاکستان میں یہ جانور نہیں ملتا۔

جہاں تک اقتصادیات کا تعلق ہے مسٹر ایم ایم احمد نے پوری منصوبہ بندی سے مرزائیت کو مضبوط کیا ہے۔ جس طرح امریکہ میں یہودیوں نے اپنے آپ کو مضبوط کیا ہے۔ امریکہ میں یہودی اس قدر اثر انداز ہیں کہ تمام بنکوں، انشورنس کمپنیوں پر ان کا قبضہ ہے اور امریکہ کے تمام بڑے بڑے کارخانوں غرضیکہ ہر بڑے سرمایہ کاری کے اڈے پر یہودیوں کا قبضہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی سینٹ اور صدران کی حمایت کے بغیر منتخب نہیں ہو سکتے۔ یہی طریقہ ایم ایم احمد نے اختیار کیا ہے اور وہی پوزیشن حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اور چوہدری ظفر اللہ نے یہاں آ کر باقاعدہ مرزائیوں کو لائسنس سے نوازا۔ کارخانوں کے پرمٹ دیے اور اس کی ابتداء شاہنواز لمیٹڈ سے ہوئی۔ ظفر اللہ خان کی حمایت سے قادیانیوں کا بڑا گروہ حکومت میں داخل ہو گیا تھا۔ ان کے ظفر اللہ سربراہ تھے جو وزیر خارجہ تھے۔ ایم اے فاروقی جو ایوب خان کے زمانہ میں سب کچھ تھے اور ایم ایم احمد چنانچہ جتنی اہم انڈسٹریز تھیں انھوں نے ان کے لائسنس قادیانیوں کو دیے۔ ورنہ قادیانی کبھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ تھے۔ پنجاب میں نصیر اے شیخ، فاروق اے شیخ، شاہنواز لمیٹڈ وغیرہ نے زیادہ منافع والی تجارت کے حقوق حاصل کر لیے تا کہ مرزائی قادیانی اقتصادی طور پر مضبوط ہو جائیں...... جہاں انھوں نے پنجاب میں شوگر انڈسٹریز، ٹیکسٹائل ملز وغیرہ قائم کیے اور سندھ وغیرہ میں اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان سے جتنے بھی فائدے حاصل کیے تھے وہ حاصل کیے یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء میں نوٹوں کی واپسی کا جب اعلان ہوا تو لوگوں کو یہ جان کر شاید

حیرت ہوگی لیکن اس سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ واپسی کی تاریخ پر ربوہ سے کوئی شخص بھی نوٹ جمع کرانے نہیں آیا۔ کیونکہ انھیں ایم ایم احمد کے ذریعے تین دن پہلے ہی یہ معلوم ہوگیا تھا کہ نوٹ واپس ہورہے ہیں۔ چنانچہ کوئی بھی قادیانی خسارے میں نہیں رہا۔ اب وہ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر رہ کر بڑے عظیم اقتصادی اور سیاسی فوائد حاصل کررہے ہیں اور پوزیشن یہ ہے کہ وہ اقلیت میں ہیں اور اپنی وہی پوزیشن بنانا چاہتے ہیں جو امریکہ میں یہودیوں نے بنا لی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ فتنہ اسی طرح پروان چڑھتا رہا تو آئندہ چل کر یہی ہوگا کہ اس ملک پر مکمل طور پر ان کا قبضہ ہوگا اور ان کی مرضی کے بغیر کوئی حکومت نہیں کرسکے گا۔

اس کا ثبوت ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مل گیا کہ قادیانیوں نے کھل کر پیپلز پارٹی کی حمایت کی۔ مرزا ناصر الدین محمود نے ربوہ میں اپنے خطبہ میں باقاعدہ اعلان کیا کہ مرزائی پیپلز پارٹی کی حمایت کریں۔ چنانچہ پیپلز پارٹی کے لیے بچے بچے نے انتخابات میں کام کیا پیپلز پارٹی مرزائیوں کے کندھے پر سوار ہوکر اُبھری ہے۔" (۱۲۹)

مولانا شاہ احمد نورانی نے جنرل یحییٰ سے ملاقات کرکے اسے نہ صرف قادیانیوں کے ناپاک عزائم سے آگاہ کیا۔ بلکہ قادیانی اسرائیل گٹھ جوڑ کے حوالے سے بھی ہوش ربا انکشافات کیے (۱۳۰) اور قادیانی تحریک کو صیہونیت کی ذیلی تنظیم قرار دیا۔ ان کے بقول "مذہب کا تو ان لوگوں (قادیانیوں) نے لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک بہت بڑی خطرناک سیاسی تحریک ہے اور یہ صیہونیت کی ایک ذیلی تنظیم ہے جو مسلمانوں کے اندر رہ کر مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا سامان پیدا کررہی ہے...... یہ ڈبل گیم کھیل رہے ہیں، ان کا پہلا مقصد تو یہ ہے کہ حکومت مکمل طور پر ان کے قبضہ میں آجائے اگر حکومت قبضہ میں نہیں آتی تو یہ ملک ہی ختم ہوجائے۔ اس سلسلے میں ایک بات کی وضاحت کردوں کہ ربوہ تو بہرحال ان کا مرکز ہے لیکن یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے اور شاید بعض لوگوں کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ قادیان جو مرزائیوں کا اصل مرکز ہے۔ جہاں مرزا غلام احمد نے جھوٹی نبوت کا چرچا کیا تھا قادیان میں مرزا غلام احمد کی قبر بھی ہے، وہاں پر ۳۱۳ قادیانی بٹھا رکھے ہیں اور یہ قادیانی درویش کہلاتے ہیں، ان ۳۱۳ درویشوں کا خرچہ ربوہ سے جاتا ہے اور جب وہاں آدمیوں کی کمی ہوجاتی ہے تو ان کی کمی پوری کرنے کے لیے یہاں سے آدمیوں کو بھیج دیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرقی پنجاب میں تبادلہ آبادی ہوگیا اور وہاں مسلمانوں کا وجود نہیں ہے مگر

قادیانیوں کو ہندوستان (یعنی مشرقی پنجاب) میں رہنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان سے بھی ان کا رابطہ ہے۔

ہر وہ طاقت جو اسلام کی دشمن ہے اور اسلام کو نیست و نابود کرنا چاہتی ہے وہ مرزائیوں کی دوست ہے اور یہ اس کے ایجنٹ ہیں۔ قادیان اور ربوہ کا براہ راست رابطہ ہے ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہے...... اخبارات اس کے گواہ ہیں اور تفصیل کے ساتھ یہ واقعات اخبارات میں آئے ہیں کہ قادیان میں رہنے والے قادیانیوں نے باقاعدہ بنگلہ دیش تسلیم کرلیا ہے اور انھوں نے بنگلہ دیش کی حمایت کا بھی اعلان کردیا ہے۔ مرزا ناصر الدین محمود نے باقاعدہ اس بات کا اعلان کیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان ایک ہوکر رہیں گے۔ ان کے ساتھی اب بھی کوشش کررہے ہیں اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ مرکز ان کا قادیان رہے کیونکہ وہی ان کا قبلہ و کعبہ ہے اور وہ براہ راست اپنے مرکز سے رابطہ قائم رکھنا چاہتے ہیں...... قادیانی حج کے لیے نہیں جاتے لیکن جب سے پاکستان بنا ہے یہ لوگ بھی جانے لگے اور چونکہ ان کے پاسپورٹ میں قادیانی نہیں لکھا ہوتا اس لیے سعودی حکومت انھیں نہیں روکتی۔ وہاں پہنچ کر یہ لوگ سازشیں کرتے ہیں اور یہاں یہ کہتے ہیں کہ ہم تبلیغ کی غرض سے گئے تھے اور چونکہ وہاں ان کو تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں ہے اس لیے وہ ہاں صرف جاسوسی کرتے ہیں اور یہودیوں کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہاں سعودی عرب میں قادیانیت کی تشہیر و تبلیغ پر مکمل پابندی ہے اور اگر حکومت کے علم میں یہ بات آجائے گی فلاں شخص قادیانی ہے تو اسے گرفتار کرلیا جاتا ہے اور وہاں سے بچ کر نہیں جاسکتا۔ (۱۳۱)

اس طرح مولانا شاہ احمد نورانی سانحہ سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں قادیانی سازش کے حقائق کو منصہ شہود پر لائے جو بذاتِ خود ایک لائق تحسین امر ہے۔

مولانا شاہ احمد نورانی اور "نیا پاکستان" ☆

۱۹۷۰۔۷۱ء کا سیاسی بحران مشرقی پاکستان کی علیحدگی، جنرل یحییٰ کی ایوانِ اقتدار سے رخصتی اور ذوالفقار علی بھٹو کے سریر آرائے تخت ہونے پر منتج ہوا۔ یوں ذوالفقار علی بھٹو "نئے پاکستان" کے وزیر اعظم بن گئے اب مولانا نورانی کی آئینی و سیاسی جدوجہد کا نیا باب شروع ہوگیا تھا۔

☆ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے مغربی پاکستان کیلئے "نیا پاکستان" کی اصطلاح استعمال کی۔

جنوری ۱۹۷۲ء میں دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کے ممبران قومی وصوبائی اسمبلی کا اجلاس مولانا نورانی کی زیر قیادت کراچی میں منعقد ہوا۔ شرکائے اجلاس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ جمہوریت بحال کرے اور جتنی جلدی ممکن ہو سکے مارشل لاء اٹھا لے۔ (۱۳۲)

کراچی میں جمعیت علمائے پاکستان کے ایک اجلاس میں ایک پانچ نکاتی (۱۳۳) منظور کیا جس میں مارشل لاء اٹھائے جانے، جنگی قیدیوں کی بھارت سے واپسی اور قومی صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس بلانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ (۱۳۴)

رائے عامہ اور صحافتی حلقوں نے مولانا نورانی کے پانچ نکاتی فارمولے کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ جنگ کراچی نے اپنے تبصرے میں لکھا:

مسٹر بھٹو کے اقتدار سنبھالنے کے بعد مولانا نورانی جس طرح اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ ادا کر رہے ہیں...... اور موجودہ حکومت کو راہِ راست پر لانے کے لیے کوشش کر رہے ہیں...... وہ آپ کی جرأت و ہمت، حق گوئی و بے باکی اور دور اندیشی وفراست کا واضح ثبوت ہے...... مولانا شاہ احمد نورانی نے موجودہ بحران سے عہدہ برآ ہونے کے لیے (جو) پانچ نکاتی فارمولا پیش کیا ہے۔ اسے محتاط الفاظ میں موجودہ مسائل کا بہترین حل کہا جا سکتا ہے۔ (۱۳۵)

ان نکات کی مقبولیت کے اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا نورانی کے مجوزہ ان پانچ نکات کو دیگر اپوزیشن جماعتوں نے بھی اپنا لیا۔ (۱۳۶)

بھٹو حکومت نے سانحۂ مشرقی پاکستان کے اسباب وعلل سے توجہ ہٹانے کے لیے فروری ۱۹۷۲ء میں دولت مشترکہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا، مولانا نورانی نے اسے ناکام خارجہ پالیسی سے تعبیر کرتے ہوئے ایک غیر مناسب اور عجلت مندانہ اقدام قرار دیا۔ (۱۳۷)

انھوں نے جہاں ایک طرف بھٹو کو سانحۂ مشرقی پاکستان کا ذمہ دار ٹھہرایا تو دوسری طرف سانحۂ مشرقی پاکستان میں محب وطن افراد کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی مذمت کی اور ان سے اظہار ہمدردی کے لیے ۱۱ فروری ۱۹۷۲ء کو مکمل ہڑتال کی اپیل کی۔ (۱۳۸)

مولانا نورانی سول مارشل لاء کے تسلسل کو عوامی آمریت سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کے خیال میں بھٹو حکومت مارشل لاء کی طوالت کو ایک ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اپوزیشن جماعتوں کو کچلنے کی کوشش کر رہی تھی تا کہ ملک میں یک جماعتی نظام **One party system** کو لایا جا سکے۔ (۱۳۹)

تاہم پی پی، نیپ اور جے یو آئی کے سہ جماعتی سمجھوتے نے مولانا نورانی کی مارشل لاء کے جلد خاتمے کی کوششوں کو خاصا نقصان پہنچایا کیونکہ اس سمجھوتے کی رو سے مارشل لاء ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء تک جاری رہنا تھا۔ (۱۴۰)

عبوری آئین ۱۹۷۲ء اور مولانا نورانی

ملک عزیز کے لیے متفقہ آئین کی تدوین تشکیل روز اوّل ہی سے بنیادی ریاستی ضرورت رہی ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین سے قبل بالترتیب ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دساتیر بنائے گئے لیکن دونوں دساتیر ملکی ضروریات کے لیے ناکافی اور عوامی امنگوں پر پورا نہ اتر سکے۔ جہاں تک ۱۹۵۶ء کے آئین کا تعلق تھا تو اس کے نفاذ کی نوبت ہی نہ آئی نہ اس کے تحت الیکشن ہو سکے جبکہ ۱۹۶۲ء کا آئین صدر جنرل ایوب خان کا خود ساختہ تھا۔ جو صرف مارشل لاء کی ضرورت پوری کرنے کے لیے تراشا گیا تھا۔ جنرل ایوب کے سیاسی منظر سے ہٹتے ہی بے معنی ہو کر رہ گیا۔ کسی بھی آئین کی یہ بنیادی خصوصیت ہوتی ہے کہ یہ ریاست کے شہریوں کو نظریاتی، مذہبی، سیاسی، سماجی، ہر قسم کا تحفظ مہیا کرتا ہے۔ اس کے تحت ریاست کے شہریوں کو اس کے بنیادی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اس میں اقلیتیوں کے حقوق کی ضمانت بھی موجود ہوتی ہے۔ ۱۹۷۱ء کے بحران کا بنیادی سبب بھی ملک میں متفقہ دستور کی عدم موجودگی تھا۔ جس کی وجہ سے ملک کے دونوں حصوں میں اختلافات بڑھے۔

۱۹۷۰ء کے الیکشن جس آئین (لیگل فریم ورک آرڈر) کے تحت کرائے گئے تھے وہ بھی ایک جز وقتی آئین اور ملکی ضروریات کے لیے ناکافی تھا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی تھی کہ ملک میں آئین سازی کے لیے اقدامات کیے جاتے کیونکہ ملک عزیز کا زیادہ عرصے تک سرزمین بے آئین رہنا اس کی یکجہتی اور سالمیت کے لیے خطرناک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی نے تشکیل آئین کو اپنی سیاسی ترجیحات میں سرفہرست رکھا۔ ۲۷ مارچ ۱۹۷۲ء کو سرگودھا میں جمعیت کی جنرل کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے حکومت کو خبردار کیا کہ عبوری آئین قرآن وسنت کے مطابق نہ ہوا تو نہ صرف اس کے نفاذ کی مخالفت کی جائے گی بلکہ حکومت کے خلاف ایک ملک گیر تحریک بھی چلائی جائے گی۔ (۱۴۱)

بھٹو حکومت نے آئین سازی کے سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر عبور آئین کا مسودہ

۱۱ اپریل ۱۹۷۲ء کو قومی اسمبلی میں پیش کر دیا۔ تاہم حزب اختلاف کے ارکان قومی اسمبلی نے مسودہ آئین کو ناقابل قبول قرار دیا۔ مولانا نورانی قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کے لیے راولپنڈی پہنچے اور ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا۔ ان اخبار نویسوں سے باتیں کرتے ہوئے انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ۱۴ اپریل ۱۹۷۲ء سے پہلے پہلے مارشل لاء اٹھایا لیا جائے۔ انھوں نے بھی مسودہ آئین پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۵۴ء کا مسودہ آئین اس لیے بدرجہ بہتر تھا۔ (۱۴۲)

انھوں نے اپوزیشن جماعتوں پر اسلامی آئین اور جمہوریت کی بالادستی کے لیے مشترکہ کوششوں کے لیے زور دیا۔ مولانا نورانی کے ان مطالبات کے جواب میں ۱۴ اپریل کو بھٹو نے اعلان کیا کہ وہ ۱۴ اگست کے بجائے ۲۱ اپریل کو مارشل لاء اٹھانے کو تیار ہیں بشرطیکہ اپوزیشن ۱۷ اپریل ۱۹۷۲ء کو عبوری آئین منظور کر لے۔ (۱۴۳)

قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے بعد بھٹو نے ۱۴ اپریل ۱۹۷۲ء کو عبوری مسودہ آئین اسمبلی میں پیش کر دیا (۱۴۴)۔ بحث ومباحثہ کے بعد ۱۷ اپریل کو منظور کر لیا گیا (۱۴۵)۔ بھٹو نے حسب وعدہ ۲۱ اپریل کو مارشل لاء اٹھا لیا۔ حکومت نے مستقل آئین کی تیاری کے لیے ایک ۲۵ رکنی کمیٹی تشکیل دی جس میں جے یو پی کی طرف سے مولانا نورانی نے نمائندگی کی (۱۴۶)۔ عبوری آئین کی منظوری کے بعد بھٹو حکومت نے ہنگامی حالات حقوق کی معطلی برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا تو کسی بھی پارٹی یا شخصیت نے بھٹو کے اس اقدام کی مخالفت نہیں کی سوائے مولانا نورانی اور کونسل مسلم لیگ کے سردار شوکت حیات خان جنھوں نے بھٹو کے اس اقدام کو ماورائے آئین قرار دیا۔ (۱۴۷)

قومی اسمبلی کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نورانی نے بھٹو کے ۲۱ اپریل کے مارشل لاء کے اٹھائے جانے کے فیصلے کو سراہا۔ انھوں نے صدر پر زور دیا کہ آئین قرآن وسنت اور علماء کے ۲۲ نکات کی بنیاد پر مرتب کیا جائے۔ (۱۴۸)

۱۵ اپریل کو مارشل لاء ریگولیشنز کے حوالے سے مولانا نورانی نے کہا کہ عبوری آئین میں مارشل لاء اور قوانین (MLRs) کی تمام شقوں کو جوں کا توں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عبوری آئین میں غیر اسلامی قوانین کے خاتمے کا کوئی ٹائم فریم نہیں دیا گیا۔ انھوں نے حکومت پر شراب، رقص وموسیقی، نائٹ کلبوں اور قمار بازی پر پابندی نہ لگانے

پر کڑی نکتہ چینی کی۔ انھوں نے کہا کہ غیر اسلامی دفعات کے خاتمے تک عبوری آئین کو کسی بھی صورت میں قبول نہیں کیا جائے گا۔ (۱۴۹)

انھوں نے حکومتی اقدامات کو فسطائیت اور آمریت قرار دیا۔ (۱۵۰) مولانا نورانی کے بقول جو آئین ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے اس میں اسلام کو قطعاً کوئی تحفظ فراہم نہیں کیا گیا۔ اس میں کوئی اسلامی روح کارفرما نہیں ہے۔ حکومت کی تمام نیک نیتی کے باوجود اس عبوری آئین سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا چونکہ اس میں وہ تاریخیں متعین نہیں کی گئیں جب بینکوں کے سود، شراب، نائٹ کلب اس قسم کی دوسری چیزوں سے قوم کو نجات ملے گی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ دوسری اصلاحات تو حکومت نہایت ہی عجلت میں نافذ کرتی جا رہی ہے لیکن جو برائیاں معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں ان کو دور کرنے کا کوئی وقت متعین نہیں کیا گیا۔ (۱۵۱)

مولانا نورانی نے دستور کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں لکھا ہے کہ پاکستان کا صدر مسلمان ہوگا مگر مسلمان کی تعریف کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہے؟ یہاں ہر شخص مسلمان بننے کی کوشش کرتا ہے اس ملک میں اسلام کے بدترین دشمن موجود ہیں جو مسلمان بن کر یہاں حکمران بن سکتے ہیں اور چور دروازے سے حکومت کرنے کے لیے وہ یہاں آ سکتے ہیں۔ (۱۵۲)

جو شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین رکھتا ہو اور حضور پرنور ﷺ کے آخری نبی ہونے پر یقین رکھتا ہو وہ مسلمان ہوگا اور یہ تعریف آئین میں درج ہونا ضروری ہے تاکہ غیر مسلموں کے حکمران بننے کا سدباب کیا جا سکے (۱۵۳)۔ چونکہ عقیدہ ختم نبوت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے اس لیے انھوں نے قومی اسمبلی میں اپنے پہلے ہی خطاب میں اس عقیدے کے تحفظ پر اظہار خیال کیا اور اسے قانونی تحفظ دینے کے لیے آئین میں مسلمانوں کی تعریف درج کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ (۱۵۴) لیکن پیپلز پارٹی نے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی آڑ لے کر مسلمان کی متفقہ تعریف درج کرنے سے راہ فرار اختیار کرنا چاہی اور پی پی پی کے مذہبی معاملات کے ترجمان اور مرکزی کابینہ کے وزیر مولانا کوثر نیازی (۱۹۳۴ء۔ ۱۹۹۶ء) نے مولانا شاہ احمد نورانی کے خطاب کے جواب میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

علماء میں جو اختلافات موجود ہیں ان کی بناء پر ایک عالم دوسرے عالم سے مسلمان کی تعریف پر متفق نہیں ہے میں اس وقت بھی یہاں چیلنج کرتا ہوں کہ علماء مسلمان کی کوئی متفقہ

تعریف اس ایوان کے سامنے پیش کریں میں ان کو چیلنج کرتا ہوں کہ ان کے جتنے ارکان یہاں بیٹھے ہیں وہ باہم مل کر مسلمان کی کوئی تعریف ہمارے سامنے پیش کریں ہم انھیں پندرہ دن دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ایک ساتھ بیٹھ جائیں اور مسلمانوں کی کسی ایک تعریف پر متحد ہو جائیں...... ہم اسے منظور کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ آج بھی ان کے اندر باہمی اختلاف ہوگا اور وہ صحیح طور پر مسلمان کی کوئی ایک تعریف نہیں کر سکیں گے۔ (۱۵۵)

کوثر نیازی کے اس چیلنج کے بعد جمعیت علماء پاکستان کے ڈپٹی پارلیمانی لیڈر علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری خطاب کے لیے اٹھے اور انھوں نے واضح انداز میں کہا:

میں اپنی جماعت کی طرف سے اس بات کو قبول کرتا ہوں...... ہم چاہتے ہیں کہ اجمالی طور پر اور اختصار سے مسلمان کی تعریف اس آئین میں آ جائے تا کہ جو لوگ لفظ مسلم سے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور لفظ اسلام کی تعریف میں نہیں آتے ان کے لیے اس لفظ سے استفادہ حاصل کرنے کا سدِ باب ہو جائے۔ اجتماعی طور پر تحقیقی تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے...... مسلمان کی تعریف کے سلسلہ میں علماء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ گورنر جنرل غلام محمد کے زمانے میں علماء نے متفقہ طور پر ۲۲ نکات ☆ پیش کر دیے تھے (۱۵۶)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علماء میں اختلاف نہیں تھا اور جو چیلنج مولانا کوثر نیازی صاحب نے دیا ہے ہم اس کو قبول کرتے ہیں اور علماء کے نزدیک مسلمان کی متفقہ طور پر تعریف پیش کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ (۱۵۷)

اس دن اسمبلی کی کارروائی کے اختتام کے بعد ایم این اے ہوسٹل میں جمعیت علماء پاکستان کے پارلیمانی قائد مولانا نورانی کے کمرے میں جمعیت کے سرکردہ راہنماؤں کا اجلاس ہوا۔ جس میں مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا محمود علی رضوی ایم این اے، مولانا غلام علی اوکاڑوی اور عبدالمصطفیٰ ازہری ایم این اے شریک ہوئے...... اس اجلاس میں مسلمان کی مختصر اور جامع تعریف تجویز کی گئی...... مجوزہ تعریف کا ڈرافٹ اپوزیشن کے دوسرے علمائے کرام مولانا عبدالحکیم، مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا عبدالحق آف اکوڑہ خٹک کے پاس لے جایا گیا، جنھوں نے جمعیت علمائے پاکستان کی اس ڈرافٹ کی توثیق کی اور یہ طے ہوا کہ اسمبلی میں یہ تعریف مولانا عبدالحق آف اکوڑہ خٹک پیش کریں گے۔ (۱۵۸)

مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک (ف ۱۹۸۸ء) کو مسلمان کی جامع تعریف اسمبلی میں

پیش کرنے کی ذمہ داری اس لیے سونپی گئی کہ حکومت کو بتایا جا سکے کہ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر اسی تعریف اور دیگر اہم معاملات میں متفق ہیں۔ مولانا عبدالحق نے ۱۷ اپریل کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں جمعیت علمائے پاکستان کے طرف سے تجویز کردہ مسلمان کی تعریف پیش کی (۱۵۹)۔ جمعیت علمائے پاکستان کی اس مجوزہ تعریف کو بعد میں ۱۹۷۳ء کے آئین میں شامل کر لیا گیا جسے صدر اور وزیر اعظم کے حلف کے ضمن میں اس طرح تحریر کیا گیا ہے:

میں قسم کھاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ خدا اور اس کی آخری کتاب قرآن پاک پر مجھے پورا یقین ہے اور میں ایمان رکھتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ میں قیامت کے دن، رسول اللہ ﷺ کی سنت و حدیث اور قرآن پاک کے احکامات پر بھی ایمان رکھتا ہوں۔ (۱۶۰)

اس طرح مولانا شاہ احمد نورانی پاکستان کی آئینی تاریخ میں وہ پہلے سیاسی رہنما تھے جنھوں نے آئین میں مسلمان کی تعریف شامل کروائی۔ (۱۶۱)

مسلمان کی اس تعریف کے مطابق:

A Mulim has to accept and acknowldge the unity of God, to believe in Holy Quran, Divine Books, Sunnah, the traditions of the Holy Prophet (Peace Be Upon Him) of Islam and in all about the Messenger of God, and also in the Prophet of Islam as being the last of all Prophets thereby meaning that Hazrat Muhammad (Peace Be Upon Him) is 'Nabi-e-Akhir-uz-Zaman' and to believe in all that he has brought and not to believe in any body as either 'Zilli' or 'Barozi' or 'Tabai' or permanent or any kind of Prophet after him. (162)

مولانا نورانی نے عوام کو بھی اس سلسلے میں اعتماد میں لیا اور اس مسئلے کی اہمیت کے بارے میں بتایا کیونکہ ان کا یہ موقف تھا کہ ان ارکانِ اسمبلی کو قوم منتخب کرتی ہے اس لیے اہم قومی معاملات سے قوم کو باخبر رکھا جانا چاہیے چنانچہ انھوں نے عوام کو اسمبلی کی کارروائی سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا:

☆ علماء کے بائیس نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمہ نمبر۲۔

ہم نے اسمبلی میں مولانا کوثر نیازی کے اس چیلنج کو قبول کر لیا تھا جو انھوں نے مسلمان کی تعریف کے سلسلے میں کیا تھا اور کہا تھا کہ علمائے کرام مسلمان کی تعریف کے بارے میں متفق نہیں ہیں...... اسمبلی میں تمام اسلامی جماعتوں کے نمائندوں نے متفقہ طور پر مسلمان کی جامع اور مکمل تعریف پیش کر کے ثابت کر دیا تھا کہ علمائے کرام میں مسلمان کی تعریف اور اسلامی آئین کے متعلق کوئی اختلاف رائے نہیں جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ اسلامی نظام سے فرار کا بہانہ تلاش کرتے ہیں لیکن وہ یاد رکھیں کہ ہم انھیں کوئی بہانہ بنانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ (۱۶۳)

جبکہ لفظ مسلمان کی تعریف و توضیح کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مسلمان وہ ہے کہ جو کتاب و سنت اور ضروریات دین پر یقین رکھتا ہو اور قرآن کو ان تشریحات کے مطابق مانتا ہو جو سلف صالحین نے کی ہیں۔ نیز حضور ﷺ کو آخری نبی تسلیم کرتا ہو۔ اگر اسلامی آئین میں مسلمان کی یہ تعریف شامل نہ کی گئی تو ہم ایسے آئین کو اسلامی آئین نہیں کہیں گے۔ بھٹو بار بار اسلام کے لیے جان قربان کرنے کا اعلان کرتے ہیں قوم کو ان کی جان کی ضرورت نہیں۔ اس لیے فی الحال جان قربان نہ کریں بلکہ اسلام کے لیے شراب کے استعمال اور درآمد پر پابندی عائد کریں۔ (۱۶۴)

بنگلہ دیش تسلیم کرنے کا مسئلہ

جون ۱۹۷۲ء میں حمود الرحمٰن کمیشن (جو کہ ۲۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مقرر کیا گیا تھا) نے سانحۂ مشرقی پاکستان کی وجوہات کے ضمن میں اپنی عبوری رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کے مندرجات نے حکومت مخالف سرگرمیوں بالخصوص احتجاجی مظاہروں میں شدت پیدا کر دی۔ شملہ معاہدہ (جولائی ۲، ۱۹۷۲ء) نے اس صورتحال میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ملک کے مختلف حصوں خاص طور پر صوبہ پنجاب شدید ہنگاموں کی لپیٹ میں آیا۔ (۱۶۵) ☆

☆ شملہ معاہدہ میں ایک شق یہ بھی تھی کہ فریقین اقوام متحدہ کے چارٹر کی پابندی کرتے ہوئے ایک دوسرے کی سرحدات کا احترام کریں گے، مقبوضہ علاقے واپس کر دیے جائیں گے اور فوجیں جنگ سے پہلی پوزیشن پر واپس لوٹ جائیں گی۔ اس معاہدہ کا بنیادی مقصد پنجاب کے مقبوضہ علاقے خالی کروا کر اہل پنجاب کو مطمئن کرنا تھا کیونکہ پنجاب بھٹو کی طاقت کا مرکز تھا تاہم بھارت نے مقبوضہ کشمیر کے بعض مقامات مثلاً وادی لیپا اور ٹھا کو چک واپس نہ کر کے معاہدہ کی صریحاً خلاف ورزی کی جس سے پوری قوم بالخصوص پنجاب میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

بھٹو حکومت کی کوشش تھی کہ کسی طرح بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے بین الاقوامی سطح پر حکومت کی نیک نامی میں اضافہ کیا جائے تاکہ بنگلہ دیش اور بھارت میں موجود جنگی قیدیوں کی باعزت واپسی ممکن ہو سکے۔ جمعیت علمائے پاکستان نے ان حالات میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے خلاف جدوجہد شروع کر دی اور حکومت کے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے عزائم کو ملکی سالمیت کے خلاف خطرہ اور دو قومی نظریہ کے منافی قرار دیا۔ اس موقع پر مولانا نورانی نے کہا:

Simla Accord is worse than the Tashkent Declaration, as the latter was a declaration of intent while the former a full-fledged and binding agreement on adopting a particular policy.... It has been signed to defame and after this, Pakistan has accepted the aggression of India in East Pakistan. (166)

۳۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو جمعیت نے ایک بہت بڑے عوامی جلسے کا اہتمام کیا جس میں حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرے اور عدلیہ کی زیر نگرانی تین ماہ کے اندر اندر نئے انتخابات کرائے۔ (۱۶۷)

مولانا نورانی کے بقول جے یو پی اب بھی مشرقی پاکستان کو پاکستان کا حصہ تصور کرتی ہے۔ پاکستان کے عوام حتیٰ کہ قومی اسمبلی بھی بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کر سکتی۔ پاکستان کے عوام بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی تمام حکومتی کوششوں اور اقدامات کو مسترد کر دیں کیونکہ ایسی کوششیں اور اپیلیں وہی لوگ کر رہے ہیں جو اس کے قیام کے ذمہ دار ہیں۔ (۱۶۸) مزید برآں مولانا نورانی نے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے شائع کرنے کا مطالبہ بھی کیا۔ (۱۶۹)

اگرچہ جمعیت بنگلہ دیش کے تسلیم کیے جانے کے خلاف تھی اور اس نے "ڈھاکہ دلی سے دور نہیں" "بنگلہ دیش منظور نہیں" کے نعرے بھی لگائے (۱۷۰) لیکن جمعیت نے اس مسئلہ کو جنگی قیدیوں کی واپسی سے منسلک نہیں کیا۔ مولانا نورانی نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں اٹھائے (۱۷۱)۔ انھوں نے کہا کہ جب تک پیپلز پارٹی برسر اقتدار ہے، ملک کے دونوں حصوں کے دوبارہ متحدہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے نئے الیکشن کی تشکیل و نفاذ کے بعد نئے الیکشن کرائے جائیں۔ (۱۷۲)

جاری ملکی حالات کے تناظر میں اپوزیشن جماعتوں نے ضروری خیال کیا کہ اس

سنجیدہ مسئلے (تسلیم بنگلہ دیش) پر مشترکہ و متفقہ مؤقف اپنایا جائے اس سلسلے میں ۲۸ نومبر ۱۹۷۲ء کو مولانا نورانی کے زیر صدارت اپوزیشن جماعتوں کا اجلاس ہوا۔ جس میں جمعیت علمائے پاکستان، پاکستان مسلم لیگ، جماعت اسلامی، پاکستان جمہوری پارٹی، جمعیت اہلحدیث اور جسٹس پارٹی (ق ۱۹۶۹ء) نے شرکت کی۔ اپوزیشن رہنماؤں نے اس امر پر اتفاق ظاہر کیا کہ اندریں حالات بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا، ملکی یکجہتی اور سلامتی کے لیے خطرناک ہے۔ (۱۷۳)

ان حالات کو دیکھتے ہوئے بھٹو نے ۲ دسمبر ۱۹۷۲ء کو اعلان کیا کہ حکومت عوام کی رضامندی کے بغیر بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرے گی۔ (۱۷۴) اس طرح وقتی طور پر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا عمل معرضِ التوا میں چلا گیا۔ یقیناً یہ جمعیت علمائے پاکستان کی ایک بہت بڑی فتح تھی۔ (۱۷۵)

متحدہ جمہوری محاذ کی تشکیل، مستقل آئین کے لیے جدوجہد اور مولانا نورانی

بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرنے کے محاذ پر کامیابی کے بعد مولانا نورانی نے مستقل آئین کے لیے جدوجہد کو نہایت تیزی سے آگے بڑھایا۔ مولانا نورانی نے پی پی حکومت کی طرف سے ملک میں صدارتی نظام لانے کی کوششوں اور غیر اسلامی شقوں کی شدت سے مخالفت کی۔ اگست ۱۹۷۲ء میں انھوں نے ساہیوال میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تمام اپوزیشن جماعتیں فرانسیسی طرز کے آئین کی مخالفت کریں گی۔ (۱۷۶)

ایک مستقل آئین کے لیے مولانا نورانی کی دستوری تجاویز کچھ اس طرح تھیں:

(۱) پارلیمانی طرز حکومت، (۲) ملک کا سرکاری مذہب اسلام اور (۳) دو ایوانی مقننہ۔ (۱۷۷)

اکتوبر ۱۹۷۲ء میں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن لاہور کی دعوت پر وکلاء کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اپنی ان تجاویز کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ملکی آئین کی بنیاد قرآن وسنت پر استوار ہونی چاہیے ملکی آئین میں یہ شق موجود ہونی چاہیے کہ جو اسلام سے منحرف ہوگا اس کی سزا موت ہے۔ لہٰذا عبوری آئین میں اسلامی شقوں کا تحفظ ضروری ہے۔ ہماری جماعت غیر اسلامی آئین کو قبول نہیں کرے گی۔ اس لیے کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا تاکہ مسلمان دین اسلام کی اصل روح کے مطابق طرز حیات اپنائیں۔

اس ملک کے باشندوں کو پورا اختیار ہے کہ وہ اسلامی آئین کا مطالبہ کریں ہم اسمبلی کے اندر اور باہر مستقل جدوجہد کریں گے اور غیر ملکی آئین کی تشکیل ونفاذ کی ہر کوشش کی ڈٹ کر مخالفت کی جائے گی۔ (۱۷۸)

لاہور میں ایک عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بھٹو حکومت کی کوشش ہے کہ عبوری آئین ہی کو ترمیم واضافہ کے بعد مستقل آئین کا درجہ دے دیا جائے۔ جمعیت اس کی کسی طور پر حمایت نہیں کرے گی۔ جمعیت پر اس جماعت کے ساتھ تعاون کرے گی جو قرآن وسنت کی اساس پر آئین کی تیاری میں حمایت کرے گی۔ (۱۷۹)

جبکہ ڈیفنس آف پاکستان رولز (DPRs) کے حوالے سے انھوں نے حکومت پر الزام عائد کیا کہ ملک کے تحفظ کے بجائے اس کے قانون کو برسراقتدار لوگوں کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف استعمال کیا جارہا ہے۔ سی آئی اے کے آلہ کار بھارتی جاسوس اور تخریب کار ملک میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ انھیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں۔ دوسری طرف حزب اختلاف کے خلاف یہ قانون بڑی تیزی سے حرکت میں آجاتا ہے۔ ڈیفنس آف پاکستان رولز دراصل ''ڈیفنس آف پرائم منسٹر رولز بن کر رہ گیا ہے۔ (۱۸۰)

مسودۂ آئین پر مولانا نورانی کے اعتراضات اور آئینی سمجھوتہ

ملک کے آئین کی تیاری کے مرحلے میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے آئین سازی کے لیے ارکان قومی اسمبلی میں مشتمل جو کمیٹی قائم کی تھی اس میں اپوزیشن کی پارٹیوں کے رہنما بھی موجود تھے۔ جنھوں نے کمیٹی کے اجلاس میں اپنی اپنی آئینی تجاویز پیش کیں۔ اس سلسلے میں بھٹو اور پی پی پی رہنماؤں کے مذاکرات ہوئے۔ ان مذاکرات میں مولانا شاہ احمد نورانی نے اپنی آئینی تجاویز سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کیا اور مذاکرات کی میز پر بھٹو کو قائل کر لیا(۱۸۱)۔ بھٹو جیسا ذہین سیاستدان بھی مولانا نورانی کی آئینی تجاویز میں نقص نہ نکال سکا(۱۸۲)۔ نتیجتاً آئین سازی کے ضمن میں ایک ایسا فارمولا مرتب کیا گیا جس سے حزب اقتدار اور حزب اختلاف نے اتفاق کیا۔ اس فارمولے کی روشنی میں ایک ''آئینی سمجھوتہ'' پیپلز پارٹی اور اپوزیشن پارٹیوں کے درمیان ہوا۔ جس پر ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو دستخط ہوئے (۱۸۳)۔

اس آئینی سمجھوتے پر دستخط کے بعد مولانا نورانی نے کہا کہ:

"Today we have reached an important mile stone in the history of our nation." (184)

اس آئینی سمجھوتے میں ان متفقہ امور کی نشاندہی کی گئی تھی جن کے مطابق آئین سازی کی جانی تھی۔ ۴۵ دفعات پر مشتمل ۱۷۰ صفحات کے اس مسودے میں یہ بات عیاں تھی کہ اپوزیشن آئین سازی میں خصوصی دلچسپی لے رہی ہے۔ دراصل اپوزیشن کے راہنماؤں نے پیپلز پارٹی کے مجوزہ آئین میں ۲۰۰ سے زائد ترامیم پیش کی گئی تھیں۔ لیکن بالآخر ۴۵ دفعات پر فریقین کا باہمی سمجھوتہ ہوگیا۔ (۱۸۵)

اپوزیشن اور حکومت کے درمیان آئینی سمجھوتے کے بعد توقع کی جا رہی تھی کہ آئین فی الحقیقت متفقہ اور غیر متنازعہ ہوگا۔ باہمی افہام وتفہیم کے اسی جذبہ کو برقرار رکھا جائے گا مگر جب پیپلز پارٹی نے آئین کا مسودہ تیار کیا اس میں حکومت اور اپوزیشن کے درمیان طے پائے گئے آئینی سمجھوتے کی خلاف ورزی کر کے باہمی اعتماد کو مجروح کیا گیا تو مولانا نورانی نے اسے سنگین وعدہ خلافی قرار دیا اور اپوزیشن کے دیگر راہنماؤں نے بھی اس طرز کی مذمت کی (۱۸۶)۔ جبکہ حکومت نے یہ تاثر دیا کہ حزب اختلاف کی جماعتیں آئین سازی میں دلچسپی نہیں رکھتے اور وہ الزامات لگا کر حکومت کو بدنام کر رہی ہیں۔ (۱۸۷)

مولانا نورانی کے بقول:

آپ کو اس بات پر حیرت ہوگی کہ ایسا فارمولا جس پر حزب اختلاف اور حزب اقتدار کی جماعتوں نے اتفاق کے ساتھ اور جسے باہمی افہام کی فضا میں خلوصوں اور نیتوں کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا۔ اتنی جلدی متنازعہ کیسے بن گیا...... میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اصل مسودہ آئین میں اس سمجھوتے کو نظر انداز کیا جائے گا اور حکمران حسب عادت اپنی مرضی مسلط کرنے اور اپنے اقاقتدار کو محفوظ رکھنے اور اپنے اختیارات کو دائمی بنانے کے لیے سمجھوتے کو اس طرح کچل کر عوامی نمائندوں کی کوششوں پر...... پانی پھیر دیں گے اور ہر اسلامی و جمہوری دفعہ سے پوری ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ مکر جائے گی۔ (۱۸۸)

مولانا شاہ احمد نورانی کے بقول آئینی سمجھوتہ دراصل چند متفقہ امور کا نام ہے۔ ۱۷۰ صفحات اور ۴۵ دفعات پر مشتمل اس سمجھوتے کو مکمل آئین نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ ہی یہ پابندی لگائی جا سکتی ہے کہ مسودہ آئین جو کہ ۲۸۰ دفعات پر مشتمل ہے۔ محض آئینی سمجھوتے کی

بناء پر بغیر کسی رائے اور بحث کے منظور کر لیا جائے کیونکہ چار دن کے آئینی مذاکرات میں مکمل آئین کی تدوین ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ آئینی سمجھوتے کے بعد مسودہ دستور مکمل کرنے کے بعد حکمران جماعت حزب اختلاف پر انحراف کا الزام لگاتی ہے۔ ہماری دلچسپی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ...... آئینی کمیٹی کے اجلاس کے دوران تقریباً دو سو سے زائد تجاویز پیش کی گئیں جو شخص ۲۰۰ سے زائد آئینی ترامیم پیش کرے اس کی دلچسپی کا اندازہ آپ اس کی ترامیم سے لگا سکتے ہیں...... مسودہ دستور اور آئینی سمجھوتے کو سامنے رکھ لیجیے تو...... اندازہ ہو جائے گا کہ حکمران جماعت نے کس بے دردی سے اس کی اسلامی اور جمہوری روح کو پامال کیا...... آئینی سمجھوتے میں اسلامی دفعات ۲۹ سے لے کر ۴۳ تک ہیں۔ ان دفعات میں اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب بتانے کے بعد یہ ہونا چاہیے تھا کہ اسلام کو اس ملک میں مکمل طور پر نافذ کیا جائے...... جمعیت علمائے پاکستان چونکہ یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ اسلام ہی پاکستان کے وجود بقا کا ضامن ہے۔ اسلام اگر اس ملک میں نہیں ہے تو اس ملک کی بقا کا کوئی بھی جواز نہیں رہ جاتا اور پھر اس ملک کو وہ تحفظ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو اسلام کو اس ملک میں عملی طور پر نافذ ہونے کے بعد ہونا چاہیے اسلامی دفعات اسی صورت میں موثر ہو سکتی ہے جبکہ ان کو باقاعدہ دستوری تحفظ دیا جائے یعنی جس طرح وزیراعظم یا صدر مملکت کو صاحب اختیار بنایا جاتا ہے اور اس کے اختیارات کی حدود متعین کی جاتی ہیں۔

دستوری طور پر یہ تمام چیزیں طے کرنے کے بعد قانونی شکل بھی دی جاتی ہے تاکہ اپنے اختیارات کو اس دستور کی روشنی میں استعمال کرنے اور ان قوانین کا پابند رہے۔ جو دستور کی روشنی میں تیار کیے گئے ہیں...... لیکن برسراہ کی روشنی میں استعمال کرنے اور ان قوانین کا پابند رہے۔ جو دستور کی روشنی میں تیار کیے گئے ہیں۔ لیکن سربراہ مملکت یا وزیراعظم کو اختیارات نہ دیے جائیں تو ظاہر ہے ایک نمائشی وزیراعظم (یا) صدر ہے۔ اسلام کے ساتھ ساتھ ۲۵ سال سے مسلسل یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے...... اسلام کو ایک حسین قسم کے دستوری چوکھٹے میں ہمیشہ سجانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ آئینی سمجھوتے میں عملی طور پر یہ دفعات رکھوائی گئی تھیں کہ اس ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا اور کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا جبکہ تمام موجودہ قوانین جو غیر اسلامی ہیں ان کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے اور ان کو موثر طور پر نافذ کرنے کی ضمانت اس دستور میں نہیں دی گئی۔

ہر ایک فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر کوئی بھی حکومت اس کی آزادی کو چیلنج کرے اس کو گرفتار کر کے ہراساں کرے، پریشان کرے تو وہ عدالت سے رجوع کر سکتا ہے۔ لیکن آپ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوگی کہ اگر اسلام کے قوانین کا مذاق اڑایا جائے۔ اسلام کے احکامات پر جن کو کتاب سنت میں قانونی حیثیت گزارنے کی اجازت دی جائے۔

اسلامی کونسل ...... (کو) غیر مؤثر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ وہ صرف اس وقت مشورہ دے سکتی ہے۔ جب اس سے مشورہ طلب کیا جائے، وہ صرف اس وقت ہی اپنی رائے ظاہر کر سکتی ہے جب اس سے رائے پوچھی جائے ...... دستور میں مسلمان کے مرتد ہونے اور مذہب تبدیل کرنے کی ممانعت میں کوئی دفعہ موجود نہیں ہے۔ ہر شہری اس بات کے لیے آزاد ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنا مذہب تبدیل کرے تو اب یہ دستور کہ جس میں یہ دفعہ موجود نہیں ظاہر ہے کہ آپ اس کو اسلامی کیسے کہہ سکتے ہیں ...... اگر کتاب وسنت کے خلاف قوانین اسلامی نافذ کیے گئے تو جہاں کسی شہری مسلمان کو انھیں چیلنج کرنے کا حق نہیں ہے وہاں پارلیمنٹ کے ارکان کو بھی چیلنج کا حق نہیں۔ یعنی حکومت وقت جب چاہے پارلیمنٹ سے اپنی مرضی کے مطابق چاہے کتاب وسنت کے خلاف وہ قوانین ہوں ان کو نافذ کرا سکتی ہے ...... جو دفعات اسلام اور اسلامی قوانین کے لیے رکھی گئی تھیں۔ ان کو آئینی سمجھوتے کے بعد دستوری مسودہ تیار کرتے وقت بالکل ختم کر دیا گیا ...... دستوری سمجھوتہ میں اسلام کو جو تحفظ دیا گیا تھا اس کی روشنی میں جو مسودۂ دستور تیار ہوتا تھا۔ اس میں ظاہر ہے کہ اس قسم کے احکامات آ جاتے تھے کہ ملک سے مکمل طور پر تمام غیر شرعی چیزوں کو تدریجی طور پر ختم کرنے کی اجازت دی جائے لیکن اس کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی۔

آئینی سمجھوتہ اس بات کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ آنے والے زمانے میں قومی اسمبلی دو سو ممبران پر مشتمل ہوگی اور قومی اسمبلی کے ایوانِ بالا جس کو سینٹ کہتے ہیں، سینٹ کے ساٹھ ممبران ہوں گے ...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت ۱۴۴ افراد پر مشتمل اسمبلی آئندہ ۲۰۰ پر مشتمل ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے الیکشن کروانے پڑیں گے ...... بقیہ سیٹوں کا نہیں بلکہ پوری قومی اسمبلی کا نئے سرے سے انتخاب ہوگا۔ ان کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ نئے دستور پر اپنی رائے کو ظاہر کر سکیں ...... (یہ کیسے ممکن ہے کہ) ۱۴۴ کے ایوان کو ۲۰۰ سے نہ بھریں۔ ایسے ہی رہنے دیں اور دستور نافذ کر دیں۔ مارچ یا اپریل میں دستور نافذ کر رہے ہیں (یعنی ۱۹۷۴ء

کے مارچ یا اپریل میں) اور عمل کر رہے ہیں ...... ۱۹۷۷ء میں پانچ سال کے بعد یہ تو بڑی مضحکہ خیز بات ہے ...... بھارت نے ۱۹۴۸ء میں نیا دستور نافذ ہونے کے فوراً بعد الیکشن کرایا اور نام نہاد بنگلہ دیش میں بھی نیا دستور بن گیا اور نافذ ہو گیا اور اس کے مطابق وہاں مارچ میں الیکشن ہو رہے ہیں۔ مجھ (مولانا نورانی) سے یہ کہا گیا کہ بنگلہ دیش تو ایک ملک ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اس میں الیکشن ہو رہے ہیں ...... کہ یہاں بھی تو لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان ہے۔ جب نیا پاکستان ہے، نئے پاکستان کا دستور ہے تو نئے الیکشن بھی ہونے چاہئیں۔

آئینی سمجھوتے میں یہ بھی طے کیا (گیا) تھا کہ عدلیہ مکمل طور پر آزاد ہوگی اور عدلیہ اس اعتبار سے آزاد ہوگی کہ اس کو کام کرنے، مروجہ قوانین پر پابندی اور عملدرآمد کرانے کا مکمل اختیار ہوگا۔ عدلیہ کے اراکین معزز جج صاحبان یہ سب کے سب آئینی دیے جانے کے بعد اپنے آپ کو محفوظ سمجھیں گے۔

اس لیے عدلیہ کو انتظامیہ سے بالکل آزاد رکھا جائے۔ عدلیہ کی آزادی کو اس دستور میں متاثر کیا گیا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ عدلیہ کو اتنا با اختیار ہونا چاہیے تھا کہ پاکستان کے ہر حصے میں اس کی تکمیل ہو سکے لیکن اس دستور میں حکومت نے بڑا عجیب وغریب فیصلہ کیا جو قطعاً آئینی سمجھوتے کی اس روح کو ختم کر دیتا ہے۔ آئینی سمجھوتے کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔ انھوں نے ٹریبونل قائم کر دیے ہیں۔ (۱۸۹)

الیکشن کمیشن کے تقرر کے سلسلہ میں وزیراعظم ...... جس الیکشن کمیشن کے چاہے مقرر کر دے تو ظاہر ہے کہ جب وزیراعظم الیکشن کمیشن مقرر کرے گا تو پھر اس ملک میں انتخابات کا حشر کیا ہوگا۔ آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں اور ابھی حال ہی میں ایک سال کے عرصہ میں جو ضمنی انتخابات ہوئے ہیں ...... ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ گواہ ہیں کہ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں جہاں ضمنی انتخابات ہوئے وہاں کیا کیا دھاندلیاں ہوئی ہیں ...... مارشل لاء کے ظالمانہ اور جابرانہ قوانین کو تحفظ دیا گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے افراد اور خاص طور پر حکمران جماعت ماضی کے ان دو بڑے ڈکٹیٹروں کو غدار اور آمر کہتے ہیں لکھتے ہی نہیں تھکتے کہ صدر ایوب ایسے تھے، صدر یحییٰ ایسے تھے لوگ ان کو برا کہتے نہیں تھکتے لیکن بڑی حیرت کی بات ہے کہ حکمران جماعت جو ان کے خلاف منظم تحریک چلانے کے بعد عوامی حکومت کی حیثیت سے ان کا تختہ الٹنے کے بعد برسر اقتدار آئی تھی، وہی حکومت آج ان

آمروں، ظالموں اور غاصبوں کے آمرانہ قوانین کو اس جمہوری دستور میں تحفظ دے رہی ہے۔
ا ایک بہت ہی بدنام زمانہ اور رسوائے زمانہ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ (PPA) ۱۹۶۲ء میں نافذ ہوا۔ اس PPA کو مارشل Regime نے نافذ کیا تھا۔ اسے دستوری تحفظ دیا گیا ہے۔ (۱۹۰)

آئینی کمیٹی نے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو قومی اسمبلی میں اپنی حتمی رپورٹ پیش کر دی تاہم مولانا شاہ احمد نورانی اور کئی دیگر سیاسی رہنماؤں نے رپورٹ کے مندرجات سے اختلاف کیا۔ مولانا نورانی نے اپنے اختلافی نوٹ میں جداگانہ انتخابات غیر قانونی دولت و جائیداد کی ضبطی اور صدر اور وزیراعظم کے درمیان توازن اختیارات پر زور دیا۔ (۱۹۱)

۳۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خطاب کرتے ہوئے مولانا نورانی نے حکومت پر الزام عائد کیا کہ اس نے طے شدہ آئینی سمجھوتے کی خلاف ورزی کی ہے۔ آئینی کمیٹی نے متفقہ طور پر یہ شوق تجویز کی تھی کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔ لیکن آئینی مسودے میں اس شق اور اس جیسے دیگر دفعات کو حکمت عملی کے اصولوں (Principals of policy) کے زمرے میں رکھا گیا جو کہ بعید از انصاف امر تھا۔ اس کے علاوہ آئینی مسودے میں اس قسم کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی تھی کہ تمام قوانین قرآن وسنت کی روشنی میں مرتب کیے جائیں گے۔ (۱۹۲)

مولانا شاہ احمد نورانی نے مجوزہ اسلامی کونسل کو ایک غیر موثر ادارہ قرار دیا۔ ان کے خیال میں حکومت نے آئینی مسودے میں ان امور کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کیا ہے تا کہ اسلامی آئین کی تشکیل ونفاذ کی راہ مسدود کی جاسکے۔☆ (۱۹۳)

انھوں نے آئینی مسودے کی منظوری کے بعد نئے انتخابات کی ضرورت پر زور دیا اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے عدالتی اختیارات میں کمی پر گہرے تحفظات کا اظہار بھی کیا (۱۹۴)۔ جبکہ مارشل لاء ریگولیشنز کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ نام نہاد جمہوری حکومت نے مارشل لاء ریگولیشنز نمبر ۵۹، ۸۹، ۹۱ اور ۱۴۴ کو آئینی مسودے میں شامل کر کے اپنی جمہوریت پسندی کی قلعی کھول دی ہے اور آمرانہ وراثت کو تسلسل دیا ہے۔ (۱۹۵)

☆ آئینی سمجھوتے میں بنیادی حقوق کے تحفظ کی کوئی ضمانت موجود نہیں تھی۔ اس کے علاوہ آئینی سمجھوتے میں ایوان زیریں (قومی اسمبلی) کے ۲۱۰ نشستوں کی ضمانت دی گئی تھی لیکن آئینی مسودے میں ۱۹۷۱ء تک صرف ۱۴۴ نشستوں کا ذکر کیا گیا تھا جبکہ ایوانِ بالا (سینٹ) کے لیے ۶۰ کے بجائے ۴۰ نشستوں پر اکتفا کیا گیا۔ (ڈیلی پاکستان ٹائمز، ۳۱ جنوری ۱۹۷۳ء)

مولانا نورانی نے تسلیم کیا کہ وزیراعظم کو دوتہائی اکثریت سے ہٹائے جانے کی تجویز حزب اختلاف نے دی تھی تا کہ وزیراعظم مضبوط ہو۔ (۱۹۶) ☆

پی پی حکومت کے تمام غیر آئینی ہتھکنڈوں کے باوجود وہ اس بات کے حامی تھے کہ اگر حکومت نئے انتخابات کے انعقاد پر رضامند ہو جاتی ہے تو آئینی مسودے کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (۱۹۷)

ابھی آئینی محاذ پر حکومت اپوزیشن کشمکش جاری تھی کہ سیاسی حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ فروری ۱۹۷۳ء کے اوائل میں اسلام آباد میں واقع عراقی سفارت خانے سے ہتھیاروں اور گولہ بارود کی ایک بہت بڑی مقدار برآمد ہوئی (۱۹۸)۔ حکومت نے الزام لگایا کہ اپوزیشن بیرونی عناصر سے مل کر حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے۔ اس الزام کی بنیاد پر حکومت نے بلوچستان میں جمعیت علمائے اسلام اور نیپ کی مخلوط حکومت ختم کر دی۔ اس حکومتی اقدام کے ردعمل کے طور پر صوبہ سرحد میں مولانا مفتی محمود نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ (۱۹۹)

مولانا نورانی کا خیال تھا کہ وفاقی حکومت اپوزیشن کو دباؤ میں لا کر من مرضی کے فیصلے مسلط کرنا چاہتی ہے۔ انھوں نے اس حکومتی فعل کو مشرقی پاکستان میں جنرل یحییٰ خان کے اقدام سے مماثل قرار دیا۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ صدر اپنی پارلیمانی ٹیم کے ساتھ بلوچستان کا دورہ کرے۔ (۲۰۰)

متحدہ جمہوری محاذ کا قیام اور آئینی جدوجہد کا تسلسل

حکومت کی طرف سے اپوزیشن کو دیوار کے ساتھ لگانے کی پالیسی نے حزب اختلاف کی جماعتوں میں بے چینی پیدا کر دی تھی۔ ملک میں خوف و ہراس کی فضا قائم تھی کوئی بھی شخص حکومت سے مخالفت مول لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا (۲۰۱)۔ مخالف کش حکومتی اقدامات نے کئی اپوزیشن رہنماؤں کو گوشہ عافیت میں چلے جانے پر مجبور کر دیا اور کئی اپوزیشن رہنما حکومت کے ساتھ تعاون پر مجبور ہو گئے (۲۰۲)۔ ممتاز دولتانہ سفیر برطانیہ بن کر لندن چلے گئے۔ خان عبدالقیوم خان کو وزارتِ داخلہ کا لالچ دے کر حکومت نے اپنے ساتھ ملا لیا۔

☆ بھٹو وزارتِ عظمیٰ کے عہدے کو مضبوط دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ کمزور وزیراعظم ہمیشہ حزب اختلاف کے رحم وکرم پر ہوتا تھا۔ وزیراعظم بصورت دیگر صدارتی نظام پر بضد تھے۔ انھوں نے یک جماعتی نظام کو کلی طور پر مسترد کر دیا۔ (روزنامہ حریت ۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء)

حتیٰ کہ خود جمعیت کے تین ارکان میں محمد ابراہیم برق، مہر غلام حیدر بھروانہ اور صاحبزادہ نذیر سلطان جمعیت کا ساتھ چھوڑ گئے۔ (۲۰۳)

ابتداء میں حزب اختلاف کے قائد، مسلم لیگ کے سربراہ شوکت حیات خان تھے جن کے گیارہ ارکان تھے مگر جلد ہی یہ گیارہ کم ہوتے ہوتے ایک رہ گیا اور حزب اختلاف گھٹ کر چند ارکان پر مشتمل رہ گیا تو از سرنو حزب اختلاف بنانا پڑا۔ جس کے لیے قرعہ فال خان عبدالولی خان کے نام نکلا کیونکہ وہ حزب اختلاف کی تمام جماعتوں سے زیادہ اراکین قومی اسمبلی لیے ہوئے تھے۔ ان کی پارٹی کے سات ارکان منتخب ہوئے تھے اور یہ سات کے سات حزب اختلاف میں ڈٹے ہوئے تھے جبکہ مسلم لیگ کے گیارہ میں سے دس ارکان، جمعیت کے سات میں سے تین ارکان، منحرف ہو کر حکومت میں شامل ہو چکے تھے۔ (۲۰۴)

ان حالات کو دیکھتے ہوئے تمام اپوزیشن جماعتیں بھٹو کے غیر جمہوری اور ظالمانہ اقدامات کے خلاف اکٹھی ہوگئیں۔ چنانچہ ۱۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو راولپنڈی میں آزاد ارکان قومی اسمبلی اور حزب اختلاف کے رہنماؤں نے پیر مردان شاہ آف پگاڑا شریف (پ ۱۹۲۷ء) کی سربراہی میں متحدہ جمہوری محاذ (United Democratic Front) کے قیام کا فیصلہ کیا (۲۰۵)۔ مولانا نورانی کو متحدہ جمہوری محاذ کی کوآرڈی نیٹنگ (رابطہ عوام) کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ ☆ (۲۰۶)

☆ اس کے علاوہ اس اجلاس میں ایک دس رکنی آئینی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ آئینی بل میں کم از کم ضروری ترامیم تجویز کی جائیں۔ یوڈی ایف میں نیپ، پاکستان مسلم لیگ، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان، جماعت اسلامی، خاکسار تحریک (ق ۱۹۳۰ء اور پاکستان جمہوری پارٹی تھیں۔ اس کے علاوہ چند آزاد ارکان شامل تھے۔ متحدہ جمہوری محاذ نے ایک بارہ نکاتی اعلامیہ بھی جاری کیا۔ جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) پاکستان کی علاقائی سالمیت کا تحفظ
(۲) ایک اسلامی جمہوری، وفاقی اور پارلیمانی آئین کی منظوری کے لیے
(۳) بنیادی حقوق کی بحالی (۴) جبر وتشدد اور استحصال کا خاتمہ
(۵) فسطائیت کا خاتمہ (۶) صوبائی خودمختاری کی ضمانت
(۷) عراقی سفارت خانے سے اسلحہ کی برآمدگی کے معاملے کی تحقیق وتفتیش
(۸) مزدور، طلباء اور مزارعین کے حقوق کی حمایت . (۹) مثبت سیاسی اصولوں کی پیروی
(۱۰) نظریاتی سازشوں کے خاتمہ کے لیے مشترکہ جدوجہد (۱۱) کومت کی آمریت کی مخالفت
(۱۲) سانحۂ مشرقی پاکستان کے جنگی قیدیوں کی جلد واپسی کے لیے کوششیں وغیرہ۔

(پاکستان ٹائمز، لاہور، ۱۵ مارچ ۱۹۷۳ء)

نفاذِ اسلام، ملک میں ڈکٹیٹر شپ کے خاتمے اور حقیقی جمہوریت لانے کے لیے آپ نے عوامی رابطہ مہم کے انچارج کی حیثیت سے ملک کے طول وعرض کے دورے شروع کر دیے (۲۰۷) اور پھر مشترکہ طور پر جلسوں کا پروگرام بنایا چنانچہ متحدہ حزب اختلاف کی جانب سے عوامی طاقت کا پہلا مظاہرہ بصورت جلسہ پشاور میں ہوا جو حکومتی توقع کے برخلاف بہت زیادہ کامیابی سے ہمکنار ہوا (۲۰۸) اس جلسے میں تمام اپوزیشن رہنماؤں کا نہایت ہی پُرجوش استقبال کیا گیا اور خاص طور پر مولانا نورانی کو اسمبلی کے اندر اور باہر جرأت مندانہ کردار کی وجہ سے بے حد پذیرائی حاصل ہوئی (۲۰۹)۔ متحدہ اپوزیشن کی مہم کے سلسلے میں پشاور کے علاوہ کوئٹہ اور حیدرآباد کے جلسے بھی نہایت کامیاب رہے۔ (۲۱۰)

ادھر حکومت کی یہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اپوزیشن کی یہ رابطہ مہم ناکامی سے ہمکنار ہو اور عوام کے ذہنوں سے ان کے اثرات کو زائل کیا جا سکے جب یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی تو بھٹو حکومت بوکھلاہٹ کا شکار ہونے لگی۔ اس نے حزب اختلاف کے آئندہ پروگراموں کو سبوتاژ کرنے کے لیے غیر روایتی ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیے جس کے تحت لاؤڈ اسپیکر اکھاڑے جانے لگے اور عوام میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے لیے سیکیورٹی کے نام پر جلسے میں شرکت کرنے والوں پر برسرعام لاٹھیاں برسائی گئیں۔ پیپلز پارٹی کے غنڈوں کو کھلی چھوٹ دی گئی کہ وہ جس طرح بھی چاہیں ان جلسوں کو ناکام بنائیں۔ ان لوگوں نے جلسہ گاہوں میں پتھراؤ بھی کیا۔ گولیاں بھی چلائیں۔ جبکہ دوسری طرف پولیس امن وامان کے نام پر جلسے کے منتظمین اور کارکنوں کو گرفتار کرتی رہی اور انھیں جیلوں میں بند کر کے اذیتیں دیتی رہی حتیٰ کہ جمہوریت کی دعویدار حکومت نے حزب اختلاف کی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے ان کے تمام جلسوں کے اجازت نامے منسوخ کر دیے تاکہ اپوزیشن رہنماؤں کا رابطہ عوام سے منقطع کر دیا جائے۔ (۲۱۱)

اسی طرح ملتان میں بھی جلسہ عام نہ ہونے دیا گیا جلسہ گاہ قاسم باغ کے چاروں طرف ناکہ بندی کر دی گئی کسی کو اندر داخلے کی اجازت نہ دی گئی لیکن عوام پھر بھی ہزاروں کی تعداد میں پہنچ گئے تو ان پر لاٹھی چارج کر کے منتشر کیا جاتا رہا لیکن عوامی سیلاب نے چھوٹے چھوٹے جلسوں اور ریلیوں کی شکل اختیار کر لی اور علاقائی راہنما قومی رہنماؤں کا انتظار کیے بغیر خود ہی تقاریر کرنے لگے۔ (۲۱۲)

ادھر جس ٹرین سے مولانا نورانی کراچی سے ملتان آ رہے تھے اسے روہڑی روک دیا گیا اور اتنی تاخیر سے روانہ کیا گیا کہ جلسے کا وقت ہی ختم ہو چکا تھا مگر عوام اسٹیشن پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ حتیٰ کہ ریلوے اسٹیشن پر تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی۔ مولانا نورانی ملتان پہنچے اور اسی جگہ خطاب کرنا شروع کر دیا تو پولیس فورس نے انھیں وہیں روک دیا اور حکم نامہ دکھایا کہ آپ پورے ملتان ضلع میں کہیں خطاب نہیں کر سکتے (۲۱۳)۔ اس طرح متحدہ محاذ کی عوامی رابطہ مہم کے اجتماعات پر پابندی لگا دی گئی اور اس کو بالجبر ختم کر دیا گیا مگر مولانا نورانی نے مذہبی جلسوں اور بزرگان دین کے عرس کے نام پر ایک نئے انداز سے عوامی رابطے کو برقرار رکھا اور ہر جگہ اپنی تقاریر میں جمہوریت کا راگ الاپنے والی حکومت کے آمرانہ اقدامات سے عوام کو آگاہ کرتے رہے۔ (۲۱۴)

پیپلز پارٹی کی حکومت مولانا شاہ احمد نورانی کو غیر جمہوری انداز میں سچائی بیان کرنے سے جتنا روکتی تھی مولانا کا لہجہ اتنا ہی سخت ہوتا جا رہا تھا اور وہ اپنی جدوجہد کو مزید تیز کر دیتے تھے (۲۱۵)۔ انھوں نے صادق آباد میں اپنے خطاب کے دوران جمہوریت کے نام پر قائم آمریت کا عوامی عدالت میں ان الفاظ میں پردہ چاک کیا:

موجودہ حکومت آزادی تحریر و تقریر اور جمہوریت کے ساتھ مذاق کر رہی ہے۔ موجودہ حکومت کے دور میں غنڈہ گردی اور عیاشی میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ اپوزیشن کو ناکام بنانے کے لیے پتھراؤ کیا جاتا ہے۔ غنڈہ گردی کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جا رہا ہے اور غنڈوں پر کوئی قانون لاگو نہیں کیا جاتا۔ پچیس سالہ تاریخ میں مزدوروں پر اتنا ظلم کبھی نہیں ہوا جتنا آج کل ہو رہا ہے۔ ایسی ظالم حکومت کے قائد کو قائد عوام کیسے کہا جا سکتا ہے۔ حکومت کا عوام سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت عوام کے سامنے آنے کی جرأت نہیں کرتی۔ (۲۱۶)

جب ایک طرف مولانا نورانی نے متحدہ جمہوری محاذ کی کوآرڈی نیٹنگ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے رابطہ عوام مہم جاری رکھی ہوئی تھی تو اس اثناء میں محاذ کی آئینی کمیٹی نے مزید وقت ضائع کیے بغیر کم از کم دفعات پر مشتمل ایک چارٹر آف ڈیمانڈ تشکیل دے دیا۔ یہ چارٹر آف ڈیمانڈ ۱۶ مارچ ۱۹۷۳ء کو بھٹو حکومت کے حوالے کیا گیا۔ (۲۱۷)

اس میں عدلیہ کی آزادی، الیکشن کمیشن کے قیام، بنیادی حقوق اور وزیر اعظم کے

اختیارات کے متعلق نکات شامل تھے۔ تاہم بھٹو حکومت نے اس چارٹر آف ڈیمانڈ کو درخور اعتناء نہ سمجھا تو محاذ نے فیصلہ کیا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو راولپنڈی میں ایک جلسہ عام منعقد کر کے عوام پر اپنی پوزیشن واضح کی جائے (۲۱۸)۔ حکومت نے اس جلسے کو جبر و تشدد سے سبوتاژ کر دیا جس کے نتیجے میں ایک درجن سے زائد افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے۔ (۲۱۹)

اس ظلم و تشدد کے خلاف احتجاج کے طور پر محاذ کی قیادت نے فیصلہ کیا کہ آئندہ اسمبلی سیشن کا بائیکاٹ کیا جائے (۲۲۰) تاہم بھٹو نے حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے ۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو اپوزیشن کو دعوت نامہ بھجوایا تا کہ قومی اتفاق رائے (National Consensus) کو ممکن بنایا جا سکے (۲۲۱)۔ بھٹو نے محاذ کے بعض مطالبات تسلیم بھی کر لیے اور انھیں ۷ اپریل کے اسمبلی سیشن میں شرکت کی دعوت بھی دی۔ لیکن محاذ نے بائیکاٹ کے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا (۲۲۲)۔ بعد ازاں جب مذاکرات کے فائنل راؤنڈ میں بھٹو نے کچھ اور ترامیم بھی تسلیم کر لیں تو متحدہ جمہوری محاذ نے اجلاس میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ (۲۲۳)

اس کے بعد قومی اسمبلی میں ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو رائے شماری کرائی گئی تا کہ معلوم کیا جا سکے کہ اپوزیشن کے کون کون سے رہنما مجوزہ آئین کی مخالفت کرتے ہیں (۲۲۴)۔ آئین پر رائے شماری سے قبل متحدہ جمہوری محاذ کے رہنماؤں کا اجلاس اسلام آباد میں ہوا جس میں شریک زیادہ تر پارٹی رہنماؤں کی رائے یہی تھی کہ آئین کے حق میں ووٹ دیا جائے۔ لیکن مولانا نورانی کی رائے تھی کہ پیپلز پارٹی نے دستوری معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے اور آئین میں شامل اسلامی دفعات تسلی بخش نہیں ہیں۔ اس لیے جمعیت علمائے پاکستان کے ارکان آئین کے حق میں ووٹ نہیں دیں گے۔ (۲۲۵)

خان عبدالولی خان، سردار شوکت حیات، مولانا ظفر احمد انصاری اور متحدہ جمہوری محاذ کے دیگر قائدین کے دلائل کے بعد طے پایا کہ جمعیت علماء پاکستان کے ارکان آئین کے خلاف ووٹ نہیں دیں گے لیکن مولانا شاہ احمد نورانی اپنے اس نظریے پر ثابت قدمی سے قائم رہے کہ وہ اور جمعیت کے ارکان قومی اسمبلی مجوزہ آئین کے حق میں کھڑے نہیں ہوں گے۔ (۲۲۶)

مولانا نورانی اور ان کے رفقا اپنے اس عزم پر عمل پیرا رہے۔ جب دستور پر رائے شماری ہوئی تو مولانا شاہ احمد نورانی، علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری، مولانا محمد علی رضوی اور مولانا محمد

ذکاء نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا (۲۲۷)۔ جب کہ اپوزیشن کے دیگر رہنماؤں میر غوث بخش بزنجو، عبدالولی خان اور پروفیسر غفور نے آخری وقت تک یہ کوشش جاری رکھی کہ مولانا نورانی کسی طرح کھڑے ہو جائیں لیکن آپ ہمیشہ کی طرح اپنے مضبوط ارادے پر قائم رہے۔ اسمبلی میں تحریک استقلال سے وابستہ ارکان محمود علی قصوری، احمد رضا قصوری اور پیپلز پارٹی کے ایک رکن میر علی احمد تالپور نے بھی دستور کے خلاف ووٹ دیا۔ (۲۲۸)

مولانا نورانی سے ایک صحافی نے جب یہ سوال کیا کہ آپ مشترکہ حزب اختلاف کے رابطہ سیکرٹری کے اہم عہدے پر فائز ہیں جب کہ اپوزیشن نے نئے آئین کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ آپ نے اس کے حق میں ووٹ کیوں نہیں دیا؟ آپ نے جواب دیا:

آئین کی دفعات کو میں مکمل طور پر اسلامی نہیں سمجھتا اور یہی میری جماعت کا بھی موقف ہے۔ جہاں تک متحدہ جمہوری محاذ کا تعلق ہے، ہم نے اپنی پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں یہ طے کیا تھا کہ ہر شخص انفرادی طور پر آئین کے بارے میں جو رائے رکھتا ہے اس کا اظہار کرے۔ اس لیے رابطہ کمیٹی یا مشترکہ حزب اختلاف سے اختلاف کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رابطہ کمیٹی نے اپوزیشن کے تمام ارکان کو یہ اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق ووٹ دیں یا نہ دیں۔ (۲۲۹)

دستور کے متعلق رائے شماری میں جمعیت علماء پاکستان کے اراکین کی طرف سے حصہ نہ لینا ایک اہم خبر بن گئی تھی اور قومی صحافتی حلقے اس پر حیرت انگیز تبصرے کر رہے تھے۔ مولانا نورانی نے کراچی میں اخبار نویسوں کو بتایا کہ دستور کی تیاری کے دوران جمعیت علماء پاکستان کے رہنماؤں کو مرکز اور سندھ میں وزارتوں اور سفارتوں کی پیشکش کی گئی لیکن ہم نے اسلام اور جمہوریت کی خاطر اسے ٹھکرا دیا۔ (۲۳۰)

مولانا نورانی نے کہا کہ ہم ایسی دستور کو کس طرح مکمل اسلامی کہہ سکتے ہیں جس کے اندر اسے مکمل طور پر اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ۹ سالہ مدت مقرر کی گئی ہے اور اس طرح خود حکمران پارٹی نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ اس عرصے کے بعد ہی آئین سازی مکمل طور پر قرآن وسنت کی روشنی میں ہوگی۔ پاکستان کی آئین سازی کی تاریخ میں مملکت کا سرکاری مذہب اسلام قرار دینے اور آئین میں مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا مطالبہ سب سے پہلے پیش کرنے کا سہرا جمعیت علماء پاکستان کے سر ہے۔ (۲۳۱)

لیکن ابھی تک ہمارے بہت سے بنیادی مطالبات تسلیم نہیں کیے گئے ہیں۔ اس لیے ہم نے رائے شماری میں حصہ نہ لے کر واضح طور پر اپنے اختلافات کا اظہار کر دیا ہے اور نئے آئین کی منظوری کے بعد دراصل ہمارے کام کا آغاز ہوا ہے۔ اب ہم اسلامی دفعات کو آئینی تحفظ دلانے اور عائلی قوانین کی تنسیخ، تینوں افواج کے سربراہوں کے لیے مسلمان ہونے کی شرط اور فتنہ ارتداد کو روکنے کی ضمانت حاصل کرنے کی جدوجہد کریں گے (۲۳۲)۔ اس طرح بالآخر ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو پاکستان کا مستقل آئین منظور ہوا۔ جسے ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء سے نافذ العمل ہونا تھا۔ (۲۳۳)

اگرچہ ۱۹۷۳ء کا آئین مکمل طور پر اسلامی آئین نہیں کہا جا سکتا لیکن مولانا شاہ احمد نورانی اور دیگر علمائے کرام کی کوششوں سے اس آئین میں بعض اسلامی شقیں شامل کر لی گئیں اور اس طرح کمیونسٹ عناصر جو پاکستان کو کمیونزم کی آماجگاہ بنانا چاہتے تھے، اپنے مقاصد میں ناکام ہو گئے۔ (۲۳۴)

متحدہ جمہوری محاذ، جمعیت اور مولانا نورانی...... آئین کی منظوری کے بعد کا لائحہ عمل

مولانا شاہ احمد نورانی نے کراچی میں ایک استقبالیے سے خطاب کرتے ہوئے آئین کی منظوری کے حوالے سے کہا کہ یہ آئین نہ تو مکمل طور پر جمہوری ہے نہ اسلامی، اس لیے ان کی جماعت اسے نظام مصطفیٰ ﷺ سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھے گی (۲۳۵)۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ آئین ۱۲ ربیع الاول سے لاگو کیا جائے اور اس دن کو یوم نظام مصطفیٰ ﷺ قرار دیا جائے۔ ☆ (۲۳۶)

اسی اثناء میں جمعیت علمائے پاکستان کے زیر اہتمام ۲۶، ۲۷ مئی ۱۹۷۳ء کو خانیوال کنونشن کا اہتمام کیا گیا اس میں متعدد قرار دادیں منظور کی گئیں۔ ان میں نئے انتخابات کے انعقاد، محمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی اشاعت اور ہنگامی حالات کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا (۲۳۷)۔ کنونشن میں بعض حکومتی پروردہ علماء (جن میں صاحبزادہ فیض الحسن (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۴ء)

☆ روزنامہ ڈان نے ۱۶ اپریل ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں رپورٹ کیا کہ اگرچہ جے یو پی نے آئین پر دستخط نہیں کیے کہ لیکن اس کے پارلیمانی لیڈر مولانا نورانی آئین منظور ہونے کی کارروائی کے دوران اسمبلی میں موجود بھی رہے اور اس کی کامیابی کے لیے دعا بھی مانگی۔

(قادری، صدیق خان، آئین میں مسلمان کی تعریف، ص ص ۱۰۔۱۲)

پیش پیش تھے) نے کوشش کی کہ متحدہ جمہوری محاذ میں شمولیت کے فیصلے کی وجہ سے مولانا کے خلاف ایکشن لیا جائے۔ (۲۳۸) ☆

تاہم کنونشن کے مندوبین کی اکثریت نے مولانا نورانی کا ساتھ دیا اور حکومت کو جے یو پی میں انتشار کی کوششوں میں کامیابی حاصل نہ ہوئی (۲۳۹)۔ کنونشن میں مندوبین سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نورانی نے کہا:

ہم نے کوشش کی کہ ماضی کی روایت نے جو تاثر پیدا کر دیا تھا اسے ختم کر دیں اور میں یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوں گا کہ عملی طور پر ہم اس تاثر کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اب جمعیت علماء پاکستان میں ایسے اصحاب قیادت پر فائز ہیں جو کسی ڈر اور خطرے کے بغیر کلمہ حق کہنا اپنے لیے باعث نجات اور توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔ کم از کم میں اپنی، مولانا عبدالستار خان نیازی اور اپنے تمام رفقاء کی جانب سے یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ ہم پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ کلمہ حق کو انشاء اللہ بلند کرتے رہیں گے...... کافی عرصہ سے ارباب حکومت اس کوشش میں ہیں کہ ایوب خان دور کے درباری مشائخ صاحبزادگان اور مولویوں کو جمعیت پر پھر سے مسلط کر دیں (یا) کم از کم ایک متوازی جمعیت ہی قائم کرا دیں...... لیکن داخلی طور پر جمعیت اپنے ارکان میں اتنی مقبول ہے کہ اب ان درباری اور خوشامدی لوگوں کا نوٹس نہیں لیا جائے گا...... اس میں شک نہیں کہ ہماری جماعت کے بعض افراد ارباب حکومت کے ایماء پر یہ مہم چلا رہے تھے۔ انھیں توقع تھی کہ وہ کنونشن کے مندوبین سے متحدہ جمہوری محاذ سے جمعیت کی علیحدگی کا فیصلہ کرا لیں گے۔ ☆☆ (تاہم) ہماری کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے کھلے دل سے اس مسئلہ پر عام بحث کی دعوت دے دی اور دلائل کے ساتھ مخالفین کو قائل کیا۔ ہماری سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ نیپ ہو یا جماعت اسلامی، جمعیت علماء اسلام ہو

☆ کیونکہ مولانا نورانی خواجہ قمر الدین سیالوی کے استعفیٰ کی وجہ سے ان دنوں جمعیت کے قائم مقام صدر کے طور پر کام کر رہے تھے۔

☆☆ واضح رہے کہ اس کنونشن میں جمعیت کے مرکزی ہی نہیں بلکہ تمام صوبائی جنرل کونسلوں کے ارکان شریک تھے۔ ان کے علاوہ خصوصی دعوت پر بھی بہت سے مندوبین شریک ہوئے۔ بحث نماز عصر کے بعد شروع ہوئی۔ نمازوں اور کھانے کے وقفہ کے ساتھ رات دو بجے تک جاری رہی۔ صرف چار ارکان نے مخالفت کی جبکہ بھاری اکثریت نے محاذ کے ساتھ وابستگی کی منظوری دی۔

یا مسلم لیگ، ہم نے اتحاد بارہ نکات کی بنیاد پر کیا ہے۔ اگر ان نکات میں کوئی برائی ہے تو بتائے لیکن ان نکات پر کوئی اعتراض نہ کیا جا سکا اور اس طرح ہمارے مخالفین کو شکست تسلیم کرنا پڑی۔ جہاں تک میرے صدر منتخب ہونے کا تعلق ہے۔ میرے خلاف نہ تو کوئی امیدوار کھڑا ہوا اور نہ ہی کوئی ووٹ میرے خلاف ڈالا گیا۔ اس طرح سے ناظم اعلیٰ کا انتخاب بھی اتفاق رائے سے کیا گیا۔ (۲۴۰) ☆

متحدہ جمہوری محاذ کی رابطہ اور اطلاعات کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے محاذ کی آئندہ لائحہ عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نورانی نے کہا:

رابطہ عوام کی مہم محاذ کے مرکزی رہنماؤں کی طرف سے شروع کی گئی تھی۔ پشاور، کوئٹہ، حیدر آباد، کراچی، ملتان اور لاہور کے دورے اس مہم کے سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ پشاور، کوئٹہ اور حیدر آباد میں محاذ کے جلسے بہت کامیاب رہے اور ان میں ذرہ بھر بھی ہنگامہ نہ کرایا جا سکا لیکن ان تین عام جلسوں کی کامیابی دیکھ کر ارباب حکومت محاذ کی رابطہ عوام مہم سے بوکھلا گئے اور ہمارے جلسے منعقد ہونے سے پہلے سٹیج اور لاؤڈ سپیکر اکھاڑ دیے گئے، عوام میں خوف و ہراس پیدا کیا گیا اور اس حقیقت کی گواہی لاکھوں عوام پر پُرامن جلسے منعقد کر کے جمہوری اور آئینی قدروں کو بحال کیا، ملتان، کراچی اور لاہور میں جلسے نہ ہونے دیے گئے پہلے اجازت دے کر پھر اجازت نامے منسوخ کر دیے گئے اور اس طرح ارباب حکومت نے نہ صرف یہ کہ جمہوری اقدار کو پامال کیا بلکہ جمہوری عمل کو بھی مسدود کر دیا اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ موجودہ ارباب حکومت عوام کا اعتماد کھو بیٹھے ہیں اور اب وہ سرکاری مشینری، پولیس فیڈرل، سیکورٹی فورس، پولیس پیپلز گارڈ اور لاقانونیت کے عادی عناصر کے بل پر چل رہے ہیں...... موجودہ ارباب حکومت کے عزائم ایک سال سات ماہ کے عرصہ میں بالکل عیاں ہو چکے ہیں اور وہ یہ کہ وہ عوامی نہیں بلکہ فسطائی حکمران ہیں جو ہٹلر اور مسولینی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے دور حکومت میں اتنے مزدوروں کو گولیوں سے مارا ہے کہ صرف پاکستان

☆ خانیوال کنونشن میں ہی جمعیت علماء پاکستان کا نیا دستور بھی منظور کیا گیا۔ نئے دستور پر سولہ گھنٹے کے قریب بحث و غور کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے بعد اس کی منظوری دے دی گئی۔ اس میں جمعیت پر کسی فرد یا کسی مقتدر شخص کے شخصی اقتدار کی اجارہ داری ختم کر دی گئی ہے۔ وہ اس طرح کے نئے دستور کی رو سے صدر کا انتخاب صرف دو سال کے لیے ہوگا۔ دو سال کے بعد بھی وہ صدارت کا انتخاب لڑنے کا اہل ہے لیکن دو مرتبہ کے بعد وہ تمام عمر جمعیت کا صدر نہیں بن سکے گا۔ (ماہنامہ ترجمان اہل سنت کراچی، جون ۱۹۷۳ء، ص ۷۹۔۸۰)

کی تاریخ ہی نہیں بلکہ شکاگو کی تاریخ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ارباب حکومت میں سے بعض کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ انھوں نے اپنی سرپرستی میں سمگلنگ کرائی اور اب تک کرا رہے ہیں۔ انھوں نے سرمایہ داروں کو تحفظ دیا ہے۔ انھیں بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا ہے۔ ابھی حال ہی میں سیاحت کارپوریشن کا چیئرمین بائیس خاندانوں کے ایک ممتاز نمائندے مسٹر کاؤس جی کو مقرر کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے مسٹر رفیق کے سپرد پی آئی اے کو کیا جاچکا ہے۔ نوکر شاہی اور افسر شاہی کو پھر قوم پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ افسر شاہی کے ایک بہت بڑے نمائندے مسٹر عزیز احمد کو وزیر بنا دیا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت بلکہ اعتراف ہے کہ پیپلز پارٹی میں اہل افراد موجود نہیں۔ (۲۴۱)

آئین ۱۹۷۳ء پر دستخط کے حوالے سے متحدہ جمہوری محاذ کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

آئین کی وضاحت کو میں مکمل اسلامی نہیں سمجھتا اور یہی میری جماعت کا بھی موقف ہے۔ جہاں تک متحدہ جمہوری محاذ کا تعلق ہے ہم نے اپنی پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں طے کیا تھا کہ ہر شخص انفرادی طور پر آئین کے بارے میں رائے رکھتا ہے۔ اس کا اظہار کرے۔ اس لیے رابطہ کمیٹی اور مشترکہ حزب اختلاف کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور رابطہ کمیٹی نے اپوزیشن کے تمام ارکان کو یہ اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق ووٹ دیں یا نہ دیں...... (جہاں تک جمعیت علمائے اسلام کے غلام غوث ہزاروی (۱۸۸۵ء-۱۹۸۱ء) کا تعلق ہے) مولانا غلام غوث ہزاروی، جمعیت علماء اسلام کے ممتاز رکن ہیں...... جمعیت کی جنرل کونسل نے ان کی موجودگی میں محاذ میں شرکت کے فیصلے کی توثیق کی تھی۔ اس لیے مولانا غلام غوث ہزاروی کے لیے مناسب یہی تھا اور ہے کہ وہ اپنی جماعت کے فیصلے کی پابندی کریں...... جہاں پر محاذ کے اہم عہدوں پر جماعت اسلامی کے ارکان کا تعلق ہے تو وہ سب سے اہم عہدہ صدارت کا ہے جو مسلم لیگ کے پاس ہے اور پھر تمام فیصلے کسی عہدے یا شخصیت کی بنیاد پر نہیں ہوتے بلکہ اکثریت کی رائے سے ہوتے ہیں اور ان فیصلوں میں تمام جماعتیں شامل ہوتی ہیں۔ اس لیے کسی ایک جماعت کو اس سلسلے میں کوئی فوقیت حاصل نہیں اس پس منظر میں غلام غوث ہزاری کے اعتراض کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ (۲۴۲)

مولانا نورانی نے بلوچستان میں آرمی ایکشن اور آزاد کشمیر حکومت کے خلاف

سازشوں کی بھی مذمت کی۔ (۲۴۳)

آئین کی منظوری کے بعد متحدہ جمہوری محاذ کے رہنماؤں نے نیا سیاسی ایجنڈا تشکیل دیا جس کے تحت آئین کے جلد از جلد نفاذ کے لیے بڑی بڑی عوامی ریلیوں کا انعقاد کیا گیا (۲۴۴) نفاذ آئین کے سلسلے میں حکومت اور محاذ کے درمیان ۲۹ جون ۱۹۷۳ء کو مذاکرات مری کے مقام پر ہوئے لیکن حکومتی ہٹ دھری کی وجہ سے ناکام رہے (۲۴۵)۔ اس دوران سیاسی فضا میں مزید کشیدگی اس وقت پیدا ہوئی جب قومی اسمبلی نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لیے قرارداد پاس کی (۲۴۶)۔ اپوزیشن نے اسمبلی سیشن کا بائیکاٹ کر دیا (۲۴۷)۔ مولانا نورانی نے "مری مذاکرات" سے پہلے ہی حکومت پر واضح کر دیا تھا کہ حکومت کی طرف سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی صورت میں جمعیت حمایت نہیں کرے گی۔ (۲۴۸)

۲۹ جولائی ۱۹۷۳ء کو متحدہ جمہوری محاذ نے لاہور میں ایک قومی کنونشن کا اہتمام کیا جس میں اعلان کیا گیا کہ اگر ۲۴ اگست ۱۹۷۳ء تک عوام کے بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کا تحفظ نہ کیا گیا اور دفعہ ۱۴۴ کے تحت آزادی اظہار پر سے پابندی نہ ہٹائی گئی تو حکومت کے خلاف ملک گیر تحریک چلائی جائے گی۔ (۲۴۹)

انتخاب وزیر اعظم

اس دوران ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت وزیر اعظم کے انتخاب کا مرحلہ آ گیا تو متحدہ جمہوری محاذ نے اس اہم معاملے پر غور و خوض کے لیے سربراہی اجلاس منعقد کیا جس میں یہ طے کرنا تھا کہ آیا وزارت عظمیٰ کا الیکشن لڑا جائے یا نہیں اور اگر لڑا جائے تو وزیر اعظم کا امیدوار کون ہونا چاہیے کیونکہ پیپلز پارٹی کی طرف سے مسٹر بھٹو وزیر اعظم کے امیدوار تھے جو اس وقت صدارتی عہدے پر بھی فائز تھے۔ (۲۵۰) نیز یہ کہ وزیر اعظم کے ووٹر قومی اسمبلی کے ارکان تھے اور جس طرح ایوان میں پیپلز پارٹی کی اکثریت تھی اس کے پیش نظر اس کی ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جبکہ بھٹو صاحب کی یہ خواہش تھی کہ وہ بلا مقابلہ وزیر اعظم منتخب ہو جائیں تاکہ وہ قوم میں یہ تاثر دے سکیں کہ پورے ملک میں ان کے سامنے کوئی شخصیت نہیں جو کہ کسی سطح پر بھی ان کے مقابلے میں آئے چنانچہ تفصیلی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ وزارت عظمیٰ کا الیکشن لڑا جائے گا تاکہ قوم کے سامنے متبادل قوت و قیادت کا تصور پیش کیا

جائے اور بھٹو کے طلسم کو توڑا جائے (۲۵۱) اور اس کے بلامقابلہ منتخب ہونے کے ارادے کو خاک میں ملا دیا جائے اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اس کے مقابلے میں کون آئے گا کیونکہ ضروری تھا کہ اس اہم ترین منصب کے لیے مقابلے پر وہی شخصیت ہو جس کا ماضی و حال اقتدار پرستی کی غلاظتوں سے پاک ہو جو فہم و فراست، جرأت و بہادری، معاملہ فہمی اور ملکی و بین الاقوامی سیاست پر گہری نظر رکھتا ہو، جو درمیان ہی میں بھٹو کے دباؤ یا لالچ میں آ کر الیکشن لڑنے سے انکار نہ کر سکے (۲۵۲)۔ چنانچہ اس نازک ترین موقعہ پر تمام اپوزیشن رہنماؤں کی نظر انتخاب مولانا نورانی پر پڑی جو مذکورہ بالا تمام خصوصیات کے حامل تھے (۲۵۳)۔ یوں ۵ اگست ۱۹۷۳ء کے اس کل اپوزیشن جماعتی اجلاس میں مولانا نورانی کی نامزدگی نے یہ بات طے کر دی کہ سوشلسٹ، ذہین و فطین سیاستدان بھٹو کا مقابلہ مولانا نورانی ہی کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دیگر جماعتوں کی قیادت نے بھی مولانا نورانی کو اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ (۲۵۴)

یوں مولانا نورانی عملی سیاست کے صرف تین سال بعد ہی اس مقام پر پہنچ چکے تھے جن پر دیگر قومی رہنما عرصہ دراز سے نہ پہنچ پائے تھے، وزیر اعظم کے انتخاب میں آپ نے بڑے اعتماد سے مسٹر بھٹو کا مقابلہ کیا اور ۳۲ ووٹ حاصل کیے یوں انھوں نے بھٹو کے بلامقابلہ وزیر اعظم بننے کی اس خواہش کو ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دیا۔ (۲۵۵)

آپ کو اپوزیشن کے تقریباً تمام ہی ارکان نے ووٹ دیا صرف جمعیت علماء اسلام کے تین ارکان مولوی غلام غوث ہزاروی، مولوی عبدالحکیم اور مولوی عبدالحق (والد مولوی سمیع الحق) نے آپ کے مقابلے میں بھٹو کو ووٹ دینے کو ترجیح دی۔ (۲۵۶) ذوالفقار علی بھٹو کا وزارت عظمیٰ کے انتخابات میں مقابلہ کرنے کے بعد مولانا نورانی کی شخصیت قومی سیاسی افق پر ایک نئے انداز سے ابھری کہ تمام قومی راہنماؤں کا آپ کی شخصیت پر اعتماد ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ چنانچہ پیر کرم شاہ الازہری نے انھیں یوں خراج تحسین پیش کیا:

عام انتخابات کے بعد قومی اسمبلی میں جمعیت علماء پاکستان کا جو پارلیمانی گروپ تشکیل دیا گیا اس کی قیادت مولانا شاہ احمد نورانی کے سپرد کی گئی اس عرصہ میں بڑے کٹھن اور صبر آزما مراحل بھی آئے، ابتلاء و آزمائش کی روح فرسا اذیتوں کو بھی طے کرنا پڑا۔ ترکیب و ترغیب کے ہتھکنڈے بھی استعمال کیے گئے لیکن ہر موقع پر اس بطل جلیل نے اپنی بالغ نظری مومنانہ فراست اور قائدانہ صلاحیتوں کا وہ مظاہرہ کیا کہ اپنے اور بیگانے سب عش عش کر اُٹھے،

ریڈیو اور ٹیلی ویژن پہ آئین کے متعلق اپوزیشن کے عام لیڈروں کے انٹرویو نشر ہوئے لیکن مولانا نورانی کے انٹرویو کی شان ہی نرالی تھی۔ جس مہارت اور حذاقت سے انھوں نے اس شاطر نقاد کو ہر نکتے پر مات دی اور لاجواب کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ غرض کہ نجی گفتگو ہو یا مجمع عام میں سیاسی خطاب، اپنے حامی اور عقیدت مندوں کا حلقہ ہو یا مخالفین کا ہجوم، آئین سازی کی مہم ہو یا متحدہ محاذ کی تشکیل کا مرحلہ، ہر جگہ نورانی میاں منفرد نظر آتے ہیں۔ اہلسنت کو ان کی کارکردگی پر فخر ہے یہ مرد درویش ابتداء سے آخر تک اپنے موقف پر ڈٹا رہا ان کو جن جاں گسل مرحلوں سے گزرنا پڑا ان کی شدت کا صحیح احساس وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے حالات پر کڑی نظر رکھی ہو...... جمعیت علماء پاکستان کے وہ نمائندے جو پنجاب سے منتخب ہوئے بجز حضرت مولانا محمد ذکاء کے انھوں نے اپنا قومی فرض ادا نہ کیا۔ انھوں نے ہماری امید کو ٹھیس پہنچائی ہے اپنے بے غرض اور بے لوث کارکن کا منہ چڑایا ہے۔ جو قوم سے ان کے لیے ووٹوں کی بھیک مانگتے رہے۔ (۲۵۷)

جمعیت علماء پاکستان کو ایک خاص مذہبی جماعت سے اٹھا کر ملک کی معروف سیاسی جماعتوں کی صف میں لا کھڑا کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ مولانا شاہ احمد نورانی بروقت اظہار رائے پر خاص توجہ دیتے تھے جو ایک اچھے سیاسی رہنما کے لیے ضروری وصف ہے۔ وہ جرأت و بے باکی کے ساتھ کسی ذہنی تحفظ کے بغیر بات کرنے کے قائل تھے۔ (۲۵۸)

جمعیت کی سابقہ قیادت کے برعکس موجودہ قیادت نے ملکی سیاست میں انتہائی جاندار کردار انجام دے کر یہ ثابت کر دیا کہ محض قیادت کی وجہ سے کسی مکتب فکر کے بارے میں کوئی پختہ رائے قائم نہیں کر لینی چاہیے۔ جمعیت کی سیاست میں دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد مولانا شاہ احمد نورانی ایک نمایاں سیاستدان کے طور پر اُبھرے۔ انھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی کلمہ حق بلند کرنے میں کبھی پس و پیش سے کام نہیں لیا اور اس حقیقت کو نظر انداز کرنا آسان نہیں کہ پہلے قومی اسمبلی میں مشترکہ حزب اختلاف اور بعد میں متحدہ جمہوری محاذ کے قیام میں مولانا نے نمایاں اور ٹھوس کردار ادا کیا۔ (۲۵۹)

جب متحدہ جمہوری محاذ کی قیادت نے دیکھا کہ حکومت کسی بھی طرح کے سمجھوتے پر تیار نہیں اور نہ ہی وہ آئین کے جلد نفاذ کا ارادہ رکھتی ہے تو ۲۴ اگست ۱۹۷۳ء کو سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کر دیا (۲۶۰)۔ دورانِ تحریک مولانا نورانی کا موقف تھا کہ حکومت عوام میں

اعتماد کھو چکی ہے اس لیے نئے انتخابات ناگزیر ہو گئے ہیں۔ (۲۶۱)

گوجرانوالہ میں ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے کہا کہ حکومت سے مذاکرات خارج از امکان ہیں اور تحریک کا واحد مقصد حکومت کو آئین اور جمہوری اقدار کی احترام پر مجبور کرنا ہے (۲۶۲)۔ لیکن ابھی سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ہی تھا کہ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں عرب اسرائیل جنگ چھڑ گئی۔ جس کی وجہ سے عوام کی توجہ وقتی طور پر بین الاقوامی حالات پر مرکوز ہو گئی۔ مولانا نورانی نے عربوں کی حمایت کرتے ہوئے عرب بھائیوں کی امداد کے لیے رضا کار بھجوانے کی تجویز بھی پیش کی۔ انھوں نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو امریکہ کے خلاف یوم مذمت منانے کا اعلان کر دیا۔ (۲۶۳) جے یو پی کے سندھ سے سینیٹر مفتی محمد ظفر علی نعمانی نے سینٹ میں عربوں کی حمایت میں ایک قرارداد پیش کی لیکن حکومت نے بعض تکنیکی وجوہات کا بہانہ بنا کر سینٹ میں اسے منظور نہیں ہونے دیا۔ (۲۶۴)

مولانا شاہ احمد نورانی اور تحریک ختم نبوت ۱۹۷۳-۷۴ء

ختم نبوت کے سلسلہ میں چلائی گئی تحریک ۱۹۵۳ء مارشل اور تشدد کے نتیجے میں وقتی طور پر دم توڑ گئی تھی۔ بعد ازاں مارشل لاء ۱۹۵۸ء...... ۱۹۶۹ء کے دوران قادیانیوں کو سرکاری طور پر تحفظ حاصل رہا (۲۶۵) لیکن جمہوری دور کے آغاز سے ہی علمائے کرام نے ایک بار پھر اس مسئلہ کی طرف توجہ دی۔ مارشل لاء کا دور قادیانیوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ اس دوران انھوں نے نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی اپنے آپ کو خاصا مستحکم کر لیا (۲۶۶)۔ انھوں نے اپنی سرگرمیوں کو تیزی سے پھیلاتے ہوئے عوامی تنظیموں اور معاشی اداروں میں کلیدی آسامیاں حاصل کر لیں۔ مزید برآں انھوں نے یورپی طاقتوں اور صیہونی تنظیموں کی مکمل پشت پناہی سے بیرون ممالک اپنے تبلیغی مراکز قائم کر لیے۔ ایوب خاں تمام اہم معاملات میں قادیانی بیوروکریٹس پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ حتیٰ کہ معاشی منصوبہ بندی جیسے خاص معاملے اور بین الاقوامی معاملات کے میدان میں بھی ایوب خاں کی حوصلہ افزائی سے یہ لوگ اہم مناصب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (۲۶۷)

مرزا غلام احمد کا پوتا مرزا مظفر احمد (ایم ایم احمد) جو کہ پہلے فنانس سیکرٹری بنا۔ بعد ازاں پاکستان پلاننگ کمیشن کا ڈپٹی چیئرمین بن گیا ☆ (۲۶۸)۔

اسی طرح ایوب حکومت کی اعانت سے قادیانیوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی مذہبی و سیاسی تحریکوں کے خلاف معاندانہ سرگرمیاں شروع کریں (۲۶۹) ابتداء میں جماعت اسلامی ان کا نشانہ بنی (۲۷۰)۔ جماعت احمدیہ کی مجلس مشاورت کی سالانہ رپورٹ برائے ۱۹۶۳ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ جماعت اسلامی کے خطرے سے نمٹنے کے لیے مزید ذرائع پیدا کیے جائیں۔ ختم نبوت کے خلاف مزید لٹریچر تقسیم کیا جائے اور مشرقی پاکستان میں ایک سال کے لیے مؤثر مبلغ مقرر کیا جائے (۲۷۱)۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ:

۱۔ مخالفین جماعت احمدیہ نے ہمیشہ ''ختم نبوت'' کے نام پر ملک میں افراتفری پھیلانے کی کوشش کی لہٰذا اس خطرے سے نمٹنے کے لیے ان کی سرگرمیوں سے حکام بالا کو باخبر رکھا جائے۔

۲۔ ممکنہ شرارت سے آگاہی کے لیے افسران تک رسائی کا اہتمام ہونا چاہیے تاکہ ملکی امن کے لیے اس کے تباہ کن اثرات سے آگاہ کیا جا سکے۔

۳۔ علاقائی اور قومی اخبارات کے ذریعے شرارت کو دبانے کی سعی کی جائے۔

۴۔ ختم نبوت کے متعلق چوہدری ظفر اللہ کے خیالات کو ایک رسالے کی شکل میں شائع کر کے حکام بالا پولیس، وزراء اور اراکین پارلیمنٹ کو روانہ کیا جائے۔

۵۔ جماعت احمدیہ کی نظامتِ اصلاح و ارشاد اس سلسلے میں مناسب عملی اقدامات کرے۔ (۲۷۲)

۱۹۶۵ء میں جب ایوب خان کی طرف سے صدارتی انتخابات کا اعلان کیا گیا تو قادیانیوں نے متحدہ حزب اختلاف (Combined Opposition Parties) کے مقابلے میں ایوب خان کا کھل کر ساتھ دیا ☆ (۲۷۳)۔ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح

☆ تاہم دلچسپ امر یہ ہے کہ مغربی پاکستان جمعیت علمائے پاکستان میں شامل علماء اور مشائخ کی اکثریت نے مادرِ ملت کے خلاف ایوب خان کا ساتھ دیا۔ اس سلسلے میں ابوالبرکات سیّد احمد قادری نے عورت کی سربراہی کے خلاف فتویٰ بھی دیا۔

(Afzal, M: Rafique, Political Parties in Pakistan: 1958-1969, Islamabad, 1987, pp80-81)

(۱۸۹۳ء-۱۹۶۷ء) اور ایوب خان کی انتخابی مہم چلانے کے لیے ربوہ میں ایک خصوصی سیل قائم کر دیا گیا۔ نیشنل عوامی پارٹی، جماعت اسلامی اور کونسل مسلم لیگ کے سیاستدانوں کی کردار کشی کا مشن سونپا گیا (۲۷۴)۔ اس طرح قادیانیوں کی پشت پناہی سے فرضی تنظیموں نے سینکڑوں رسالے، جرائد، کتابچے اور اشتہارات شائع کروا کر تقسیم کرائے بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملکی مسائل سے توجہ ہٹانے کے لیے قادیانیوں نے جنرل ایوب کو ترغیب دی کہ وہ کشمیر پر حملہ کر کے اسے بزور طاقت حاصل کر لیں (۲۷۵) لیکن قادیانیوں کی کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ تاہم ستمبر ۱۹۶۵ء کے بھارتی حملے نے قادیانیوں کو کچھ عرصے کے لیے سہارا ضرور دیا کیونکہ ان کی خواہشات کے عین مطابق عوام کی توجہ اندرونی مسائل سے ہٹ گئی تھی۔ (۲۷۶)

قادیانی ایوب حکومت میں اس قدر اثر و رسوخ حاصل کر چکے تھے کہ انھوں نے ہر عوامی رد عمل اور تنقید کو میڈیا اور سرکاری مشینری کا سہارا لے کر روایتی تنگ نظری اور تعصب ثابت کیا۔ اس پر رہی سہی کسر مارشل لاء آرڈیننسز اور ڈی پی آرز نے نکال دی۔ بہت سے علماء کو فرقہ ورانہ جذبات کو ہوا دینے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا (۲۷۷)۔ پریس پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کئی اخبارات کے مدیروں اور ناشران کو حراست میں رکھا گیا۔ (۲۷۸)

مزید برآں قادیانیوں نے متحدہ مغربی پاکستان کے گورنر جنرل موسیٰ خاں سے رابطہ کر کے یکم اپریل ۱۹۶۶ء کو ہوم سیکرٹری سے ڈی پی آرز کے تحت تمام مدیروں، ناشران اور طابعین کے لیے ایک لیٹر جاری کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ کوئی بھی ایسا مواد شائع نہ کریں جو کسی بھی فرقے کے عقائد، ابتداء، الہامات یا پیش گوئیوں کے بارے میں ہو (۲۷۹)

بعد ازاں ۲۷ جولائی ۱۹۶۷ء کو گورنر کے حکم پر چٹان ہفت روزہ لاہور کے مدیر کو حکم جاری کیا گیا کہ وہ اشتعال انگیز فرقہ ورانہ تحریروں کی اشاعت یا ان میں ملوث ہونے سے باز رہے (۲۸۰)۔ لیکن یہ ہتھکنڈے ہفت روزہ چٹان کو نہ جھکا سکے (۲۸۱)۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ۲۱ اپریل ۱۹۶۸ء کو اس کا ڈکلیریشن منسوخ کر دیا گیا (۲۸۲)۔ ان کارروائیوں سے عوامی غیض و غضب میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا جو ایوب خان کے اقتدار کے خلاف "تحریک جمہوریت پاکستان" (Pakistan Democratic Movement) کی تحریک کی صورت میں نکلا (۲۸۳) اور جو بالآخر ایک اور مارشل لاء پر منتج ہوا۔ نئے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خاں نے جلد ہی جمہوریت کی بحالی کا وعدہ کیا اور دسمبر ۱۹۷۰ء میں انتخابات کرا دیے۔ جس کے

نتائج نے قوم کو دو واضح گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سال کے اندر اندر ملک کے دونوں بازو ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔ مارشل لاء انتظامیہ کی طرف سے مشرقی بازو میں طاقت کے استعمال نے بھارت کو جواز فراہم کر دیا کہ وہ بنگالیوں کی اعانت کے نام پر تخریب کار داخل کر سکے۔ اس طرح دسمبر ۱۹۷۱ء کو غیر ملکی اور قادیانیوں کی سازشوں سے پاکستان کو دولخت کر دیا گیا۔ قوم نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی وجوہات اور اس سازش میں ملوث یحییٰ خاں، ایم ایم احمد اور دیگر افراد کے خلاف مقدمے کا مطالبہ کیا۔ بھٹو نے اشک شوئی کی خاطر جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کر دیا تاکہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی وجوہات کا پتہ چلایا جا سکے۔ لیکن بھٹو نے اپنے دور حکومت میں اس رپورٹ کو کبھی شائع نہ کیا۔ (جس کی رپورٹ کافی قطع برید کے بعد ۲۰۰۳ء میں شائع کی گئی)

بھٹو حکومت کے ابتدائی دو سالوں میں قادیانیوں نے اس سے مکمل تعاون کیا۔ قادیانیوں کے اخبار "الفضل" ربوہ نے کئی اداریے لکھے جن میں لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ احتجاجی سیاست کو ترک کریں۔ امن امان کے قیام میں عوامی حکومت کی مدد کریں (۲۸۴)۔ لیکن بعد میں حالات نے ثابت کر دیا کہ قادیانی اپنی محسن بھٹو کے ساتھ بھی مخلص نہیں تھے۔ اپریل ۱۹۷۳ء میں بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے کی ایک سازش کا انکشاف ہوا۔ جس میں مبینہ طور پر تین قادیانی افسر ملوث تھے (۲۸۵)۔ جس سے بھٹو حکومت سے قادیانی فرقے کی وفاداریاں مشکوک ہو گئیں۔ چنانچہ پیپلز پارٹی قیادت نے قادیانیوں کی حمایت ترک کر دی (۲۸۶)۔ فوجی انقلاب میں قادیانیوں کے ملوث ہونے کا یہ مطلب تھا کہ آئین کو نیست و نابود کر دیا جائے اور اقتدار حاصل کیا جائے (۲۸۷)۔ لیکن قادیانیوں کی جڑوں پر ضرب کاری اس وقت لگی جب کشمیر اسمبلی نے ۲۹ اپریل ۱۹۷۳ء کو قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا (۲۸۸) جبکہ اس سے ٹھیک اگلے دن مولانا شاہ احمد نورانی کی تحریک پر قومی اسمبلی میں بھی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی غرض سے ۳۷ اراکین اسمبلی کے دستخطوں سے قرارداد پیش کی (۲۸۹)۔ اوپر نیچے دو شکستوں نے قادیانیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ (۲۹۰)

ان اقدامات کے بعد قادیانیوں نے غالباً یہ فیصلہ کر لیا کہ اب چپ بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر قادیانیت مخالف اقدام کو دبا دینے کی کوشش

کی۔ اس کی ایک مثال ۲۹ جولائی ۱۹۷۴ء کا ربوہ ریلوے اسٹیشن کا واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قادیانی اپنی حالیہ ہزیمت پر کس درجہ غضبناک تھے (۲۹۱)۔ واقعہ کی جزئیات کچھ یوں تھیں کہ ۲۲ مئی ۱۹۷۴ء کو نشتر میڈیکل کالج ملتان کے ایک سو کے قریب طلباء سیاحت کی غرض سے پشاور جا رہے تھے۔ راستے میں ربوہ ریلوے اسٹیشن پر انھوں نے ختم نبوت زندہ باد کے نعرے لگائے۔ ان طلبہ میں ایک دو قادیانی بھی تھے جنھوں نے ربوہ کے حسب ہدایات جاسوسی کا کام سنبھال رکھا تھا۔ چنانچہ اہل ربوہ نے فیصلہ کیا کہ طلبہ کو پشاور سے واپسی پر سبق سکھایا جائے گا (۲۹۲)۔ ۲۹ مئی کو واپسی پر چناب ایکسپریس کو ربوہ روک لیا گیا۔ جس میں طلبہ سوار تھے۔ قریباً پانچ ہزار کے قریب افراد جو کہ لاٹھیوں، کلہاڑیوں، ہاکیوں، خنجروں، تلواروں اور اسلحہ سے مسلح تھے پلیٹ فارم پر طلبہ کے منتظر تھے۔ ربوہ سے ایک اسٹیشن قبل ایک قادیانی العقیدہ اسٹیشن ماسٹر نے طلبہ کی بوگی پر نشان لگا دیا تاکہ پہچاننے میں آسانی رہے پھر یہ کہ ربوہ والوں کو مطلع اور مستعد رہنے کی غرض سے گاڑی تاخیر سے روانہ کی گئی (۲۹۳)۔ جب گاڑی ربوہ پہنچی تو بپھرے ہوئے ہجوم نے نہتے طلبہ پر ہلہ بول دیا اور گاڑیوں کے مقفل دروازے اور شیشے توڑ کر طلبہ کو بری طرح زدوکوب کیا گیا۔ ۳۰ کے قریب طلباء شدید زخمی ہوئے۔ نشتر میڈیکل کالج یونین کے صدر ارباب عالم تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گئے۔ طلبہ کے کپڑے پھاڑ دیے گئے اور ان سے قیمتی سامان چھین لیا گیا۔ (۲۹۴)

جب اس سانحہ کی خبر فیصل آباد اسٹیشن پہنچی تو غصے سے بھرے ہوئے لوگ اسٹیشن پہنچ چکے تھے جبکہ ڈپٹی کمشنر اور ایس ایس پی سمیت تمام انتظامیہ بھی اسٹیشن پر موجود تھی۔ مولانا تاج الدین محمود جو موقع پر موجود تھے انھوں نے زخمی طلبہ کو تسلی تشفی دی شدید زخمیوں کو فیصل آباد کے ہسپتالوں میں داخل کرا دیا گیا جبکہ باقی طلباء کو ایئر کنڈیشنڈ بوگی میں ملتان روانہ کر دیا۔ (۲۹۵)

۳۰ مئی کو ہفت روزہ چٹان سمیت متعدد اخبارات نے واقعہ کو نمایاں کوریج دی (۲۹۶)۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک بھر میں زبردست احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ تمام بڑے شہروں لاہور، فیصل آباد، ساہیوال، ملتان، سرگودھا، گوجرانوالہ وغیرہ میں لوگ سراپا احتجاج تھے۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ اس سانحہ کی عدالت عالیہ کے کسی جج سے تحقیقات کرائی جائے (۲۹۷)۔ جبکہ پنجاب اسمبلی میں حزب اختلاف کے اراکین جن میں مولانا شاہ احمد نورانی پیش پیش تھے نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ مرزائیوں کو فوری اقلیت

قرار دیا جائے (۲۹۸) اور انھیں کلیدی آسامیوں سے سبکدوش کر دیا جائے اور مجرموں کو عبرتناک سزا دی جائے۔ اسمبلی کی اس بحث میں قائد حزب اختلاف علامہ رحمت اللہ ارشد سمیت، چودہ اراکین صوبائی اسمبلی نے حصہ لیا۔ جن میں سید تابش الوری، ملک خداداد بندیال، حاجی محمد سیف اللہ، مخدوم زادہ حسن محمود، حافظ علی اسد اللہ، میاں خورشید انور، چوہدری امان اللہ، خانزادہ خان محمود وغیرہ پیش پیش تھے (۲۹۹)۔

مسئلہ قادیانیت قومی اسمبلی میں

مسئلہ کی سنگین نوعیت کے پیش نظر اور قادیانی عزائم کی سرکوبی کے لیے ضروری تھا کہ اس کی سرکوبی کے لیے علمائے کرام سیاسی و آئینی کوششیں بھی بروئے کار لائیں۔ قبل ازیں مولانا شاہ احمد نورانی آئین پاکستان ۱۹۷۳ء میں مسلمان کی متفقہ تعریف شامل کروا چکے تھے (۳۰۰)۔ چنانچہ ان کی طرف سے مناسب تیاریوں کے بعد قومی اسمبلی میں ۳۰ اپریل ۱۹۷۴ء کو قادیانیوں کے خلاف ایک قرارداد پیش کی گئی (۳۰۱)۔ جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے (۳۰۲)۔ اس پر حزب اختلاف کے ۲۲ ارکان کے دستخط موجود تھے (۳۰۳)۔ بعد ازاں دستخط کرنے والوں کی تعداد ۳۷ تک جا پہنچی۔ (۳۰۴)

مولانا شاہ احمد نورانی نے جب مولانا مفتی محمود سے قرارداد پر دستخط کے لیے کہا تو انھوں نے مولانا نورانی کو تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کی سختیاں یاد دلائیں اور کہا کہ آپ کیوں خون کی ندیاں بہانا چاہتے ہیں؟ (۳۰۵) مولانا نورانی نے جواباً کہا کہ ناموسِ مصطفوی ﷺ کی خاطر تمام مشکلات و مصائب سر آنکھوں پر، چنانچہ مولانا مفتی محمود نے قرارداد پر دستخط کر دیے (۳۰۶)۔

قرارداد کے پیش ہونے کے بعد اسپیکر قومی اسمبلی صاحبزادہ فاروق علی نے مولانا نورانی سے کہا کہ آپ نے یہ کیا مصیبت کھڑی کر دی۔ یہ بحث کرنا کہ کون مسلمان ہے یا کافر، پارلیمنٹ کا کام نہیں۔ یہ کسی مدرسہ یا دارالعلوم کی بحث ہے۔ آپ اس مسئلہ کو اسمبلی میں کیوں لانا چاہتے ہیں؟ (۳۰۷) لیکن مولانا نورانی نے بالآخر سب کو قائل کر لیا (۳۰۸)۔ بالخصوص انھوں نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کر کے انھیں معاملے کی نزاکت کا احساس دلایا۔ علامہ نورانی نے بھٹو سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ دیکھیے آپ وزیراعظم ہیں، اس

ملک کے سربراہ ہیں۔ اگر آپ کے ہوتے ہوئے کوئی شخص اپنے آپ کو وزیر اعظم کہنا شروع کر دے تو آپ اسے کس ذیل میں رکھیں گے۔ آپ اسے غدار قرار دیتے ہوئے اس پر مقدمہ بغاوت درج کرائیں گے۔ بعینہٖ ختم نبوت کا مسئلہ ہے آپ ﷺ کے بعد کوئی رسول اور نبی نہیں اور سادہ سی بات ہے جو اس عقیدے پر ایمان نہ رکھتا ہو تو اسی کا فر قرار دیا جائے۔ (۳۰۹)

اس طرح بھٹو لاجواب ہو گئے اور اسی پارلیمنٹ میں بحث کے لیے لانا منظور کر لیا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسے قواعد وضوابط کے تحت کس طرح اسمبلی میں لایا جاتا تو اس کا حل مولانا نورانی نے یہ تجویز کیا کہ رولز کے تحت ''پارلیمنٹ ان کیمرہ'' بلالی جائے۔ اس طرح ارکان قومی اسمبلی کی موجودگی میں بحث کروائی جائے (۳۱۰)۔

مولانا نورانی کے بقول:

''اس وقت ساری بحث کے نکات یحیٰی بختیار (اٹارنی جنرل پاکستان) نے تیار کیے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے بہت محنت کی۔ رات کے دو دو، تین تین بجے تک انھوں نے قادیانیوں سے پوچھے جانے والے سوالات تیار کیے۔ ہم ان کو بتاتے تھے کہ قادیانیوں کے یہ عقائد ہیں اور پھر وہ اس سے سوال تیار کرتے تھے۔ اسمبلی میں ہم سب کی طرف سے وہ بات کرتے تھے اور سوال کرتے تھے اور مرزا ناصر جواب دیتا تھا۔ ہم رات کو نکات یحیٰی بختیار صاحب کو لکھ کر دے دیتے تھے۔ میرے ساتھ ظفر احمد انصاری بھی تھے اور عبدالحفیظ پیرزادہ بھی۔ پھر یحیٰی بختیار ان کی چھان پھٹک کرتے کہ یہ سوال مناسب رہے گا یا نہیں؟ ہمیں یہ ثابت کرنا تھا کہ ربوہ دراصل ریاست کے اندر ایک ریاست ہے۔ اہم سیاسی پوائنٹ بھی مثلاً پاکستان میں جب پاسپورٹ بنوائیں تو اس پر یہ مہر لگتی ہے کہ سوائے اسرائیل کے تمام ممالک کے لیے کارآمد ہے لیکن یہ قادیانی اسرائیل کیسے جاتے ہیں۔ ان کا تل ابیب میں ہیڈ کوارٹر ہے اور یہودیوں نے انھیں اجازت دی ہوئی ہے۔ اس کے ثبوت کے طور پر ہم نے ''الفضل'' کے تمام پرچے اور ڈاک کے پتے جمع کروا کر یحیٰی بختیار کو دیے۔ جب انھوں نے مرزا ناصر سے پوچھنا شروع کیا کہ تل ابیب اور اسرائیل کی حکومت سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ آپ کا وہاں پر دفتر ہے تو وہ ان تمام باتوں سے انکار کر گیا تو پھر یحیٰی بختیار صاحب نے وہ تمام رسالے اور پتے جو ہم نے ان کو دیے تھے پیش کیے تو اسے ماننا پڑا کہ ہاں وہاں پر کچھ لوگ اپنے طور پر کام کر رہے ہیں۔ مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ قادیانیوں کے یہودیوں کے

ساتھ خصوصی تعلقات ہیں اور یہودیوں نے ان کو پناہ دے رکھی ہے جو وہاں کے بسنے والے ہیں مقامی عرب باشندوں کو تو وہ مار مار کر نکال رہے ہیں لیکن قادیانیوں کو وہاں آباد کیا جا رہا ہے۔ کئی سو کی تعداد میں قادیانیوں کو انھوں نے وہاں بسایا ہے جنھوں نے وہاں پر عمارتیں حاصل کر رکھی ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے کے لیے یہودی ان کو استعمال کرتے ہیں ہم نے یہ بھی ایک پہلو بتایا کہ جب پاکستان بن گیا تو انھوں نے ربوہ میں الگ جگہ لی ہے اور پنجاب کے پہلے گورنر سر فرنس موڈی نے ان کو ایک آنے گز پر وہ ساری زمین دی جو کئی سو ایکڑ زمین ہے۔ سر ظفر اللہ خان اس وقت وزیر خارجہ تھے۔ اس پوزیشن کا بھی انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ ہم نے یہ ساری چیزیں اسمبلی میں ثبوت کے طور پر پیش کیں۔ بھٹو صاحب بھی مان گئے اور پیپلز پارٹی نے ہماری مدد کی۔ اس وقت سیکولر قوتیں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ہم نے اسمبلی میں جاتے ہی محاذ بنا لیا۔ تمام دینی جماعتوں کو ساتھ ملا کر مفتی محمود، پروفیسر عبدالغفور اور میں یعنی جمعیت علمائے پاکستان، جمعیت اسلام اور جماعت اسلامی تینوں جماعتیں متحد ہو گئیں۔ آزاد ارکان سردار شیر باز مزاری اور الٰہی بخش سومرو کے والد مولا بخش مرحوم یہ سب ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے ۳۲ ارکان کے دستخط سے قرارداد پیش کی تھی کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔'' (۳۱۱)

مولانا شاہ احمد نورانی کی راہ حق سے ہٹانے کے لیے لاہور گروپ (قادیانیوں کا ایک فرقہ) کی طرف سے پچاس لاکھ تک کی بھی پیشکش ہوئی لیکن آپ نے اسے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا (۳۱۲)

مولانا شاہ احمد نورانی نے اسمبلی سے باہر جون ۱۹۷۴ء سے لے کر ستمبر ۱۹۷۴ء تک ملک کے طول عرض میں مسلسل دورے کر کے عامۃ المسلمین کو قادیانی فتنہ کی ہلاکت انگیزیوں سے آگاہ کیا (۳۱۳)۔ اسی دوران ۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو سانحہ ربوہ ہوا۔ جس کے بعد مولانا شاہ احمد نورانی نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اب قادیانیوں کو کیفر کردار تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھا جائے گا (۳۱۴) چنانچہ طویل بحث مباحثہ کے بعد ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو چار بجے اسمبلی کے اجلاس میں آئین میں ترمیم منظور کر لی گئی (۳۱۵)۔ جس کی رو سے قادیانیوں اور ان کے متعلقین کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔ اسی روز شام ۷ بجے سینٹ نے اس فیصلہ کی توثیق کر دی (۳۱۶) ☆ اس طرح نوے سالہ فتنہ اپنے منطقی انجام کو پہنچا اور بلاشبہ یہ مولانا شاہ احمد نورانی کا

ایک عظیم اور بے مثال سیاسی کارنامہ ہے۔

مولانا نورانی اور سیاسی میدانِ عمل (۱۹۷۷ء......۲۰۰۳ء)

مولانا شاہ احمد نورانی جو باقاعدہ طور پر میدان سیاست میں انتخابات ۱۹۷۰ء سے قبل وارد ہوئے تھے لیکن آئینی ترجیحات اور تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء کی وجہ سے ملکی سطح پر بھرپور انداز میں متعارف ہو چکے تھے (۳۱۷)۔ ۱۹۷۵ء میں وہ ممبر سینٹ منتخب ہوئے (۳۱۸)۔ انھوں نے ۱۹۷۷ء میں بھٹو حکومت کی انتخابی دھاندلیوں کے خلاف بھرپور تحریک میں شرکت کی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کی کوششوں سے قائم شدہ پاکستان قومی اتحاد کے منشور اور بعدازاں ان کے نعرۂ نفاذِ نظام مصطفیٰ ﷺ نے اس تحریک کو "تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ" میں بدل دیا (۳۱۹)۔ جو تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کا تسلسل تھی۔ بعدازاں انھوں نے ضیاء مارشل لاء کے دوران مارشل لاء کی چیرہ دستیوں کا دل جمعی اور استقامت سے مقابلہ کیا۔ (۳۲۰)

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں جمعیت علماء پاکستان نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ قومی اتحاد کی تمام جماعتیں ضیاء الحق کی شوریٰ یا وزارتوں میں شامل ہو گئیں مگر جمعیت علمائے پاکستان اور تحریک استقلال نے ضیاء الحق کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا (۳۲۱)۔ صدر ضیاء الحق نے جمعیت علمائے پاکستان کے علماء اور مشائخ کو رویت ہلال کمیٹی کی چیئرمین شپ، اسلامی نظریاتی کونسل کی سربراہی، مدارس اور مساجد کو زکوٰۃ اور فنڈز دے کر جمعیت کو کمزور کرنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ اپنی عزائم میں کامیاب نہ ہو سکے (۳۲۲)۔ ۱۹۸۸ء میں مولانا شاہ احمد نورانی کراچی میں ایم کیو ایم کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی وجہ سے انتخابات میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن انھوں نے کمال استقامت، جرأت اور بہادری کے ساتھ نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے جدوجہد جاری رکھی (۳۲۳)۔ ۹۱-۱۹۹۰ء میں جب امریکہ نے ۲۰ اتحادی ممالک سمیت عراق پر حملہ کیا تو مولانا نورانی کی ہدایت پر جمعیت علمائے پاکستان کے کارکن سڑکوں پر نکل آئے اور عراق کی حمایت کی نیز اس موقع پر مولانا شاہ احمد نورانی نے عراق جانے کے لیے رضا کاروں سے اپیل کی جس پر اڑھائی لاکھ پاکستانیوں نے عراق جانے کے لیے نام لکھوائے تاہم حکومتی اجازت نہ ملنے پر یہ رضا کار عراق نہ جا سکے (۳۲۴)۔

☆ اسمبلی کی قرارداد کے متن کے لیے دیکھیے ضمیمہ ۳۔

۱۹۹۳ء میں جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) نے مل کر اسلامی جمہوری محاذ بنایا (۳۲۵)۔ تاہم ۱۹۹۸ء میں جمعیت نے الیکشن کا بائیکاٹ کیا (۳۲۷)۔ ۱۹۹۴ء میں فرقہ واریت عروج پر تھی۔ مساجد اور امام بارگاہوں میں بم دھماکے اور فائرنگ ہو رہی تھی جس کے نتیجے میں سینکڑوں بے گناہ افراد جاں بحق ہوئے (۳۲۶)۔ ان پریشان کن حالات میں مولانا شاہ احمد نورانی نے فرقہ واریت کے خاتمے کے لیے تمام مسالک کے علمائے کرام کو ۱۹۹۵ء میں ملی یکجہتی کونسل کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جس کے نتیجے میں مساجد اور امام بارگاہوں میں بم دھماکے اور فائرنگ میں ریکارڈ کمی ہوئی (۳۲۷)۔ تاہم بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے بعد آپ نے ۱۹۹۷ء کے الیکشن کا بائیکاٹ کیا کیونکہ احتساب کے بغیر انتخابات ان کے نزدیک بے معنی تھے (۳۲۸)۔ نائن الیون کے واقعہ کے بعد جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو انھوں نے دفاع افغانستان و پاکستان کونسل بنائی۔ دفاع افغانستان و پاکستان کونسل کی بنیاد پر ہی ۷ جولائی ۲۰۰۱ء کو اسلام آباد میں قاضی حسین احمد کی رہائش گاہ پر پاکستان کی چھ بڑی دینی و سیاسی جماعتوں کا اتحاد "متحدہ مجلس عمل" تشکیل پایا اور مولانا نورانی کو اس کا سربراہ بنایا گیا (۳۲۹)۔ ان کی زیر قیادت متحدہ مجلس عمل نے بے مثال کامیابی حاصل کی (۳۳۰)۔ تاہم مولانا نورانی نے بذات خود انتخابات ۲۰۰۲ء میں حصہ نہ لیا بلکہ اپنے آپ کو انتخابی مہم کے لیے وقف رکھا۔ تاہم مجلس عمل کی کامیابی کے بعد انھیں نہ چاہتے ہوئے بھی سینٹ کا ممبر نامزد کر دیا گیا (۳۳۱)۔ سینٹ میں تمام اپوزیشن جماعتیں مولانا نورانی کو قائد حزب اختلاف بنائے جانے پر متفق تھیں لیکن حکومت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ معاملہ معرض التوا میں چلا گیا۔ (۳۳۲)

مولانا شاہ احمد نورانی نے ۴، ۵ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو مینار پاکستان گراؤنڈ میں جمعیت علمائے پاکستان پنجاب کے دو روزہ صوبائی خادمین کنونشن کا اعلان کیا تاکہ یوں پاکستان میں ڈویژنل سطح پر خادمین کنونشن منعقد کیے جائیں (۳۳۳)۔ اس اعلان کے مطابق ۱۴ دسمبر ۲۰۰۳ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں راولپنڈی ڈویژن کا خادمین کنونشن ہونے والا تھا جس میں مولانا شاہ احمد نورانی نے خطاب کرنا تھا (۳۳۴)۔ مولانا نے نو مارچ ۲۰۰۴ء میں مینار پاکستان گراؤنڈ میں کل پاکستان میلاد مصطفیٰ کانفرنس کا اعلان بھی کیا تھا۔ مولانا نورانی کی خواہش تھی کہ وہ ملک میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ کی جدوجہد کرتے ہوئے اللہ کے حضور حاضر

ہوں (۳۳۵)۔ جو اللہ تعالیٰ نے پوری کر دی۔ انھیں اللہ نے مشرف حکومت کے غیر آئینی اقدامات کے خلاف ۱۱ دسمبر ۲۰۰۳ء تک ہی مہلت دی اور وہ اسلام آباد میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ (۳۳۶)

مولانا شاہ احمد نورانی کی دینی خدمات کا اجمالی جائزہ

مولانا شاہ احمد نورانی اپنے آباؤ اجداد اور اسلاف الصالحین کی تبلیغ کاوشوں کا تسلسل تھے۔ ان کے خاندان میں ان کے دادا عبدالحکیم جوش میرٹھی، ان کے والد شاہ عبدالعلیم صدیقی، تایا مولانا نذیر احمد خوجندی صدیقی، دوسرے تایا مولانا مختیار احمد صدیقی، ان کی بہن ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی کی دینی خدمات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ (۳۳۷)

ان کا خاندان شروع سے ہی برصغیر میں اسلامی قدروں کا ترجمان اور دونوں نظریہ کا داعی رہا ہے۔ اسی بناء پر تقسیم ہند کے بعد مولانا نورانی نے مقام مصطفیٰ ﷺ کے تحفظ اور نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ مولانا نورانی نے نہ صرف اندرون ملک بلکہ اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر بیرون ملک بھی تبلیغی سرگرمیوں کا ایک وسیع سلسلہ شروع کیا۔ (۳۳۸)

مولانا شاہ احمد نورانی اور ورلڈ اسلامک مشن

ورلڈ اسلامک مشن کی سرگرمیوں کا جائزہ مولانا کی عالمی مبلغانہ شخصیت کا نمایاں پہلو ہے۔ ورلڈ اسلامک مشن اور مولانا کی شخصیت اور ان کا خاندان لازم و ملزوم ہیں (۳۳۹)۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس ادارے کی ضرورت و اہمیت کاموں کی نوعیت اور حصول وسائل کا تقابلی جائزہ لیا جائے کیونکہ اس کی کارکردگی کی تفصیل آج تک باضابطہ طور پر منظر عام پر نہیں لائی گئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ سمجھ آئی ہے کہ مولانا تشہیر کو پسند نہیں کرتے تھے۔

آج جبکہ دنیا نے حیرت انگیز ترقی کر لی ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی بدولت تبلیغ کے نت نئے طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ یہود و ہنود کی بڑی بڑی تنظیمیں مختلف روپ دھار کر اپنے پوشیدہ مقاصد حاصل کرنے کے لیے شبانہ روز کوشاں ہیں ان حالات میں طویل عرصے سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ عالمی سطح پر ایک ایسی تنظیم قائم کی جائے جو مسلمانوں کی دینی اور روحانی ضروریات پوری کرے۔ بالخصوص ان مسلمانوں کے لیے جنھوں نے روزگار کے سلسلے میں ۴۰، ۵۰ سال سے ہندوستان اور پاکستان کو خیرباد کہہ کر

امریکہ اور یورپ کو اپنا مسکن بنایا ہوا ہے۔ دن رات کی انتھک محنت سے انھوں نے مالی مشکلات سے تو چھٹکارا پا لیا۔ لیکن ان کی آنے والی نسلوں کے لیے دین کا رشتہ برقرار رکھنا دشوار ہو گیا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دین کے لیے ان کی تشنگی بڑھتی جا رہی ہے۔ (۳۴۰)

دنیا بھر کے مسلمان اور خصوصاً برصغیر کے لوگ جو امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور یورپ کے بعض حصوں نیز سنگاپور، ہانگ کانگ وغیرہ میں رہائش پذیر ہیں ان کی مذہبی ضروریات نسبتاً زیادہ ہیں کیونکہ ان ممالک کی حکومتیں غیر مسلم عیسائی ہیں۔ غیر مسلم سیکولر ہو تو اس سے اتنے نقصانات نہیں ہوتے جبکہ یہاں تو عیسائی حکومتیں برملا اپنے مذہب کی سرپرستی کرتی دکھائی دیتی ہیں اور ان کی ہر وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان آباد مسلمانوں کو عیسائی بنا لیں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو آئندہ نسل کو عیسائی بنانے کے لیے ماحول تیار کریں۔ (۳۴۱)

مولانا شاہ احمد نورانی چونکہ بچپن ہی سے بین الاقوامی سطح پر اسلام کی دعوت عام کرنے کے مشن پر عمل پیرا تھے۔ اس لیے اس کیفیت کو انھوں نے شدت سے محسوس کیا۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے جنوری ۱۹۷۳ء میں حج کے موقع پر دنیا بھر کے مذہبی پیشواؤں کو مکہ مکرمہ میں اکٹھا کیا (۳۴۲)۔ ان جید علماء کی مجلس مشاورت مسلسل کئی روز تک اس بات پر غور کرتی رہی کہ لادینیت کی یلغار کو روکنے، مسلمانوں میں دین کا احترام کرنے اور اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے کا جذبہ کیسے پیدا کیا جائے (۳۴۳)۔ یہ بھی عہد کیا گیا کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں مسلمانوں کو دفاع اسلام کی ضرورت پیش آئے تو ورلڈ اسلامک مشن اس فرض کو بھرپور طریقے سے ادا کرے گا۔ چنانچہ طے پایا کہ عالمی سطح پر ایک مذہبی تنظیم کا قیام عمل میں لایا جائے (۳۴۴)۔ اس کے ذریعے جہاں ایک طرف مسلمانوں کو قرآن و سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جائے۔ وہاں دوسری طرف اسلام کے خلاف لادینی طاقتوں کی یلغار کو بھی روکا جائے (۳۴۵)۔ چنانچہ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۳ء کو بریڈ فورڈ (برطانیہ) میں ورلڈ اسلامک مشن کا مرکزی سیکرٹریٹ قائم کیا گیا (۳۴۶)۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۴ء کو مولانا شاہ احمد نورانی کی صدارت میں سینٹ جارجز ہال میں اس کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی (۳۴۷)، جس میں تنظیم کے اصول و ضوابط ترتیب دیے گئے۔

مشن کی جانب سے تبلیغ کے خدوخال یوں واضح کیے گئے:

۱۔ مشن کو دعوت بنی نوع انسان کے لیے ہوگی۔ مسلم غیر مسلم کی تمیز کیے بغیر ترجیحاً

مسلمانوں کی اصلاح اور انھیں اسلامی احکام کا پابند بنانے کی کوشش کرے گا۔

۲۔ کسی بھی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے کے لیے نہ کسی طرح کا لالچ دیا جائے گا اور نہ جبر بلکہ شعوری بنیاد پر تبدیلی لانے کے لیے ماحول پیدا کیا جائے تاکہ وہ دیگر مذاہب کے مقابلے میں اس کی آفاقی خوبیوں کی بدولت اسلام قبول کرے۔

۳۔ ورلڈ اسلامک مشن نے پروگرام ترتیب دیا کہ مسلم بچوں اور نوجوانوں کے قبول میں اسلام کی تاریخ، عقائد اور فرائض پیغمبر اسلام ﷺ کے فضائل و کمالات اور صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں کے نقوش ثبت کیے جائیں گے۔

۴۔ معاشرے میں خواتین کا ہمیشہ سے اہم کردار رہا ہے۔ اس لیے مسلم خواتین کو تربیت اولاد، فرائض عائلی، محاسن اخلاق اور اسلامی معاشرت کی بنیادی تعلیم دی جائے گی تاکہ وہ اپنے کردار بھرپور طریقہ سے ادا کرسکیں۔

۵۔ نومسلم افراد کو اسلامی معاشرے میں ضم کر کے امتیاز مٹایا جائے گا اور ایک نومسلم کو نت نئے حالات کا سامنا کرتے وقت جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس کی ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ (۳۴۸)

ورلڈ اسلامک مشن نے ایک اور اہم کام یہ انجام دیا کہ روزمرہ کے پیش آمدہ مسائل اور ان کے بارے میں درست حل کے لیے دارالافتاء قائم کیا، جو عالمی مرکز میں جید مفتیان کرام کی نگرانی میں کام کر رہا ہے اور بغیر کسی معاوضہ کے دنیا بھر سے بھیجے گئے سوالات کے جوابات پیش کرتا ہے (۳۴۹)۔ ادارہ ترویج اسلام کے لیے دینی کتب و قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ کتاب مفت مہیا کرتا ہے۔ مزید یہ کہ اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی تشکیل کر کے اسلام پر تحقیقی کام کو مزید آگے بڑھایا جارہا ہے۔ جس سے کسی ایک موضوع پر مکمل معلومات کم سے کم وقت میں حاصل ہوجاتی ہیں۔ (۳۵۰)

ورلڈ اسلامک مشن کے لٹریچر، اس کی علمی نشستیں اور والہانہ جذبے کے کاموں کو دیکھ کر بسا اوقات عیسائی پادری مولانا نورانی کو مناظرہ کی دعوت دے دیتے تھے، جن کا مقصد اسلام کے مقابل عیسائیت کا سچا مذہب ثابت کرنا ہوتا۔ وہ ایسے غیر منطقی سوالات کرتے آخر میں سوائے شرمندگی کے انھیں کچھ حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ بائبل کی اصل کتاب روئے زمین پر کہیں نہیں (۳۵۱)۔ مختلف عیسائی فرقوں نے اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اس میں تحریف کر

لی ہے۔ اکثر مولانا کو یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں خطاب کی دعوت دی جاتی۔ وہاں بھی عیسائی پادری آتے اور لیکچر کے اختتام پر سوالات کی اجازت ہوتی۔ یہاں بھی عیسائی پادری مولانا کے سامنے عیسائیت کا دفاع نہ کرپاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ مادیت کی آگ میں جل رہا ہے اور خود عیسائیت کے پروکار اپنے مذہب سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس لیے ورلڈ اسلامک مشن کی کارکردگی کی بدولت اسلام کی جڑیں ان ممالک میں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی ہیں اس قدر وسیع کام کو چلانے کے لیے فنڈز نہایت اہم ہوتے ہیں اس لیے وسائل کی بنیاد پر تنظیم کی پالیسی مرتب کی جاتی ہے۔ (۳۵۲)

پروفیسر محمد احمد صدیقی کے بقول:

مولانا شاہ احمد نورانی عالمی سطح پر مبلغ کی حیثیت سے تنظیموں کے درمیان تقابلی جائزہ کی فہم و فراست رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے آغاز میں ہی وسائل پیدا کرنے کے طریقے وضع کرلیے۔ ممبر شپ فیس کے علاوہ متعلقین باقاعدگی سے معاونت کرتے ہیں تاکہ اپنی آمد کے تحت صحیح سمت میں بغیر ''ڈکٹیشن'' کے کام کرسکیں کیونکہ اسوقت چند اور تنظیمیں بھی اسی طرز پر کام کررہی ہیں مگر ان کا مقصد مختلف حکمرانوں کی بادشاہتوں کا تحفظ کرنا ہے۔ پیسہ خرچ کرنے والے ممالک کے حالات جس طرف کروٹ لیں وہ اس طرف چل پڑتی ہیں۔ عالم اسلام کو اس کا نفع ہو یا نقصان وہ اپنے آقاؤں کی خوشنودی اور اپنی گرانٹ میں اضافہ کے لیے اپنا سب کچھ لگادیتی ہیں۔ وہ مذہبی سے زیادہ سیاسی ہیں۔ جس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ مولانا اشہ احمد نورانی خود دارانہ مزاج کے انسان تھے، اس لیے ورلڈ اسلامک مشن کی پالیسیوں میں اس کی جھلک نمایاں نظر آتی تھی۔ اپنی آزادانہ پالیسی کی وجہ سے ورلڈ اسلامک مشن نننے ہر دور میں عالم اسلام کے وسیع تر مفاد میں کام کیا۔ اس لیے دنیا کے ہر گوشہ میں اسے پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ ورلڈ اسلامک مشن کی تنظیم پر غور کیا جائے تو ہر ملک ایک الگ یونٹ کی شکل رکھتا ہے۔ تمام یونٹس اپنے وسائل سے اپنے کام سرانجام دیتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے بیشتر ممالک میں اس کی رجسٹریشن ہے۔ ورلڈ اسلامک مشن نے اب تک اپنی مددآپ کے تحت کینیڈا، ساؤتھ امریکہ، فرانس، ناروے، بلجیئم، ہالینڈ، پرتگال، جرمنی، آسٹریلیا، ماریشس، کینیا، تنزانیہ، ساؤتھ افریقہ سمیت بہت سے علاقوں میں اپنے ادارے قائم کیے، ہیں، جن سے ہزاروں تشنگان دین استفادہ کررہے ہیں۔ مولانا ہر سال ان اداروں کی

کارکردگی، تنظیم تبلیغ اور نئے قائم شدہ مدارس و مسجد کا افتتاح و سیمینار میں شرکت کرنے کے لیے دنیا بھر کا دورہ کرتے تھے۔ ان کا ورلڈ اسلامک مشن پاکستان کے دفتر میں بیٹھ کر بھی اپنے یونٹوں سے ہر ملک میں مستقل رابطہ رہتا اور کسی بھی ایمرجنسی میں وہ وہاں پہنچتے ہیں۔ ان کے دورے اور رابطے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔

مولانا کے ان دوروں کا سب سے اہم فائدہ یہ بھی ہوتا تھا کہ دنیا میں اسلام اور عالم اسلام کے خلاف ہونے والی سرگرمیوں کا اہل وطن کو بھی پتہ چلتا رہتا۔ اس طرح غیر سرکاری سطح پر پوری دنیا کے مسلمان ورلڈ اسلامک مشن کے ذریعے زنجیر کی مانند ایک دوسرے سے جڑ جاتے۔ اب وہاں نہ تو افریقہ کا حبشی رہتا ہے اور نہ برطانیہ کا گورا۔ رنگ و نسل سے آزاد ایک قوم حضور پرنور ﷺ کے جھنڈے تلے متحد نظر آتی ہے۔ ان میں پاکستانی بھی ہیں، ہندوستانی بھی، امریکی، چینی، روسی، افریقی، جاپانی، الغرض ہر براعظم کا شخص محبت رسول ﷺ کی لڑی میں پرویا نظر آتا ہے...... مولانا نورانی کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ماریشس کے وزیراعظم نے درست کہا تھا کہ ربیع الاول میں مولانا ماریشس تشریف لاتے تھے تو ان کا استقبال سربراہ مملکت کی طرح ہوتا تھا اور ماریشس میں امن وسکون کا سہرا مولانا نورانی کے سر۔

یہ جملے مولانا کے عالمی مبلغ ہونے اور چیئرمین ورلڈ اسلامک مشن کے منصب جلیلہ کو بہترین طریقہ پر نبھانے کا اعتراف ہیں۔ (۳۵۳)

خانوادۂ مولانا نورانی کی سرپرستی میں مزید ادارے بھی دنیا کے مختلف ممالک میں کام کررہے ہیں جن کے نام یہ ہیں:

۱۔	ماریشس	حلقہ قادریہ علیمیہ اشاعت اسلام علیمیہ اسلامک مشن کالج علیمیہ دارالعلوم ورلڈ اسلامک مشن، ماریشس
۲۔	سری لنکا	حلقہ قادریہ علیمیہ اشاعت اسلام، سیلون
۳۔	گیانا	ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن
۴۔	امریکہ	مسلم ایجوکیشن ٹرسٹ، جارج ٹاؤن

۵۔	ساؤتھ امریکہ	اسلامک مشنریز گلڈ
۶۔	ملائیشیا	آل ملایا مسلم مشنری سوسائٹی
۷۔	برطانیہ	حنفی مسلم سرکل۔ پریسٹن
۸۔	ہالینڈ	دارالعلوم جامعہ مدینۃ الاسلام (ڈ۔نہاگ) (یہ ۱۸ کمروں پر مشتمل عظیم الشان عمارت ہے جہاں بیلجیئم فرانس وغیرہ سے بچے قرآن پاک اور دینی تعلیم (جس میں حفظ وتجوید بھی شامل ہے) حاصل کرنے آتے ہیں۔ نیز یہاں عربی زبان بھی سکھائی جاتی ہے)
۹۔	کینیڈا	ٹورنٹو میں دو ایکڑ پر مسجد، گرلز اسکول/ بوائز اسکول زیر تعمیر ہے۔(۳۵۴)

مولانا شاہ احمد نورانی کی اندرون وبیرون ملک تبلیغی خدمات

مولانا نورانی اور ان کے خاندان کی اسلامی خدمات تاریخ کا حصہ ہیں۔ بالخصوص تحریک پاکستان کے سلسلے میں ان کے والد شاہ عبدالعلیم صدیقی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد مولانا نورانی نے اپنے عالمی فرائض سنبھال لیے (۳۵۵)۔ ان کو بہتر انداز میں جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی ہمہ پہلو ملکی و دینی خدمات پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

۱۔ ۱۹۵۵ء: عالم اسلام کی عظیم تاریخی یونیورسٹی جامعہ الازہر (مصر) کے علماء کی دعوت پر قاہرہ تشریف لے گئے۔

۲۔ ۵۸۔۱۹۵۶ء: مولانا شاہ احمد نورانی نے حضرت مفتی ضیاء الدین بابا خانوف مفتی اعظم روس کی خصوصی دعوت پر روس کا تبلیغی دورہ کیا۔ یہاں انھوں نے ازبکستان، تاشقند، سمرقند، بخارا کے مقبوضہ علاقوں کے مسلمانوں میں دینی جذبہ پیدا کرنے کے لیے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور اسلامی جذبہ کو اجاگر کیا۔

۳۔ ۱۹۵۹ء: مشرق وسطیٰ کا خیرسگالی دورہ کیا۔

۴۔ ۱۹۶۰ء: تبلیغی دورے کے لیے مشرقی افریقہ، مڈغاسکر اور ماریشس گئے۔

۵۔ ۱۹۶۱ء: مولانا نورانی نے سری لنکا اور شمالی افریقہ کا دورہ کیا۔

۶۔ ۱۹۶۲ء: نائیجیریا کے وزیر اعظم احمد و بیول شہید کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے اور ان کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے تین ماہ کا تبلیغی دورہ کیا۔ علاوہ ازیں مولانا نورانی نے صومالیہ، کینیا، ٹانگانیکا، یوگنڈا اور ماریشس میں تبلیغی خدمات انجام دیں۔ اسی سال مدینہ منورہ میں مولانا نورانی کی شادی انجام پائی۔

۷۔ ۱۹۶۳ء: مولانا نورانی نے ترکی، فرانس، مغربی جرمنی، برطانیہ، ماریشس، نائیجیرا اور اسکنڈے نیوین ممالک کا ایک تبلیغی دورہ کیا اور اس سال چینی مسلمانوں کی دعوت پر عوامی جمہوریہ چین کا تبلیغی دورہ بھی کیا۔

۸۔ ۱۹۶۴ء: مولانا نورانی نے امریکہ (یو ایس اے)، جنوبی امریکہ اور کینیا کا تبلیغی دورہ کیا۔

۹۔ ۱۹۶۸ء: اسلامک ریویو لندن (برطانیہ) کے قادیانی ایڈیٹر سے ٹرینی ڈاڈ میں ساڑھے پانچ گھنٹے مناظرہ کیا، بالآخر وہ کتابیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

۱۰۔ ۱۹۶۹ء: مولانا نے پاکستان آنے کے بعد سب سے پہلا بیان قادیانی فتنہ پر دیا اور علماء اسلام کے خلاف قادیانیوں کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالیا ور پوری قوم کو دعوت دی کہ فتنہ قادیانی سے نمٹنے کے لیے بھر پور لائحہ عمل مرتب کرے۔

۱۱۔ ۱۹۷۰ء: جمعیت علمائے پاکستان کی جانب سے کراچی سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہو کر سیاست کے میدان میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے درمیان مذہبی طاقت کو تسلیم کروایا۔

۱۲۔ ۱۹۷۱ء: علامہ نورانی نے سعودی عرب اور مشرقِ وسطیٰ کے دیگر ممالک کا تقریباً ڈیڑھ ماہ کا دورہ کیا۔

۱۳۔ ۱۹۷۲ء: فتنہ مرزائیت پر قومی اسمبلی میں خطاب۔

۱۴۔ ۱۹۷۳ء: ذوالفقار علی بھٹو کے مقابل متحدہ جمہوری محاذ کا قیام اور متفقہ آئین کے لیے کوشش۔

۱۵۔ ۱۹۷۴ء: مولانا شاہ احمد نورانی نے ۱۲ اپریل ۱۹۷۴ء کو بریڈ فورڈ (برطانیہ) کے سینٹ جارجز ہال میں ایک عظیم الشان عالمی کانفرنس کی صدارت کی۔ اس کانفرنس

میں مختلف ممالک کے پچاس علماء شریک ہوئے۔ کانفرنس میں مولانا کو ورلڈ اسلامک مشن کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ اس موقع پر مولانا نے ۴۴ ملکوں میں مشن کی شاخوں کے قیام کے لیے کنوینز مقرر کیے جن میں پاکستان، بھارت، سری لنکا، انڈونیشیا، تنزانیہ، پرتگال، صومالیہ، جنوبی افریقہ، سینی گال، نائیجیریا، مصر، شام، عراق، افغانستان، مغربی جرمنی، فرانس، ہالینڈ، انگلینڈ، امریکہ، سری نام (ڈچ گیانا)، ارجنٹائن، سعودی عرب اور ٹرینی ڈاڈ شامل ہیں۔ اسی سال کے تبلیغی دورے پر ماریشس (افریقہ) کیے گئے وہاں ایک اسلامی دار العلوم کی بنیاد رکھی اور ۱۲ ربیع الاوّل کو عظیم الشان جلسہ میلاد النبی ﷺ سے خطاب کیا۔ اس جلسہ میں خطاب کرتے ہوئے ماریشس کے وزیر اعظم رام غلام نے کہا کہ ماریشس کے عوام بالخصوص مسلمانوں پر مولانا شاہ احمد نورانی کا یہ عظیم احسان ہے کہ وہ اپنی تمام تر مصروفیات کو چھوڑ کر یہاں تشریف لائے۔ جلسے میں گورنر جنرل ماریشس سر عثمان، چیف جسٹس ایچ کاسن علی، اراکین اسمبلی، غیر ملکی سفراء، ورلڈ اسلامک مشن ماریشس کے چیئرمین محمد کسینو، نیشنل مسلم کونسل کے احمد عبداللہ اور مسلم یوتھ آرگنائزیشن کے صدر عبد الغفور نے بھی شرکت کی۔ ماریشس سے مدینہ منورہ حاضری دینے کے لیے سعودی عرب پہنچے اور مکہ معظمہ میں عمرہ ادا کرتے ہوئے کینیا چلے گئے۔

۱۶۔ فتنہ مرزائیت کا سدباب۔ پاکستان کی قومی اسمبلی میں مولانا شاہ احمد نورانی نے ۳۰ جون ۱۹۷۴ء کو مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لیے قرارداد پیش کی، جس کے تحت ہمیشہ کے لیے مرزائیوں کو پاکستان کے آئین میں غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔

۱۷۔ چیئرمین ورلڈ اسلامک مشن کی حیثیت سے ۱۹۷۵ء میں مولانا شاہ احمد نورانی نے مولانا عبد الستار خان نیازی، پروفیسر شاہ فرید الحق، علامہ ارشد القادری پر مشتمل وفد کی قیادت کرتے ہوئے امریکہ، افریقہ اور یورپ کا دورہ کیا، مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی حاضری اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کرنے کے بعد یہ وفد جدہ سے نیروبی (کینیا، افریقہ) پہنچا۔ جہاں جامع مسجد کھمراہ میں عربی زبان میں مولانا نے خطاب کیا۔ اس دورے کے دوران نیروبی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ افریقی ممالک میں قادیانی اسلام کا نام لے کر مصروف کار ہیں۔ درحقیقت وہ ان

ملکوں کے اتحاد کو کمزور کر رہے ہیں۔ افریقہ کے مختلف ممالک کا ۱۸ روزہ تبلیغی دورہ کرنے کے بعد یہ وفد برطانیہ روانہ ہو گیا۔ جہاں دو ہفتے قیام کے بعد وفد نے امریکہ (یو ایس اے) جنوبی امریکہ، کینیڈا، مغربی جرمنی، اسپین، تیونس، لیبیا، الجزائر، مصر اور ترکی کا تبلیغی دورہ کیا۔ اس دوران مولانا اور ان کے وفد نے ایک لاکھ میل سے زائد کا سفر طے کیا اور ۶۰۰ سے زائد تقاریر کیں۔ اس دورے کے دوران بہت سے غیر مسلموں نے مولانا شاہ احمد نورانی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

۱۸۔ ۱۹۷۶ء: جمعیت علمائے پاکستان کی طرف پاکستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔

۱۹۔ ۱۹۷۷ء: تحریک نظام مصطفیٰ میں گرفتاریاں اور قاتلانہ حملہ۔

۲۰۔ مئی ۱۹۷۸ء میں علامہ نورانی کیپ ٹاؤن (جنوبی افریقہ) کے تبلیغی دورے پر روانہ ہوئے۔ مولانا نے وہاں کے میئر کی جانب سے شہریوں کے استقبالیہ میں "اسلام بیسویں صدی کے چیلنج کو قبول کرتا ہے" کے عنوان سے انگریزی میں خطاب کیا۔ جس میں کہا کہ اب دنیا بھر میں غیر مطمئن اور بے چین انسانوں کو اسلام کی اکملیت اور جامعیت کا احساس ہو رہا ہے۔ کیپ ٹاؤن کے میئر نے جوابی خطاب میں مولانا کو "سفیر اسلام" کا خطاب دیا۔ اس دورے میں ۱۰۵ افریقی، یورپی اور مقامی افراد نے اسلام قبول کیا۔

۲۱۔ ۱۹۷۹ء: علامہ نورانی نے برمنگھم (برطانیہ) میں منعقدہ عظیم الشان نظام مصطفیٰ کانفرنس میں شرکت کی۔ اس کانفرنس کے مفتی اعظم قبرص ڈاکٹر رفعت مصطفیٰ اور ترکی کے ڈاکٹر محمد یوجل نے بھی خطاب کیا۔ یہ برطانیہ کی تاریخ میں مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ اسی سال مولانا نورانی نے عظیم الشان میلاد مصطفیٰ ﷺ کانفرنس رائے ونڈ (پاکستان) میں بھی شرکت کی۔

۲۲۔ فروری ۱۹۸۰ء میں امریکہ کے شہر نیویارک میں کولمبیا یونیورسٹی کے انٹرنیشنل ہال میں "اسلام کی ہمہ گیریت" کے موضوع پر انگریزی میں خطاب کیا۔ یونیورسٹی کی ایک پروفیسر خاتون نے مولانا نورانی کی تقریر سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ نیویارک سے ریاست ٹرینی ڈاڈ کے مسلمانوں کی دعوت پر ٹرینی ڈاڈ ایئر پورٹ پر اترے تو مولانا کا فقید المثال استقبال کیا گیا اور پوری ریاست میں عام تعطیل کر

دی گئی۔ یہاں ۲۵ دنوں میں ۴۰ خطابات کیے۔ پھر سری نام، آسا د آئی لینڈ سے ہوتے ہوئے جرمنی پہنچے۔ اسلامک سنٹر میامی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ سے قبل انگریزی میں خطاب کیا۔ جہاں کچھ افریقی مسلمان ہوئے۔

کولمبیا یونیورسٹی میں "افغانستان میں روسی جارحیت اور افغان مہاجرین" کے عنوان پر خطاب کیا۔ پھر کیلیفورنیا اور لاس اینجلس کا دورہ کیا۔ ۱۵ جون ۱۹۸۰ء کو ورلڈ اسلامک مشن کی چوتھی کانفرنس میں شرکت کے لیے ہالینڈ گئے۔ یہ کانفرنس ایمسٹرڈیم کے چاپ ایڈن ہال میں منعقد ہوئی۔ جس میں ڈین ہاگ، روڈ ڈیم، اترخ، انتوفن، سوٹیلو کے مسلمانوں کے علاوہ برطانیہ، بیلجیم، ناروے، بھارت، پاکستان، مصر، مراکش، الجزائر، امریکہ اور ٹرینی ڈاڈ کے علماء اور مندوبین نے بھی شرکت کی۔ کانفرنس کی کارروائی مختلف زبانوں میں کی گئی۔ مولانا محمد بشیر، مولانا منیر الزمان، مولانا شاہد رضا نعیمی، ڈاکٹر ذکی بداوی (عربی)، ڈاکٹر رحمت کرامت نے (ڈچ)، مولانا جیلانی صدیقی (مولانا نورانی کے بڑے بھائی) نے انگریزی میں اور مولانا عبدالوہاب صدیقی نے بھی خطاب کیا۔ اپنے صدارتی خطاب میں مولانا نورانی نے کہا کہ "ورلڈ اسلامک مشن پوری دنیا میں اسلام کا پیغام پھیلانے اور مسلمانوں کے درمیان باہمی رشتہ اخوت استوار کرنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔"

۲۳۔ ۱۹۸۱ء: میں جنوری میں کینیا کے مسلمانوں کی دعوت پر روانہ ہوئے۔ پہلے مکہ مکرمہ (سعودی عرب) میں عمرہ ادا کیا۔ پھر مدینہ منورہ میں دربارِ رسالت ﷺ میں حاضری دی۔ پھر کینیا، ماریشس، جنوبی افریقہ، زمبابوے، مالدوی، جزائر فجی، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ہانگ کانگ اور سنگاپور کا ۶ ماہ کا دورہ کیا۔ واپس کراچی پہنچ کر افطار پارٹی سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نورانی نے فرمایا: "اہم بات یہ ہے کہ یورپ، مشرقِ بعید اور افریقہ والے اسلام قبول کر رہے ہیں لیکن ان ممالک میں موجود بعض لوگوں نے تبلیغ کے نام پر گروہ بندیاں قائم کر رکھی ہیں، ان لوگوں نے من گھڑت تاویلات سے دین کو نقصان پہنچایا ہے اور اپنی بے راہ روی سے نو مسلموں کو اسلام سے متنفر کر رہے ہیں۔ ہم نے اسلام ورثہ میں پایا ہے جبکہ یورپ اور دیگر ممالک کے نو مسلموں نے اسلام کی حقانیت کو دیکھ کر، پرکھ کر قبول کیا

ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد اس کی زندگی میں انقلاب آ جانا چاہیے۔ لیکن نیم ملاؤں کے قول و فعل میں تضاد اور ان کی تفرقہ بازیوں کے باعث انقلاب تو درکنار وہ اسلام کی مبادیات سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور دیگر ممالک میں اسلام کی تبلیغ کے لیے ماحول سازگار ہے۔ بلاشبہ ہندو اور عیسائی بھی مقابلے پر آئے ہیں اور بڑے منظم طریقے سے اپنے مذاہب کا پرچار کر رہے ہیں، لیکن اسلام کی طاقت سے انھیں شکست دی جاسکتی ہے۔

۲۴۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۸۲ء کو مولانا شاہ احمد نورانی ماریشس کے تبلیغی دورے پر گئے۔ اس دورے میں بہت سے قادیانی (مرزائی) آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہاں ۴۵ اجتماعات سے خطاب کیا۔ جسے ریڈیو ماریشس نے نشر کیا۔ آخر میں علیمیہ مشنری کالج ماریشس کا معائنہ کیا۔

۲۵۔ ۱۰ جنوری ۱۹۸۳ء: ڈربن (جنوبی افریقہ) گئے، جہاں آپ نے میلاد مصطفی ﷺ کانفرنس سے خطاب کیا۔ جبکہ پروفیسر شاہ فرید الحق اور مولانا شاہ تراب الحق قادری نے بھی خطاب کیا۔ ۳۰ جنوری کو دارالعلوم علیمیہ رضویہ ڈربن کی نئی عمارت کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر مولانا شیخ فضل الرحمٰن مدنی سعودی عرب سے شریک ہوئے۔ کیپ ٹاؤن کے اجتماعات میں ۴۰۰ مرزائیوں نے قادیانیت سے تائب ہو کر مولانا نورانی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اسلام قبول کرنے والے تمام خواتین و حضرات کو قرآن حکیم اور ترجمہ کنزالایمان پیش کیا گیا۔ ہالینڈ کے مشہور شہر ہیگ میں انٹرنیشنل کورٹس آف جسٹس کے ہیڈ آفس کے قریب ''کالج فار مسلم اسکالرز'' کا افتتاح کیا۔ ہالینڈ کے ایک ماہ کے تفصیلی دورے کے دوران ہزاروں لوگوں کے سینکڑوں اجتماعات سے خطاب کیا۔ یہاں بھی متعدد عیسائی اور قادیانی مولانا کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس دورے میں مولانا عبدالستار خان نیازی اور پروفیسر شاہ فرید الحق ہمراہ تھے۔ وہاں سے مولانا لندن پہنچے اور برلن ہال میں ایک اجتماع سے خطاب کیا۔ وکٹوریہ پارک مانچسٹر، اسلامک لرننگ سنٹر ایڈلیڈ، اسلامک کونسل آف برطانیہ اور آکسفورڈ میں مختلف پروگراموں میں خطاب کیا۔

۲۶۔ جنوری ۱۹۸۴ء: ماریشس کے لیے روانہ ہوئے۔ جہاں کئی غیر مسلموں نے اسلام

قبول کیا۔ بمبئی (بھارت) کے راستے آتے ہوئے اجمیر شریف حاضری کی خواہش کی، پانچ روز بمبئی ایئرپورٹ پر انتظار کیا، مگر ہندوستانی حکومت نے اجازت نہ دی۔ اسی سال مولانا نے برطانیہ میں چھ مساجد کا سنگ بنیاد رکھا۔

۲۷۔ ۴ اور ۵ مئی ۱۹۸۵ء: ورلڈ اسلامک مشن برطانیہ کے تحت ویمبلے ہال لندن میں ''حجاز مقدس کانفرنس'' میں شریک کی۔ اسی سال ایمسٹرڈیم (ہالینڈ) کی ۲۵ ملین پاکستانی روپے کی لاگت سے جامع مسجد طیبہ کی تعمیر مکمل ہوئی۔ یورپ کی یہ پہلی مسجد تھی، جس میں پانچوں وقت لاؤڈ اسپیکر پر اذان دی جاتی ہے۔ اسپیکر کی اجازت وہاں کے یہودی میئر سے حاصل کی گئی۔ اس مسجد میں ایک بہترین لائبریری قائم کی گئی ہے، جس میں ہالینڈ کے پوپ کی جانب سے دیا گیا سو سال قبل ایک ڈچ کے ہاتھ کا عربی میں لکھا ہوا قرآن بھی موجود ہے۔ اسی سال مولانا نے حکومت سری لنکا کی دعوت پر دو ہفتے کا تبلیغی دورہ کیا۔

۲۸۔ ۱۹۸۶ء: مولانا نے برطانیہ، ہالینڈ، ماریشس کا تبلیغی دورہ کیا۔

۲۹۔ ۲۴ مارچ ۱۹۸۶ء: ایران، عراق جنگ ختم کرانے کے لیے ورلڈ علماء کانفرنس کی قائم کردہ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے عراق گئے۔ نومبر میں برطانیہ، جنوبی افریقہ، فرانس اور کینیا کا تفصیلی دورہ کیا۔

۳۰۔ ۱۹۸۷ء: ہالینڈ میں ایک مسجد کا افتتاح کیا اور بہت سے مذہبی اجتماعات سے خطاب کیا۔ نیز وزارت اوقاف عراق کی دعوت پر دورہ کیا۔ بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقدہ لیبیا میں شرکت، ایران، عراق جنگ بندی کے لیے کرنل قذافی سے ملاقات کی۔ نیز برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک کا دورہ کیا۔

۳۱۔ دسمبر ۱۹۸۷ء: تھائی لینڈ، جرمنی، سوئزرلینڈ اور افریقی ممالک کا دورہ کیا۔ ہالینڈ اور برطانیہ میں مسجد کا افتتاح کیا۔ عراق اور ہالینڈ گئے۔

۳۲۔ اگست ۱۹۸۸ء: جامع مسجد لسٹر (برطانیہ) کا سنگ بنیاد رکھا، جس پر ۲۰ لاکھ پونڈ اسٹرلنگ خرچ کیے گئے۔ برطانیہ کی یہ عظیم الشان مسجد ۵ سال میں مکمل ہوئی۔

۳۳۔ ۱۹۸۹ء: بھارت کا تبلیغی دورہ کیا۔ دارالعلوم علیمیہ احمد آباد میں جلسہ کی صدارت کی۔ مختلف اجتماعات میں اسلام کی جامعیت، عالمی اصلاحی، معاشی اور سماجی نظام

پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ہندومت اور اسلام کی تقابل پر لیکچر دیے۔ پھر سوئٹزر لینڈ، لیبیا کا دورہ کیا اور جامعۃ الازہر، مساوات یونیورسٹی کے سینٹ کے اجلاسوں میں بطور رکن شرکت کی۔

۳۴۔ ۱۹۹۶ء: میں ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں پہلی مسجد کا افتتاح کیا۔

۳۵۔ ۲۹ مئی ۲۰۰۰ء: کو کراچی میں ختم نبوت کانفرنس سے خطاب فرمایا۔

۳۶۔ ۲۰۰۰ء: تین ہفتے کے دورے پر ماریشس میں ربیع الاوّل کے اجتماعات میں شرکت کی۔

۳۷۔ ۲۰۰۱ء: ماہ اگست میں چھ ہفتے کے تبلیغی دورے پر ہالینڈ، فرانس، جرمنی، برطانیہ اور بلجیئم میں ختم نبوت کانفرنسوں سے خطاب فرمایا۔

۳۸۔ ماہ نومبر میں سوئے آصل کاہنہ (لاہور) میں ورلڈ اسلامک مشن کے تحت بننے والے صفہ اسلامک یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا۔

۳۹۔ ۱۵ نومبر اورنگی ٹاؤن نمبر ۳ کراچی نزد سبحانی مسجد متصل بنگلہ بازار میں جذبۂ جہاد کانفرنس سے خطاب فرمایا۔

۴۰۔ ۲۶ جون ۲۰۰۲ء: ۶ ہفتے کے دورے پر نیروبی، ماریشس پر مختلف مقامات پر محافل میلاد سے خطاب فرمایا۔

۴۱۔ ماہ اگست ۲۰۰۳ء: تین ہفتے کے دورے پر ڈربن و ہالینڈ روانہ ہوئے۔ ربیع الاوّل میں ماریشس (افریقہ) میں اجتماعات میں شرکت کی۔ (۳۵۶)

مولانا نورانی کے تبلیغی دوروں کا سلسلہ مرتے دم تک جاری رہا۔

مولانا شاہ احمد نورانی جہد مسلسل کی ایک عظیم علامت اور نادر الوجود مثال تھے۔ انھوں نے مذہب وملت کی خدمت کے لیے نہ صرف اپنی زندگی وقف کر دی بلکہ اندرون و بیرون ملک ایک ایسی انقلابی مثال قائم کر گئے جو رہتی دنیا تک اسلامیانِ ملت کے لیے تشجیع و تحریک کا باعث بنی رہے گی۔ ان کے دینی و سیاسی زندگی کے جس بھی پہلو کا جائزہ لیں اس میں ایک بھرپور جدوجہد کا پرتو غالب طور پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے دین اور سیاست کو کبھی الگ نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

کا عملی نمونہ دکھائی دیتی ہے۔

حوالہ جات وتعلیقات

(۱) مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ بمطابق ۱۳ مارچ ۱۹۲۶ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب والد اور والدہ ہر دو طرف سے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے ملتا ہے۔
(نورانی، محمد امین، مولانا، عہد رواں کی ایک عبقری شخصیت، علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲)

(۲) مولانا نورانی کا خاندان میرٹھ میں ایک ممتاز علمی و روحانی گھرانے کے طور پر متعارف تھا۔ آپ کے خاندان کے متعدد افراد نے ملی تاریخ میں دینی و سیاسی خدمات کی یادگار اور قابل فخر روایات قائم کیں۔ (ایضاً)

(۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) ایضاً

(۶) صدیقی، محمد احمد، پروفیسر، ''مبلغ اسلام مولانا محمد عبدالعلیم صدیقی''، مشمولہ عظیم مبلغ اسلام، خواتین ورلڈ اسلامک مشن، کراچی، ص ۶۷۔

(۷) ایضاً

(۸) انصاری، حافظ محمد فضل الرحمٰن، ''شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی کی دینی خدمات کا مختصر تعارف''، بشمولہ عظیم مبلغ اسلام، مرتبہ ڈاکٹر محمد یونس قادری، خواتین اسلامی مشن، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۶۶) محولہ بالا، ص ۶۲۔

(۹) ایضاً (۱۰) ایضاً

(۱۱) صدیقی، محمد احمد، پروفیسر، ''مبلغ اسلام مولانا محمد عبدالعلیم صدیقی''، مشمولہ عظیم مبلغ اسلام محولہ بالا، ص ۶۷۔

(۱۲) ایضاً (۱۳) ایضاً، ص ۶۸ ۱۴ ایضاً

(۱۵) انصاری، حافظ محمد فضل الرحمٰن، بحوالہ سابقہ، ص ۶۳

(۱۶) بدایونی، عبدالحامد قادری، مولانا، ''مبلغ اسلام شاہ عبدالعلیم صدیقی''، مشمولہ عظیم مبلغ، محولہ بالا، ص ۶۹۔

(۱۷) ایضاً، ص ۷۱ (۱۸) ایضاً (۱۹) ایضاً
(۲۰) ایضاً (۲۱) ایضاً
(۲۲) بدایونی، عبدالحامد قادری، بحوالہ سابقہ، ص ۷۰
(۲۳) ایضاً (۲۴) ایضاً، ص ۷۱ (۲۵) ایضاً
(۲۶) پروفیسر محمد احمد صدیقی سے انٹرویو (مؤلف)
(۲۷) ایضاً (۲۸) ایضاً (۲۹) ایضاً (۳۰) ایضاً
(۳۱) قادری، محمد یونس، ڈاکٹر، ''تحریک پاکستان میں شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی کا کردار'' مشمولہ عظیم مبلغ اسلام، بحوالہ سابقہ، ص ص ۱۵۹۔۱۶۰۔
(۳۲) ایضاً، ص ۱۶۱ (۳۳) ایضاً، ص ۱۶۲
(۳۴) ایضاً، ص ۱۶۲۔۱۶۳ (۳۵) ایضاً، ص ۱۶۳
(۳۶) بدایونی، عبدالحامد، بحوالہ سابقہ، ص ۷۰
(۳۷) ایضاً
(۳۸) قادری محمد یونس، بحوالہ سابقہ، ص ۱۶۸
(۳۹) ایضاً (۴۰) ایضاً
(۴۱) مینارۂ نور (مجلہ) حلقہ قادریہ علیمیہ، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۳۴
(۴۲) پروفیسر محمد احمد صدیقی سے انٹرویو
(۴۳) ایضاً (۴۴) ایضاً (۴۵) ایضاً
(۴۶) ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی سے انٹرویو (مؤلف)
(۴۷) ایضاً (۴۸) ایضاً (۴۹) ایضاً
(۵۰) انٹرویو فیملی فیملی میگزین، ۲۷ ستمبر ۱۹۹۸ء
(۵۱) ایضاً
(۵۲) روزنامہ نوائے وقت، ۲۲ مئی ۲۰۰۱ء
(۵۳) ایضاً
(۵۴) ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی سے انٹرویو
(۵۵) ایضاً (۵۶) ایضاً
(۵۷) پروفیسر محمد احمد صدیقی سے انٹرویو
(۵۸) ایضاً (۵۹) ایضاً (۶۰) ایضاً (۶۱) ایضاً
(۶۲) روزنامہ دبدبہ سکندری، رام پورہ، ۱۷ دسمبر ۱۹۴۰ء، مخزونہ ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی۔

(۶۳) پروفیسر محمد احمد صدیقی سے انٹرویو۔
(۶۴) ایضاً (۶۵) ایضاً (۶۶) ایضاً
(۶۷) نورانی، محمد امین، بحوالہ سابقہ، ص ۳۳
(۶۸) ایضاً، ص ۳۴ (۶۹) ایضاً، ص ۳۵ (۷۰) ایضاً، ص ۳۷ (۷۱) ایضاً
(۷۲) کاشمیری، شورش، تحریک ختم نبوت، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۳، ۲۴
(۷۳) ایضاً
(۷۴) مودودی، ابوالاعلیٰ، قادیانی مسئلہ، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۲۱ تا ۳۰
(۷۵) ایضاً (۷۶) ایضاً (۷۷) ایضاً
(۷۸) ایضاً، ص ۴۴ تا ۴۶ (۷۹) ایضاً (۸۰) ایضاً
(۸۱) ایضاً
(۸۲) روزنامہ الفضل ربوہ، ۳ جنوری ۱۹۵۲ء
(۸۳) ایضاً ۱۹ جنوری، ۱۹۵۲ء
(۸۴) روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۱۴ جولائی ۱۹۵۲ء
(۸۵) بیگ، ظفر اللہ، برصغیر پاک و ہند میں تحریک ختم نبوت، ایک تاریخی و تجزیاتی مطالعہ، (۱۹۸۴ء)، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، ۱۹۹۷ء، ص ۹۷ تا ۱۰۵۔
(۸۶) ایضاً (۸۷) ایضاً (۸۸) ایضاً (۸۹) ایضاً
(۹۰) انجم، تجمل حسین، پاکستان تاریخی و سیاسی جائزہ (۱۹۴۷ء، ۱۹۹۲ء)، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۶ تا ۱۴۲۔
(۹۱) ایضاً (۹۲) ایضاً (۹۳) ایضاً

۹۴۔ ابتداء میں پنجاب حکومت نے اس تحریک کی حمایت کی اس تحریک کا مقصد مرکزی حکومت سے اپنے مطالبات منوانا تھا۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ (جو ان دنوں وزیراعلیٰ پنجاب تھے) کی تمام ہمدردیاں علماء کے ساتھ تھیں۔ مارچ کے ان شدید ہنگاموں سے پہلے خواجہ نظام الدین نے اس تحریک کے بارے میں رائے لینے کے لیے کراچی میں گورنروں اور چیف منسٹروں کا ایک اجلاس طلب کیا! دولتانہ نے مختلف وجوہ کی بناء پر حاضری سے معذوری ظاہر کی۔ خواجہ نظام الدین نے ٹیلی فون پر دولتانہ سے تبادلہ خیال کیا چنانچہ فیصلہ ہوا کہ مرکزی کابینہ کے سامنے حکومت پنجاب کے خیالات وزیر مال چوہدری محمد حسین چٹھہ پیش کریں گے۔ محمد حسین چٹھہ نے جو رائے دی وہ اب تک کے حکومت پنجاب کے تحریک تحفظ ختم نبوت سے رویے سے قطعی مختلف تھی۔ محمد حسین چٹھہ نے کہا کہ حکومت پنجاب کی رائے یہ ہے کہ وہ تحریک کے آگے جھک نہیں سکتے یہاں جو

بھی فیصلہ ہوگا پنجاب اس پر عمل درآمد کرے گا۔ یعنی پنجاب حکومت نے تحریک کے مطالبات کو قطعاً رد کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ حالانکہ یہ تحریک حکومت پنجاب کی حمایت سے ہی اس قدر زور پکڑ گئی تھی۔' ولانا اختر علی خان نے بھی مجلس عمل کے ایک اجلاس میں اس امر کو تسلیم کیا تھا مسٹر دولتانہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ پنجاب میں احمدیوں کے خلاف تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے کوئی گرفتاری نہیں کی جائے گی۔ ان کے ایماء پر کئی وفد خواجہ نظام الدین سے ملے جن کے مطالبات من وعن وہی تھے جو علماء نے تحریک کے آغاز میں پیش کیے تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے علمائے کے مطالبات پر غور وفکر کیا۔ خواجہ صاحب اگرچہ مذہبی ذہن کے انسان تھے مگر کچھ مطالبات ایسے بھی تھے جن کو من وعن تسلط نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً احمدیوں کو کلیدی عہدوں سے ہٹایا جانا۔ پاکستان اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا تھا اب کی کسی کو صرف مذہبی بنیادوں پر عہدوں سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا مسٹر ظفر اللہ بین الاقوامی طور پر ایک مانے ہوئے شخص تھے ایسا کرنے سے پاکستان کو عالمی دباؤ برداشت کرنا پڑتا۔ امریکی امداد بن کر دی جاتی۔ ان وجوہات کی بناء پر خواجہ ناظم الدین پر عالمی طور پر دباؤ تھا کہ وہ تحریک کے مطالبات پر کان نہ دھریں۔ لہٰذا مرکزی حکومت نے اس تحریک کو دبانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مرکزی حکومت کے ایماء پر فوج نے لاہور شہر اور چھاؤنی ایریا میں مارشل لاء نافذ کردیا اور مارشل لاء کا نظام اعلیٰ میجر جنرل اعظم خان کو مقرر کیا گیا۔ (ایضاً)

(۹۵) بیگ، ظفر اللہ، بحوالہ سابقہ، ص ۹۹۶ تا ۱۰۱۰
(۹۶) ایضاً (۹۷) ایضاً (۹۸) ایضاً
(۹۹) انٹرویو صدیقی، محمد احمد، پروفیسر
(۱۰۰) ایضاً (۱۰۱) ایضاً (۱۰۲) ایضاً (۱۰۳) ایضاً
(۱۰۴) ایضاً
(۱۰۵) انٹرویو، مفتی جمیل احمد نعیمی، ۱۰ جولائی ۲۰۰۵ء
(۱۰۶) ایضاً
(۱۰۷) صدیقی، فریدہ احمد، بحوالہ سابقہ
(۱۰۸) نعیمی، جمیل احمد، بحوالہ سابقہ
(۱۰۹) ایضاً
(۱۱۰) روزنامہ نوائے وقت، ۵ اپریل ۱۹۷۰ء
(۱۱۱) ماہنامہ ترجمان اہل سنت، مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۳۷
(۱۱۲) ایضاً (۱۱۳) ایضاً، ص ۳۸ (۱۱۴) ایضاً

(۱۱۵) ایضاً، ص ۳۹ (۱۱۶) ایضاً، ص ۵۱
(۱۱۷) ایضاً، ص ۶۳ (۱۱۸) ایضاً (۱۱۹) ایضاً
(۱۲۰) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۰ دسمبر ۱۹۷۰ء
(۱۲۱) ایضاً (۱۲۲) ایضاً
(۱۲۳) روزنامہ زندگی، ۲۴-۳۰ ستمبر ۱۹۷۳ء
(۱۲۴) انٹرویو صدیقی، محمد احمد، بحوالہ سابقہ
(۱۲۵) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۹ جنوری ۱۹۷۱ء
(۱۲۶) ایضاً
(۱۲۷) صدیقی، جاوید احمد، نورانی سیاست، شبلی پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ص ۱۱-۱۵
(۱۲۸) ایضاً
(۱۲۹) نورانی، فیض الرسول رضا، صاحبزادہ، افکار نورانی، بزبان امام شاہ احمد نورانی، مکتبہ اہل سنت جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور، س ن، ص ص ۵۷-۶۰
(۱۳۰) ماہنامہ ترجمان اہل سنت۔ مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۶۳
(۱۳۱) نورانی، محمد امین، بحوالہ سابقہ، ص ص ۸۲-۸۵
132- Daily Pakistan Times January 1, 1972.
(۱۳۲) پانچ نکاتی مطالبے کی تفصیل کچھ یوں ہے:
۱۔ یحییٰ خان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔
۲۔ مشرقی پاکستان میں پاکستان دوست باشندوں کے جان و مال کے تحفظ اور ۹۳ ہزار یرغمالی فوجیوں کی واپسی کی کارروائی تیز کی جائے...... اور اس مقصد کے لیے حکومت عوام کو اعتماد میں لے...... مسئلہ کے جذباتی اور انسانی پہلوؤں کے پیش نظر پراسرار انداز اختیار کرنے سے گریز کیا جائے۔
۳۔ ملک سے مارشل لاء ختم کیا جائے۔ عبوری آئینی ڈھانچے میں ترمیم کر کے پارلیمانی نظام حکومت کے تحت قومی وصوبائی اسمبلیوں کے اجلاس بغیر کسی تاخیر کے طلب کیے جائیں...... اور شہریوں کے مکمل حقوق بحال کیے جائیں۔
۴۔ اسلام کو محض نعرہ بازی اور سیاسی اسٹنٹ کے طور پر استعمال نہ کیا جائے بلکہ اسلامی اخوت و مساوات کی حقیقی روح کے مطابق انقلابی، سماجی، اقتصادی اصلاحات کی جائیں...... یہ اصلاحات اسی وقت دیرپا اور پائیدار ہوسکتی ہیں جب جمہوری طور پر اسمبلی کے ذرائع سے ہو۔
۵۔ مسلح افواج کے سیاست میں حصہ لینے پر مکمل پابندی عائد کی جائے تاکہ مستقبل میں کبھی فوجی

ذرائع سے اقتدار پر قبضہ جمانے کا امکان باقی نہ رہے۔

(روزنامہ جنگ کراچی، ۱۷ جنوری ۱۹۷۲ء)

133- Daily Dawn, January 16, 1972.

134- Ibid.

(۱۳۵) روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۷ جنوری ۱۹۷۲ء

(۱۳۶) روزنامہ جسارت، کراچی، ۱۷ جنوری ۱۹۷۲ء

(۱۳۷) ماہنامہ ضیائے حرم، بھیرہ، مارچ ۱۹۷۲ء، ص ۱۴

(۱۳۸) روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۱۰ فروری ۱۹۷۲ء

(۱۳۹) ایضاً ۳ مارچ ۱۹۷۲ء

(۱۴۰) ایضاً ۷ مارچ ۱۹۷۲ء

(۱۴۱) جے یو پی کی جنرل کونسل نے عبوری آئین کی منظوری بھی دی اور جے یو پی کی تنظیم نو بھی کی گئی۔ جس کی رو سے خواجہ قمر الدین سیالوی صدر، پیر کرم شاہ الازہری نائب صدر اول، مولانا نورانی نائب صدر دوم، دیوان سید آل مجتبیٰ نائب صدر سوم اور مولانا محمود احمد رضوی ناظم اعلیٰ منتخب کیے گئے۔ کونسل نے ایک بیس رکنی مجلس عاملہ بھی منتخب کی جبکہ مولانا عبدالستار خان نیازی کو جے یو پی پنجاب کا کنوینر مقرر کیا گیا۔ (نوائے وقت، ۲۸ مارچ ۱۹۷۲ء)

(۱۴۲) ایضاً ۱۳ اپریل ۱۹۷۲ء

143- Dail Dawn, April 15, 1972.

144- Ibid.

145- Ibid, April 18, 1972.

146- Abid, April 22, 1972.

147- Kumar, Satish, New Pakistan, Lahore, 1978. p-16.

148- National Assembly of Pakistan Debates, Vol-I, No. 1, April 14, 1972, pp 70-73.

149- Ibid, Vol-1 No.2, April 15, 1972, pp 123-124.

150- Daily Dawn, May 2, 1972.

(۱۵۱) مزید تفصیل کے لیے دیکھئے صدیقی، جاوید احمد، نورانی سیاست بحوالہ سابقہ۔

(۱۵۲) ایضاً (۱۵۳) ایضاً (۱۵۴) ایضاً (۱۵۵) ایضاً

(۱۵۶) علماء کے ۲۲ نکات کی بنیاد پر ہی قرارداد مقاصد ۱۹۴۹ء، مرتب کی گئی جو ہر آئین کے دیباچے کے

طور پر موجود ہے۔

(۱۵۷) صدیقی، جاوید احمد، بحوالہ سابقہ، ص ص ۴۹-۶۵۔

(۱۵۸) ایضاً (۱۵۹) ایضاً (۱۶۰) ایضاً

161- Ahmed, Mujeeb, Jamiyyat Ulma-i-Pakistan (1948-1979), NIHCR, Islamabad, 1993, p 94.

162- National Assembly of Pakistan debates, vol-1 No.2, April 17, 1972, p 355.

(۱۶۳) صدیقی، جاوید احمد، بحوالہ سابق، ص ۳۵۔

(۱۶۴) ایضاً

165- Daily Dawn, Karachi, July 3, 1972.

166- Ibid, July 11, 1972.

(۱۶۷) روزنامہ نوائے وقت لاہور، یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء

168- Daily Dawn, December 30, 1972.

169- Ibid.

(۱۷۰) انٹرویو مولانا مفتی جمیل احمد نعیمی، کراچی۔

(۱۷۱) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۴ نومبر ۱۹۷۲ء۔

(۱۷۲) ایضاً ۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء

(۱۷۳) روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۲۹ نومبر ۱۹۷۲ء

(۱۷۴) ایضاً ۳ دسمبر ۱۹۷۲ء (۱۷۵) ایضاً

(۱۷۶) ایضاً ۷ اگست ۱۹۷۲ء (۱۷۷) ایضاً ۲۱ ستمبر ۱۹۷۲ء

(۱۷۸) ایضاً ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۲ء اور قادری، صدیق خان، جمعیت قیام سے اب تک، لائل پور، ۱۹۷۴ء، ص ص ۶-۷

(۱۷۹) روزنامہ امروز، ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۲ء

(۱۸۰) روزنامہ نوائے وقت، ایضاً

(۱۸۱) نعیمی، جمیل احمد، بحوالہ سابقہ (۱۸۲) ایضاً

(۱۸۳) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۲ء

184- Daily Pakistan Times, Rawalpindi, October 21, 1972.

185- Ibid.

(۱۸۶) نعیمی، جمیل احمد، بحوالہ سابقہ

(۱۸۷) ایضاً

(۱۸۸) ماہنامہ ترجمان اہل سنت، کراچی، مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۷۶

(۱۸۹) جن کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بھی سرکاری فیصلے سے متاثر ہوا ہے، وہ حکومت کا ملازم ہے اور اپنے افسر بالا کے کسی فیصلے سے متاثر ہوا ہے اور وہ شکایت لے کر جاتا ہے تو صرف کورٹ میں وہ شکایت کر سکتا ہے اور ایسے دوسرے افراد بھی جن پر براہ راست حکومت کے فیصلے کا اثر پڑا ہے تو وہ اگر اس کے خلاف اپیل کرنا چاہے تو ہو صرف A.C میں اپیل دائر کر سکتا ہے اور A.P.C اگر اس کے خلاف فیصلہ دیتا ہے تو اس کو اب یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی بھی عدالت عالیہ یا عدالت عظمیٰ میں جا کر اپیل کر سکے۔ Conadm کا فیصلہ بالکل آخری اور حتمی ہوگا۔ (ماہنامہ ترجمان اہلسنّت، کراچی مارچ ۱۹۷۳ء، ص ص ۷۶۔۷۸)

(۱۹۰) آئین کی رو سے فرد کو بنیادی حقوق حاصل ہوں گے، پارٹی بنانے کا حق حاصل ہوگا۔ شہری آزادی کے حقوق بھی اس کو حاصل ہوں گے۔ وہ جو پارٹی چاہے بنائے، جس پارٹی میں چاہے شریک ہو۔ ایک طرف تو اس میں یہ تحفظ دیا گیا ہے اور دوسری جانب PPA کے ذریعے یہ تمام اختیارات لے لیے گئے۔ اب وہ PPA کے تحت پابند ہیں۔ جس جماعت سے وہ بدگمان ہے، جس پر جماعت پر اسے اعتماد نہیں رہا ہے، اس جماعت کو اب چھوڑ نہیں سکتا اور اگر چھوڑے تو اس کی سیٹ جاتی رہتی ہے۔ PPA کے سلسلہ میں بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ ہم لوگ اس کی مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ حکمران جماعت کے لوگ PPA کے ٹوٹنے کے بعد زیادہ سے زیادہ حکمران جماعت سے نکل آئیں اور اس طرح سے حکومت کمزور ہو جائے گی۔

مولانا نورانی کے بقول PPA ایک قومی اسمبلی کے ممبر کی آزادی پر بہت بڑا قدغن ہے۔ اسمبلی کے ممبر کی آزادیٔ فکر اور فیصلے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے اس قانون کی موجودگی ضروری ہے اور یہ میں سمجھتا ہوں کہ آئینی سمجھوتے سے انحراف کیا گیا ہے کہ بات جب آئینی سمجھوتے کی ہو رہی تھی تو یہ طے ہوا تھا کہ PPA کو اس طرح نافذ کیا جائے کہ کوئی بھی شخص اگر قومی اسمبلی میں ہی جماعت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنا چاہے تو وہ اپنی سیٹ سے پہلے استعفیٰ دے، دوبارہ الیکشن لڑ کر آئے اور پھر اس حکمران کے خلاف جو چاہے کرے۔ اب آپ غور فرمائیے کہ حکمران جماعت رمضان شریف میں آئینی سمجھوتے کے وقت یہ چاہتی تھی کہ PPA کو اور زاویہ وسیع کیا جائے اور اسے اس حد تک لایا جائے تاکہ اگر کوئی شخص عدم اعتماد کی تحریک اپنی جماعت کے وزیراعظم کے خلاف لانا چاہے تو اس کی اپنی سیٹ عدم اعتماد کی تحریک سے ہی ختم ہو

جائے۔ یہ بڑا عجیب سا مذاق ہے کہ اس شخص کی ساتھ جسے تین چار لاکھ ووٹروں نے منتخب کر کے بھیجا ہے اب اس کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ جس وقت چاہے عدم اعتماد کی تحریک اپنی جماعت کے وزیراعظم کے خلاف لائے۔ اس کو یہ بھی حق حاصل ہے اس زمانے میں یہ بھی بات ہو رہی تھی کہ PPA میں بات رکھی جائے کہ اگر عدم اعتماد کی تجویز فیل ہو جائے ناکام ہو جائے تو جتنے بھی افراد نے اس کے حق میں ووٹ دیے ہیں، دستخط کیے ہیں، ان سب کی سیٹیں ختم کر دی جائیں۔ اب وہ دوبارہ لڑ کر آئیں۔ یہ بھی مذاق ہو رہا ہے کہ اس کے بعد پھر وزیراعظم کو 2/3 عدم اعتماد کی تجویز لا کر وزارت کو نہیں بلکہ جمہوری اقدار کو استحکام بخشنے کی کوشش کی گئی تاکہ اس PPA سے نجات پائی جائے۔ استحکام جو حکمران جماعت مانگ رہی تھی کہ اسی پلان چاہیے۔ جمہوریت استحکام کے لیے فرض ہے کہ وزیراعظم اپنے پاس اور تمام عہد جو اس نے اپنے ووٹرز سے کیے ہیں ان کو بروئے کار لا سکے۔ ان کے لیے یہ طے کیا گیا تھا کہ اس کو چاہے کہ PPA کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کیا جائے۔ اس کے بعد پھر یہ تجویز کچھ حضرات نے پیش کی اور پھر آئینی سمجھوتے کے زمانے میں 2/3 سے کچھ تو ۵۱ سے ۵۶ آئے اور اس کے بعد ۶۶ پر آ گئے کہ 2/3 سے عدم اعتماد کی تجویز پیش کی جا سکتی ہے تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ 2/3 کی تجویز سے جب وزیراعظم کو استحکام حاصل ہو گیا جمہوریت کو استحکام حاصل ہوگیا۔ وزیراعظم کو اپنی پالیسیاں بروئے کار لانے کا حق حاصل ہو گیا تو پھر PPA کی ضرورت باقی کیا رہ جاتی ہے۔ (ایضاً)

(۱۹۱) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۳ جنوری ۱۹۷۳ء

192- Daily Pakistan Times, Rawalpindi, January 31, 1973.

193- Ibid.

194- Ibid.

(۱۹۵) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۳۱ جنوری ۱۹۷۳ء

(۱۹۶) روزنامہ حریت، ۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء

(۱۹۷) ایضاً

198- Daily Daw Karachi, February 12, 1973.

(۱۹۹) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۷ فروری ۱۹۷۳ء

200- Daily Dawn, Op.cit.

(۲۰۱) انٹرویو جنرل (ر) خواجہ محمد اظہر، لاہور

(۲۰۲) ایضاً (۲۰۳) ایضاً (۲۰۴) ایضاً

205- Daily Pakistan Times Lahore, March 14, 1973.

206- Ibid.

(۲۰۷) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۱۵ مارچ ۱۹۷۳ء

(۲۰۸) بھٹو حکومت اپنے یوم آغاز سے ہی اپنی جمہوریت کش پالیسیوں کی وجہ سے حزب اختلاف کا نشانہ تھی۔ بالخصوص نوابزادہ نصر اللہ خان، عبدالولی خان اور مفتی محمود اس سلسلہ میں پیش پیش تھے۔ چنانچہ حزب اختلاف کی جماعتوں نے ۱۹۷۰ء میں ولی خان کو قومی اسمبلی میں اپنا قائد منتخب کر لیا اور جمہوریت کی بحالی کے لیے جدوجہد کا اعلان کر دیا۔ بھٹو نے اگر مارشل لاء کے تحت اقتدار نہ سنبھالا ہوتا تو شاید حالات مختلف ہوتے۔ فروری ۱۹۷۳ء میں ولی خان اور مفتی محمود کی مخلوط حکومت سرحد سے مستعفی ہو گئی اور یوں جماعت اسلامی پاکستان، ڈیموکریٹک پارٹی، کونسل مسلم لیگ، جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان نے بھٹو کے خلاف باقاعدہ محاذ آرائی شروع کر دی۔ ان تمام جماعتوں نے ایک سیاسی اتحاد تشکیل دیا جسے ''متحدہ جمہوری محاذ'' (United Democratic Front) کا نام دیا گیا۔ بھٹو نے سیاستدانوں کو سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہوتے دیکھ کر اس کو توڑنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے خفیہ ایجنسیوں کا سہارا لینے کی رسم کو برقرار رکھا۔ انھوں نے این اے رضوی کا ریکارڈ اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے بارے میں دو متضاد آراء ہیں ایک حلقے کا کہنا ہے کہ این اے رضوی اس سازش سے باخبر تھے جو بھٹو نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے تیار کی تھی۔ اس حوالے سے انھوں نے بھٹو کے خلاف شواہد اکٹھے کر رکھے تھے لیکن جونہی بھٹو اقتدار میں آئے، این اے رضوی نے اس ریکارڈ کو تلف کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ بھٹو کے زیر عتاب آنے سے بچ جائیں لیکن بھٹو نے عجلت سے کام کیا اور این اے رضوی کو گرفتار کر لیا ان کی جگہ میاں انور علی کو انٹیلی جنس بیورو کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا۔ یحییٰ خان اپنے دور حکومت میں تمام سیاستدانوں کے ٹیلی فون ٹیپ کرواتے تھے۔ خفیہ ایجنسیوں کے حکام انھیں سیاستدانوں کی حرکات و سکنات سے باخبر رکھتے تھے۔ بھٹو انٹیلی جنس کے ریکارڈ کو کھنگال کر اپنے خلاف ساری رپورٹوں کو ضائع کروا دیا۔ اس کے مختلف رپورٹوں کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے جنرل گل حسن اور جنرل رحیم کو فارغ کر دیا۔ پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت نے بعد میں الزام لگایا کہ جنرل گل حسن اور جنرل رحیم نے حکومت تختہ الٹ کر اقتدار سنبھالنے کی سازش کی تھی۔ بھٹو کے اس اہم فیصلے نے خفیہ ایجنسیوں اور فوج کی ہائی کمان کو خوفزدہ کر دیا اور انھیں یقین ہو گیا کہ بھٹو کافی طاقتور حکمران ہیں، اس لیے ان کے خلاف سازشوں کا تانا بانا بننا فی الوقت ممکن نہیں۔ جنرل گل حسن اور جنرل رحیم کی اقتدار پر قابض ہونے کی خواہش دل میں ہی رہ گئی۔ جنرل ضیاء کے سوا دوسرے کسی جرنیل نے اس طرح کی سازش نہ کی کیونکہ بھٹو نے فوج کے اندر بھی اپنا

جاسوسی کا نظام مضبوط کر لیا تھا اور جرنیلوں کے فون بھی ٹیپ ہوتے تھے۔ بھٹو نے جرنیلوں کو اس کا بھی پابند کر دیا کہ وہ سیاستدانوں سے رابطے نہ رکھیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے جلد ہی یو ڈی ایف کے قیام کا توڑ بھی نکال لیا اور اخبارات میں قائد حزب اختلاف ولی خان کی جماعت کے خلاف خبریں شائع ہونا شروع ہو گئیں جلد ہی جماعت اسلامی بھی بھٹو کی پراپیگنڈہ مہم کی لپیٹ میں آ گئی۔ جمعیت اسلامی کا متعلق اخبارات نے ایسی خبریں شائع کیں جن میں جماعت اسلامی کو پاکستان کو تسلیم نہ کرنے والی جماعت کی ذیل میں رکھا گیا۔ بلکہ یہ کہا گیا کہ یہ جماعتیں یو ڈی ایف میں اس لیے شامل ہوئی ہیں تاکہ ملک کو تقسیم کرنے کی بھارتی سازش کو کامیاب کرایا جا سکے۔ ادھر اتحاد میں شامل بعض جماعتیں بھی ولی مخالف حکومتی پراپیگنڈے کا شکار ہو کر ان کی قیادت کے حوالے سے تحفظات کا شکار ہو گئیں۔ خصوصاً مولانا غلام غوث ہزاروی اور مسلم لیگ کے میاں زاہد سرفراز نے ولی خان کی قیادت پر اعتراض کر دیا۔ ان دونوں رہنماؤں کا موقف یہ تھا کہ متحدہ جمہوری محاذ کو ایسی جماعت کا تعاون حاصل نہیں کرنا چاہیے جس نے قائداعظم کی مخالفت کی تھی اور نظریہ پاکستان پر اب بھی یقین نہیں رکھتی تھی۔ اس طرح کے اختلافات نے محاذ کو خاصے نقصانات سے دوچار کر دیا۔ بعد ازاں متحدہ جمہوری محاذ نے ۶ فروری ۱۹۷۵ء کو پیپلز پارٹی سے معاہدہ کیا کہ اپوزیشن کی جماعتوں کو جمہوری انداز میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت ہو گی مگر بھٹو حکومت نے مارچ ۱۹۷۵ء میں معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگا دی اور متحدہ جمہوری محاذ نے پارلیمنٹ کے اجلاسوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ یوں حکومتی ہتھکنڈوں نے محاذ میں افتراق و انتشار کی کیفیت پیدا کر دی۔ بعد ازاں ان جماعتوں میں اختلافات اس حد تک بڑھے کہ جمعیت علمائے پاکستان نے متحدہ جمہوری محاذ کو خیر باد کہہ دیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ اتحاد غیر موثر ہو کر رہ گیا۔ تاوقتیکہ اس کی جگہ ایک بھرپور اور موثر اتحاد پاکستان قومی اتحاد ۱۹۷۷ء نے لے لی۔

اگرچہ متحدہ جمہوری محاذ حکومتی اقدامات کے نتیجے میں بکھر گیا تاہم اس کا ایک دور رس نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی جماعتوں میں کافی عرصہ کے بعد مشترکہ جمہوری جدوجہد کا شعور بیدار ہوا۔ جس نے بعد ازاں ملکی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

(۲۰۹) نعیمی، جمیل احمد، بحوالہ سابقہ

(۲۱۰) ایضاً (۲۱۱) ایضاً

(۲۱۲) انٹرویو مولانا شبیر ہاشمی

(۲۱۳) ایضاً (۲۱۴) ایضاً (۲۱۵) ایضاً (۲۱۶) ایضاً

(۲۱۷) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۷ مارچ ۱۹۷۳ء

(۲۱۸) ایضاً، ۲۵ مارچ ۱۹۷۳ء (۲۱۹) ایضاً (۲۲۰) ایضاً

(۲۲۱) ایضاً، ۳ اپریل ۱۹۷۳ء (۲۲۲) ایضاً، ۵ اپریل ۱۹۷۳ء

(۲۲۳) احمد، غفور، پھر مارشل لاء آ گیا، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ص ۳۹-۴۲

(۲۲۴) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۱ اپریل ۱۹۷۳ء

(۲۲۵) ماہنامہ ترجمان اہل سنت، کراچی، مئی ۱۹۷۳ء، ص ص ۴۶-۴۹

(۲۲۶) ایضاً (۲۲۷) ایضاً (۲۲۸) ایضاً

(۲۲۹) صدیقی، جاوید احمد، بحوالہ سابقہ، ص ۷۱

(۲۳۰) ایضاً

(۲۳۱) شرکاء خانیوال کنونشن سے مولانا نورانی کا خطاب، بحوالہ ماہنامہ ترجمان اہل سنت، کراچی، جون ۱۹۷۳ء، ص ۴۸

(۲۳۲) ایضاً

(۲۳۳) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۱ اپریل ۱۹۷۳ء

(۲۳۴) ۱۹۷۳ء کے آئین کی جو اسلامی شقیں مولانا شاہ احمد نورانی کی طرف تجویز کردہ ترمیمات کی وجہ سے آئین کا حصہ بنیں تھیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ مملکت کا مذہب اسلام ہوگا۔

۲۔ قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔ پہلے سے موجود قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالا جائے گا۔

۳۔ دستور کے نفاذ کے ۹۰ دن کے اندر اندر اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل ضروری ہوگی۔ کم از کم دو ممبران سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کے ججوں کی کونسل کا چیئرمین ان میں سے کسی ایک کو مقرر کیا جائے گا۔

۴۔ صوبائی یا مرکزی اسمبلی کی 2/5 اقلیت بھی کسی زیر غور قانون کو اسلامی نظریاتی کونسل کے پاس بھیج سکنے کی مجاز ہوگی۔ (پہلے یہ حق صرف اکثریت پارٹی کو حاصل تھا)

۵۔ کونسل کا مشورہ موصول ہونے سے پیشتر انتہائی ناگزیر حالات میں اگر کوئی قانون پاس ہو جائے اور کونسل بعد میں یہ رائے دے کہ قرآن و سنت کے منافی ہے، تو لازماً اس پر نظر ثانی کی جائے گی۔ کونسل کی رپورٹ وصول ہونے کے دو سال کے اندر اندر قومی اور صوبائی اسمبلیاں ان قوانین کو کونسلوں کے مشوروں کے مطابق قرآن و سنت کے مطابق بنانے کی پابند ہوں گی۔
(ڈائری، مولانا جمیل احمد نعیمی)

(۲۳۵) قادری، صدیق خان، آئین میں مسلمان کی تعریف کس طرح شامل ہوئی، ص ص ۱۰-۱۲۔

(۲۳۶) ایضاً

(۲۳۷) ماہنامہ ترجمان اہل سنت کراچی، جون ۱۹۷۳ء، ص ۷۹-۸۰

(۲۳۸) ایضاً (۲۳۹) ایضاً (۲۴۰) ایضاً، ص ص ۸۰-۸۲

(۲۴۱) ایضاً، ص ۸۳ (۲۴۲) ایضاً، ص ۸۴

(۲۴۳) پیپلز پارٹی کی حکومت ہر اس شخص کا راستہ روک رہی تھی جس کا تعلق حزب اختلاف سے تھا۔ انھوں نے آزاد کشمیر میں ووٹوں کی اکثریت کی بنیاد پر آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی سردار عبدالقیوم کی صدارت میں قائم حکومت کے خلاف محض اس لیے اقدامات کرنا شروع کر دیے کہ سردار عبدالقیوم کے روابط اپوزیشن رہنماؤں سے تھے اور سردار عبدالقیوم نے مسٹر بھٹو کی خواہش کے برعکس قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا اور اس کے کچھ عرصے بعد مسلم کانفرنس کی منتخب حکومت کو ایک فرمان کے ذریعے ختم کر دیا گیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے سردار عبدالقیوم خان کی حکومت برطرف کرنے کے فیصلے پر سخت احتجاج کیا اور کہا کہ ملک کے کروڑوں غیور مسلمان قادیانیوں کے ایماء پر آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خان کی برطرفی برداشت نہیں کریں گے۔ سردار عبدالقیوم نے آزاد کشمیر اسمبلی سے قادیانیوں کے خلاف قرارداد منظور کروا کر ساری دنیا کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ حکومت کو اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔

لیکن حکومت اپنی اکثریت کے زعم میں مبتلا رہی اور قادیانی لابی نے آزاد کشمیر سے مسلم کانفرنس کی حکومت ختم کرانے کے بعد یہ تاثر دیا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے معاملات پر ان کا گہرا اثر ہے اور مسٹر بھٹو اس لابی کے اس لیے بھی اسیر ہو گئے تھے کیونکہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں قادیانیوں نے پیپلز پارٹی کی بھرپور مدد کی تھی لیکن ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کے خلاف جو ملک گیر مہم چلی اس کی وجہ سے بھٹو بھی بے بس ہو گئے تھے اور انھیں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا پڑا۔
(نعیمی، جمیل احمد، بحوالہ سابقہ)

(۲۴۴) روزنامہ جنگ کراچی، ۳۰ مئی ۱۹۷۳ء

(۲۴۵) ایضاً، ۳۰ جون ۱۹۷۳ء (۲۴۶) ایضاً

(۲۴۷) ایضاً (۲۴۸) ایضاً ۲۹ جون ۱۹۷۳ء

249- Kumar, Satish, op,cit, p 49.

(۲۵۰) ہاشمی، شبیر احمد، بحوالہ سابقہ

(۲۵۱) ایضاً (۲۵۲) ایضاً (۲۵۳) ایضاً

(۲۵۴) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۶ اگست ۱۹۷۳ء

(۲۵۵) نعیمی، جمیل احمد، بحوالہ سابقہ

(۲۵۶) ہاشمی، شبیر احمد، بحوالہ سابقہ

(۲۵۷) ''سردلبراں'' اداریہ ماہنامہ ضیائے حرم، جون ۱۹۷۳ء

(۲۵۸) ایضاً

(۲۵۹) ہفت روزہ استقلال، ۲ جولائی ۱۹۷۳ء

(۲۶۰) روزنامہ نوائے وقت، ۲۵ اگست ۱۹۷۳ء

(۲۶۱) ایضاً، ۹ ستمبر ۱۹۷۳ء (۲۶۲) ایضاً، ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء

(۲۶۳) ایضاً، ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء

264- Senate of Pakistan Debates, volIII, NO.8, December 4, 1973, pp 286-290.

(۲۶۵) ہاشمی، شبیر احمد، بحوالہ سابقہ

(۲۶۶) ایضاً

(۲۶۷) مست، محمد سلیم، فاتح قادیانیت، لاہور، س ن، ص ۱۳۔۲۱

(۲۶۸) ایم ایم احمد دراصل صیہونیوں کے خفیہ گروپوں مثلاً ''فورڈ فاؤنڈیشن'' اور ''ہاورڈ ایڈوائزی گروپ'' کی اعانت سے پاکستان معیشت میں عدم توازن کا ذمہ دار تھا۔ انہی گروپوں کے ایماء پر منصوبہ بندی کمیشن اور صوبائی محکمہ جات برائے منصوبہ بندی میں اپنے پروردہ ماہرین معیشت کی ایک بھاری تعداد کو داخل کر دیا تاکہ پاکستان کے لیے اپنی مرضی کے مطابق پانچ سالہ منصوبے تیار کیے جاسکیں۔ اس ناقص منصوبہ بندی سے مشرقی ومغربی پاکستان میں ناہمواریاں پیدا کی گئیں۔ (ایضاً، ص ۲۲)

(۲۶۹) ایضاً (۲۷۰) ایضاً

(۲۷۱) مزید برآں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ''جماعت احمدیہ مشرقی پاکستان'' کا امیر فوری طور پر چیف سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، ضلعی مجسٹریٹ اور انچارج پولیس کو جماعت احمدیہ کے خلاف کسی بھی قسم کی مزاحمت کا شک گزرنے کی صورت میں فوری معطل کرے گا۔ اس کے علاوہ امیر کو جماعت کی ہائی کمان کی طرف سے یہ بھی ہدایت کی گئی کہ وہ ذیلی پولیس افسران سے بھی رابطہ رکھے۔ جبکہ بنگالی زبان میں مدون کردہ ایک کتابچہ بعنوان ''مولانا مودودی اور پاکستان کی مخالفت'' کی پانچ ہزار کاپیاں مشرقی پاکستان میں تقسیم کی گئیں۔ (رپورٹ مجلس مشاورت، ربوہ، ۲۲۔۲۴ مارچ ۱۹۶۳ء، ربوہ فیصلہ نمبر بتاریخ ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۔۲۵)

(۲۷۲) رپورٹ، مجلس مشاورت، بحوالہ سابقہ، ص ۲۶۔۲۷

(۲۷۳) مست، محمد سلیم، بحوالہ سابقہ، ص ۲۳

(۲۷۴) ایضاً

(۲۷۵) آغا شورش کاشمیری کے بقول قادیانی اکابرین، ہر قیمت پر قادیان کا حصول چاہتے تھے۔ اسی سلسلے میں ایک قادیانی جرنیل اختر نے نواب آف کالاباغ اور ایوب خان سے ملاقاتیں کیں اور انھیں کشمیر پر حملے کے لیے آمادہ کیا تاہم ایوب خان نے اس قسم کی تجویز کو رد کر دیا تھا۔ (کاشمیری، شورش، تحریک ختم نبوت، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۳۵ تا ۴۰)

(۲۷۶) ایضاً، ص ۳۷ (۲۷۷) ایضاً، ص ۳۸

(۲۷۸) تاہم ان تمام سختیوں کے باوجود ہفت روزہ چٹان ایک ایسا اخبار تھا جس نے اپنے مدیر (آغا شورش کاشمیری) کی گرفتاری اور ہوم ڈیپارٹمنٹ کی سختیوں کے باوجود قادیانیوں پر تنقید جاری رکھی اور ان کی خفیہ سازشوں کو بے نقاب کیا۔ (ایضاً، ص ۴۰، ۴۱)

(۲۷۹) ہفت روزہ چٹان، ۱۔۶ اپریل ۱۹۶۶ء

(۲۸۰) ایضاً ۲۶۔۳۱ جولائی ۱۹۶۷ء

(۲۸۱) احمد، بشیر، تحریک احمدیت، یہودی وسامراجی گٹھ جوڑ، عبداللہ اکادمی، لاہور س ن ندارد، ص ۶۴۶ تا ۶۵۱

(۲۸۲) ایضاً

(۲۸۳) اعلان تاشقند ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کی تفصیلات قوم کے لیے مایوس کن تھیں۔ ایوب خان جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جیتی ہوئی بازی مذاکرات کی میز پر ہار گئے تو طلباء اور عوام نے حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ جسے شروع شروع میں حکومت نے جبر وتشدد سے دبا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت مخالف قوتیں متحد ہونا شروع ہو گئیں۔ اسی سلسلے میں سابق وزیر اعظم چوہدری محمد علی کی رہائش گاہ پر آل پارٹیز کانفرنس طلب کر لی گئی تاہم شیخ مجیب کے ۶ نکات نے اس اے پی سی کو ناکام بنا دیا۔ بعدازاں ۱۹۶۷ء میں پانچ ہم خیال جماعتوں کونسل مسلم لیگ، جماعت اسلامی، عوامی لیگ (نوابزادہ نصر اللہ گروپ) قومی جمہوری اتحاد (این ڈی اے) اور نظام اسلامی پارٹی نے ایک اتحاد ''تحریک جمہوریت پاکستان'' (Pakistan Democratic Movement) بنانے کا اعلان کر دیا۔ یوں پی ڈی ایم نے رابطہ عوام مہم کے ذریعے ایوب خان کے خلاف عوامی قوت کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ حکومت نے جب عوامی غیض وغضب بڑھتے دیکھا تو ۲۵ جنوری ۱۹۶۷ء کو لاہور میں کرفیو لگا دیا جبکہ ۲۸ جنوری تک ملک کے تمام بڑے شہروں میں فوج طلب کی جا چکی تھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے اخبارات روزنامہ جنگ ونوائے وقت برائے سال ۶۶۔۱۹۶۷ء)

(۲۸۴) روزنامہ الفضل، ربوہ، ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء

(۲۸۵) ۳۰ مارچ ۱۹۷۳ء کو حکومت نے بری اور فضائی افواج کے نوجوان افسروں کی بڑی تعداد کو حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش تیار کرنے کے الزام میں گرفتار کیا۔ یہ سازش پاکستان کی تاریخ میں اٹک سازش کے نام سے مشہور ہے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۷۳ء کو پاکستان کی بری اور فضائی افواج نے ۵۹ نوجوان افسران کو ملک کے صدر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ ان ''باغیوں'' میں بری فوج کے جو افسران شامل تھے ان میں بریگیڈیئر ایف بی علی اور کرنل عبدالعلیم آفریدی فوج سے ریٹائر ہو چکے تھے جبکہ میجر فاروق آدم، میجر نادر پرویز، میجر سعید اختر ملک، میجر فاروق نواز جنجوعہ، کیپٹن صادق پرویز، کیپٹن منیر رفیع، کیپٹن نوید رسول مرزا، بریگیڈیئر واجد علی شاہ، کرنل ہمدانی، میجر نصر اللہ، میجر ایاز احمد سپرا اور کیپٹن آصف شفیع کا تعلق فوج کے حاضر افسران سے تھا۔

بری فوج کی ان افسران کو فضائیہ کے جن افسران کی حمایت بھی حاصل تھی۔ ان افسران کے نام اس طرح ہیں (۱) ونگ کمانڈر ای ایچ ہاشمی (۲) سکواڈرن لیڈر ایم غوث (۳) گروپ کیپٹن مسعود اسکندر (۴) ونگ کمانڈر وامق راشد (۵) اسکواڈرن لیڈر جاوید افضال (۶) اسکواڈرن لیڈر دلاور حسین (۷) اسکواڈرن لیڈر اے کے ہمایوں (۸) اسکواڈرن لیڈر این آر اختر (۹) فلائیٹ لیفٹیننٹ اکرم بیگ (۱۰) اسواڈرن لیڈر ممتاز احمد (۱۱) اسکواڈرن لیڈر پرویز اقبال (۱۲) فلائیٹ لیفٹیننٹ ایس کے ظفر (۱۳) گروپ کیپٹن اے ستار چوہدری اور (۱۴) گروپ کیپٹن ایس سجاد حیدر۔

ان پر الزام تھا کہ انھوں نے ۲۰ اگست ۱۹۷۲ء سے ۳۰ مارچ ۱۹۷۳ء کے دوران راولپنڈی، لاہور اور پشاور میں حکومت کے خلاف ایک گہری سازش تیار کی جس کا مقصد حکومت کا تختہ الٹنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ملزمان نے آپس میں جل کر اور دوسرے فوجی یونٹوں سے مدد حاصل کر کے ایک فوجی پریڈ میں صدرِ مملکت، گورنر پنجاب، چند وزرا اور چیف آف دی آرمی اسٹاف کو حراست میں لینے کا پروگرام تھا اور یوں انھوں نے حکومت کے خلاف سازش کر کے آرمی ایکٹ کی دفعہ ۱۳۱ کے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان پر آرمی ایکٹ دفعہ ۱۳ (اے) کا اطلاق بھی کیا گیا تھا۔

چونکہ بریگیڈیئر ایف بی علی اور کرنل عبدالعلیم آفریدی فوج سے ریٹائر ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے موقف اختیار کیا کہ ان پر فوجی ایکٹ کے تحت مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ یہ معاملہ ایک رٹ پٹیشن کے ذریعہ پہلے ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ تک پہنچا۔ سپریم کورٹ نے فیصلہ صادر کی کہ کسی غیر فوجی کو ایسے مقدمے میں فوجی عدالت کے سامنے لایا جا سکتا ہے جس میں الزام کی

نوعیت یہ ہو کہ غیر فوجی آدمی نے کسی فوجی آدمی کے ساتھ مل کر کوئی جرم مشترکہ طور پر سرزد کیا۔ اگر فوجی معاملہ میں کسی غیر فوجی آدمی کا تعلق ثابت ہو سکے تو پھر مقدمہ فوجی عدالت میں قابل سماعت ہوگا۔

''باغیوں'' کے وکلائے صفائی میں منظور قادر، ایم انور، ایس ایم ظفر اور اعجاز بٹالوی جیسے نامور وکلاء شامل تھے۔ مقدمہ کئی ماہ جاری رہا۔ مارچ ۱۹۷۳ء میں اس مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔ بری فوج کے افسران کا اٹک میں اور فضائی فوج کے افسران کا بڈبیر میں دو مختلف فوجی عدالتوں میں کورٹ مارشل ہوا۔ اٹک کی جنرل کورٹ مارشل کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل محمد ضیاء الحق اور بڈبیر کی جنرل کورٹ مارشل کے سربراہ ایئر وائس مارشل رب نواز تھے۔

فیصلہ کے مطابق بری فوج کے ۱۵ اور فضائی فوج کے ۴ افسران کو حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں ملوث پایا گیا جنھیں تین سال سے عمر قید تک کی مختلف معیاد سزائیں سنائی گئیں۔ (مختار، شاہد، پاکستانی سیاست کی نصف صدی، لاہور، ص ۱۰۱-۱۰۳)

(۲۸۶) احمد بشیر، بحوالہ سابقہ، ص ۶۵۳

(۲۸۷) چونکہ آئین میں مولانا شاہ احمد نورانی اور دیگر جید علماء کی کوششوں میں مسلمان کی واضح تعریف آئین میں شامل کرا دی گئی تھی جس سے قادیانیت کا راستہ رک گیا تھا۔ اس لیے قادیانی ہر خلاف آئین اقدام کی حمایت کرتے تھے۔ چاہے وہ فوجی انقلاب ہی کیوں نہ ہو۔ (ایضاً)

(۲۸۸) روزنامہ جنگ، کراچی، ۳۰ اپریل ۱۹۷۳ء

(۲۸۹) ایضاً، یکم مئی ۱۹۷۳ء

(۲۹۰) قادیانیوں کی کوششوں کو مزید سبوتاژ کرنے کے لیے جون ۱۹۷۳ء میں شورش کاشمیری نے ایک کتابچہ بعنوان ''عجمی اسرائیل'' تالیف کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ قادیانیت ایک مذہبی نہیں سیاسی تحریک ہے۔ (احمد بشیر، بحوالہ سابقہ، ص ۷۱۰)

(۲۹۱) روزنامہ جنگ کراچی، ۳۰ جولائی ۱۹۷۳ء

(۲۹۲) کاشمیری، شورش، بحوالہ سابقہ، ص ۲۳۰

(۲۹۳) ایضاً (۲۹۴) ایضاً ص ۲۳۱

(۲۹۵) اللہ وسایا، مولانا، پارلیمنٹ میں قادیانی شکست، طبع اوّل، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۲ تا ۱۵

(۲۹۶) روزنامہ جنگ، ۳۱ مئی ۱۹۷۳ء

(۲۹۷) ایضاً ۲ جون ۱۹۷۳ء

(۲۹۸) ماہنامہ ترجمان اہل سنت، کراچی، جون ۱۹۷۳ء

(۲۹۹) روزنامہ نوائے وقت لاہور، یکم جون ۱۹۷۳ء

(۳۰۰) ہاشمی، شبیر احمد، بحوالہ سابقہ

(۳۰۱) روزنامہ جنگ کراچی، یکم مئی ۱۹۷۴ء

(۳۰۲) ایضاً

(۳۰۳) ہاشمی، شبیر احمد، بحوالہ سابقہ

(۳۰۴) تاہم اس قرارداد پر دوعلماء غلام غوث ہزاروی اور مولانا عبدالحکیم نے دستخط نہ کیے۔ (ایضاً)

(۳۰۵) کیونکہ ۱۹۷۳ء کی تحریک کے دوران مولانا عبدالستار نیازی، علامہ خلیل احمد قادری، صوفی محمد قصوری اور مولانا مودودی کو سزائے موت سنائی گئی تھی۔ تاہم بعد میں مولانا مودودی نے معافی نامہ داخل کر کے جان چھڑائی۔ (ایضاً)

(۳۰۶) ایضاً

(۳۰۷) درحقیقت پیپلز پارٹی کو اقتدار دلانے میں قادیانیوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس لیے اگر مولانا نورانی اس مسئلے کو آسمبلی میں زیر بحث لاتے تو اس فرقہ کی ناراضگی کا ڈر تھا۔ جو پیپلز پارٹی کے لیے نقصان دہ تھا۔ (ایضاً)

(۳۰۸) ایضاً

(۳۰۹) مولانا شاہ احمد نورانی سے ایک تاریخی انٹرویو، ملک محبوب الرسول قادری، ۶ اگست ۱۹۹۹ء، مشمولہ افکار نورانی، بحوالہ سابقہ، ص ۴۱۔۴۴

(۳۱۰) ایضاً (۳۱۱) ایضاً

(۳۱۲) مست، محمد سلیم، بحوالہ سابقہ، ص ۲۹۔۳۰

(۳۱۳) ایضاً (۳۱۴) ایضاً

(۳۱۵) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۸ ستمبر ۱۹۷۴ء

(۳۱۶) ایضاً

(۳۱۷) انٹرویو ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی

(۳۱۸) ایضاً (۳۱۹) ایضاً (۳۲۰) ایضاً (۳۲۱) ایضاً

(۳۲۲) ایضاً

(۳۲۳) انٹرویو پروفیسر محمد احمد صدیقی

(۳۲۴) ایضاً (۳۲۵) ایضاً (۳۲۶) ایضاً (۳۲۷) ایضاً

(۳۲۸) ایضاً (۳۲۹) ایضاً

(۳۳۰) فریدہ احمد صدیقی، بحوالہ سابقہ

(۳۳۱) ایضاً

(۳۳۲) ماہنامہ ندائے اہل سنت لاہور، نومبر ۲۰۰۳ء، ص ۳۶

(۳۳۳) ایضاً (۳۳۴) ایضاً، جنوری ۲۰۰۴ء، ص ۷

(۳۳۵) تفصیل کے لیے دیکھئے قومی روزنامہ جات اشاعت ۲ دسمبر ۲۰۰۳ء

(۳۳۶) صدیقی، محمد احمد، پروفیسر، ''علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی'' مشمولہ عظیم مبلغ اسلام، خواتین اسلامی مشن پاکستان، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۰

(۳۳۷) ایضاً (۳۳۸) ایضاً، ص ۱۰۰۔۱۰۱ (۳۳۹) ایضاً، ص ۱۰۱

(۳۴۰) ایضاً (۳۴۱) ایضاً (۳۴۲) ایضاً (۳۴۳) ایضاً

(۳۴۴) ایضاً (۳۴۵) ایضاً (۳۴۶) ایضاً (۳۴۷) ایضاً، ص ۱۰۲

(۳۴۸) ایضاً (۳۴۹) ایضاً (۳۵۰) ایضاً (۳۵۱) ایضاً

(۳۵۲) اگر مولانا نورانی کی مصروف زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ممکن نہیں تھا کہ وہ تصنیف و تالیف کی طرف آتے۔ تاہم انھوں نے چند کتابیں بھی لکھیں جن میں عیسائیت اور مرزائیت کی رَد میں دو ضخیم کتابیں بھی شامل ہیں۔

(1) **The seal of Prophet (SAW)**

(2) **Juses Christ in the light of Omran.**

(۳۵۳) جیل کے دن، جیل کی راتیں (تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ میں اسیری کے دوران تحریر کی۔)

(۳۵۴) ایضاً ص ۱۰۴

(۳۵۵) ایضاً ص ص ۹۴۔۹۹

(۳۵۶) مولانا نورانی نے چیئرمین ورلڈ اسلامک مشن کی حیثیت سے تمام براعظموں کے جس قدر دورے کیے اور جو اسلامی خدمات سرانجام دیں اس کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ (ایضاً، ص ۱۰۰۔۱۰۵)

اس مختصر سے جائزے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی کی مصروفیات کا شیڈول سال بھر کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اس میں بین الاقوامی سطح پر مصروفیات اور ملکی داخلی ضروریات کو ہمیشہ مدنظر رکھا جاتا ہے۔ مولانا نورانی نے یوں تو بہت سے چھوٹے بڑے ادارے قائم کیے لیکن ورلڈ اسلامک مشن جیسے کی بنیاد رکھ کر پوری دنیا میں عیسائی مشنری کو منہ توڑ جواب دیا ہے۔ براعظم افریقہ میں مسلمانوں کی آبادی ۶۵ فیصد ہے۔ پوپ جان پال دوئم نے افریقی سرزمین پر قدم رکھتے ہی سجدہ کیا اور کہا کہ موجودہ صدی میں افریقہ ہمارا ہوگا۔ اس کے جواب میں عالم اسلام سے صرف ایک آواز بلند ہوئی تھی اور وہ مولانا شاہ احمد نورانی کی تھی کہ افریقہ اور موجودہ صدی اسلام کی ہے۔ وقت نے مولانا کی اس بات کو کافی حد تک درست بھی ثابت کر دیا ہے۔

باب دوم

پاکستان قومی اتحاد اور مولانا شاہ احمد نورانی

۱۹۷۰ء کے الیکشن کے بعد قائم ہونے والی اسمبلی کی (ذوالفقار علی بھٹو کے بطور وزیرِاعظم حلف ۱۹۷۳ء کے بعد سے شمار ہونے والی) مدت ۱۹۷۸ء میں ختم ہونا تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت بالخصوص ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی شخصیت کی بدولت ان دنوں اپنے عروج پر تھی۔ جبکہ دوسری طرف سوشلزم کو بطور اقتصادی نظام اپنانے کے نتیجہ میں ملک کی نظریاتی اساس کو خطرات لاحق ہو چکے تھے۔ اسمبلی میں متحدہ جمہوری محاذ کے نام سے متحدہ اپوزیشن موجود تو تھی لیکن اتحاد کے اندرونی اختلافات نے اسے غیر موثر بنا کر رکھ دیا تھا۔ حکومت کی منتقم مزاج پالیسی کے زیرِ اثر اپوزیشن پارٹیاں اس حد تک خائف تھیں کہ اسمبلی کی کارروائی اور اخباری بیانات کی حد تک ہی بھٹو حکومت کی مخالفت کی جاتی تھی۔ جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ کی حیثیت سے مولانا شاہ احمد نورانی، اپوزیشن کی اس معذرت خواہانہ پالیسی کے حق میں نہیں تھے۔ بالخصوص ضمنی انتخابات کے حوالے سے مولانا نورانی کا موقف یہ تھا کہ ان میں بھرپور حصہ لے کر نہ صرف حکومت کے سامنے اپنی طاقت و اہمیت کا مظاہرہ کیا جائے بلکہ حکومتی دھاندلیوں کو بھی عوام کے سامنے لایا جائے۔ بصورت دیگر عوام میں حزب اختلاف کی ساکھ کو نقصان پہنچے گا لیکن دیگر پارٹیاں ضمنی انتخابات کے بائیکاٹ پر مصر تھیں حکومت مخالف پالیسی کے تحت صوبائی ضمنی الیکشن میں لاہور میں غلام مصطفیٰ کھر کے مقابلے میں جمعیت نے اپنا نمائندہ کھڑا کیا جب کہ اپوزیشن کی دیگر جماعتوں نے اس سے لاتعلقی کا اعلان کیا۔ مزید برآں جب مولانا نورانی سینٹ کے رکن منتخب ہوئے تو انہوں نے پیپلز پارٹی کے نور العارفین کے مقابلے میں حاجی محمد حنیف طیب صاحب کو کھڑا کیا جس پر متحدہ اپوزیشن نے جے یو پی کی پالیسی پر زبردست تنقید کی۔ ان عوامل کی بناء پر متحدہ جمہوری محاذ میں دراڑیں پڑنا شروع ہوگئیں۔ بالآخر پہلے جے یو پی نے محاذ کو خیر باد کہا جبکہ بعد ازاں تحریک استقلال نے بھی اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ حکومت کے لیے یہ صورتحال حد درجہ اطمینان کا باعث تھی۔

مولانا نورانی کی یہ خواہش تھی کہ اپوزیشن کے اس غیر موثر اتحاد کو ازسرِنو منظم کر کے ایک پائیدار اور مضبوط اتحاد کی صورت میں ڈھالا جائے۔ اس لیے انہوں نے باہمی اتحاد و آہنگی کی ہر کوشش کا خیر مقدم کیا۔ تاکہ حکومت کے آمرانہ اور غیر آئینی اقدامات کا بھرپور جواب دیا جاسکے۔ اسی سلسلے میں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے سربراہ سردار شیر باز مزاری کی دعوت پر ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو لاہور میں اپوزیشن کی تمام جماعتوں کا ایک اجلاس منعقد ہوا (۱) جس میں مولانا نورانی، مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصراللہ خان، پیر پگاڑا، میاں طفیل محمد اور پروفیسر غفور احمد نے شرکت کی (۲) تحریک استقلال کے سربراہ ایئر مارشل ریٹائرڈ محمد اصغر خان کی عدم شرکت کی وجہ سے اگرچہ اجلاس میں کوئی خاص پیشرفت نہ ہوئی تاہم تمام جماعتوں نے اس امر پر اتفاق ظاہر کیا کہ کم سے کم پروگرام پر اتحاد قائم کیا جائے۔ (۳) اسے وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیا گیا۔ مگر تحریک استقلال کے بغیر ایسے کسی اتحاد کے قیام کو غیر اہم قرار دیا اور یہ طے ہوا کہ آئندہ اجلاس میں اصغر خان کی شرکت یقینی بنانے کے لیے ایک وفد تشکیل دیا جائے جو انہیں اتحاد میں شمولیت پر آمادہ کر سکے۔ (۴)

دوسرے اجلاس میں اصغر خان کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے جو وفد تشکیل دیا گیا اس میں مولانا نورانی، سردار شیر باز مزاری اور پروفیسر غفور احمد شامل تھے۔ (۵) اصغر خان کا موقف تھا کہ کسی ایسے اتحاد کی کوئی ضرورت نہیں جو بے نتیجہ اور غیر موثر رہے جس میں شامل تمام جماعتوں کو برابر کا حق نہ دیا جائے۔ مگر وفد کے ذریعے بالخصوص مولانا نورانی کی کوششوں سے اصغر خان کو قائل کرلیا گیا اور یہ طے پایا کہ چونکہ حکومت کسی بھی وقت انتخابات کا اعلان کرسکتی ہے اسی لیے حزب اختلاف کو باہمی تعاون کے لیے ایک ورکنگ پیپر تیار کرلینا چاہیے۔ (۶)

حکومت نے اپنی مقبولیت کو کیش کرانے اور سرکاری مشینری اور ذرائع ابلاغ پر کنٹرول کی وجہ سے اپنی انتخابی مہم کو قبل از وقت ہی شروع کر دیا۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اس مقصد کے لیے ملک کے طول و عرض کے دورے کئے اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے اور پیپلز پارٹی کے منشور کی افادیت کو اجاگر کرنے کے لیے ہر حربے اور پراپیگنڈہ کا سہارا لیا۔ اس مقصد کے لیے ذرائع ابلاغ کے ساتھ ساتھ ذرائع آمد و رفت کو موثر طور پر استعمال میں لیا گیا۔ (۷) اپنی اس قبل از وقت انتخابی مہم کے سلسلے میں وزیراعظم بھٹو کی ہدایت پر ایک ایسی جدید ایئر کنڈیشنڈ ٹرین تیار کرائی گئی (اور اسے عوامی ٹرین کا نام دیا گیا)

جس میں میکنائز ڈسسٹم کے تحت ایسا سٹیج نصب تھا جسے بوقت ضرورت پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرنے کے بعد بٹن دباتے ہی اس کو چھپایا جاسکے۔ اس سے حکومت کے آئندہ عزائم اور انتخابی تیاریوں کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ (۸)

حزب اختلاف پر دباؤ بڑھانے کے لیے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۶ء کو سینٹ نے پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کی نااہلیت کے متعلق ایک (ترمیمی) بل منظور کیا (۹)۔ صوبائی وزیر قانون ملک محمد اختر کے بقول رشوت ستانی یا بدعنوانی کے مرتکب افراد کو رکنیت کے لیے نااہل قرار دیا جائے گا اور اس قانون کا اطلاق وفاقی اور صوبائی وزیروں، پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلی کے ممبران، اٹارنی جنرل اور ایڈووکیٹ جنرل پر ہوگا۔ مزید برآں قانون کے تحت اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کیا جائے گا۔ سرکاری بنچوں کی طرف سے متعدد سینیٹروں مثلاً قاضی فیض الحق، افضل کھوکھر، سردار محمد اسلم، مس آصفہ فاروقی، مس نرگس زمان کیانی اور مسٹر عبداللطیف نے بل کی حمایت کی اور ایسا موثر بل پیش کرنے کے لیے وزیراعظم کا شکریہ ادا کیا۔ حتی کہ اسے ایک انقلابی قدم گردانا گیا۔ (۱۰)

سینٹ کے اجلاس میں بل کی مخالفت کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ یہ بل سابقہ ایبڈو (Ebdo) یا پروڈا (Proda) قوانین سے مختلف نہیں۔ اس قانون میں بھی سابقہ قوانین کی طرح متعدد خامیاں ہیں۔ انہوں نے وزیراعظم کو تحقیقات شروع کرانے کا اختیار دینے پر بھی نکتہ چینی کی۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح وزیراعظم کے آمرانہ عزائم کو تقویت ملے گی۔ وزیراعظم کو حکومت، پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے حزب اختلاف کے ممبروں پر کلی اختیارات حاصل ہو جائیں گے اور اس طرح اس بل کی شقوں کو اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف ایک حربے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ بل کی منظوری کے سلسلے میں حکومت کی عجلت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ محمد صفدر، جنہوں نے بل میں متعدد ترامیم پیش کرنا تھیں ایوان میں موجود نہیں تھے۔ (۱۱) حکومت کی طرف سے آئندہ انتخابات کے حوالے سے ۲۰ جنوری ۱۹۷۷ء کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی حتمی حلقہ بندیوں کا اعلان کر دیا گیا۔ (۱۲) جبکہ وزیر قانون ملک محمد اختر نے عوامی نمائندگی کے قانون مجریہ ۱۹۷۵ء کا حوالہ دیتے ہوئے متنبہ کیا کہ انتخابی دھاندلی کے مرتکب افراد ۵ سال تک انتخابات میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ (۱۳)

تحریک استقلال پنجاب کے چیئرمین اور رکن قومی اسمبلی میاں محمود علی قصوری کے بقول عوامی نمائندگی کے بل میں اپوزیشن کا نقطہ نگاہ شامل نہیں کیا گیا تھا اور اپوزیشن جماعتیں آئندہ حکمت عملی کے سلسلے میں تذبذب کا شکار تھیں۔ حتیٰ کہ آئندہ اپوزیشن قیادت کا فیصلہ ہونا بھی باقی تھا۔ اپوزیشن کی اسی کمزوری کو نشانہ بناتے ہوئے پیپلز پارٹی کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل سید ناصر علی رضوی، جو ان دنوں وفاقی وزیر تعمیرات و منصوبہ بندی تھے، نے ۴ جنوری ۱۹۷۷ء کو بار ایسوسی ایشن لودھراں کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اپوزیشن ملک کی قیادت کس طرح سنبھالنے کے اہل ہے جو ابھی تک خود اپنی قیادت کا فیصلہ نہیں کر سکی۔ اپوزیشن جماعتوں پر الزام لگاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اپوزیشن پارٹیوں کے دستور میں اب زیادہ فرق نہیں رہا۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی نے حق ملکیت کو اپنے منشور میں شامل کر لیا ہے۔ (۱۴)

پشاور میں نمائندہ نوائے وقت سے بات چیت کرتے ہوئے اپوزیشن کے ایک اہم رہنما مولانا مفتی محمود نے کہا کہ آئندہ الیکشن میں مشترکہ امیدوار کھڑے کرنے کے لیے حزب اختلاف میں جلدی ہی سمجھوتہ کا امکان ہے۔ اس سلسلہ میں ۹ جنوری ۱۹۷۷ء کو اجلاس ہوگا جس میں حزب اختلاف کی تمام جماعتوں کے اہم رہنما شرکت کریں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جیسے ہی حکومت کی طرف سے عام انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہوگا۔ متحدہ محاذ کے انتخابی منشور کی تشہیر شروع کر دی جائے گی۔

چونکہ ملک میں عام انتخابات کی تاریخ کا اعلان کسی بھی وقت متوقع تھا۔ اس لیے باخبر اخباری حلقوں نے قیاس آرائیوں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو روزنامہ نوائے وقت نے مقتدر حلقوں کے حوالے سے یہ خبر جاری کی کہ ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کے سلسلے میں ۱۰ جنوری کو قومی اسمبلی جبکہ ۱۳ جنوری کو چاروں صوبائی اسمبلیاں توڑ دی جائیں گی۔ وزیراعظم بھٹو ۷ جنوری کو صدر مملکت مسٹر فضل الٰہی چوہدری سے قومی اسمبلی توڑنے کی رسمی درخواست کریں گے۔ اسی طرح چاروں وزرائے اعلیٰ بھی گورنروں سے صوبائی اسمبلیاں ختم کرنے کی درخواست کریں گے۔ (۱۵)

نوائے وقت کی پیشگوئی سچ ثابت ہوئی۔ ۱۰ جنوری ۱۹۷۷ء کو صدر مملکت مسٹر فضل الٰہی چوہدری نے (وزیراعظم بھٹو کی ایڈوائس پر) آئین کی آرٹیکل ۵۸ کے تحت اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے قومی اسمبلی کو توڑنے اور ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو نئے انتخابات

کرانے کا اعلان کر دیا (۱۶)۔ اگرچہ یہ متوقع تھا تاہم حزب اختلاف کے رہنماؤں نے الزام لگایا کہ حکمران جماعت نے اپنی انتخابی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد قبل از وقت اور ڈرامائی طور پر انتخابات کا اعلان کیا ہے۔ جبکہ اسی روز پاکستان الیکشن کمیشن نے انتخابی ضوابط کا اعلان کر دیا۔ (۱۷)

مولانا شاہ احمد نورانی (جو، ان دنوں سینیٹر تھے) نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے اس اعلان کو "بہت اچھا" اور "بہت خوب" قرار دیا۔ ان کے بقول وہ انتخابات کے لیے تیار تھے لیکن عام انتخابات کا اعلان ڈرامائی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ معروف جمہوری طریقہ کے مطابق اپوزیشن کو بھی وہی سہولتیں بہم پہنچائی جانی چاہئیں جن سے حکمران پارٹی گزشتہ ۶ ماہ سے مستفید ہو رہی تھی۔ افسوس تو اس امر کا تھا کہ حکمران پارٹی نے اپنی انتخابی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد انتخابات کا اعلان کیا۔ (۱۸) (سابقہ) متحدہ جمہوری محاذ کے سیکرٹری جنرل مسٹر بارک اللہ کے بقول ایک ماہ انتخابی تیاریوں کے لیے نہایت مختصر عرصہ تھا۔ اتنے کم وقت میں حزب اختلاف کے لیے عوام سے رابطہ کرنا ممکن نہیں۔ (۱۹)

۹ جنوری کو انتخابی حکمت عملی کو قطعی شکل دینے کے لیے (سابقہ) متحدہ جمہوری محاذ کی دو اہم پارٹیوں تحریک استقلال اور جمعیت علمائے پاکستان کے رہنماؤں میں باہمی مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اصغر خان اور مولانا شاہ احمد نورانی نے اپنے معاونوں سمیت باہمی صلاح مشورے شروع کر دیئے۔ (واضح رہے کہ یہ دونوں پارٹیاں ان دنوں محاذ سے باہر تھیں) چنانچہ یہ طے پایا کہ تمام پارٹیاں حکمران جماعت کے امیدواروں کے خلاف مشترکہ امیدوار کھڑا کریں گی۔ (۲۰)

چونکہ اب حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ باہمی اتحاد کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا اس لیے مولانا نورانی جو ایک عرصے سے اپوزیشن جماعتوں کو ایک مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ ایک بار پھر سرگرم عمل ہو گئے۔ ان کی خواہش تھی کہ تمام اپوزیشن جماعتیں مل بیٹھ کر گفت وشنید کے ذریعے اپنے اختلافات طے کریں انہوں نے ہر پارٹی رہنما سے ملاقات کی (۲۱) اور اسے وقت کی نزاکت اور اتحاد کی ضرورت کا احساس دلایا۔ چنانچہ آپ کی دعوت پر ۱۰ جنوری ۱۹۷۷ء کو اپوزیشن کی تمام جماعتوں کے رہنما، جمعیت علمائے پاکستان کے مرکزی دفتر لاہور میں جمع ہوئے اور تاریخ ساز اجلاس شروع ہو گیا۔ (۲۲)

اس کل جماعتی اجلاس میں صرف سربراہان کو مدعو کیا گیا تھا حتیٰ کہ جمعیت علمائے پاکستان کے مولانا عبدالستار نیازی اور جماعت اسلامی پاکستان کے پروفیسر غفور احمد کو موجود ہونے کے باوجود، اجلاس میں شرکت کی اجازت نہ دی گئی (۲۴)۔ اس اہم اجلاس کی صدارت مولانا شاہ احمد نورانی نے کی۔ نشستوں کی تقسیم کے حوالے سے ان کا موقف تھا کہ جمعیت علمائے پاکستان اور تحریک استقلال اتحاد کے اندر ۳۶ فیصد کے حساب سے قومی وصوبائی اسمبلیوں کی نشستیں حاصل کریں گی۔ اس فیصلے سے جماعت اسلامی کی قیادت کے سوا کسی نے اختلاف نہ کیا کیونکہ جماعت کا رویہ شروع ہی سے سرد مہری کا تھا۔ حتیٰ کہ ایک مرحلہ پر جماعت نے اتحاد میں شمولیت سے بھی انکار کر دیا۔ خاص بحث وتمحیص کے بعد بالآخر تمام اختلافی امور طے پاگئے اور ''پاکستان قومی اتحاد'' (Pakistan National Alliance PNA) کے نام سے اپوزیشن جماعتوں کے ایک نئے سیاسی اتحاد کا اعلان ہوا (۲۵) مولانا نورانی کی کوششیں بالآخر رنگ لائیں اور تاریخ پاکستان کا ایک اہم ترین اتحاد وجود میں آیا جس نے آگے چل کر پاکستان کی سیاسی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ یہ مولانا نورانی کی سول آمریت کے خلاف جمہوری کوششوں کا واضح ثبوت تھا۔

اجلاس میں مختلف اپوزیشن جماعتوں کے جن اہم رہنماؤں نے شرکت کی ان میں میاں طفیل محمد، پروفیسر غفور احمد، مولانا عبدالستار نیازی، مولانا غلام علی اوکاڑوی، مولانا فتح محمد، نوابزادہ نصراللہ خان، ملک محمد قاسم، خواجہ محمد صفدر، عبدالحمید بٹ، محمد زمان خان اچکزئی اور صفدر حسین صدیقی شامل تھے۔ جمعیت علمائے پاکستان کے سینئر نائب صدر محمد رفیق باجوہ نے نمائندوں کو بتایا کہ حزب اختلاف ملک بھر میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی ہر نشست پر انتخابات لڑے گی۔ (۲۶) اتحاد کے اعلان کے بعد مختلف سیاسی جماعتوں کے قائدین کے معاونین ومعتمدین کو بھی اجلاس میں شریک ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ اتحاد کے مرکزی عہدیداروں کے انتخاب کا مرحلہ شروع ہوا۔ جے یو پی کے مولانا عبدالستار نیازی نے تجویز پیش کی کہ اتحاد کا صدر ایسی شخصیت ہونی چاہیے جو سیاسی لحاظ سے بے داغ ہو اور جس پر ملک دشمنی کا الزام نہ ہو۔ جس کی جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد نے بھرپور تائید کی اور کہا کہ صرف دو جماعتیں ایسی ہیں جو اس الزام سے مبرا ہیں۔ جمعیت علمائے پاکستان اور پاکستان مسلم لیگ۔ لہٰذا اتحاد کا صدر ان دو جماعتوں میں سے لیا جائے۔ (۲۷) تاہم نوابزادہ نصراللہ

خان نے اس امر سے اختلاف کرتے ہوئے جمعیت علمائے اسلام کے مولانا مفتی محمود کا نام پیش کیا۔ دوسری طرف سے پیر پگاڑا کا نام تجویز کیا گیا۔ مگر مولانا مفتی محمود نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا۔ اجلاس کی فضا کشیدہ ہوچکی تھی۔ اصغر خان جو پہلے ہی اس قسم کے اتحادوں اور جماعتوں سے مایوس بیٹھے تھے۔ انہوں نے بائیکاٹ کی دھمکی دے دی۔ اس مرحلہ پر مولانا نورانی نے معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے اصغر خان کو قائل کرلیا اور مولانا مفتی محمود کی صدارت کو قبول کرلیا۔ (۲۸) جبکہ جنرل سیکرٹری کے لیے جمعیت علمائے پاکستان کے رفیق احمد باجوہ بلامقابلہ منتخب کرلیے گئے۔ مرکزی پارلیمانی بورڈ کے سربراہ کے لیے پیر پگاڑا کا انتخاب عمل میں آیا۔ حالانکہ مولانا شاہ احمد نورانی کی گزشتہ خدمات کے پیش نظر توقع کی جارہی تھی کہ سیاسی اتحاد کی صدارت کے لیے انہی کا انتخاب عمل میں آئے گا۔ مگر انہوں نے نہ صرف اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا بلکہ قومی اتحاد کے وجود کے لیے طے شدہ اصولوں کے مطابق مقررہ نشستوں سے بھی کم پر راضی ہوگئے اور جہاں جہاں جمعیت کو سیٹیں الاٹ کی گئیں وہاں جے یو پی کے امیدواروں نے کاغذات نامزدگی جمع کرادیئے۔ (۲۹)

اپوزیشن جماعتوں کی اس کوشش کا ملک بھر کے سیاسی حلقوں میں خیر مقدم کیا گیا۔ نوائے وقت نے پاکستان قومی اتحاد کے قیام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

اپوزیشن میں یہ سعی اتحاد اگرچہ درپیش انتخابی تقاضوں اور مصلحتوں کی مرہونِ منت ہے۔ لیکن اس مشترکہ تقسیم میں شامل ہونے والی جماعتوں نے باہمی عہد و پیمان کی پاسداری کی۔ یعنی کسی بھی لیڈر نے حد سے بڑھی ہوئی انانیت اور کسی بھی جماعت نے خودسری روا نہ رکھی تو پاکستان قومی اتحاد کے قیام کو نہ صرف قومی سیاست میں ایک اہم واقعے کی حیثیت حاصل ہوجائے گی بلکہ انتخابات میں بھی جان پڑ جائے گی۔ جو جمہوری عمل کو آگے بڑھانے کی بہت اہم بنیاد ہوتی ہے...... انتخابات کے موقع پر اپوزیشن میں اشتراک عمل کا اہتمام ایک پرانا معمول ہے۔ ہر دور میں مختلف ناموں سے متحدہ محاذ بنتے رہے ہیں۔ پاکستان قومی اتحاد کو بھی اس متحدہ محاذ کی نئی یا وسیع تر شکل قرار دیا جاسکتا ہے جو اوائل مارچ ۱۹۷۲ء میں قائم کیا گیا تھا۔ ایسے متحدہ محاذوں کی ضرورت اپوزیشن جماعتوں کی بہت زیادہ تعداد کی وجہ سے محسوس کی جاتی ہے لیکن جس ہم خیالی کو ان کی بنیاد بنایا جاتا ہے اس کے منطقی تقاضے پورے نہیں کئے جاتے اس لیے متحدہ محاذ نہ صرف عارضی ثابت ہوتے ہیں بلکہ کچھ عرصے تک سیاسی رونق بڑھانے

کے بعد جب ان کا شیرازہ بکھرتا ہے تو اس کا نتیجہ اپوزیشن جماعتوں میں اتحاد کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ انتشار کی صورت میں نکلتا ہے...... نئے اتحاد کی بنیاد رکھنے والے بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کا عزم اتحاد اہم ہونے کے باوجود یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ ''قول مرداں جاں دارد'' کا مثبت، ٹھوس اور واشگاف مظاہرہ بھی کریں تاکہ ان میں اشتراک عمل کو سیاست میں جو اہمیت حاصل ہوئی ہے عارضی اور ہنگامی ثابت نہ ہو...... پاکستان میں قومی اتحاد کی بقا اور انتخابی کارکردگی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس میں شامل ہونے والی جماعتیں اپنے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے کس قدر خلوص اور بے لوثی سے کام لیتی ہیں اور وہ اپنے نصب العین کو بلند اور مطمع نظر کو کس قدر وسیع بناتی ہیں۔ (۳۰)

۱۶ جنوری کو پاکستان قومی اتحاد کے تنظیمی ڈھانچے کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ جس کے مطابق:

صدر: مولانا مفتی محمود (سابق قائد حزب اختلاف اور صدر جمعیت علمائے اسلام)

سیکرٹری جنرل: چوہدری محمد رفیق باجوہ (سینئر نائب صدر جمعیت علمائے پاکستان)

چیئرمین اطلاعات دفتر: مسٹر ابوسعید انور

چیئرمین مرکزی پارلیمانی بورڈ: پیر صاحب پگاڑا (سربراہ پاکستان مسلم لیگ) بنائے گئے۔ (۳۱)

پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کیا کہ وہ ۱۷ جنوری کو قومی اسمبلی کی نشستوں کے لیے اپنے امیدواروں کا اعلان کریں گے جبکہ صوبائی اسمبلیوں کے لیے پارٹی ٹکٹوں کا اعلان ۲۰ جنوری کو کیا جائے گا۔ (۳۲) وزیراعظم بھٹو کا اسمبلیوں کے ٹوٹنے کے محض تین دن کے اندر اتنا بڑا اعلان اس امر کا غماز تھا کہ پیپلز پارٹی نے انتخابات کے لیے اپنا پیپر ورک مکمل کرنے کے بعد ہی قبل از وقت اعلان انتخاب کیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اپوزیشن کے مقتدر جماعت پر الزامات بے جا نہیں تھے۔

چیف الیکشن کمشنر مسٹر جسٹس سجاد احمد خان نے قومی اسمبلی کے لیے نشستوں کا اعلان کیا۔ (۳۳) ملک کے مختلف یونٹوں میں نشستوں کی تقسیم درج ذیل ہے:

علاقہ	عام نشستیں	خواتین کے لیے
پنجاب	۱۱۵	۶
سندھ	۴۳	۲
سرحد	۲۶	۱
بلوچستان	۷	۱
فاٹا	۸	×
وفاقی دارالحکومت	۱	×
میزان	۲۰۰	۱۰

کل نشستیں = ۲۱۰

ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں نے ملک بھر میں قومی اسمبلیوں کی نامزدگیاں درج ذیل انداز میں کیں:

علاقہ جات	نشستیں	امیدوار	پی پی پی	پی این اے	قیوم لیگ
کراچی	۱۱	۵۸	۱۵	۱۳	۴
باقی سندھ	۳۲	۱۳۰	۶۲	۱۷	......
پنجاب	۱۱۵	۵۸۱	۱۲۹	۱۸۸	۸
سرحد+قبائلی علاقے	۸+۲۶	۱۲۰+۲۳۴	۱۰+۳۶	۵۸	۲۳
بلوچستان	۷	۲۹	۱۰	......	۲
اسلام آباد	۱	۷	۱	۱	......

پاکستان قومی اتحاد نے جلد ہی رابطہ عوام مہم شروع کر دی۔ کاغذات نامزدگی جمع کراتے وقت عوام کا جم غفیر امیدواروں کے ساتھ ہوتا۔ انتخابات میں شکست کے خدشہ کے پیش نظر بھٹو نے آمرانہ ہتھکنڈوں کا استعمال شروع کر دیا۔ امیدواروں کو دھونس دھمکیاں تو معمول کی بات تھی حتیٰ کہ کئی امیدواروں کو اغوا کروا کر خود اور دیگر کئی رہنماؤں کو بلا مقابلہ کامیاب قرار دلوا دیا۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صوبائی اسمبلیوں کے لیے ۳۹ امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہوئے اور ان تمام کا تعلق پاکستان پیپلز پارٹی سے تھا۔ (۳۴) یکم فروری ۱۹۷۷ء تک یہ تعداد ۶۷ تک جا پہنچی۔

(سندھ سے ۲۶، بلوچستان سے ۱۲ اور پنجاب سے ایک امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہوا۔)(۳۵)

پیپلز پارٹی نے قومی اتحاد کے امیدواروں کو ہراساں کرنے کی مہم ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت اور وسیع پیمانے پر شروع کی۔ گھانچی پاڑہ کراچی میں قومی اتحاد کے امیدوار حاجی محمد حنیف طیب کے الیکشن آفس کے افتتاح کے موقع پر پیپلز پارٹی کے امیدوار سلیمان گھانچی اور حاجی عباس قاسم پٹیل کی قیادت میں غنڈوں نے پتھراؤ کیا اور بعد ازاں فائرنگ شروع کردی۔ مولانا نورانی پتھراؤ سے زخمی ہوگئے انہیں کندھے پر چوٹ آئی۔ کارکن جمعیت صوفی ایاز نیازی کے صاحبزادے محمد اقبال کی ناک توڑ دی گئی جبکہ ایک کارکن شکیل قریشی کی آنکھ پتھر لگنے سے زخمی ہوگئی۔ پاک کالونی کے کارکن محمود علی، مولانا نورانی کو بچانے کے لیے گاڑی آگے لائے تو ان پر شدید پتھراؤ کیا گیا۔ ان کے سر اور سینے پر شدید چوٹیں آئیں۔ پولیس ایک گھنٹہ تک خاموش تماشائی بنی رہی۔ مولانا نورانی نے مقامی پولیس سٹیشن سے فون پر رابطہ قائم کیا تو ایس ایچ او نے تعاون سے انکار کردیا (۳۶) ایسے واقعات پورے ملک میں دہرائے گئے۔ ملتان صوبائی حلقہ ۱۶۴ سے قومی اتحاد کے امیدوار شیخ خلیل اللہ کے بقول پولیس نے ان کی کوٹھی کو گھیرے میں لیے رکھا اور ان کے تائید کنندہ اور تجویز کنندہ مسٹر اللہ بخش اور محمد شریف کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان کے دوستوں اور رشتہ داروں پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ انتخابات سے دستبردار ہوجائیں۔ (۳۷)

حکومت کے ظلم وستم کا سلسلہ اس قدر دراز تھا کہ آزاد امیدواروں کو بھی ڈرایا دھمکایا گیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت ہر قیمت پر انتخابات جیتنا چاہتی تھی۔ حتیٰ کہ وزیراعظم بھٹو نے اپنوں کو بھی نہ بخشا۔ پی پی کے باغی امیدوار سید خاور علی شاہ۔ رانا رب نواز نون، سید حسن رضا شاہ اور اتحاد کے امیدوار میاں خالد حسین مڑل انتقامی کارروائی کے خوف سے زیر زمین چلے گئے (۳۸)۔ اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ فیڈرل سکیورٹی فورس اب حکمران طبقے کو عوامی نفرت کے ریلے سے نہیں بچا سکتی۔ (۳۹)

پیپلز پارٹی نے ٹکٹ دیتے وقت بعض وزراء اور پارٹی عہدیداروں کی غلط نوازشات اور مفادات کو پیش نظر رکھا۔ قومی اسمبلی کے ٹکٹ حاصل کرنے والوں کی اکثریت

باثر اور جاندار تھی۔ کارکن طبقے کی خواہشات کو یکسر پس پشت ڈال دیا گیا۔ تاہم پیپلز پارٹی نے ان انتخابات میں کچھ نئے تجربات بھی کیے۔ مثلاً سنٹرل پنجاب میں جہاں موثر برادریوں اور مضبوط دھڑوں کے باعث پچھلے انتخابات میں پارٹی ٹکٹ جاری کیے جاتے تھے۔ پی پی نے اس روایت کو ختم کیا۔ مثلاً ضلع ساہیوال میں جو افراد پی پی میں برادریوں کے نام پر شامل ہوئے تھے انہیں پارٹی ٹکٹوں سے محروم کردیا گیا۔ اس کے علاوہ جھنگ اور مظفر گڑھ میں فرقہ وارانہ بنیاد پر بھی ٹکٹ نہیں دیئے گئے۔ (۱۹۷۰ء کے انتخاب میں شیعہ رہنما کرنل عابد حسین جھنگ میں اسی وجہ سے ناکام ہوئے تھے جو ناکامی کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ پیپلز پارٹی نے ان علاقوں میں عوامی مزاج کا اندازہ بخوبی لگالیا تھا۔ اس لیے ۱۹۷۷ء میں فرقہ وارانہ شخصیات کو ٹکٹ دینے سے گریز کیا گیا۔

ادھر اپوزیشن امیدواروں کا یہ حال تھا کہ امیدواروں کی اکثریت انتخابی معرکہ آرائی کے نقطہ نظر سے موثر اور باثر نظر نہیں آتی تھی۔ قومی اتحاد کی ٹکٹوں کی تقسیم میں بعض اپوزیشن جماعتوں نے محض خوش فہمی کی بنیاد پر اپنے ہی پارٹی امیدواروں کو ترجیح دی۔ اس سے بہت سے قومی اور صوبائی حلقوں میں غیر موثر افراد کو ہی نامزد کردیا گیا۔ حالانکہ ان حلقوں میں اپوزیشن کو کئی باثر افراد دستیاب ہوسکتے تھے۔ اس سیاسی کوتاہی سے قومی اتحاد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ مثلاً ضلع شیخوپورہ کے مرکزی حلقہ نمبر ۹۵ میں جے یو پی کے بعض رہنماؤں کے ایماء پر سانگلہ ہل کے ایک دیندار مہاجر صنعتکار مفتی ظفر علی نعمانی کو قومی اتحاد کے لیے نامزد کردیا گیا جبکہ اس حلقے کے باشعور سیاسی کارکنوں کے پرزور اصرار پر جہاں مفتی صاحب کو دستبردار ہونے کی ترغیب دی گئی وہاں نامور مسلم لیگی رہنما چوہدری محمد حسین چٹھہ کو قومی اتحاد کے لیے نامزد کردیا گیا۔ اسی ضلع کی مرکزی نشست ۹۳ سے پی پی کے امیدوار چوہدری منظور حسین گجر کے مقابلے میں تحریک استقلال میں شامل فیرز والا کے ایک وکیل چوہدری مراد الدین کو قومی اتحاد کے لیے نامزد کیا گیا اور دوسری نشست پر شیخوپورہ کے مشہور مسلم لیگی ملک برکت علی عتیق کو نظر انداز کیا گیا۔ ملک صاحب نے اس علاقہ سے ایک ضمنی انتخاب میں محض اس لیے حصہ لیا تھا، حکومت کی صعوبتیں برداشت کیں اور پی پی کے امیدوار چوہدری نثار احمد پنوں کا مقابلہ کیا کہ وہ عام انتخابات میں پھر مسلم لیگ کی طرف سے الیکشن کے لیے امیدوار بنیں گے۔ مجبوراً انہوں نے اس نشست پر بطور آزاد امیدوار کاغذات نامزدگی جمع کرادیے۔

اسی طرح گوجرانوالہ کے ایک مرکزی حلقہ نمبر ۹۹ سے جہاں پی پی کا ٹکٹ حافظ آباد کے ایک سابق ایم پی اے چوہدری سیف اللہ تارڑ کو ملا وہاں تحریک استقلال کے بعض رہنماؤں کی ترغیب سے قومی اتحاد کے لیے جسٹس چوہدری نوازش علی بھٹی کو نامزد کیا گیا تھا مگر اس علاقہ کے اپوزیشن کارکنوں کے اصرار پر بعد ازاں حافظ آباد کے ایک سابق ایم این اے چوہدری ارشاد اللہ تارڑ کو دیا گیا۔

قومی اتحاد کی طرف سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لینے والے امیدواروں کے اس رد و بدل سے نہ صرف کارکنوں میں بددلی پھیلی بلکہ امیدواروں کا ووٹ بنک بھی متاثر ہوا۔ اس سے بھی اپوزیشن کے مقابلے میں حکمران جماعت کو زیادہ فائدہ ہوا۔ امیدواروں کے ناموں کی تبدیلی سے ووٹروں کے ذہنوں کا منتشر ہونا ایک فطری امر تھا۔

قومی اتحاد کے اس سیاسی رویے کے پس منظر میں غالباً یہ وجہ تھی کہ اپوزیشن کے امیدوار ماضی میں شہری نشستوں پر حکمران جماعتوں کے مقابلے میں زیادہ کامیابی سے ہمکنار ہوتے تھے۔ اس لیے قومی اتحاد کی طرف سے یہ تاثر دیا گیا کہ اپوزیشن امیدوار شہروں میں پیپلز پارٹی کے مقابلے میں انتخابی نقطہ نگاہ سے بالا ہیں۔ بالفرض اگر انتخابات ۱۹۷۷ء میں بھی ماضی کا یہ تاثر برقرار رہتا تو بھی قومی اتحاد نے شہروں میں اپوزیشن رہنماؤں کے رد و بدل کی جو مثال قائم کی وہ کسی صورت بھی نیک فال نہیں تھی کیونکہ اس سے قومی اتحاد کو ہرگز استحکام نصیب نہیں ہوسکتا تھا۔ قومی اتحاد کے امیدواروں نے بھی انتخابی حلقوں کے لیے پارٹی مفادات کے بجائے ذاتی پسند و ناپسند کو ترجیح دی۔ مثلاً خاکسار امیدوار امیر حبیب اللہ سعدی لاہور کے مرکزی حلقہ نمبر ۸۵ میں کھڑے ہوئے۔ ان کے پیش نظر یہ حقیقت تھی کہ ان کے آبائی حلقہ کمالیہ سے ان کے چھوٹے بھائی رائے حفیظ اللہ طارق پی پی کے نامزد امیدوار تھے۔ اس لیے انہوں نے لاہور کے حلقے کو منتخب کیا۔ قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل رفیق احمد باجوہ نے بھی اپنے آبائی حلقہ سانگلہ ہل کے بجائے لاہور ہی کو اپنے انتخابی معرکہ کے لیے منتخب کیا۔ ملک محمد قاسم نے بہاولنگر کے مقابلہ میں سمن آباد لاہور کو اس لیے ترجیح دی کہ انہیں اس حلقہ سے زیادہ ووٹ ملنے کی توقع تھی۔ لاہور کے تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل طالبعلم لیڈروں نے بھی انتخاب میں حصہ لینے کے لیے لاہور ہی کو منتخب کیا۔ مثلاً جاوید ہاشمی۔ حالانکہ ٹکٹوں کی تقسیم کے وقت قومی اتحاد کے اکابرین اور اتحاد میں شامل جماعتوں کے سربراہان کو اس امر کا

احساس ہونا چاہیے تھا کہ لاہور پر لاہور والوں کا بھی حق تھا۔ وہ بزرگ کارکن جنہیں یہاں مقبولیت حاصل تھی اور ایک عرصہ سے سیاسی کردار ادا کرتے چلے آرہے تھے ٹکٹوں کے زیادہ حقدار تھے۔

قومی اتحاد کے امیدواروں کے مقابلے میں آزاد امیدواروں اور بعض (اپوزیشن) جماعتوں کے امیدوار کھڑے ہونے کی وجہ سے بھی قومی اتحاد کو خاطر خواہ دھچکا پہنچا۔ مثلاً لائلپور (موجودہ فیصل آباد) کی مرکزی نشست نمبر ۶۹ پر پی پی کے امیدوار میاں محمد اقبال کے مقابلے میں قومی اتحاد کے امیدوار میاں زاہد سرفراز تھے۔ جبکہ اسی نشست پر انقلابی محاذ کے رہنما مسٹر مختار رانا ہی امیدوار تھے۔ اسی طرح ملحقہ مرکزی حلقہ نمبر ۷۰ میں جہاں پی پی کا ٹکٹ ایوب کابینہ میں شامل وزیر چوہدری علی اکبر مرحوم کے صاحبزادے کیپٹن نثار اکبر کو دیا گیا وہاں بھی مسٹر مختار رانا انقلابی محاذ کے امیدوار تھے۔ اس نشست پر قومی اتحاد کی طرف سے چوہدری محمد صدیق رندھاوا کو نامزد کیا گیا۔

لاہور شہر کے مرکزی حلقہ نمبر ۸۲ سے جہاں قومی اتحاد نے سابق وزیراعلیٰ پنجاب مسٹر محمد حنیف رامے (۲۰۰۵ء) کو نامزد کیا اس نشست پر پاکستان ورکرز پارٹی کے کمیونسٹ صدر مرزا محمد ابراہیم بھی امیدوار تھے۔ جبکہ پی پی نے اس نشست پر خالد لطیف کو بار ایٹ لاء کو ٹکٹ دیا۔

بعض حلقوں میں موثر امیدواروں کے بطور آزاد امیدوار انتخابات حصہ لینے سے بھی قومی اتحاد کے امیدواروں کی پوزیشن غیر مستحکم ہوئی۔ مثلاً لاہور شہر میں صوبائی حلقہ نمبر ۱۰۱ سے قومی اتحاد کی طرف سے پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر مسٹر فرید پراچہ کو نامزد کیا گیا۔ اس نشست پر سابق مرکزی وزیر قانون و پارلیمانی امور ایس ایم ظفر بھی بطور امیدوار کھڑے تھے۔ صوبائی حلقہ نمبر ۱۱۰ سے جہاں پاکستان قومی اتحاد کے نامزد امیدوار سمیع اللہ خان تھے، اس حلقہ سے سابق ایم پی اے سردار خالد عمر بطور آزاد امیدوار الیکشن لڑ رہے تھے۔ اس قسم کی صورتحال پنجاب کے ۲۰ مرکزی اور ۵۵ صوبائی حلقوں میں موجود تھی اس کا بالواسطہ فائدہ حکمران جماعت ہی کو پہنچا۔

بلوچستان صوبائی اسمبلی میں انتخابات سے پہلے ہی پی پی کو اکثریت حاصل ہوگئی۔ ۴۳ صوبائی نشستوں میں سے ۲۲ نشستوں پر، پی پی کے امیدواران بلامقابلہ منتخب ہوئے۔ اس

کی وجہ اپوزیشن کا بائیکاٹ تھا۔ اگر اپوزیشن مقابلے کا فیصلہ کرتی تو امید تھی کہ پی پی کے تین سے زائد امیدوار بلا مقابلہ نہ ہوتے۔ بلا مقابلہ منتخب ہونے والوں میں صوبائی وزیر اعلیٰ محمد علی خان باروزئی، سینئر صوبائی وزیر غوث رئیسانی، صوبائی وزیر اوقاف نصرت اللہ سنجرانی، وزیر اعلیٰ جام غلام قادر شامل تھے۔ وزیر اعلیٰ باروزئی کے مقابلے میں ایک آزاد امیدوار تھا جس کے کاغذات نامزدگی مسترد ہو گئے۔ بعد ازاں اس نے شکست تسلیم کر کے صلح کر لی۔ سینئر صوبائی وزیر غوث بخش رئیسانی کے مقابلے میں بھی ایک آزاد امیدوار تھا۔ جس کا شمار وزیر اعلیٰ باروزئی کے دوستوں میں ہوتا تھا۔ مسٹر باروزئی، مسٹر رئیسانی اور دیگر معتبرین، اس آزاد امیدوار کے گھر بلوچی رواج کے مطابق ''میڑھ'' لے کر گئے جس کی وجہ سے صلح عمل میں آئی۔

اس میڑھ کی اخبارات میں بہت تشہیر ہوئی۔ سیاسی مبصرین کے مطابق اس سے بلوچستان میں پیپلز پارٹی کو سیاسی طور پر نقصان پہنچا۔ میڑھ بہت خاص حالات میں لے جائی جاتی ہے جبکہ غوث بخش رئیسانی کا معاملہ یہ تھا کہ اگر وہ انتخاب لڑتے تو یقیناً جیت جاتے۔ رئیسانی کی طرف سے لے جائی گئی میڑھ کو بعض حلقوں نے کمزوری سے تعبیر کیا۔

پولنگ سے پہلے ہی اکثریت حاصل ہونے پر پی پی کی انتخابی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ تاہم وہ امیدوار جو بلا مقابلہ منتخب نہ ہو سکے ان میں پریشانی کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ پی پی بلوچستان میں تمام نشستیں حاصل کرنے کی سیاسی غلطی شاید نہ کرے بلکہ ڈھیلی ڈھالی اپوزیشن بھی برقرار رکھے۔ اس سلسلے میں کن حکومتی امیدواروں کو قربانی کا بکرا بنایا جائے گا؟ یہ سوال بھی پی پی امیدواروں کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ مبصرین کے خیال میں بلوچستان میں بعض ایسے امیدواروں کو بھی کامیاب کرایا جائے گا جو بعد میں کسی وقت بھی پی پی

☆ میڑھ بلوچی رواج میں عموماً تنازعات ختم کرانے کے لیے لے جائی جاتی ہے اور جس کے گھر میڑھ جاتی ہے وہ میڑھ کی بات ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ میڑھ زنا کاری اور چوری کے معاملات کے علاوہ دیگر تنازعات میں بھی جاتی ہے۔ اس رواج کے تحت عموماً قتل بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ میڑھ میں معتبرین کے علاوہ ایک سید اور قرآن شریف بھی ہمراہ ہوتے ہیں۔ میڑھ لے کر جانے والا اقرار جرم کرتا ہے اور دوسرے فریق کو کہتا ہے کہ وہ جو سزا یا جرمانہ چاہے کر سکتا ہے۔ تصفیہ یا صلح کے لیے رقم کا تصفیہ بھی ہوتا ہے۔ جو دوسرے فریق کی صوابدید پر ہوتا ہے۔ کہ وہ جرمانے کی رقم وصول کرے یا معاف کر دے۔ قتل کے مقدمات میں میڑھ کے ہمراہ دیگر لوازمات کے علاوہ تلوار بھی لے جائی جاتی ہے جو دوسرے فریق کو دیدی جاتی ہے کہ وہ اگر چاہے تو اپنے مخالف کو گردن سے اڑا دے لیکن عموماً معافی عمل میں آتی ہے۔ (نوائے وقت ۳ فروری ۱۹۷۷ء)

میں شامل ہو سکتے ہیں یا اپوزیشن بنچوں پر بھی پی پی کے دوست شمار ہوں۔ یہ پیشگوئی بھی کی گئی کہ بلوچستان میں پی پی مزید ۱۳ صوبائی نشستیں لے کر ۴۰ میں سے ۳۵ حاصل کرے گی۔ خواتین کی ۲ اور ایک اقلیتی نشست سمیت ۳۸ نشستیں حاصل کرے گی جبکہ باقی ماندہ ۵ میں سے ۲ پختونخواہ نیپ اور تین آزاد امیدوار کامیاب ہوں گے۔ (۴۰)

سندھ اسمبلی کی ۱۰۰ میں سے ۴۴ نشستوں پر پی پی کے امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ حیدرآباد اور سکھر ڈویژن سے ۲۱، ۲۱ امیدواروں نے بلا مقابلہ کامیابی حاصل کی۔ (۴۱)

یہ تو تھی قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے حوالے سے پاکستان قومی اتحاد اور حکومتی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کی صورتحال۔ اس سے واضح طور پر یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی ہی مسند اقتدار سنبھالتی۔ اسے پاکستان قومی اتحاد کی بدقسمتی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ پیپلز پارٹی کی تیاریاں مکمل تھیں جبکہ پاکستان قومی اتحاد کے منشور کا اعلان بھی نہ ہو سکا تھا۔ (۴۲) تاہم پاکستان قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل رفیق احمد باجوہ کے بقول اتحاد کا منشور نہ صرف پاکستان پیپلز پارٹی کے انتخابی منشور سے بہتر ہوگا بلکہ یہ عوامی خواہشات کا آئینہ دار ہوگا۔ اس میں کوئی خیالی یا تصوراتی بات نہیں ہوگی۔ (۴۳)

> مختلف سیاسی جماعتوں کے اتحاد سے پیدا ہونے والے تاثر کو بہتر کیے اور کافی حد تک آگے بڑھائے بغیر منشور کی اشاعت مناسب نہیں اور اس بات کی ضرورت تھی کہ قومی اتحاد کے رہنما ملک کے اکثر حصوں کا دورہ کریں اور عوامی تاثر سے اچھی طرح واقف ہو جائیں...... بھٹو نے انتخابات سے پہلے ملک بھر میں گھر انتخابی دورہ کر کے اپنے حق میں راہ ہموار کر لی تھی اور انتخابات اب ان کے لیے پکی پکائی کھیر تھی لیکن انتخابات کے اعلان کے قومی اتحاد کی صورت میں نو جماعتوں کا اشتراک ان کے لیے پریشانی کا باعث بنا۔ (پیپلز پارٹی پر الزام لگاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ) پاکستان پیپلز پارٹی نے ہر ممکن طور پر قومی اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس سلسلے میں اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہے۔ اتحاد کے پرامن جلسوں میں گڑ بڑ

پھیلانے کے لیے پی پی نے جلسوں میں اپنے آدمی داخل کیے ہیں۔

اتحاد میں انتشار پھیلانے کے لیے پی پی نے اپنے آدمی امیدواروں کی شکل میں بھیجے۔ لیکن بروقت علم ہو جانے کی وجہ سے پی پی کا یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا۔ ایسے ملازمین جنہوں نے حال ہی میں سرکاری ملازمت چھوڑی ہے انہیں بھی حزب اختلاف کی کئی جماعتوں میں (خفیہ طریقے سے) شامل کروایا گیا۔ پی پی کی چال یہ تھی کہ وہ کاغذات نامزدگی داخل کریں گے جن پر پیپلز پارٹی ان امیدواروں پر اعتراض کرے گی جس کے نتیجے کے طور پر ان کے امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہو جائیں گے۔ (۴۴)

قومی اتحاد کے امیدواروں کو نہ صرف ہراساں کیا گیا بلکہ حیلے بہانوں سے جلسوں پر پابندی بھی عائد کی گئی۔ مثال کے طور پر قومی اسمبلی حلقہ نمبر ۱۱ کراچی سے (قومی اتحاد کے امیدوار) مولانا نے چیف الیکشن کمشنر کے نام ایک درخواست میں لکھا کہ اندرون سندھ پاکستان قومی اتحاد کے امیدواروں اور ان کے متعلقین کو ہر ممکن طریقے سے ہراساں کیا جا رہا ہے۔ مزید برآں قومی اتحاد کی انتخابی گاڑیوں کو پولیس بھی روک رہی تھی۔ (۴۵)

ان انتقامی کارروائیوں کے باوجود قومی اتحاد کے رہنما پرعزم تھے۔ ۲۳ جنوری ۱۹۷۷ء کو کراچی کے نشتر پارک میں پاکستان قومی اتحاد کے زیر اہتمام پہلا جلسہ عام منعقد کیا گیا۔ (۴۶) کراچی کے جلسہ عام کے بعد راولپنڈی سے ایک ملک گیر جلوس کا اہتمام کیا گیا جس کو صوبہ پنجاب کے تمام چھوٹے بڑے شہروں سے گزرنا تھا۔ (۴۷) اس جلوس کے ابتدائی مرحلے میں تمام قائدین کو آنا تھا مگر وہ نہ آسکے۔ اس لیے اس مرحلے پر جلوس کی قیادت مولانا شاہ احمد نورانی اور اصغر خان نے کی۔ (۴۸) اس جلوس کا آغاز ایوان صدر راولپنڈی سے کیا گیا۔ اس جلوس کی قیادت کے لیے مفتی محمود، مولانا شاہ احمد نورانی، اصغر خان اور مولانا جان محمد عباسی کو آنا تھا۔ مگر محمد عباسی کو اس روز الیکشن کمیشن نے بلا لیا جبکہ مفتی محمود علالت کے باعث اتنا طویل سفر نہ کر سکے۔ بالآخر یہ جلوس مولانا نورانی، اصغر خان اور کشمیری رہنما سردار سکندر حیات کی قیادت میں مختلف رکاوٹوں کو عبور کرتا ہوا گوجر خان، سرائے عالمگیر، کھاریاں، لالہ موسیٰ سے ہوتا ہوا گجرات پہنچا۔ گجرات سے وزیر آباد اور پھر لاہور سے ہوتا ہوا صادق آباد پر اختتام پذیر ہوا۔ (۴۹)

قومی اتحاد کے رہنماؤں نے اسلامی معاشرہ کے قیام کا عزم کیا۔ رفیق احمد باجوہ

نے اس موقع پر اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ۸ فروری ۱۹۷۷ء کو اللہ کی حاکمیت اور نظام مصطفی ﷺ کے قیام کے لیے منشور کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اخبارات کے مطابق جلسہ میں اڑھائی لاکھ افراد موجود تھے☆ (۵۰)۔ جلسے سے قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود، ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان، مولانا نورانی، میاں طفیل محمد، نوابزادہ نصر اللہ خان، شیر باز مزاری، بیگم نسیم ولی، ملک محمد قاسم، رفیق احمد باجوہ، مسٹر اشرف خان، سردار سکندر حیات نے بھی خطاب کیا۔ اس کی صدارت مسٹر احسان وائیں نے کی۔ غریبوں کے حقوق اور آزادی صحافت کا عزم کیا گیا۔ اتحاد کے سیکرٹری جنرل رفیق باجوہ کے بقول ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ عمل میں لایا جائے گا۔ کراچی سے خیبر تک شراب پر پابندی ہوگی۔ چھ ماہ کے اندر قیمتیں ۱۹۷۰ء والی پوزیشن پر لائی جائیں گی۔ بھٹو کو اگر اپنی طاقت پر بھروسہ ہے تو مجھے مصطفیٰ ﷺ کی طاقت پر بھروسہ ہے۔ ہماری اسمبلی پڑھے لکھے اور شریف لوگوں کی اسمبلی ہوگی، بیٹیوں کے سروں پر ڈوپٹے واپس آجائیں گے۔ اراکین کو شراب اور رشوت نہ لینے کا حلف دینا ہوگا۔

سردار شیر باز مزاری کے بقول وہ ۲۰ سال سے کراچی میں مقیم تھے اور ان کا خاندان جاگیرداری کا مخالف تھا۔ ان کے خاندان نے (کبھی) کوئی خطاب قبول نہیں کیا۔ (۵۱)

راولپنڈی سے صادق آباد تک رابطہ عوام مہم کا سلسلہ کامیابی سے اختتام پذیر ہوا۔

قومی اتحاد کے رہنماؤں نے رابطہ عوام مہم ملک بھر میں جاری و ساری رکھی۔ کراچی میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کراچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کہا کہ فرد واحد کا اقتدار ہمیشہ ظلم و تشدد لاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اتحاد جمہوری اصولوں کے مطابق حکمران کرے گا۔ اتحاد کی رابطہ کمیٹی کے صدر مبین نورانی نے ٹی وی، ریڈیو، کراچی میونسپل کارپوریشن کے ذمہ داروں کو خبردار کیا کہ اگر انہوں نے قومی ملازم ہوتے ہوئے (کسی بھی) سیاسی پارٹی کے کارکن کی حیثیت سے کام کیا تو ان کا احتساب ہوگا۔ (۵۲)

جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ اور پاکستان قومی اتحاد کے رہنما مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ ان کا حکمران جماعت پیپلز پارٹی سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں بلکہ حکمرانوں کے غلط اصولوں سے اختلاف تھا...... پاکستان قومی اتحاد اس ملک میں شریعت محمدی ﷺ کا نفاذ

☆ نوائے وقت کے رپورٹر کے مطابق راولپنڈی سے گوجرانوالہ یہ ۳۰ میل لمبا جلوس تھا، کسانوں نے ہل اٹھا کر جلوس کا ساتھ دیا۔ (نوائے وقت ۷ فروری ۱۹۷۷ء)

چاہتا ہے جبکہ حکمران جماعت غیر شرعی قوانین لاگو کرنا چاہتی ہے۔ ان کے (سابقہ) دور اقتدار میں لادینی نظام کو فروغ دیا گیا۔ اسلام دشمنوں کو چھوٹ دی گئی۔ قومی دولت کا غلط استعمال ہوا (جس سے) مہنگائی بے انتہا بڑھ گئی۔ (۵۳)

ان کے بقول وزیراعظم بھٹو کا یہ کہنا غلط تھا کہ ملک میں مہنگائی بین الاقوامی حالات کا نتیجہ تھی۔ مہنگائی کی وجہ حکمرانوں کی بڑھتی ہوئی عیاشی ہے جس کی وجہ سے عوام پر ٹیکس زیادہ کردیئے گئے ہیں...... انتظامیہ پر سالانہ ایک کروڑ ۴۴ لاکھ خرچ ہوتے ہیں اور جو کار وزیراعظم کے زیر استعمال ہے اس کی قیمت ۲ لاکھ روپے ہے...... اب جبکہ ملک آدھا رہ گیا ہے۔ اخراجات چار گنا بڑھ گئے ہیں۔ جب تک (عوام) ایسے لوگوں کو برسر اقتدار نہیں لائیں گے جو سادہ ہوں اور اگر وقت آئے تو سائیکل پر بھی دفتر جاسکیں اس وقت تک مہنگائی پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ (اس سلسلے میں قانون بنانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ۱۴ سو سال پہلے قانون بن چکا ہے۔) (۵۴)

حیدرآباد میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نورانی نے کہا کہ موجودہ حکومت میزائل، ٹینک اور طیارے بنانے کا فریب دے رہی ہے۔ حالانکہ حکومت ۶ برس میں اسکوٹر اور جیپ بھی نہیں بناسکی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ گھی اور چینی جیسی عوام ضرورت کی اشیاء ہندوستان اسمگل کی گئیں جن کا اعتراف وفاقی حکومت کے وزیر داخلہ نے بھی کیا...... ملک میں نظم و نسق کا یہ عالم ہے کہ وزیراعظم پاکستان اور وزیراعلیٰ سندھ دونوں کی سرکٹ ہاؤس میں موجودگی کے باوجود شاہی بازار میں دکانیں لوٹی گئیں...... حکومت کی پوری مشینری پیپلز پارٹی کو کامیاب بنانے میں لگی ہوئی ہے جو سراسر ناجائز ہے۔ اگر حکومت عوامی ہونے کی دعویدار ہے تو وہ سرکاری ذرائع کو ترک کرکے انتخاب لڑے۔ (۵۵)

میانوالی میں انتخابی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نورانی نے کہا کہ قومی اتحاد برسر اقتدار آکر شملہ معاہدہ منسوخ کردے گا اور کشمیر کا فیصلہ شمشیر سے کیا جائے گا۔ (۵۶)

اسی طرح دیپالپور میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ انتخابات میں انتظامیہ کی مداخلت بالکل برداشت نہیں کی جائے گی اور قومی اتحاد برسر اقتدار آنے کے بعد ایک کمیشن مقرر کرے گا کہ اس ملک کے ٹکڑے کرنے کا ذمہ دار کون ہے۔ اس ملک کے

ٹکڑے کرنے والوں کو ضرور سزا ملے گی...... انتظامیہ کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ وہ قومی اتحاد کے کارکنوں کے خلاف جھوٹے مقدمات قائم نہ کرے اور نہ ان کو ہراساں کرے۔ ایسے افسران کی فہرستیں تیار کی جارہی ہیں جو قومی اتحاد کے کارکنوں کو ہراساں اور ان کے خلاف جھوٹے مقدمات قائم کررہے ہیں۔ (۵۷)

عیسیٰ خیل میں مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ حکمران طبقہ مہنگائی کو کبھی بین الاقوامی حالات کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور کبھی کہنا چاہتا ہے کہ سیاسی استحکام نہ ہونے کی وجہ سے مہنگائی بڑھ گئی ہے۔ اس تضاد (بیانی) سے حکومتی پارٹی کی قلعی کھل گئی...... مہنگائی صرف پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیپلز پارٹی کو سیاسی استحکام حاصل نہیں ہوا۔ ایسی حکومت جسے سیاسی استحکام نہ ہو، اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں...... اگر قومی اتحاد برسر اقتدار آگیا تو سوشلزم اور سیکولر ازم اپنے فطری انجام کو پہنچ جائیں گے۔ انہوں نے انتخابات کو حق و باطل کے درمیان ایک معرکہ قرار دیا۔ اگر حق برسر اقتدار آگیا تو ملک میں اسلامی نظام قائم ہوجائے گا اور اس وقت جو بے شمار برائیاں معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں ان کا ایک آرڈیننس کے ذریعے ایک ماہ کے اندر اندر خاتمہ کردیا جائے گا۔ (۵۸)

قومی اتحاد کے رہنماؤں نے ملتان اور بہاولپور میں بھی مختلف عوامی جلسوں سے خطاب کیا۔ ان جلسوں کی قیادت مولانا نورانی، نوابزادہ نصراللہ خان، اصغر خان، میاں طفیل محمد، نواب مظفر حسین، حبیب اللہ سعدی، راؤ نوروز اختر اور سردار سکندر حیات خان کررہے تھے۔ (۵۹) ساہیوال میں مولانا شاہ احمد نورانی، مفتی محمود، نوابزادہ نصراللہ خان، میاں طفیل محمد اور اصغر خان نے خطاب کیا۔ (۶۰)

جوں جوں قومی اتحاد کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ پیپلز پارٹی کی صفیں بوکھلاہٹ کا شکار ہوتی چلی گئیں۔ چنانچہ ۶ فروری کو کراچی میں اپوزیشن کے جلوس پر فائرنگ کرکے ۱۵ افراد کو زخمی کردیا گیا۔ ان میں سے ۳ افراد کی حالت نازک تھی۔ جن میں سے ایک بعد ازاں چل بسا۔ ڈرگ کالونی میں احتجاجاً دکانیں بند کردی گئیں۔ پی پی کے آدمیوں نے اتحاد کے دفتر کو آگ لگادی۔ پی پی کے قومی و صوبائی اسمبلیوں کے امیدوار جمیل الدین عالی اور صغیر حسین جعفری کے آدمیوں نے حملہ کیا۔ ان کارروائیوں کو پیپلز پارٹی رہنما پیرزادہ عبدالحفیظ کی پشت پناہی حاصل تھی۔ (۶۱)

پورے ملک میں قومی اتحاد کے کارکنوں اور رہنماؤں پر حملے کئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی بھٹو اور اس کے حواریوں نے اسلامی اقدار کا سرِعام مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ چنانچہ گوجرانوالہ میں ایک جلسہ عام میں بھٹو نے کہا کہ جنرل چوہدری کہتا ہے کہ ہم جم خانہ کلب میں شراب پی کر دکھائیں گے۔ وہ کون ہوتا ہے؟ یہ ملک ہمارا ہے ہم شراب پی کر دکھائیں گے اور واقعی شراب پی کر دکھائی گئی۔ اسی روز سابق صوبائی وزیر رانا اقبال نے سرِعام شراب تقسیم کی۔ (۶۲)

پیپلز پارٹی اقتدار کے نشے میں مست تھی اور ہر قیمت پر انتخابات میں اکثریت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ وزیر قانون پیرزادہ عبدالحفیظ نے بیان دیا کہ اگر قومی اتحاد کے رہنما ۷ مارچ کو گھر سے نکلے تو ان کا سر اڑا دیا جائے گا۔ جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکرٹری اطلاعات اور مذہبی امور کے وفاقی وزیر مولانا کوثر نیازی نے حزب اختلاف کے اتحاد کو ''نو لاشوں کا اتحاد'' قرار دیا جو مفاد اور اغراض پر مبنی تھا۔ اڑتالیس گھنٹے میں قائم ہونے والا یہ اتحاد ان کے بقول اڑتالیس گھنٹے میں ہی بکھر جائے گا۔ انہوں نے الزام لگاتے ہوئے کہا کہ اگر ان جماعتوں کا اتحاد واقعی ایک مقصد کے حصول کے لیے تھا تو یہ اپنی اپنی جماعتیں ختم کر کے ایک امیر کی قیادت پر کیوں متفق نہیں ہو جاتے...... یہ اتحادی نہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ان میں سے کئی پاکستان کے مخالف ہیں اور کچھ ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے دیتے ہیں۔ ایسے لوگ کیسے متحد رہ سکتے ہیں...... یہ لوگ نام تو اسلام کا لیتے ہیں لیکن اصل میں خارجی ہیں...... ان لوگوں کے دل جدا جدا ہیں۔ (۶۳)

پیپلز پارٹی کی جارحانہ انتخابی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور دوسری طرف یہ عالم تھا کہ ۷ فروری تک (یعنی انتخابی مہم شروع کئے جانے کے ایک ماہ بعد تک) قومی اتحاد کا انتخابی منشور ہی پیش نہ کیا جا سکا۔ بالآخر فروری کو وہ دن آ ہی گیا جب قومی اتحاد کا منشور پیش کر دیا گیا۔
قومی اتحاد نے جمعیت علمائے پاکستان کے منشور ہی کو قومی اتحاد کا مشترکہ منشور مان لیا۔ اس طرح نظام مصطفی ﷺ کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد کا عہد کیا گیا۔

اس موقع پر مولانا شاہ احمد نورانی نے خطاب کرتے ہوئے کہا: یہ اتحاد نظام مصطفی ﷺ کے نفاذ کے لیے ہے اور ہم نظام مصطفی ﷺ کے نفاذ کے لیے متحد رہیں گے۔ پوری قوم اس ڈکٹیٹر (ذوالفقار علی بھٹو) سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ۷ مارچ کو پوری قوم

ڈکٹیٹر شپ کے خاتمے اور نظام مصطفی ﷺ کے نفاذ کے لیے ووٹ دے گی اور ملک میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گا۔ (۶۴)

قومی اتحاد کے انتخابی منشور کے پیش لفظ میں بطور ایمان یہ اقرار و اعتراف کیا گیا کہ نظریہ پاکستان کی بنیاد قرآن اور سنت ہے اور یہ عزم و عہد کیا گیا کہ پاکستان میں قرآن و سنت کے نظام کو مکمل طور پر نافذ کیا جائے گا۔ بارہ صفحات پر مشتمل اس دستاویز میں روزگار، خارجہ پالیسی، صنعت و حرفت، تعلیم، آئین و قانون، قومی زبان، نظام معیشت کے بارے میں قومی اتحاد کی پالیسیوں اور عزم پر روشنی ڈالی گئی۔ اس میں کھل کر تمام تر زور اسلام کے مکمل نظام زندگی ہونے اور پاکستان میں اس کی تعلیمات پر عملدرآمد پر زور دیا گیا۔ اس منشور کی قابل قدر بات یہ تھی کہ اس نے اس فکری انتشار کے خاتمہ کی طرف مثبت پیشرفت دکھائی جو پچھلے چند برس سے سوشلزم کے بحث نے پیدا کر دیا تھا۔ ایک دلچسپ حقیقت کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ قومی اتحاد نے جن جماعتوں کی طرف سے منشور دیا تھا ان میں کالعدم نیپ کی جانشین پارٹی (شیر باز مزاری کی) این ڈی پی بھی شامل تھی جو سیکولر جماعت اور سوشلزم کی حامی تھی اور بھٹو نے بھی اپنی انتخابی مہم میں سوشلزم کو مشرف بہ اسلام کر کے مساوات محمدی بنا دیا۔ اس لحاظ سے کم از کم (وقتی طور پر ہی سہی) پاکستان کی سرزمین اسلام سے سوشلزم کا جنازہ نکل گیا☆۔ (۶۵)

۷ مارچ کے انتخابی معرکہ میں پاکستان قومی اتحاد کامیاب ہوتا یا پاکستان پیپلز پارٹی لیکن عوامی مظاہرے نے ایک بات تو ثابت کر دی تھی کہ پاکستان اپنی سرشت میں اسلامی مملکت ہے اور عوام الناس اسلام کے سوا کسی اور نظام حیات کو اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں اس لیے اگر حکمران پارٹی بدستور برسر اقتدار رہی تو اسے اپنی تشکیلی پالیسی کے کچھ بنیادی اصولوں میں ترمیم کرنا پڑے گی اور اگر قومی اتحاد فتح پاتا تو وہ تو نظام اسلام کے نفاذ کا مکلف تھا ہی۔ دراصل پاکستان پیپلز پارٹی کے کمیونسٹ عناصر نے پارٹی کے متعلق جان بوجھ کر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت غلط فہمی پھیلائی۔ انہوں نے پارٹی قیادت پر یہ تاثر جمایا کہ انتخابی کامیابی اس کے انقلابی شعور کی رہین منت تھی۔ حالانکہ وہ کامیابی (۱۹۷۰ء کے الیکشن میں) سراسر ملک کی سیاست کی ایک تاریخی پیشرفت تھی۔ کوئی (گزشتہ) دو اڑھائی عشروں سے

☆ پاکستان قومی اتحاد کے منشور کے لیے دیکھئے ضمیمہ ۴۔

سیاسی قیادت یا تو پرانے پھٹے ہوئے سیاسی مہروں کے ہاتھ میں تھی یا آمریت کے جبر و استبداد، پرعتاب کی گرفت میں تھی۔ اس پس منظر میں بھٹو کی نئی نویلی جوان سال دلکش شخصیت صحرا میں تازہ ہوا کا ایک فرحت بخش جھونکا ثابت ہوئی۔ ان کی شخصیت کا جو پہلو خاص طور پر جاذب نگاہ تھا وہ ان کا بھارت کے بارے میں جارحانہ طرز عمل تھا۔ اسی لیے ان کی اعلان تاشقند کی مخالفت بہت موثر ثابت ہوئی۔ حقیقتاً بھٹو اسی دن قوم کے مقبول لیڈر قرار پا گئے تھے جب ایوبی کابینہ سے نکلنے کے بعد لاکھوں لاہوریوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔ گو انہوں نے اپنی پارٹی اس واقعے کے قریباً ایک سال بعد بنائی لیکن اسی دن سے ان کی قیادت کا سکہ جاری ہو گیا تھا اور جب کسی قسم کے سوشلزم کا ذکر تھا اور نہ ہی بھٹو کی کسی ترقی پسند تحریک سے نسبت تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی قیادت (اس وقت تک) قومی سانچے میں ڈھلی تھی نہ کہ کسی نظریاتی سانچے میں۔ پھر انتخابی مہم کے دوران بھی ''روٹی، کپڑا اور مکان'' کے نعرے کے علاوہ جس کی ہر پسماندہ ملک میں کشش ہوگی، ان کا سراپا ایک مسلمان قومی لیڈر کا تھا اور انہوں نے اس بات کا خاص التزام کیا کہ وہ ملک کے کسی کونے میں بھی ہوں وہاں کے کسی بزرگ کے مزار پر حاضری ضرور دیں۔ سوشلزم کے نفوذ کا باب انتخابی کامیابی کے بعد شروع ہوا۔ عوام نے صنعتوں کو قومیانے کی پالیسی کا برا نہ منایا اور کسی عالم دین نے بھی اس پر اسلامی نقطہ نگاہ سے اعتراض نہ کیا لیکن پیپلز پارٹی کے دانشوروں نے پروگرام کو مخصوص معنی پہنانے اور خالصتاً کمیونسٹ اصطلاحیں استعمال کرنا شروع کیں تو لوگوں کا ماتھا ٹھنکا۔ اب نہ صرف ''ایشیا سرخ ہے'' کا نعرہ لگایا گیا اور خارجی دنیا کے معاملات پر اسلامی اتحاد کی شاہراہ سے مطمع نگاہ کا رخ مڑا۔ عین اسلامی سربراہ کانفرنس (۱۹۷۴ء) کے دوران تیسری دنیا کے افق کی نشاندہی کی گئی بلکہ یہاں تک کہ بعض اساسی اقدار سے گریز کی راہ اختیار ہوئی۔

جوں جوں انتخاب کے دن قریب آ رہے تھے انتخابی مہم شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ طرفین سے ایک دوسرے پر الزام تراشیوں کا سلسلہ بھی عروج پر تھا اور اپنی برتری و فوقیت کے دعوے بھی اس شدت سے کیے جا رہے تھے۔ لاہور میں ۱۹ فروری ۱۹۷۷ء کو ایک انتخابی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل رفیق احمد باجوہ نے کہا کہ پیپلز پارٹی اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے تا کہ انتخاب ملتوی کرنے کا بہانہ تلاش کیا جا سکے لیکن ملک کے عوام ایسا نہیں ہونے دیں گے...... ملک میں جو نظام دنیا چاہتی

ہے وہ مقبولیت حاصل کر رہا ہے (۶۶)۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ (ہمارا ووٹ بینک متاثر کرنے کی خاطر) پراپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ قومی اتحاد برسر اقتدار آ کر اہل تشیع کو اقلیت قرار دے دے گا۔ (یہ سراسر غلط ہے) ہماری زندگی (ہی) امام حسینؓ سے ہے اور ہم تو حق و صداقت کا پرچم بلند کر رہے ہیں جس کا سبق نواسۂ رسول ﷺ نے دیا ہے۔ ہمیں سرمایہ داروں کا ایجنٹ قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن (یہ بات طے ہے کہ) جب ملک میں اسلامی نظام قائم ہوتا ہے تو سرمایہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ قومی اتحاد برسر اقتدار آ کر ملک سے سرمایہ داری، جاگیرداری ختم کر دے گا۔ لاہور ہی میں ایک اور انتخابی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان قومی اتحاد کے رہنما اور قومی اسمبلی کے امیدوار مولانا عبیداللہ انور نے کہا کہ ملک کو اسلامی ذہن دیا جائے گا اور غیر شرعی قوانین کو یکسر ختم کر دیا جائے گا۔ جبکہ سیاست میں دہشتگردی کو فروغ دینے والوں کا سختی سے محاسبہ کیا جائے گا۔ انتخابات میں دھاندلی (ہرگز) برداشت نہیں کی جائے گی...... برسر اقتدار جماعت انتخابی مہم پر سرکاری خزانے سے بے دریغ روپیہ خرچ کر رہی ہے۔ (یہاں تک کہ) پیپلز پارٹی نے اپنی (انتخابی) مہم میں تمام سرکاری ذرائع کو جھونک دیا ہے...... انہوں نے قومی اتحاد کے کارکنوں سے کہا کہ اگر وہ سرکاری گاڑیاں یا دیگر املاک استعمال ہوتی دیکھیں تو اسے روکیں...... پیپلز پارٹی کے دور میں سیاسی رہنما قتل ہوئے لیکن ان کے کسی قاتل کو سزا نہ دی گئی لیکن قومی اتحاد برسر اقتدار آ کر ان قاتلوں کو سزائیں دے گا اور تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے...... قومی اتحاد ملک میں اسلام کا پرچم بلند کرے گا۔ (۶۷)

مولانا شاہ نورانی نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں قومی اتحاد کے زیر اہتمام ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر قومی اتحاد برسر اقتدار آ گیا تو ملک میں نظام مصطفیٰ نافذ کیا جائے گا۔ ۱۹۷۱ء کی قیمتیں واپس لائی جائیں گی۔ اخراجات میں گنجائش پیدا کی جائے گی اور عیاشیاں ختم کی جائیں گی۔ ضرورت پڑے گی تو کاروں کے بجائے سائیکلوں پر سفر کریں گے۔ غیر ملکی دوروں پر ٹیمیں لے جانے کے بجائے وفود کی تعداد مختصر کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا مگر اس ملک میں اسلام سے غداری کی جاتی رہی ہے...... اب ہم حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور لا کر پاکستان کو اسلام کی برکتوں سے مالا مال کریں گے اور پاکستان میں نظام مصطفیٰ ﷺ کے قیام کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں

کریں گے...... نو جماعتوں کے اتحاد سے پیپلز پارٹی ڈانواں ڈول ہوچکی ہے اس لیے وہ گالی گلوچ پر اتر آئی ہے...... ایک کمیشن قائم کیا جانا چاہیے جو یہ فیصلہ کرے کہ (۱۹۷۱ء میں) ملک کس نے توڑا۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حکومت نہ تو یحییٰ خان پر مقدمہ چلانا چاہتی ہے اور نہ ہی محمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ شائع کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجرم خواہ کوئی بھی ہو اسے سزا دی جانی چاہیے۔ (۶۸)

انہوں نے حیدر آباد میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بھٹو اب کہتے ہیں کہ اگر ہم انتخاب ہار گئے تو اپوزیشن بنچوں پر بیٹھیں گے یہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین ۱۹۷۰ء میں ہی اپوزیشن کا کردار ادا کرنے پر رضا مند ہو جاتے تو پاکستان کے دو ٹکڑے بھی نہ ہوئے ہوتے...... بھٹو کے اس دعوے کے باوجود کہ اسلام کو کوئی خطرہ نہیں اسلام خطرے میں ہے۔ اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک میں جس کے آئین میں بھی اسلام کو سرکاری مذہب قرار دیا جاچکا ہے۔ اسلام کے احکام سے روگردانی کی گئی۔ لائسنس پر شراب فروشی اور بیس ہزار عورتوں کو عصمت فروشی کی اجازت دی گئی...... اسلام کو منکرین زکوٰۃ سے خطرہ ہے جو زکوٰۃ کو استحصالی نظام قرار دے رہے ہیں...... بھٹو غلط کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ذمہ داری خود لی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن پاک کے تحفظ کا ذمہ لیا ہے اور اسلام کے تحفظ کا فرض حضور نبی کریم ﷺ کی امت کے سپرد کیا گیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ضمانت دی ہوتی تو اندلس میں جہاں مسلمان سات سو برس تک حکمران رہے، مسلمان کیوں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ بیت المقدس اور قبلہ اول یہودیوں کے قبضے میں کیوں ہے؟ یہ اس لیے ہوا کہ مسلمان اسلام کی حفاظت نہیں کر سکے۔ وہاں شراب خانے، نائٹ کلب اور عیاشی بڑھ گئی تھی...... ہم ووٹ پر یقین رکھتے ہیں اور ووٹ کے ہی ذریعے پرامن جمہوری انقلاب لائیں گے۔ (۶۹)

حکومتی حلقوں کی طرف سے یہ تاثر دیا جارہا تھا کہ پاکستان قومی اتحاد کامیابی کی صورت میں خان عبدالولی خان کو ملک کا وزیر اعظم نامزد کرے گا۔ اس تاثر کے پھیلائے جانے کے پس منظر میں یہ وجہ کار فرما تھی کہ عبدالولی خان کی نیپ کو حکومت نے کالعدم قرار دیا ہوا تھا۔ اس طرح قومی اتحاد پر ملک دشمن جماعت کی حمایت کا الزام بالآخر قومی اتحاد کے عوامی تاثر کو مجروح کر دیتا۔ اس صورتحال میں اتحاد کے سیکرٹری جنرل رفیق احمد باجوہ نے وضاحت

کرتے ہوئے کہا کہ قومی اتحاد پر خان عبدالولی خان کو ملک کا وزیر اعظم بنانے کے خفیہ معاہدہ کا الزام سراسر بہتان ہے۔ (ہاں البتہ) قومی اتحاد نے شیڈو کابینہ کے نام طے کر رکھے ہیں لیکن بعض مصلحتوں کی بناء پر یہ نام ظاہر نہیں کیے جا رہے...... خان عبدالولی خان موجودہ انتخاب میں حصہ نہیں لے رہے اور نہ ہی وہ انتخاب لڑنے کے اہل ہیں۔ اس لیے انہیں وزیر اعظم بنانے کا الزام قطعی طور پر خلاف واقعہ ہے...... یہ محض ایک مفروضہ ہے جو بددیانتی سے قائم کیا گیا...... انتخابات کے بعد جو لوگ منتخب ہوں گے وہ دستور کے مطابق اپنا پارٹی لیڈر منتخب کریں گے۔ اس وقت اس مسئلہ پر کسی تنازعہ کا کوئی احتمال نہیں۔ کسی اختلاف کے بغیر طے کرلیا گیا ہے کہ انتخابات میں کامیابی کے بعد کلیدی مناصب کن لوگوں کے سپرد کیے جائیں...... (۷۰) (جہاں تک نیشنل عوامی پارٹی سے پابندی اٹھانے کا تعلق ہے) قومی اتحاد سپریم کورٹ کے فیصلے کو از خود کالعدم قرار نہیں دے گا (ہاں اگر) ایسے حالات معاون ہوئے جن کی موجودگی میں فیصلہ مختلف ہوتا تو ولی خان اور اس کے ساتھیوں کو صفائی کا موقع دیا جاسکتا ہے...... ولی خان اور اس کے ساتھیوں کے متعلق کارروائی سیاسی اور تاریخی نوعیت کی ہے (لہٰذا اسے) اسی منظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ (۷۱)

جیسے جیسے انتخابات کا وقت قریب آرہا تھا حکومت اور قومی اتحاد کی معرکہ آرائی بھی شدت اختیار کرتی چلی جارہی تھی۔ انتخابی مہم کے دوران پیپلز پارٹی کی ہنگامہ آرائیوں اور انتقامی حربوں کے پیش نظر خدشہ تھا کہ انتخابات میں حکومت ضرور دھاندلی سے کام لے گی۔ انہی خدشات کے پیش نظر پاکستان قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل رفیق احمد باجوہ نے مطالبہ کیا کہ ۷ مارچ کے روز (عام انتخابات کے موقع پر) فوج تعینات کی جائے اور ۸ مارچ سے دفعہ ۱۴۴ نافذ کرنے کا فیصلہ واپس لیا جائے۔ انہوں نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس امر کا پہلے بھی مطالبہ کیا جاچکا ہے کہ (عام) انتخابات فوج کی زیرنگرانی کرائے جائیں۔ اس کی وجوہات واضح تھیں کہ حکمران جماعت پر انتخابی مہم میں واضح ہوگیا تھا کہ وہ پولنگ بوتھ کا تقدس برقرار رکھ کر الیکشن میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ مصدقہ اطلاعات (موجود) ہیں۔ کہ حکمران جماعت نے بڑے وسیع پیمانے پر انتخاب جیتنے کے لیے پرانے اور بدنام طریقے استعمال کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ جہاں تک پولیس فورس اور ایف ایس ایف کا تعلق ہے ان کی غیر جانبداری پر ان کے سابقہ رویہ کی بنا پر یقین کرنا نہ صرف

ہمارے لیے بلکہ کسی بھی رائے دہندہ کے لیے ممکن نہ تھا۔ انتخابات کے موقع پر ایف ایس ایف طلب کی جارہی ہے لیکن (یہ) فورس سرکاری طور پر وزیراعظم بھٹو اور ان کی حکومت سے وفاداری کا حلف اٹھائے ہوئے ہے۔ چنانچہ یہ فورس انتخابات میں نہ صرف ہماری نظر میں بلکہ قانونی طور پر بھی ہمارے مخالف کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں، پریذائڈنگ افسروں اور پولنگ ایجنٹوں کو غیر قانونی حرکتیں کرنے سے روکے گی، عبث ہے...... یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ فیڈرل سکیورٹی فورس وزیراعظم کے جلسوں میں بطور سامعین استعمال ہوتی رہی ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ ناقابل تردید ہے کہ بھٹو جہاں کہیں بھی انتخابی مہم پر گئے ان کے جلسوں میں فیڈرل سکیورٹی فورس کے ملازمین سفید کپڑوں میں شامل ہوئے ہیں۔ (یہ افسوسناک بات ہے کہ) ہمیں بجائے تریاق کے زہر مہیا کیا گیا۔ کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اگر فوج کو شہر میں طلب کیا گیا ہے تو پولنگ اسٹیشنوں پر کیوں نہیں بھیجا جارہا ہے...... تاکہ لوگ آزادانہ فضا میں اپنا حق رائے وہی استعمال کرسکیں۔ (۷۲)

دھاندلی کے اس خدشہ کے تسلسل میں یہ خبر بھی پھیل گئی کہ حکومت (ناکامی کی صورت میں) انتخابی نتائج کو تبدیل کرنے کا راستہ اپنائے گی۔ نوائے وقت کو انٹرویو دیتے ہوئے قومی اتحاد میں شامل تحریک استقلال کے سربراہ ایئر مارشل ریٹائرڈ محمد اصغر خان نے کہا کہ حکومت نے انتخابی نتائج کو تبدیل کرنے کے لیے تین تجاویز مرتب کی ہیں:

۱۔ ووٹوں کی گنتی کے بعد یہ ریکارڈ (الیکشن کمیشن کو بھیجنے کے بجائے) متعلقہ ڈپٹی کمشنروں کی تحویل میں دے دیئے جائیں گے۔ جہاں ان نتائج کو تبدیل کیا جاسکے گا۔

۲۔ ووٹروں کی گنتی کے بعد (حکومت کی کوشش ہوگی کہ) پولنگ ایجنٹوں کو گنتی کے بارے میں مصدقہ نقول مہیا نہ کی جائیں تاکہ دھاندلی کو (بعد ازاں) کوئی چیلنج نہ کرسکے۔

۳۔ حکومت انتخابات سے قبل قومی اتحاد کے بعض پولنگ ایجنٹوں کو گرفتار کرلینا چاہتی ہے۔ (۷۳)

تشکیک وابہام کی اس فضا میں بالآخر عام انتخابات منعقد ہوئے (۷۴)۔ پورے ملک میں حکمران جماعت نے تشدد، دھونس اور دھاندلی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ کراچی میں قومی

اتحاد کے امیدوار مولانا محمد زکریا گولی لگنے سے شدید زخمی ہوگئے۔ مولانا نورانی، پروفیسر غفور احمد اور سردار شیر باز مزاری نے مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حکومت نے انتخابات کا جو ڈھونگ رچایا ہے اسے قومی اتحاد اور عوام کی واضح اکثریت قبول کرنے سے انکار کرچکی ہے۔ مولانا نورانی کے بقول حیدرآباد میں الیکشن کے روز ۱۱ بجے سے ساڑھے تین بجے تک مسلسل ساڑھے چار گھنٹے مسلسل گولیاں چلتی رہیں۔ لیاقت میڈیکل ہسپتال میں ان کی موجودگی میں ۱۲۲ زخمی اور دو لاشیں لائی گئیں۔ یہی صورتحال نوابشاہ میں بھی تھی۔ (۷۵)

۷ مارچ کا الیکشن، سلیکشن زیادہ تھی اور الیکشن کم۔ جو پاکستان کی انتخابی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ اس الیکشن میں پیپلز پارٹی نے بزور بازو ۱۵۴ نشستیں حاصل کیں جبکہ قومی اتحاد کو ۳۸ نشستوں پر کامیاب قرار دیا گیا۔ حکومت نے کوشش کی کہ مرکزی راہنماؤں کی نشستیں محفوظ رہیں تاکہ یہ لوگ اسمبلی میں پہنچ جائیں اور عوام سے رجوع کرنے کا کم از کم احتمال ہو۔ جشن فتح کے ساتھ ہی حکومتی رہنماؤں نے بیان دینا شروع کردیا کہ وہ ''عوامی قوت'' سے برسر اقتدار آئے ہیں۔

قومی اتحاد نے اس کے جواب میں ۱۰ مارچ کے صوبائی انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کردیا (۷۶)۔ عوام کی طاقت کس کے ساتھ ہے؟ یہ وہ سوال تھا جس کا مثبت اور واضح جواب عوام نے خود ہی فراہم کردیا۔ قومی اتحاد کی ملک گیر ہڑتال کی کال کے جواب میں ۱۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو پولنگ سٹیشنوں پر ویرانی کی کیفیت طاری رہی، عوام نے واضح طور پر قومی اتحاد کی حمایت کا ثبوت دے دیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے لیے لازم تھا کہ وہ عوامی رائے کا احترام کرتے ہوئے فوری طور پر مستعفی ہوکر منصفانہ، آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے انعقاد کا اعلان کردیتی۔ اس طرح آئندہ مستقبل قریب میں ہونے والے ناقابل تلافی نقصانات سے بچا جاسکتا تھا۔ لیکن وزیراعظم بھٹو نے معکوس راہ اختیار کی۔ انہوں نے بائیکاٹ اور ہڑتال سے سبق سیکھنے کے بجائے، سابقہ روز اختیار کرتے ہوئے طاقت، تشدد، ہٹ دھرمی اور دھونس کا راستہ اختیار کیا۔ بھٹو نے ملک گیر ہڑتال کے بعد بیان دیا کہ میں کمزور ہوں مگر میری کرسی بہت مضبوط ہے۔ میں نے تم (قومی اتحاد والوں) سے نمٹنے کا انتظام کرلیا ہے۔ میں تحریک کو دبانے کے لیے ہر (ممکن) ہتھکنڈہ استعمال کروں گا۔ اب دو ہی راستے ہیں یا تو موجودہ انتخابات (کے نتائج) تسلیم کرلو ورنہ تمہیں سختی سے کچل دیا جائے گا۔ (۷۷)

پاکستان قومی اتحاد کے رہنما جمیعت علمائے پاکستان کے سربراہ سینیٹر شاہ احمد نورانی نے ۱۱ مارچ کی پرامن اور مکمل کامیاب ہڑتال پر باشعور اور جیالے عوام کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے بقول ہڑتال میں تمام دکانیں، بازار، صنعتی وتجارتی مرکز، ٹریفک اور ٹریڈز مکمل طور پر بند تھیں جو اس بات کا ثبوت تھا کہ عوام نے ۷ اور ۱۰ مارچ کے انتخابی ڈرامے کو مسترد کر دیا ہے اور پوری قوم اتحاد کے ساتھ ہے۔ برسر اقتدار پارٹی کے چھوٹے سے لے کر بڑے فرد نے ایڑی چوٹی کا زور لگالیا لیکن وہ ہڑتال ناکام نہیں کر سکے۔ یہ ہڑتال دراصل ایک ریفرنڈم تھا جس میں قوم نے واضح طور پر پاکستان قومی اتحاد کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اب وزیراعظم ان کے ساتھیوں اور چیف الیکشن کمشنر اور اس کے معاونین کو مستعفی ہو جانا چاہیے۔ اس لیے کہ انہوں نے عوام کا اعتماد مجروح کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس سے زیادہ بے بسی کیا ہوگی کہ جس حکومت نے نام نہاد انتخابات میں کراچی میں سو فیصد اور صوبائی اسمبلی کی نشستیں حاصل کیں اس پارٹی کے رہنما تو درکنار اس کے کارکن بھی ہڑتال کے دن عوام کے سامنے آنے کی جرات نہ کر سکے۔ انہوں نے کہا کہ پوری انتظامیہ مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ جن وفود نے سندھ اور پنجاب میں ہڑتال ناکام کرنے کے لیے برسر اقتدار ٹولے کو یقین دہانی کرائی تھی وہ خود بری طرح ناکام اور ہڑتال کامیاب رہی۔ ملک بھر میں جو کارکن گرفتار ہوئے ہیں ان کے خاندان اپنے حوصلوں کو بلند رکھیں۔ (۷۸)

الیکشن میں مبینہ دھاندلیوں کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ الیکشن کمیشن کے بقول صوبائی عملہ پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس لیے ان دھاندلیوں کی تحقیقات (اس کے دائرہ اختیار میں نہیں لہٰذا) الیکشن ٹریبونل ہی کریں گے۔ بیلٹ پیپروں کی تیاری اور تقسیم کا مسئلہ بھی متنازعہ صورتحال اختیار کر چکا تھا۔ جماعت اسلامی کے رہنما میاں طفیل محمد کے بقول ۶ اور ۷ مارچ کی درمیانی رات گورنمنٹ پریس میں بیلٹ پیپر چھپا کر لاہور کے چار پانچ حلقوں میں تقسیم کیے گئے۔ حکومت نے ذرائع ابلاغ کو بھی غیر سرکاری نتائج کے اعلان کے متعلق ابہام پھیلانے کی خصوصی ہدایت کر رکھی تھیں۔ مثال کے طور پر:

۱۔ ۷ مارچ کی شام ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے دور دراز انتخابی حلقوں کے بعض پولنگ سٹیشنوں کے نتائج (جزوی طور پر) بار بار نشر کیے جا رہے تھے لیکن بڑے شہروں خاص طور پر صوبائی دارالحکومتوں کے انتخابی نتائج کے اعلان میں غیر معمولی تاخیر کی

جا رہی تھی۔

۲۔ پاکستان قومی اتحاد نے انتخابات کے متعلق جو قرارداد منظور کی اس میں بڑے کھلے الفاظ میں "فرضی نتائج کے اعلان" کا بھی الزام عائد کیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک ٹھوس مثال سانگھڑ (سندھ) کی پیش کی گئی۔ وہاں قومی اتحاد کے امیدوار حکیم بخش نظامانی کو جو مصدقہ نتیجہ دیا گیا اس کے مطابق وہ کامیاب قرار دیئے گئے تھے لیکن ریڈیو اور ٹی وی پر (ان کے مخالف) پیپلز پارٹی کے امیدوار کی کامیابی کا اعلان کیا جا رہا تھا۔

۳۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات مولانا عبدالستار نیازی کا یہ حلفیہ بیان تھا کہ انہیں پولنگ سٹیشن کلرکوٹ کے پریذائیڈنگ آفیسر کے دستخطوں کے ساتھ پولنگ کا جو انتخابی نتیجہ فراہم کیا گیا وہ ۷ مارچ کو قومی اسمبلی کے لیے پولنگ کے بجائے تین دن بعد (۱۰ مارچ کو) ہونے والے صوبائی انتخابات کے بارے میں تھا۔ (۷۹)

ان حالات میں قومی اتحاد کے لیے سوائے سر پیٹنے کے کوئی چارہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ قومی اتحاد کے مرکزی قائدین بشمول مولانا شاہ احمد نورانی نے صدر مملکت سے مطالبہ کیا کہ نگران حکومت تشکیل دے کر اپوزیشن کے مشورے سے نیا الیکشن کمیشن قائم کیا جائے بصورت دیگر ۱۴ مارچ سے ملک گیر احتجاج مظاہرے شروع کیے جائیں گے (قومی اسمبلی کے انتخابات میں مبینہ دھاندلیوں سے دل برداشتہ ہو کر پاکستان قومی اتحاد نے صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا تھا)۔

لندن کے اخبار "فنانشل ٹائمز" کے مطابق مغربی جمہوریت کے تصور کو پیش نظر رکھ کر پاکستان کے انتخابات پر تبصرہ کرنا ہی بے معنی ہے جس ملک میں حزب اختلاف کے مقتدر رہنما جیلوں میں بند ہوں، اخبارات پر پابندیاں عائد ہوں۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کی کثیر تعداد سرکاری کنٹرول میں ہو۔ ان ذرائع ابلاغ کے ذریعے فرد واحد کو سپرمین بنانے کے لیے استعمال کیا جائے اور اس کے سیاسی مخالفین کا محض بے لاگ تذکرہ روا نہ رکھا جاتا ہو، وہاں انتخابات کے نتائج حیرت انگیز تو ہو سکتے ہیں غیر معمولی نہیں۔ اخبار "گارڈین" لندن نے اپنے نمائندہ (جو وزیراعظم بھٹو کی پریس کانفرنس منعقدہ ۹ مارچ میں موجود تھا) کے حوالے سے یہ تبصرہ شائع کیا کہ وزیراعظم اور ان کے ساتھیوں کے چہرے سے ندامت اور پشیمانی

کے جو آثار نمایاں تھے وہ کسی حد تک اصغر خان کے (لگائے گئے) الزامات کی تائید کرتے ہیں۔(۸۰)

۱۴ مارچ ۱۹۷۷ء کو حکومت نے قومی اتحاد کے بڑے بڑے لیڈر گرفتار کر لیے۔ کیونکہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ پاکستان قومی اتحاد حکومت مخالف تحریک چلائے گا جس کا عندیہ اپوزیشن کے بعض رہنما پہلے ہی دے چکے تھے۔ گرفتار کئے جانے والوں میں قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود، بیگم نسیم ولی خان، محمود علی قصوری، خواجہ محمد صفدر اور مولانا عبدالستار نیازی شامل تھے۔(۸۱) یوں ۱۴ مارچ کا دن، اس تحریک کا نقطۂ آغاز بنا جو ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے بعد ملکی تاریخ کی سب سے بڑی تحریک تھی۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک اگرچہ وقتی طور پر دب گئی تھی مگر ۱۹۷۴ء میں اسے اپنی منطقی منزل مل گئی یعنی تحفظ ختم نبوت کا حصول، قادیانیوں کو اقلیت قرار دیئے جانے کے ساتھ ہی ممکن ہوگیا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ کی تحریک شروع کی گئی۔ صرف تین سال کے عرصے میں عوامی جوش وخروش ایک دفعہ پھر اسی نقطہ جوش پر پہنچ گیا تھا۔ جہاں یہ ۱۹۷۴ء میں تھا۔ قومی اتحاد کے موقف کو عوامی سطح پر بھرپور پذیرائی ملی۔ نظام مصطفیٰ ﷺ ہی وہ نعرہ تھا جس پر مسلمان برصغیر نے مملکت خداداد پاکستان کی بنیاد رکھی تھی، اس لیے اس نعرہ کی عوام کے دلوں میں دلکشی اور کشش کا جاگزیں ہونا فطری امر تھا۔ نظام مصطفیٰ ﷺ کی منزل ایسا نصب العین تھا جس کی تلاش قوم کو عرصہ ۳۰ برس سے تھی۔ مگر اسلامیان پاکستان کو سفر جانب منزل کی ابتداء ہی میں بھٹکا دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک کے سیاسی سفر پر نظر ڈالی جائے تو عوام الناس کی فلاح و بہبود کا کہیں بھی سراغ نہیں ملتا۔ پاکستانیت کا نعرہ لگانے والوں نے قوم کو نہ صرف جغرافیائی طور پر دولخت کر دیا تھا بلکہ ملک کی نظریاتی سرحدات کو بھی کمیونزم اور سوشلزم کے خطرات لاحق کر دیئے گئے۔ قبل ازیں ۶۵۔ ۱۹۶۴ء میں مادر ملت کی انتخابی مہم میں متحدہ اپوزیشن (سی او پی) نے بڑا اہم اور حوصلہ افزا کردار ادا کیا تھا لیکن جونہی ۲ جنوری ۱۹۶۵ء کی شام کو مادر ملت کی ناکامی کا اعلان کیا گیا اس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا اور اس کے فوراً بعد قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں اس اتحاد میں شامل جماعتوں نے حکمران کنونشن (مسلم) لیگ سے ساتھ ساتھ ایک دوسری کے مقابلے میں بھی امیدوار کھڑے کئے۔ چار سال بعد ۶۹۔ ۱۹۶۸ء میں ایوب خان کی آمریت کے خلاف اپوزیشن جماعتوں کی مشترکہ تحریک جمہوریت (پی ڈی ایم) کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس

تحریک کی عوامی سطح پر مقبولیت کے پیش نظر ایوب خان تو بحالی جمہوریت کے سلسلے میں اس کے دو بنیادی مطالبات تسلیم کرنے پر آمادہ ہوگئے لیکن اس مقصد کے لیے جو گول میز کانفرنس بلائی گئی اس کے دوران میں تحریک جمہوریت میں شامل جماعتوں میں پھوٹ پڑ گئی اور انہوں نے باہمی عہد و پیمان کی پاسداری کے بجائے ایک دوسرے کی مخالفت کا راستہ اختیار کر لیا۔ اس کی سزا (ان کے ساتھ قوم و ملک کو بھی) دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات اور ان کے نتیجے میں مابعد صورتحال کی صورت میں ملی۔

پاکستان قومی اتحاد کے قیام کے ساتھ ملک کے ہر حصے میں جو پذیرائی حاصل ہوئی اس کی وجہ سے انتخابی مہم میں جو جان پیدا ہوئی۔ اس میں قومی اتحاد کے رہنماؤں کی انتھک محنت اور سعی و جدوجہد کا بھی بڑا حصہ تھا لیکن بنیادی طور پر یہ ان کے باہمی اتفاق واتحاد کا صلہ اور انعام تھا۔ اس قومی اتحاد کا ایک بہت بڑا اعجاز اور مثبت اثر یہ ہوا (جو اپنی جگہ تاریخی اہمیت کا حامل بھی تھا) کہ اس اتحاد میں شامل ہونے کی وجہ سے ایسے عناصر نے بھی نظریہ پاکستان کی پاسداری اور اسلامی شریعت کے نفاذ کی ذمہ داری قبول کر لی جو یا تو سیکولر اور سوشلسٹ تھے یا علاقائی قومیتوں کے علمبردار رہے تھے۔ اگر ان تجربات کا ملکی سیاست میں تسلسل برقرار رکھا جاتا تو کوئی وجہ نہیں کہ ملک میں جمہوریت کو فروغ نہ ملتا۔

اگرچہ پاکستان قومی اتحاد کو (انتخابات تک) قائم ہوئے دو ماہ کا بھی عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن انتخابی مہم کے دوران میں خلق خدا کے سامنے وعدہ و پیمان کے علاوہ قوم و ملک اور جمہوری عمل کے فروغ کا بھی تقاضا تھا کہ مختلف سیاسی حلقوں کے درمیان ہم خیال اور باہمی افہام و تفہیم کی فضا کو بتدریج فروغ حاصل ہوتا۔ بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ اشتراک عمل پارٹیوں کے باہمی ادغام کی صورت میں وقوع پذیر ہوتا۔ اگر مختلف پارٹیاں ایک منشور پر متفق ہو سکتی تھیں تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ ایک پارٹی قیادت کے تحت ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے سیاسی جدوجہد کا آغاز نہ کرتیں۔ اگر ایثار و تعاون کا یہ جذبہ روز اول ہی سے ہمارے سیاسی مزاج کا حصہ ہوتا تو ہماری سیاسی تاریخ آج مختلف ہوتی۔ کیونکہ باہمی افہام و تفہیم کا یہی فقدان ۱۹۵۸ء، ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۷ء کے مارشل لاؤں کی بنیاد بنا۔

پاکستان قومی اتحاد کو اگرچہ اپنے قیام سے ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن تحریک کے ابتدائی ایام میں جس واقعہ نے اتحاد کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں وہ اس خب کا پھیلنا تھا

کہ جمعیت علمائے پاکستان کے رہنما اور اتحاد کے سیکرٹری جنرل رفیق احمد باجوہ اور وزیراعظم بھٹو کے درمیان روابط موجود ہیں (۸۲) بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ رفیق احمد باجوہ نے وزیراعظم کے مخبر کی حیثیت سے اجلاس کی مکمل کارروائی ان تک پہنچاتے تھے۔ یہ خبر نہ صرف قومی اتحاد کے لیے بلکہ مولانا نورانی کے لیے ذاتی حیثیت میں ایک صدمہ سے کم نہ تھی۔ جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ کی حیثیت سے ان پر فیصلہ کن ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ باجوہ جیسی اہم شخصیت کے بارے میں کیا سیاسی حکمت عملی اختیار کی جائے۔ (۸۳) چنانچہ انہوں نے معاملہ فہمی اور اپنی اصول پسندی کو بروئے کار لاتے ہوئے، باجوہ کے اس اقدام کو جمعیت کے اصولوں کی خلاف ورزی جانتے ہوئے ناقابل معافی اور ناقابل تلافی قرار دیا۔ (۸۴) باجوہ کو نہ صرف اتحاد سے نکال دیا گیا بلکہ جمعیت کی ابتدائی رکنیت سے بھی خارج کردیا گیا (۸۵) تاہم ۲۰۰۳ء میں باجوہ کی رکنیت غیر مشروط طور پر بحال کی گئی ☆ (۸۶) ان کی جگہ اتحاد کے سیکرٹری جنرل جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد بنے۔ بلاشبہ مولانا نورانی کے اس جرات مندانہ فیصلے سے اتحاد بہت بڑے امتحان سے بخوبی سرخرو ہوا۔ اگرچہ یہ ان کی اصول پسندی کا ادنیٰ سا مظاہرہ تھا تاہم اس امر سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ سے ان کی وابستگی خلوص نیت پر مبنی تھی۔

حکومت مخالف تحریک کو دبانے کے لیے حکومت نے ہر ہتھکنڈہ استعمال کیا۔ بڑے بڑے شہروں میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی گئی۔ یہ خبر بھی ملی کہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو پولیس کی وردیاں اور اسلحہ مہیا کیا جارہا تھا۔ لاہور میں مسجد شہداء سے قومی اتحاد کے قائدین نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جلوس نکالا، ان گرفتار رہنماؤں میں حبیب اللہ سعدی، چوہدری

☆ تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے کہ رفیق باجوہ مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ جمعیت علمائے پاکستان کے مرکزی صدر مولانا شاہ احمد نورانی انہیں معاف کردیں اس سلسلے میں انہوں نے باقاعدہ درخواست کررکھی تھی لیکن باجوہ مشروط طور پر معافی چاہتے تھے لیکن مولانا شاہ احمد نورانی نے ایسا کرنے سے انکار کردیا اس پر باجوہ نے یہ شرط عائد کی کہ وہ اس صورت میں غیر مشروط معافی مانگیں گے اگر مولانا شاہ احمد نورانی اپنے ہاتھ سے ان کا رکنیت فارم پر کریں چنانچہ ان کی خواہش کا احترام کیا گیا۔ باجوہ کی جمعیت سے کمٹمنٹ کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے تمام عمر کسی سیاسی جماعت میں شرکت اختیار نہ کی۔ وہ اس بات کا برملا اظہار کیا کرتے تھے کہ ان کے قائد مولانا شاہ احمد نورانی ہیں۔

غلام جیلانی، چوہدری محمد حسین چٹھہ، قاری عبدالحمید اور محمد الیاس بٹالوی شامل تھے۔ (۸۷)

پاکستان قومی اتحاد کے رہنما مولانا نورانی نے جمعیت علمائے پاکستان کے تمام کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ ملک میں نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے کی جانے والی جدوجہد میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔ جمعیت علمائے پاکستان کے زیر اہتمام ایک اعلیٰ سطحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ چیف الیکشن کمشنر اور وزیراعظم کی تقریریں (اور وضاحتیں) غیر تسلی بخش تھیں اور ان میں قومی اسمبلی کے انتخابات میں ہونے والی دھاندلیوں سے پہلو تہی کی گئی تھی حالانکہ تمام لوگ اس بات سے باخبر تھے کہ ان انتخابات میں کیا ہوا۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین نے اپنی تقریر میں نرمی بھی اختیار کی اور دھمکیاں بھی دیں لیکن سیاسی فیصلے اس طرح نہیں کیے جاتے۔ جہاں تک صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا تعلق تھا۔ ان کے علم میں تھا کہ ان انتخابات کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ قومی اتحاد بچوں کا اجتماع نہیں جسے وزیراعظم یا چیف الیکشن کمشنر کی (طفل) تسلیوں سے بہلایا جاسکے۔ (حکومت کی طرف سے) یہ تاثر دینے کی کوشش کی جارہی تھی کہ پنجاب کے عوام نے شدید دھاندلیوں کے باوجود شدید ردعمل کا اظہار نہیں کیا، بالکل غلط تھا اور یہ حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ پنجاب کے عوام نے بائیکاٹ اور ہڑتال کو کامیاب بنا کر شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ قومی اتحاد کی بداخلاقیوں کا ذکر کیا جارہا ہے لیکن یہ بتایا جائے کہ گالیاں کس نے دیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ الزام لگایا جارہا ہے کہ جمعیت علمائے پاکستان نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی (یہ الزام بے بنیاد ہے) حالانکہ ہم پاکستان بنانے والوں میں شامل ہیں اور جیسا کہ جمعیت کے نام سے ظاہر ہے اس میں پاکستان کا لفظ شامل ہے اور یہ قیام پاکستان کے بعد وجود میں آئی۔ (۸۸)

حیدرآباد سے کراچی پہنچنے پر انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ کراچی انتظامیہ کا رویہ (ناقابل برداشت اور) قابل مذمت ہے۔ کل (۱۴ مارچ) کے مظاہروں میں پولیس نے جو اشک آور گیس کے گولے پھینکے ان سے گھروں میں بیٹھے ہوئے بچے اور خواتین بھی محفوظ نہ رہیں۔ قرآن ہمارا منشور ہے اور وہی ہمارے لیے راہ نجات ہے اس لیے ہم قرآن مجید کے سائے میں پرامن تحریک چلائیں گے جبکہ پیپلز پارٹی سوشلزم پر یقین رکھتی ہے (ہمارے لیے) یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم قرآن کی جگہ شراب کی بوتل لے کر سامنے آئیں۔ انہوں نے کہا کہ

حکومت اور چیف الیکشن کمشنر مستعفی ہو جائیں۔ قومی اسمبلی کے انتخابی نتائج تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔(۸۹)

قبل ازیں حیدر آباد میں قومی اتحاد کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نورانی نے کہا کہ اندرون سندھ کی صورتحال دھما کہ خیز تھی جہاں دوبارہ لسانی فسادات کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ تاہم تشدد سے عوامی تحریک کو دبایا نہیں جاسکتا۔(۹۰)

حکومت مخالف بیانات کی وجہ سے بالآخر مولانا شاہ احمد نورانی کو ۱۸ مارچ کو گرفتار کرلیا گیا۔ (۹۱) آپ کی گرفتاری کی وجہ سے تحریک میں اور شدت پیدا ہوگئی چنانچہ مجبوراً حکومت نے آپ کو ۲۱ مارچ کو رہا کردیا۔ (۹۲) رہائی کے بعد آپ نے قومی اتحاد کے اہم رہنما سردار شیر باز مزاری کے ہمراہ کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ۱۲ مارچ کی قرارداد میں بھٹو کے ساتھ مذاکرات کے بارے میں جو موقف اختیار کیا گیا تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور موجودہ حالات میں جبکہ ۷ مارچ سے ۲۱ مارچ کے دوران ملک بھر میں ایک سو سے زائد افراد شہید ہو چکے ہیں۔ ہزار سے زائد زخمی اور دس ہزار کے لگ بھگ جیلوں میں ہیں۔ بھٹو سے مذاکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں رہنماؤں نے ملک بھر کے عوام کو بالعموم اور کراچی و حیدر آباد کے عوام کو بالخصوص تیرہ روزہ پرامن تحریک چلانے پر مبارکباد پیش کی۔(۹۳)

ملک میں امن و امان کی صورتحال خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی کہ ان حالات میں صدر پاکستان جناب فضل الٰہی چوہدری نے ۲۶ مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرلیا۔(۹۴) سردار شیر باز مزاری اور مولانا نورانی نے کہا کہ پورے ملک میں خون خرابہ ہو رہا ہے اور بھٹو پرامن احتجاج کرنے والوں کو تشدد کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کروا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم بھٹو کی طرح ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ (۲۶ مارچ کو طلب کردہ) اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے والوں کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی مگر اتنا ضرور کہیں گے کہ اسمبلی اجلاس میں شرکت کرنے والے اپنی ذمہ داری پر ایسا کریں گے۔ ۱۹۷۰ء کی اسمبلی ایک نمائندہ اسمبلی تھی جبکہ ۷ مارچ کے نام نہاد انتخابات کے نام پر دھوکہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس صدارتی حکم کا نوٹس بھی لیا گیا ہے۔ جو الیکشن کمیشن کے گزٹ نوٹیفکیشن سے قبل جاری کیا گیا ہے حالانکہ ازروئے قانون پہلے کامیاب امیدواروں کو گزٹ نوٹیفکیشن

جاری کیا جاتا تھا...... پیپلز پارٹی ۷ مارچ کا انتخاب ہار چکی ہے اور جہاں تک کہ بھٹو کے اپنے انتخاب کا سوال ہے وہ بھی مشکوک ہے اور ہم انہیں منتخب تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ ۷ مارچ کے عام انتخابات کا بھارت کے ۱۹ مارچ کے انتخابات سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسز اندرا گاندھی نے اپنے آپ کو ایک باضمیر خاتون ثابت کیا ہے۔ نیز انہوں نے اقتدار کی خاطر جمہوریت کا خون کرنے سے بھی گریز کیا ہے۔ (۹۵) مولانا نورانی کے بقول بھٹو نے بھی اسمبلی کا بائیکاٹ کیا تھا۔ اس لیے وہ دوسروں کو مسٹر بائیکاٹ نہیں کرسکتے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر وزیراعظم مستعفی ہو جائیں اور کابینہ کے کسی سینئر رکن کو وزیراعظم بنا دیا جائے تو اس صورتحال میں آپ کا ردعمل کیا ہوگا تو انہوں نے کہا ہم صدر پاکستان سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے حکم سے قومی اسمبلی کے انتخابات کا اعلان کریں جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ صدر سے کس آئین کی رو سے اپیل کرسکتے ہیں تو ان کے بقول یہ مسئلہ آئینی کے بجائے سیاسی تھا۔(۹۶)

پرزور احتجاجی تحریک کے دسویں روز (۲۴ مارچ کو) لاہور میں مولانا مفتی محمود، مولانا شاہ احمد نورانی اور ملک محمد قاسم کی قیادت میں احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ جلوس کا مقام آغاز نیلا گنبد طے پایا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عوام کے مطالبات تسلیم ہونے تک تحریک جاری رہے گی۔(۹۷)

۲۵ مارچ کو پاکستان قومی اتحاد کے متعدد مرکزی رہنماؤں کو تین تین ماہ کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ (۹۸) مولانا مفتی محمود، پروفیسر غفور احمد، میاں طفیل محمد اور ملک قاسم کو لاہور سے مولانا شاہ احمد نورانی، سردار شیر باز مزاری، شاہ فرید الحق اور ظہور الحسن بھوپالی کو کراچی سے گرفتار کیا گیا۔ ملتان سے مولانا حامد علی خان، صوبائی اسمبلی کے امیدوار شیخ خضر حیات، شیخ عبد احمد اور مسٹر احمد خان درانی کو گرفتار کیا گیا۔ جبکہ خواجہ محمد صفدر نے سیالکوٹ سے گرفتاری پیش کی۔(۹۹)

حکومت کے ان اقدامات کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ قومی اتحاد کے رہنماؤں کی یہ گرفتاریاں قومی اسمبلی کے اجلاس سے محض ایک دن پہلے عمل میں آئیں۔ قومی اتحاد کی ہائی کمان کے فیصلے کے تحت نوابزادہ نصر اللہ خان کو قومی اتحاد کا نائب صدر بنا دیا گیا۔ جنہوں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ عوام تمام رہنماؤں کے گرفتار ہونے کے

بعد بھی احتجاجی تحریک جاری رکھیں گے۔(۱۰۰)

وزیراعظم بھٹو نے انتخابی نتائج کو ایک طے شدہ حقیقت قرار دیا (بالفاظ دیگر دوبارہ انتخابات کا سوال، مذاکرات کے دائرہ کار سے باہر تھا) تاہم دیگر امور پر بات کی جاسکتی ہے۔ (دیگر امور میں (صرف) صوبائی اسمبلیوں کے دوبارہ انتخابات کا امکان وغیرہ شامل تھے۔)

۲۶ مارچ کو پورے ملک میں نمایاں ہڑتال دیکھنے میں آئی۔ قومی اتحاد نے اس دن کو یوم سیاہ کے طور پر منایا۔ کراچی، حیدرآباد، ملتان، لاہور، راولپنڈی اور پشاور میں تمام بڑی بڑی مارکیٹیں اور بازار بند رہے۔ شہروں کے علاوہ قصبوں میں بھی قومی اتحاد کی اپیل پر ہڑتال کی گئی بعض مقامات پر جزوی ہڑتال بھی رہی۔ وکلاء بھی عدالتوں میں حاضر نہیں ہوئے کئی شہروں میں ٹرانسپورٹروں نے بھی ہڑتال کی۔(۱۰۱)

قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس منعقدہ ۲۶ مارچ میں ۶۱ ارکان اسمبلی نے حلف اٹھایا۔(۱۰۲) قومی اتحاد کا کوئی منتخب رکن اجلاس میں شریک نہیں ہوا۔ قیوم مسلم لیگ کے یوسف خٹک نے بھی اجلاس کا بائیکاٹ کیا (واضح رہے کہ یوسف خٹک قیوم مسلم لیگ کے واحد منتخب امیدوار تھے)۔

اس صورتحال سے گھبرا کر حکومت نے تحریک کو سختی سے کچلنے کا فیصلہ کرلیا۔ ۳۱ مارچ کا سانحہ مسلم مسجد لاہور اور ۹ اپریل (اس دن پنجاب اسمبلی کا افتتاحی اجلاس ہونا تھا) کے پولیس مظالم نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔

اس تمام احتجاج کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کو احساس دلایا جائے کہ اب عوام ''روٹی کپڑا اور مکان'' سے زیادہ نظام مصطفیٰ کا نفاذ چاہتے ہیں۔ مگر حکومت نے حالات سے سبق سیکھنے کے بجائے ایک ایسا فیصلہ کیا جو آگے چل کر ملک کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوا یہ تھا فوج کو شامل اقتدار کرنا۔ بڑے بڑے شہروں کراچی، حیدرآباد اور لاہور کو فوج کے حوالے کردیا گیا۔ جہاں مارشل لاء احکامات نافذ کیے گئے۔ جن کے تحت مذکورہ شہروں میں کرفیو لگا دیا گیا لیکن تحریک پھر بھی جاری رہی۔

اس دوران سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند قائدین نے تحریری طور پر ان بنیادی اصولوں کو وزیراعظم بھٹو تک پہنچایا جن پر مذاکرات ہوسکتے تھے حکومتی اٹارنی جنرل مسٹر یحییٰ بختیار نے قومی اتحاد کو چیلنج دیا کہ صوبائی اسمبلیوں کے دوبارہ انتخابات میں اپوزیشن عوامی

طاقت کا مظاہرہ کرے اس طرح مجبوراً (بھٹو کے لیے) قومی اسمبلی کو توڑنا ناگزیر ہوجائے گا۔
تاہم اس تجویز کو قبول نہیں کیا گیا۔

موجودہ سیاسی بحران پر ملک کے تمام مکاتب فکر پریشان تھے۔ صلاح الدین خان ایڈووکیٹ سپریم کورٹ نے ایک غیر جانبدار شہری کی حیثیت سے حکومت اور قومی اتحاد کو مصالحت کا راستہ اپنانے پر زور دیا۔ بحران کے حل کے سلسلے میں انہوں نے ایک تجویز بھی پیش کی جو ان حالات میں بہترین کہی جاسکتی تھی ان کے بقول قومی اتحاد کے بعض حالیہ فیصلوں اور مطالبات اور بھٹو کے بعض غیر جمہوری اقدامات سے پاکستان متزلزل ہو رہا ہے۔ اگر معاملات کو تدبر کے ساتھ سنبھالنے میں تاخیر ہوگئی تو خانہ جنگی کا خطرہ پیدا ہوجائے گا۔ لہٰذا پاکستان کے عوام قومی اتحاد اور بھٹو سے دردمندانہ اپیل ہے کہ سپریم کورٹ کے تین ریٹائرڈ جج صاحبان کی ایک مصالحتی کمیٹی کے سامنے قومی اتحاد (کے رہنما) اور بھٹو اپنا موقف پیش کریں۔ مذکورہ مصالحتی کمیٹی اتفاق رائے یا کثرت رائے سے جو بھی فیصلہ کرے اتحاد اور حکومت اس کو قبول کرکے افہام وتفہیم کے ذریعے معاملات کے سلجھانے کی کوشش کریں۔ مذاکرات کے لیے کوئی فریق کوئی پیشگی شرط نہ لگائے۔ مذاکرات کو دائرہ کار بھی اسی کمیٹی سے متعین کروالیا جائے۔(۱۰۳)

امید واثق تھی کہ اگر اس وقت اہل درد کی ایسی تجاویز پر غور کیا جاتا تو عین ممکن تھا کہ سیاسی بحران کے حل کا کوئی باعزت راستہ نکلتا۔ لیکن حکومت وقت جو ۱۹۷۰ء سے مسند اقتدار پر براجمان تھی۔ اس کے لیے ایسی تجاویز پر عمل کرنا تو درکنا اقتدار چھوڑنے کی محض سوچ ہی سوہان روح تھی۔ اس لیے حکومت نے روز اول ہی سے ایسے اقدامات کیے کہ ہمارے اقتدار پھر انہی کارپردازان حکومت کے سروں پر ہی آبیٹھے۔

امر واقعہ یوں تھا کہ اوائل جنوری میں انتخابات کا اعلان اس وقت کیا گیا جب حکمران پارٹی کو اپنی کامیابی کا ۹۵ فیصد یقین ہوگیا۔ یہ بات بلاوجہ نہیں تھی کہ حکمران جماعت کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے ایک ایک سیٹ کے لیے دس پندرہ سے بیس پچیس امیدواروں نے درخواستیں دی تھیں۔ ان کے نزدیک یہ ٹکٹ ہی کامیابی کی کلید تھا۔ اسی امید میں انتخابات کے اعلان سے پہلے تک بااثر افراد اور حلقے جوق در جوق پارٹی میں شامل ہونے کے اعلانات کرتے رہے تھے۔ بھٹو بظاہر تو یہ تاثر دیتے رہے کہ آئین کے تحت انتخابات ایک سال کے

لیے ملتوی کئے جاسکتے ہیں۔ جس سے اپوزیشن پارٹیاں اس خیال میں رہیں کہ الیکشن ابھی دور ہیں۔ مزید برآں دفعہ ۱۴۴ ہنگامی حالت کے نفاذ اور دیگر کئی امتناعی قوانین نے بھی انہیں بے بس کر رکھا تھا جبکہ بھٹو ایک سال قبل ہی (بالواسطہ طور پر) انتخابی مہم شروع کر چکے تھے۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے لیے اپوزیشن کو انتخابی مہم کے لیے بہت تھوڑا وقت ملا تھا لیکن اس قلیل عرصے میں بھی سیاست میں جو تبدیلی رونما ہوئی۔ اس نے بھٹو جیسے موقع شناس اور نباض سیاسی رہنما کو بھی متحیر کردیا۔ صرف چند دنوں میں حالات یہ صورت اختیار کر گئے کہ حکمران جماعت کے تمام اندازے غلط ہو کر رہ گئے لیکن اب انتخابات کرانے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا تھا کیونکہ اسمبلیاں توڑی جاچکی تھیں اور قومی اسمبلی سے انتخابات ملتوی کرانے کا بل پاس کرانا ممکن نہیں رہا تھا۔ الیکشن کمیشن نے کاغذی اور تحریری حد تک انتخابات میں بے قاعدگی اور دھاندلی کا راستہ اپنی طرف سے مسدود کردیا تھا لیکن حکمران جماعت کے امیدوار جو حربے اختیار کرسکتے تھے ان کی نشاندہی کے باوجود کمیشن نے کوئی انسدادی تدابیر اختیار نہ کیں اور بدعنوانی کا علاج صرف انتخابی عذرداریاں قرار دیا، ووٹ اور ووٹر کا تقدس پامال ہوا تو ملک گیر احتجاج کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ابتداء میں بھٹو نے اس احتجاج کو حسب معمول کوئی اہمیت نہ دی اور غالبًا یہ خیال کرلیا کہ وہ اپنی ذہانت اور تدبر سے اس پر قابو پالیں گے۔ دوسری طرف سے یہ احساس و تاثر بڑھتا گیا کہ ان انتخابات میں اتنی دھاندلیاں ہوئیں کہ انہیں کسی بھی طور انتخابات مانا نہیں جاسکتا۔ اس کے بعد (اشک شوئی کے طور پر) چند حلقوں میں بے ضابطگیوں کی سرسری تحقیقات کرانے اور الیکشن کمیشن کو کچھ مزید اختیارات دینے اور بڑی تعداد میں الیکشن ٹریبونلز قائم کرنے کے اقدامات کئے گئے۔ لیکن یہ تدبیر بھی حیلہ سازی، سیاسی سودے بازی یا دکھاوے کے سوا کچھ نہیں تھی اور اپوزیشن نے بجاطور پر اسے قبول نہیں کیا۔ اس بحرانی کیفیت میں مذاکرات کی دعوت بھی قابل قبول نہ رہی اور قومی اتحاد نے اس دعوت کو رد کر کے پہلی بار اپنے سیاسی تدبر کا ثبوت دیا (بالفاظ دیگر وہ بھٹو کی سیاسی چالوں کا ادراک کرچکے تھے) اگر قومی اتحاد (ایک دفعہ) مذاکرات کی میز پر بیٹھ جاتا تو محکوم پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے قوم کو یہ تاثر دیا جاتا کہ ''قومی اتحاد اور حکومت میں کوئی جھگڑا نہیں'' اور '' کچھ لو اور کچھ دو'' کے اصول کے تحت قومی اتحاد و مصالحت پر رضامند ہوگیا ہے۔ اگرچہ اتحاد ابھی مذاکرات کی میز پر بیٹھا بھی نہ ہوتا لیکن نشرواشاعت کے ان سرکاری اداروں سے (الیکشن کے

نتائج کی طرح) مختلف تاثر دیا جاتا۔ اسی تدبیر کو بروئے کار لاتے ہوئے حکومت قومی اتحاد کو بار بار مذاکرات کی دعوت دیتی رہی حالانکہ سیاسی یا آئینی فضا میں کوئی ایسی پیچیدگی یا الجھن نہ تھی جو مذاکرات کی محتاج ہو لیکن اس تاثر کو خوب ابھارا گیا کہ آئین میں نیا الیکشن کرانے کی کوئی گنجائش نہیں اور نیا الیکشن صرف نیا وزیراعظم ہی کرا سکتا ہے۔

حکومت اس زعم میں تھی کہ ملک میں کوئی آئینی بحران نہیں اور تمام ''کارروائیاں'' آئین کے مطابق تھیں اگرچہ یہ سب اپنے اقتدار کے دوام واستحکام کی کارروائیاں تھیں لیکن ان رسمی کارروائیوں کے دوران میں عوام نے جس طرح اپنے ردعمل کا اظہار کیا اور ملک گیر احتجاج کیا گیا کیا یہ لوگ ووٹر نہیں تھے؟ اگر حکومت کے بقول ''طاقت کا اصل سرچشمہ عوام'' تھے تو ضرورت اس امر کی تھی کہ عوام سے دوبارہ رجوع کیا جاتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا اور ملک کو مستقبل قریب میں ایک بار پھر مارشل لائی آمریت کے گھناؤنے سائے تلے جانا تھا جو صحرا کی دھوپ سے بھی بدتر تھا۔

سیاسی بحران کے حل کے لیے جس روشن ضمیری کی ضرورت تھی (اگرچہ سب میں نہیں) وہ وزیراعظم کے (اکثر) رفقاء میں مفقود تھی۔ کیونکہ بھٹو جیسی طاقت ور شخصیت کے سامنے دم مارنے کی کسی میں مجال نہیں تھی۔ پھر بھی بارش کے پہلے قطرے کی طرح پیپلز پارٹی کے چند خیرخواہاں جن میں سردار شوکت حیات، مسٹر انور علی نون، میر بلخ شیر مزاری، امیر عبداللہ روکڑی، مسٹر ذاکر حسین قریشی، میاں صلاح الدین اور کریم بخش اعوان شامل تھے، نے بھٹو کو مشورہ دیا کہ تشدد اور خون خرابے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں از سر نو انتخابات کرا دیئے جائیں اور ملک میں تمام فریقوں کو قابل قبول ادارے کے زیر اہتمام عام انتخابات اور شرعی نظام کے نفاذ کا فوری طور پر اعلان کیا جائے۔ حکومتی پارٹی کے بعض ارکان اپنی نشستوں سے استعفیٰ کے بھی حامی تھے۔ اس سلسلے میں گورنر ہاؤس لاہور میں وزیراعظم بھٹو سے سردار شوکت حیات، میاں صلاح الدین اور مسٹر انور علی نون نے ملاقات بھی کی۔ اس ملاقات میں وزیراعظم بھٹو پر زور دیا گیا کہ بڑھتی ہوئی لاقانونیت اور خانہ جنگی کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ فی الفور اقدامات کئے جائیں۔ سات افراد کے اس ''ہم خیال'' گروپ نے صورتحال کے تناظر میں درج ذیل اقدامات تجویز کئے:

۱۔ کسی مزید تاخیر کے بغیر شرعی قوانین کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔

۲۔ ملک میں خون خرابے اور تشدد کے خاتمے کے لیے نئے عام انتخابات کرانے میں (ہماری دانست میں) کوئی حرج نہیں۔

۳۔ عام انتخابات کا انعقاد ایسے ادارے کے زیر اہتمام ہو جو تمام فریقوں کے لیے قابل قبول ہو۔

ان اراکین اسمبلی نے ملک میں بڑھتی ہوئی لاقانونیت اور قتل و غارت کی کھلے عام مذمت کی۔ لیکن حکومت نے ان اقدامات کو خاطر میں لانے کے بجائے سردار شوکت حیات خان کو حکومت مخالف سرگرمیوں اور حق گوئی کی پاداش میں پیپلز پارٹی سے نکالنے کے ساتھ ساتھ پی پی کی پارلیمانی پارٹی سے بھی خارج کردیا گیا۔ (کیونکہ سردار شوکت حیات پارٹی ڈسپلن کو توڑنے کا الزام لگایا گیا کیونکہ اس حکومت مخالف تحریک کے روح رواں وہی ٹھہرائے گئے تھے) جبکہ میاں صلاح الدین نے اپنی نشست سے استعفیٰ دے دیا۔ (۱۰۴)

اراکین اسمبلی کے ایسے ردعمل کی حکومت کو بھی توقع نہیں رہی تھی کیونکہ اراکین اسمبلی کی اتنی بڑی تعداد نے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کیا تھا۔ مستقبل میں پارٹی انتشار سے بچنے کے لیے (اور محض اپوزیشن کی اشک شوئی کی خاطر) بھٹو نے نفاذ شریعت کا مطالبہ تسلیم کرلیا اور ملک بھر میں شراب کے استعمال اور نائٹ کلبوں پر پابندی عائد کردی گئی اور قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کی ازسرنو تشکیل کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن ملک میں دوبارہ عام انتخابات کے انعقاد کے سلسلے میں کوئی پیشرفت نہ ہوسکی۔ تاہم ملک کے مختلف حلقوں کی طرف سے جاری بحران کے حل کے لیے مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ اس سلسلے میں الیکشن کمیشن کو درج ذیل حکمت عملی اپنانے کا مشورہ دیا گیا:

۱۔ جملہ ریکارڈ انتخابات نشست ہائے قومی اسمبلی کو فوری طور پر الیکشن کمیشن کے سپرد کیا جائے۔ اسے انتظامیہ کی تحویل میں ہرگز نہ رہنے دیا جائے۔

۲۔ صوبہ پنجاب کے انتخابات کی سرسری سماعت حسب ذیل ترجیحات سے کی جائے۔

(i) وہ نشستیں جہاں سے موجودہ سپیکر، ڈپٹی سپیکر اور وزراء منتخب ہوئے۔

(ii) وہ نشستیں جہاں سے سابقہ وزراء انتخاب لڑے۔

(iii) وہ نشستیں جہاں سے پرانے اراکین پیپلز پارٹی انتخاب لڑے اور کامیاب ہوئے۔

(iv) وہ نشستیں جہاں سے نووارد، اراکین پی پی الیکشن لڑے اور کامیاب رہے۔

۳۔ سرسری سماعت کو قلیل ترین عرصہ میں سرانجام دینے کے لیے سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے جج صاحبان پر مشتمل دو دو رکنی الیکشن ٹریبونلز قائم کیے جائیں۔ (۱۰۵)

لیکن حکومت نے قومی اتحاد کے گرد گھیرا تنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ڈیفنس آف پاکستان رولز (ڈی پی آر) کے تحت، تحریک سے متعلق خبروں پر پابندی لگادی گئی۔ پیشگی حکومتی اجازت کے بغیر کوئی خبر، فوٹو، کارٹون یا خاکہ شائع کرنے کی سختی سے ممانعت کردی گئی۔ اخبارات کو پابند کیا گیا کہ وہ خبروں کی اشاعت کی منظوری ہوم سیکرٹری سے لیں۔ ان اقدامات کا اطلاق تحریک کی ہمدردی میں ہونے والی تمام سرگرمیوں پر تھا۔ حکومت نے کراچی، حیدرآباد، لاہور، لائلپور (فیصل آباد)، سیالکوٹ اور بہاولنگر میں کرفیو نافذ کردیا۔ چھوٹے شہروں مثلاً لائلپور، سیالکوٹ اور بہاولنگر میں صرف کرفیو لگانے پر ہی اکتفا کیا گیا جبکہ بڑے شہروں کراچی، حیدرآباد اور لاور میں کرفیو کے علاوہ مارشل لاء کا نفاذ بھی کیا گیا۔ (حالانکہ حکومت اس سے پہلے ایوب خان کے دور کے آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۳ء (پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس کو منسوخ کرنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ ایسا کرنا تو درکنار اس پر مستزاد یہ کہ ڈی پی آر کے تحت قومی اتحاد کی حمایت میں جاری سرگرمیوں پر پابندی لگادی گئی تھی۔) (۱۰۶)

دوسری طرف رائے عامہ کے اطمینان کے لیے وزیراعظم بھٹو نے اپوزیشن سے مذاکرات کا سلسلہ بھی شروع کردیا۔ اس سلسلے میں ۲۵ اپریل ۱۹۷۷ء کو بھٹو نے قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود سے اڑھائی گھنٹے ملاقات کی۔ جس کے نتیجے میں نظربند رہنماؤں کو سہالہ ریسٹ ہاؤس منتقل کردیا گیا۔ ان رہنماؤں میں مولانا شاہ احمد نورانی، نوابزادہ نصراللہ خان، میاں طفیل محمد، مولانا جان محمد عباسی، سردار شیر باز مزاری، ملک محمد قاسم اور بیگم نسیم ولی شامل تھے جبکہ اصغر خان کو ابھی کوٹ لکھپت جیل ہی میں رکھا گیا۔ اس کے علاوہ وفاقی وزیر برائے مذہبی امور مولانا کوثر نیازی نے مولانا مودودی، مولانا مفتی محمود اور علامہ شاہ احمد نورانی کو اسلامی نظریاتی کونسل میں شمولیت کی پیشکش کی۔ ساتھ ہی یہ بھی مژدہ سنایا کہ ان کی (قومی اسمبلی کی) نشستیں برقرار رہیں گی...... وزیراعظم بھٹو نے قومی اسمبلی کے انتخابات دوبارہ کرانے کی پیشکش کرتے ہوئے سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے متفقہ ججوں پر مشتمل نیا الیکشن کمیشن تشکیل دینے

پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ تاہم عبوری حکومت کے قیام کے مطالبے پر فریقین میں اتفاق رائے نہ ہوسکا۔ (۱۰۷)

وزیراعظم بھٹو نے اعلان کیا کہ ۱۰ مئی کو ان کی کابینہ کے چار یا پانچ وزراء سہالہ میں نظر بند رہنماؤں سے ملاقات کر کے باقاعدہ مذاکرات کا لائحہ عمل طے کریں گے۔ اپوزیشن کے رویئے پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے کہا اس وقت اپوزیشن کو صرف بنیادی اور ضروری مسائل پر گفتگو کرنی چاہیے لیکن اپوزیشن نے مذاکرات کے لیے ۳۲ نکات ☆ پیش کر دیئے جو مذاکرات کے ابتدائی مراحل پر ہی تعطل کا باعث بن سکتے ہیں (اور وہ نہیں چاہتے کہ مذاکرات میں تعطل پیدا ہو) جبکہ باقی ماندہ مسائل پر بعد ازاں اسمبلی کے اندر یا باہر بات چیت ہوسکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت اصل مسئلہ الیکشن کے انعقاد کا ہے اور اس پر ہی بات ہونی چاہیے۔ بھٹو نے کہا کہ ان کی ہر ممکن کوشش ہوگی کہ قومی مفاد میں کوئی (بہترین) سمجھوتہ ہو جائے۔ انہوں نے الزام لگایا کہ اپوزیشن کے پیش کردہ نکات میں نظام مصطفیٰ ﷺ کا ذکر ہی نہیں بلکہ ساری بات حصول اقتدار کی ہے۔ (لیکن یہ سردست مسئلہ نہیں) اپوزیشن کو چاہیے کہ وہ ایجی ٹیشن کی سیاست ترک کر دے کیونکہ ایسی سیاست سے مذاکرات کے لیے خلوص نیت کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔ ایسی صورتحال نے ملکی اقتصادیات تباہ کر کے رکھ دی ہے۔ (۱۰۸)

پاکستان قومی اتحاد کے قائم مقام صدر پیر صاحب پگاڑا نے اس صورتحال کے تناظر میں الزام لگایا کہ بھٹو نے اپنے وعدوں سے انحراف کیا اور اتحاد کی صفوں میں انتشار پھیلانے کی ہر ممکن سعی کی جس کا ایک پہلو یہ کہ اتحاد میں شامل جماعتوں کے سربراہوں کو الگ الگ پیغام بھجوائے لیکن انہیں کوئی کامیابی نہ مل سکی۔ علاوہ ازیں مسٹر یحیٰی بختیار کے ذریعے قومی اسمبلی توڑنے کا وعدہ کیا گیا بشرطیکہ قومی اتحاد صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں بھارتی اکثریت حاصل کرے تو قومی اسمبلی کے بھی الیکشن کرائے جاسکتے تھے۔ پیر صاحب کے بقول قومی اتحاد کی جنرل کونسل نے اس فارمولے کو اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ تحریک قومی اسمبلی کے انتخابات میں دھاندلیوں کے خلاف جاری ہے۔ اندریں حالات صوبائی اسمبلی کے انتخابات کا ذکر کرنا اصل مسئلے سے لوگوں کی توجہ ہٹانے اور عوام کو ذہنی خلفشار میں مبتلا کرنے کی ایک کوشش تھی۔ (۱۰۹)

☆ ان ۳۲ نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے، ضمیمہ ''قومی اتحاد اور حکومت کے مسودات''

بھٹو نے بالفاظ دیگر جن صوبائی اسمبلیوں کے توڑنے کی بات کی انہیں بالواسطہ طور پر غیر نمائندہ تسلیم کر لیا۔ حالانکہ انہی اسمبلیوں کے ذریعے بالواسطہ سینٹ کے انتخابت مکمل کیے گئے تھے۔ بھٹو نے اس دوران کئی پینترے بدلے۔ مثلاً انہوں نے حکومتی موقف میں بہتری (لچک) کی بات کی (اسی سوچ کے تحت) ان کی طرف سے قومی اتحاد کے رہنماؤں کو اس نوعیت کے پیغام بھی ملے کہ وہ قومی اسمبلی کے از سر نو انتخابات کرانے میں بھی رضامند ہیں۔ (دراصل وہ اس امر کی یقین دہانی چاہتے تھے کہ اگر ان کی جانب سے اس قسم کی پیشکش ہو تو اسے قبول کر لیا جائے گا) اس عرصے میں قومی اتحاد کے باقی ماندہ رہنماؤں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ (قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود کو کیمپ جیل سہالہ میں منتقل کر دیا گیا۔) بھٹو نے وہاں ان سے ملاقات کی اور انہیں یقین دلایا کہ اگر اتحاد کی طرف سے قومی اسمبلی کے دوبارہ انتخاب کا مطالبہ (دوبارہ باضابطہ طور پر) پیش کیا گیا تو وہ اسے منظور کر لیں گے۔ اسی دوران قومی اتحاد کے مرکزی رہنماؤں کو بھی دوسری جیلوں سے سہالہ منتقل کر دیا گیا۔ قومی اتحاد کے رہنماؤں نے جب تجاویز کو بہتر بنانے کے لیے قانونی مشیروں سے مشورہ کرنے کی سہولت مانگی جو مہیا نہیں کی گئی جبکہ (اتحاد پر یہ تاثر قائم کرنے کے لیے کہ دیگر ممالک، خاص طور پر عرب ممالک حکومت کے ساتھ ہیں) حکومت نے سعودی سفیر ریاض الخطیب کو سہالہ میں قومی اتحاد کے رہنماؤں سے ملاقات کی اجازت دے دی۔ ☆ یہ ۲۷ اپریل کی بات تھی۔ اگلے ہی دن ۲۸ اپریل کو بھٹو نے قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان قومی اتحاد کو خارجی طاقتوں، خاص طور پر امریکہ کا ایجنٹ قرار دیا بلکہ انتخابی مہم اور حالیہ تحریک کے سلسلے میں تمام رہنمائی اور اعانت حاصل کرنے کا الزام عائد کیا۔ حالانکہ اس سے پیشتر وہ خود اپنی تقریر میں اس بات کی تردید کر چکے تھے کہ پاکستان قومی اتحاد کو کسی بیرونی ملک سے کوئی امداد حاصل ہوئی تھی۔ انہوں نے امریکہ، جاپان، مغربی یورپ، کمیونسٹ ممالک، عرب ممالک اور خلیج کی

☆ سفیر محترم نے قومی اتحاد کے نظر بند رہنماؤں کو شاہ خالد اور شہزادہ فہد کے پیغامات پہنچائے جن میں پاکستان کی موجودہ سیاسی صورتحال پر تشویش اور اضطراب کا اظہار کیا گیا اور ان محترم شخصیات کی طرف سے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کی بھی پیشکش کی گئی۔ جواباً قومی اتحاد کے رہنماؤں نے اپنے موقف اور مطالبات سے آگاہ کیا اور ملکی حالات کے حوالے سے شاہ خالد اور شہزادہ فہد کے ذاتی دلچسپی اور ہمدردانہ جذبات پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ (روزنامہ وفاق لاہور، ۲۸ اپریل ۱۹۷۷ء)

ریاستوں کے نام گنوا کر کہا تھا کہ پاکستان کے ان کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ اس لیے ان میں سے کوئی بھی ملک قومی اتحاد کو مالی امداد نہیں دے سکتا۔ لیکن (اب) انہوں نے امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی اور خود اسلامی برادر ملک مصر کے خلاف بھی تلخ نوائی سے گریز نہیں کیا۔☆

۲۹ اپریل کو متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ احمد الخطیب السویدی سہالہ میں قومی اتحاد کے قائدین سے ملے۔ انہوں نے الشیخ زید بن سلطان النہیان کی طرف سے فریقین کے مابین سیاسی تصفیے کی خواہش کا اظہار کیا۔☆☆

قومی اتحاد کے رہنماؤں نے السویدی پر واضح کیا کہ بھٹو ایک طرف پاکستان کے دوست اور برادر اسلامی مملکوں کے سربراہوں کو اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے کی دعوت دیتے تھے جبکہ دوسری طرف اپنی تقریروں میں قومی اتحاد پر غیر ملکی ایجنٹ ہونے کا الزام لگاتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سیاسی تصفیے کے لیے مخلص اور سنجیدہ نہیں تھے۔ وزیر خارجہ السویدی نے جواب دیا کہ انہوں نے یہ تقریر خود سنی ہے اور اس کے بعد بھٹو سے اس کے بارے میں تبادلہ خیال بھی کیا۔ بھٹو کا کہنا تھا کہ انہوں نے اپنی تقریر میں قومی اتحاد پر کوئی الزام نہیں لگایا۔

طے ہوا کہ دوسرے دن (یکم مئی کو) بھٹو مفتی محمود سے ملنے کے لیے سہالہ جائیں گے۔ لیکن عین ملاقات کے دن ڈاکٹروں کے مشورہ پر مفتی صاحب ہسپتال منتقل کر دیئے گئے۔ (انہیں (مولانا مفتی محمود کو) وہاں بھٹو کا پیغام پہنچایا گیا کہ وہ (مفتی محمود کی) علالت کی وجہ سے

☆ اس کے بعد سے پریس ٹرسٹ کے اخبارات نے مسلسل اسی قسم کے مضامین شائع کئے جو اس سے پیشتر ''لندن پلان'' اور عراقی اسلحہ کے سکینڈل کے سلسلے میں چھپتے رہے تھے۔ ابلاغ عامہ کے ذرائع سے مسلسل پراپیگنڈہ کیا جاتا رہا۔ تاہم ان ایام میں رائے عامہ ماضی کے تلخ تجربات کے پیش نظر بھٹو کی کسی بات پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

☆☆ قومی اتحاد کے رہنماؤں نے احمد الخطیب السویدی کا شکریہ ادا کیا اور انہیں یقین دلایا کہ قومی اتحاد عوام کے مطالبات کی تکمیل اور بنیادی حقوق کی بحالی کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔ ان دنوں (۳۰ اپریل کو) قومی اتحاد کے مرکزی رہنماؤں نے سیاسی تصفیے کے لیے اپنے پہلے سے طے شدہ مطالبات کی بنیاد پر تجاویز مرتب کیں اور مولانا مفتی محمود نے بھٹو کے ملٹری سیکرٹری اور سیکرٹری کو بلا کر کہا کہ بھٹو ان تجاویز پر سہالہ آکر گفتگو کریں۔ اگر انہیں یہ منظور ہوں اور وہ ان پر عملدرآمد کرانے کے لیے آمادہ ہوں تو تفصیلات طے کرنے کے لیے بات چیت ہو سکتی ہے۔

اس دن ان سے نہ مل سکیں گے۔)

لہٰذا اگلے دن ۲ مئی کی شام کو ہسپتال میں بھٹو مفتی صاحب سے ملے اور قومی اسمبلی کے انتخابات کے بارے میں بھی اپنے وزراء سے مشورہ کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ مفتی محمود ۳ مئی کو سہالہ گئے اور انہوں نے اپنے رفقاء سے مشورہ کیا۔ طے پایا کہ بھٹو کو مولانا مفتی محمود ہی اس فیصلہ سے مطلع کر دیں گے کہ ان کے وزراء کے ساتھ قومی اسمبلی کے انتخابات یا کسی بھی موضوع پر گفتگو نہیں ہوسکتی۔ تحریک کے بنیادی مقاصد (جو مطالبات کی حیثیت اختیار کر چکے تھے) موضوع بحث نہیں بنائے جاسکتے لیکن اگر وہ اصولاً انہیں تسلیم کرنے کا اعلان نہیں کرتے تو قومی اتحاد بے سود اور بے مقصد بات چیت میں الجھنے کے لیے تیار نہیں۔ قومی اتحاد نے الزام لگایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھٹو اب خانہ ساز افواہوں اور بے بنیاد پراپیگنڈے سے تحریک کو متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ ۳ مئی کو یہ تجاویز بھٹو کے ملٹری سیکرٹری کو پہنچا دی گئیں جس نے کہا کہ کل ۴ مئی کو بھٹو کے جواب سے مطلع کر دیا جائے گا۔ لیکن تین دن گزر جانے کے باوجود بھٹو کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ اس پر قومی اتحاد کے رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ یہ تمام صورتحال قوم کے سامنے پیش کر دی جائے۔ ساتھ ہی قومی اتحاد کی تجاویز شائع کر دی جائیں تاکہ قوم کے علم میں رہے کہ قوم کے نمائندوں نے قوم کے اعتماد کو کسی مرحلے پر مجروح نہیں کیا اور اپنے موقف اور تحریک کے طے شدہ مقاصد سے سر موانحراف نہیں کیا۔(۱۱۰)

اتحاد کے قائم مقام صدر پیر پگاڑا نے واضح طور پر کہا کہ قومی اتحاد کے اصل اور بنیادی مطالبات صرف تین ہیں بھٹو مستعفی ہو جائیں۔ عدالت کی نگرانی میں نئے سرے سے عام انتخابات کرائے جائیں اور نیا الیکشن کمیشن تشکیل دیا جائے اس کے علاوہ (جو بھی) دیگر تجاویز دی گئی ہیں انہیں ذیلی یا اضافی حیثیت حاصل ہے اور انہیں بات چیت کا مرحلہ آنے پر طے کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک الیکشن کمیشن کے نئے سرے سے تشکیل کا تعلق ہے چیف الیکشن کمشنر مسٹر جسٹس سجاد احمد خان رخصت پر چلے گئے ہیں جن کی اس عہدے پر واپسی کا کوئی امکان نہیں۔(۱۱۱) پیر پگاڑا نے وزیر اعظم بھٹو کی اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ ان کے وزراء سہالہ میں نظر بند لیڈروں سے قومی اتحاد کی تجاویز پر ابتدائی مذاکرات کریں گے۔ ان کے بقول قومی اتحاد کے پیش کردہ تین بنیادی مطالبات پر بات چیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (بالفاظ دیگر

یہ تینوں بنیادی مطالبات طے شدہ امر (A Settled Fact) ہیں) البتہ عبوری دور کے لیے انتظامی امور کی تفصیلات طے کرنے کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین بھٹو سے اس وقت مذاکرات ہوسکتے ہیں جب وہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ کر نئے انتخابات اور اپنے مستعفی ہونے کا اعلان کریں۔ ان دو امور کے علاوہ تیسرا بنیادی مسئلہ نئے الیکشن کمیشن کی تشکیل کا تھا۔ اس کی طرف قدم اٹھالیا گیا ہے۔☆ (موجودہ چیف الیکشن کمشنر کے رخصت پر چلے جانے کے بعد نئے الیکشن کمیشن کا تقرر اس سلسلے کی پہلی کڑی ہوگا۔) ۱۰ مئی کو وزیر اعظم بھٹو نے کابینہ کے اجلاس میں ملک میں جاری سیاسی اور اقتصادی صورتحال کا جائزہ لیا۔ بعد ازاں انہوں نے مذاکرات کے حوالے سے حکومتی موقف بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ سیاسی تصفیہ کے لیے حزب اختلاف کے رہنماؤں کے ساتھ براہ راست مذاکرات کے لیے حسب سابق تیار ہیں۔ انہوں نے سابقہ موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ قبل ازیں بات چیت کے لیے وزراء کی جس کمیٹی کے قیام کی جو تجویز پیش کی گئی تھی وہ (دراصل) محض رسمی ابتدائی معاملات طے کرنے کے لیے تھی۔ حکومت بھی اس پر مصر نہیں رہی کہ مذاکرات کا یہی ایک طریقہ ہے۔

مزید برآں بھٹو نے کہا کہ جب تک براہ راست رابطہ قائم نہ ہو کچھ کہنا مشکل ہے اور بالواسطہ رابطے وقت طلب ہوتے ہیں۔ (لیکن بالواسطہ رابطے بھی بے سود نہیں اور نہ ہی خارج از امکان ہیں) تاہم سعودی سفیر ریاض الخطیب بالواسطہ رابطے کا کام دے رہے ہیں۔ (اگرچہ سعودی سفیر مطمئن اور پرامید نظر آرہے تھے لیکن پھر بھی) جب تک کوئی براہ راست رابطہ قائم نہ ہو، حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ میرے (بھٹو کے) نزدیک قومی اتحاد کے مطالبات کی طوالت کے پیش نظر (یہی بہتر تھا کہ) قطعی بات چیت سے قبل کوئی ایجنڈا تیار کرلیا جائے لیکن اگر قومی اتحاد کو یہ تجویز منظور نہیں (تو پھر ٹھیک ہے) میں نے براہ راست بات چیت سے انکار نہیں کیا۔ میں نے وقت کی بچت اور سہولت کی خاطر ایسا کیا۔ تاہم میری کوشش ہے کہ معاملات جلد از جلد طے ہو جائیں۔ قومی اتحاد پر لگائے گئے غیر ملکی اعانت کے

☆ واضح رہے کہ قبل ازیں کمبائنڈ ملٹری ہسپتال راولپنڈی میں مسٹر بھٹو نے مولانا مفتی محمود سے ملاقات کی تھی تو مولانا صاحب نے واضح طور پر بتادیا تھا کہ وہ وزراء کی ٹیم سے ملاقات نہیں کریں گے کیونکہ بنیادی مطالبات پر مذاکرات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

حصول کے الزام کے حوالے سے بھٹو نے کہا: "اگر ہمارے پاس ٹھوس ثبوت نہ ہوتا تو میں ۲۸ اپریل والی تقریر نہ کرتا لیکن ثبوت شائع کرنے سے معاملات اور خراب ہوسکتے ہیں اور پھر کوئی بھی خودمختار حکومت اس قسم کے ثبوت شائع کرنے کی پابند نہیں ہوتی۔ میں نے امریکی وزیر خارجہ کو ان کے خط کا جواب دے دیا ہے۔ جس میں پرسکون اور غیر جذباتی طریقے پر آمادگی ظاہر کی ہے (تاہم) بات چیت کے وقت کا انحصار اب امریکہ پر ہے۔" (۱۱۲)☆
ایک طرف تو مذاکرات کے لیے دعوت پر دعوت دی جارہی تھی جبکہ قومی اتحاد کے رہنماؤں کو تنگ کرنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ لاہور میں قومی اتحاد کی جنرل کونسل کے اجلاس منعقدہ ۷ مئی کے دوران پولیس نے چھاپہ مار کر اجلاس میں شریک تمام رہنماؤں کو گرفتار کرکے دفاتر کو سر بمہر کردیا گیا۔ (۱۱۳)☆☆

پولیس کے چھاپہ سے پہلے اجلاس میں چوہدری محمد اشرف باجوہ کو قومی اتحاد کا قائم مقام صدر جبکہ ایم انور بار ایٹ لاء کو قائم مقام سیکرٹری جنرل چنا گیا۔ اجلاس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۶ مئی) کو نماز جمعہ کی ادائیگی سے روکنے کی بھرپور مذمت کی گئی۔ (۱۱۴) اسی روز (۷ مئی کو) راولپنڈی میں مولانا غلام اللہ خان کی مسجد اور ملک کے دیگر حصوں میں مسجد کی بے حرمتی کے واقعات سامنے آئے جس پر قومی اتحاد نے سخت احتجاج کیا اور یہ طے پایا کہ امام الحرمین شریفین الاستاذ شیخ عبداللہ السبیل کو ایک تار دیا جائے کہ وہ عالم اسلام کو ان افسوسناک واقعات سے آگاہ کریں اور عالم اسلام کو بتائیں کہ پاکستان میں کس طرح دینی اقدار اور عبادت گاہوں کے تقدس کو پامال کیا جارہا ہے۔ (۱۱۵)
ملک میں لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال کو جس طریقے سے قابو میں رکھنے کی کوشش کی

☆ اس طرح وزیر اعظم بھٹو دنیا کو باور کرانا چاہتے تھے کہ قومی اتحاد دراصل امریکی حمایت سے بھٹو کے خلاف تحریک چلانے میں مصروف ہے۔ بھٹو کے اس طرز عمل نے اسے نہ صرف اپنے دوستوں سے محروم کردیا بلکہ عالمی طاقتوں کی ناراضگی بھی مول لی جو ان کے لیے آگے چل کر سوہانِ روح اور جان لیوا ثابت ہوئی۔

☆☆ اس پر طرفہ تماشہ یہ تھا کہ اسی دن لاہور میں پاکستان پیپلز پارٹی کا بھی ایک اجلاس ہوا جس میں پارٹی کے چیئرمین نے پارٹی کارکنوں سے خطاب کیا (اگر اجلاس پر پابندی عائد تھی تو قانون کی دھجیاں کیوں بکھیری گئیں۔) تاہم اس اجلاس پر نہ تو پولیس نے کوئی چھاپہ مارا اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی گرفتاری عمل میں آئی۔ نہ ہی جلسہ گاہ کو سر بمہر کیا گیا۔

جارہی تھی، بھٹو اس کو جاری رکھنے پر مصر تھے۔ ۱۰ مئی کو لاہور میں پولیس نے جلوس پر بے تحاشا لاٹھی چارج کیا (لیکن فوج کو پیچھے رکھا گیا) بھٹو کا کہنا تھا کہ جب تک ایجی ٹیشن جاری رہا، گرفتاریاں بھی جاری رہیں گی۔ اسی روز پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں قومی اتحاد کی حکمت عملی کو ''بچگانہ سیاست'' قرار دیا گیا کہ قومی اتحاد وفاقی وزراء کی کمیٹی سے ملاقات نہیں کرے گا۔ (۱۱۶)

حکومت کی سختیاں جاری تھیں قومی اتحاد کے رہنماؤں پر دباؤ بڑھانے کی خاطر بعض رہنماؤں کی بیگمات کو گھروں پر نظر بند کردیا گیا۔ ان میں بیگم میاں طفیل محمد، بیگم شاہین حنیف رامے، بیگم وزیر علی، بیگم عفیفہ ممدوٹ، بیگم ایم کے خاکوانی، بیگم پیر محمد اشرف اور بیگم رانا نذر الرحمٰن شامل تھیں۔ (جماعت اسلامی پاکستان کے امیر) میاں طفیل محمد اور (قومی اتحاد لاہور شہر کے صدر) پیر محمد اشرف کی بیگمات کو ان کی رہائشگاہ واقع منصورہ ملتان روڈ پر ایک ماہ کے لیے نظر بند کردیا گیا جبکہ بیگم حنیف رامے کو ان کی رہائشگاہ واقع مین روڈ پر ایک ماہ کے لیے دوبارہ نظر بند کردیا گیا ان کی نظر بندی ڈی پی آر کی دفعہ ۳۲ کے تحت عمل میں لائی گئی (اس سے قبل ۲۴ اپریل کو بیگم حنیف رامے کو ایک ماہ کے لیے ان کے گھر پر نظر بند کردیا گیا تھا لیکن ۶ مئی کو یہ احکامات واپس لے لیے گئے تھے)۔ دریں اثناء قومی اتحاد کے رہنما ملک وزیر علی ذوالفقار حسین ممدوٹ اور رانا نذر الرحمٰن کی بیگمات کو بھی ان کے گھروں میں ایک ماہ کے لیے نظر بند کرکے ان کی رہائشگاہوں کے باہر پولیس کا پہرہ بٹھادیا گیا۔ جبکہ بیگم ایم کے خاکوانی کی رہائشگاہ کو بھی ۱۲ مئی کی شام پولیس نے گھیرے میں لے لیا لیکن ان کو کسی قسم کے احکامات نہیں دکھائے گئے۔ (۱۱۷) ۱۲ مئی ہی کی رات وزیر اعظم بھٹو نے سہالہ میں سوا گھنٹہ تک ملاقات کی۔ قبل ازیں وزیر اعظم کی زیر صدارت وفاقی کابینہ کا اجلاس ہوا جو سہ پہر تین بجے شروع ہوا اور رات آٹھ بجے تک جاری رہا۔ اجلاس کے ختم ہونے کے فوراً بعد وزیر اعظم سہالہ روانہ ہوگئے۔ ملاقات میں پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے دیرینہ مطالبات کو دہرایا گیا☆ دونوں طرف سے اپنے اپنے موقف کی وضاحت کی گئی لیکن فریقین اپنے اپنے موقف میں کوئی نمایاں تبدیلی لانے پر رضامند نہ ہوئے۔

☆ واضح رہے کہ قبل ازیں اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود اور وزیر اعظم بھٹو میں تین ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ ان کی پہلی ملاقات ۲۳ اپریل کو ہوئی تھی۔ یہ چوتھی ملاقات تھی۔

اس موقع پر وزیر اعظم بھٹو نے ایک اور چال چلی۔ انہوں نے تجویز دی کہ وہ اس سوال پر کہ وہ قوم کے لیڈر رہیں گے یا نہیں، استصواب کروائیں گے۔ اگر وہ استصواب جیت گئے تو ملک میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں گی۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ استصواب کب اور کس طریقہ کار کے تحت کرایا جائے گا۔☆

۱۲ مئی شام کو وزیر اعظم نے قومی اسمبلی میں ریفرنڈم کرانے کا اعلان کیا۔ ان کے خیال میں یہ موجودہ تعطل کو ختم کرنے کا واحد آبرومندانہ اور مناسب طریقہ کار تھا (کیونکہ ان کے بقول حزب اختلاف نے بے لچک رویہ اختیار کرکے مذاکرات کا دروازہ بند کردیا تھا۔ اس لیے چارہ کار کے طور پر انہوں نے بحران کے حل کا متبادل طریقہ کار تجویز کیا) اس مقصد کے لیے آئین میں ایک (عارضی) ترمیم کو ضروری خیال کیا گیا۔ انہوں نے کہا ''میں نے مولانا مفتی محمود کے ساتھ اپنی بات چیت میں تین شہروں میں مارشل لاء ختم کرنے پر آمادگی اور بلوچستان سے فوجوں کی واپسی اور ہنگامی حالت ختم کرنے کے مطالبات پر اپنی اصولی آمادگی کا اظہار کردیا تھا لیکن کہا تھا کہ وقت کے تعین پر گفتگو ہوسکتی ہے...... ملکی حالات قومی اسمبلی توڑنے اور دوبارہ انتخابات کرانے کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ اب مولانا مفتی محمود نے کل (۱۲ مئی کے) اپنے خط میں مجھے آگاہ کیا ہے کہ جب تک ان کے تین مطالبات تسلیم نہیں کیے جاتے وہ اس وقت تک بات چیت کے لیے قطعاً تیار نہیں ہیں...... میں خود قربانی کے لیے تیار ہوں لیکن میں ملک کے اعلیٰ ترین ادارہ کو بھینٹ نہیں چڑھا سکتا...... میں نہ تو ڈکٹیٹر بننا چاہتا ہوں اور نہ بلیک میل پسند کرتا ہوں...... میں آپ کے سامنے انتخابی عمل کی تاریخ پیش کروں گا۔ میں نے ۷ جنوری کو انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا اور یہ اعلان ملک کے بہترین مفاد میں کیا گیا تھا۔ انتخابات کا اعلان مقررہ وقت سے پہلے کیا گیا۔ انتخابات اگست میں منعقدہ ہونا تھے جو آئین اور قانون کے مطابق ایک سال تک ملتوی بھی کیے جاسکتے تھے لیکن میں نے جنوری میں دو ماہ بعد انتخابات کرانے کا اعلان کیا...... ہم نے انتخابی مہم میں حزب اختلاف کو اپنی بات کہنے، لوگوں سے رابطہ قائم کرنے، تقاریر کرنے اور مہم چلانے کے بھرپور مواقع دیا اور ان پر کسی طرح کی کوئی پابندی نہ لگائی گئی۔ ۷ مارچ کو قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور نتیجہ

☆ بی بی سی کے نمائندے مارک ٹیلی کے بقول وزیر اعظم نے کہا کہ ملک کا ڈھانچہ اس طرح بدل دیا جائے گا کہ آئندہ بحرانوں سے بخوبی نمٹا جاسکے۔ (روزنامہ وفاق لاہور، ۱۳ مئی ۱۹۷۷ء)

سامنے آگیا۔ جب تک پولنگ ہوتا رہا اس وقت تک لوگوں نے کوئی اعتراض نہ اٹھایا۔ لیکن نتیجہ سامنے آنے کے بعد شور مچا دیا گیا کہ دھاندلی ہوئی ہے۔ میں نے...... بھرپور یقین دلایا کہ جس حلقہ میں دھاندلی ہوئی ہے اس کی فوری تحقیقات کرائی جائیں گی اور مکمل انصاف کی یقین دہانی بھی کرائی گئی'' (۱۱۸) لیکن پھر بھی دھاندلی کا شور جاری رہا۔

بھٹو نے اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''میں یہ بات پہلے بھی واضح کر چکا ہوں کہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب دوبارہ کرایا جاسکتا ہے لیکن قومی اسمبلی کا انتخاب دوبارہ نہیں کرایا جاسکتا۔ میرا جواز یہ تھا کہ قومی اسمبلی کے انتخاب میں اپوزیشن نے پوری طرح حصہ لیا تھا لیکن صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب کا انہوں نے بائیکاٹ کیا تھا اور قومی اسمبلی کا انتخاب متنازعہ نہیں ہے لیکن اس پر الزامات در الزامات کا سلسلہ شروع کردیا گیا اور الزامات اس جماعت پر عائد کئے گئے جو انتخابات جیت چکی تھی...... شکایات کے ازالہ کے لیے قانونی تحفظ موجود تھا لیکن انہوں نے لوگوں کو گھروں سے باہر نکالا انہیں سڑکوں پر لائے اور یہ پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ اسلام خطرے میں ہے...... آپ کو معلوم ہے کہ اس اقدام سے ملک میں کیا ہوا۔ خاص طور سے کراچی، لاہور اور حیدرآباد میں...... اسی اثناء میں حکومت نے بحران دور کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ اپوزیشن کے مطالبات کو پیش نظر رکھا اور اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار نے اپنے فارمولا میں کہا کہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات دوبارہ کرائے جاسکتے ہیں۔ اگر ان میں اپوزیشن جیت جائے گی تو قومی اسمبلی کا انتخاب بھی دوبارہ کرایا جاسکتا ہے اور صوبائی اسمبلی کا انتخاب قومی اسمبلی کے انتخاب کے لیے ریفرنڈم ہوگا۔ لیکن اپوزیشن نے فوراً ہی سرسری طور پر اس فارمولا کو مسترد کردیا...... جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اسلام پر ان کی اجارہ داری نہیں ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ اسلام کے لیے کام کریں۔ ہم نے کوششیں بھی کی ہیں...... (بلکہ) میں نے لاہور میں اعلان کیا تھا کہ نظام مصطفیٰ ﷺ نافذ کیا جائے گا۔ جب میں نے یہ اعلان کیا تو ایک جماعت نے جو خود کو سب سے منظم مذہبی جماعت قرار دیتی ہے کہ لیڈر نے کہا یہ اصل مسئلہ نہیں...... (بلکہ اصل مسئلہ اقتدار کا حصول تھا)...... میں سعودی عرب کے شاہ خالد کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں جنہوں نے صورتحال کو معمول پر لانے کے لیے ہماری مدد کی۔ دوسروں نے بھی ہماری مدد کی۔ متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ زید بن سلطان النہیان نے بھی مدد کی۔ لیبیا کے صدر قذافی نے بھی

ہماری مدد کی اور اپنے نمائندے بھیجے۔ دوسرے دوست ملکوں نے بھی نمائندے بھیجے، تنظیم آزادی فلسطین کے رہنما یاسر عرفات نے پیغام بھیجا کہ وہ پاکستان کی صورتحال کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بحران کے حل کے لیے کوششوں میں حصہ لے سکتے ہیں۔ سعودی عرب کے نمائندے نے اپوزیشن لیڈروں سے ملاقات بھی کی۔ ان کوششوں کے ساتھ میں اپنے کردار کا بھی ذکر کروں گا۔ میں نے لاہور میں جماعت اسلامی کے رہنما سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ بات چیت کی۔ میں نے انہیں پرخلوص تجاویز پیش کرنے کو کہا۔ میں نے ان کے ساتھ بحران پر بات چیت کی۔ میں اس سلسلے میں زیادہ نہ کہوں گا، میں نے مفتی محمود سے چار ملاقاتیں کیں اس مقصد کے لیے بحران کو دور کیا جاسکے۔ پیر پگاڑا کے ساتھ ۳۰ اپریل کو ملاقات کی اور طویل بات چیت کی۔ جس کے بعد ۳۲ مطالبات پیش کردیئے گئے۔ میں ان پر بھی زیادہ نہیں کہنا چاہتا۔ ہم نے کوئی ایسا بیان نہیں دیا اور کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جس سے بات چیت کے امکان پر برا اثر پڑتا ہو۔ میں نے بار بار اپوزیشن لیڈروں سے بات چیت کی تاکہ قوم کے وسیع مفاد میں بحران کا حل تلاش کیا جاسکے۔ اپوزیشن نے قومی اسمبلی توڑنے کا مطالبہ کیا ہے میں نے اپوزیشن کو بارہا کہا کہ میں ان کی بات سنتا ہوں لیکن قومی اسمبلی نہ توڑنے کے بارے میں انہیں میرا نقطہ نظر بھی سننا چاہیے۔ میں یہ سنتا ہوں کہ اسمبلی توڑ دی جائے اور میری آپ سنیں کہ کیوں اسمبلی نہیں توڑی جانی چاہیے اور ایک دوسرے کو سننے کے بعد کوئی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔ شروع میں اپوزیشن لیڈروں نے کہا ہم آپس میں بات چیت کریں گے اور اس کا فیصلہ کریں گے لیکن بعد میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ پہلے میں قومی اسمبلی توڑنے کا مطالبہ تسلیم کروں اور پھر وہ میرے ساتھ بات چیت کریں گے اور دوسرے نکات پر بعد میں بات ہوگی۔'' (۱۱۹)

بلوچستان میں فوج کشی اور مختلف شہروں میں مارشل لاء کے نفاذ کی پالیسی سے متعلق اپوزیشن کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے بھٹو نے کہا کہ ''میں نے جب ۱۱ مئی کو مولانا مفتی محمود سے ملاقات کی تو ان سے کہا کہ انتخابات کے لیے غیر جانبدارانہ ادارہ قائم کرنے اور انتخاب کا وقت مقرر کرنے کا مسئلہ آئین میں طے شدہ ہے اس کے مطابق کام ہوا ہے اور اس نکتہ پر بات چیت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں آپ کے ساتھ بامقصد سمجھوتہ پر بات چیت کرسکتا ہوں قومی اسمبلی توڑنے کا معاملہ بہت نازک ہے اور میں نے بتایا کہ اس

سے کیا مسائل پیدا ہو سکتے ہیں؟ انہوں نے بلوچستان سے فوج ہٹانے کا مسئلہ بھی اٹھایا۔ میں نے اس پر کہا کہ اب صوبہ میں صورتحال بہتر ہو چکی ہے اور اصولی طور پر میں اس بات پر متفق ہوں لیکن فوج ہٹانے کا وقت مقرر کرنا اصل مسئلہ ہے اور یہ اہم نکتہ ہے فوج کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کل ہی آپریشن ختم کر دیں اس کے لیے فوجی ماہرین کی رائے لینا ضروری ہوتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پہاڑیوں پر باغی لوگ چڑھے ہوں وہ ابھی نیچے آنے پر رضامند نہ ہوئے ہوں۔ امن و امان کا مسئلہ موجود ہو اور فوج کو کہہ دیا جائے کہ کل ہی آپریشن ختم کر دے۔ جہاں تک ہنگامی حالت کا تعلق ہے میں اسے ختم کرنے پر بھی اصولی طور پر متفق ہوں لیکن اس میں بھی اصل مسئلہ وقت کا تعین ہے اور اس کے لیے بات چیت اور تبادلہ خیال کی ضرورت ہے۔ ہم نے تو ہنگامی حالت میں بھی رعاتیں دی ہیں۔ انتخابی مہم میں جلسوں کی اجازت دی گئی۔ انتخاب کے بعد ہنگامی حالت ختم کی جا سکتی تھی لیکن اب صورتحال بدل چکی ہے...... بیرونی مداخلت جاری ہے اور اس صورتحال میں آپ مجھ سے کیسے توقع کرتے ہیں کہ ہنگامی حالت ختم کر دی جائے۔ ہاں البتہ ایک ساتھ بیٹھ کر اس کا بھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ تین شہروں سے مارشل لاء اٹھانا بھی ممکن ہے۔ ٹھیک ہے آپ ایجی ٹیشن چھوڑ دیں مارشل لاء ختم کر دیا جائے گا لیکن ان مسائل پر بات چیت کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ساری باتیں ہونے کے بعد مفتی محمود نے کہا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بات چیت کریں گے اور کل (۱۲ مئی کو) جواب بھیج دیا جائے گا۔☆ (۱۲۰)

بھٹو نے خود کو عوام کا نمائندہ کہتے ہوئے اپنی کہا کہ انہوں نے کبھی آمر بننے کی کوشش نہیں کی بلکہ تمام فیصلے ملکی مفادات کے تحت کئے۔ حالانکہ اصل صورتحال اس سے بالکل مختلف تھی۔ ان کے بقول:

”میں عوام سے تعلق رکھتا ہوں چند اپوزیشن ارکان کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔ میں عوام کے پاس جانے کے لیے تیار ہوں۔ میں ریفرنڈم کے ذریعہ ان کا فیصلہ معلوم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس میں میں کوئی بے عزتی محسوس نہیں کرتا۔ میں ایک باعزت اور اصولی پوزیشن چاہتا ہوں۔ میں اس ملک کا آمر بننے کا خواہشمند نہیں ہوں مجھے یقین ہے کہ یہ باعزت طریقہ ہے۔ اگر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میری جگہ کوئی اور ہو تو یہ ایک قومی فیصلہ ہوگا۔

☆ بھٹو کے خطاب کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے روزنامہ وفاق، لاہور کی اشاعت ۱۴ مئی ۱۹۷۷ء

لوگ مجھے اقتدار میں رکھنا چاہیں گے تو اس کا منطقی نتیجہ سامنے آجائے گا...... ہمیں عوام کے سامنے حقائق رکھنا ہوں گے۔ ہمیں سب سازشوں کا انکشاف کرنا ہوگا۔ ہم بتائیں گے کہ اگر ہم رہے تو ہم لوگوں کو معاشی انصاف فراہم کریں گے۔ بدعنوانیاں ختم کریں گے۔ ملک کے اداروں کو اس طرح استوار کریں گی کہ وہ اس قسم کی مشکلات کا مقابلہ کر سکے...... اگر ریفرنڈم کا نتیجہ میرے حق میں نکلا تو میں اس ملک کا آمر بن بیٹھوں گا یا یہ نہیں کہ یک جماعتی نظام یا صوبائی خودمختاری اور عدالتوں کے اختیارات کو سلب کروں گا۔ یہ فیصلے پہلے ہی ہو چکے ہیں لیکن مجھے حالات کے تقاضوں کے تحت تبدیلیاں کرنا ہوں گی۔ تاکہ ہم آئندہ سازشوں کا مقابلہ کر سکیں۔ ہمیں جو تجربہ ہوا ہے یہ ایک خوفناک تجربہ تھا ہم اس کے حق میں نہ تھے کہ ملک اس قسم کے حالات سے دوچار ہو۔ میں فرد کی آزادی کا قائل ہوں۔ ہمارے ہاں مذہب اور صوبائیت کو ہمیشہ استعمال کیا گیا ہے لیکن ہم نے معاشی انصاف کی بات کی۔ ہم نے ایسے مسائل اٹھائے ہیں، ہمیں ایسا نظام قائم کرنا ہے جو انصاف کی ضمانت دے۔ ہم اس قابل ہو سکیں کہ سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی اور سماجی برائیوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ ہمارا ملک اسلامی اور ترقی پسندانہ خطوط پر چلے۔ ہمیں اس قسم کے اقدامات کرنا ہوں گے کہ ملک بحران کا شکار نہ ہو۔ میں نے اب تک بہت کچھ کیا ہے۔ صوبائی خودمختاری کا مسئلہ حل کیا گیا...... بہرحال لوگوں کو میرے خیالات کا علم ہونا چاہیے انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کس قسم کے مسائل نے ہمیں مشکلات سے دوچار کیا ہے۔ ماضی میں بھی اس نظام نے ہمیں نقصان پہنچایا۔ میں نہیں کہہ سکتا مستقبل میں کیا ہو۔ ہمیں اس نظام کو تبدیل کرنا ہوگا۔ ہمارا اپنا تجربہ ہے اور دوسرے ملکوں کا تجربہ بھی ہے کہ یہ اقدامات ہونے چاہئیں لیکن اس کا انحصار مستقبل پر ہے۔ میں اخلاقی طور پر اس کا مجاز نہیں ہوں کہ اب ایسے اعلانات کروں اب فیصلہ عوام کے پاس ہے وہ ذمہ دار ہیں کہ اپنے مستقبل کے بارے میں وہ کیا چاہتے ہیں۔ وہ کس قسم کا نظام چاہتے ہیں۔ میں نے یہ مسئلہ ایوان کے سپرد کیا لیکن اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا...... میں نے معاملہ عوام کے حوالے کر دیا ہے۔ میں قومی اسمبلی کی قربانی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں خود کو قربان کر سکتا ہوں۔ میں اپنی ذات کی قربانی دینا چاہتا ہوں اگر میرے خلاف لوگوں میں اتنی نفرت پھیلائی گئی ہے کہ اب وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ نہ تو اب فیصلہ ان کے اختیار میں ہے۔ میں نے ایک اصولی اور آبرومندانہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ میں نے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے حزب اختلاف کو

مذاکرات کی میز پر لانے کی بہت کوشش کی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنے مطالبات کو بنیادی شرط کے طور پر پیش نہ کریں بلکہ ان پر آ کر بات کریں۔ بہر حال اب ایک تاریخی لمحہ آ گیا ہے۔ یہ ایک اہم گھڑی ہے میں اس وقت اس مسئلہ کا مرکز ومحور بن چکا ہوں۔ اب میں اپنی تقدیر لوگوں کے حوالے کر رہا ہوں...... عوام اب فیصلہ کریں گے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کیا چاہتے ہیں؟ میں عوام کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں گا۔" (۱۲۱) ☆

وزیر اعظم نے قومی اسمبلی میں اپنی تقریر میں بتایا کہ مفتی محمود کا خط انہیں مل گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپوزیشن موجودہ سیاسی بحران کو ختم کرنے کے سلسلے میں ان سے بات چیت کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔ بھٹو نے ۱۲ مئی کو یہ تحریر کردہ خط پڑھ کر اپنے تبصرہ کے ساتھ ارکان اسمبلی کو سنایا۔ (۱۱۲)

ادھر ملک بھر میں تحریک جاری تھی۔ لاہور میں خواتین نے بھی جلوس نکالے۔ مارشل لاء حکام کے جاری کردہ پریس ریلیز کے مطابق ۱۱ مئی کو کرفیو کے وقفے کے دوران ۴۰ سے ۶۰ خواتین نے ہائیکورٹ کے علاقے سے جلوس نکالا جو انارکلی بازار سے ہوتے ہوئے واپس ہائیکورٹ میں پرامن طور پر منتشر ہوگیا۔ انارکلی بازار میں کچھ مرد بھی جلوس میں شامل ہوگئے جنہیں پولیس نے الگ کر دیا لیکن انہوں نے منتشر ہونے کے بجائے خشت بازی شروع کر دی (پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا) لاٹھی چارج کے دوران بعض افراد زخمی بھی ہوئے جبکہ چار افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ (پریس ریلیز کے مطابق ان افراد پر فوجی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جانا تھا۔) (۱۲۳)

ملک میں جاری محاذ آرائی کے تناظر میں سے اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں تھا کہ مابعد انتخابات بات چیت کیوں بار بار ناکام ہوئی۔ اس کی ایک وجہ فریقین میں عدم اعتماد اور بدگمانی تھی جس نے ایک عرصے سے سیاسی فضا کو مکدر اور بوجھل کیا ہوا تھا۔ رہی سہی کسر ے مارچ

☆ وزیر خارجہ مسٹر عزیز احمد نے بھٹو کے اقدامات کی تائیدیوں کی کہ حکومت کے پاس اس امر کی واضح شہادت موجود ہے کہ اگر موجودہ بے چینی جاری رہی تو ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہونے کا خدشہ ہے۔ ان کے بقول اپوزیشن کے مطالبات پورے کرنے کی بار بار کوشش کی جا چکی ہے لیکن اپوزیشن نے ہر مرتبہ وزیر اعظم کی پیشکش کو مسترد کر دیا۔ بالآخر وزیر اعظم نے (موجودہ) بحران کے حل کے لیے عوام کے پاس جانے کا (یعنی ریفرنڈم کرانے کا) فیصلہ کیا۔ (روزنامہ نوائے وقت، ۱۵ مئی ۱۹۷۷ء)

۱۹۷۷ء کے انتخابات کے انداز ونتائج نے نکال دی۔ سہ ماہہ مذاکرات کی (چوتھی بار) ناکامی کے بعد کے تعطل کو دور کرنے کے لیے حکومت نے استصواب کا جو طریقہ تجویز کیا وہ نیا تو ضرور تھا لیکن مثالی حل ہرگز نہیں تھا کیونکہ جن وجوہ کے پیش نظر وہ صوبائی اسمبلیوں کے دوبارہ انتخابات کرانے پر رضامند ہونے کے ساتھ قومی اسمبلی کے دوبارہ انتخابات کرانے کے لیے تیار نہیں تھے وہ ملک گیر عام استصواب کے جواب کے خلاف بھی پیش کی جا سکتی تھیں۔ کیونکہ مجوزہ ریفرنڈم بھی آئینی دائرہ کار سے باہر کی ایک کوشش تھا۔ لازمی بات ہے کہ اس پر عملدرآمد کے لیے بھی آئین میں ترمیم کی جاتی تھی۔ معلوم نہیں وہ کس بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف ان کی ذات ہی متنازعہ فیہ تھی۔☆ کیونکہ قومی اتحاد کے رہنما خاص طور پر نوابزادہ نصر اللہ خان اور مولانا مودودی بڑے کھلے الفاظ میں یہ کہہ چکے تھے کہ از سر نو انتخابات میں اگر وزیر اعظم بھٹو کی پارٹی دوبارہ کامیاب ہوگئی تو وہ عوام کے اس فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں گے۔

اس پس منظر میں دوبارہ انتخابات کرانے سے انکار اور استصواب رائے پر آمادگی میں جو فرق اور تضاد تھا وہ محتاج وضاحت نہیں۔ وزیر اعظم کے مجوزہ استصواب کے متعلق دو باتیں بنیادی تھیں:

۱۔ وہ استصواب کے انعقاد کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کرتے؟

۲۔ کیا وہ طریق کار مجروح فریق کے لیے قابل قبول تھا؟

جہاں تک استصواب کے طریق کار کا تعلق تھا تو اس کی نوعیت آئین میں عارضی ترمیم (وزیر اعظم کے بقول) سے واضح ہو جاتی تھی لیکن جیلوں میں پابند ومحبوس شاکی فریق کے لیے بھی اس کے قابل قبول ہونے کے متعلق حتمی بات کہنا مشکل تھا۔ (ظاہر ہے یہ صورتحال ناقابل قبول تھی) اس فریق کی عوام میں مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا تھا کہ خود وزیر اعظم بھٹو بار بار یہ تسلیم کر چکے تھے کہ ۷ مارچ کے انتخابات میں قومی اتحاد نے ۳۶۔۳۷ فیصد ووٹ حاصل کئے اور یہ تناسب اتنا اہم اور وقیع تھا کہ اس کی بنیاد پر ہی وہ بار بار صوبائی انتخابات دوبارہ کرانے کی پیشکش کرتے رہے (ان کی یہ پیشکش اس مرحلہ پر بھی

☆ دنیا کے قانون سازوں کا مقولہ ہے کہ کسی شخص یا ذات کے لیے قانون بدلنا کئی خرابیوں کے دروازے کھول سکتا ہے۔ ایک شخص کی خاطر آئین بدلنا ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے مترادف ہے۔ اگر امریکہ کے آئین کا حوالہ دیا جائے تو اس میں ۲۰۰ سالوں کے اندر (۱۹۷۷ء تک) محض ۱۴ ترامیم ہوئیں۔ (مؤلف)

حسب سابق برقرار تھی۔ اگر قومی اتحاد وصوبائی انتخابات کا بھی بائیکاٹ کر دیتا تو بحران کے حل میں مجوزہ طریقہ استصواب کیا مدد دیتا)۔

مزید برآں بھٹو نے اسمبلی فلور پر یہ بات واضح کر دی کہ اگر استصواب کا نتیجہ ان کے حق میں ہوا تو یہ آئندہ کئی طرح کی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ہوگا۔ (اگرچہ انہوں نے ان تبدیلیوں کی وضاحت تو نہ کی کہ وہ انقلابی نوعیت کی ہوں گی یا عام نوعیت کی) عام خیال یہی تھا کہ یہ تبدیلیاں پارلیمانی نظام کے بجائے صدارتی نظام اور ایک پارٹی کی حکومت یا ان دونوں پہلوؤں کے متعلق تھیں (اگر ایسا ہو جاتا تو) یقیناً سیاسی نظام کا سارا نقشہ ہی تلپٹ ہو کر رہ جاتا۔ (۱۲۴) حکومت کے خیال میں اب یہ بات طے شدہ معلوم ہوتی تھی کہ پاکستان قومی اتحاد کے ردعمل کی پرواہ کئے بغیر استصواب کی تجویز پر عملدرآمد کر لیا جائے۔ پارلیمنٹ کے اجلاس منعقدہ (۱۵ مئی ۱۹۷۷ء) میں وفاقی وزیر خزانہ عبدالحفیظ پیرزادہ نے اس ضمن میں کسی قسم کا ابہام باقی نہیں رہنے دیا۔ انہوں نے تو یہاں تک بتا دیا کہ رائے شماری کے لیے ابتدائی انتظامات شروع بھی کر دیئے گئے تھے اور فوج نے یہ ذمہ داری قبول کر لی تھی کہ وہ رائے شماری کے پرامن انعقاد کے لیے مناسب انتظامات کرے گی۔ بظاہر یہ متنازعہ اور یکطرفہ فیصلہ حکومت نے اس دلیل کی بنیاد پر کیا کہ حزب اختلاف نے مذاکرات کے دروازے بند کر دیئے لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو حقیقت کچھ اور ہی دکھائی دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ حکومت نے نئے انتخابات کرانے سے اصولی اتفاق بھی نہیں کیا اور اپوزیشن کے دونوں بنیادی مطالبات تسلیم کئے بغیر اسی مذاکرات کے میز پر آنے کے لیے کہا، اس لیے حزب اختلاف کے نظر بند رہنما خط کتابت بند کرنے پر مجبور ہوئے۔ وزیراعظم نے عام انتخابات کا مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار (محض) اس بناء پر کیا کہ ان کی دانست میں ملک کے داخلی اور خارجی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ وزیر خارجہ عزیز احمد نے بھی اپنی پارلیمنٹ کی تقریر میں اس نقطہ نظر کی مکمل حمایت کی بلکہ اہل وطن سے مطالبہ کیا کہ اگر انہیں ملک کی سلامتی عزیز ہے تو ان کے بیان پر سنجیدگی سے غور کریں۔ انہوں نے (اپنی تقریر کے دوران) غیر ملکی مداخلت کے بارے میں ٹھوس اور وقیع ثبوت ہونے کا بھی تذکرہ کیا۔ ان حالات میں کیا یہ مناسب نہ ہوتا کہ حکومت عام انتخابات کا مطالبہ اصولی طور پر تسلیم کر لیتی۔ اس کے بعد مذاکرات کی میز پر حزب اختلاف کے رہنماؤں کو تفصیل سے اپنے دلائل سے آگاہ کرتی جس کی روشنی میں فوری طور پر انتخابات کا

انعقاد ممکن یا مناسب نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ حکومت کی فراہم کردہ معلومات سے آگاہ ہونے کے بعد حزب اختلاف یا تو کچھ عرصہ کے لیے انتخابات کے التواء پر رضامند ہو جاتی یا وہ ایسا راستہ تجویز کر دیتی جس کے ذریعہ کسی قابل ذکر ہنگامی اور اکھاڑ پچھاڑ کے بغیر انتخابات کا انعقاد ممکن ہوتا۔ اگر بھٹو کو اعتماد تھا کہ وہ انتخابات فوری طور پر منعقد کرنے کے خلاف اپنے دلائل سے حزب اختلاف کو قائل کر سکتے ہیں تو حزب اختلاف بھی اس دعوے میں حق بجانب تھی کہ وہ بھٹو کو اسی انداز میں انتخابات کرانے کا طریقہ بتا سکتی ہے جو ملک کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رہنے کی ضمانت دے سکتا۔ یوں بھی صرف داخلی خطرات اور بیرونی مداخلت کے امکانات میں کمی بیشی ہی کو معیار تسلی کیا جائے تو بھی حزب اختلاف سے مفاہمت کے بعد پرامن اور نسبتاً پرسکون فضا میں انتخابات کرانا، اس راستے (یعنی ریفرنڈم کے انعقاد) سے بدرجہ بہتر ہوتا جسے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

متنازعہ امور پر اصولی اتفاق رائے کے فوراً بعد یقیناً ملک میں زندگی معمول پر آ جاتی۔ خطرات اور بیرونی مداخلت کے امکانات رفتہ رفتہ ختم ہو جاتے۔ اس کے بعد جب عام انتخابات کے انعقاد پر اتفاق رائے ہو جاتا یا فی الوقت حزب اختلاف التوائے انتخابات پر راضی ہو جاتی اور عبوری عرصہ کے لیے مرکز اور صوبوں میں متفق علیہ انتظامات ہو جاتے تو ملک تمام خطرات سے کلیتاً محفوظ ہو جاتا۔ لیکن جو راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا اس میں خطرات ہی خطرات تھے۔ بھٹو کے تجویز کردہ اس نئے تجربہ کے بارے میں کم سے کم یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف تھا اور اس کے نتائج کے بارے میں ہرگز اعتماد کے ساتھ کوئی (حتمی) رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی کہ اس سے جاری بحران کا کوئی باعزت اور سود مند نتیجہ نکلتا۔

جہاں تک قومی اتحاد کے مؤقف کا سوال تھا، قائم مقام صدر قومی اتحاد پیر پگاڑا کی پریس کانفرنس (منعقدہ مئی) نے صورتحال واضح کر دی تھی کہ اتحاد قومی اسمبلی کے انتخابات پر اتفاق رائے کے بعد بھٹو کے فوری استعفیٰ کے مطالبے میں لچک پیدا کرنے پر آمادہ تھا اس کا (صاف) مطلب یہ تھا کہ تعطل نے جو قطعی صورتحال اختیار کی تھی اس کی بنیادی وجہ وزیراعظم کا یہ موقف (ہٹ دھرمی) کہ بوجوہ حالات موجودہ، قومی اسمبلی کے انتخابات کا انعقاد ممکن نہیں۔ نہ کہ اس کا سبب حزب اختلاف کی طرف سے اپنے دونوں مطالب کے پیشگی طور پر منظور کئے

جانے پر اصرار تھا۔

اندریں حالات (بہترین) حل یہ تھا کہ بجائے رائے شماری کے راستے پر یک طرفہ ٹریفک چلائی جاتی بلکہ حزب اختلاف کو مذاکرات کی میز پر لانے کے لیے عام انتخابات پر اصولی اتفاق رائے کا اظہار کردیا جاتا۔ بعد ازاں حزب اختلاف کو اپنے نقطہ نظر پر قائل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ کیونکہ قومی اتحاد میں شامل تمام سیاسی رہنماؤں کی حب الوطنی شک و شبہ سے بالاتر تھی اور (یقیناً) یہ رہنما پاکستان کو لاحق خطرات کی سنگینی کا احساس کرنے کی صلاحیت سے (ہرگز) عاری نہیں تھے۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ وزنی دلائل کو آنکھیں بند کرکے مسترد کردیتے۔ (۱۲۵)

اور یہ حقیقت بھی تھی تحریک کے دوران جس طرح قوم نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا اور قومی اسمبلی کی برخواستگی اور دوبارہ انتخابات کرانے کے حق میں ملک گیر تحریک چلائی جو پاکستان کی تاریخ میں کیا، برصغیر کی تاریخ بلکہ تاریخ عالم میں بحالی جمہوریت اور ووٹ کے تقدس کے حق میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ قوم نے رضا کارانہ طور پر گرفتاریاں پیش کیں، ہڑتالیں کیں، ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہوئے اور سینکڑوں نے جام شہادت نوش کیا۔ خواتین اور بچے سڑکوں پر نکل آئے۔ طلباء اور وکلاء نے قومی اتحاد کے مطالبات کے حق میں جلوس نکالے۔ مزدوروں اور کسانوں نے ساتھ دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دشمن (بھی) اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب عوام کا حکمران طبقے پر اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ یہ بات کسی طور پر بھی تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ قومی اتحاد کے قائدین میں بعض غیر ملکی ایجنٹ تھے جہاں بھٹو کی حب الوطنی میں شک نہیں وہاں دوسرے قائدین کی حب الوطنی بھی ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ (قوم کا باشعور طبقہ ایسے اقدامات کو وقعت نہیں دیتا)۔ حکمران پارٹی کے اس قسم کے اقدامات نے جہاں قوم کو کوئی فائدہ نہ دیا بلکہ ان سے بحران کے حل کی کوششوں کو زبردست نقصان پہنچا۔

اگر قومی اسمبلی کو توڑ کر نئے انتخابات کرانے کے مطالبے سے قومی اتحاد کے قائدین دستبردار بھی ہو جاتے تو قوم کی بھاری اکثریت اس سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھی۔

اندریں حالات:

۱۔ کیا ریفرنڈم کا انعقاد بحران کے حل کے لیے کارآمد حل تھا؟

۲۔ کیا جاری صورتحال ملکی استحکام کے لیے سودمند تھی؟

۳۔ کیا ایک ایسی اسمبلی جس کے خلاف (پچھلے دو ماہ (مارچ اپریل ۱۹۷۷ء) سے) قوم نفرت کا اظہار کررہی تھی۔ قائم رکھنے کا کوئی جواز تھا۔

۴۔ کیا قوم کو (حکومت سے) اختلاف رائے کا کوئی حق نہیں تھا؟

۵۔ کیا اس طرح قوم دو متحارب گروپوں میں تقسیم ہوکر خانہ جنگی، کی طرف نہیں بڑھ رہی تھی؟

۶۔ کیا حکمران طبقہ کو ازسرنو انتخابات کے نتیجہ میں اپنی ناکامی کا یقین تھا؟

۷۔ کیا ملکی صورتھال تواتر سے جاری رہتی تو حکومت چین سے اپنی انتخابی مدت پوری کرتی؟

مذکورہ حالات اس امر کا تقاضا کررہے تھے کہ قومی اسمبلی کو توڑ کر ملک میں ازسرنو انتخابات کرادیئے جاتے تو ملک کے لیے اور جمہوریت سودمند ثابت ہوتے۔ مگر آنے والے دنوں کے نقصانات کی پیش بینی کسی نے بھی نہ کی۔

اسی اثناء میں جب حکومتی ریفرنڈم کے انعقاد کی تیاریاں کررہی تھی۔ پاکستان الیکشن کمیشن نے حکومت کی انتخابات میں دھاندلیوں کو بے نقاب کرنا شروع کردیا۔ جس سے حکومت اور الیکشن کمیشن کے درمیان شدید اختلافات بھی پیدا ہوگئے۔ بلکہ حکومتی افراد اور الیکشن کمیشن کے درمیان ٹھن گئی۔ چیف الیکشن کمشنر نے واضح طور پر کہا کہ کمیشن نے دھاندلیوں کے تمام مروجہ طریقوں کو بے نقاب کردیا ہے۔ جس سے آئندہ سے بیلٹ بکس کے تقدس کے پیش نظر منصفانہ انتخابات کی راہیں کھل گئی ہیں۔ (۱۲۶)

جبکہ وفاقی وزیر قانون و پارلیمانی امور ایس ایم مسعود کے مطابق صدر مملکت نے وہ آرڈیننس ہی واپس لے لیا ہے جو انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۷۷ء کو جاری کیا تھا (جس کے تحت چیف الیکشن کمشنر کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی حلقے میں پولنگ کو خلاف قانون قرار دے سکتے تھے بشرطیکہ انہیں تسلی ہو جائے کہ وہاں وسیع پیمانے پر بے قاعدگیاں کی گئی تھیں) وزیر قانون کی تحریک پر ایوان نے وہ ترمیمی مسودہ قانون مجلس منتخبہ کے سپرد کردیا جس نے اس آرڈیننس کی جگہ لینا تھی۔

وفاقی وزیر قانون اور پارلیمانی امور ایس ایم مسعود نے اپنی کتاب تحریک تشریح

کرتے ہوئے کہا کہ اس آرڈیننس کے تحت چیف الیکشن کمشنر کو ایسے اختیارات دیئے گئے تھے جس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات علم میں آئی کہ کئی ایسے کیسوں کا فیصلہ بھی کیا گیا جن میں کامیاب امیدواروں کے نتائج فی الحقیقت متاثر نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ کئی کیس ایسے بھی تھے جہاں کامیاب امیدوار چالیس ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوئے لیکن صرف دو یا تین سو ووٹوں کی بددیانتی کے باعث چیف الیکشن کمشنر نے کامیاب امیدواروں کا انتخاب کالعدم قرار دے دیا۔ (۱۲۷)

الیکشن کمیشن کی طرف سے ان الزامات کا بھرپور دفاع کیا گیا۔ الیکشن کمیشن نے وضاحت کی کہ اب (۱۴ مئی ۱۹۷۷ء) تک قومی اسمبلی کے جن حلقوں میں انتخابی دھاندلیوں اور بے قاعدگیوں کے بارے میں جو فیصلے دیئے گئے وہ واقعات اور قانون کے مطابق تھے...... اب تک جو (بھی) فیصلے کئے گئے وہ صرف چیف الیکشن کمشنر کی طرف سے نہیں دیئے گئے بلکہ وہ کمیشن نے دیئے تھے جس میں چیف الیکشن کمشنر کے علاوہ لاہور اور سندھ ہائیکورٹوں کے دو فاضل جج بھی شامل تھے اور یہ فیصلے ہر ایک مقدمہ کے مخصوص واقعات اور قانون کے مطابق کئے گئے...... اگر کسی شخص کو ان فیصلوں کے خلاف شکایت ہے تو اسے اس کے خلاف ہائیکورٹ یا سپریم کورٹ میں باقاعدہ قانونی چارہ جوئی کا حق ہے۔ (۱۲۸)

حکومت چونکہ ریفرنڈم کرانے کے لیے سنجیدہ تھی۔ اس لیے ۱۴ مئی ۱۹۷۷ء کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے ساتویں آئینی ترمیم کا بل منظور کرلیا۔ اس ترمیمی بل کا مسودہ وزیر قانون مسٹر ایس ایم مسعود نے پیش کیا۔ اس ترمیم کے مطابق اگر وزیراعظم ڈالے گئے ووٹوں کا نصف حاصل نہ کرسکے تو وہ مستعفی سمجھے جائیں گے۔ اس اعلان کا نفاذ ۲۱ اپریل سے (ہی) ہوگا۔ صدر مملکت ریفرنڈم کرانے کے لیے ایک کمیشن قائم کریں گے۔ (۱۲۹)

لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اسلم ریاض حسین، مسٹر جسٹس کرم الٰہی چوہان، مسٹر جسٹس شمیم حسین قادری، مسٹر جسٹس پال اور مسٹر جسٹس جاوید اقبال پر مشتمل فل بنچ نے ساتویں آئینی ترمیم اور بعض شہروں میں مارشل لاء کے نفاذ سے متعلق رٹ درخواست کی سماعت کرتے ہوئے آئینی ترمیم کے اصل متن کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ مارشل لاء حکام کے جاری کردہ تمام احکامات کی نقول بھی طلب کرلیں۔ (۱۳۰)

حکومت کے لیے حالات پیچیدہ صورت اختیار کرتے جارہے تھے۔ قومی اتحاد سے

مفاہمت کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔ ایک طرف الیکشن کمیشن نے انتخابات کے دوران کی گئی دھاندلیوں کی بے نقاب کرکے حکومت کو اخلاقی طور پر دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کردیا تھا تو دوسری طرف قانونی محاذ پر لاہور ہوئیکورٹ کے اقدامات نے حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ اس صورتحال سے نکلنے کے لیے حکومت نے دوطرفہ روابط کے لیے پاکستان قومی اتحاد ہی کے ایک رہنما (سابق صدر آزاد کشمیر) آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے صدر سردار عبدالقیوم خان کو سہالہ کیمپ سے رہا کردیا۔☆

یہ رہائی سہالہ میں بھٹو، مفتی ملاقات کے بعد عمل میں آئی (۱۳۱)۔ سردار عبدالقیوم خان نے کہا کہ وہ اصولوں پر سودے بازی نہیں کریں گے۔ انہیں یہ ٹاسک دیا گیا کہ وہ اصغر خان، میاں طفیل، پروفیسر عبدالغفور، مولانا شاہ احمد نورانی، میر شیر باز مزاری اور بیگم نسیم ولی خان سے ملاقاتیں کریں۔ (۱۳۲)

اس مقصد کے لیے سردار عبدالقیوم خان کراچی روانہ ہوگئے۔ اپنے مشن پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ حکومت نے اندریں حالات یہ ضروری سمجھا کہ مذاکراتی عمل کو ایک بار پھر شروع کیا جائے لیکن قومی اتحاد کے رہنماؤں کو دوبارہ سہالہ منتقل کرنے کے بجائے ان سے ان کے مقام قید پر ہی ملاقات کا بندوبست کیا جائے۔ اس طرح ایک طرف تو وقت کی بچت ہوتی، دوسرے یہ کہ انہیں خواہ مخواہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے کیوں تکلیف دی جائے۔ سردار دعبدالقیوم کے بقول انہیں مولانا مفتی محمود نے مختلف رہنماؤں سے صلاح و مشورہ کرنے کے لیے مقرر کیا تھا نہ کہ حکومت نے انہوں نے کہا کہ وہ ملک کی مختلف جیلوں میں بند قومی اتحاد کے رہنماؤں☆☆ سے تبادلہ خیال کرکے ان کے خیالات مولانا مفتی محمود تک

☆ انہیں اس مقصد کے لیے ۱۸ مئی ۱۹۷۷ء کو پلندری جیل آزاد کشمیر سے رہا کرکے خصوصی طور پر سہالہ لایا گیا۔ سہالہ سے وہ راولپنڈی میں اپنی اقامت گاہ ''کاکا جی ہاؤس'' چلے گئے۔ سردار عبدالقیوم خان کو ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو سول ڈیفنس آف آزاد کشمیر کے قواعد کی دفعہ ۲۵ کے تحت ان کے آبائی گھر ضلع پونچھ میں نظر بند کردیا گیا تھا۔ جبکہ بعد ازاں یکم مارچ ۱۹۷۶ء کو سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۴ کے تحت نظر بند کردیا گیا۔ اس طرح وہ اپنی رہائی تک ۱۹ ماہ زیر حراست رہے۔ (جنگ کراچی، ۲۱ مئی ۱۹۷۷ء)

☆☆ واضح رہے کہ قومی اتحاد کے رہنما، ملک کی مختلف جیلوں میں بند تھے۔ ساہیوال جیل میں ایئر مارشل (ر) اصغر خان، جیکب آباد میں مولانا شاہ احمد نورانی، دادو جیل میں پروفیسر غفور احمد کو رکھا گیا۔

پہنچائیں گے۔(۱۳۳) تاہم سردار عبدالقیوم خان نے مشن کی دیگر حساس تفصیلات بتانے سے گریز کیا۔ ان کے بقول پاکستان قومی اتحاد اور وزیراعظم بھٹو کے درمیان مذاکرات کا دوسرا دور پاکستان کے ایک طاقتور دوست ملک کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔(۱۳۴) انہوں نے کہا کہ مذاکرات کے لیے بنیاد تلاش کرلی گئی ہے۔ اگر حالات اسی طرح (سازگار) رہے تو امید ہے کہ مذاکرات نتیجہ خیز ثابت ہوں گے۔ تاہم اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ تمام رہنماؤں کو رہا کردیا جائے۔ انہیں مولانا مفتی محمود کی طرف سے پیشگی تجاویز نہیں دی گئیں البتہ تمام رہنماؤں سے ملاقات کے بعد امید واثق تھی کہ نئے حالات کے تحت تجاویز تیار کی جائیں۔ انہوں نے وضاحت کی کہ دونوں فریقین کے رویہ میں، حالات میں اور جاری صورتحال میں موثر تبدیلی واضح ہوئی ہے۔(۱۳۵)

سردار عبدالقیوم خان نے کہا کہ ان کے لیے اس مرحلہ پر یہ بتانا مشکل ہے کہ مولانا مفتی محمود کو رپورٹ پیش کرنے کے بعد کن رہنماؤں سے ملاقات کی جائے گی۔ (ان حالات میں جبکہ قومی اتحاد کی طرف سے یحیٰی بختیار فارمولا مسترد کیا جاچکا تھا اور عوام کی طرف سے بھی ریفرنڈم کی تجویز مسترد کی جاچکی تھی) بات چیت کا موضوع کیا ہوگا؟ تاہم ان رہنماؤں سے مذاکرات کے دوسرے دور کا امکان کم ہے۔(۱۳۶) ان کے خیال میں "میں نے جو کچھ دیکھا (ان کا اشارہ جیل کی سختیوں کی طرف تھا) خاص طور پر ان حالات میں میرے لیے دوسری بار یہ ذمہ داریاں قبول کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے انہیں (حکومت کو) کوئی دوسرا آدمی تلاش کرنا ہوگا...... میں کے ڈی ای کے طیارہ میں کراچی سے جیکب آباد گیا جہاں میں نے مولانا شاہ احمد نورانی سے ملاقات کی انہیں سندھ، بلوچستان کی سرحد کے قریب واقعہ گھڑی خیرو سے وہاں (جیکب آباد) لایا گیا تھا۔ انہیں ۱۱۶ (ڈگری) فارن ہائیٹ کی گرمی میں اس جگہ جیل میں رکھا گیا ہے۔ مجھے یہ معلوم کرکے سخت دکھ ہوا۔ حالانکہ امر واقع ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی اس بارے میں میرے سامنے شکایت کا ایک لفظ زبان پر نہیں لائے...... مولانا نورانی سے میری بات چیت دو گھنٹے جاری رہی (۷۵ میل لمبی خستہ حال سڑک پر دادو کے لیے روانگی سے قبل میں نے ان کے ساتھ دوپہر کا کھانا بھی کھایا) بعدازاں میں نے دادو میں پروفیسر غفور احمد سے ۷۵ منٹ تک گفتگو کی...... میں نے ان لیڈروں کو مولانا مفتی محمود کا پیغام پہنچایا اور ان حضرات سے ملک کی موجودہ سیاسی صورتحال کے مختلف پہلوؤں پر بے تکلفی سے بات چیت کی...... ہم

سب کے خیالات ایک جیسے ہیں اور ہماری سوچ یکساں ہے...... حکومت اور حزب مخالف کے درمیان موجودہ رابطہ کا مقصد مذاکرات کی بیاد تلاش کرنا ہے۔ جونہی مذاکرات کے لیے فضا سازگار ہوگی قوم کو ساری تفصیلات سے آگاہ کردیا جائے گا۔ اس مرحلہ پر اس سے زیادہ کچھ کہنا مشکل ہے...... (امید ہے کہ) جونہی مذاکرات شروع ہوئے تمام قائدین کو رہا کردیا جائے گا۔" (۱۳۷)

مختلف رہنماؤں سے ملاقات کے بعد وہ راولپنڈی پہنچے اور بتایا کہ پاکستان قومی اتحاد اپنے دیرینہ موقف پر ثابت قدمی سے قائم ہے کیونکہ اصولوں پر سودے بازی نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر لچک کا مظاہرہ ہوا تو وہ دونوں اطراف سے ہوگا۔ انہوں نے اس امر پر افسوس ظاہر کیا کہ پاکستان قومی اتحاد کے اسیر رہنماؤں سے ناروا سلوک کیا جارہا تھا۔ جس سے صورتحال بہتر ہونے میں کوئی مدد نہیں مل رہی۔ حکومت صورتحال خراب کرنے کے بجائے فضا کو سازگار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ خدشہ تھا کہ مذاکرات کا عمل سبوتاژ ہوجائے۔ انہوں نے اسیر رہنماؤں کے حوصلے اور عظمت کی داد دی۔ ان کے بقول مولانا شاہ نورانی اور پروفیسر غفور احمد کو تنگ کوٹھریوں میں رکھا گیا جبکہ اصغر خان کو قید تنہائی میں رکھا گیا تھا۔ مولانا شاہ نورانی کو ۲۷ گھنٹے مسلسل سفر کرایا گیا۔(۱۳۸)

اس مرحلہ پر وزیراعظم بھٹو نے ایک اور پینترا بدلا، اور کہا کہ مذاکرات پیشگی شرط کے بغیر ہونے چاہئیں۔ حالانکہ ۱۴ مئی کی بھٹو مفتی ملاقات میں قومی اتحاد کے دیرینہ موقف کو تسلیم کیا گیا تھا۔ امر واقعہ یہ تھا کہ گیند حکومت کی کورٹ میں تھی۔ قومی اتحاد کی طرف سے مذاکرات کے لیے آمادگی کے برملا اظہار پر اب ساری قوم بھٹو کے ردعمل، جواب یا آئندہ اقدام کے لیے گوش بہ آواز تھی۔ تاہم سوال یہ تھا کہ مذاکرات کب شروع کئے جائیں؟ فضا کو سازگار بنانے کے لیے باہمی اعتماد کے کون سے اقدامات کئے جائیں؟ لیکن اس سلسلے میں ضروری تھا کہ مری (جون ۱۹۷۳ء) والی تاریخ نہ دہرائی جائے۔☆

تاہم حکومت نے مذاکرات کے دوسرے مرحلہ کے لیے اقدامات کرنا شروع کردیے۔ ۲۸ مئی کو کابینہ کے خصوصی اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ حزب اختلاف کے ساتھ

☆ بعض بنیادی مطالبات تسلیم ہونے کے بعد ہی حکومت کے ساتھ مذاکرات پر آمادگی کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس لیے غیر مشروط مذاکرات کا جو تاثر دیا جارہا تھا، سراسر غلط تھا۔ (نوائے وقت ۲۷ مئی ۱۹۷۷ء)

مذاکرات کیئے جائیں۔ تاہم ابھی تاریخ اور جگہ کا حتمی اعلان نہ کیا گیا۔ باخبر ذرائع کے مطابق یہ مذاکرات آئندہ ہفتے مری میں متوقع تھے۔ قومی اتحاد کی طرف سے مذاکراتی ٹیم میں مولانا مفتی محمود، پروفیسر غفور احمد، نوابزادہ نصر اللہ خان کا اعلان پہلے ہی کیا جاچکا تھا۔ (۱۳۹) حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ مذکورہ بالا شخصیات کو مذاکرات کے ابتدائی مرحلے میں رہا کردیا جائے گا۔ مذاکرات کے حوالے سے قومی اتحاد نے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہا کہ اتحاد نے بعض بنیادی مطالبات تسلیم کرانے کے بعد ہی بات چیت پر آمادگی ظاہر کی تھی جبکہ حالیہ مذاکرات کا مقصد صرف انتخابات کی تاریخ کا تعین تھا۔ (۱۴۰)

۳۱ مئی ۱۹۷۷ء کو وزیراعظم کی زیر صدارت اعلیٰ فوجی حکام نے ۳ گھنٹے تک امن و امان کی صورتحال پر غور کیا گیا۔ اس اجلاس میں جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین جنرل ایم شریف، چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق، چیف آف نیول سٹاف ایڈمرل محمد شریف، چیف آف ایئر سٹاف ایئر چیف مارشل ذوالفقار علی خان اور دیگر اعلیٰ فوجی حکام نے شرکت کی۔ ☆ (۱۴۱) چونکہ مذاکرات ۳ جون ۱۹۷۷ء کو راولپنڈی میں ہونا تھے اس کے مقصد کے لیے مذاکراتی ٹیم کے اراکین کو رہا کردیا گیا۔ مذاکرات کے لیے راولپنڈی میں واپڈا ریسٹ ہاؤس کا انتخاب کیا گیا۔ (۱۴۲) بعد ازاں اس خبر کی وزیر اطلاعات کوثر نیازی نے توثیق کردی۔ ان کے بقول مذاکرات ۳ جون ۱۹۷۷ء کو شام ساڑھے چار بجے شروع ہونا تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ فریقین کی طرف سے مذاکرات کے لیے کوئی پیشگی شرط عائد نہیں کی گئی۔ بلکہ مذاکرات کے لیے دل (اور ذہن) کے ساتھ ہوں گے۔ (۱۴۳) ☆☆

مذاکرات کے لیے فریقین کی طرف سے تین تین امیدواروں کو نامزد کیا گیا۔ مفتی محمود نے رہائی کے بعد بیان دیتے ہوئے کہا کہ اتحاد میں شامل تمام جماعتوں کے رہنماؤں کی منظوری ہی سے مذاکرات (کے آغاز) کا فیصلہ ہوا جبکہ قومی اتحاد اپنے موقف پر پوری قوت سے قائم ہے۔ (۱۴۴)

☆ اس اجلاس میں ملکی صورتحال کے حوالے سے چند انتظامی نوعیت کے فیصلے بھی کیئے گئے جن کی تفصیل نہیں بتئی گئی۔ واضح رہے کہ عام انتخابات کے بعد تحریک شروع ہونے سے جو صورتحال پیدا ہوئی اس کے بعد کراچی ڈویژن، ضلع حیدرآباد اور ضلع لاہور میں مارشل لاء نافذ کردیا گیا اور دیگر مختلف شہروں میں امن و امان برقرار رکھنے کے لیے سول انتظامیہ کی طرف سے فوج کو طلب کیا گیا تھا۔

☆☆ خیر سگالی اقدامات کے طور پر حکومت نے این ڈی پی کی بیگم نسیم ولی کی رہائی کا حکم دیا۔ مزید برآں جاری بحران کے دوران جاں بحق ہونے والوں کے پسماندگان کی امداد کا فیصلہ کیا گیا۔

حکومت اپوزیشن مذاکرات

پہلا دورِ مذاکرات:

متوقع مذاکرات کے لیے ۲ جون کو قومی اتحاد کے رہنماؤں مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد کو رہا کردیا گیا۔ تینوں رہائی کے بعد راولپنڈی میں ''واپڈا ریسٹ ہاؤس'' میں پہنچے مذاکرات کی فضا کو سازگار بنانے کے لیے دوست عرب ممالک کے علاوہ سعودی عرب کے شاہ خالد نے خصوصی کردار ادا کیا جبکہ سردار عبدالقیوم خان کی کوششیں بھی قابل ستائش تھیں۔ (۱۴۵) قومی اتحاد کی طرف سے فیصلہ کیا گیا کہ پہلے سے طے شدہ مذاکرات کمیٹی کے ارکان (جن میں اتحاد کے تینوں بڑے عہدیدار شامل تھے) شرکت کریں گے۔ حکومتی ٹیم اراکین تین سے زائد ہوئے تو پھر پیر پگاڑہ یا سردار عبدالقیوم خان کو ٹیم میں شامل کیا جاسکتا تھا۔ اگرچہ حکومت کی طرف سے امر کا اعلان کیا گیا کہ مذاکرات غیر مشروط تھے مگر قومی اتحاد کے رہنما پیر پگاڑا اور سردار عبدالقیوم بار بار اس بات کی وضاحت کرچکے تھے کہ انہوں نے مذاکرات کے لیے پہلے ہی تجاویز پیش کرر کھی تھیں۔ (۱۴۶)

قومی اتحاد کی طرف سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ مذاکرات کے آغاز میں اس امر پر زور دیا جائے گا کہ سب سے پہلے ۶ جون ۱۹۷۷ء کو ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس کو معطل کیا جائے کیونکہ قومی اتحاد کے حلقوں کے مطابق اس اسمبلی کی قانونی حیثیت مشکوک تھی اور ان کے نزدیک سیاسی فضا کو سازگار بنانے کے لیے اجلاس کو ملتوی کرنا ضروری تھا۔ قومی اتحاد کے بقول ایجنڈے میں قریباً وہی ۳۲ نکات شامل تھے جو انہوں نے ۳ مئی کو وزیراعظم کو پیش کیئے تھے اور یہ ۳۲ نکات پانچ بنیادی تجاویز کا حصہ تھے:

(i) وہ اقدامات جو فوری طور پر کیئے جائیں۔
(ii) قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑا جائے اور ملک میں عام انتخابات کرائے جائیں۔
(iii) الیکشن کمیشن کی تشکیل نو اور انتخابات کے متعلق انتظامات۔

(iv) پاکستان اور آزاد کشمیر میں مطلوبہ انتظامی اقدامات۔

(v) جناب بھٹو کا استعفیٰ۔

تاہم قومی اتحاد نے اپنی پانچویں تجویز جو بھٹو کے استعفیٰ کے متعلق تھی میں لچک پیدا کردی۔ (۱۴۷) مذاکرات سے پہلے مولانا مفتی محمود کی زیر صدارت اسلام آباد کے ایک پرائیویٹ بنگلے (۱۴۸) ☆ میں قومی اتحاد کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا جو تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا۔ (۱۴۹) اس اجلاس میں قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل پروفیسر غفور احمد، نوابزادہ نصراللہ خان، بیگم نسیم ولی، سردار عبدالقیوم خان، پیر پگاڑا اور مسٹر ایس ایم ظفر شریک ہوئے۔ مولانا مفتی محمود نے اجلاس سے قریباً پچاس منٹ تک خطاب کیا۔ (۱۵۰)

ان کے بقول:

(i) قومی اتحاد عوام کی امنگوں کے مطابق اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے تمام مسائل کے حل کرنے کا خلوص دل سے خواہاں ہے۔

(ii) مذاکرات ایک دن ضائع کئے بغیر (تسلسل سے) جاری رہنے چاہئیں۔

(iii) چونکہ دونوں فریق ایک دوسرے کے نقطہ نظر سے واقف ہیں اس لیے اگر خلوص اور دیانتداری سے کام لیا جائے تو (متنازعہ) مسائل ایک گھنٹے میں طے ہو سکتے ہیں۔

(iv) قومی اتحاد کے کارکن اور حامی اپنی قیادت پر پورا اعتماد رکھیں۔ انہیں حالات سے پوری طرح باخبر رکھا جائے گا۔

(v) چاہیے تو یہ تھا کہ حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات سے قبل صلاح مشورہ کی غرض سے تمام اسیر رہنماؤں کو نہیں تو کم از کم اتحاد میں شامل سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں کو ہی رہا کر دیا جاتا۔

(vi) مارشل لاء اور ہنگامی حالات کو ختم کر دیا جاتا (تاکہ) اس سے بات چیت کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے میں مدد ملتی۔

۳ جون ۱۹۷۷ء کو مذاکرات کا پہلا دور واپڈا ریسٹ ہاؤس کے بجائے وزیر اعظم سیکرٹریٹ (ایوان وزیر اعظم) کے گیسٹ روم میں ہوا۔ جو اڑھائی گھنٹے جاری رہا۔ (۱۵۱)

☆ یہ بنگلہ پی ڈی پی کے ایک خاموش رہنما چوہدری محمد ارشد کی اقامت گاہ تھا۔ جو اسلام آباد کے سیکٹر ایف ۴/۷ میں واقع تھا۔

مذاکرات کے اس دور میں قومی اتحاد کی طرف سے دوبارہ انتخابات کے مسئلہ کو اس لیے بحث میں نہیں لایا گیا کہ بنیادی سیاسی مسائل کو مذاکرات میں زیر بحث لانے سے قبل اتحاد میں شامل جماعتوں کے سربراہوں سے صلاح مشورہ کرنا ضروری تھا (جو کہ رہنماؤں کی اسیری کی وجہ سے پہلے ممکن نہ تھا) مذاکرات بیشتر طور پر ان ابتدائی باتوں تک ہی محدود رہے جو قومی اتحاد کی سات تجاویز پر مشتمل تھے جو وزیر اعظم کو مذاکرات کے لیے اپنی آمادگی کے ساتھ روانہ کی گئی تھیں، مذاکرات میں ملک کی عام سیاسی اور اقتصادی صورتحال کا ذکر بھی کیا گیا اور ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کے قومی اسمبلی کے عام انتخابات میں مبینہ دھاندلیوں کے خلاف ملک گیر تحریک کے نتیجے میں جو نقصانات اور گرفتاریاں ہوئے وہ بھی زیر بحث آئے۔ قومی اتحاد نے گرفتار شدگان اور ان کے مقدمات کی نوعیت سے متعلق اعداد و شمار بھی طلب کئے۔ (۱۵۲)

پہلے مذاکراتی دور کے نتیجے میں درج ذیل فیصلے ہوئے:

(i) دفعہ ۱۴۴ کے خلاف ورزی کے الزام میں تمام گرفتار شدگان کی رہائی کا فیصلہ کیا گیا مزید برآں یہ تجویز کیا گیا کہ اس الزام میں مزید گرفتاریاں نہیں ہوں گی۔

(ii) سازگار مذاکراتی ماحول کے قیام کے لیے حکومت اور حزب اختلاف نے عوام سے مشترکہ اپیل کی کہ دوران مذاکرات جلسے، جلوس اور مظاہرے بند کئے جائیں۔ (۱۵۳) ☆

(iii) اخبارات پر عائد سنسر شپ ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

(iv) ایئر مارشل ریٹائرڈ محمد اصغر خان، مولانا شاہ احمد نورانی ☆☆ اور خان محمد اشرف کی رہائی کا فیصلہ کیا گیا۔

(v) تحریک کے دوران شدید زخمی ہونے والوں کو معاوضہ کی ادائیگی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ (۱۵۴)

☆ ادھر مذاکرات کے دوران جلسے، پر پابندی کا فیصلہ کیا گیا لیکن دوسری طرف حکومتی شہ پر مختلف اراکین اسمبلی نے اس کی خلاف ورزی جاری رکھی۔ ۴ جون ۱۹۷۷ء کو خیرپور سندھ سے ۳۶ میل دور قصبہ رانی پور میں وفاقی وزیر مواصلات مسٹر ممتاز بھٹو نے ایک جلسہ سے خطاب کیا۔ ان کے بقول: ''پاکستان پیپلز پارٹی عوام کے ووٹوں کی بھارتی اکثریت سے منتخب ہو کر آئی ہے اس لیے اسے حکومت کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔'' اس کے باوجود وزیر اعظم بھٹو نے اپنی فراخدلی کا مظاہرہ کر کے متواتر تین ماہ تک مصالحت کی کوششیں جاری رکھیں اور انہیں مذاکرات پر آمادہ کیا تا کہ عوام کو پر سکون ماحول فراہم کیا جائے...... مذاکرات ہوتے رہیں گے لیکن ریفرنڈم کرانے کی تجویز بھی اپنی جگہ قائم ہے...... ملکی بحران غیر ملکی سازش کا نتیجہ ہے جسے پاکستان کے عوام کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔''

☆☆ واضح رہے کہ مولانا نورانی مسلسل ۳ جون ۱۹۷۷ء تک قید میں رہے۔

پہلے دور کے مذاکرات کے بعد مشترکہ اعلان:

مشترکہ اعلان کے تحت وزیر اعظم بھٹو نے حکومت کی جانب سے شرکائے مذاکرات کو یقین دلایا کہ متعلقہ امور کا ایک متفقہ حل تلاش کرنے کے ارادہ سے بات چیت کا آغاز کیا گیا تھا۔ جواباً مولانا مفتی محمود نے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا۔ گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ:

(i) قومی اتحاد کے تین مرکزی رہنماؤں اصغر خان، مولانا شاہ احمد نورانی اور خان محمد اشرف کو فوری طور پر رہا کر دیا جائے۔

(ii) ابتدائی اقدام کے طور پر ان تمام افراد کو جنہیں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا کی فوری رہائی کا فیصلہ کیا گیا، اس سلسلے میں آئندہ نئے مقدمات قائم نہ کی جائے اور نہ ہی نئی گرفتاریاں کی جائیں۔

(iii) مارشل لاء کے ہٹائے جانے اور ملک میں جاری ہنگامی حالات کے خاتمہ کے لیے مذاکرات کی آئندہ مراحل میں غور وخوض کیا جائے گا۔

(iv) تحریک کے دوران جو لوگ جان بحق ہوئے ان کے خاندانوں کو مناسب معاوضہ دینے کا اعلان حکومت پہلے ہی کر چکی تھی۔ اب یہ طے کیا گیا کہ اس عرصہ میں جو لوگ شدید زخمی ہوئے تھے انہیں مناسب معاوضہ ادا کیا جائے۔

(v) یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ فریقین ماحول کو بہتر بنانے کے لیے ہر ایسی بات سے گریز کریں گے جس کا بات چیت پر اثر پڑے۔ حکومت سرکاری ذرائع ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اپنے حامیوں کو تلقین کرے گی کہ وہ ایسی تحریر کا تقریر سے گریز کریں جس کا بات چیت پر برا اثر پڑ سکتا ہو۔

(vi) طرفین نے عوام سے اپیل کی کہ جب تک مذاکرات جاری ہیں وہ مظاہروں، جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ منقطع کر دیں۔

(vii) اخبارات سے سنسر شپ ختم کرایا جائے گا۔

(viii) آئندہ اجلاس پیر ۶ جولائی، ۱۱ بجے دن ایوانِ وزیر اعظم میں منعقد ہوگا تا کہ اس دوران کوئی اتحاد کے رہنما ایک جگہ جمع ہو کر باہمی مشورہ کر سکیں اور (اس دوران)

حکومت کو بھی غور وخوض کا موقع مل سکے۔

(ix) مشترکہ اعلان کے تحت فیصلہ کیا گیا کہ مولانا کوثر نیازی اور پروفیسر غفور احمد پر اجلاس (دور مذاکرات) کے بعد اور مذاکرات کے اختتام پر مشترکہ بیان جاری کریں گے۔ (مشترکہ بیان اردو میں تیار کیا گیا)

مذاکرات کے پہلے دور میں پہلے وزارت داخلہ کے سیکرٹری مسٹر ایم کے چوہدری اور پھر چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق کو گیسٹ روم میں بلایا گیا۔ دونوں الگ الگ ۱۵ سے ۲۰ منٹ تک وہاں رہے۔ (۱۱۵) ☆

جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ اور پاکستان قومی اتحاد کی جنرل کونسل کے رکن شاہ احمد نورانی نے اپنی رہائی کے بعد ۴ جون ۱۹۷۷ء کی شام کراچی میں جمعیت علمائے پاکستان کے مرکزی دفتر میں ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا جس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے پاکستان قومی اتحاد کے موقف کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ''میں قومی اتحاد کے تمام رہنماؤں کی رہائی کے بغیر اپنی رہائی بے معنی سمجھتا ہوں......قومی اتحاد کے تین مطالبات بھٹو کا استعفیٰ، قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے دوبارہ انتخابات اور الیکشن کمیشن کی از سر نو تشکیل قوم کی امانت ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے پاکستان کے ساڑھے چھ کروڑ عوام نے عظیم قربانیاں دی ہیں۔ لہٰذا قومی اتحاد ان مطالبات سے بے وفائی نہیں کر سکتا......قوم کو پاکستان قومی اتحاد پر اعتماد کرنا چاہیے وہ جس طرح اس سے قبل قوم کے اعتماد پر پورا اترا ہے آئندہ بھی قوم کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچنے دی جائے گی......تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے پاکستان کے عوام نے جو عظیم قربانیاں دی ہیں وہ پاکستان کی تاریخ کے سنہری باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (اپنی گرفتاری کی تفصیلات بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ۱۳ مئی کو سہالہ سے واپس کراچی ایئرپورٹ سے گرفتار کر کے مجھے پولیس کی گاڑی میں ۲۶ گھنٹے تک مسلسل سفر کے بعد گڑھی خیرو پہنچا دیا گیا جہاں انہیں حوالات میں رکھا گیا)......اس وقت

☆ پروفیسر غفور احمد کے مطابق جنرل ضیاء الحق حکومتی درخواست پر پہلے اجلاس میں آئے اور جب حکومت سے مارشل لاء ہٹانے کا کہا گیا تو حکومت نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ جنرل ضیاء الحق کی جانب سے کسی دشواری کا اظہار کیا گیا تھا۔ اسی دشواری کی دفعات کے لیے انہیں اجلاس میں بلایا گیا تھا۔

(جنگ کراچی، ۶ جون ۱۹۷۷ء)

تک قومی اتحاد کے ۶۰۰ سے زائد کارکن شہید ہو چکے ہیں۔ جبکہ ۸۰۰۰ افراد قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کی فائرنگ سے زخمی ہوئے ہیں اور قریباً ایک لاکھ افراد جیلوں میں بند ہیں۔ حکومت نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے والوں کی رہائی کا اعلان کیا ہے لیکن اس اعلان کے نتیجہ میں رہا ہونے والے کارکنوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس لیے کہ بیشتر افراد پر ضابطہ فوجداری، ڈی پی آر، لوٹ، آتشزنی، بلوے، بغاوت پر اکسانے اور اشتعال دلانے کے سنگین مقدمات قائم کیے گئے۔ (انہوں نے تحریک استقلال کے سیکرٹری جنرل مشیر احمد پیش امام کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ان پر قتل کے الزام میں مقدمہ قائم کیا گیا)...... میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل (۳ جون ۱۹۷۷ء) کے سمجھوتے میں کیا روح کارفرما رہی ہے۔ مگر میرے نزدیک قومی اتحاد کے رہنماؤں کی نظر میں یقیناً یہی تصور ہوگا کہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے سلسلے میں جس قدر افراد گرفتار ہوئے ان پر کسی بھی دفعہ کے تحت مقدمات ہوں، وہ رہا کر دیے جائیں...... جہاں تک کل کے مذاکرات اور مشترکہ اعلان کا تعلق ہے میں فی الحال اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بغیر اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ابھی زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں...... میں مذاکرات کی صورتحال اور کل کے مشترکہ اعلان سے مایوس تو نہیں ہوں لیکن فی الحال میں اس کا خیر مقدم بھی نہیں کر سکتا...... عوام صبر اور سکون کے ساتھ بہتر نتائج کی توقع رکھیں لیکن ساتھ ہی مکمل عزم اور حوصلے کے ساتھ ہر ممکن صورتحال کا مقابلہ کرنا ہوگا...... جمعیت (علمائے پاکستان) کی ۹۰ فیصد قیادت جیلوں میں بند ہے۔ میں اپنی قیادت کو بھی اعتماد میں لینے کے لیے ان سے بات چیت کی خواہش رکھتا ہوں کیونکہ جے یو پی، تحریک استقلال اور این ڈی پی کے علاوہ دیگر جماعتوں کی مرکزی سطح کی اعلیٰ قیادت کے رہنما راولپنڈی میں موجود ہیں۔ میں ان کے سامنے یہ تجویز رکھوں گا کہ مذاکرات کے دوسرے دور میں سب رہنماؤں اور کارکنوں کی بلاتخصیص رہائی کا مسئلہ طے کیا جائے......" (۱۶۵)

دوسرا دور:

پہلے دور میں چونکہ تسلی بخش پیشرفت ہوئی تھی۔ اس لیے مذاکرات کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ آئندہ مذاکرات کے حوالے سے سردار عبدالقیوم نے کہا کہ ۶ جون کے مذاکراتی

اجلاس (مذاکرات کے دوسرے دور) میں بنیادی مسئلہ اٹھایا جائے گا۔ ان کے بقول اسمبلی ٹوٹنے کے ۹۰ دن کے اندر اندر انتخابات کرائے جانے ضروری تھے اور اگر اس سلسلے میں حکومت نے زائد مہلت مانگی تو یہ آئین کے منافی اقدام کے ہونے کی وجہ سے ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اگر یہ مذاکرات ناکام ہوئے یقیناً یہ قوم کی سب سے بڑی بدنصیبی تھی۔ (۱۵۷)

مولانا نورانی نے مذاکرات کے دوسرے دور کے حوالے ۵ جون کو اپنے ایک بیان میں کہا کہ "حکومت کی جانب سے ابتدائی سمجھوتے (۳ جون ۱۹۷۷ء) کے بعد کی گئی بے ضابطگیوں کے بارے میں پیر (۶ جون) کے مذاکرات میں سب سے پہلے حکومت سے وضاحت طلب کی جائے گی کیونکہ سمجھوتے میں یہ بات طے کی گئی تھی کہ قومی اتحاد کی جماعتوں کے سربراہوں اور دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے الزام میں گرفتار تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ مگر اس کے باوجود کراچی سنٹرل جیل میں قید ہزاروں سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں میں سے صرف سات کو اور پنڈی میں ۱۸۰ میں سے صرف ابھی تک ایک سیاسی قیدی رہا کیا گیا ہے جبکہ حکومت کی طرف سے یہ کہا گیا تھا کہ مجموعی تعداد کے نصف قیدی ایسے ہیں جو دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں گرفتار ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے قیدیوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اس کے ساتھ ہی قومی اتحاد کے رہنما ایئر مارشل اصغر خان کے ساتھ بدسلوکی کا مظاہرہ کیا گیا اور خود مجھے سمجھوتہ کے ۱۷ گھنٹے بعد رہا کیا گیا۔ اس کے علاوہ سرکاری اخبارات نے اپنے اداریوں میں معاہدے کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے یکطرفہ پراپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی نے بھی اس معاہدے کی روح کے مطابق اپنا رویہ درست نہیں کیا۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ بات چیت آگے بڑھنے سے پہلے ابتدائی سمجھوتہ (پہلے مذاکراتی دور کے نتائج) پر عملدرآمد کا جائزہ لیا جائے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ دونوں فریقوں نے اس پر کہاں تک عمل کیا ہے اور کس فریق نے خلاف ورزی کی ہے تاکہ آئندہ بات چیت بغیر رکاوٹ کے جاری رہ سکے۔" (۱۵۸)

مولانا شاہ احمد نورانی نے ملک میں چلائی گئی تحریک کے حوالے سے کہا کہ مذاکرات کا حاصل نظام مصطفیٰ ﷺ ہوگا۔ جو کہ اس ملک کا مقدر بند چکا تھا اور ساری تحریک کا مرکزی نکتہ تھا۔ تحریک کے لیے عوام نے جو قربانیاں پیش کیں وہ ناقابل فراموش تھیں۔ جس منظم طریقے سے تحریک چلائی گئی تحریک کی بدولت حکومت کو مذاکرات کی میز پر لانے میں کافی

آسانی ہوئی۔ (۱۵۹) انہوں نے کہا کہ یہ عوام کی طاقت ہی تھی جس نے حکومت کو ازسرِنو انتخابات کرانے پر مجبور کیا۔ قومی اتحاد نے ذاتی اغراض کے بجائے قومی مفادات کی حفاظت کے لیے عوام کو ان کے حقوق دلانے کے لیے ایک ایک مشن کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی۔ ملک میں جاری تحریک کو برصغیر کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ (۱۶۰)

مذاکرات کا دوسرا دور ایوانِ وزیراعظم میں ۶ جون ۱۹۷۷ء کو بوقت گیارہ بجے دن شروع ہوا۔ مذاکرات کے پہلے دور کے حوالے سے کیئے گئے اقدامات زیر بحث آئے خصوصاً نظر بندوں کی رہائی اور جیل میں ان کے ساتھ روا رکھی جانے والی مبینہ بدسلوکی کا معاملہ زیر غور آیا۔ فریقین نے جاری بحران کے بنیادی مسئلہ کے حل کے لیے دو فارمولوں کا پیش کیا جانا تھا۔ حکومتی نمائندے مولانا کوثر نیازی کے بقول ان دونوں میں سے کسی بھی فارمولے پر سمجھوتہ ہونے کی صورت میں عملدرآمد کے لیے آئین میں باہمی ترمیم ممکن تھی۔ تاہم اتحاد کے نمائندے نے زور دیا کہ اگر پاکستان قومی اتحاد نے کوئی بھی فارمولا قبول کیا تو بعض شرائط کے تحت ہوگا نئے انتخابات کی صورت میں:

۱۔ قومی اتحاد انتخابات کرانے کے لیے ایک سال کے بجائے زیادہ سے زیادہ چار ماہ کی مہلت دینے کے حق میں ہے۔ اس صورت میں قومی اسمبلی کے موجودہ بجٹ اجلاس میں بجٹ صرف عبوری مدت کے لیے پیش کرنے پر زور دیا جائے گا۔

۲۔ عبوری دور میں حکومت میں شامل ہونے کی صورت میں اتحاد، وزیراعظم کے اختیارات میں کمی چاہیے گا۔

۳۔ اگر انتخابات کے وقت کے تعین اور متعلقہ امور پر سمجھوتہ ہوگیا تو انتخابات کے انعقاد کے لیے ضروری غیر جانبدار مشینری اور ایسے انتخابی قوانین وضع کرنے پر زور دیا جائے گا جن کے تحت دھاندلی کے امکانات کم سے کم رہ جائیں۔

۴۔ اس فارمولے کو قبول کرنے کی صورت میں (اس بات کا امکان ہے کہ) قومی اتحاد نئے انتخابات کو موجودہ آئین کے تحت دوسرے عام انتخابات تسلیم کرلے۔☆

☆ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت پہلے انتخابات ۷ اور ۱۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو کرائے گئے تھے جنہیں قومی اتحاد تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ سمجھوتے کی صورت میں نہ صرف ان انتخابات کو اخلاقی اور قانونی حیثیت حاصل ہوجاتی بلکہ ان کے نتیجے میں بننے والی اسمبلی بھی جائز قرار پاتیں۔

اس کے لیے آئین میں دوسرے انتخابات کے لیے ۱۸ سال کی عمر رکھے جانے کی شق کو ترمیم کے ذریعہ تیسرے انتخابات کے لیے کہ دیا جائے گا۔ (یعنی اس طرح سمجھوتے کے تحت منعقد کرائے جانے والے انتخابات میں حسب سابق ۲۱ سال کی عمر کے افراد ہی ووٹ ڈالنے کے لیے اہل قرار دیئے جاتے۔ اس طرح آئینی لحاظ سے کوئی سقم باقی نہ رہتا۔ (۱۶۱)

تیسرا دور:

مذاکرات کے تیسرے دور ۷ جون ۱۹۷۷ء) میں قومی اتحاد کی طرف سے ملک میں ازسرنو انتخابات کے فارمولے پر اتفاق ظاہر کیا گیا۔ جبکہ دوبارہ پولنگ کے امکان کو مسترد کردیا گیا۔ دوبارہ انتخابات کے انعقاد کے لیے تفصیلات طے کرنے کی غرض سے قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل پروفیسر غفور احمد اور وزیر خزانہ عبدالحفیظ پیرزادہ پر مشتمل دو رکنی سب کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ (۱۶۲) اس کمیٹی کا اجلاس اگلے روز (۸ جون کو) وزارت خزانہ کی عمارت میں ہونا طے پایا۔ کمیٹی کو اپنی نتائج بھی رپورٹ ۹ جون کو فیصلہ کن مذاکرات میں پیش کرنا تھی۔ (۱۶۳)

قومی اتحاد کی طرف سے ممتاز قانون دان میاں محمود علی قصوری کی سربراہی میں قانونی ماہرین کی گیارہ رکنی کمیٹی ☆ کا قیام عمل میں لیا گیا۔

چوتھا دور:

اس مذاکراتی دور میں نئے انتخابات کے سلسلے میں درج ذیل امور زیر غور آئے۔

۱۔ انتخابات کی تاریخ کا تعین کیا جائے۔

۲۔ ایسے تحفظات دیئے جائیں، جن سے دھاندلی کا امکان کم سے کم رہ جائے۔

۳۔ موجودہ قومی اسمبلی کے خاتمے اور نئے انتخابات کے انعقاد کے درمیانی عرصہ میں قائم ہونے والی مرکزی اور صوبائی حکومتیں انتخابات میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر کسی قسم کی مداخلت نہ کرسکیں۔ (۱۶۴) تاہم مذاکراتی سب کمیٹی متعدد امور طے نہ

☆ اس کمیٹی کے ذمہ نئے انتخابات کے فارمولوں کو عملی جامہ پہنانے، مذکورہ اہم نکات، مطلوبہ تفصیلات اور ان کے آئینی اور قانونی پہلوؤں پر غور وخوض کرنا تھا۔ اس کمیٹی کا اجلاس ۷ جون ۱۹۷۷ء کو اسلام آباد میں قومی اتحاد کی مرکزی کونسل کے اجلاس کے ساتھ ساتھ رات گئے تک جاری رہا۔ یہ بھی طے پایا کہ اس کمیٹی کا اجلاس، مذاکرات کے چوتھے دور (سب کمیٹی کے اجلاس) سے قبل ہوگا۔

کر سکی۔ نئے انتخابات کے انتظامات کے سلسلہ میں بھی بعض امور پر عدم اتفاق سامنے آیا۔ مذاکرات کا چوتھا دور (۹ جون ۱۹۷۷ء) اس لحاظ سے رسمی رہا کہ اس میں سب کمیٹی نے اپنی رپورٹ زبانی پیش کی اور بتایا کہ بنیادی اختلافات انتخابات کے حوالے سے اپوزیشن کی طرف سے طلب کردہ (بعض) تحفظات پر تھے۔ (۱۶۵)

پانچواں دور:

مذاکرات کا پانچواں دور ۱۰ جون ۱۹۷۷ء کو ہوا۔ جس میں بعض اختلافات طے ہوئے تاہم جو اختلافات ہنوز تصفیہ طلب تھے ان میں عبوری دور میں حکومت کا ڈھانچہ، وزیر اعظم کے اختیارات میں کمی اور دیگر متعلقہ امور شامل تھے۔ قومی اتحاد نے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے لیے ضروری تحفظات کے ضمن میں چھ بنیادی نکات پیش کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی قومی اتحاد نے واضح کر دیا کہ مطلوبہ تحفظات کی یقین دہانی کے بغیر اتحاد مذاکرات جاری رکھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوگا۔ اگرچہ اتحاد نے مذاکرات میں کسی تعطل کا اشارہ نہیں دیا تاہم صورتحال بند گلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ حکومت نے سوچ بچار کے لیے ۱۲ جون تک مہلت مانگ لی۔ (۱۶۶)

مولانا شاہ احمد نورانی نے حکومتی حلقوں پر واضح کر دیا کہ اگر نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے ہماری (اتحاد کی) کوششوں کے تمام راستے بند کئے گئے تو پھر غلامان مصطفیٰ ﷺ پہلے سے ہی زیادہ شدت سے تحریک چلائیں گے۔ (۱۶۷)

اصغر خان نے حکومت پر الزام لگایا کہ مذاکرات کو جان بوجھ کر طول دیا جا رہا ہے۔ (۱۶۸)

چھٹا دور:

مذاکرات کا چھٹا دور (۱۲ جون ۱۹۷۷ء) کو اس یقین دہانی کے ساتھ ختم ہو گیا کہ مذاکرات کا نتیجہ پرسوں (۱۴ جون کو) نکل آئے گا۔ قومی اتحاد نے یقین دلایا کہ حکومتی نقطہ نظر پر غور کیا جائے گا۔ (۱۶۹)

اس وقت تک ازسرنو انتخابات الیکشن کمیشن کی تشکیل نو، سیاسی قیدیوں کی رہائی، ہنگامی حالات کے خاتمے، موجودہ اسمبلیوں (قومی وصوبائی) کو توڑنے اور غیر جانبدار صوبائی گورنروں کے تقرر جیسے معاملات قریباً طے ہو چکے تھے۔ اب اختلافات صرف انتخابات کی حتمی

تاریخ کے تعین کے سلسلہ میں تھے۔ اس ضمن میں حکومت کا موقف یہ تھا کہ انتخابات نومبر ۱۹۷۷ء میں ہوں جبکہ پاکستان قومی اتحاد اگست کے وسط تک چاہتا تھا۔ قومی اتحاد کی طرف سے نئے انتخابات کے فارمولے پر آمادگی ظاہر کرنے کے بعد، اب صرف تین ذیلی امور زیر بحث تھے:

۱۔ انتخابات کی حتمی تاریخ کا تعین۔
۲۔ نئے الیکشن کمیشن کا قیام اور
۳۔ قومی اتحاد کے زعماء کی مرکزی حکومت میں شرکت۔☆

ساتواں دور:

آخری نکتہ کے سلسلے میں قومی اتحاد نے مذاکرات کے ساتویں دور (۱۳ جون ۱۹۷۷ء) میں حکومت پر زور دیا کہ موجودہ (حکومی) ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں جن سے قومی اتحاد کے نمائندوں کو حکومت میں حقیقی حصہ اور اختیار ہے۔ قومی اتحاد نے اس ضمن میں چند مطالبات کئے۔ مثلاً انہیں کابینہ میں عددی مساوات حاصہ ہو، انہیں برابر کے اہم محکمے دیئے جائیں اور انہیں برخواست نہ کیا جائے وغیرہ، حکمران پارٹی کے لیے یہ بات قابل قبول نہیں تھی اس لیے آخری لمحات میں فریقین میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ حالانکہ حکمران پارٹی نے ۱۲ جون ۱۹۷۷ء کو یہ موقف اختیار کیا تھا کہ قومی اتحاد اس شرط پر حکومت میں شامل ہو سکتا تھا کہ وہ وزارتوں کے لیے نامزد نمائندوں کی فہرست وزیر اعظم کو دیں۔ حکومت کی طرف سے یہ موقف اختیار کیا گیا کہ اس فہرست میں نہ صرف ان اصحاب کو وزیر بنانے کے لیے منتخب کیا جائے گا جو وزیر اعظم کو قابل قبول ہوں بلکہ انہیں صرف وہی محکمے دیئے جائیں جو ان کے لیے بھٹو منتخب کریں۔ (۱۷۰)☆☆

☆ تیسرا موضوع اس لیے بھی ابھرا کہ حکومت نئے انتخابات جلد کرانے کے لیے تیار نہ تھی۔ کیونکہ حتمی تاریخ کے تعین کے سلسلہ میں حکومت اور اتحاد میں واضح اختلافات پائے جاتے تھے۔ مرکزی حکومت میں شمولیت کے بعد قومی اتحاد اس پوزیشن میں ہوتا کہ وہ حکومت پر جلد از جلد انتخابات کرانے کے لیے زور دے سکتا۔

☆☆ گویا قومی اتحاد کو حتمی طور پر نہ اپنے وزیروں کی نامزدگی کا حق حاصل تھا اور نہ اہم محکموں کے مطالبے کا اور یہ موجودہ حکومت کے سربراہ کا استحقاق تھا کہ وہ جس طرح چاہتا اپنے وزاراتی ساتھیوں کا انتخاب کرتا اور انہیں اپنی مرضی اور پسند کے محکمے الاٹ کرتا۔ بالفاظ دیگر قومی اتحاد وزیر اعظم کے رحم و کرم اور صوابدید کا محتاج تھا۔

قومی اتحاد کی مرکزی کونسل کو ان شرائط پر حکومت میں شمولیت کی تجویز منظور نہیں تھی۔ اس لیے اس نے اپنے مذاکراتی نمائندوں کو ہدایت کی کہ اس قسم کی حکومت میں شمولیت کی پیشکش کو مسترد کر کے اپنے اصل اور اولین مطالبہ (انتخابات کے جلد از جلد انعقاد) کی طرف لوٹ جائیں اور حکومت پر واضح کر دیں تاکہ اگر انتخابات نومبر کی بجائے اگست میں ہوں تو اس صورت میں قومی اتحاد کو حکومت میں شرکت کی حاجت نہیں اور وہ ان تحفظات پر قانع رہیں گے جو آزادانہ انتخابات کے لیے ضروری تھے اور جن پر پہلے ہی اتفاق ہو چکا تھا۔ (۱۷۱)☆

قومی اتحاد کے رہنما شروع سے جلد انتخابات کو حکومت میں شرکت پر ترجیح دیتے تھے وہ ۴۵ دن کے اندر اندر انتخابات کے ساتھ اس بات پر مصر تھے کہ ایسے تحفظات سے جن میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ممکن ہوں اور وہ دوبارہ اس تلخ تجربے سے نہ گزریں جس کا وہ گزشتہ انتخابات میں شکار ہوئے۔ اس ضمن میں نئے الیکشن کمیشن کا قیام از حد ضروری اور اولیت کا حامل تھا۔ قومی اتحاد کے قانونی ماہرین نے اس بات کا خاص طور پر مطالبہ کیا کہ چیف الیکشن کمشنر کو وسیع انتظامی اختیارات حاصل ہوں اور وہ انتخابات سے متعلقہ کسی ایسے افسر کو جو ناجائز حرکت کا مرتکب قرار پایا جائے فوری اور سرسری برخواستگی کا حکم دے سکے۔

قومی اتحاد نے حکومتی حلقوں پر زور دیا کہ انتخابات چاہے اگست میں ہوں یا نومبر میں دونوں صورتوں میں اتحاد، بھٹو کے اختیارات محدود کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے تحفظات کے علاوہ سب سے اہم تحفظ انتخابات کے انعقاد کے درمیان عبوری دور کے لیے پی این اے کے اشتراک سے مرکز میں نگران حکومت کا قیام ہے۔ (۱۷۲) مذاکرات کے ساتویں دور کی صبح کی نشست کے اختتام پر راولپنڈی میں قومی اتحاد کی نو جماعتوں کے سربراہوں پر مشتمل مرکزی کونسل نے حکومتی موقف پر غور کے بعد متفقہ طور پر اپنے موقف میں تبدیلی نہ کرنے کا فیصلہ کیا کہ اگر قومی اتحاد عبوری حکومت میں شامل ہوا تو پھر وہ خود ہی اپنے وزراء نامزد کرے گا اور محکموں کا تعین بھی قومی اتحاد کے مشورے سے ہوگا۔

☆ یعنی غیر جانبدارانہ گورنروں کا تقرر، مرکزی انتخابات کے متعلق صوبائی انتظامیہ میں مداخلت اور ایمرجنسی کا خاتمہ وغیرہ۔

شام کی نشست میں حکومت کی طرف سے کچھ مزید تجاویز بھی دی گئیں۔ (۱۷۳)☆

آٹھواں دور:

مذاکرات کا آٹھواں دور ۱۴ جون ۱۹۷۷ء کو ہوا۔ مذاکرات میں دوبارہ انتخابات کے انعقاد پر اتفاق کے علاوہ مناسب مشینری کے قیام اور انتخابات کے وقت کے تعین کی سرکاری تجویز پر غور کیا گیا۔ مولانا کوثر نیازی نے اس امر پر زور دیا کہ یہ دوبارہ انتخابات آئین کے تحت دوسرے عام انتخابات تصور کیے جائیں۔ یہ انتخابات اسی سال ماہ رمضان کے بعد ہوں گے۔ پروفیسر غفور احمد کے بقول انتخابات کے وقت کے تعین کا تعلق نئے سرکاری تجویز سے ہے جو اگر منظور کر لی گئی تو پھر موجودہ حکومت نئے انتخابات تک برسر اقتدار رہے گی۔ مذاکرات کے بعد عبوری حکومت کی جس تجویز پر غور کیا گیا تھا وہ ترک کر دی گئی ہے۔ مزید برآں نئی سرکاری تجویز کی منظوری کی صورت میں اس پر عملدرآمد کے امور طے کرنے کے لیے اگر ضروری ہوا تو دونوں فریقوں کے ماہرین قانون کا اجلاس ہوگا۔ (۱۷۴)

نواں دور:

بالآخر خدا خدا کر کے مذاکرات کے نویں دور (منعقدہ ۱۵ جون ۱۹۷۷ء) میں بنیادی امور پر سمجھوتہ ہو گیا (۱۷۵) جس کی فنی تفصیلات طے کرنے کے لیے عبدالحفیظ پیرزادہ اور پروفیسر غفور احمد پر مشتمل سب کمیٹی قائم کی گئی۔ طے پایا کہ اس کمیٹی کی رپورٹ کے بعد حتمی سمجھوتے پر دستخط ہو جائیں گے۔ (۱۷۶) اس سمجھوتہ کے مطابق:

۱۔ نئے انتخابات اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں ہونا قرار پائے جو کہ ایک نئے خودمختار اور بااختیار الیکشن کمیشن کی زیرنگرانی ہونا تھے۔

۲۔ باقاعدہ سمجھوتہ ہونے کے چند روز بعد قومی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں توڑ دی جائیں گی اور صوبوں میں پاکستان قومی اتحاد کی رضامندی سے غیر جانبدار گورنر مقرر کیے جائیں گے۔ نئے غیر جانبدار صوبائی گورنروں کو مکمل اختیارات ہوں گے۔ وہ انتظامی افسران کو تبدیل کرنے ہٹانے یا نکالنے کے مجاز ہوں گے۔

۳۔ سمجھوتے کے ساتھ ہی ملک میں نافذ ہنگامی حالت ختم کر دی جائے گی۔

☆ تاہم ان کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔

۴۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات، قومی اسمبلی کے انتخابات کے ایک روز بعد ہوں گے۔ جن پر غور وخوض کے بعد حتمی فیصلہ مذاکرات کے آٹھویں دور میں ہونا تھا۔

۵۔ ایسے سول ملازمین جو انتخابات میں دھاندلی کا باعث بن سکتے ہیں انہیں تبدیل کردیا جائے گا۔

ان کی جگہ نئے افسران کا تقرر عمل میں آئے۔گا۔☆

۶۔ اس بنیادی سمجھوتہ کے تحت بلوچستان سے فوج بیرکوں میں واپس بلالی جائے گی۔

۷۔ آزاد کشمیر کے معاملات پر سردار عبدالقیوم خان سے بات چیت کی جائے گی۔

۸۔ آئین میں کی گئی تمام یکطرفہ ترامیم پر نظر ثانی کی جائے گی اور ان میں سے جو ترامیم بھی انسانی حقوق کے خلاف ہوں گی، انہیں ختم کردیا جائے گا۔ اس کے علاوہ انتخابات کے سلسلہ میں (آئین میں) ضروری ترامیم بھی کی جائیں گی۔

۹۔ سینٹ کے حالیہ انتخابات میں منتخب کئے جانے والوں کی رکنیت بھی ختم ہوجائے گی۔

۱۰۔ باضابطہ سمجھوتہ کی صورت میں ایک اعلیٰ اختیارات کی دس رکنی کونسل قائم کی جائے گی جس میں دونوں فریقوں کے پانچ پانچ ارکان ہوں گے۔ اس کمیٹی میں اگر کسی بات پر تنازعہ ہوا تو اسے سپریم کورٹ میں پیش کردیا جائے گا۔ سپریم کورٹ کے تین سینئر ججوں پر مشتمل بینچ اس کا ۷۲ گھنٹوں میں فیصلہ کردے گا۔

۱۱۔ نئے انتخابات، آئین کے تحت دوسرے عام انتخابات (تصور) ہوں گے جبکہ رائے دہندگان کے لیے ۱۸ سال کی عمر کی شرط تیسرے عام انتخابات پر ملتوی کردی جائے گی (جو کہ اس سے پیشتر دوسرے تمام انتخابات پر لاگو ہونا تھا) اور اس کے لیے آئین میں ترمیم کی جائے گی۔

۱۲۔ انتخابات کے نتائج تک موجودہ حکومت برقرار رہے گی۔☆☆

۱۳۔ سمجھوتہ کی تفصیلات کا اعلان، سمجھوتہ پر دستخط ہوجانے کے ساتھ ہی کیا جائے گا۔

☆ ان سول ملازین میں صوبائی چیف سیکرٹریز، ہوم سیکرٹریز، آئی جی پولیس، ڈویژنل کمشنرز، بعض وفاقی سیکرٹری، فیڈرل سکیورٹی فورس کے چیف اور ایسے دوسرے افسران شامل تھے۔

☆☆ کیونکہ قومی اتحاد کی طرف سے عبوری حکومت کی تجویز ترک کردی گئی تھی۔

۱۴۔ سمجھوتہ پر جناب بھٹو اور مولانا مفتی محمود دستخط کریں گے۔☆

۱۵۔ اس سمجھوتے کے تحت، اس بات کا لحاظ کئے بغیر کہ کوئی سیاسی کارکن کسی مقدمے میں ملوث ہے۔ تمام سیاسی قائدین کو (باضابطہ سمجھوتے کے ساتھ ہی) رہا کردیا جائے گا اور ان پر قائم تمام مقدمات واپس لے لیے جائیں گے۔ نیز ٹریبونل اور خصوصی ٹریبونل ختم کردیئے جائیں گے۔(۱۷۷)

مذکورہ سمجھوتے کے حوالے سے اطمینان ظاہر کرتے ہوئے وزیراعظم بھٹو نے کہا کہ عام انتخابات کا فیصلہ عوام کے مطالبے پر کیا گیا ہے اور (اس طرح) بحران مکمل طور پر ختم ہوگیا ہے۔ (انہوں نے اپنی مثال دیتے ہوئے کہا کہ) بعض اوقات تاریخ فاتح کے لیے المیہ بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہا کہ وہ ۱۸ جون سے سعودی عرب، لیبیا، کویت، متحدہ عرب امارات اور ایران کا خیر سگالی دورہ کریں گے کیونکہ حکومت اور قومی اتحاد کے آخری اجلاس مذاکرات کے دور منعقدہ ۱۷ جون ۱۹۷۷ء) کے بعد جو صورتحال پیدا ہوئی اس کی وجہ سے یہ دورہ (انتہائی) ضروری ہوگیا تھا۔ ان کے بقول معاہدے پر دستخط چار روزہ دورہ سے واپسی پر ہوں گے۔ (مزید برآں اطمینان طلب پہلو یہ ہے کہ) سمجھوتہ کا مسودہ تیار کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی بلکہ پانچ اسلامی ملکوں کے دورے میں جو مزید چار دن لگیں گے ان سے (مذاکرات کے نتائج کے حوالے سے) کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ اس سے قانونی ماہرین کو سمجھوتے کا ایک اچھا مسودہ تیار کرنے کے لیے اور وقت مل جائے گا۔(۱۷۸)

مذاکرات جب عین نتیجہ خیز ثابت ہونے والے تھے وزیراعظم بھٹو کا یوں اچانک غیر ملکی دورہ کا اعلان اگرچہ سیاسی حلقوں کے لیے ضرور حیرت کا باعث بنا تھا لیکن بھٹو کی اس سیاسی چال کو مختلف مکاتب فکر نے کئی معنی پہنائے۔ حکومت حلقوں کے لیے یہ دورہ پرسکون حالات اور سمجھوتے کے حوالے سے اطمینان کا اظہار تھا۔ بعض حلقوں نے اسے بھٹو کی بلا کی خود اعتمادی سے محمول کیا۔ پاکستان قومی اتحاد نے اسے ایک تاخیری حربے (Delaying Trick) کے طور پر لیا۔ حالات خواہ کچھ بھی تھے لیکن پاکستان کی سیاسی تاریخ کے حوالے سے

☆ توقع کی جارہی تھی کہ یہ سمجھوتہ ۲۰ جون کے لگ بھگ ہوجائے گا۔ سمجھوتہ کی تفصیلات طے کرنے کے لیے چار چار قانونی مشیروں کی مدد کے ساتھ سب کمیٹی کا اجلاس ۱۶ جون ۱۹۷۷ء کو اسلام آباد میں ہونا طے پایا۔

اس دورہ نے گہرے اثرات مرتب کئے۔ اگر معاہدے پر دورے سے پہلے دستخط ہو جاتے تو یقیناً آئندہ مارشل لاء کے لیے راہ ہموار نہ ہوتی۔

۱۶ جون ۱۹۷۷ء کو مذکورہ بالا سمجھوتے کی تفصیلات طے کرنے کے لیے دورکنی کمیٹی کا اجلاس وفاقی وزیر خزانہ عبدالحفیظ پیرزادہ کے دفتر میں دو گھنٹے جاری رہا اور کافی غور وخوض کے بعد قومی اتحاد کے قانونی ماہرین نے سمجھوتہ کا مسودہ اتحاد کی مرکزی کونسل میں پیش کردیا۔ اجلاس کے اختتام پر طے پایا کہ (سمجھوتے کی تفصیلات کو حتمی شکل دینے کے لیے دورکنی کمیٹی کا اجلاس کل (۱۷ جون) کو بھی ہوگا۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ سمجھوتے پر دستخط ہونے تک اس پر اطمینان کا اظہار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی عوام کو مطمئن ہونا چاہیے۔ اس سمجھوتہ پر کڑی نظر رکھی جائے گی کہ تفصیلات کے طے کرنے میں عوام کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہ ہونے پائے...... پانچ روز پہلے مذاکرات میں یہ بات طے ہوچکی تھی کہ قومی وصوبائی اسمبلیوں کے قومی اتحاد کے نامزد جملہ امیدوار جن کو گرفتار کیا گیا تھا ان سب کو فوری طور پر رہا کردیا جائے گا اور تمام مقدمات واپس لے لیے جائیں گے مگر ابھی تک طے شدہ معاہدے پر عمل نہیں ہوا اور بلا مبالغہ سینکڑوں امیدوار جیلوں میں بند ہیں...... جس انداز سے ریڈیو اور ٹی وی پر موجودہ سمجھوتے کا اعلان کیا گیا وہ بھی عوام کو ذہنی انتشار میں مبتلا کرنے کی ایک کوشش تھی۔ (۱۷۹)

حکومت نے خیر سگالی اقدامات کے تحت تحریک کے دوران گرفتار شدگان کی رہائی کا فیصلہ کیا۔ تاہم فوجداری جرائم، سماج دشمن اور غنڈہ گردی کے ملزموں کو رہا نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سمجھوتہ کے تحت شاہ فرید الحق، محمود اعظم، مولانا ذکریا، منور حسن، مولانا حقانی، جنید فاروقی، ظہور الحسن بھوپالی اور بوستان علی ہوتی رہا کردیئے گئے۔ اسی دوران ۱۷ جون کو جسٹس دوراب پٹیل نے قائم مقام چیف الیکشن کمشنر کا حلف اٹھالیا۔ (۱۸۰) ☆

مزید برآں پاکستان قومی اتحاد کی مرکزی کونسل نے اس سمجھوتے کی منظوری دے دی جو آئینی ماہرین کی کمیٹی نے تیار کیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک شیڈول بھی تیار کیا گیا جس میں (ممکنہ) آئینی ترامیم کے حوالے سے تفصیلات دی گئی تھیں۔ (۱۸۱)

☆ ان کی تقرری جسٹس سجاد احمد جان کی رخصت پر وارسا روانگی کے بعد عمل میں آئی۔ جسٹس دوراب پٹیل کے نام پر قومی اتحاد نے بھی اتفاق ظاہر کیا تھا۔

قومی اتحاد نے عبدالحفیظ پیرزادہ سے کئی امور سے متعلق وضاحتیں طلب کرلیں۔ مثال کے طور پر قومی اتحاد کے متعدد رہنما حکومتی یقین دہانیوں کے باوجود بند تھے۔ جن کا سمجھوتہ کے تحت رہا کیا جانا طے تھا۔ اس کے علاوہ غلام مصطفی کھر کو بطور گورنر پنجاب مقرر کردیا گیا تھا جو کہ سمجھوتہ کی صریحاً خلاف ورزی تھا کیونکہ سمجھوتہ کے تحت گورنر کے عہدہ پر غیر جانبدار اور قومی اتحاد کی رضامندی سے افراد کا تعین عمل میں آنا تھا۔ کھر کی تقرری جیسے اقدامات سے حکومت کے آئندہ عزائم کا پتہ چلانا مشکل نہیں تھا۔ (۱۸۲)

مولانا شاہ احمد نورانی نے سیاسی قیدیوں کی رہائی کے حوالے سے حکومت پر واضح کیا کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ ۱۹۷۲ء سے لے کر ۱۹۷۷ء کے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرے کیونکہ سیاسی قیدیوں کی بلا جواز حراست کا کوئی اخلاقی یا قانونی جواز نہیں تھا۔ (۱۸۳) ☆

دسواں دور:

مذاکرات کے دسویں دور (منعقدہ ۲۳ جون ۱۹۷۷ء) میں پاکستان قومی اتحاد نے سمجھوتے کا مسودہ پیش کردیا۔ حکومت نے یقین دہانی کرائی کہ ان نکات پر غور وخوض کے بعد سمجھوتے پر دستخط کردیئے جائیں گے۔ اسی روز بھٹو نے غیر ملکی دورے سے واپسی پر کہا کہ مذاکرات کا عمل پھر شروع کیا جائے گا۔ تاہم اختلافات (اگر کوئی تھے بھی تو وہ) محض فنی نوعیت کے ہیں۔ (۱۸۴)

قومی اتحاد نے اس دوران سمجھوتہ کے نظرثانی شدہ) مسودہ کے علاوہ انتخابی قوانین کا مسودہ بھی پیش کردیا۔ حکومت نے اعلان کیا کہ مذاکرات کے آئندہ (گیارہویں) دور میں سمجھوتہ کے بارے میں اپنے شق وار جوابات سے مطلع کرے گی بلکہ بعض نکات کے بارے میں پاکستان قومی اتحاد سے استفسارات بھی کیے جائیں گے۔ (۱۸۵)

گیارہواں دور:

۲۵ جون کو ہونے والے مذاکرات کے گیارہویں دور میں حکومت نے قومی اتحاد کے سمجھوتے کے جواب میں اپنا (شق وار) جوابی مسودہ پیش کردیا۔ حکومتی نمائندہ مولانا کوثر

☆ واضح رہے کہ حکومت نے آزاد کشمیر کے سابق صدر سردار عبدالقیوم خان کو بلا جواز ڈیڑھ سال سے زائد عرصہ تک نظر بند رکھا۔ کیونکہ وہ آزاد کشمیر میں سوشلسٹ نظریہ کے برخلاف اسلامی حکومت کے موید اور حامی سمجھے جاتے تھے۔ جو کہ حکومت وقت کو ناگوار خاطر تھے۔

نیازی نے کہا کہ یہ دونوں مسودے دریا کے دو کنارے نہیں (جو نہ مل سکیں) حکومت اور اتحاد کے درمیان اختلافات کونسل، اس کی اختیارات اور اسمبلیاں توڑنے کی تاریخ پر تھے۔ اتحاد کے نمائندہ پروفیسر غفور احمد کے مطابق آئندہ اجلاس میں اتحاد کی طرف سے نیا مسودہ پیش کئے جانے کا امکان ہے، جس سے سمجھوتہ میں تاخیر ہو سکتی ہے۔(۱۸۶)

اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ آخر صبر و برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ حکومت کی جانب سے معاہدے پر دستخط کرنے کے سلسلہ میں تاخیری ہتھکنڈہ استعمال کیا جا سکتا...... آخر کب تک بے چین اور منتظر عوام کو انتظار کی تکلیف کا نشانہ بنایا جاتا رہے گا۔ اس لیے عوام کو جھوٹے دلاسے دینے کا سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے اور حکومت ادھر یا ادھر کا فیصلہ کر کے یہ واضح کرے کہ آیا وہ عوامی مطالبات کے آگے جھکنے کے لیے تیار ہے یا نہیں تاکہ عوام اپنا لائحہ عمل تیار کر سکیں۔(۱۸۷) اور واقعی حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ اب یہ چوہے بلی کا کھیل ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ اس لیے قومی اتحاد کی مرکزی کونسل نے آخری مسودہ پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا جس کے بعد اتحاد کوئی دوسرا مسودہ یا نئی تجاویز پیش نہیں کرے گا۔ اسے آخری مسودہ کو مذاکرات کے بارہویں دور میں زیر بحث لایا جاتا تھا۔

حکومت نے قومی اتحاد کے اس موقف کو دھمکی یا الٹی میٹم سے تعبیر کیا۔ پیرزادہ نے کہا کہ حکومت منظور یا نامنظور کی بنیاد پر مسودے کو وصول نہیں کرے گی۔ پروفیسر غفور احمد نے واضح کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کو دھمکی یا الٹی میٹم نہیں دیا گیا حکومت (چاہے تو) دو دن میں جواب دے دے اور حکومت اگر اس سلسلے میں وضاحت چاہے تو اس کا موقف سننے کو تیار ہیں۔(۱۸۸)

مذاکرات کے تین ہفتوں کے بعد پاکستان قومی اتحاد نے مجوزہ سمجھوتے کا مسودہ حکومت کو دیا تھا جو مذاکرات (کے دور) میں ۲۵ جون کو زیر غور آیا۔ اس پر حکومت نے بعض اعتراضات کئے۔ حکومت نے اس میں ترمیم یا تبدیلیوں کے بجائے اپنی طرف سے نیا مسودہ پیش کر دیا۔ قومی اتحاد کے اجلاس میں حکومت کی طرف سے قومی اتحاد کے مسودے پر کئے گئے اعتراضات پر تفصیل سے غور کیا گیا۔ اس کے علاوہ حکومت کے مسودے پر بھی غور کیا گیا۔ حکومت کا مسودہ غالباً عجلت میں تیار کیا گیا تھا اس لیے اس میں مختلف پہلوؤں سے کمی تھی۔

چنانچہ اتحاد نے فیصلہ کیا کہ پہلے مسودہ پر بنیادی دستاویز کے طور پر کیا جائے۔ حکومت کے مسودے اور اعتراضات کو مدنظر رکھتے ہوئے اتحاد نے نظر ثانی شدہ مسودہ تیار کیا جس میں حکومت کے اٹھائے گئے اعتراضات کو زیادہ سے زیادہ ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے علاوہ حکومت کے مسودے کی کچھ دفعات کو نئے مسودے میں شامل کیا گیا۔ اس نظر ثانی شدہ مسودے کو مرکزی کونسل کے اجلاس (منعقدہ ۲۷ جون) میں حتمی شکل دے دی گئی۔ جسے ۲۸ جون کو پیرزادہ کے حوالے کیا جانا تھا...... مگر دونوں فریقوں کا مقصد عام انتخابات غیر جانبدارانہ، منصفانہ اور دیانتدارانہ کرانے اور اس کے لیے مطلوبہ مشینری قائم کرنا ہے تو امید ہے کہ حکومت، قومی اتحاد کے مسودے کو قبول کرے گی۔(۱۸۹)

مولانا شاہ احمد نورانی اس صورتحال کا عمیق نظری سے جائزہ لے رہے تھے۔ ان کے نزدیک حکومتی نمائندہ کے اقدامات ایک تاخیری حربے کے سوا کچھ نہیں تھے۔ حکومت کے کردار پر انہوں نے کڑی نظر رکھی اور وقتاً فوقتاً وہ حکومتی غلطیوں کی نشاندہی کرتے رہے۔ ان کے بقول حکومت نے مذاکرات کے آغاز سے لے کر اب (گیارہواں دور) تک ۱۳ واضح خلاف ورزیاں یا اشتعال انگیزیاں کیں۔ حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح واضح تھی کہ قومی اتحاد...... (انتخابات کے بعد پیدا ہونے والے بحران کے حل کے لیے محض) دوست ملکوں کی اپیل پر مذاکرات کے لیے آمادہ ہوا تھا۔ اس کا واضح مقصد یہ تھا کہ بھٹو کی حکومت کی منافقت اور قومی اتحاد سے سمجھوتہ کی خواہش کے بار بار اعلان کی حقیقت بے نقاب ہو جائے اور مذاکرات کے دوران بھٹو نے جو بھی خلاف ورزیاں کیں، اس سے (کم از کم) ہمارا (قومی اتحاد کا) مقصد پورا ہو گیا (کہ دراصل غلطی پر کون تھا)...... ہم نے اپنی پوزیشن اور بھٹو کی منافقت ثابت کرنے کے لیے متعلقہ خلاف ورزیوں کی نشاندہی تمام متعلقہ حلقوں تک کی (لیکن) ان خلاف ورزیوں کی موجودگی میں ہمیں (نہ تو پہلے) بھٹو سے کوئی امید تھی اور نہ (اب) ہے لیکن پھر بھی اگر وہ ہماری طرف سے پیش کردہ خلاف ورزیوں کی تردید چاہیں تو قومی اتحاد کے مسودہ (برائے) سمجھوتہ کو بلاتاخیر قبول کر لیں۔(۱۹۰)

مولانا نورانی نے بھٹو (اور ان کی حکومت) کی غلطیوں کے حوالے سے جن امور کی نشاندہی کی، وہ درج ذیل تھے:

۱۔ مذاکرات کا آغاز کرنے میں حکومت کی جانب سے غیر ضروری تاخیر کی گئی اور قومی

اتحاد کی جانب سے مذاکرات کی پیشکش کو (اگرچہ) ۲۶ مئی (۱۹۷۷ء) کو قبول کرلیا گیا مگر حکومت کے تاخیری ہتھکنڈوں کے باعث بات چیت ۳ جون کو شروع ہوسکی۔

۲۔ اس دوران قومی اتحاد کی جماعتوں پر سنگین الزامات عائد کرنے کا سلسلہ (بھی) جاری رہا۔ یہاں تک کہ شاہراہ ریشم بند کرنے کے سلسلے میں قومی اتحاد کے رہنماؤں کے خلاف بے بنیادی پراپیگنڈہ شروع کردیا گیا۔ حالانکہ جب یہ حادثہ ہوا تو قومی اتحاد کی پوری قیادت (مختلف) جیلوں میں تھی۔ اس کا (واضح) مقصد قومی اتحاد کی پوزیشن کو بیرون ممالک میں متاثر کرنا تھا۔

۳۔ ۳ جون کو قومی اتحاد میں شامل جماعتوں کے تین سربراہوں کی رہائی کا اعلان مذاکرات کے (اعلان کے) فوری بعد کردیا گیا۔ مگر اسی رات تین بجے اصغر خان کو رہا کرتے ہوئے شدید بدسلوکی کی گئی۔ مجھے (نورانی کو) رات بھر سفر کرایا گیا۔ کراچی لاکر جیل پہنچا دیا گیا اور ۴ جون کو ساڑھے گیارہ بجے رہا کردیا گیا۔ اگر حکومت کی نیت صحیح ہوتی اور وہ خواہ مخواہ (قومی اتحاد کے رہنماؤں کو) ذہنی اذیت نہ دینا چاہتی تو یہ رہائی ۳ جون کو ہی ہوسکتی تھی۔ یہ تاخیر (اور ایذاء رسانی) بھی وعدہ خلافی کا حصہ ہے کیونکہ ۲۷ مئی سے (رہنماؤں کی رہائی کا) وعدہ کیا جارہا تھا۔

۴۔ مذاکرات کی ہر نشست میں تمام سیاسی نظربندوں کی رہائی کا عہد کیا جاتا رہا اور بھٹو نے باہر جانے سے پہلے یہ اعلان کیا کہ تمام سیاسی نظربند اس تحقیق کے کہ ان پر کیا الزامات ہیں رہا کئے جارہے ہیں۔ اس اعلان کے باوجود اب بھی (۲۸ جون ۱۹۷۷ء تک) ملک بھر میں دس ہزار افراد جیل میں ہیں اور قومی (اتحاد کے) رہنماؤں میں مولانا عبدالستار خان نیازی اور جنرل (امیر عبداللہ خان) نیازی کو رہا نہیں کیا گیا۔

۵۔ مذاکرات کے دوران حکومت نے چوہدری ظہور الٰہی، محمد صالح الدین، حنیف رامے اور خواجہ خیرالدین ☆ کو رہا کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر وہ ایفاء نہ ہوسکا۔

☆ خواجہ خیرالدین بعد میں لاپتہ ہوگئے تھے اور مارشل لاء کے نفاذ کے کئی دن بعد گھر پہنچے تھے۔ ان کے بقول انہیں حکومتی کارندوں نے رن آف کچھ میں چھوڑ دیا تھا جہاں سے وہ طرح طرح کے مصائب جھیلنے کے بعد گھر پہنچے تھے۔

اس طرح ٹریبونل کی سزاؤں کے خاتمے کا مسئلہ (بھی) زیر بحث آیا جس سے (یقیناً) سعید حسن اور ان کے ساتھی اور ان جیسے (کئی) نظربند رہنما رہا ہو جاتے مگر عمل ندارد۔

۶۔ سمجھوتہ کے اعلان کے بعد جناب بھٹو نے جان بوجھ کر تاخیر کی اور (۱۷ تا ۲۳ جون) بیرون ملک چلے گئے۔

۷۔ پیرزادہ نے پیپلز پارٹی لاہور کے کنونشن میں سمجھوتے اور مذاکرات کی جزئیات کا توڑ مروڑ کر اعلان کیا اور یوں سمجھوتے کی کھلی خلاف ورزی کی۔

۸۔ مذاکرات کے دوران انتظامی ڈھانچے میں تبدیلیوں پر جو اصولی اتفاق ہوا تھا۔ اس کے پیش نظر حکومت کو اپوزیشن کے نقطہ نظر کا بخوبی احساس تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر کھر جیسے شخص کو مشیر نامزد کیا۔ بڑے پیمانہ پر افسروں کے تبادلے کئے۔ ایک ایسے شخص کو سندھ ہائیکورٹ کا ایڈیشنل جج ☆ بنایا جس پر انتخابی بدعنوانیوں کا سنگین مقدمہ چل رہا تھا۔

۹۔ سمجھوتے سے قبل بھٹو نے جو تقریر کی اس سے اپوزیشن پر اشتعال انگیز الزامات لگائے اور سمجھوتے کے فوراً بعد فضا کو دھماکہ خیز بنانے کی کوشش کی۔

۱۰۔ مذاکرات میں قدم قدم پر تعطل پیدا کیا گیا اور پیرزادہ۔ غفور (سب) کمیٹی میں مسٹر پیرزادہ نے سمجھوتے کے بنیادی اصولوں سے انحراف کرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ اسمبلیوں کو توڑنے کی جس تاریخ پر اتفاق رائے ہوگیا تھا اسے بدلنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی سپریم کونسل (جس کے قیام کی تجویز خود حکومت نے پیش کی تھی) کو بے اختیار رکھنے پر زور دے کر اس بنیادی سمجھوتہ اور اتفاق رائے کو مسخ کردیا۔

۱۱۔ مذاکرات کی حالیہ نشستوں میں قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم کا رویہ بحران کو حل کرنے کی طرف پیش قدمی تھا جبکہ پی پی کی ٹیم مذاکرات کو غیر معینہ مدت تک چلانا چاہتی تھی۔

۱۲۔ مصطفیٰ کھر نے حزب اختلاف کو کچلنے کی دھمکیوں سے اپنے عہدے (بطور گورنر

☆ مولانا نورانی نے اس ایڈیشنل جج کا نام پردہ اخفاء میں رکھا۔

پنجاب) کی مدت کا آغاز کیا اور اس طرح بلی (جلد ہی) تھیلے سے باہر آگئی۔

۱۳۔ کراچی اور لاہور میں تشدد کے حالیہ واقعات بھی حکومت کے عزائم کو بے نقاب کر رہے ہیں۔(۱۹۱) ☆

حکومت کو بہرطور، پاکستان قومی اتحاد کا پیش کردہ مسودہ قبول کرنا پڑا اور غفور۔ پیرزادہ کمیٹی نے اس پر یکم جولائی کے اجلاس میں تین گھنٹہ تک غور وخوض کیا جبکہ حکومت کی مذاکراتی ٹیم نے بھی سمجھوتہ کا جائزہ لیا۔(۱۹۲)

مولانا نورانی نے ایک بار پھر واضح کیا کہ آزادانہ انتخابات کی ضمانت کے بغیر دوبارہ انتخابات کا عمل بے معنی ہوگا۔(۱۹۳)

بارہواں دور:

بالآخر وہ دن بھی آگیا جب تمام اختلافات طے ہوئے۔ ۲ جولائی ۱۹۷۷ء کو مذاکرات کے بارہویں دور میں حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان معاہدہ ہوگیا۔ اتحاد کے نمائندہ پروفیسر غفور احمد نے واضح طور پر کہا کہ قومی اتحاد کی مرکزی کونسل آج (۲ جولائی کی) صبح نو بجے اپنے اجلاس میں معاہدہ کی توثیق کردے گی جبکہ حکومتی نمائندہ مولانا کوثر نیازی نے یہاں تک پرامیدی ظاہر کی کہ "اب ہم معاہدہ پر دستخط کے لیے ملیں گے۔" (۱۹۴)

مذاکرات کی یہ طویل ترین نشست (جو یکم جولائی رات آٹھ بجے سے شروع ہوئی اور ۲ جولائی کی صبح چھ بج کر پچیس منٹ تک جاری رہی اور اس طرح بات چیت کا دورانیہ دس گھنٹے اور پچیس منٹ رہا) ملکی تاریخ کی بھی ریکارڈ طویل نشست تھی۔ سمجھوتہ کے تمام پہلو زیر بحث لائے گئے اور تمام امور پر اتفاق رائے ہوگیا۔(۱۹۵)

مثال کے طور پر:

۱۔ سمجھوتہ ہونے کی صورت میں قومی اور صوبائی اسمبلیاں ۱۵ جولائی کو توڑ دی جائیں گی۔

۲۔ بلوچستان سے فوج، دستخط ہونے کے ۴۵ دن کے اندر واپس بلالی جائے گی۔

☆ کراچی میں قومی اتحاد کے جلوس پر حملہ، لاہور میں فائرنگ سے دو درجن کے لگ بھگ افراد کو زخمی کرنا، ملتان میں مولانا حامد علی خان کے جلوس میں پولیس وین کا مولانا غوث محمد جیلانی کی گاڑی کو ٹکر مار کر تباہ کرنا: ثابت کرتی تھی کہ حکومت مذاکراتی عمل میں کس حد تک سنجیدہ اور مخلص تھی۔

۳۔ وزیراعظم بھٹو، سمجھوتہ پر عملدرآمد کرانے والی کونسل کے چیئرمین ہوں گے وغیرہ۔

حکومت اس وقت اخلاقی طور پر بری طرح پھنس چکی تھی۔ صرف معاہدے پر دستخط ہونا باقی تھے۔ پاکستان قومی اتحاد نے حکومتی فرار کے تمام راستے بالآکر مسدود کردیئے تھے۔ بھٹو کا یہ قول سچ ہونے جارہا تھا کہ بعض اوقات تاریخ فاتح کے لیے المیہ بن جاتی ہے۔ بھٹو کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ معاہدے پر دستخط کردیتے یا اپنی روایتی ہٹ دھرمی کو جاری رکھتے ہوئے معاہدے سے ہی مکر جاتے۔ چنانچہ انہوں نے موخرالذکر اقدام پر ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا اور قومی اتحاد پر روایتی الزام تراشی کا سلسلہ ایک بار پھر شروع کردیا۔

انہوں نے پاکستان قومی اتحاد پر اس مرحلہ پر الزام عائد کیا جب اس کی کوئی منطقی وجہ نہیں تھی اور جسے کوئی بھی ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ الزام یہ تھا کہ معاہدہ ہو جانے کے بعد حزب اختلاف کی مذاکراتی ٹیم مزید دس نکات لے کر آگئی تھی۔ (۱۹۶) حالانکہ ہر نکتہ اور ہر لفظ پر پوری بحث ومباحثے کے بعد سمجھوتہ ہوا تھا۔ صرف دستخط ہونا باقی تھے۔ بھٹو کے اس اقدام نے نہ صرف قومی اتحاد بلکہ پوری قوم کو مشکل میں ڈال دیا۔ قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود نے اعلان کیا کہ بھٹو ثابت کریں کہ ہماری طرف سے نئے نکات پیش کئے گئے تھے۔ مضبوط تحفظات کے بغیر منصفانہ انتخابات کرانا ممکن نہیں۔ جن نو (یا دس) نکات کا الزام لگایا جارہا ہے یہ پہلے مسودہ اور نظرثانی شدہ مسودے میں شامل ہیں۔(۱۹۷)

اس مرحلہ پر مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ جاری صورتحال کی تناظر میں قومی اتحاد میں کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوگا۔ اتحاد متحد اور قائم ہے اور ہر قیمت میں قائم رہے گا۔ (جہاں تک اتحاد کے اندر یا اتحاد کے باہر حکومت کے ساتھ) اختلاف رائے (کا تعلق ہے یہ) جمہوریت کی نشانی ہے اور اسلامی اصول کے مطابق ہے مگر قومی اتحاد کے رہنماؤں اور ہائی کمان میں کوئی اختلاف نہیں (حالات چاہے جو بھی رخ اختیار کریں) موجودہ صورتحال قانونی ماہرین کے اٹھائے گئے بعض نکات کے باعث پیدا ہوئی اور (ہم محض یہ چاہتے ہیں کہ معاہدے میں) ایسا کوئی قانونی سقم (باقی) نہ رہے جس کے باعث سپریم کونسل کے اختیارات متاثر ہوں یا معاہدے پر عملدرآمد میں کوئی دشواری ہو یا پھر انتخابی مہم کے دوران اور انتخابات کے بعد کوئی

ناخوشگوار صورتحال پیدا ہو۔ (۱۹۸)

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق نے ۵ جولائی کی رات مارشل لاء نافذ کردیا اور جب ''ساری جاتی دیکھیئے تو آدھی دیجیئے چھوڑ'' والی کہاوت پر عملدرآمد شاید بھٹو حکومت کی قسمت میں نہیں تھا۔ ایک ایسی طویل سیاہ رات کا آغاز ہوا جس نے ملکی تاریخ پر آگے چل کر نہایت گہرے اثرات مرتب کیئے۔

حکومت۔ اتحاد مذاکرات......ایک جائزہ

سات مارچ کو ملک بھر میں قومی اسمبلی کے انتخابات کے انعقاد کے بعد سرکاری نتائج کے خلاف عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان قومی اتحاد نے بطور احتجاج تحریک چلانے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کے پہلے ہی مرحلے میں قومی اتحاد نے صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ کردیا اور ملک کے بڑے شہروں اور قصبوں میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جلوسوں، جلسوں اور مظاہروں کا جو لامتناہی سلسلہ جاری ہوا۔ اس احتجاج نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ حکومت کے خلاف چلائی جانے والی تحریک ہمہ گیر اور موثر بن گئی۔ تحریک میں خواتین، وکلاء، علماء اور طلباء سمیت عوام کے مختلف طبقوں کی طرف سے بیلٹ بکس کے تقدس اور آئندہ انتخابات میں دھاندلیوں اور تشدد کے تمام تر امکانات ختم کرنے کے لیے اپنے بے پایاں جذبات کا اظہار کیا گیا اس تحریک کے دوران میں قیمتی جانیں کام آئیں۔ ہزاروں افراد زخمی ہوئے بے تحاشا سیاسی کارکن گرفتار کیئے گئے اور بے پناہ مالی نقصانات اٹھائے گئے۔ پولیس اور دیگر ایجنسیوں نے تحریک کو دبانے کے لیے انتہائی کوشش کی مگر اس کی شدت نے حکومت کو مجبور کردیا کہ وہ تحریک چلانے والوں کے مطالبات پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ بالآخر حکومت نے تحریک کی شدت کا احساس کرتے ہوئے مذاکرات کی ضرورت کو محسوس کرلیا۔ شروع میں سیاسی حلقوں میں اس قسم کی افواہیں گشت کرتی رہیں کہ حکومتی اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات کرانے کے لیے چند معروف ریٹائرڈ سیاست دانوں کی خدمات حاصل کی جارہی ہیں مگر جن سیاست دانوں کا نام لیا گیا انہوں نے خود ہی مذاکرات کے سلسلے میں اپنی خدمات کے بارے میں معذرت کردی۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پچھلے چند سال کے سیاسی عمل نے سیاست سے دلچسپی رکھنے والی کسی قدآور شخصیت کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اپنی غیر جانبداری کا بھرم رکھ کر کسی وقت بحران کی صورت میں اپنا کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ پاکستان کی سنگین سیاسی صورتحال نے بالآخر برادر مسلم ممالک کی

سوچ بچار کرنے پر مجبور کردیا اور انہوں نے اپنے نمائندوں کے ذریعے فریقین کے درمیان مذاکرات کی ترغیب دی فلسطینی رہنما یاسر عرفات نے اپنے ایلچی کو پاکستان بھیجا جنہوں نے پاکستان بھیج کر مذاکرات کی راہیں ہموار کرنے کا کردار ادا کیا۔ وزیراعظم بھٹو نے قومی اتحاد کے قائدین سے مذاکرات کے لیے سہالہ ریسٹ ہاؤس کا انتخاب کیا اور یہ مقام چند روز تک ملک کے سیاسی حلقوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا مگر کوئی واضح بنیاد فراہم نہ ہونے کے باعث سہالہ مذاکرات کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکے اور جن راہنماؤں کو سہالہ ریسٹ ہاؤس لے جایا گیا تھا ان میں سے قومی اتحاد کے مرکزی صدر مولانا مفتی محمود کے سوا باقی تمام رہنماؤں کو ملک کی مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا اور اس طرح مذاکرات میں تعطل پیدا کرنے کے بعد پاکستان کا سیاسی بحران زیادہ سنگین شکل اختیار کرگیا۔ اس دوران قومی اتحاد میں شامل ایک جماعت مسلم کانفرنس کے نظر بند سربراہ سردار عبدالقیوم سے خدمات حاصل کی گئیں اور انہیں مذاکرات کی بنیاد بھی فراہم کردی گئی۔ سردار صاحب نے فریقین میں مذاکرات کے لیے جو کردار ادا کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ آزاد کشمیر کے اس سابق صدر کو ایک منصوبے کے تحت آزاد کشمیر کے عالم انتخابات میں جس طرح ناکام بنایا گیا وہ ملک کے سیاسی حلقوں سے ہرگز پوشیدہ نہیں۔ لیکن چوہدری غلام عباس مرحوم جیسے عظیم محب وطن کے جانشین کی حیثیت سے مذاکرات شروع کرانے میں جو کاوش انہوں نے کی اسے ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سردار صاحب کی ان خدمات کا اعتراف خود حکومتی حلقوں نے بھی کیا۔ مذاکرات کی بنیاد فراہم ہو جانے کے بعد سردار عبدالقیوم نے قومی اتحاد کے آٹھ نظر بند رہنماؤں مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان، پروفیسر غفور احمد، ایئر مارشل (ر) اصغر خان، میاں طفیل محمد، مولانا شاہ احمد نورانی، سردار شیر باز خان مزاری اور خان محمد اشرف خان سے جیلوں میں ملاقاتیں کیں۔ سردار صاحب نے لاہور میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے بھی بات چیت کی اور اس طرح قومی اتحاد کے قائم مقام صدر پیر صاحب پگاڑا سے بھی طویل مذاکرات کئے۔ قومی اتحاد کے قائدین نے مذاکرات کی بیاد فراہم ہونے پر حکومت سے مذاکرات کے لیے اظہار آمادگی کردیا۔

مذاکرات شروع کرانے میں پاکستان میں سعودی عرب کے سفیر جناب ریاض الخطیب نے بڑا ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک طرف سعودی سفیر نے فریقین میں سمجھوتہ کرانے میں مذاکرات کی راہیں ہموار کیں اور دوسری طرف ان مذاکرات کے بارے میں وہ سعودی

فرمانروا شاہ خالد کو بھی مسلسل آگاہ کرتے رہے۔ جناب ریاض الخطیب نے فریقین پر واضح کردیا تھا کہ دنیا بھر کے دردمند مسلمانوں کی خواہش تھی کہ اسلام کے نام پر معرض وجود میں آنے والے اس ملک میں موجود سیاسی بحران جلد از جلد ختم ہو جائے۔ سعودی عرب نے پاکستان کے لیے جس غایت درجہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے اس کے پیش نظر یہ بات بلاخوف و تردید کہی جاسکتی ہے کہ سعودی عرب وطن عزیز کی ترقی وخوشحالی میں شاندار کردار کا مظاہرہ کررہا ہے۔

آزاد کشمیر کے سابق صدر سردار عبدالقیوم کی قومی اتحاد کے رہنماؤں سے ملاقاتوں کے مثبت نتائج سامنے آئے اور قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود نے ۲۶ مئی کو ہی وزیراعظم بھٹو کو آگاہ کردیا تھا کہ وہ ان سے مذاکرات کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر وزیراعظم نے اپنے اہم ساتھیوں سے صلاح مشورے کے لیے ۳ جون کی تاریخ مقرر کردی۔ ۳ جون تک وزیراعظم نے اپنے وفاقی وزراء، چاروں صوبوں کے انتظامی سربراہوں، فوجی جرنیلوں اور پیپلز پارٹی کے ارکان قومی اسمبلی سے صلاح مشورے کئے اور سیاسی بحران ختم کرنے کے سلسلے میں انہیں اعتماد میں لیا۔ دوسری جانب حکومت نے قومی اتحاد کے قائدین کو صلاح مشورے کے لیے رہا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ پیر صاحب پگاڑا اور سردار عبدالقیوم کے سوا قومی اتحاد کے باقی سات قائدین اور سیکرٹری جنرل نظر بند رہے۔ مذاکرات سے صرف ایک روز قبل مذاکرات کمیٹی کے تین ارکان مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد کو رہا کیا گیا۔ جبکہ باقی رہنماؤں کو مذاکرات کے دوران رہا کیا گیا۔ مذاکرات کے آغاز سے قبل ہی مولانا مفتی محمود نے حکومت پر واضح کردیا تھا یہ مذاکرات کے دوران ملک کے سیاسی ماحول کو پرامن اور خوشگوار رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ تحریک کے دوران تمام نظر بند سیاسی اسیروں کو رہا کردیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ۳ جون کو مذاکرات کے آغاز سے دو گھنٹے قبل صدر راولپنڈی کی ایک جامع مسجد میں خطبہ جمعہ دیتے ہوئے حکومت کو پیشکش کی تھی کہ اگر حکومت سیاسی اسیروں کو رہا کر دے تو وہ پورے ملک میں امن بحال کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہیں۔

قومی اتحاد اور حکومت کے مابین مذاکرات کی تاریخ کا اعلان ہونے کے بعد وفاقی دارالحکومت سارے ملک کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ یکم جون کو ہی ملک بھر سے ہزاروں سیاسی کارکن راولپنڈی پہنچ گئے۔ ملکی اور غیر ملکی اخبار نویسوں کی بہت بڑی تعداد مذاکرات کی خبروں

کے سلسلے میں شہر کے مختلف ہوٹلوں اور رہائشگاہوں میں مقیم رہے۔ دو ہفتے تک سارا ملک فریقین کے مابین مذاکرات کے نتائج کے بارے میں گوش برآواز رہا۔ پچھلے تیس سال (۱۹۷۷ء تک) کے دوران راولپنڈی سیاسی طور پر اتنا مصروف اور پررونق نہیں رہا تھا حتیٰ کہ ایوب خان کے ساتھ جمہوری مجلس کے رہنماؤں کے مذاکرات میں بھی اتنی گہما گہمی نہیں تھی جتنی ان مذاکرات کے دوران دیکھنے میں آئی۔ ایک طرف فریقین میں مذاکرات ہو رہے تھے اور دوسری جانب قومی اسمبلی کا رواں بجٹ سیشن بھی جاری تھا۔ اس دوران پیپلز پارٹی نے بھی وفاقی دارالحکومت میں اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں اور پیپلز پارٹی کے صوبائی سربراہوں کا اجلاس بھی راولپنڈی میں منعقد ہوا۔ فریقین کی طرف سے مذاکرات میں حصہ لینے والے حضرات کے ناموں کا اعلان پہلے ہی کردیا گیا تھا۔ بھٹو کے ساتھ دو وفاقی وزراء عبدالحفیظ پیرزادہ اور مولانا کوثر نیازی تھے جبکہ قومی اتحاد کی مذاکراتی کمیٹی مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصراللہ خان اور پروفیسر غفور احمد پر مشتمل تھی۔ مولانا مفتی محمود اور نوابزادہ نصراللہ خان رہائی کے بعد اسلام آباد میں ہل روڈ پر واقع پیر صاحب پگاڑا کی رہائشگاہ پر سیاسی سرگرمیاں ختم ہوگئیں اور ایف ۷/۴ کے علاوہ پی ڈی پی کے ایک خاموش رہنما چوہدری محمد ارشد کی رہائشگاہ قومی اتحاد کی سیسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ مولانا مفتی محمود اور نوابزادہ نصراللہ خان یہیں رہائش پذیر تھے۔ مذاکرات سے ایک روز قبل رات گئے تک قومی اتحاد کی مذاکرات کمیٹی کے ارکان اس بات سے بے خبر رہے کہ مذاکرات کے لیے کون سا مقام منتخب کیا گیا ہے تاہم اگلے روز قومی اتحاد کے قائدین کو آگاہ کیا گیا کہ مذاکرات ایوان وزیراعظم میں پانچ بجے شروع ہوں گے۔ ۳ مارچ کو قومی اتحاد کی مذاکرات کمیٹی کے ارکان کو کارکنوں کے ایک جلوس کے جلو میں ایوان وزیراعظم لے جایا گیا۔ فریقین میں اڑھائی گھنٹے تک باضابطہ مذاکرات ہونے کے بعد مولانا کوثر نیازی اور پروفیسر غفور احمد نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں بتایا گیا کہ اتحاد کے نظر بند قائدین ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان، مولانا نورانی اور خان اشرف کو رہا کردیا گیا ہے اس کے علاوہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے والے اسیروں کی رہائی کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔ مشترکہ بیان میں فریقین کی طرف سے اپیل کی گئی کہ مذاکرات کے دوران میں مظاہروں جلسوں اور جلوسوں کو معطل کردیا جائے اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ مزید گرفتاریاں عمل میں نہیں لائی جائیں گی اور نہ نئے مقدمات قائم کئے جائیں گے۔ مذاکرات کے پہلے روز ہی اخبارات

پر سے سنسر شپ بھی اٹھالیا گیا اور یوں مذاکرات کو پیر پر ملتوی کردیا گیا۔ مذاکرات کے دوسرے راؤنڈ سے ایک روز قبل رات کو مولانا مفتی محمود کی رہائش گاہ پر قومی اتحاد کے مرکزی رہنماؤں کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں مذاکرات کے دوسرے مرحلے کے خفیہ ایجنڈے کے بارے میں صلاح مشورے کئے گئے۔ پیر ۶ جون جب فریقین میں مذاکرات شروع ہوئے تو حکومت کی طرف سے بنیادی مسئلے کے حل کے لیے دو فارمولے پیش کئے گئے تاہم ان فارمولوں سے اخبار نویسوں کو آگاہ نہ کیا گیا حکومت نے قومی اتحاد کے رہنماؤں کو آگاہ کردیا کہ وہ دونوں میں سے کسی بھی فارمولے پر اتفاق کرکے حکومت کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیں۔ دو فارمولوں میں سے ایک فارمولا ملک میں دوبارہ پولنگ اور دوسرا فارمولا دوبارہ انتخابات کے بارے میں تھا۔ دوبارہ پولنگ کی صورت میں ان نشستوں پر دوبارہ انتخاب کرایا جانا تھا۔ جہاں وسیع پیمانے پر دھاندلیوں کا ارتکاب کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان نشستوں پر دوبارہ انتخاب کرائے جاتے جہاں پیپلز پارٹی کے امیدوار بلامقابلہ منتخب قرار دیئے گئے تھے۔ جبکہ دوبارہ انتخابات کے فارمولے کا مطلب قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ کر ملک میں ازسرنو انتخابات منعقد کرانا مقصود تھا۔ دونوں فارمولوں کے بارے میں قومی اتحاد کے قائدین کا ایک اہم اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا مفتی محمود نے کی۔ بڑے غور و فکر کے بعد قومی اتحاد نے دوبارہ پولنگ کا فارمولا مسترد کردیا جبکہ ملک میں ازسرنو انتخابات منعقد کرانے کا دوسرا فارمولا منظور کرلیا گیا اور ۷ جون کو قومی اتحاد کی مذاکرات کمیٹی نے حکومت کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کردیا۔ قومی اتحاد نے دوبارہ پولنگ کے فارمولے کو محض اس لیے مسترد کردیا تھا کہ اس سے نہ صرف قومی اتحاد کے کارکنوں میں تحریکی جذبہ مفقود ہوجاتا بلکہ بلوچستان میں بھی انتخابی معرکہ آرائی نہیں ہوسکتی تھی جہاں حالیہ انتخابات میں قومی اتحاد نے بوجوہ قومی اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا۔

۷ جون کے مذاکرات میں ملک میں ازسرنو انتخابات کرانے کی تفصیلات طے کرنے کے لیے وفاقی وزیر مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ اور پروفیسر غفور احمد پر مشتمل ایک سب کمیٹی قائم کردی گئی۔ قومی اتحاد نے ملک میں ازسرنو انتخابات کرانے کے سلسلے میں سفارشات تیار کرنے کے لیے ماہرین قانون پر مشتمل ایک سب کمیٹی تشکیل دی۔ ماہرین کی اس قانونی کمیٹی میں بیرسٹر ظہور الحق، ایس ایم ظفر، خالد اسحاق، مسٹر عامر رضا، اے خان، ایم انور، مرزا

عبدالغفور بیگ، نسیم فاروقی، سید احمد یوسف، رانا عبدالرحیم اور چوہدری محمد اسماعیل کو شامل کیا گیا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب قومی اتحاد نے ملک میں تحریک چلائی تھی اس وقت قومی اتحاد نے وزیراعظم بھٹو اور چیف الیکشن کمشنر کے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا تھا۔ قومی اتحاد کا موقف تھا کہ وزیراعظم اور چیف الیکشن کمشنر نے ملک میں منصفانہ اور آزادانہ طور پر انتخابات منعقد کرانے کی آئینی ذمہ داریاں پوری نہیں کیں اس لیے انہیں مستعفی ہو جانا چاہیے لیکن جب قومی اتحاد کے مرکزی قائدین کو مذاکرات کی بنیاد مہیا کی گئی تو اس میں ان قائدین کو یقین دلایا گیا تھا کہ ملک میں ازسرنو انتخابات کی صورت میں دھاندلیوں کے تمام تر امکانات کو ختم کر دیا جائے گا اور بیلٹ بکس کے تقدس کو ہرگز پامال نہیں ہونے دیا جائے گا چنانچہ مذاکرات کے دوران قومی اتحاد کے لیڈروں نے ملک میں آزادانہ ماحول میں دوبارہ انتخابات کے انعقاد کی ضرورت کو ہر چیز پر مقدم رکھا۔ شروع میں قومی اتحاد نے دھاندلیوں کے امکانات مٹانے کے لیے مرکز میں عبوری حکومت میں اپنی نمائندگی کی ضرورت کو بھی محسوس کیا تھا مگر بعد میں یہ تجویز اس بناء پر واپس لے لی گئی کہ اگر عبوری حکومت میں حصہ دار بننے کے باوجود آئندہ انتخابات میں دھاندلیاں کی گئیں تو پھر دھاندلیوں کے بارے میں صرف حکومت کو ہی مورد الزام ٹھہرانا مشکل ہو جائے گا اور دوسرے عبوری حکومت میں شامل ہونے کی صورت میں قومی اتحاد آئندہ انتخابات میں متوقع کامیابیاں حاصل نہ ہو پاتیں اور مخالف فریق کو طعنہ زنی کا موقع مل جاتا کہ اس وقت قومی اتحاد اسلام کے لیے نہیں بلکہ اسلام آباد کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ بہرحال قومی اتحاد کی قانونی کمیٹی نے ملک میں منصفانہ انتخابات کرانے کے لیے اپنی آئینی سفارشات مرتب کیں اور اس بات کی سفارش کی گئی کہ انتخابات کے گویا الیکشن مشینری کو اس قدر مضبوط بنا دیا جائے دوران الیکشن کمیشن کے اختیارات میں اضافہ کر دیا جائے کہ دھاندلیوں کے تمام تر امکانات ختم ہو جائیں اور شہریوں کو کسی خوف، لالچ اور دباؤ کے بغیر اپنے ووٹ کا مقدس حق استعمال کرنے کا موقع مل جائے۔ یہی وجہ تھی کہ قومی اتحاد کی طرف سے اس بات پر زیادہ زور دیا گیا کہ صوبائی وزارتیں ختم کی جائیں اور غیر جانبدار گورنر مقرر کیے جائیں تاکہ وہ صوبوں کے آئینی مگر انتخابات کے دوران بااختیار سربراہ کی حیثیت سے انتخابات میں دھاندلیوں کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف کارروائی کر سکیں۔ پچھلے عام انتخابات کے دوران دھاندلیاں کرانے میں سرکاری افسروں نے جو کردار ادا کیا تھا، اس کے پیش نظر قومی اتحاد نے حکومت پر

واضح کر دیا تھا کہ الیکشن کمیشن کو اس قدر بااختیار ادارے کی شکل دی جائے کہ انتخابی دھاندلیوں کا ارتکاب کرنے والے افسروں کو برطرف کرنے کا اختیار بھی براہ راست کمیشن کو دیا جائے اور کمیشن کے فیصلے کے خلاف کسی افسر کو اپیل کرنے کا حق بھی نہیں ملنا چاہیے بہرحال قومی اتحاد نے ملک میں انتخابی مشینری کو مضبوط بنانے کے لیے جو سفارشات کیں ان کا مقصد اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا کہ اس ملک میں بیلٹ بکس کا تقدس بحال ہونا چاہیے کیونکہ ووٹ کا صحیح استعمال نہ ہونے کے باعث ملک مسلسل سیاسی عدم استحکام کا شکار رہا جس نے اس ملک کے لیے بیشمار اور لاانتہاہی مسائل پیدا کیے۔ اس کے علاوہ قومی اتحاد کا اصرار یہ تھا کہ انتخابات کا انعقاد جلد سے جلد ہو۔ اس کے لیے اتحاد کی جانب سے ماہ رمضان المبارک سے قبل عام انتخابات کرانے پر زور دیا گیا۔ تاہم حکومت کی ٹیم نے سیلاب، ماہ رمضان اور بعض دیگر وجوہات کی باء پر ماہ نومبر کے آخر میں انتخابات کرانے کی پیشکش کی۔ بالآخر ماہ اکتوبر میں انتخابات کرانے پر اتفاق ہو گیا۔

۸ جون کو وفاقی وزیر عبدالحفیظ پیرزادہ اور قومی اتحاد کے مرکزی سیکرٹری جنرل پروفیسر غفور احمد پر مشتمل مذاکراتی سب کمیٹی نے بنیادی مسئلے کے حل کے فارمولے پر غور کیا اور اس میں یہ کمیٹی متعدد امور طے نہ کر سکی۔ ۹ جون کو مذاکرات کے چوتھے مرحلے میں فریقین کے نمائندوں نے بات چیت کی جس میں اسمبلی کو توڑنے اور نئے انتخابات کی تاریخوں کے تعین پر اختلاف پیدا ہو گیا۔ جبکہ اگلے روز ۱۰ جون کے مذاکرات میں عبوری دور میں حکومت کے ڈھانچے وزیراعظم کے اختیارات میں کمی اور دیگر امور پر اختلافات کے باعث فریقین میں اتفاق رائے نہ ہو سکا اور بعض امور پر غور کرنے کے لیے مذاکرات کو دو دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ حکومت کے مذاکرات کمیٹی کے ایک رکن مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے بطور وفاقی وزیر ۱۱ جون کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں بجٹ پیش کرنا تھا۔ ۱۲ جون کو فریقین میں مذاکرات کے چھٹے راؤنڈ پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ۱۴ جون کو مذاکرات کا قطعی نتیجہ سامنے آ جائے گا۔ ۱۴ جون کو فریقین کی طرف سے بتایا گیا کہ حکومت اور قومی اتحاد ملک میں دوبارہ انتخابات کرانے پر متفق ہو گئے تھے۔ ۱۵ جون کو مذاکرات کے آٹھویں راؤنڈ میں اعلان کیا گیا کہ حکومت اور قومی اتحاد میں سمجھوتہ طے پا گیا تھا، تفصیلات طے کرنے کے لیے مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ اور پروفیسر غفور احمد پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ اس سمجھوتے کی تفصیلات...... کے مطابق اکتوبر میں نئے

انتخابات منعقد ہوں گے۔ فریقین نے طے کیا کہ سمجھوتہ پر عملدرآمد کرنے کے لیے اعلیٰ اختیارات کی حامل ایک دس رکنی کونسل ہوگی جس میں فریقین کے پانچ پانچ نمائندے ہوں گے۔ کونسل میں اختلافات کا فیصلہ سپریم کورٹ کے تین ججوں پر مشتمل ایک پینل کرے گا۔ نیا آزاد اور خودمختار الیکشن کمیٹی قائم کیا جائے گا باقاعدہ سمجھوتہ کے بعد قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی جائیں گی۔ سمجھوتہ میں طے کیا گیا کہ صوبوں میں غیر جانبدار گورنر مقرر کیے جائیں گے اور سمجھوتہ کے ساتھ ہی ملک میں ایمرجنسی ختم کردی جائے گی اور ٹریبونل اور خصوصی ٹریبونل ختم کردیئے جائیں گے۔

فریقین کے مابین مذاکرات کے نویں راؤنڈ میں ایک زبانی سمجھوتہ ہوا ہے، لیکن حتمی تحریری سمجھوتہ بھٹو کے بیرون ملک دورے کی وجہ سے ملتوی ہوگیا تھا۔

سمجھوتے کی تفصیلات طے کرنے والی کمیٹی میں بعض امور پر اختلافات، جن میں اسمبلیاں توڑنے کی تاریخ، گورنروں کی برقرار کے سلسلہ میں حزب اختلاف سے مشورہ اور عام انتخابات کے منصفانہ انعقاد کے لیے ضمانتیں شامل تھیں۔ بعض سیاسی حلقوں کے نزدیک کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ تاہم وزیراعظم بھٹو نے مذاکرات کے دسویں راؤنڈ کے بعد اختلافات کو فنی نوعیت کا مسئلہ قرار دیا اور کہا کہ بنیادی امور ان کے دورے پر جانے سے قبل ہی طے ہوچکے تھے۔ دوسری طرف قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل پروفیسر عبدالغفور احمد نے ان اختلافات کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ اختلافات فنی نوعیت کے نہیں بلکہ تفصیلاتی تھے اور تفصیلات بھی اتنی ہی اہم تھیں جتنے کہ بنیادی اصول۔

حکومت اور حزب اختلاف کے مابین باضابطہ رابطے کا آغاز ۲۳ اپریل کو وزیراعظم بھٹو اور قومی اتحاد کی سربراہ مولانا مفتی محمود کے مابین سہالہ ریسٹ ہاؤس میں اڑھائی گھنٹے سے ہوا اس طرح مذاکرات کی مثبت عملی شکل نکلنے میں دو ماہ سے زائد کا عرصہ لگا۔ اس دوران بات چیت ناکام ہوئی۔ وزیراعظم بھٹو نے ریفرنڈم کا اعلان کیا اور بالآخر بات دوبارہ عام انتخابات (یا نئے) کے انعقاد پر آکر ختم ہوئی۔ اپوزیشن اور حکومت دونوں نے کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر کاربند رہتے ہوئے ملک وقوم کی بہتری کے لیے راہ نکالی۔ قومی اتحاد نے وزیراعظم بھٹو کے مستعفی ہونے کے بارے میں اپنے مطالبے پر اصرار کرنا ترک کرکے اسے وقار کا مسئلہ نہ بنایا۔ دوسری طرف وزیراعظم بھٹو نے قومی اسمبلی توڑنے کی حامی بھر کے ملک وقوم کے وسیع تر

مفاد اور عوام کی خواہشات کے سامنے سر تسلیم کم کردیا۔

لیکن اصل چیز سمجھوتہ پر عملدرآمد کرنا تھا اور اس کے لیے جس جرات رندانہ کی ضرورت تھی وہ بھٹو میں مفقود تھی یا زعم اقتدار نے ان کے قویٰ مختل کر رکھے تھے۔ اس ضمن میں جس عالی ظرفی، وسیع القلبی اور بصیرت کا مظاہرہ درکار تھا اس کی زیادہ ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی تھی۔ لیکن مذاکرات کے اس طویل عمل کے دوران ایک طرف جس طرح قومی اتحاد نے سیاسی بصیرت اور صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا وہ قابل ستائش تھا لیکن حکومت نے اسے قومی اتحاد کی کمزوری پر محمول کرتے ہوئے، جب سابق بہانہ سازی اور حیلہ جوئی کو اپنا سیاسی شعار بنائے رکھا۔ ان کے لیے مذاکراتی عمل ''مذاکرات برائے مذاکرات'' ہی کا نام تھا۔ کیونکہ جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا، تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کی شدت میں کمی آتی جارہی تھی۔ حتیٰ کہ مذاکرات کے آخری دنوں میں حالات مجموعی طور پر پرسکون تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب سمجھوتے پر دستخط کرنے کا وقت آیا تو بھٹو، بیرون ممالک دورے پر چلے گئے۔ یہی تاخیری حربے بالآخر سیاسی بساط کے لپیٹے جانے کا باعث بنے۔ ایک مرحلے پر جب حکومتی مذاکراتی نمائندے مولانا کوثر نیازی نے کہا تھا کہ معاہدہ تیار ہے صرف دستخط کرنا باقی ہیں تو ضروری تھا کہ دستخط کر دیئے جاتے۔ لیکن بھٹو نے اسے اپنی سیاسی کمزوری جانا، یہاں تک کہ قومی اتحاد کے رہنماؤں نے ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو بھی حکومت سے دستخط کا مطالبہ کیا کیونکہ اسی دن کابینہ کا اجلاس تھا۔ جس میں جنرل ضیاء الحق کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ ان کی موجودگی بھٹو کابینہ کے لیے حد درجہ اطمینان کا باعث تھی۔ سمندر کی پرسکون سطح پر زیر آب تلاطم کے کوئی آثار نہیں تھے۔ قومی اتحاد کی طرف سے اگر اس موقع پر مارشل لاء کا کوئی تاثر دیا بھی گیا تھا تو چیف آف آرمی سٹاف کی کابینہ میں موجودگی نے اسے زائل کردیا تھا۔ کابینہ کے اجلاس میں جنرل ضیاء الحق نے معاہدہ کی دستاویز کی نقل مانگ لی۔ کابینہ کا ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کا اجلاس، بھٹو حکومت کا آخری اجلاس ثابت ہوا۔ کیونکہ ۵ جولائی کا سورج، قوم کے لیے تیسرے مارشل لاء کا پیغام لے کر آیا۔ یوں مارشل لاء کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی بھٹو حکومت، مارشل لاء کے ذریعے ہی اپنے منطقی انجام کو پہنچی۔

پاکستان قومی اتحاد اور تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ ضیاء دور میں

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے آمرانہ اقدام کے بعد چیف آف دی آرمی اسٹاف جنرل محمد ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کے عہد اقتدار کا تمام ریکارڈ سربمہر کرادیا تاکہ ان کے ریکارڈ کی چھان بین کر کے اسے مناسب وقت پر حسب ضرورت ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف استعمال کیا جاسکے۔ کیونکہ ضیاء الحق بھٹو کے ساتھیوں کو، جو کسی بھی وقت مارشل لاء کے خلاف عوامی تحریک کا باعث بن سکتے تھے، کو اس وقت دبانا از حد ضروری تھا کیونکہ مارشل لاء حکام کے ساتھ تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے واقعات، حالات اور نتائج واضح تھے کہ عوامی غیض کو بعض اوقات مارشل لاء کی سختیاں بھی روک نہیں پاتیں۔ ان حالات میں جنرل ضیاء نے اپنی نشری تقریر میں جہاں ملکی سیاسی حالات کی نزاکت کو ایشو بنایا، وہیں افواج پاکستان کو ملک کا اصل محافظ قرار دیا کیونکہ ہر آڑے وقت میں فوج نے ملک کو بچانے کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔ یہ بات اس لیے بھی صحیح تھی کہ سیاستدانوں نے ہر دفعہ حالات اس نہج پر پہنچا دیے کے فوج کی مداخلت ہر دفعہ ہی فطری دکھائی دی۔

جنرل ضیاء الحق نے ملکی سیاست کے حوالے سے جتنے بھی اقدامات کیے، لاشعوری طور پر ان میں عوامی ردعمل سے بچنے کی ہر ممکن تعبیر کی گئی تھی۔ مثال کے طور پر مارشل لاء کے نفاذ کے محض بائیس دن کے اندر اندر (۲۷ جولائی ۱۹۷۷ء کو) عام انتخابات کا اعلان، انتخابی عمل کو ممکن بنانے کے لیے مختلف مراحل کی انجام دہی، بعد ازاں پہلے احتساب اور پھر انتخاب کا نعرہ، مجلس شوریٰ کا قیام اور ملک کے قوانین کو اسلامی رنگ دینا وغیرہ۔ خواہ کسی بھی اقدام کا تجزیہ کیا جائے، اس کے پس منظر میں تحریکِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا انجانا خوف ضرور موجود تھا۔ اگر قومی اتحاد کے بعض رہنما ابن الوقتی کا مظاہرہ نہ کرتے تو عین ممکن تھا کہ انتخابات اپنے صحیح

وقت پر ہی منعقد کرائے جاتے۔

سیاستدانوں کی کج فہمیوں کی وجہ سے جس طرح جنرل ضیاء الحق نے اپنے نوے دن کے وعدہ کو گیارہ سال تک طول دیا۔ وہ ہماری سیاسی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اگر پانچ جولائی سے قبل جناب بھٹو سمجھوتہ پر دستخط کردیتے تو فوج و انتظامی معاملات میں مداخلت کی راہ ہرگز نہ سوجھتی اور نہ ہی جمہوری عمل رکتا۔

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد قومی اتحاد کے مرکزی رہنماؤں، مولانا شاہ احمد نورانی، بھٹو اور ان کے چیدہ چیدہ ساتھیوں کو حفاظت کے نام پر مری میں زیر حراست رکھا گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے وہاں بعض سیاستدانوں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ جنرل ضیاء نے یقین دلایا کہ ان کی حیثیت اسلام کے ادنیٰ سپاہی اور قوم کے امین کی سی ہے اور وہ اکتوبر میں انتخابات کرا کر، اقتدار قوم کے نمائندوں کو سونپ دیں گے۔ قبل ازیں بھٹو۔ اتحاد مذاکرات کا مرکزی نقطہ بھی چونکہ آزادانہ، غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد ہی تھا۔ اس لیے شروع شروع میں سیاستدانوں نے جنرل ضیاء کے اقدامات کو بھٹو کی سیاسی غلطیوں کا ازالہ قرار دیا۔ اس طرح دوبارہ انتخابات کے لیے ملک گیر سطح پر جاری تحریک کا جواز باقی نہ رہا۔ دوبارہ انتخابات جو قبل ازیں (بھٹو، اتحاد سمجھوتہ کے تحت) اگست کے وسط میں ہونا تھے۔ نئے تبدیل شدہ شیڈول کے تحت، اب اکتوبر میں ہونا قرار پائے تھے۔ عوامی سطح پر اس تبدیل شدہ پروگرام کا بھی خیر مقدم کیا گیا۔ کیونکہ اصل عوامی مطالبہ از سر نو انعقاد انتخابات پورا ہو چکا تھا۔ ۲۸ جولائی کو (اعلان انتخابات کے اگلے روز) مولانا شاہ احمد نورانی اور قومی اتحاد کے دیگر رہنماؤں کو رہا کردیا گیا تاکہ وہ انتخابات کے لیے تیاری کرسکیں۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے انتخابات کا وعدہ پورا ہونے پر عوام الناس سے اپیل کی کہ وہ غیر جانبدارانہ انتخابات کے بخیر و خوبی انعقاد کے لیے مارشل لاء انتظامیہ سے مکمل تعاون کریں (۱۹۹) کیونکہ انتخابات کے ذریعے ہی ملک میں جمہوری عمل کو جاری وساری رکھنے میں مدد مل سکتی تھی اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔ اس کے بقول نظام مصطفیٰ ﷺ پاکستان کا مقدر بن چکا تھا اور کوئی طاقت اس کے نفاذ کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی (۲۰۰)۔ قومی اتحاد کے رہنماؤں نے یقین ظاہر کیا کہ قومی اتحاد وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے گا۔ بلکہ جماعت اسلامی کے ممتاز رہنما میاں

طفیل محمد کے بقول، قومی اتحاد بتدریج انضمام کے رستے کی طرف بڑھ رہا تھا، چونکہ اتحاد ایک ہی مقصد اور منزل کے حصول کے لیے قائم کیا گیا تھا، اس لیے اب انتشار کے بجائے اتحاد کو استقرار اور مضبوطی کے راستے پر جاری و ساری رکھنا ضروری تھا (۲۰۱)۔ بلکہ جماعت اسلامی ہی کے سرگرم عمل رہنماء پروفیسر غفور احمد نے تجویز پیش کی کہ جب قومی اتحاد کا پرچم، منشور اور منزل ایک ہی تو پھر کیوں نہ تمام سیاسی پارٹیوں کو ضم کر کے مشترکہ پلیٹ فارم سے سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا جائے۔ انہوں نے مزید کہا کہ (چونکہ اب انتخابات کے انعقاد میں وقت بہت کم تھا اور اس مقصد کے لیے مناسب عرصۂ وقت درکار تھا اس لیے) اس پہلو پر انتخابات کے بعد غور کیا جائے گا۔ (۲۰۲)

جنرل ضیاء الحق کے نزدیک قومی اتحاد کی مضبوطی آمریت کے مستقبل کے لیے مستقل خطرہ تھی اس لیے اس کا توڑ کیا جانا ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے قومی اتحاد کی صفوں میں اپنے حامی تلاش کیے جانے ضروری تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے قومی اتحاد کے رہنماؤں سے روابط بڑھانے شروع کر دیئے۔ حکومتِ وقت کی طرف سے نرم پالیسی نے بعض سیاستدانوں کو حکومت سے قریب کر دیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی ان رابطوں کے خلاف تھے کیونکہ غیر منتخب حکومت سے مفاہمت، بالآخر سیاستدانوں پر عوامی اعتماد کے تزلزل کا باعث تھی۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے اس صورتِ حالات کا سختی سے نوٹس لیا اور قومی اتحاد کے رہنماؤں کو یاد دہانی کرائی کہ حکومت وقت سے ایسے رابطے بڑھانا قومی اتحاد کے منشور کو صریحاً خلاف ورزی تھی۔ کیونکہ پالیسی امور کے متعلق تمام فیصلوں کے لیے باہمی اتفاق رائے ہونا ضروری تھا۔ جو بالآخر قومی اتحاد کے لیے نقصان دہ تھا۔ قومی اتحاد کے بعض رہنماؤں کے سامنے سابقہ مارشل لاء ادوار کے تجربات عیاں تھے۔

اس لیے وہ در پردہ مارشل لاء کے حمایت کا فیصلہ کر چکے تھے۔ بلکہ بعض رہنماؤں نے انتخابات کے التواء کا مشورہ بھی دیا۔ جنرل ضیاء ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے۔ اس لیے انہوں نے ''پہلے احتساب پھر انتخاب'' کے مشورے کو پسند کیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے اسے ایک غلط فیصلہ قرار دیا۔ حالانکہ احتساب کا عمل ایک منتخب حکومت، عدالتی طریقے سے بطریق احسن سرانجام دے سکتی تھی۔ ان حالات میں جلتی پر تیل کا کام مری سے ذوالفقار علی بھٹو کی رہائی نے کیا۔ مارشل لاء حکومت نے یہ پتہ عین موقع پر کھیلا کیونکہ رہائی کے بعد لاہور

اور کراچی میں بھٹو کے عوامی استقبال نے نہ صرف بھٹو کی سیاسی ساکھ کو فائدہ پہنچایا بلکہ قومی اتحاد پر دباؤ بڑھانے کے لیے بھی کارگر ثابت ہوا۔ اس لیے قومی اتحاد کے اکثر رہنماؤں نے سیاسی جنگ، سیاسی میدان میں لڑنے کی بجائے، میدان سے ہی راہ فرار اختیار کرنے کو ترجیح دی اور مارشل لاء کے سایہ عافیت کو اپنی منزل قرار دیا۔ مولانا نورانی نے ایسے رہنماؤں کو خبردار کیا کہ ایسے اتحاد کے وجود کا کوئی اخلاقی جواز نہیں جو ایک غیر جمہوری، غیر سیاسی، غیر منتخب اور غیر نمائندہ اور مارشل لائی حکومت کا مرید و حامی ہو۔ لہٰذا جمعیت علمائے پاکستان نے تحریری طور پر پاکستان قومی اتحاد کو اپنے مؤقف سے آگاہ کیا۔ اس لیے پاکستان قومی اتحاد کے صدر نے نوابزادہ نصر اللہ خان کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد جمعیت علمائے پاکستان سے اختلافی امور طے کرنا تھا۔ سیاسی مقاصد میں واضح اختلاف، انتشار کو جنم دیتا ہے۔ اس لیے اصولی مؤقف کی بنا پر مولانا شاہ احمد نورانی نے اپنے رفقاء سے باہمی مشاورت کر کے اتحاد سے علیحدگی کا اصولی فیصلہ کرلیا۔ تحریک استقلال تو اتحاد کے رویئے سے نالاں ہو کر اتحاد کو پہلے ہی خیر باد کر چکی تھی۔ جمعیت کی علیحدگی نے پاکستان قومی اتحاد کی بہت بڑی مشکل حل کر دی تھی۔ کیونکہ جنرل ضیاء الحق کے آئندہ اقدامات از قسم مجلس شوریٰ کا قیام اور اسلام کا نام استعمال کرنے کے لیے جس قسم کے افراد چاہیے تھے وہ انہیں بغیر کسی حیل و حجت کے دستیاب تھے۔

بھٹو کی رہائی سے حکومت جو مقاصد حاصل کرنا چاہتی تھی، وہ پورے ہو چکے تھے۔ لہٰذا انہیں آزاد چھوڑے رکھنا نئے مسائل کو جنم دے سکتا تھا۔ حکومت بھٹو کو کسی قانونی جواز کے تحت جیل میں رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر بھٹو کی بے اعتدالیاں اور بد اعمالیاں سامنے آئیں اور انہیں محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ بھٹو نے اپنی حکومت کے آخری دور میں جو آمرانہ رویہ اختیار کیا تھا، اس سے بہت سے پیپلز پارٹی رہنماؤں کو پارٹی سے دل برداشتہ کر دیا تھا۔ گو انہیں وقتی طور پر بھٹو سے اختلاف رائے کی ہمت نہ ہوتی، تاہم ان کی گرفتاری کے بعد انہوں نے نہ صرف سکھ کا سانس لیا بلکہ انہوں نے حکومت کے اس اقدام پر رسمی احتجاج کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ ادھر بچے کھچے قومی اتحاد کی حمایت نے مارشل لاء اقدامات کو حوصلہ بخشا۔ اس طرح ضیاء الحق کے لیے ایک لمبے عرصے کے لیے حکومت کرنا آسان ہوگیا۔ لہٰذا اکتوبر ۱۹۷۷ء میں انہوں نے انتخابات کرانے کے بجائے اسے ایک سال کے لیے مؤخر کر دیا

لیکن اگلے ہی مہینے انہوں نے طلباء اور پیشہ ورانہ تنظیموں کے انتخابات پر پابندی لگا دی۔ اسی مہینے مارشل لاء حکومت کو سپریم کورٹ کی طرف سے بھی حکومت کا قانونی جواز مل گیا۔ جب "بیگم نصرت بھٹو کیس" کا فیصلہ سناتے ہوئے، "نظریۂ ضرورت" کے تحت قانونی قرار دیا اور یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جسے حکومت اگلے کئی سالوں تک سند جواز کے طور پر پیش کرتی رہی حالانکہ اس کیس میں حکومت نے انتخابات کے جلد از جلد انعقاد کو بطور مؤقف پیش کیا تھا چونکہ فیصلہ میں انتخابات کے حوالے سے کسی تاریخ کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔☆۔

مارشل لاء حکومت نے "پہلے احتساب اور پھر انتخاب" کے نعرے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے صرف انہی سیاستدانوں کے خلاف کارروائی کی جو حکومت مخالف تھے یا حکومت کے لیے کسی بھی حوالے سے خطرہ تھے۔ اس طرح نام نہاد احتسابی عمل کئی سالوں تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ پیپلز پارٹی کے وہ رہنما، جو قابل گرفت تھے ضیاء حکومت کی حمیت کر کے، احتسابی عمل کی چھلنی سے بخیر و عافیت گزر گئے۔ بلکہ کئی ایسے افراد جو سیاست میں حصہ لینے کے لیے نا اہل قرار دیئے گئے تھے بعد ازاں جنرل ضیاء کی مجلس شوریٰ کے اراکین بنے۔ ایسے لوگوں کے رویے کے برخلاف مولانا نورانی کا موقف تھا کہ احتساب کرنے والوں کا احتساب ہونا بھی ضروری تھا۔ ان کا ہمیشہ یہ موقف رہا کہ آئین کے خلاف ورزی کرنے والوں کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیے۔ آئین شکنی کی سزا (جو کہ آئین کی دفعہ چھ کہلاتی ہے) مولانا نورانی کی تجویز پر ہی آئین کا حصہ بنی تھی۔ ۱۹۷۸ء کے آغاز میں بھٹو دور کے قائم شدہ حیدر آباد ٹریبونل کو خلاف قانون قرار دے کر ختم کر دیا گیا جس کے نتیجہ میں خان عبد الولی خان اور ان کے ساتھیوں کو رہائی ملی۔ لیکن عبد الولی خان نے بھی مارشل لاء کی حمایت کا راستہ اپنایا۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے جنرل ضیاء الحق سے ایک ملاقات کے دوران، انتخابات ملتوی کرنے اور انتخاب سے پہلے احتسابی عمل کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ مجھے قومی اتحاد کے کئی رہنماؤں نے ہاتھ جوڑ کر انتخابات کے التواء کے لیے کہا ہے...... لیکن جب مولانا نورانی نے زور دے کر ان رہنماؤں کے نام پوچھے تو جنرل ضیاء نے ان کے نام بتانے سے

☆ حکومت نے "بیگم نصرت بھٹو کیس" کے فیصلے کی تعبیر اپنے مفاد، اپنی آسانی اور اپنی صوابدید پر کی۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۵ء تک آٹھ سال حکومت نہایت سہولت سے اس فیصلے کی آڑ میں نکال لیے اور ۱۹۸۵ء میں بھی جب انتخابات کرانے کی نوبت آئی تو وہ بھی غیر جماعتی بنیادوں پر کرائے گئے۔

انکار کیا۔☆۔ انتخابی عمل کو معرض التواء میں ڈالنے کے لیے جنرل ضیاء نے انہی لوگوں کی شہ پر بلدیاتی انتخابات کو عام انتخابات سے پہلے کرانے کا فیصلہ کیا۔ یہاں تک بیشتر سیاستدانوں کی حمایت سے جنرل صاحب نے محض چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہد پر متمکن رہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے ایک قدم آگے صدر پاکستان کی حیثیت سے بھی حلف اٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک کابینہ بنانے کا اعلان کیا گیا جس میں پاکستان قومی اتحاد کی بعض جماعتوں کے وزراء کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اس طرح مسلم لیگ، جمعیت علمائے اسلام، جماعت اسلامی اور پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کے سربراہوں نے اپنی اپنی پارٹیوں کی صف اول کی قیادت کو ضیاء کابینہ کا وزیر بنوا دیا۔ جبکہ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی، تحریک استقلال پاکستان اور جمعیت علمائے پاکستان نے مارشل لاء حکومت کا دست و بازو نہ بن کر جمہوریت پسندی کا ثبوت دیا۔ قبل ازیں ۱۰، اکتوبر ۱۹۷۷ء کی قرارداد کی رو سے قومی اتحاد کے عہدیداروں نے واضح طور پر فیصلہ کیا تھا کہ قومی اتحاد مارشل لاء حکومت کی وزارتیں قبول نہیں کرے گا لیکن اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ (۲۰۳) جمعیت علمائے پاکستان نے نہ صرف اس تمام تر صورتحال سے اپنے آپ کو الگ رکھا اور بریفنگ کے نام پر جنرل ضیاء الحق سے ملاقاتوں کی بھی مخالفت کی۔ بلکہ جمعیت نے عوام الناس سے روابط بڑھانے کو ان ملاقاتوں پر ترجیح دی۔

جنوری ۱۹۷۸ء میں مولانا شاہ احمد نورانی اپنی جماعت کے دیگر عہدیداروں کے ہمراہ شیخوپورہ کا دورہ کر رہے تھے کہ سی ایم ایل اے سیکریٹریٹ سے فون پر مولانا شاہ احمد نورانی سے درخواست کی گئی کہ وہ ۴ فروری کو اسلام آباد میں ہونے والی بریفنگ میں شرکت کریں لیکن مولانا نورانی نے اس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا بلکہ مولانا نے مارشل لاء کے خلاف اپنی مہم جاری رکھی اور ملک کے مختلف حصوں میں دورے کر کے عوام کو بتایا کہ مارشل لاء ملکی مسائل کا حل نہیں اس لیے جمعیت کسی طور پر مارشل لاء کے شانہ بشانہ کھڑی نہیں ہوگی۔ ان کا مقصد نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ ہے نہ کہ حصول اقتدار۔ اس لیے منزل کے حصول تک جدوجہد جاری رکھی جائے گی۔ (۲۰۴)

☆ چونکہ یہ ایک اجتماعی ملاقات تھی، اس لیے اس میں مولانا نورانی کے علاوہ قومی اتحاد کے کئی دیگر رہنما بھی موجود تھے۔ آپ کے پر زور اصرار پر جنرل ضیاء نے ان لوگوں کے نام تو نہ بتائے البتہ اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود اور میاں طفیل محمد کی خاموشی اور نیچی نگاہوں نے معاملہ کسی حد تک واضح کر دیا کہ تحریک کی قیادت کرنے والے اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا نعرہ لگانے والے عنقریب لیلائے اقتدار سے ملاقات کرنے والے ہیں۔

مولانا نورانی کی اس مہم سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے قومی اتحاد کی بعض جماعتیں نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی اصطلاح پر ہی تنقید کرنے لگیں☆۔ نظام مصطفیٰ ﷺ کی اصطلاح مولانا نورانی اوران کی جمعیت کا عطیہ ہے اوراس نظام کو جوتعریف مولانا اوران کی جمعیت نے کی۔ وہی ایک عرصہ تک اور خاص طور پرتحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے دوران مستند سمجھی گئی۔ مولانا شروع ہی سے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے کوشاں رہے(۲۰۵)۔ آخر دم تک انہوں نے اسے نشان منزل قرار دیا۔

''سیاسی معاملات میں مولانا شاہ احمد نورانی سے اختلافات کیا جاسکتا ہے۔ ان کے منشور، ان کی پالیسی اور طرز فکر پر اعتراض کیا جاسکتا ہے لیکن ان پر جمہوریت دشمن قوتوں، غیر آئینی، غیر سیاسی اور غیر نمائندہ حکمرانوں، قوم کے سرپر اپنے آپ کو مسلط کرنے والی متعدد غاصبوں، آمروں، جابروں اور مطلق العنان حکمرانوں کے ساتھ کسی بھی وقت مصالحت، سمجھوتہ یا اقتدار میں شرکت یا شراکت کا الزام نہیں لگایا جاسکتا......''(۲۰۶)

نظام مصطفیٰ ﷺ کے نعرے کے تحفظ اوراپنے سیاسی تاثر کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ رابطہ عوام کے ذریعے صورتحال کی اصلاح کی جاتی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے آل پاکستان سنی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ قبل ازیں حکومت، قومی اتحاد اور میڈیا کی طرف سے جمعیت کش مہم کے جواب میں مولانا شاہ احمد نورانی نے اپنی پوزیشن یوں واضح کی ''ہم پر یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ جداگانہ انتخابات کے فیصلے کے متعلق حکومت کی حمایت کرکے غلط طریقے سے آئینی مسائل کھڑے کرنے کی پالیسی کی حوصلہ افزائی کی ہے...... اس طرح ہم بھی انتخابات کے ممکن التواء کی سازش میں شریک ہوگئے ہیں۔ (یا) ہم نے آئین کے پنڈورا بکس کو دوبارہ کھولنے کی تائید کردی ہے لیکن یہ اصولوں کا معاملہ ہے۔ ہم نے ہمیشہ (سے)

☆ باالفاظ دیگر یہ اصطلاح جمعیت علمائے پاکستان اورشاہ احمد نورانی سے منسوب سمجھی گئی۔ یہی جماعتیں ۱۴ مارچ ۱۹۷۷ء سے لے کر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کا نعرہ بلند کرتی رہی تھیں۔ اب اس سے لاتعلقی کا اظہار کر کے انہوں نے ثابت کردیا کہ ان کا نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نعرہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ جمعیت علمائے پاکستان کا حصہ تھا۔ لیکن اگر جمعیت علمائے پاکستان اور پاکستان قومی اتحاد کے منشور کا سرسری جائزہ ہی لیا جائے تو واضح طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اتحاد کا منشور، دراصل جمعیت علمائے پاکستان کا ہی منشور تھا۔ دونوں دساتیر کے مقابلہ وموازنہ کے لیے دیکھیے ضمیمہ جات۔

جداگانہ انتخابات کی حمایت کی ہے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تیاری کے دوران بھی اس مسئلے پر ہم نے بڑی جدوجہد کی مگر ہماری نہیں سنی گئی۔ اب اگر یہ کام جو یقیناً ایک اچھا کام ہے ہو رہا ہے تو ہم اس کی حمایت ضروری سمجھتے ہیں...... میں مخالفت برائے مخالفت پر یقین نہیں رکھتا۔ جہاں تک انتخابات کا سوال ہے تو یہ نیت کا معاملہ ہے۔ اگر حکومت چاہے تو مارشل لاء کی چھڑی کی مدد سے ہنگامی بنیادوں پر تین مہینے کے اندر رائے دہندگان کی فہرست تیار کرائی جاسکتی ہے۔ جب ۱۹۷۳ء کی مردم شماری چھ مہینے کے اندر ہوسکتی ہے تو ووٹرز لسٹ کا کام تو اس کے نصف سے بھی کم ہے لیکن نام نہاد سول کابینہ میں جو لوگ شریک ہوئے ہیں وہ اس وقت تک انتخابات نہیں کرائیں گے جب تک ان کے ذہن پر ہارنے کا اندیشہ سوار ہے۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے انتخابات بھی انھوں نے اسی اندیشے سے ملتوی کرائے تھے اور جس الیکشن کا عہد کیا جارہا ہے اس کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔ نئی فہرست بنانے کے کام کو طول دیا جائے گا۔ پھر نئی حلقہ بندیوں کے کام میں مہینے لگائے جائیں گے اور اس عرصے میں اقتدار میں شریک سیاسی جماعتیں ہنگامے کھڑے کر کے انتخابات ملتوی کرائیں گے چونکہ یہ جماعتیں کبھی الیکشن نہیں جیت سکتیں۔ اس لیے ان سے انتخابات کرانے کی توقع فضول ہے۔ یہ لوگ اسلام کا نام لے کر چور دروازے سے اقتدار میں آئے ہیں۔ خطرہ یہ ہے کہ کہیں خدانخواستہ لوگ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ شاید نظام مصطفیٰ ﷺ اسی کا نام ہے...... جمہوریت اسلام کی روح ہے اور جمہوریت صرف انتخابات کے ذریعے ہی عمل میں آسکتی ہے۔ (اسے) الگ کر کے اسلامی نظام کے قیام کی کوشش فضول ہوگی۔ یہ اسلام کے ساتھ زیادتی ہوگی اور جنرل ضیاء کی پارٹنر جماعت اسلامی اور مفتی محمود کی جمعیت علمائے اسلام کے لوگ یہی کر رہے ہیں...... سول کابینہ کو اقتدار میں شریک کرنے کا عمل مارشل لاء کو طول دینے کے مترادف ہے...... اس لیے سول کابینہ کے قیام کو خلوص اور نیک نیتی نہیں کہا جاسکتا...... پاکستان کی تخلیق بیلٹ بکس کے ذریعے ہوئی تھی یہ نہ تو کوئی فوجی کارروائی تھی اور نہ ہی اس کی تشکیل میں فوج نے کوئی کردار ادا کیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کو معلوم ہونا چاہیے کہ سپریم کورٹ نے انھیں آئین کو پورے طور پر معطل کرنے کی اجازت نہیں دی اور نہ ہی نظریہ ضرورت' انھیں تیس سال کے دستوری تجربے کے بعد مزید تجربات کر کے قوم کو آزمائش میں ڈالنے کی اجازت دیتا ہے۔ نظریہ ضرورت نے سول حکومت کی بھی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ لوگ آج حکومت میں ہیں جو کبھی جمہوری طریقہ سے حکومت

میں آنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگر یہ الیکشن میں جیت کر اپنے افکار و خیالات ہم پر مسلط کرتے تو یہ جائز بات ہوتی لیکن چور دروازے سے غیر آئینی، غیر جمہوری اور غیر نمائندہ حکومت بنا کر یہ اپنے افکار و خیالات ہم پر مسلط کر کے امن کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں......" (۲۰۷)

جوں جوں پاکستان سنی کانفرنس کی تیاریاں ہونے لگیں، حکومتی حلقوں اور بچے کھچے اتحاد میں تشویش کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ سنی کانفرنس کے انعقاد سے قبل حکومتی حلقوں کی طرف سے مولانا نورانی کو بار بار دعوت دی گئی کہ وہ جنرل ضیاء الحق سے مذاکرات کر کے اپنے مطالبات سے آگاہ کریں۔ اس سلسلے میں وزیر داخلہ محمود اے ہارون کی کوشش قابل ذکر ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح مولانا نورانی جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ جب ان کی طرف سے اصرار بڑھا تو مولانا نورانی نے ملاقات کے لیے آمادگی ظاہر کردی تاکہ عقائد اہلسنت اور جمعیت کے خلاف حکومتی حمایت یافتگان کی سرگرمیوں سے حکومت کو آگاہ کیا جائے۔

سنی کانفرنس کے انعقاد سے قبل سول کابینہ کے بعض وزراء نے اس کے انعقاد کے سلسلے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی بھر پور کوشش کی۔ ان کو خطرہ یہ تھا کہ کہیں یہ خالصتاً مذہبی بنیادوں پر بلائی جانے والی کانفرنس سیاسی سرگرمیوں کے ایک لامتناہی سلسلے کے پیش خیمہ نہ بن جائے۔ کانفرنس کے انعقاد سے چند روز قبل جب وفاقی وزیر برائے مذہبی امور مسٹر افتخار احمد انصاری (جن کا تعلق پاکستان جمہوری پارٹی سے تھا) ملتان آئے تو انہیں مقامی انتظامیہ نے باور کرانے کی کوشش کی کہ سنی کانفرنس کا انعقاد، امن عامہ کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہوگا۔ اس لیے کانفرنس کے روحِ رواں علامہ سید احمد سعید کاظمی کو اس کے انعقاد سے دو روز قبل آگاہ کر دیا گیا کہ اس کی اجازت منسوخ کی جاتی ہے۔ اس صورتحال میں مولانا شاہ احمد نورانی نے خود مارشل لاء حکام سے رابطہ کر کے صورتحال کی سنگینی کا احساس دلایا اور کہا کہ کانفرنس کے انعقاد میں روڑے اٹکانے کی صورت میں نتائج کی ذمہ داری انتظامیہ پر ہوگی۔

حکومتی مخالفت کے باوجود آل پاکستان سنی کانفرنس ۱۶، ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو ملتان میں منعقد ہوئی۔ علامہ سید احمد سعید کاظمی اور مولانا شاہ احمد نورانی کے اس کانفرنس سے خطابات نہ صرف جمعیت کی پالیسیوں کے آئینہ دار تھے بلکہ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے متعلق جمعیت

کے واضح مؤقف پر مبنی ہے۔ تقریب استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے علامہ کاظمی نے کہا: "ہمیں چاہیے کہ متحد ہو کر اسلامی دستور کے نفاذ کے لیے اپنی آواز بلند کریں۔ دستور، اسلام کی عمارت کی بنیاد ہے اور جب بنیاد ہی نہ ہوگی تو عمارت کیسے تعمیر ہوگی اس لیے ضروری ہے کہ مملکت خدا داد میں جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا اسلامی دستور نافذ کیا جائے۔" (۲۰۸)

مولانا شاہ احمد نورانی نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "ہم حضور پر نور ﷺ کے محبت بھرے مشن کو لے کر چل رہے ہیں۔ اولیاء اللہ کا مشن محبت کا مشن ہے۔ یہ پیغام محبت ہے اور جو اولیاء اللہ کے دامن سے وابستہ ہیں وہ فرقہ نہیں...... محبت رسول اللہ ﷺ کا فروغ ہماری سیاست ہے اور یہ سیاست ہمارے دین کا حصہ ہے...... کملی والے آقا ﷺ کی محبت ہمیں نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی محبت میں سرگرداں کیے ہوئے ہے...... جہاں یہ نظام ہوگا...... وہاں ہم ہوں گے ...... سیاست ہمارا مذہب نہیں، سیاست ہمارے دین کا ایک حصہ ہے۔ ہمیں سیاسی میدان میں بات کرنا ہوگی تو کریں گے...... ہمارا مقصد و مشن دہر میں اسم محمد ﷺ سے اُجالا کرنا ہے اور جو اسے فرقہ وارانہ کہتے ہیں۔ انہیں اپنا راستہ مبارک ہمیں اپنا راستہ مبارک...... یہ کہا جا رہا ہے کہ سنی کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ علماء اہل سنت، عوام اہل سنت اپنی طاقت کے مظاہرے سے ہے۔ حکومت پر دباؤ ڈال کر اقتدار اور وزارتیں حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارا مقصد آپ کے سامنے ہے...... اپنے دین اور ایمان کی حفاظت کیجیے تاکہ مقامِ مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ ہو سکے۔ اپنے گھر، اپنے محلّہ اور اپنی بستی میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ نافذ کیجیے اس سرزمین پاکستان کو رسول ﷺ کے نام سے آراستہ کیجیے اور عہد کیجیے کہ انشاء اللہ پاکستان کی سرزمین پر نظامِ مصطفیٰ ﷺ نافذ ہو کر رہے گا۔" (۲۰۹)

آل پاکستان سنی کانفرنس کی کامیابی نے سول کابینہ میں بے چینی پیدا کردی کیونکہ اس ایک بات تو واضح ہو گئی تھی کہ عوام روزِ اول کی طرح، اپنے مطالبہ نفاذ نظامِ مصطفیٰ ﷺ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ کانفرنس کے غالب مذہبی رنگ کی وجہ سے بعض سیاسی حلقے یہ پراپیگنڈہ کرنے لگے کہ سیاسی سطح پر ایسی کانفرنس کا انعقاد کرنا، جمعیت علمائے پاکستان کے لیے ناممکن ہے۔ اس لیے کانفرنس کے فوراً بعد ملتان میں مولانا حامد علی خان کی رہائش گاہ پر فیصلہ کیا جائے گا کہ عنقریب جمعیت کی طرف سے رائے ونڈ (لاہور) میں میلادِ مصطفیٰ ﷺ کانفرنس منعقد کی

جائے گی حکومت کی بھرپور کوشش تھی کہ اس کانفرنس کو ناکام کیا جائے۔☆ حکومت کی طرف سے پیدا کردہ مشکلات کے باوجود مولانا نورانی نے اپنی عوامی رابطے کے پروگرام جاری رکھے اور ۲۵، ۲۶ مارچ ۱۹۷۹ء میں جمعیت علمائے پاکستان کے تحت ہونے والی میلاد مصطفیٰ ﷺ کانفرنس تک اپنا تنظیمی دورہ مکمل کرلیا۔

میلاد مصطفیٰ ﷺ کانفرنس حکومت کے لیے اس لیے بھی ناقابل قبول تھی کہ اس کی وجہ سے عوام کی طرف سے نفاذ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ اور ملک میں عام انتخابات کا مطالبہ شدت اختیار کر رہا تھا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''لوگوں کا خیال ہے کہ پہلے یہ لوگ، (جمعیت علمائے پاکستان) نظامِ مصطفیٰ ﷺ اور مقام مصطفیٰ ﷺ کی بات کرتے تھے۔ اب بات میلادِ مصطفیٰ ﷺ تک جا پہنچی ہے۔ نام مصطفیٰ ﷺ اور مقام مصطفیٰ ﷺ کا وجود محض میلادِ مصطفیٰ ﷺ کا مرہونِ منت ہے...... (موجودہ حکومتی پراپیگنڈہ کے تحت) اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ جمعیت علمائے پاکستان بک گئی ہے یا بک جائے گی (تو وہ صریحاً غلط فہمی میں مبتلا ہے)...... ہمیں بکنے کی ضرورت نہیں ہمارا سودا بار بار نہیں ہوتا ہم بارگاہ مصطفیٰ ﷺ میں بک چکے ہیں۔ ہمارا خریدار کوئی نہیں رہا...... (ہماری کوئی بولی نہیں لگا سکتا۔)...... وقت آرہا ہے کہ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی جو منزل آپ نے متعین کی ہے...... مل کر رہے گی۔(۲۱۰)

جہاں تک عوامی تحریک کے حوالے سے تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا تعلق ہے تو ۱۹۷۸ء اور ۱۹۷۹ء کے عوامی جوش و خروش نے اس کی اہمیت اور عوامی سطح پر مطالبے کی قوت نے ثابت کردی تھی ☆☆۔ لیکن اس منزل کے حصول کے لیے جس قسم کی قوت نافذ درکار تھی

☆ عوام میں مولانا شاہ احمد نورانی کی سیاسی پالیسیوں کو سراہا گیا۔ جس سے کابینہ کی عوامی حمایت کی قلعی کھل گئی۔ اس لیے انہوں نے اقتدار کے بل بوتے پر فرقہ وارانہ تصادم کا پروگرام بنایا۔ اہل سنت کی مساجد پر مسلح قبضے، دل آزار تقاریر کے ذریعے اشتعال انگیزی اور تصادم کا منصوبہ بنایا گیا۔ مارشل لاء حکمرانوں نے جو یو پی اور جماعت اہل سنت کے سیاسی اور مذہبی جلسوں کو درہم برہم کرنے کے لیے کوششیں شروع کردیں تاکہ تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کو ناکام کیا جائے۔ پہلے مرحلہ میں مساجد پر قبضہ کرنے کی مہم شروع کی گئی جبکہ جلسوں کو درہم برہم کرنے کی مہم کا آغاز کوٹ ادو میں منعقدہ جلسہ عام سے شروع کیا گیا جس میں مولانا شاہ احمد نورانی نے خطاب کرنا تھا۔

☆☆ آل پاکستان سنی کانفرنس ملتان منعقدہ ۱۹۷۸ء اور میلادِ مصطفیٰ ﷺ کانفرنس رائے ونڈ (لاہور منعقدہ ۱۹۷۹ء)

وہ جمعیت علمائے پاکستان کے پاس نہیں تھی۔ کیونکہ جمعیت نے کبھی بھی آئین و قانون کے منافی چلنا نہیں سیکھا تھا۔ ملک میں کسی بھی آئین و قانون کی نفاذ کے لیے سیاسی قوت یا ریاستی مشنری درکار ہوتی ہے لیکن قوت اقتدار کے حصول کے لیے سودے بازی کم از کم شاہ احمد نورانی کے لیے ناممکن تھی۔ قومی اتحاد اپنی اصل ہیئت میں تو دسمبر ۱۹۷۷ء میں ہی دم توڑ چکا تھا۔ باقی ماندہ نام نہاد اتحاد مارشل لاء کے زیر سایہ چلا گیا تھا۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ زمام اقتدار سنبھالتے ہی باقی ماندہ قومی اتحاد، تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے دوران کیے گئے وعدے پورے کرتا، مگر عوامی قربانیوں کو پس پشت ڈال کر اتحاد نے محض اقتدار کی خاطر اصول قربان کردیئے تھے۔ اتحاد کے سربراہ بھٹو دور میں تو دوبارہ انتخابات کے مطالبہ کو نہایت شدت سے اٹھاتے رہے تھے لیکن اب اس مطالبہ کو انہوں نے یکسر فراموش کردیا تھا(۲۱۱)۔ جہاں تک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ کا تعلق ہے تو یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس کا نعرہ و مطالبہ جمعیت علمائے پاکستان کی دین تھا اور اس کی منشور کا حصہ تھا(۲۱۲)۔ اس کے لیے قربانیاں بھی سب سے زیادہ اسی کے کارکنوں نے دیں بلکہ بھٹو، اتحاد مذاکرات کے دوران ایک مرحلے پر جب بھٹو نے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کا اعلان کرنے کی پیشکش کی تو اتحاد کی مذاکراتی ٹیم نے کہا کہ ہم نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی نہیں صرف انتخابات کی بات کرنے آئے ہیں۔ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کا کام تو مولانا شاہ احمد نورانی کا ہے(۲۱۳)۔ جہاں تک اتحاد کی خاطر قربانیوں کا تعلق تھا تو چند ایک پارٹیوں کے سوا ہر پارٹی نے کچھ نہ کچھ قربانی دی لیکن جمعیت علمائے پاکستان کا نام اس سلسلے میں سرفہرست تھا۔ جمعیت کی سب سے بڑی قربانی جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا وہ اتحاد کے پہلے سیکریٹری جنرل چوہدری رفیق احمد باجودہ کو ایک غلطی پر نہ صرف اتحاد کے سیکریٹری جنرل کے عہدے سے بلکہ جمعیت علمائے پاکستان کے ابتدائی رکنیت سے بھی خارج کردیا گیا۔ اس طرح جماعت اسلامی کو سیکریٹری جنرل کا عہدہ مل گیا اور اسی کے ساتھ اتحاد میں سازشیں شروع ہوگئیں بلکہ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ اتحاد میں شامل تمام جماعتوں کے انضمام کا اعلان کر کے جماعتوں میں اندرونی اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کی(۲۱۴)۔ جہاں تک اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود کا تعلق تھا وہ اس بات پر مصر تھے کہ سول کابینہ انتخابات کے انعقاد تک مستعفی نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ تو یہاں تک آس لگائے بیٹھے تھے کہ شاید

جنرل صاحب کسی وقت صوبائی وزارتوں کے قیام کا اعلان کر دیں☆ (۲۱۵)۔ لیکن اُنہوں نے واضح کر دیا کہ فی الحال صوبائی وزارتوں کا قیام ممکن نہیں بلکہ کچھ عرصہ تک موجودہ کابینہ کی کارکردگی مانیٹر کی جائے گی اور انہیں بھٹو کے مقدمۂ قتل کے فیصلہ تک انتظار کرنا ہوگا۔ (۲۱۶) جنرل صاحب کا خیال تھا کہ بھٹو کہ مقدمہ قتل کے فیصلے۔ کے بعد ملک کی سیاسی صورتحال کا اندازہ لگانے کے بعد ہی ان وزارتوں کو قائم کرنے کا فیصلہ کیا جاسکتا تھا۔ (۲۱۷)

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یہ محسوس کرتے تھے کہ سول کابینہ کے قیام کے بعد ان کی سیاسی مخالفتوں میں اضافہ ہوا تھا اور ایسے مرحلہ پر جبکہ سابق وزیر اعظم بھٹو پر مقدمہ قتل کا فیصلہ ہونا تھا وہ اپنے آپ کو مزید متنازعہ نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ صدر بننے کے بعد انہیں اور زیادہ وسیع سیاسی حمایت کی ضرورت تھی۔ جس کے لیے انہوں نے (اتحاد سے باہر) قومی رہنماؤں سے ملاقاتوں کے سلسلہ کو از سر نو شروع کر دینا ضروری سمجھا۔ اسی سلسلے میں انہوں نے کراچی میں مولانا شاہ احمد نورانی سے ملاقات کی☆☆ (۲۱۸)

مولانا نورانی نے ملاقات کے دوران واضح اور دوٹوک مؤقف اختیار کرتے ہوئے کہا (۲۱۹) کہ اگر نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ اور عام انتخابات کے انعقاد میں ضرورت سے زیادہ تاخیر ہوئی اور موجودہ سول کابینہ انتخابات تک برقرار رہی تو ملک میں ۱۹۷۷ء سے زیادہ زوردار مؤثر تحریک چل سکتی ہے اس کے علاوہ انہوں نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر پر واضح کر دیا کہ مذہبی منافرت اور فرقہ واریت کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی جارہی تھی اور وہ اقتدار میں شامل عناصر اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسی صورت میں حالات کسی وقت بھی نازک رخ اختیار کر سکتے تھے...... مساجد پر ایک اقلیت فرقہ کی جانب سے قبضہ کی کوششوں، اوقاف میں مخصوص فرقہ کی سرپرستی اور مسجد میں سلام بند کرانے کے احکامات نے ملک کی مذہبی فضا کو مکدر کر دیا تھا اور اگر اسے فوراً نہ رکوایا گیا تو

☆ اس وقت صوبوں میں گورنر راج نافذ تھا۔ قومی اتحاد کے رہنماؤں کو توقع تھی کہ شاید مرکزی سول کابینہ کے تجربے کو صوبائی سطح پر بھی آزمایا جائے گا۔

☆☆ قومی اتحاد نے کابینہ میں شمولیت کے سلسلے میں سیاسی حمایت کی جو تصویر جنرل صاحب کو پیش کی تھی۔ اس کے نتائج مایوس کن ہی نکلنا تھے اور اگر چہ اس وقت تک کابینہ کو قائم ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا مگر یہ تجربہ ناکام ہوتا نظر آرہا تھا اور ان کے وزراء صورتحال پر قابو پانے میں ناکام رہے تھے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے جنرل ضیاء نے فیصلہ کیا کہ فی الوقت صوبائی حکومتیں قائم نہ کی جائیں۔

صورتحال مزید بگڑ سکتی تھی۔ جنرل ضیاء نے مولانا شاہ احمد نورانی سے نہ صرف ذاتی توجہ دینے کا وعدہ کیا بلکہ انہوں نے جمعیت کی منشور کمیٹی سے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کا خاکہ بھی مانگ لیا جو بعد ازاں انہیں بھجوا دیا گیا۔ (۲۲۰)

مولانا شاہ احمد نورانی کے نزدیک نفاذ نظامِ مصطفیٰ ﷺ ہر خواہش، کوشش یا ارادہ سے بڑھ کر تھا، اگر وہ ملک میں جمہوری عمل کے جاری و ساری رہنے کے خواہاں تھے تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جمہوری عمل عین اسلامی اصولوں کے مطابق تھا۔ آمریت کی مخالفت بھی اسی لیے کی تھی کہ اس میں عوامی رائے کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ اس کے لیے اگر انہوں نے اتحاد بنانے کی سعی کی تھی وہ بھی نفاذِ نظامِ مصطفیٰ کے لیے اجتماعی کوششوں کا حصہ تھی کیونکہ کسی اکیلی سیاسی جماعت کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی سیاسی قوت کے بل بوتے پر اتنے عظیم کام کو سرانجام دے سکتی۔ اگر چہ قومی اتحاد کے قیام کا تجربہ مولانا نورانی کے لیے ایک تلخ تجربہ ثابت ہوا۔ تاہم انہوں نے نفاذ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے لیے جاری کی گئی تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کو ترک نہ کیا۔ یوں تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ ضیاء عہد میں اپنے نئے دور میں نئے عزم کے ساتھ داخل ہوگئی۔

حوالہ جات وتعلیقات

(۱) روزنامہ جنگ کراچی، یکم نومبر ۱۹۷۶ء

(۲) ایضاً

(۳) انٹرویو، مولانا شبیر احمد ہاشمی، ۱۷ جولائی ۲۰۰۵ء

(۴) ایضاً (۵) ایضاً (۶) ایضاً

(۷) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۴ جنوری ۱۹۷۷ء

(۸) ایضاً

(۹) ایضاً، یکم جنوری ۱۹۷۷ء

(۱۰) ایضاً

(۱۱) اس بل کی منظوری سے ایک روز قبل ۳۰ دسمبر ۱۹۷۶ء کو نمائندہ عہدوں پر فائز افراد کی بدعنوانیوں کی روک تھام کا بل منظور کیا گیا لیکن اس بل میں وزرائے اعلیٰ اور وزیر اعظم کے عہدوں کو شامل کیا گیا تھا۔ وزیر قانون کے بقول اس بل کا اطلاق موجودہ ارکان پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان پر نہیں ہوگا۔ قائم مقام قائد حزب اختلاف خواجہ محمد صفدر کے بقول موجودہ شکل میں یہ بل موثر نہیں ہوگا کیونکہ موجودہ ارکان پارلیمنٹ و اسمبلی کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور آئندہ اسمبلی کے لیے اس بل کا کوئی اخلاقی جواز موجود نہیں۔ (روزنامہ جنگ کراچی، یکم جنوری ۱۹۷۷ء)

(۱۲) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۳ جنوری ۱۹۷۷ء

(۱۳) ایضاً، ۴ جنوری ۱۹۷۷ء (۱۴) ایضاً، ۵ جنوری ۱۹۷۷ء

(۱۵) ایضاً، ۷ جنوری ۱۹۷۷ء (۱۶) ایضاً، ۱۱ جنوری ۱۹۷۷ء

(۱۷) ایضاً، ۱۰ جنوری ۱۹۷۷ء (۱۸) ایضاً (۱۹) ایضاً (۲۰) ایضاً

(۲۱) انٹرویو، مولانا شبیر احمد ہاشمی، ۱۷ جولائی ۲۰۰۵ء

(۲۲) ایضاً (۲۳) ایضاً (۲۴) ایضاً (۲۵) ایضاً

(۲۶) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۲ جنوری ۱۹۷۷ء

(۲۷) انٹرویو، مولانا شبیر احمد ہاشمی، ۱۷ جولائی ۲۰۰۵ء

(۲۸) ایضاً (۲۹) ایضاً

(۳۰) اداریہ روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۳ جنوری ۱۹۷۷ء

(۳۱) روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۷ جنوری ۱۹۷۷ء

(۳۲) ایضاً، ۱۳ جنوری ۱۹۷۷ء

(۳۳) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۸ جنوری ۱۹۷۷ء

(۳۴) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۴ جنوری ۱۹۷۷ء

(۳۵) ایضاً

(۳۶) ایضاً، ۳۱ جنوری ۱۹۷۷ء

(۳۷) ایضاً (۳۸) ایضاً

(۳۹) ایضاً، یکم جنوری ۱۹۷۷ء

(۴۰) پختون خواہ نیپ، سردار عبدالصمد خان اچکزئی نے این اے پی سے الگ ہو کر بنائی تھی۔ وہ بعد ازاں پی پی کے اتحادی بنے۔ جب عبدالصمد خان اچکزئی کو شہید کرایا گیا تو ان کی نشست پر ان کے صاحبزادے محمود خان اچکزئی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ محمود خان کو اس ضمنی انتخاب میں پی پی کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ محمود خان کافی عرصہ سرکاری بنچوں پر بیٹھنے کے بعد گورنر راج سے کچھ عرصہ پہلے آزاد بنچ پر چلے گئے۔ (ایضاً، ۳ جنوری ۱۹۷۷ء)

(۴۱) ایضاً، ۵ فروری ۱۹۷۷ء (۴۲) ایضاً (۴۳) ایضاً (۴۴) ایضاً

(۴۵) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۵ جنوری ۱۹۷۷ء

(۴۶) ایضاً

(۴۷) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۷ فروری ۱۹۷۷ء

(۴۸) ایضاً (۴۹) ایضاً (۵۰) ایضاً (۵۱) ایضاً

(۵۲) ایضاً

(۵۳) روزنامہ وفاق لاہور، یکم فروری ۱۹۷۷ء

(۵۴) ایضاً (۵۵) ایضاً

(۵۶) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۲ فروری ۱۹۷۷ء

(۵۷) ایضاً

(۵۸) روزنامہ وفاق لاہور، ۲۱ فروری ۱۹۷۷ء

(۵۹) ایضاً (۶۰) ایضاً، ۱۳ فروری ۱۹۷۷ء

(۶۱) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۷ فروری ۱۹۷۷ء

(۶۲) روزنامہ وفاق لاہور، ۱۳ فروری ۱۹۷۷ء

(۶۳) اس الزام کا جواب دیتے ہوئے قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود نے کہا کہ وہ اور مولانا شاہ احمد نورانی کئی بار ایک دوسرے کی اقتداء میں نماز ادا کر چکے ہیں...... مولانا کوثر نیازی نے مجھے اور مولانا مودودی کو قائداعظم کے مزار اور داتا دربار پر فاتحہ خوانی کا چیلنج دیا تھا۔ (ہمیں قبول ہے بشرطیکہ) مولانا کوثر نیازی تحریری طور پر اپنے حلقہ سے دستبرداری کا اعلان کریں۔ (ایضاً)

(۶۴) روزنامہ وفاق لاہور، ۱۰ فروری ۱۹۷۷ء

(۶۵) نظام مصطفیٰ ﷺ کے نعرے کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ نعرہ پیپلز پارٹی کے انتخابی جلسوں میں استعمال ہونے لگا۔ منڈی بہاؤالدین میں پی پی کے مقررین نے ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اپوزیشن کی نو جماعتوں کا اتحاد محض اقتدار کی خاطر قائم کیا گیا ہے جبکہ پ پ پارٹی ملک میں نظام مصطفیٰ ﷺ قائم کرے گی۔ ان مقررین میں ملک محمد یامین اور میاں وحید الدین شامل تھے۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۵ فروری ۱۹۷۷ء)

(۶۶) روزنامہ وفاق لاہور، ۲۰ فروری ۱۹۷۷ء (۶۷) ایضاً

(۶۸) ایضاً، ۲۲ فروری ۱۹۷۷ء (۶۹) ایضاً، ۳ مارچ ۱۹۷۷ء

(۷۰) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۷ فروری ۱۹۷۷ء

(۷۱) ایضاً

(۷۲) روزنامہ وفاق لاہور، ۶ مارچ ۱۹۷۷ء

(۷۳) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ایضاً

(۷۴) واضح رہے کہ اصغر خان قبل ازیں، پاکستان قومی اتحاد کے لیے الاٹ کیے گئے انتخابی نشان ہل کے بیلٹ پیپر میں ڈیزائن پر اعتراض کر چکے تھے۔ ان کے خیال میں ہل کے ڈیزائن میں تبدیلی

نا گزیر ہے کیونکہ عوام الناس کے لیے اس نشان کا پہچانے جانا مشکل ہوگا۔ بالفاظ دیگر الیکشن سے پہلے ہی جیت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ تاہم الیکشن کمیشن نے اصغر خان کے اس خدشے کو بے بنیاد قرار دیا۔ (ایضاً، ۱۶ فروری ۱۹۷۷ء)

(۷۵) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۸ مارچ ۱۹۷۷ء

(۷۶) ایضاً، ۱۱ مارچ ۱۹۷۷ء (۷۷) ایضاً

(۷۸) روزنامہ وفاق لاہور، ۱۲ مارچ ۱۹۷۷ء

(۷۹) ایضاً، ۱۱ مارچ ۱۹۷۷ء

(۸۰) قریشی، محمد اسحاق، مضمون ''پاکستان میں عام انتخابات'' بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۴ مارچ ۱۹۷۷ء

(۸۱) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۵ مارچ ۱۹۷۷ء

(۸۲) انٹرویو، مولانا شبیر احمد ہاشمی، ۱۷ جولائی ۲۰۰۵ء

(۸۳) ایضاً (۸۴) ایضاً

(۸۵) رفیق احمد باجوہ نے اپنی صفائی میں کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کیا نہ ہی کسی اور ذرائع سے باجوہ بھٹو ملاقات کی تردید سامنے آئی۔ باجوہ کا موقف یہ تھا کہ ان کے خلاف سازش کی گئی ہے۔ انہوں نے بھٹو سے ملاقات نہیں کی۔ قومی اتحاد کے (بعض) رہنما میری مقبولیت سے حسد کرنے لگے تھے لیکن انہوں نے کسی بھی رہنما کا نام بتانے سے گریز کیا۔ تاہم انہوں نے ایک وضاحتی بیان میں کہا کہ ایک مقامی اخبار نے (انہوں نے اخبار کا نام نہیں بتایا) یہ خبر شائع کرکے (کہ میں نے وزیر اعظم سے ملاقات کی ہے) گویا دبے لفظوں میں انہوں نے ملاقات کیے جانے کو تسلیم کرلیا تھا) اور یہ کہ میرا کسی سیاسی شخصیت یا سیاسی جماعت سے اس وقت تک سمجھوتہ نہیں ہوسکتا جب تک وہ شخصیت یا سیاسی جماعت نظام مصطفیٰ ﷺ کو تسلیم نہ کرے۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ جمعیت علمائے پاکستان کے نائب صدر اور پاکستان قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل ہیں۔ یہ دو جماعتیں شرعی نظام کی داعی ہیں جس سے وہ دستبردار ہونے کے لیے کسی صورت تیار نہیں اور وزیر اعظم یا کسی شخصیت سے ملاقات کے اہتمام کا اختیار قومی اتحاد کی مرکزی کونسل کو ہے۔ (نوائے وقت لاہور، ۱۹ مارچ ۱۹۷۷ء)

(۸۶) انٹرویو، مولانا شبیر احمد ہاشمی، ۱۷ جولائی ۲۰۰۵ء

(۸۷) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۵ مارچ ۱۹۷۷ء

(۸۸) روزنامہ وفاق لاہور، ۱۶ مارچ ۱۹۷۷ء

(۸۹) ایضاً (۹۰) ایضاً

(۹۱) ایضاً، ۱۹ مارچ ۱۹۷۷ء (۹۲) ایضاً، ۲۲ مارچ ۱۹۷۷ء

(۹۳) ایضاً، ۲۳ مارچ ۱۹۷۷ء (۹۴) ایضاً، ۲۷ مارچ ۱۹۷۷ء

(۹۵) ایضاً

(۹۶) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۲ مارچ ۱۹۷۷ء

(۹۷) ایضاً، ۲۶ مارچ ۱۹۷۷ء (۹۸) ایضاً

(۹۹) ایضاً، تاہم حکومتی مظالم کا مفصل ذکر ۱۹۷۷ء کے اخبارات میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے ہفت روزہ افق کراچی، تحریک نظام مصطفیٰ نمبر۔

(۱۰۰) ایضاً (۱۰۱) ایضاً، ۲۷ مارچ ۱۹۷۷ء (۱۰۲) ایضاً

(۱۰۳) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۶ اپریل ۱۹۷۷ء

(۱۰۴) ایضاً، ۲۵ اپریل ۱۹۷۷ء (۱۰۵) ایضاً، ۲۰ اپریل ۱۹۷۷ء

(۱۰۶) ایضاً، ۲۵ اپریل ۱۹۷۷ء (۱۰۷) ایضاً، ۲۷ اپریل ۱۹۷۷ء

(۱۰۸) روزنامہ وفاق لاہور، ۹ مئی ۱۹۷۷ء

(۱۰۹) ایضاً، ۷ مئی ۱۹۷۷ء (۱۱۰) ایضاً (۱۱۱) ایضاً، ۸ مئی ۱۹۷۷ء

(۱۱۲) ایضاً، ۱۱ مئی ۱۹۷۷ء (۱۱۳) ایضاً، ۸ مئی ۱۹۷۷ء (۱۱۴) ایضاً

(۱۱۵) ایضاً (۱۱۶) ایضاً، ۱۱ مئی ۱۹۷۷ء

(۱۱۷) تاہم بی بی سی کے نمائندے مارک ٹیلی نے پیر پگاڑا کے حوالے سے رپورٹ دی کہ وزیراعظم بھٹو نے سرحدی صورتحال کے تناظر میں مولانا مفتی محمود سے درخواست کی کہ وہ دوبارہ انتخابات کرانے کا مطالبہ واپس لے لیں کیونکہ ایران اور ہندوستان نے اپنی فوجیں پاکستان کی تینوں سرحدوں پر جمع کر دی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وزیراعظم نے استصواب کی تجویز دے دی۔ اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا گیا۔ بی بی سی کے نمائندہ کے بقول پیر پگاڑا نے بتایا کہ جب بھٹو مفتی محمود سے ملنے سہالہ گئے تو اپنے ساتھ کچھ نئے نقشے بھی لے گئے اور ایک فوجی افسر بھی ان کے ہمراہ تھا۔ مفتی محمود کو نقشوں کے ذریعے بتایا گیا کہ مشرق میں سندھ اور آزاد کشمیر کی سرحد پر ہندوستان

نے فوجیں جمع کر دی ہیں اور مغرب میں ایران فوجیں بلوچستان کی سرحد کے ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔ مارک ٹیلی نے لکھا کہ قائم مقام صدر پیر پگاڑا نے آج سہالہ جا کر نظر بند رہنماؤں سے حسب معمول ملاقات کی کوشش کی لیکن انہیں اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ (ایضاً، ۱۳ مئی ۱۹۷۷ء

(۱۱۸) بھٹو اور مفتی محمود کی ملاقات ۱۱ مئی کو ہوئی تو جس کے بعد مفتی محمود نے بھٹو کو ایک خط کے ذریعے اصلاح احوال کے لیے کہا تھا۔ یہ خط ۱۲ مئی کو بھٹو کو مل گیا۔ اس سے اگلے دن بھٹو نے اس خط کا جواب دے دیا۔ (ایضاً، ۱۲ مئی ۱۹۷۷ء)

(۱۱۹) ایضاً

(۱۲۰) بھٹو کی طرف سے مفتی محمود کے خط کا جواب اور پھر اس پر بحث کچھ یوں تھی۔ ''ڈیئر بھٹو:
آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۱ مئی کو میری آپ سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے کہا تھا کہ آپ کی تجاویز کا جواب اپنے ساتھیوں سے مشورہ کے بعد دوں گا۔ اب انہوں نے لکھا ہے کہ بے مقصد بات چیت سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ مفتی محمود نے لکھا کہ حکومت کے وزیروں نے انتخاب میں دھاندلی کی ہے کراچی کے ملت اخبار میں الیکشن کمشنر کا ایک بیان بھی شائع ہو چکا ہے جس میں انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ دھاندلیاں ہوئی ہیں اور اب صرف ایک ہی حل ہے کہ نئے الیکشن کرائے جائیں۔ مفتی محمود نے یہ بھی لکھا کہ پی این اے پر بین الاقوامی سازش میں ملوث ہونے کا الزام لگایا گیا ہے اور آپ کے سیاسی کارکنوں اور نام نہاد قانون نافذ کرنے والے اداروں نے ظلم و تشدد کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ بھٹو آپ نے قومی اسمبلی کے الیکشن کو اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا ہے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے ۲۸ اپریل کو تقریر کی تھی اور انہوں نے اب ۱۲ مئی کو یہ مسئلہ اٹھایا...... انہوں نے یہ کیوں نہ کہا کہ وہ انتخاب کے لیے پیشگی شرائط عائد کرنا چاہتے ہیں لیکن اب انہوں نے اس خط میں یہ مسئلہ اٹھایا ہے اگر میں نے انتخاب کو اپنے وقار کا مسئلہ بنایا ہوتا تو میں ان کے ساتھ بات کیوں کرتا۔ میں لاہور میں دوسرے رہنما کے ساتھ بات کیوں کرتا۔ اب مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ وہ تین مطالبات تسلیم کئے بغیر میرے ساتھ بات چیت نہیں کر سکتے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بات چیت کے دروازے کس نے بند کئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو بنیادی مطالبات پیش کئے گئے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ میں مستعفی ہو جاؤں۔ دوبارہ انتخابات کرائے جائیں اور نیا الیکشن کمیشن قائم کیا جائے۔

......۱۱ مئی کو میں نے مولانا مفتی محمود سے ملاقات کی انہوں نے یہ کہا کہ میں آپ کی صورتحال کو سمجھتا ہوں انہوں نے کہا میں اپنے ساتھیوں سے بات کر کے جواب بھیجوں گا۔ میں جب نے ان سے ملاقات کی تو تین مسائل زیر بحث آئے۔ میرا استعفیٰ قومی اسمبلی اور نیا الیکشن کمیشن۔ میں نے ان کو بتایا کہ الیکشن کمیشن کا مسئلہ بنیادی نوعیت کا نہیں ہے باقی دو مطالبات مان لینے کا مطلب ملک کی تباہی ہوگی۔ میں نے ان کو وہ تفصیلات بھی بتائیں جو ملک کو تباہی کی طرف لے جاسکتی ہیں وہ میں نے واضح کیا کہ ہم نے دو مہینے انتخابی مہم چلائی جس سے ملک کے مختلف طبقات میں کشیدگی پیدا ہوئی لوگوں میں طبقاتی کھچاؤ پیدا ہوا۔ علاقائی کشیدگی بڑھی۔ یہ کشمکش معمولی نوعیت کی نہ تھی۔ یہ بہت اہم اور نازک مسئلہ ہے یہ ایک شعلہ انگیز مسئلہ ہے۔ مستقبل قریب میں اگر ہم دوبارہ انتخابات میں لگ جائیں تو اس سے ہونے والے نقصانات کی ذمہ داری کس پر ہوگی۔ میں نے بتایا کہ قومی اسمبلی کے دوبارہ انتخابات کرانے کی صورت میں بیرونی مداخلت کا خطرہ ہے۔ میں اس لیے اس پر اصرار کر رہا ہوں۔ جبکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کے انتخابات بیک وقت ایک دن ہوں۔ اگر ہم ملک کے لیے خطرہ مول لیتے ہیں تو اس کا جواب ہمیں دینا ہوگا ہم جیتے ہوئے ہیں۔ پیپلز پارٹی جیتی ہوئی ہے۔ غیر جانبدار مبصرین اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں کامیابی ہوئی۔ اگر آج وہ یہ کہتے ہیں کہ قومی اسمبلی ختم کی جائے تو آئندہ ہر حکومت کے خلاف اپوزیشن یہی مطالبہ کرے گی کہ یہ اسمبلی ان کو نہیں چاہیے۔ یہ ملک کا ایک بہت بڑا ادارہ ہے اس کو نقصان کیسے پہنچائیں۔ میرے خیال میں ایک طرف تو طبقاتی تقسیم کا مسئلہ ہے، غیر ملکی مداخلت ہے۔ دوسری طرف شکست خوردہ جماعت پورے ملک میں انتخابات کا مطالبہ کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس اقدام سے مسائل کی پٹاری کھل جائے گی۔ میں نے مولانا مفتی محمود سے کہا کہ میں حزب اختلاف کے ارکان سے ملاقات اور بات کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں ہم تو آپ سے کچھ سننا چاہتے ہیں۔ تین روز قبل ہی میں نے اپنی جماعت سے بات کی تھی میں نے جو موقف اختیار کیا ہے اگر میں غلط ہوں تو آپ کوئی دوسرا لیڈر منتخب کرلیں۔ میں نے ان کو یہ بات پورے خلوص سے کہی اگر آپ چاہتے ہیں تو کوئی دوسرا سربراہ چن لیں جو اس معاملہ میں اپوزیشن سے بات چیت کر سکے۔ البتہ میں اپنے طور پر اسمبلی توڑنے کو تباہ کن سمجھتا ہوں۔ اگر کوئی دوسرا اسمبلی توڑنے کی جرات رکھتا ہے تو میں اس کے لیے یہ منصب چھوڑ سکتا ہوں۔ میں اسمبلی میں بیٹھنے کے لیے تیار ہوں لیکن

ارکان اسمبلی نے مجھ پر دوبارہ اعتماد کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں آپ پر پورا اعتماد ہے۔ ہم آپ کی حمایت کرتے ہیں۔ آپ نے سب فیصلے صحیح کیے ہیں...... میں آئینی طریقے سے اس مسئلہ کے حل کے لیے تیار ہوں۔ میں کرسی چمٹا ہوا نہیں ہوں۔ دس مئی کو میں نے کہا کسی اور کو قائد ایوان بنالو۔ میرے استعفیٰ کے مسئلہ کو انتہائی اہمیت دی گئی۔ لہٰذا میں نے اس سلسلہ میں اکثریتی پارٹی سے بات کی۔ میں نے کہا وہ اپنا نیا لیڈر منتخب کرسکتی ہے...... اگر میری اہمیت اتنی زیادہ ہے تو اپوزیشن مجھ پر حکم نہیں چلاسکتی۔ میری پارٹی مجھے ہدایت (Dictate) کرسکتی ہے۔ میں ایک محب وطن پاکستانی ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سخت قومی بحران ہے۔ اب حالات اتنے خراب ہوچکے ہیں تو آئین میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔ وہ ترمیم آئین کا مستقل حصہ نہ ہو بلکہ عارضی ہو۔ قومی اسمبلی اور سینٹ دونوں یہ ترمیم منظور کرسکتی ہیں۔"

(۱۲۱) اس سلسلے میں جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی کا بیان محل نظر رہے۔ ان کے بقول وہ (بھٹو) کیسے کہہ سکتے ہیں کہ داخلی اور خارجی خطرات کے پیش نظر ملک میں نیا انتخاب کرانا ممکن نہیں جبکہ ان کے نزدیک استصواب کرانا ممکن ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ساری انتظامی مشینری بھٹو کے کنٹرول میں ہے اور بھٹو کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ اس سلسلے میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جو لازماً ہر سوچنے والے آدمی کے ذہن میں الجھن پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ ان سوالات کا واضح جواب دیا جائے۔ مولانا نے کہا کہ (۱) ریفرنڈم کرانے کی صورت میں تقریباً وہی انتظامات کرنے پڑیں گے جو مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات بیک وقت کرائے جانے کے لیے کیے جانے ہوں گے اور ان پر تقریباً وہی مصارف آئیں گے۔ کیا معقول وجہ ہے کہ اس دوسری صورت کو اختیار کرنے کے بجائے پہلی صورت اختیار کرنا تجویز کیا گیا ہے؟ (۲) اگر بالفرض ریفرنڈم کا فیصلہ بھٹو کے خلاف ہو تو کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ وہ اسمبلی بھی ان کے ساتھ رخصت ہو جس میں عوام کی رائے کے برعکس ان پر اعتماد ظاہر کر کے انہیں وزیر اعظم منتخب کیا گیا ہے اور اسی طرح وہ صوبائی اسمبلیاں بھی ختم ہوں جن کے متعلق بھٹو کئی دفعہ یہ قبول کرچکے ہیں کہ ان کے دوبارہ انتخابات ہونے چاہئیں۔ اس صورت میں ایک وہ انتظامات اور اخراجات ہوں گے جو ریفرنڈم کے لیے ہوں گے اور دوبارہ وہی انتظامات اور اخراجات اسمبلیوں کے لیے کیے جائیں گے۔ کیا اس بات پر غور کرلیا گیا ہے کہ ملک کے نظم ونسق اور مالیت پر دوہرا بوجھ ڈالنے کی کیا وجہ ہے؟ (۳) بھٹو نے اسمبلیوں کے انتخابات ازسرنو نہ کرانے

کی وجہ یہ بیان کی ہیں کہ ملک کے حالات مخدوش ہیں بیرونی مداخلت ہو رہی ہے اور انتخابات کی صورت میں اور زیادہ مداخلت کا اندیشہ ہے اگر یہ امر ہی انتخابات کرانے میں مانع ہے تو ریفرنڈم کرانے میں کیوں مانع نہیں؟ (۴) یہ طریقہ کہ قوم کے سامنے صرف اک سوال پیش کر دیا جائے کہ وہ فلاں شخص کو قبول کرتی ہے یا نہیں۔ بالعموم آمرانہ نظام میں اختیار کیا جاتا ہے۔ جمہوری طریقے میں اگر ریفرنڈم کرایا جائے تو متبادل صورت بھی سامنے رکھنا پڑے گی تا کہ وہ متبادل صورتوں میں موازنہ قائم کر کے لوگ اپنی رائے قائم کر سکیں کہ وہ ان میں سے کس کو پسند کرتے ہیں اور کس کو نہیں۔ مثلاً ریفرنڈم پر یہ سوال لوگوں کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے کہ وہ بھٹو کو پسند کرتے ہیں یا قومی اتحاد کو...... (ایضاً)

(۱۴۴) ڈیئر بھٹو! آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۱ مئی کو جب آپ سہالہ آئے تھے تو میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اپنے رفقاء کے ساتھ صلاح مشورہ کے بعد معطل کر سکوں گا کہ آیا موجودہ سیاسی بحران حل کرنے کے لیے ہم میں مذاکرات ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ میں نے سہالہ جیل کیمپ میں اپنے دوسرے ساتھیوں کو آپ کے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا۔ آپ کے نقطۂ نظر جو مجھے بتایا گیا وہ یوں تھا کہ موجودہ اندرون اور بیرون صورت حال ملک میں دوبارہ انتخابات کے لیے موزوں نہیں۔ اب اگرچہ آپ قومی اسمبلی کے انتخابات کروانا مناسب خیال نہیں کرتے اس کے باوجود آپ سیاسی مذاکرات جاری رکھنے کے حامی ہیں۔ ہم نے اپنے اجلاس میں آپ کے نقطۂ نظر پوری طرح غور کیا۔ ہمارا متفقہ نظریہ یہ ہے کہ ملک کو درپیش سیاسی مسائل اور اس کے حل کے بارے میں آپ کے خیالات قوم کے نقطۂ نظر سے اتنے مختلف ہیں کہ بے مقصد بات چیت جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اپنے اس نقطۂ نظر سے آپ کو آگاہ کرتے ہوئے میں آپ کی توجہ آپ کی اس پریس کانفرنس کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جس میں آپ نے خود یہ تسلیم کیا تھا کہ ۷ مارچ کے انتخابات میں آپ کے وزراء سرکاری حکام اور ساتھیوں نے سنگین بے ضابطگیاں کی ہیں۔ میں آپ کی توجہ ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کی اس رپورٹ کی طرف بھی دلانا چاہتا ہوں جو کراچی کے گجراتی زبان کے اخبار ڈیلی ملت میں چھ مئی کو شائع ہوئی تھی اور جس میں چیف الیکشن کمشنر کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ انتخابات میں دھاندلیاں اتنی وسیع پیمانے پر ہوئی ہیں کہ خاص خاص کیسوں کی چھان بین کا کوئی فائدہ نہیں اور یہ کہ اس کا واحد حل ملک میں عام انتخابات ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق پریس ریلیز جو پہلے جاری کر دی گئی تھی واپس لے لی گئی جس کی وجہ سے دوہ دوسرے

قومی اخبارات میں شائع نہیں ہو سکی۔

میں آپ کو اس انتہائی اشتعال انگیز اور قطعاً غلط اور بے بنیاد الزام کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ جو آپ نے ۲۸ اپریل کو قومی اسمبلی میں لگایا اور جس میں آپ نے پاکستان قومی اتحاد کو ایک بین الاقوامی سازش میں ملوث بتایا۔

ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ گزشتہ تین ہفتوں کے دوران جبکہ آپ موجودہ صورتحال پر تشویش کا اظہار اور مسئلہ کو حل کرنے کی خواہش پر زور دیتے رہے۔ آپ کی حکومت نے ہزاروں سیاسی کارکنوں کو جن میں خواتین بھی شامل تھیں قید کیا اور انہیں ذلیل و خوار کیا اور آپ کے نام نہاد قانون کا نفاذ کرنے والے اداروں نے بھاری تعداد میں بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا۔ میر پور خاص میں دو روز قبل بندوق کے دستے سے خاتون کو زد و کوب کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی بہیمانہ کارروائی ہمارے خیال میں ایک ایسی حکومت کا فعل نہیں ہو سکتا جو مسئلہ کو بات چیت کے ذریعے حل کرنے کی متمنی ہو۔

یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ آپ نے موجودہ صورتحال کو اپنے ذاتی وقار کا مسئلہ بنالیا اور عوام کی مرضی کے سامنے جھکنے کی بجائے اپنے ہم وطنوں کو مصائب و آلام سے دوچار کر دیا۔ آپ کی حکومت کی اس انتہائی اشتعال انگیز اور ذلت آمیز کارروائی کے باوجود اپنے لاکھوں ہم وطنوں کی مرضی اور خواہش کے برعکس جو آپ کے نام نہاد قانون کا نفاذ کرنے والے اداروں کی گولیوں اور لاٹھیوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ میں نے آپ سے اس امید پر ملاقات کرنا منظور کر لیا کہ شائد موجودہ بحران کا کوئی جلد اور باعزت حل نکل آئے۔ میں نے یہ فیصلہ نیک نیتی سے اور بغیر کسی انا کے کیا۔ اس توقع پر کہ ہو سکتا ہے معقولیت کی کوئی راہ نکل آئے اور ملک مزید خون خرابے اور مصیبتوں سے بچ جائے۔ بدقسمتی سے یہ توقع غلط ثابت ہوئی اور میں اور میرے رفقاء اس افسوسناک نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آپ نے سیاسی مذاکرات کا تاثر اس امید پر دیا کہ اس دوران عوام کی تحریک کمزور پڑ جائے گی۔

ایسے حالات میں آپ کو میں بڑے افسوس سے یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ میں آپ سے اس وقت تک ملاقات اور بات چیت نہیں کر سکتا جب تک ہمارے تین مطالبات جو پہلے ہی آپ تک پہنچا دیے گئے ہیں تسلیم نہیں کیے جاتے۔ مجھے امید ہے آپ سمجھ جائیں گے کہ ہم نے یہ لائحہ عمل کیوں اختیار کیا۔ ہمارے خیال میں یہ واحد راستہ ہے جو موجودہ سیاسی مسئلہ کے حل کی صورت

پیدا کرسکتا ہے۔ (روزنامہ وفاق ۱۵ مئی ۱۹۷۷ء و روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۵ مئی ۱۹۷۷ء)

(۱۲۳) ایضاً، ۱۴ مئی ۱۹۷۷ء

(۱۲۴) اس ضمن میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جن ملکوں میں استصواب کا نظام رائج ہے وہاں ایک وقت کسی ایک ہی درپیش مسئلے پر عوام کی رائے ہاں یا ناں کی صورت میں معلوم کی جاتی ہے اور عوام کے جواب کو بھی صرف اس خاص مسئلہ تک محدود رکھا جاتا ہے۔ اسی کسی بھی دوسرے اقدام کا جواز نہیں بنایا جاتا۔ وزیراعظم کے مجوزہ استصواب کے فریق صرف حکمران پارٹی اور قومی اتحاد ہی نہیں تھے بلکہ اصل اور اہم فریق عوام تھے جن سے یہ تو پوچھا جارہا تھا کہ انہیں بھٹو بطور وزیراعظم قبول ہیں یا نہیں۔ انہیں یہ بتادیا گیا کہ ان کا جواب ہاں میں ہونے کی صورت میں پوری نظام مملکت میں بھی تبدیلیاں کی جاتی تھیں لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ "نہ" کی صورت میں جواب کس مضمرات کا حامل ہوگا۔ اس کے ساتھ تو ان برادر اسلامی ملکوں کا ردعمل بھی اہم تھا جو بحران کے بے لوث اور پرامن حل کے لیے خیر خواہانہ کردار ادا کرتے رہے۔ جاری بحران کا درست اور قابل قبول حل صرف یہی تھا کہ ایک نگران حکومت کے تحت دوبارہ انتخابات کرادیے جاتے۔ حکومت کو چاہیے کہ کسی سوال کے بجائے ہل اور تلوار پر استصواب کراتی۔ (ایضاً، ۱۵ مئی ۱۹۷۷ء)

(۱۲۵) روزنامہ وفاق لاہور، ۱۶ مئی ۱۹۷۷ء

(۱۲۶) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۳ مئی ۱۹۷۷ء

(۱۲۷) ایضاً، ۱۲ مئی ۱۹۷۷ء (۱۲۸) ایضاً، ۱۵ مئی ۱۹۷۷ء

(۱۲۹) ایضاً، ۱۸ مئی ۱۹۷۷ء

(۱۳۰) رٹ گزار مجیب الرحمٰن شامی کے وکیل ڈاکٹر اعجاز بٹالوی نے آئین میں ساتویں ترمیم، آئین کی دفعہ ۲۴۵، مارشل لاء اور دیگر دفعات کی تشریح کرتے ہوئے موقف اختیار کیا کہ آئین میں ساتویں ترمیم کا مقصد عدلیہ کے اختیارات کم کرنا تھا۔ اس لیے یہ ترمیم غیر قانونی تھی۔ یہ ترمیم آئین کے بنیادی مقاصد کے منافی تھی۔ انہوں نے کہا کہ عدلیہ کی موجودگی میں شہریوں کے بنیادی حقوق سے متعلق مقدمات کی سماعت محض آئین کے تحت قائم کردہ عدالتوں ہی میں ہوسکتی تھی۔ اس آئینی ضرورت کے منافی کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ آئین کی دفعہ ۲۹۵ کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا اس میں فوج کے فرائض کی تشریح کردی گئی ہے اور آئین کے

مطابق فوج کے ذمہ آئین کا تحفظ اور عدلیہ کی ذمہ داری آئین کا نفاذ اور پاکستان کے آئین میں مارشل لاء کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ آئین کی دفعہ ۲۴۵ کے تحت فوج سول انتظامیہ کی مدد کے لیے بلائی جاسکتی ہے اور اسی دفعہ کے تحت کوئی ایسا قانون بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ جو اس کے منافی ہو اور اگر کوئی ایسا قانون بنایا بھی جائے تو یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے کہ آیا یہ قانون دفعہ ۲۴۵ کی روح کے مطابق ہے اور آئین میں رکھی گئی شرط سول انتظامیہ کی مدد کے زمرے میں آتا ہے۔ انہوں نے موقف اختیار کیا کہ اس کے لیے یہ دیکھنا کہ جو فوجی عدالتیں قائم کی جارہی ہیں وہ سول انتظامیہ کی مدد کی شرائط پوری کرتی ہیں یا مساوی اختیارات کی عدالتیں نہیں۔

سول پاور کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

اس کے تین حصے ہیں عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ۔ ان تینوں سے جو متضاد جو کچھ ہوگا وہ فوجی طاقت کہلائے گا اور سول انتظامیہ کی مدد کا مطلب یہ ہے کہ سول انتظامیہ اپنے معمول کے مطابق کام کرتی رہے اور فوج کو ایسا کرنے میں مدد دے تاکہ وہ سول انتظامیہ کے اختیارات کو خود استعمال کرنا شروع کرے۔

امریکہ کی سپریم کورٹ کے ایک جج کے حوالہ سے انہوں نے کہا:

فوج کا کسی صورتوں میں کام وفاقی حکومت کی املاک کا تحفظ اور عدالتوں کے فیصلوں پر عملدرآمد کراتا ہے۔ مارشل لاء کا مقصد فوج کی حکومت نہیں۔ انہوں نے موقف اختیار کیا کہ آئین کے مطابق ملٹری عدالتیں قائم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ ہی فوج اس اتھارٹی کے اختیارات کم کرسکتی ہے، جس کی روک کے لیے اسے بلایا گیا ہو۔

عاصمہ جیلانی کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلوں کے حوالہ سے انہوں نے کہا: عدلیہ کے نظام عدل میں مداخلت نہیں کی جاسکتی...... عدالتوں کا حق سماعت نظام عدل دو مختلف چیزیں ہیں...... ہم عدالتوں کے حق سماعت کے لیے نہیں نظام عدل کے حق کارکردگی کے لیے لڑ رہے ہیں...... ہم نے اپنی جوانیوں کا بیشتر حصہ مارشل لاء کے زیر سایہ گزارا ہے اور ہم اس کی خرابیوں سے آگاہ ہیں۔

آئین کی مختلف دفعات کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

ان (آئینی دفعات) میں قانون کے تحت قائم کردہ عدالتوں کا ذکر ہے اور ملٹری عدالتیں قانون

کے تحت قائم نہیں کی جاتی۔ وقتی طور پر تشکیل دی جاتی ہیں۔ قیام میں استقلال کا پہلو ہوتا ہے اور عدالت کا ایک ایک وجود اور تشخص ہوتا ہے مگر ملٹری کورٹوں کی صورت میں یہ تمام لازمی چیزیں موجود نہیں ہیں۔ وقتی ضرورتوں کے تحت بنائی جاتی ہیں اور کسی افسر کو عدالت کے طور پر کام کرنے کے لیے کہہ دیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ قانون کے تحت قائم کردہ عدالتیں نہیں کہلا سکتیں اس لیے ان کے قیام آئین کے منافی آئین کی دفعہ ۱۹۳ کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس (دفعہ) کے مطابق تمام عدالتوں کے لیے سپریم کورٹ کے ماتحت کام کرنا اور اس کی معاونت کرنا لازمی ہے اور دفعہ ۲۰۳ میں کہا گیا ہے کہ ہر ہائیکورٹ اپنی ماتحت عدالتوں کی نگرانی کرے گی مگر فوجی عدالتیں عدالت عالیہ کے تحت نہیں اور جو اختیارات استعمال کر رہی ہیں وہ قانون نے انہیں نہیں دیئے۔

آئین کے آرٹیکل ۲۳۲ کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

انتظامیہ کو عدلیہ کے اختیارات کے متعلق کوئی کارروائی کرنے کا اختیار نہیں ہے اور عدالت عالیہ کے حق سماعت کو کسی صورت واپس نہیں لیا جاسکتا اور ایسا کوئی بھی اقدام آئین اور قانون کے منافی ہوگا کیونکہ نظام عدل کو تباہ کرنے کی کسی صورت میں اجازت نہیں مگر مارشل لاء کے نفاذ سے مملکت کا نظام متاثر ہو رہا ہے اور ملٹری عدالتوں کا قیام ملک کے قانون کی خلاف ورزی ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۰ مئی ۱۹۷۷ء)

(۱۳۱) وزیراعظم بھٹو نے ۱۴ مئی ۱۹۷۷ء کو سہالہ میں اپنے تین وفاقی وزراء مولانا کوثر نیازی، میر افضل اور عبدالحفیظ پیرزادہ کے ہمراہ مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصراللہ خان اور سردار عبدالقیوم سے ملاقات کی۔ تفصیلی بات چیت میں وزیراعظم نے جاری بحران کے حل کے سلسلہ میں قومی اتحاد کے ساتھ تمام امور (بشمول) قومی اسمبلی کے ازسرنو انتخابات پر بات چیت کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ دریں اثناء دوست عرب ممالک جواب تک بحران کے حل کے سلسلہ میں انفرادی کوششیں کرتے رہے نے اجتماعی کوششیں شروع کر دیں۔ سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور کویت نے فریقین کو یقین دلایا کہ سمجھوتے کی صورت میں تینوں برادر اسلامی ممالک اس پر عملدرآمد کرائیں گے۔ حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ وزیراعظم بھٹو نے مذاکرات پر آمادگی ظاہر (نوائے وقت لاہور، ۲۲ مئی ۱۹۷۷ء) کر دی تھی حالانکہ وہ اس سے بیشتر قومی اسمبلی کے دوبارہ انتخابات کے مسئلے کو خارج از بحث قرار دیتے رہے تھے اور قومی اتحاد کے ساتھ مذاکرات کے تعطل کی یہ سب

سے بڑی وجہ بھی رہی تھی۔ (ایضاً روزنامہ جنگ کراچی، ۲۱ مئی ۱۹۷۷ء)

(۱۳۲) روزنامہ وفاق لاہور، ۲۰ مئی ۱۹۷۷ء (۱۳۳) ایضاً

(۱۳۴) ایضاً، ۲۱ مئی ۱۹۷۷ء (۱۳۵) ایضاً، ۲۲ مئی ۱۹۷۷ء (۱۳۶) ایضاً

(۱۳۷) ایضاً

(۱۳۸) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۳۰ مئی ۱۹۷۷ء

(۱۳۹) ایضاً، ۲۹ مئی ۱۹۷۷ء (۱۴۰) ایضاً، ۳۱ مئی ۱۹۷۷ء

(۱۴۱) اس اجلاس میں ملکی صورتحال کے حوالے سے چند انتظامی نوعیت کے فیصلے بھی کئے گئے جن کی تفصیل نہیں بتائی گئی۔ واضح رہے کہ عام انتخابات کے بعد تحریک شروع ہونے سے جو صورتحال پیدا ہوئی اس کے بعد کراچی ڈویژن، ضلع حیدرآباد اور ضلع لاہور میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور دیگر مختلف شہروں میں امن و امن برقرار رکھنے کے لیے سول انتظامیہ کی طرف سے فوج کو طلب کیا گیا تھا۔ ۳۱ مئی ۱۹۷۷ء کو وزیراعظم کی زیر صدارت اعلیٰ فوجی حکام نے ۳ گھنٹے تک امن و امان کی صورتحال پر غور کیا۔ اس اجلاس میں جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین جنرل ایم شریف، چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق، چیف آف نیول سٹاف ایڈمرل محمد شریف، چیف آف ایئر سٹاف ایئر چیف مارشل ذوالفقار علی خان اور دیگر اعلیٰ فوجی حکام نے شرکت کی۔ (ایضاً، یکم جون ۱۹۷۷ء)

(۱۴۲) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۳ جون ۱۹۷۷ء (۱۴۳) ایضاً، یکم جون ۱۹۷۷ء

(۱۴۴) ایضاً (۱۴۵) ایضاً، ۳ جون ۱۹۷۷ء (۱۴۶) ایضاً

(۱۴۷) ایضاً (۱۴۸) ایضاً (۱۴۹) ایضاً (۱۵۰) ایضاً

(۱۵۱) ایضاً، ۴ جون ۱۹۷۷ء (۱۵۲) ایضاً (۱۵۳) ایضاً، ۵ جون ۱۹۷۷ء

(۱۵۴) ایضاً

(۱۵۵) پروفیسر غفور احمد کے مطابق جنرل ضیاء الحق حکومت درخواست پر پہلے اجلاس میں آئے اور جب حکومت سے مارشل لاء ہٹانے کا کہا گیا تو حکومت نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ جنرل ضیاء الحق کی جانب سے کسی دشواری کا اظہار کیا گیا تھا۔ اسی دشواری کی دفعات کے لیے انہیں اجلاس میں بلایا گیا تھا۔ (ایضاً، ۶ جون ۱۹۷۷ء)

(۱۵۶) مولانا نورانی نے پریس کانفرنس کے آخر میں کراچی ہائیکورٹ بار کے نسیم فاروق کو ان کی ایسوی

ایشن اور کراچی بار کے اعلیٰ کردار کو خراج تحسین پیش کیا۔ انہوں نے نسیم فاروق اور لاہور ہائیکورٹ بار کے صدر جناب ارم رضا کو دعوت دی کہ وہ راولپنڈی میں قانون معاونت کے لیے تشریف لائیں۔ اپنی رہائی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ گزشتہ رات (۳ جون ۷۷ ۱۹ء) ساڑھے نو بجے خیر پور ڈسٹرکٹ جیل میں حکم ملا کہ آپ کو بحیثیت قیدی راولپنڈی منتقل کیا جارہا ہے اس کے برعکس انہیں جیل سے قریبی ریسٹ ہاؤس میں منتقل کردیا گیا۔ پھر صبح (۴ جون) بتایا گیا کہ آپ کو رہا کیا جارہا ہے۔ تحریری حکم نامہ نہ ملنے کی وجہ سے رہائی میں تاخیر ہوئی۔ ان کے بقول اگر وہ دوبارہ گرفتار نہ کیے گئے تو ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کرکے تحریک کے متاثرین کے پاس جاکر ان کا ذاتی شکریہ ادا کریں گے۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۶ جون ۷۷ ۱۹ء)

(۱۵۷) ایضاً، ۷ جون ۷۷ ۱۹ء (۱۵۸) ایضاً

(۱۵۹) روزنامہ وفاق لاہور، ۸ جون ۷۷ ۱۹ء

(۱۶۰) ایضاً، ۲۱ جون ۷۷ ۱۹ء

(۱۶۱) فریقین نے اس موقع پر دونوں فارمولوں کی تفصیلات بتانے سے انکار کردیا۔ تاہم باخبر ذرائع کے بقول یہ فارمولے دوبارہ پولنگ یا نئی انتخابات کے دو متبادل فارمولے تھے۔ جن میں سے کسی ایک پر قومی اتحاد کی طرف سے اتفاق ضروری تھا۔ قومی اتحاد سے کہا گیا کہ وہ ان فارمولوں پر غور و خوض کے بعد ۷ جون ۷۷ ۱۹ء کو مذاکرات کے تیسرے دور میں اپنے فیصلے سے آگاہ کرتا تھا۔ دوبارہ پولنگ (جو کہ ان نشستوں پر ہونا تھا جہاں پر سنگین دھاندلیاں کی گئی ہیں) کے فارمولے کے تحت انتخابی مہم کی اجازت نہیں تھی اور یہ دوبارہ پولنگ مختصر ترین مدت میں کی جانی تھی۔ جس میں امیدوار وہی تھے جو ۷ اور ۱۰ مارچ ۷۷ ۱۹ء کے انتخابات میں تھے۔ جبکہ دوسرے فارمولے کے تحت نئے عام انتخابات منعقد کیے جانے تھے ان انتخابات کے انعقاد کے لیے زیادہ مدت رکھی جانی تھی۔ اس کے علاوہ انتخابات کے حوالے سے انتخابی مہم کی گنجائش ہونے کے ساتھ ساتھ نئے امیدوار بھی حصہ لے سکتے تھے۔ مزید براں دوبارہ پولنگ کے فارمولے پر اتفاق کی صورت میں عبوری حکومت کا کوئی تصور زیر غور نہیں رکھا گیا۔ تاہم نئے انتخابات کے ضمن میں عبوری حکومت کی تجویز بھی (غالباً) شامل رکھی گئی۔ ان ذرائع کا کہنا تھا کہ ہر دو صورتوں میں وزیر اعظم بھٹو ہی رہیں گے (یعنی بھٹو سے استعفیٰ طلب نہیں کیا جاسکتا تھا۔) (ایضاً)

(۱۶۲) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۸ جون ۷۷ ۱۹ء

(۱۶۳) ایضاً، ۱۰ جون ۷۷ ۱۹ء

(۱۶۴) روزنامہ جنگ کراچی، ۹ جون ۷۷ ۱۹ء

(۱۶۵) ایضاً، ۱۱ جون ۷۷ ۱۹ء (۱۶۶) ایضاً، ۱۲ جون ۷۷ ۱۹ء (۱۶۷) ایضاً

(۱۶۸) ایضاً (۱۶۹) ایضاً، ۱۳ جون ۷۷ ۱۹ء

(۱۷۰) گویا قومی اتحاد کو حتمی طور پر نہ اپنے وزیروں کی نامزدگی کا حق حاصل تھا اور نہ اہم محکموں کے مطالبے کا اور یہ موجودہ حکومت کے سربراہ کا استحقاق تھا کہ وہ جس طرح چاہتا اپنے وزارتی ساتھیوں کا انتخاب کرتا اور انہیں اپنی مرضی اور پسند کے محکمے الاٹ کرتا۔ بالفاظ دیگر قومی اتحاد وزیر اعظم کے رحم و کرم اور صوابدید کا محتاج تھا۔ (ایضاً)

(۱۷۱) ایضاً (۱۷۲) ایضاً (۱۷۳) ایضاً، ۱۶ جون ۷۷ ۱۹ء

(۱۷۴) ایضاً (۱۷۵) ایضاً (۱۷۶) ایضاً (۱۷۷) ایضاً

(۱۷۸) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۸ جون ۷۷ ۱۹ء

(۱۷۹) ایضاً (۱۸۰) ایضاً، ۱۹ جون ۷۷ ۱۹ء (۱۸۱) ایضاً

(۱۸۲) ایضاً، ۲۰ جون ۷۷ ۱۹ء (۱۸۳) ایضاً، ۲۱ جون ۷۷ ۱۹ء

(۱۸۴) ایضاً، ۲۵ جون ۷۷ ۱۹ء (۱۸۵) ایضاً ۲۶ جون ۷۷ ۱۹ء

(۱۸۶) ایضاً، ۲۷ جون ۷۷ ۱۹ء (۱۸۷) ایضاً، ۲۸ جون ۷۷ ۱۹ء (۱۸۸) ایضاً

(۱۸۹) ایضاً، ۲۹ جون ۷۷ ۱۹ء (۱۹۰) ایضاً، ۲ جولائی ۷۷ ۱۹ء (۱۹۱) ایضاً

(۱۹۲) ایضاً، ۳ جولائی ۷۷ ۱۹ء (۱۹۳) ایضاً (۱۹۴) ایضاً، ۳ جولائی ۷۷ ۱۹ء

(۱۹۵) ایضاً (۱۹۶) ایضاً، ۴ جولائی ۷۷ ۱۹ء (۱۹۷) ایضاً، ۵ جولائی ۷۷ ۱۹ء

(۱۹۸) ایضاً (۱۹۹) ایضاً، ۱۷ اگست ۷۷ ۱۹ء (۲۰۰) ایضاً، ۱۴ اگست ۷۷ ۱۹ء

(۲۰۱) ایضاً، ۷ اگست ۷۷ ۱۹ء

(۲۰۲) حالانکہ یہ وہی تحریک استقلال تھی جو متحدہ جمہوری محاذ کے رویے سے دلبرداشتہ ہوکر، اتحادوں کی سیاست سے پہلے ہی اکتا چکی تھی۔ اصغر خان اس وقت اتحاد میں شمولیت سے گریز کی پالیسی اختیار کرنے میں حق بجانب تھے اور یہ اصغر خان ہی تھے جنہوں نے چیف آف دی آرمی سٹاف اور دیگر اعلیٰ فوجی حکام کو خطوط لکھ کر اصلاح احوال کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ان کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا کہ وہ مارشل لاء حکام کی حمایت کرکے، سیاسی فوائد حاصل کرسکتے تھے لیکن انہوں

نے مارشل لاء کے زیر سایہ رہنا پسند نہ کیا۔ لیکن اصولی طور پر وہ پاکستان قومی اتحاد کے ساتھ بھی نہ چل سکے۔ تحریک استقلال اور جمعیت علمائے پاکستان کی علیحدگی نے ثابت کردیا کہ پاکستان قومی اتحاد کی چند جماعتیں یقیناً غلطی پر تھیں۔ (ایضاً، ۳۱ اگست ۱۹۷۷ء)

(۲۰۳) چونکہ یہ ایک اجتماعی ملاقات تھی، اس لیے اس میں مولانا نورانی کے علاوہ قومی اتحاد کے کئی دیگر رہنما بھی موجود تھے۔ ان کے پرزور اصرار پر جنرل ضیاء الحق نے ان لوگوں کے نام تو نہ بتائے البتہ اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود اور میاں طفیل محمد کی خاموش اور نیچی نگاہوں نے معاملہ کسی حد تک واضح کردیا کہ تحریک کی قیادت کرنے والے اور نظام مصطفیٰ ﷺ کا نعرہ لگانے والی عنقریب لیلائے اقتدار سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ (ایضاً، ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء

(۲۰۴) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۵ جنوری ۱۹۷۸ء

(۲۰۵) ہفت روزہ افق کراچی، یکم اکتوبر ۱۹۷۸ء

(۲۰۶) ہفت روزہ محور کراچی، ایضاً

(۲۰۷) ہفت روزہ افق کراچی، ۷۔115 اکتوبر ۱۹۷۸ء، ص ۱۳

(۲۰۸) ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، سنی کانفرنس نمبر ۱۹۷۸ء، ص ۳۵

(۲۰۹) ایضاً، ص ۱۹ (۲۱۰) ایضاً

(۲۱۱) ظفر، ایس۔ ایم، "قومی اتحاد کس کی سازش کا شکار ہوا۔" ہفت روزہ افق کراچی، ۲۲۔۳۰ ستمبر ۱۹۷۸ء، ص ۷

(۲۱۲) تفصیل کے لیے دیکھیے منشور جمعیت علمائے پاکستان، ضمیمہ ۸

(۲۱۳) ظفر، ایس۔ ایم، بحوالہ سابقہ، ص ۷

(۲۱۴) ایضاً (۲۱۵) ایضاً

(۲۱۶) ہفت روزہ افق کراچی، ۱۷۔۲۳ ستمبر ۱۹۷۸ء، ص ۱

(۲۱۷) ایضاً (۲۱۸) ایضاً (۲۱۹) ایضاً (۲۲۰) ایضاً

باب سوم

تحریکِ تحفظ پاکستان، ایم آر ڈی اور مولانا شاہ احمد نورانی

تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ جن فوری مقاصد کے حصول کے لیے چلائی گئی تھی، وہ اگرچہ قومی اتحاد میں انتشار اور اس میں شامل مختلف جماعتوں کے بعض سیاستدانوں کے رویہ اور ذاتی اغراض و مفادات کی وجہ سے ناکام ہوگئی تھی، لیکن اس عوامی مطالبے کی خالق جماعت جمعیت علمائے پاکستان نے اس سلسلے میں اپنی کوششوں کو ترک نہیں کیا تھا۔(۱)

ضیاء الحق نے اگرچہ جمعیت علمائے پاکستان سے نفاذ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی منشور کمیٹی کا تیار کردہ اطلاقی خاکہ مانگ لیا تھا لیکن قرائن سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے عملی نفاذ میں مخلص نہیں تھے (۲) بلکہ بعد کے حالات نے اس امر کی تصدیق کردی تھی کہ وہ اسلامی نظام کے نفاذ کی آڑ میں محض اپنی حکومت کو طول دینا چاہتے تھے (۳)۔ ضیاء الحق نے جس طرح صوبائی وزارتوں کے قیام کو بھٹو کے مقدمۂ قتل سے منسلک کردیا تھا اس سے سیاسی حلقوں میں کئی قسم کے خدشات جنم لے رہے تھے۔ بعض حلقوں کے خیال میں مقدمے کے فیصلے کے نتیجے میں ہوسکتا ہے آمریت ایک نئے انداز سے سامنے آئے اور پھر ہوا بھی یہی (۴)۔ صوبائی وزارتوں کے لالچ میں قومی اتحاد کے سیاستدانوں پر مشتمل سول کابینہ نے اپریل ۱۹۷۹ء میں بھٹو کو پھانسی دینے کے فیصلے کو قبول کرلیا اور یوں بھٹو اندازِ سیاست اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت وقت کے دبیز پردے میں چھپ گیا۔ قبل ازیں ۲۳ مارچ ۱۹۷۹ء کو ضیاء الحق نے عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کردیا تھا بلکہ اس مقصد کے لیے ۱۷ نومبر ۱۹۷۹ء کی تاریخ بھی مقرر کردی تھی (۵)۔ ساتھ ہی یہ اعلان بھی کردیا کہ سول کابینہ کے اراکین (۶) اگر انتخابات میں حصہ لینا چاہیں تو اپنے عہد سے مستعفی ہو جائیں (۷)۔ مولانا شاہ احمد نورانی بھی سول کابینہ کے استعفوں کا مطالبہ کرتے رہے تھے (۸) لیکن ان کے لیے سب سے زیادہ اہم بات بروقت عام انتخابات کا انعقاد تھا (۹)۔ انہوں نے کہا کہ انتخابات کے لیے فوج اور عدلیہ کے علاوہ کسی تیسرے فریق کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔ انہوں

نے کابینہ کو نام نہاد سول کابینہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ اسے ۳۱ مارچ ۱۹۷۹ء تک بہر صورت ختم ہو جانا چاہیے بصورت دیگر ان سے نمٹنے کے لیے جمعیت علمائے پاکستان کی مجلس شوریٰ اپنا لائحہ عمل طے کرے گی (۱۰)۔ یہ کابینہ منتخب نمائندوں پر مشتمل نہیں اس لیے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ وزراء کی اکثریت بلیک مارکیٹنگ، اسمگلنگ، چور بازاری اور سیمنٹ کی خورد برد کی سرپرستی کر رہی ہے...... جمعیت موجودہ وزراء کی دھاندلیوں کے بارے میں مواد اکٹھا کر رہی ہے۔ (جہاں تک آئندہ سیاسی و انتخابی اتحاد کا تعلق ہے) جو پارٹیاں اور عناصر قیام پاکستان کے حق میں تھے، ان کے ساتھ اتحاد کے روشن امکانات ہیں لیکن قیام پاکستان کی مخالفت کرنے والی پارٹیوں سے تعاون ممکن نہیں۔ ائیر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان اور پیر صاحب پگاڑا اسے باہمی مفاہمت کے لیے بات چیت جاری رکھی جائے گی۔ (۱۱)

قومی اتحاد کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ یہ ایک غرض مندوں کے گروہ میں ڈھل چکا ہے اور یہ (اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے) ختم ہو چکا ہے۔ (ہاں) اگر اتحاد اپنی گذشتہ غلطیوں کی تلافی کرے، معافی مانگے اور ۲۸ ستمبر ۱۹۷۸ء والی پوزیشن پر واپس آجائے تو پھر اس پر جنرل کونسل میں بحث کی جاسکتی تھی۔ ان کے نزدیک گول میز کانفرنس کی کوئی اہمیت و افادیت نہیں تھی کیونکہ یہ مسائل کا حل نہیں تھی مسائل کا واحد حل انتخابات کا انعقاد تھا۔ اس لیے گول میز کانفرنس (جو کہ محض انتخابات کے التواء کا بہانہ تھی) کے بجائے انتخابات کرائے جانے ضروری تھے (۱۲)

انتخابات کا معاملہ حسب سابق اور حسب توقع محض اعلانات تک محدود رہا۔ اس مرحلہ پر ضیاء حکومت نے ایک نیا پینترا بدلا اور رائے عامہ کو بھٹکانے کے لیے بلدیاتی انتخابات کے انعقاد کا شوشہ چھوڑ دیا۔ ان سے ضیاء الحق کے آئندہ عزائم کا پتہ چلایا جاسکتا تھا۔ ملک کے مختلف سیاسی حلقوں کے بقول یہ انتخابات بلا جواز، بے وقت اور عام انتخابات کو معرضِ التوا میں ڈالنے کی ایک سازش تھے۔ (۱۳)

حکومت نے بلدیاتی انتخابات کے مسئلہ کو سنجیدگی سے لیا اور اسے عوام کے بہترین مفاد میں قرار دیا۔ اس طرح ستمبر ۱۹۷۹ء میں بلدیاتی انتخابات کرا دیئے گئے (۱۴)۔ یہ انتخابات دراصل ضیاء کی حکومت کرنے کی طویل المعیاد منصوبہ بندی کا حصہ تھے۔ یوں جنرل ضیاء الحق کو نچلی سطح پر مارشل لاء کی حمایت کے لیے ایسے افراد میسر آگئے جو ضیاء الحق کی اپنی

سیاسی پارٹی قرار پائے۔ اب انہیں عام انتخابات کرانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے عام انتخابات (جن کا انعقاد سرکاری اعلان کے مطابق ۱۷ نومبر ۱۹۷۹ء کو ہونا تھا) کو ملتوی کرنے کے بہانے تلاش کرنے شروع کر دیئے اور مختلف تجاویز کی آڑ میں ایک خلط مبحث کا آغاز کر دیا (۱۵)۔ اسی سلسلے میں انہوں نے متناسب نمائندگی کا شوشہ چھوڑ دیا (۱۶)۔ اس ضمن میں جب حکومت کی طرف سے جے یو پی سے رائے مانگی گئی تو مولانا شاہ احمد نورانی نے ضیاء الحق پر واضح کر دیا کہ موجودہ صورتحال میں ایسی تجویز غیر معقول اور ناقابل قبول تھی (۱۷) اور یوں بھی ضیاء کی متناسب طرز انتخابات کی تجویز دنیا کے مروجہ طریق تناسب نمائندگی سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ ان کے بقول اس مرحلہ پر نئی تجویز پیش کیے جانے سے یہی تاثر سامنے آتا تھا کہ عام انتخابات کو ملتوی کرنے کا بہانہ تلاش کیا جا رہا ہے (۱۸)۔

اس حوالے سے مولانا شاہ احمد نورانی نے ضیاء حکومت کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ جمعیت علمائے پاکستان نہیں چاہتی کہ پارلیمانی طرز حکومت کے نام پر اسکندر مرزا اور غلام محمد کا کھیل دوبارہ شروع ہو جائے نہ ہی صدر کو یہ اختیار دیا جاسکتا تھا کہ وہ جب چاہیں پارلیمنٹ کو توڑ دیں (۱۹)۔ انہوں نے کہا کہ جہاں تک ان کے اختیارات کے تعین کا تعلق ہے یہ خالص سیاسی مسئلہ ہے اور ان جماعتوں کا دردسر ہے جو آئندہ انتخابات میں کامیاب ہوں گی۔ انتخابات سے قبل ۱۹۷۳ء کے آئین میں کسی کی بھی ترمیم غیر ضروری ہے کیونکہ یہ موجودہ حکومت کا مسئلہ نہیں ہے جبکہ صدر کے بقول ان کے عزائم سیاسی نہیں (تو ایسے تمام اقدامات اس لحاظ سے غیر ضروری تھے)...... پاکستان کی بہادر مسلح افواج کی ضرورت سرحدوں پر (زیادہ) ہے اور جس قدر جلد انتخابات ہو جائیں محب وطن افواج کو اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں اسی قدر آسانی ہوگی۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ محض ۱۷ نومبر کی تاریخ پر ہی تکیہ نہ کیا جائے بلکہ جس قدر جلد ہو انتخابات کرا کے اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے اور (آئینی) ترمیم وغیرہ کے معاملات آئندہ پارلیمنٹ پر چھوڑ دیے جائیں یا پھر صدر جنرل محمد ضیاء الحق واضح طور پر یہ اعلان کر دیں کہ میں صدر ہوں اس لیے مجھے اختیارات کی ضرورت ہے جنرل صاحب کو خوشامدیوں کے ٹولے سے ہوشیار رہنا چاہیے جو اس وقت حسب سابق ''ہمیں منظور ہے'' کی رٹ لگا رہے ہیں...... جہاں تک ہمارا (جمعیت علمائے پاکستان) کا تعلق ہے ہم جنرل صاحب کے خیر خواہ ہیں اس لیے انہیں ایک بہادر جنرل کی طرح

سرحدوں پر وطن عزیز کی حفاظت کرتے دیکھنا چاہتے ہیں...... ہمیں بار بار نام نہاد قومی اتحاد میں شامل ہونے کی دعوت دی جارہی ہے (کیوں کہ) اب حکومت میں شامل ان جماعتوں کو عوام سمجھ چکے ہیں اور یہ لوگ عوام کے سامنے آنے کے لیے کسی نہ کسی سہارے کی تلاش میں ہیں لیکن اب ہم کسی کی بیساکھی نہیں بنیں گے اور کسی قیمت پر اس قومی انتشار میں شامل نہیں ہوسکتے (۲۰)۔ جس نے عوام کو مایوس کیا ہے۔ ان کے بقول اب ہر شخص کو یہ غلط فہمی دور کر لینا چاہیے کہ انتخابات زیادہ دیر تک ملتوی نہیں ہوسکتے۔ اگر حکومت نے انتخابات کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کیں تو ہم انتخابات کرائیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جو لوگ بیلٹ بکس کے ذریعے منتخب نہیں ہوسکتے وہ سازشوں کے ذریعے حکومت میں رہنا چاہتے ہیں...... ایک سیاسی جماعت (غالباً جماعت اسلامی) کی جانب سے دیہات میں الیکشن کے خلاف دستخطوں کی مہم چلائی جارہی ہے۔ اخبارات میں مراسلے شائع کرائے جارہے ہیں اور یہ کہا جارہا ہے کہ ملک کی حالت خراب ہے جبکہ درحقیقت خود اس جماعت کی حالت خراب ہے...... جمعیت علمائے پاکستان ملک کے کونے کونے میں بالخصوص دیہات میں اپنا مؤثر کردار ادا کرے گی اور کسی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا...... الیکشن ضرور ہوں گے اور آئندہ الیکشن میں نظام مصطفیٰ ﷺ کے مکمل نفاذ کے حامی ہی برسراقتدار آئیں گے...... تاریخ کا رخ نظام مصطفیٰ ﷺ کے حق میں مڑ چکا ہے اور...... عوام کے حقوق کے ساتھ کوئی مذاق نہیں کرسکتا......(۲۱)۔

۲۷ مئی ۱۹۷۹ء کو جمعیت علمائے پاکستان کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس بمقام راولپنڈی میں جمعیت کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی کی صدارت میں منعقد ہوا (۲۲)۔ اس اجلاس میں ۳۵ میں سے ۲۹ اراکین عاملہ نے شرکت کی۔ اجلاس کی پہلی نشست میں بلدیاتی انتخابات اور آئین میں ترامیم کی تجاویز پر غور کرتے ہوئے دونوں تجاویز کو مسترد کر دیا گیا اور کہا گیا (کہ اگر) عام انتخابات سے قبل بلدیاتی انتخابات کرائے گئے تو (ایک دفعہ پھر) ۱۰ مارچ ۱۹۷۷ء والی صورتحال پیدا ہو جائے گی۔ (۲۳)

جمعیت کے سیکرٹری اطلاعات جناب ظہور الحسن بھوپالی کے بقول جمعیت کی مجلس عاملہ اس نتیجے پر پہنچی کہ ۱۷ نومبر ۱۹۷۹ء کے مجوزہ عام انتخابات میں کسی قسم کی تاخیر برداشت نہیں کی جائے گی (۲۴)۔ اگر ملک میں جلد از جلد انتخابات کرا کر عوام کے منتخب نمائندوں کو

اقتدار منتقل نہ کیا گیا تو یہ ملک (جو، اب کسی بحران کا متحمل نہیں ہوسکتا) ایک اور سنگین بحران کا شکار ہو جائے گا۔ بین الاقوامی دنیا میں ہمارا قومی وقار بھی اس صورت بحال ہوسکتا ہے کہ جب یہاں مکمل طور پر جمہوری نظام قائم کر دیا جائے۔ بلدیاتی انتخابات کی تجویز بغیر سوچے سمجھے پیش کی جارہی ہے اور اس پر جس طرح اصرار کیا جارہا ہے اس سے لوگوں کے ذہن میں (آئندہ عام انتخابات کے بارے میں) شکوک وشبہات پیدا ہورہے ہیں...... اول تو الیکشن کمیشن کے اس واضح اعلان کے بعد کہ انتخابی فہرستیں اگست کے آخر میں شائع ہوسکیں گی بلدیاتی انتخابات کا انعقاد اگست یا ستمبر میں ممکن نہیں (۲۵)۔ ایسی صورت کو چاہیے کہ وہ اِدھر اُدھر کے مسائل پر توجہ دینے کی بجائے اپنی تمام تر توجہ عام انتخابات کے انعقاد پر مرکوز کرے اور بقول حکومت اگر بلدیاتی انتخابات فہرستوں کی تکمیل و اشاعت اور حلقہ بندیوں کے طویل کام کو ختم کر کے اگست میں ہوسکتے ہیں تو کیوں نہ بجائے بلدیاتی انتخابات کے، عام انتخابات کرالیے جائیں، جس کا عہد جنرل صاحب بار بار عوام کے سامنے حتیٰ کہ سپریم کورٹ کے سامنے بھی کرا چکے ہیں (۲۶)۔ جنرل محمد ضیاء الحق...... اس سلسلے میں فریق نہ بنیں اور کوئی ایسا تاثر نہ دیں جس سے عام آدمی ان کے ارادوں اور خواہشات کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔ (۲۷)

باقی ماندہ قومی اتحاد، حکومت میں رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور حکومت وقت کی خوشنودی کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھا۔ اتحاد کے رہنما اس امر پر متفق اور تیار تھے کہ صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن پیدا کرنے ے لیے آئینی ترامیم کی حکومتی فیصلہ کی تائید وحمایت کی جائے۔ دراصل قومی اتحاد اور اس سے وابستہ جماعتوں اور سرکردہ رہنماؤں کو اس امر کا بخوبی اندازہ اور احساس ہوگیا تھا کہ انہیں عام انتخابات میں ناقابل یقین شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے یہ لوگ فی الوقت عام انتخابات کے انعقاد کے حق میں نہیں تھے۔ اس لیے ان کی دانست میں اگر آئینی ترامیم ہو جائیں تو عام انتخابات کے التواء کا امکان بڑھ سکتا تھا پھر یہ کہ وہ حکومت کے آنکھیں پھیرنے سے بھی خائف تھے۔ اس لیے وہ آئینی ترامیم کی حمایت کر کے حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلانا چاہتے تھے (۲۸)۔ اس اقدام کی ناکامی کے بعد ضیاء الحق نے انتخابات کے التواء کے لیے ایک اور چال چلی کہ متوقع انتخابات ۱۹۷۹ء میں شرکت کے لیے سیاسی جماعتوں پر رجسٹریشن کی شرط عائد کر دی اور ان سے حسابات کے گوشوارے طلب کیے۔ اس سے یہی تاثر ابھرا کہ

انتخابات عن قریب ہونے والے ہیں حالانکہ اس اقدام کا مقصد بھی آرمی کے لیے آئندہ اقدامات کے ضمن میں مہلت حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۷۹ء کے وسط میں جنرل ضیاء نے غیر معینہ مدت کے لیے عام انتخابات ملتوی کر دیئے اور تمام سیاسی پارٹیوں کو کالعدم قرار دے دیا (۲۹)۔ ان کے دفاتر پر حملہ کر کے سر بمہر کر دیا گیا اور ریکارڈ قبضے میں لے لیا گیا۔ ان کے اکاؤنٹس منجمد کر دیئے گئے اور ہر قسم کے سیاسی سرگرمی کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے نئے ضابطوں اور قوانین کا اعلان کیا گیا (۳۰)۔ جس کے تحت اخبارات پر کڑی سنسر شپ عائد کر دی گئی اور سیاستدانوں کے بیانات کی اشاعت کو کڑی نگرانی میں رکھا گیا (۳۱)۔ سیاسی نظر بندیوں کا لامتناہی اور نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مارشل لاء کا یہ نیا روپ ہر سیاسی جماعت کے لیے بڑا کٹھن تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو سال تک ملک میں سیاسی عمل جمود کا شکار ہو کر رہ گیا۔ (۳۲)

۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے لے کر اکتوبر ۱۹۷۹ء تک کا عرصہ مارشل لاء انتظامیہ نے عوامی مزاج کے سمجھنے، سیاسی پارٹیوں کی ذہن خوانی، ان کے کام کے طریقہ کار اور عوام میں ان کی مقبولیت کا بغور جائزہ لینے کے لیے صرف کیا تھا (۳۳)۔ اگر اس عرصہ کے دوران تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے دوران پیدا شدہ قومی جذبات کا احساس کیا جاتا اور سیاستدانوں بالخصوص قومی اتحاد کے رہنماؤں میں ہم آہنگی ہوتی اور ان میں سے بعض، مارشل لاء کی ناجائز حکومت کے دست و بازو نہ بنتے تو عین ممکن تھا کہ جنرل ضیاء جو ۹۰ دن میں الیکشن کرانے کا وعدہ لے کر برسر اقتدار آئے تھے، انتخابات کے اس پہلے اعلان کے ساتھ ہی زمام اقتدار عوامی نمائندوں کے حوالے کر کے اپنے اصلی فرض منصبی کی طرف لوٹ جاتے (۳۴)۔ مارشل لاء کو اپنے اصلی جوہر دکھانے کے لیے سیاستدانوں نے ہی بنیاد فراہم کی تھی۔ قومی اتحاد کے بعض رہنماؤں کی ابن الوقتی اور بعد ازاں سول کابینہ میں ان کی ناقص کارکردگی نے مارشل لاء انتظامیہ کو نہ صرف سیاستدانوں کے بارے میں بدظن کر دیا بلکہ یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ سیاستدان ملکی انتظام چلانے کے اہل نہیں (۳۵)۔ اس کے علاوہ مارشل لاء انتظامیہ کے سامنے بھٹو دور کے تین ماہ کے عرصے پر محیط "مذاکرات برائے مذاکرات" اور بے نتیجہ بحث کا تلخ

تجربہ بھی موجود تھا۔ ان حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ مارشل لاء انتظامیہ طویل عرصہ کے لیے استقرار اقتدار کی منصوبہ بندی نہ کرتی (۳۶)۔ یہ سیاستدانوں کی باہمی چپقلش ہی تھی جس نے مارشل لاء انتظامیہ کو ۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۵ء جمہوری عمل کی طرف رجوع نہ کرنے پر اکسائے رکھا اور یہ سیاستدانوں کی بعد ازاں ہم آہنگی ہی تھی جس نے ضیاء حکومت کو انتخابات کرانے اور اختیارات سیاستدانوں کو منتقل کرنے پر مائل و مجبور کیا تھا (۳۷)۔

۱۹۸۱ء میں جب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مارشل لاء انتظامیہ کی طرف سے سختی کا سلسلہ قدرے نرم پڑا تو مختلف سیاسی حلقوں کی طرف سے بحالی جمہوریت کے عمل کی صدا بلند کی جانے لگی۔ اس سلسلے میں پیپلز پارٹی پیش پیش تھی (۳۸) جبکہ سابقہ قومی اتحاد کی جماعتوں میں تحریک استقلال، پی ڈی پی، جے یو آئی اور مسلم کانفرنس نمایاں تھیں جبکہ اتحاد سے باہر کی دیگر جماعتوں میں مسلم لیگ خیر الدین گروپ کا نام قابل ذکر ہے (۳۹)۔ اس نئے سیاسی اتحاد کو "تحریکِ بحالی جمہوریت ☆" (Movement for Restoration of Democracy M.R.D.) کا نام دیا گیا (۴۰)۔

اتحاد میں شمولیت کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی سے بھی رابطہ قائم کیا گیا لیکن انہوں نے رابطہ کنندگان پر واضح کر دیا کہ:

۱۔ جمعیت علمائے پاکستان جمہوریت کی بحالی کے سلسلے میں واضح اور غیر مبہم پالیسی کی حامل سیاسی جماعت ہے۔

۲۔ اس سلسلے میں اجتماعی سطح پر متفقہ لائحہ عمل اور محب وطن عناصر کا اتحاد وقت کی اہم ضرورت تھی۔

۳۔ اس ضمن میں صرف انہی جماعتوں سے تعاون کیا جا سکتا تھا جو لادینی اور سوشلسٹ نظریات سے پاک ہوں اور جو تشدد اور لاقانونیت سے پاک سیاسی جمہوری عمل پر یقین رکھتی ہوں۔ لہٰذا

۴۔ کسی ایسی سیاسی اتحاد میں جمعیت علمائے پاکستان کی شرکت ناممکن العمل اور ناقابل فہم ہے جس میں بائیں بازو کی انتہا پسند جماعتیں بالخصوص پاکستان پیپلز پارٹی موجود ہے۔ (۴۱)

☆ یہ اتحاد بیگم نصرت بھٹو اور نوابزادہ نصر اللہ خان کی کوششوں سے وجود میں آیا تھا۔

ایم آر ڈی کی تحریک (۴۲)، صوبہ سرحد کے تعلیمی اداروں میں طلباء تحاریک اور بذاتِ خود فوج کے اندر انتشار اور گروپ بندی کی سازشوں کے افشاء ہونے سے ضیاء حکومت نے ایک دفعہ پھر سیاسی حمایت کے حصول کا سلسلہ شروع کردیا (۴۳)۔ اس سلسلے میں اپنے دورہ ملتان کے دوران ضیاء الحق نے ایک اعلیٰ مشاورتی کونسل کے قیام کا عندیہ دیا (۴۴)۔ بعد ازاں انہوں نے ۲۵ فروری کو دورہ لاہور کے دوران اعلان کیا کہ مارچ ۱۹۸۱ء تک وفاقی کونسل قائم ہو جائے گی (۴۵)۔ اس سے محسوس ہو رہا تھا کہ بالآخر ضیاء حکومت جلد یا بدیر سیاسی عمل کی بحالی پر مجبور ہو جائے گی۔ ابھی حکومت گومگو کی کیفیت میں تھی کہ ۲ مارچ ۱۹۸۱ء کو الذوالفقار کی طرف سے پی آئی اے کے ایک بوئنگ طیارے کو کراچی سے پشاور پرواز کے دوران اغواء کرلیا گیا (۴۶)۔ اغواء کنندگان کا مطالبہ تھا کہ حکومت کے زیرِ حراست ۵۵ افراد کو رہا کر کے دمشق پہنچا دیا جائے۔ اس صورت حال میں عوام کی ہمدردیاں قدرتی طور پر منتشر ہوگئیں۔ اس سے حکومت کو بہر حال یہ سنہری موقع آ گیا کہ وہ سیاست میں موجود چند جماعتوں کو دہشت گرد اور وطن دشمن ثابت کرسکتی (۴۷)۔ حکومت نے دہشت گردوں کے مطالبے کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے ان مطلوبہ ۵۵ افراد کو جیلوں سے رہا کر کے، پی آئی اے کے ایک خصوصی طیارے کے ذریعے فی الفور دمشق پہنچا دیا (۴۸)۔ حالانکہ ان افراد میں سے اکثر نے دمشق جانے سے انکار کردیا تھا۔

طیارے کے اغواء سے سب سے زیادہ فائدہ حکومت کو پہنچا، جبکہ ایم آر ڈی کی تحریک جو ابھی اپنی مؤثر سیاسی سرگرمیوں کے لیے پلاننگ کررہی تھی ابتداء ہی سے انتشار کا شکار ہوگئی (۴۹)۔ اس کو جو سب سے پہلا دھچکا پہنچا وہ مسلم کانفرنس کی علیحدگی تھی۔ آزاد جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے صدر سردار عبدالقیوم خان نے ایسے ایک تخریب کارانہ اور وطن دشمن اتحاد قرار دیا (۵۰)۔ ایم آر ڈی کی تحریک نہ صرف یہ کہ زبردست بحران کا شکار ہوگئی بلکہ عوام الناس میں وہ مقبولیت نہ حاصل کرسکی جو عوامی حمایت اور تحریک کی قوت کے لیے درکار ہوتی ہے۔ ان حالات میں جمعیت علمائے پاکستان نے ایک بار پھر میدانِ عمل میں قدم رکھنے کا فیصلہ کرلیا اور ایم آر ڈی سے باہر کی جماعتوں سے رابطے تیز کردیئے گئے (۵۱)۔ اس سلسلے میں جمعیت کی مرکزی عاملہ کا اجلاس مارچ میں نائب صدر جمعیت پیر برکات احمد کی زیر صدارت ہوا (۵۲)۔ (کیونکہ مولانا نورانی ان دنوں بیرون ملک دورے پر گئے ہوئے

تھے۔) جس میں یہ اہم فیصلہ کیا گیا کہ نظریہ پاکستان کی حامی جماعتوں کو موجودہ صورتحال کا مقابلہ اتحاد واتفاق سے کرنا چاہیے۔ کیونکہ حالات جس نہج پر جارہے تھے وہ اندرونی طور پر ملک کو عدم استحکام اور انتشار کی راہ پر لے جارہے تھے۔ (۵۳)

اس موقع اتحاد کے لیے مسلم لیگ (پگاڑا گروپ جو کہ ان دنوں ایم آر ڈی میں شامل نہیں تھی) اور جمعیت علمائے پاکستان کے رہنما پیش پیش تھے (۵۴)۔ جمعیت اور مسلم لیگ کے باہمی اتحاد کی کوششیں جاری ہی تھیں کہ جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے بھی اتحاد میں شمولیت کے لیے جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت سے روابط تیز کردیئے (۵۵)۔ جماعت اسلامی کے رہنماؤں چوہدری رحمت الٰہی، مولانا فتح محمد اور چوہدری محمود احمد نے پیر پگاڑا سے ملاقات کی (۵۶) جبکہ مولانا گلزار احمد مظاہری، مولانا عبدالستار نیازی سے ملے۔ لیکن ماضی قریب میں پاکستان قومی اتحاد کے سلسلے میں جماعت اسلامی کے کردار اور بعد ازاں مارشل لاء حمایت کی وجہ باہمی اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کے لیے نتیجے میں جمعیت علمائے پاکستان نے جماعت کے متعلق محتاط رویہ اپنایا اور ان رہنماؤں پر واضح کردیا کہ متوقع اتحاد کے لیے ہم خیال جماعتوں کو کم سے کم پروگرام پر اکٹھا کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ (۵۷) ☆

اسی دوران جنرل ضیاء الحق کی طرف سے عبوری آئین (Provisional Constitutional Order) پیش کردیا گیا (۵۸) اور تمام ججوں کو اس کے تحت حلف اٹھانے پر مجبور کیا گیا اور جس جج نے حلف اٹھانے سے انکار کیا اسے فارغ کردیا گیا۔ (کیونکہ مارشل لاء انتظامیہ نے طیارہ کے اغواء کے بعد واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ اب مارشل لاء کو مارشل کی طرح چلایا جائے گا۔)

۲۹ مارچ ۱۹۸۱ء کو جمعیت علماء پاکستان نے اور پاکستان مسلم لیگ پگاڑا گروپ کی طرف سے متوقع اتحاد کے سلسلے میں مشترکہ اعلامیہ پیش کردیا گیا۔ جس کی رو سے اتحاد کو "تحریکِ تحفظِ پاکستان" کا نام دیا گیا (۵۹)۔ تین صفحات پر مشتمل اس مشترکہ اعلامیہ کی رو سے:

۱۔ پاکستان اس وقت اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہا ہے اور اسے اندرونی اور بیرونی خطرات کا سامنا ہے۔

☆ لیکن ان اقدامات کے باوجود مارشل لاء انتظامیہ بار بار یہی اصرار کررہی تھی کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کو منسوخ نہیں کیا گیا اور نہ ہی عدلیہ کے کام میں رکاوٹ پیدا کی گئی ہے۔ (شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ)

۲۔ ملک کے اندر پاکستان دشمن غیر ملکی طاقتوں کی پشت پناہی سے ایک منظم گروہ تشدد اور دہشت گردی پر عمل پیرا ہے اور ملک کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدات کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ یہ گروہ شروع ہی سے جلاؤ گھیراؤ کی منفی سیاست پر یقین رکھتا ہے اور (اس نے ماضی قریب میں) برسر اقتدار آکر بدترین فسطائی حکومت قائم کی اور تشدد اور خون خرابہ سے ملک میں خانہ جنگی کی صورت حال پیدا کی۔

۳۔ ان حالات میں محب وطن سیاسی جماعتوں کے اتحاد کی شدید ضرورت ہے۔(۶۰)

اتحاد کے مقاصد واضح کرتے ہوئے، اس مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا کہ:

۱۔ ملک میں نظام مصطفیٰ ﷺ کو اس کی اصل روح کے ساتھ نفاذ کے لیے مشترکہ جدوجہد کی جائے گی۔

۲۔ ملک گیر اندرونی و بیرونی سازشوں کے خاتمہ کے لیے اور عوام میں باہمی اتحاد استحکام کے سلسلے میں جمہوری عمل کو بحال کیا جائے گا۔ تاکہ ملک کی سلامتی کا تحفظ ممکن ہو سکے۔

۳۔ چونکہ مسلم لیگ اور جمعیت علمائے پاکستان نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا تھا اور بے مثال قربانیاں دی تھیں۔ اس لیے جمعیت اور لیگ جاری صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے خدا کو شاہد و گواہ بنا کر مشترکہ طور پر "تحریک تحفظِ پاکستان" چلانے کا اعلان کرتی ہیں اور عہد کرتی ہیں کہ تحریک میں دونوں جماعتیں بھرپور یکجہتی کے ساتھ ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملکی سالمیت تحفظ اور استحکام کے لیے کسی قسم کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کریں گی (۶۱)۔

اتحاد کے سلسلہ ۳۰ مارچ ۱۹۸۱ء کو دونوں جماعتوں کے رہنماؤں کے مذاکرات ہوئے اور باضابطہ اتحاد کے سلسلے میں تمام تفصیلات طے کی گئیں (۶۲)۔ اس ضمن میں لاہور میں جمعیت کے نائب صدر پیر سید برکات احمد کی رہائش گاہ پر اجلاس بلایا گیا (۶۳)۔ ان مذاکرات میں جمعیت علمائے پاکستان کی طرف سے پیر سید برکات احمد، سید شاہ محمد جیلانی، ملک اکبر ساقی اور مولانا عبد الستار نیازی، جبکہ مسلم لیگ (پگاڑا گروپ) کی طرف سے پیر پگاڑا کے علاوہ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، سردار عبد القیوم، ایس ایم ظفر، سید احمد سعید کرمانی،

چوہدری ظہور الٰہی، رانا خداداد خان، سلیم حسین قادری، پیر محمد اشرف، چوہدری محمد اشرف، چوہدری رحمت اللہ اور رانا محمد اشرف نے حصہ لیا (۶۴)۔ مذاکرات کے بعد باضابطہ طور پر اتحاد کے سمجھوتے پر دستخط کر دیئے گئے۔ اس موقع پر مولانا نیازی، پیر سید برکات احمد، پیر پگاڑا اور ایس ایم ظفر نے درج ذیل پانچ نکاتی پروگرام کا آئندہ جدوجہد کی بنیاد بنایا:

۱۔ سیاسی سرگرمیوں کی بحالی۔

۲۔ سنسر شپ کا خاتمہ۔

۳۔ تشدد، دہشت گردی اور لادینی نظریات کے خلاف رائے عامہ کی بیداری۔

۴۔ جمہوریت کی بحالی اور ملک میں عام انتخابات کا انعقاد۔

۵۔ عوام کی خوشحالی اور معاشی ناہمواری کو ختم کرنے، جرم و گناہ سے پاک معاشرہ کے قیام اور نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے مشترکہ جدوجہد۔(۶۵)

اس سے پہلے کہ "تحریک تحفظِ پاکستان" اپنی سیاسی جدوجہد کی سرگرمیوں کا آغاز کرتی، حکومت کی طرف سے اسے (ایم آر ڈی کی طرح) بے اثر بنانے کی کوششیں شروع کر دی گئیں (۶۶)۔ اس کا فوری محرک حکومت کا یہ اعلان بنا جو حکومت کی طرف سے اسلامی ڈھانچہ کی تشکیل کے متعلق تھا۔ جو وزارتی کمیٹی کے زیر نگرانی سرانجام پانا تھا۔ جس کے بعد مجلس شوریٰ کی طرف سے اس کی منظوری دی جانا تھی۔ یہ اعلان دراصل اسلامی رجحان کی حامل سیاسی جماعتوں میں انتشار و افتراق کی ایک کوشش تھا (۶۷)۔ بالالفاظ دیگر حکومت ایک عرصہ سے اس موقع کی تلاش میں تھی کہ کسی طرح سابقہ قومی اتحاد کی طرح سیاسی جماعت حاصل کر لی جائے۔ (۶۸) اسلامی نظام کے ڈھانچہ کی تشکیل کے وزارتی سطح پر انجام پانے اور مجلس شوریٰ میں منظوری کے اعلان نے ان جماعتوں یا رہنماؤں کے لیے حکومت میں شمولیت کی راہ ہموار کر دی جو اس مقصد کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھے (۶۹)۔ کیونکہ ان حالات میں ملک میں انتخابات کا جلد کرایا جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ بعد ازاں جب حکومت نے مجلس شوریٰ کی تشکیل کے کام کو اولیت دی تو جس نے بھی مجلس شوریٰ میں شمولیت کے لیے درخواست پیش کی اسے شرف قبولیت بخشا گیا (۷۰)۔

دیگر رہنماؤں کی دیکھا دیکھی جمعیت علمائے پاکستان کے بعض رہنما بھی حکومت جھانسے میں آگئے (۷۱)۔ جو جمعیت کے اندر گروہ بندی کے ذریعے حکومت کے ساتھ

مفاہمت کی راہ ہموار کر رہے تھے(۷۲)۔ جو کہ جمعیت کے تنظیمی ڈسپلن کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ اس گروہ کی قیادت جمعیت کے سیکریٹری اطلاعات ظہور الحسن بھوپالی کر رہے تھے(۷۳)۔ ان رابطوں کی تصدیق اس وقت ہوئی جب بھوپالی جمعیت کے منعقدہ اجلاس لاہور مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۸۱ء کے بعد اسلام آباد چلے گئے(۷۴)۔ بھوپالی نے چونکہ جمعیت کے اصولوں کی خلاف ورزی کی تھی لہٰذا جمعیت کے سیکریٹری جنرل مولانا عبد الستار نیازی نے بھوپالی کی رکنیت معطل کردی(۷۵)۔ ساتھ ہی یہ فیصلہ کیا گیا کہ دستور کے تحت دو ماہ کے اندر اندر پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں مسٹر بھوپالی کو وضاحت پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا بصورت دیگر ان کی رکنیت منسوخ کردی جائے گی(۷۶)۔

بھوپالی کے چلے جانے سے جمعیت کے اندر جو انتشار کی لہریں اٹھی تھیں ان کا دائرہ وسیع کرنے کی خاطر، حکومت کی طرف سے مولانا نورانی اور جمعیت علمائے پاکستان میں اختلافات کی خبریں جاری کی جانے لگیں(۷۷)۔ اسی سلسلے کی ایک خبر نیوز ایجنسی پی پی آئی نے ۲۵ مئی ۱۹۸۱ء کو جاری کی جس کے مطابق مولانا شاہ احمد نورانی نے پارٹی انتخابات کی وجہ سے جمعیت علمائے پاکستان سے علیحدگی اختیار کر کے مستقل طور پر بیرون ملک تبلیغی سرگرمیوں کا جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے(۷۸)۔ حالانکہ ان خبروں میں کوئی صداقت نہیں تھی۔ دو ماہ گزرنے کے بعد حسب دستور یکم جولائی ۱۹۸۱ء کو جمعیت پاکستان کی مرکزی کونسل کا اجلاس صدر جمعیت مولانا نورانی کی زیر صدارت منعقد ہوا(۷۹)۔ اس اجلاس میں جاری حالات کے ضمن میں متعدد فیصلے کیے گئے۔ کونسل نے مطالبہ کیا کہ:

۱۔ انتخابات کی راہ ہموار کرنے کے لیے محب وطن جماعتوں کو کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

۲۔ تشدد اور دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کے لیے سنسر شپ ختم کی جائے۔

۳۔ اہم قومی مسائل پر غور کے لیے محب وطن جماعتوں کی کانفرنس طلب کی جائے۔(۸۰)

اجلاس میں ظہور الحسن بھوپالی، دوست محمد فیضی اور سید احد یوسف کو جمعیت سے نکالنے کے فیصلے کی توثیق کر کے ان کی بنیادی رکنیت کردی گئی(۸۱)۔ (مذکورہ تینوں اشخاص نے مارشل لاء کی حمایت کا فیصلہ کرتے ہوئے صوبائی وزراء کے عہد حاصل کر لیے تھے۔)

مولانا شاہ احمد نورانی پر مختلف سیاسی حلقے دباؤ ڈال رہے تھے کہ "تحریک تحفظ پاکستان" کے اتحاد کو اور زیادہ وسیع کیا جائے تاکہ مارشل لاء انتظامیہ کے خلاف بھرپور تحریک چلائی جاسکے(۸۲)۔ اگرچہ مولانا شاہ احمد نورانی اس کے حق میں تھے لیکن اس سلسلے میں وہ نہ صرف محتاط واقع ہوئے بلکہ انہوں نے جمعیت کے اصولوں کے دائرہ میں رہ کر سیاسی جدوجہد کو یقینی بنایا۔ ان کے بقول ہم نے نوابزادہ نصر اللہ خان پر واضح کردیا تھا کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد ممکن نہیں کیونکہ پیپلز پارٹی کل کی ظالم تھی اس لیے آج اپنے آپ کو مظلوم نہیں کہہ سکتی(۸۳)۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ ان کی جماعت کسی ایسے اتحاد میں شامل نہیں ہوگی جس میں پیپلز پارٹی موجود ہو۔ غالباً ایم آر ڈی سے مولانا نورانی کے احتراز برتنے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی(۸۴)۔ البتہ ہم خیال دائیں بازو کی محب وطن سیاسی پارٹیوں سے اشتراک عمل ضروری ہے...... موجودہ حالات میں محب وطن جماعتوں پر سے پابندی ختم کی جائے اور انہیں سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی جائے تاکہ یہ جماعتیں زیر زمین تخریب کار عناصر کا مقابلہ کرسکیں۔ اگر محب وطن عناصر کو کام کرنے کا موقع نہ دیا گیا تو بائیں بازو کی زیر زمین جماعتیں کسی نہ کسی وقت حکومت کے لیے مسئلہ پیدا کرسکتی ہیں۔ اخبارات پر سنسر شپ عائد ہے۔ وزراء یکطرفہ طور پر اتحاد کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا(۸۵)۔ اس لیے جمعیت اور مسلم لیگ کا اتحاد ہوا۔ ان کے بقول اس اتحاد میں وسعت ہونی چاہیے لیکن نظریہ پاکستان اور قائداعظم کی مخالفت جماعتوں سے اتحاد نہیں کیا جاسکتا...... جمعیت نے واضح طور پر حکومت میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے(۸۶) ☆ اور اس سے انحراف نہیں ہوگا...... جمعیت نے قومی اتحاد سے اس وقت علیحدگی کا فیصلہ کیا کہ جب اس میں شامل بعض جماعتوں نے وزارتیں قبول کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔(۸۷)۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے "تحریک تحفظ پاکستان" کے اتحاد کو وسیع تر کرنے کے لیے ملک کی دیگر جماعتوں سے رابطے تیز کردیئے(۸۸)۔ ان کا واضح نظریہ تھا کہ نظریہ پاکستان کی داعی جماعتوں سے سیاسی اتحاد کیا جانا چاہیے چونکہ مسلم لیگ پاکستان کی خالق جماعت تھی اس لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ اس جماعت کے استحکام کے لیے کوششیں کی جائیں(۸۹)۔ اسی سلسلے میں مولانا شاہ احمد نورانی نے مسلم لیگ کے دو دھڑوں پیر پگاڑا گروپ

☆ لہٰذا جمعیت علمائے پاکستان پر یہ الزام بلا جواز تھا کہ پیپلز پارٹی سے اتحاد نہ کر کے جمعیت نے حکومت کے ہاتھ مضبوط کیے ہیں۔

اور خواجہ خیر الدین گروپ کے سربراہوں سے ملاقات کر کے انہیں آپس میں اتحاد پر مائل کیا۔ دونوں جماعتوں نے تعاون کا یقین دلایا لیکن بعدازاں بعض امور پر اختلافات کی وجہ سے ان دونوں مسلم لیگیوں کا اتحاد ممکن نہ ہوسکا۔(۹۰)

اسی دوران چوہدری ظہور الٰہی کے قتل نے نہ صرف سیاسی فضا کو مکدر کر دیا بلکہ مختلف سیاسی پارٹیوں کی طرف سے ایک دوسرے پر الزام تراشی کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا گیا(۹۱)۔ مولانا نورانی دہشت گردی کے خدشات کی پہلے ہی پیشگوئی کر چکے تھے لیکن ان کی بات پر حکومتی حلقوں نے کوئی کان نہ دھرا۔ اصلاح واحوال کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی نے جو تجاویز دیں اسے قومی پریس نے جمہوی اور تعمیری سوچ قرار دیتے ہوئے حکومت پر زور دیا کہ وہ جلد از جلد جمہوری اداروں کو بحال کر کے امن و امان کے عمل کو یقینی بنائیں:

’’کالعدم جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے تخریب وتشدد کی سیاست کی مذمت کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ تخریب وتشدد کی سیاست کو ختم کرنے کے لیے عوام کو اعتماد میں لیا جائے۔ نیز ملک وقوم کے عظیم تر مفاد میں ملک کو درپیش اندرونی و بیرونی خطرات سے لوگوں کو باخبر رکھا جائے۔ مولانا نورانی کی یہ باتیں بڑی بنیادی اور اصولی ہیں اور ہر محب وطن اور سنجیدہ فرد اپنی جگہ ایسے ہی خیالات اور احساسات رکھتا ہے۔ سیاست میں تخریب وتشدد ایک ایسا منفی رجحان ہے، جس کی کسی حال میں بھی تائید رعایت نہیں کی جاسکتی کیونکہ ایسی سیاست بہیمت کی مظہر تو قرار دی جاسکتی ہے اس کا شرف انسانی سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا کیونکہ ملک وقوم کی سلامتی و یکجہتی (انسانی وقار کے امین) اندازِ سیاست سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ جو لوگ تخریب وتشدد کی سیاست پر یقین رکھتے ہیں وہ ملک وقوم کے بہی خواہ نہیں کہلا سکتے۔ کیونکہ وہ بالواسطہ اس بات کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہوتے ہیں کہ وہ لوگوں کی جان و مال اور قومی مفادات کے تحفظ کو ایک مقدس فریضہ تصور نہیں کرتے بلکہ آنکھیں بند رکھتے ہیں ...... (ایسی صورتحال کا) ......مؤثر انسداد لوگوں کے تعاون سے ہی کیا جاسکتا ہے......قومی معاملات کے ضمن میں نہ صرف انہیں اعتماد میں لایا جائے بلکہ شریک بھی کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب عام لوگ قومی معاملات سے دور رکھے جائیں گے تو ان کا واسطہ اور دلچسپی ختم ہوتی جائے گی اور وہ کسی قدر بے چین بھی ہو جائیں گے اس لیے انہیں اندرونی و بیرونی خطرات سے آگاہ رکھنا، قومی امور میں شریک اور ذمہ دار بنانا بنیادی قومی تقاضا بن جاتا ہے...... یہ تقاضا

کسی منظم انداز میں یعنی معروف جمہوری اداروں کے وسیلے سے ہی بحسن وخوبی پورا ہوسکتا ہے۔ جب محب وطن جماعتیں یا حلقے ملک میں جمہوری اداروں کی بحالی یا قیام کی بات کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر یہی قومی تقاضے ہوتے ہیں...... یہ درست ہے کہ ہمارے ہاں ایسے عناصر بھی موجود رہے ہیں جو سیاست کے ذریعے اجنبی افکار ورجحانات کو فروغ دینے پر کمر بستہ ہے اور جنہوں نے قومی مفادات کے تحفظ کے ضمن میں خلوص کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ وہ کسی اخلاقی قدر کی پاسداری بھی نہ کر سکے۔ لیکن ایسے عناصر کا یہ ناپسندیدہ عمل ان کے بجائے افراد دوقوم کو سیاسی حقوق سے محروم رکھنے کا جواز نہیں بنایا جاسکتا۔ ایسے عناصر کا محاسبہ ضرور ہونا چاہیے لیکن قوم کے جمہوری حقوق کی قیمت پر نہیں بلکہ ایسے عناصر کے مؤثر توڑ کا واحد طریقہ صرف جمہوری اداروں اور عمل کی جلد از جلد بحالی ہے۔ قوم کو اعتماد میں لینے کے لیے اسے ملک کی سلامتی اور بقاء کے تحفظ میں ذمہ دار بنانے کے لیے جمہوری عمل کی بحالی ازبس ضروری ہے۔ اس طرح اس بنیادی ضرورت کے ضمن میں ہی قومی پریس پر ایسی قدغن لگانا بھی دانشمندی اور حقیقت پسندی نہیں جو لوگوں میں قومی شعور کی بیداری اور ان کے قومی نقطہ نظر سے تربیت کی راہ میں مانع ہو۔ قومی اخبارات ملک میں منفی سیاسی رجحانات کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ وہ ایسے عناصر کی نہ صرف نشاندہی کرتے رہے بلکہ ان کی فکر وعمل کا رد کرنے میں بھی کوشاں رہے ہیں۔ ان پر سنسر کی پابندی جہاں حکومت اور پریس کے مابین بے اعتمادی پیدا کرنے کا موجب بنی ہے وہاں قومی اخبارات، قومی کردار کے استحکام میں اپنا حصہ ادا کرنے سے بھی کسی حد تک قاصر ہوگئے ہیں اور یہ کوئی صحت مند معمول نہیں ہے۔ حکومت کو ملک وقوم کے وسیع تر مفاد میں ان بنیادی امور پر حقیقت پسندانہ انداز میں غور وخوض کرنا چاہیے۔ ملک کسی شخص یا سیاسی گروہ کی میراث نہیں ہوتا۔ اس کے مالک و وارث افراد وقوم ہوتے ہیں۔ نہ صرف ان کی حیثیت کو تسلیم کیا جانا چاہیے بلکہ اس حیثیت کو فوقیت دی جانی چاہیے کیونکہ ملک وقوم کی سلامتی اور یکجہتی وفلاح کا یہ بدیہی تقاضا ہے۔‘‘(۹۲)

لیکن ماضی قریب میں مولانا شاہ احمد نورانی نے جب بھی حکومتِ وقت کو اصلاح احوال کے لیے تجاویز دیں، حکومت نے ایک ہی عذر لنگ پیش کیا اس سلسلے میں کونسی حکمت عملی اپنائی جائے کیونکہ سیاسی حلقوں میں واضح ذہنی بغاوت اور اختلافات موجود ہیں(۹۳)۔ حالانکہ ۱۹۸۱ء کے اوائل میں ہی جمعیت علمائے پاکستان کی طرف سے سیاسی حلقوں کی رائے

کے لیے سیاستدانوں کی گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کردی گئی تھی تا کہ بحالی جمہوریت کی جدوجہد کو مؤثر کرنے کے لیے حکومت کو مشترک موقف کے ذریعے آمادہ کیا جاسکے۔(۹۴)

جب مولانا شاہ احمد نورانی کی گول میز کانفرنس کی تجویز کو حکومتی سطح پر کوئی پذیرائی نہ بخشی گئی تو انہوں نے رابطہ عوام مہم ازسرنو شروع کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ عوام الناس تک یہ اصل حقائق پہنچائے جائیں جو حکومتی پابندیوں کی وجہ سے کماحقہ نہیں پہنچ رہے تھے(۹۵)۔اس سلسلے میں انہوں نے اکتوبر۱۹۸۱ء میں پنجاب کے بعض علاقوں کا دورہ کیا اور حکومتی حلقوں پر واضح کردیا کہ ملک میں تشدد اور تخریب کی سیاست کے خلاف رائے عامہ کو بیدار اور منظم کرنے کے لیے محب وطن سیاسی جماعتوں کی سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی جائے اور ایسی سیاسی جماعتیں جو الیکشن کمیشن سے باقاعدہ رجسٹرڈ ہیں کم از کم انہیں آئین کے تحت سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی جائے تا کہ وہ تشدد کی سیاست کے خلاف رائے عامہ کو منظم کرسکیں۔(۹۶)

مجوزہ گول میز کانفرنس کی افادیت کو انہوں نے یوں واضح کیا کہ ملک میں درپیش مسائل کے حل کے لیے گول میز کانفرنس ضروری تھا جس میں تحریک نظام مصطفی ﷺ میں شامل سیاسی جماعتوں کے قائدین کو مدعو کیا جائے۔ اگر حکومت ملک کے مسائل حل کرنے میں مخلص تھی اور عوام کو اعتماد میں لینا چاہتی تھی تو اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سیاسی رہنماؤں کی گول میز کانفرنس بلائی جائے۔ سنسرشپ ختم کی جائے اور سیاسی سرگرمیوں پر عائد پابندیاں اٹھائی جائیں۔(۹۷)

لیکن حکومت نے ان باتوں پر کوئی کان نہ دھرا۔ بلکہ ہمیشہ نت نئی بحث چھیڑ کر سیاسی حلقوں میں انتشار اور بے چینی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح مارشل لاء کو عوامی حمایت یافتہ بنانے کے لیے مجلس شوریٰ کی تشکیل کے لیے اقدامات کیے جانے لگے تا کہ گول میز کانفرنس کی تجویز کی عملی افادیت کو ختم کیا جاسکے(۹۸)۔ بلکہ ضیاء کا خود یہ کہنا تھا کہ موجودہ حالات میں انتخابات نہیں کرائے جاسکتے نہ ہی انتخابات کے مسئلہ پر گول میز کانفرنس ہوسکتی ہے۔ سیاسی جماعتیں اگر حکومت سے تعاون کرنا چاہتی تھیں تو ان کے دروازے کھلے تھے (خواہ وہ چور دروازے ہی کیوں نہ ہوں) ملکی سلامتی کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسا مناسب طریق کار اختیار کیا جائے جس سے حکومت سیاستدانوں کے حوالے کی جاسکے۔(۹۹)

تاہم مولانا شاہ احمد نورانی نے اس ضمن میں رائے عامہ کو بیدار کرنے کا سلسلہ

جاری رکھا۔ پنجاب کے تیسرے مرحلے کے دورے میں انہوں نے نہ صرف عوام الناس کو سیاسی جماعتوں کی کارکردگی سے آگاہ کیا بلکہ بحالی جمہوریت کے لیے مارشل لاء کے خلاف اشتراک عمل مختلف سیاسی جماعتوں کو بھی دعوت دی:

''جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد کے لیے اشتراک عمل کی خاطر جمعیت کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ ہمارا اور مسلم لیگ پگاڑا گروپ (یعنی تحریک تحفظ پاکستان کی اتحادی جماعتیں۔) کا مؤقف واضح ہے کہ مجلس شوریٰ انتخابات کا متبادل نہیں ہے۔ یہ صرف ڈھونگ رچایا جارہا ہے۔ اس کے لیے کچھ خوشامدی اور مجاور قسم کے لوگ مجلس شوریٰ میں آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انتخابات نہ کروا کر (ملک میں) مشرقی حصے جیسے حالات پیدا کیے جارہے ہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ملک میں انتخابات کے لیے فضا سازگار نہیں ہے وہ پڑوسی ممالک ایران اور بنگلہ دیش کا جائزہ لیں کہ وہاں سنگین حالات کے باوجود انتخابات ہوئے ہیں مگر افسوس ہے کہ یہاں طرح طرح کی آزمائشیں کی جارہی ہیں......''(۱۰۰)

پنجاب حکومت نے مولانا نورانی تیسرا مرحلہ کی رابطہ عوام مہم (حالانکہ پرامن انداز میں جاری تھی) کے دوران انہیں گرفتار کرکے کراچی بھجوادیا گیا اور تین ماہ کے لیے ان کے پنجاب میں داخلہ پر پابندی عائد کردی گئی۔ بلکہ ان پر اس سلسلے میں کڑی نظر رکھی گئی اور انہیں پانچ دن بعد ۳۰ نومبر ۱۹۸۱ء کو اسلام آباد میں مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کانفرنس (جو کہ بہر حال ایک غیر سیاسی کانفرنس تھی) میں شرکت سے روک دیا گیا(۱۰۱)۔☆

مولانا شاہ احمد نورانی کی طرف سے حکومت پنجاب کے پابندی کے احکامات کو ۳ دسمبر۱۹۸۱ء کو لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کردیا گیا(۱۰۲)☆☆۔انہوں نے اس دوران صوبہ سندھ میں سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ ان کے بقول ملک کو اندرونی اور بیرونی محاذ پر سنگین خطرات لاحق تھے جن کا واحد حل منصفانہ اور آزادانہ انتخابات میں مضمر تھا۔ جبکہ نامزد افراد پر مشتمل پارلیمانٹ مطلوبہ مقاصد پورے نہیں کرسکتی۔ نہ تو وزارتوں کی پیشکش کو پذیرائی بخشی جائے گی اور نہ ہی غیر جمہوری اداروں یا تحاریک کا خیر مقدم کیا جائے گا...... اگر ہماری

☆ حالانکہ ان پر پابندی حکومتِ پنجاب کی طرف سے لگائی گئی تھی جن کا اطلاق وفاقی علاقہ جات پر نہیں ہوتا تھا۔

☆☆ بعد ازاں لاہور ہائی کورٹ نے کالعدم قرار دے دیا۔

جماعت (جمعیت علمائے پاکستان) کے لوگ ایسا طرزِ عمل اختیار کریں گے تو ان سے سختی سے نمٹا جائے گا (۱۰۳)۔☆

تاہم جنرل ضیاء الحق نے سیاسی حمایت کے حصول کے سلسلہ میں اپنے سابقہ فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۲۵ دسمبر ۱۹۸۱ء کو مجلس شوریٰ کے قیام کا اعلان کر دیا (۱۰۴)۔ جسے ملک کے سیاسی حلقوں نے ناپسندیدہ قرار دیا۔ اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے مولانا نورانی کو باضابطہ طور پر ایک سوال نامہ بھیجا گیا جس میں صدر کے اختیارات اور حکومت کی تشکیل سے متعلق ان کی رائے طلب کی گئی تھی (۱۰۵)۔ مولانا نورانی نے جواب دیا کہ ایسے امور پر بحث کے لیے موزوں ترین جگہ پارلیمنٹ ہے جہاں تک طرز حکومت کا تعلق تھا تو اس کے حوالے سے تمام معاملات کے لیے آئین میں تمام تر وضاحت موجود ہے۔(۱۰۶) مارشل لاء انتظامیہ نے مولانا نورانی کی سیاسی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے لیے ایک نیا ضابطہ جاری کیا جس کے تحت حکومت کسی بھی شخص کو وجہ بتائے بغیر بیرون ملک جانے سے روکنے کی مجاز تھی اور مفاد عامہ کے پیش نظر اس قانون کے تحت متاثر فرد کو وجہ بتانا ضروری نہیں تھا تاہم حکومت کے اقدام کے خلاف پندرہ دن کے اندر اندر نظر ثانی کی اپیل کا حق دیا گیا تھا لیکن مذکورہ اپیل پر حکومت کے فیصلے کو حتمی حیثیت حاصل تھی جسے کسی بھی عدالت یا اتھارٹی کے روبرو چیلنج کرنے کا حق حاصل نہ تھا (۱۰۷)۔☆☆

☆ اسی بناء پر احد یوسف، دولت محمد فیضی اور ظہور الحسن بھوپالی کے خلاف کارروائی کی گئی تھی۔ جمعیت علمائے پاکستان کی تقلید میں دیگر جمہوریت پسند جماعتوں نے بھی ایسے افراد کے خلاف تادیبی اقدامات کرتے ہوئے اپنی پارٹیوں سے خارج کر دیا۔ جو مارشل لاء کے زیر سایہ چلے گئے تھے۔ اس سلسلے میں مسلم لیگ پگاڑا گروپ کے جنرل سیکریٹری ایس ایم ظفر اور تحریک استقلال کے نائب صدر میاں محمود علی قصوری کے اقدامات قابل ذکر ہیں جبکہ جماعت اسلامی نے اپنی سابقہ روش کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ جماعت اسلامی کے ممتاز رہنما چوہدری رحمت الٰہی نے واضح طور پر اعلان کیا کہ ان کی جماعت کے وہ اراکین مجلس شوریٰ میں شریک ہوئے ہیں جماعت میں اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھیں گے کیونکہ ان کا انتخاب پیشہ وارانہ نمائندگی کی بنیاد پر کیا گیا۔

☆☆ اس سے پیشتر مولانا نورانی کو دبئی ایئر پورٹ سے ہی سرکاری حکم کے تحت ہٹا دیا گیا تھا کیونکہ وہ وہاں پاکستانیوں سے خطاب کر کے انہیں ملکی صورتحال سے آگاہ کرنے والے تھے۔ اس قدم سے ضیاء الحق حکومت کی مولانا نورانی سے چپقلش کی شدت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تاہم مولانا شاہ احمد نورانی نے اندرون ملک اپنی سیاسی سرگرمیوں کو نہایت شدت سے جاری رکھا۔ بالخصوص گول میز کانفرنس کے حوالے سے انہوں نے بالخصوص کوششیں جاری رکھیں اور اس مقصد کے لیے مختلف جماعتوں کے سربراہوں سے ملاقاتیں کیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ نظریہ پاکستان کے حامی محبِ وطن سیاسی جماعتوں کا ایک پلیٹ فارم پر اجتماع، مثبت نتائج کا حامل ہوگا (۱۰۸)۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ۷ جنوری ۱۹۸۲ء کو پیر پگاڑا سے مجوزہ کانفرنس کے معاملات طے کرنے کے لیے ملاقات کی (۱۰۹)۔ اسی روز نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات عابد زبیری نے بھی مولانا شاہ احمد نورانی سے ملاقات کر کے گول میز کانفرنس کے حوالے سے حمایت کا یقین دلایا (۱۱۰)۔ اسی طرح ۸ جنوری کو میر غوث بخش بزنجو ملاقات بھی نتیجہ خیز ثابت ہوئی (۱۱۱)۔

جمعیت علمائے پاکستان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ایم آر ڈی کے اور اس سے باہر کی جماعتیں (بالخصوص تحریک تحفظِ پاکستان) کم سے کم نکات پر مارشل لاء کے خلاف اپنی حکمت عملی ترتیب دیں لیکن اس سلسلے میں ضروری نہیں تھا کہ انتخابی اتحاد ہی واحد پلیٹ فارم تھا۔ جس کے ذریعے جدوجہد کی جاتی۔ اس کا واحد مقصد بحالی جمہوریت کے مشترکہ جدوجہد تھا۔(۱۱۲)۔

جمعیت علمائے پاکستان کے ممتاز رہنما شاہ فرید الحق کے بقول گول میز کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کو درپیش خطرات کے پیش نظر ضروری ہے کہ باہمی اختلافات کو بھلا کر کم سے کم پروگرام پر مشترکہ جدوجہد کی جائے (اور اس سلسلے میں کسی جماعت پر، کوئی قدغن نہیں کہ وہ کانفرنس میں شامل ہو یا نہ ہو) (۱۱۳)۔☆

انتخابات کے پر امن انعقاد کو ممکن نہیں ہونے دیں گے دوسرے یہ کہ اگر فی الوقت انتخابات کرائے گئے تو مخلوط اور کمزور حکومت بنے گی۔(۱۱۵)☆☆

☆ ان کا اشارہ غالباً جماعت اسلامی کی طرف تھا۔

☆☆ ضیاء الحق نے یہ اعلان مجلس شوریٰ کے افتتاحی اجلاس میں کیا تھا۔ وہ دراصل شوریٰ کے خلاف سیاستدانوں کو متحد ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے تھے اس لیے وہ انتخابات کے التوا کے بہانے تلاش کر رہے تھے جس کے لیے کبھی وہ دہشت گردی کے واقعات کو بہانہ بنانے یا سیاستدانوں کے باہمی نفاق اشراق و تفاوت کو وجہ کچھ بھی ہو ان کا ایک ہی مقصد تھا کہ اپنے اقتدار کو کسی طریقے سے طول دیا جائے۔

این ڈی پی اور تحریک استقلال نے مولانا شاہ احمد نورانی کی گول میز کانفرنس کی تجویز کو نہ صرف پسند کیا بلکہ بحالی جمہوریت کی جدوجہد کو مؤثر بنانے کے لیے وسیع تر اتحاد کی ضرورت پر زور دیا (۱۱۶)۔

ضیاء الحق حکومت نہیں چاہتی تھی کہ سیاستدانوں کو مل بیٹھنے کا کوئی مشترکہ پلیٹ فارم میسر آئے اس لیے حکومت سندھ نے مولانا شاہ احمد نورانی، سردار شیر باز مزاری، پروفیسر شاہ فرید الحق، مخدوم خلیق الزماں، عابد زبیری، نفیس احمد صدیقی اور پیار علی الانہ کو تنبیہ کی گئی کہ وہ ہر قسم کی سیاسی سرگرمیاں ترک کر دیں اور اس سلسلے میں انہیں باضابطہ نوٹس جاری کر دیئے گئے (۱۱۷) اور کسی خلاف ورزی کی صورت میں مارشل لاء ضابطہ نمبر ۴۸ کے تحت تادیبی کارروائی کی دھمکی دی گئی۔ اس کے علاوہ حکومت نے بعض سیاستدانوں کی صوبہ بدری کے احکامات بھی جاری کیے جن میں نیشنل پارٹی کے میر غوث بخش بزنجو اور مولانا نورانی پیش پیش تھے اور ان پر پابندی عائد کی گئی کہ وہ سندھ کی حدود میں داخل نہ ہوں۔ (۱۱۸) یہاں تک کہ حکومت کی طرف سے اخبارات کو بھی ان سیاستدانوں کی خبریں شائع کرنے سے روک دیا گیا۔ اور تمام غیر سندھی رہنماؤں کی سندھ میں داخلہ پر پابندی لگا دی گئی (۱۱۹)۔ ان جمہوریت مخالف سرگرمیوں سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ حکومت سیاستدانوں کے باہمی روابط سے کس درجہ خائف تھی (۱۲۰)۔

۲۶ جنوری ۱۹۸۲ء کو ایس ایم ظفر، سیکریٹری جنرل پاکستان مسلم لیگ (پگاڑا گروپ) نے مولانا شاہ احمد نورانی سے ایک اہم ملاقات کی جس میں مجوزہ گول میز کانفرنس اور بعد ازاں متوقع وسیع تر سیاسی اتحاد کے لیے ممکنہ اقدامات پر غور کیا گیا۔ مزید برآں اتحاد کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور ان کے سدباب سے متعلق پہلوؤں کا جائزہ بھی لیا گیا۔ (۱۲۱) مولانا نورانی نے اسی شام پیر پگاڑا سے بھی ان کے رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ بعد ازاں مشیر احمد پیش امام (تحریک استقلال کے اہم رہنما) اور مولانا کوثر نیازی سے بھی اس حوالے سے گفتگو کی (۱۲۲)۔

سیاستدانوں کی ان کوششوں کو ناکام کرنے کے لیے ضیاء الحق نے (جو ان دونوں بیرون ممالک کے دورے پر گئے ہوئے تھے) نے واپسی پر اعلان کیا کہ حکومت کو محبِ وطن جماعتوں کی سیاسی سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہیں لیکن عمل اس کے برعکس ہوا، سیاسی رہنماؤں

پر پابندیاں لگا دی گئیں اور ان کو ایک دوسرے سے ملنے سے روک دیا گیا (۱۲۳)۔ اس صورتحال سے تناظر میں مولانا شاہ احمد نورانی نے حکومت کے قول و فعل کے واضح تضاد کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ ایک طرف تو حکومت کی طرف سے یہ تاثر عام ہے کہ سیاسی جماعتوں میں باہمی افہام و تفہیم اور اجتماعی شعور کی کمی ہے جس کی وجہ سے یہ متحد ہو رہی ہیں اور کسی مشترکہ مؤقف پر پہنچ رہی ہیں تو حکومت طرح طرح کی پابندیاں عائد کر رہی تھی (۱۲۴) ☆۔ اس سے تو صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت سیاستدانوں کو متحد دیکھنا ہی نہیں چاہتی (۱۲۵) ☆☆۔

۷ فروری ۱۹۸۲ء کو مسلم لیگ رہنما خواجہ خیر الدین نے ایم آر ڈی کے ترجمان کی حیثیت سے مولانا شاہ احمد نورانی سے ملاقات کی (۱۲۶) ☆☆☆ اور ایم آر ڈی کے سابقہ رویہ کے حوالے سے معذرت بھی کی (۱۲۷)۔ اس ملاقات میں مولانا شاہ احمد نورانی نے آئندہ متوقع اتحاد کے حوالے سے جمعیت علمائے پاکستان کے چھ نکاتی ایجنڈے کی تفصیلات سے آگاہ کیا (۱۲۸) ☆☆☆☆۔ جس کی بنیاد ایک خالص سیاسی نگران حکومت کا قیام تھا (۱۲۹)۔ اس کے درج ذیل ایجنڈے پر عمل درآمد کی یقین دہانی کرائی گئی تھی:

۱۔ عبوری آئین کے حکم (Provisional Constitutional Order P.C.O) کا خاتمہ

☆ مولانا شاہ احمد نورانی نے واضح طور پر کہا کہ ان حکومتی پابندیوں کے نتیجہ میں علاقائی عصبیت، صوبائی منافرت اور پاکستان سے نفرت کو فروغ مل رہا ہے اور جب سندھی غیر سندھی بنیادوں پر سیاستدانوں کی بدری عمل میں آتی ہے تو لامحالہ طور پر قومیت اور فرقہ وارانہ نعروں کو فروغ ملتا ہے جو ملکی استحکام و یکجہتی کے لیے کسی طور بھی خوشگوار نہیں۔ مذہبی پابندیوں کے حوالے سے مولانا شاہ احمد نورانی کا مؤقف تھا کہ اس طرح کی پابندیوں کو قبول نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ۱۵۰ سالہ انگریز دور پاکستان میں بھی ایسی پابندیوں کی مثال نہیں ملتی۔

☆☆ حکومت صرف اسی ایک نکتہ کی بناء پر سیاسی جماعتیں باہم متحد و متفق نہیں اس لیے عام انتخابات کا عمل بے فائدہ اور خانہ جنگی کا باعث ہوگا، بار بار انتخابات کا اعلان کے باوجود انہیں ملتوی کرتی رہی۔

☆☆☆ حالانکہ اس سے قبل ایم آر ڈی نے مولانا شاہ احمد نورانی سے مذاکرات نہ کرنے کا اعلان کیا۔
(روزنامہ وفاق، ۶ فروری ۱۹۸۲ء)

☆☆☆☆ ایم آر ڈی سے اتحاد کرنا ایک الگ معاملہ تھا جس کے متعلق مولانا نورانی کا مؤقف بالکل واضح تھا۔ (انٹرویو شاہ فرید الحق)

۲۔ مارشل لاء کے کسی بھی نئے ضابطے کا نفاذ کیا جائے۔

۳۔ سرسری سماعت کی آرمی کورٹس کی تحلیل۔

۴۔ عدلیہ کے اختیارات کی بحالی اور

۵۔ اخبارات پر عائد سنسر شپ کا خاتمہ۔

۶۔ سیاسی جماعتوں پر سے پابندی کا خاتمہ اور سیاسی سرگرمیوں کی بحالی۔(۱۳۰)

مولانا نورانی کے بقول مجوزہ نگران حکومت الیکشن کمیشن کی زیرِ نگرانی رائے دہندگان کی فہرستیں تیار کرائے گی اور سیاسی جماعتیں صرف اس واحد شرط کے ساتھ شریک اقتدار ہوں کہ مقررہ مدت کے اندر اندر اقتدار عوام کے نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے گا(۱۳۱)۔ جبکہ ان کے بقول نگران حکومت کے لیے قومی سطح کی وہ آٹھ یا نو جماعتیں مدعو کی جائیں جو سابقہ دونوں انتخابات میں قوم کی نمائندگی کر چکی تھیں۔ بعد ازاں مذکورہ ایجنڈا تحریک تحفظِ پاکستان کی دونوں جماعتوں جمعیت اور لیگ نے باضابطہ طور پر حکومت تک پہنچا دیا(۱۳۲)۔ حکومتی حلقوں میں قول و فعل کی عدم یکسانیت اور فیصلوں میں عجلت کا مظاہرہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ خیر الدین نورانی ملاقات سے ٹھیک اگلے دن وزیر اطلاعات و نشریات راجہ ظفر الحق نے بیان دیا کہ عام انتخابات اب چند مہینوں کی بات ہے جبکہ دس فروری ۱۹۸۲ء کو ضیاء کابینہ نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ ملک میں سیاسی سرگرمیوں کی قطعی اجازت نہیں دی جا سکتی(۱۳۳)۔

مولانا نورانی نے اس فیصلے کو ملکی سیاسی جمہوری عمل کے لیے ناقابل اور مایوس کن قرار دیا۔(۱۳۴)

ان کے بقول صرف سیاسی جماعتیں ہی ملکی مفادات کے تحت سیاسی معاملات پر غور کر سکتی تھیں اس لیے حالیہ فیصلے سے حالات کے مزید بگاڑ کی توقع تھی(۱۳۵)۔ اگر صحیح اقدامات نہ کیے گئے تو ملکی سالمیت کو شدید خطرات لاحق ہو سکتے تھے جن میں زیرِ زمین سرگرمیوں میں شدت اور تخریب کاروں کی حوصلہ افزائی شامل تھی۔(۱۳۶)

سیاسی سرگرمیوں کی بحالی اور جمہوری عمل کے فروغ کے لیے جمعیت علمائے پاکستان نے پروفیسر شاہ فرید الحق کے زیرِ نگرانی ورکنگ پیپر تیار کر لیا تھا جو مولانا نورانی کے چھ نکاتی ایجنڈے، این ڈی پی کے آٹھ نکات اور ایم آر ڈی کے چار نکات کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا

تھا۔(۱۳۷)

حکومتی حلقوں کی طرف سے اسی اثناء میں مولانا شاہ احمد نورانی کے نگران وزیر اعظم کی افواہ پھیلا دی گئی جس کا واحد مقصد ممکنہ سیاسی اتحاد کے لیے سیاسی جماعتوں کی کوششوں پر پانی پھیرنا(۱۳۸)۔ جبکہ عوام کو دھوکہ دینے کے لیے حکومتی حلقے مارشل لاء حکومت کی عمدہ کارکردگی کا ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے اور دوسری طرف ضیاء الحق نے سیاستدانوں کی حوصلہ شکنی کا محاذ سنبھالا ہوا تھا۔(۱۳۹)

لیکن مولانا شاہ احمد نورانی نے ان حکومتی سختیوں اور مخالفتوں کے باوجود سیاستدانوں میں باہمی اتفاق و یگانگت پیدا کرنے کی غرض سے اپنی مساعی جاری رکھی۔ انہی کوششوں کو صحافتی حلقوں نے بھرپور ستائشانہ نگاہوں سے دیکھا: ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جو اقدامات کیے گئے ان کی توثیق سپریم کورٹ نے اس شرط کے ساتھ کی تھی کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت ہی آزادانہ منصفانہ انتخابات جلد از جلد کرائے جائیں گے اور عبوری مدت میں ایسے مقصد میں ساری توجہ مرکوز کی جائے گی۔ یہ شرط عائد کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے اعلان کیا تھا کہ ۱۹۷۳ء کا آئین ہی ملک کا اعلیٰ ترین قانون ہے...... مولانا شاہ احمد نورانی نے اربابِ اختیار اور سیاستدانوں کے غور و فکر کے لیے موجودہ تعطل کا جو حل ۶ فروری ۱۹۸۲ء کو تجویز فرمایا ہے اس میں بھی ۱۹۷۳ء کے آئین کو قومی یکجہتی کا مظہر قرار دیا گیا ہے۔ حکومت اور اربابِ سیاست کے درمیان مفاہمت کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے صدر مملکت اگر مولانا شاہ احمد نورانی کے پیش کردہ فارمولا کو مذاکرات کی بنیاد بنانے پر اپنی رضامندی کا اظہار فرما سکیں تو یقیناً مفاہمت کے امکانات اور زیادہ روشن ہو جائیں گے......(۱۴۰)

۲ مارچ ۱۹۸۲ء کو مولانا شاہ احمد نورانی نے ملک کی معروف سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کو اپنی قیام گاہ پر مدعو کیا تاکہ پُرامن انتقالِ اقتدار کا کوئی مشترکہ لائحہ عمل طے کیا جا سکے(۱۴۱)☆۔ ملاقات کو ایک کھلے پلیٹ فارم میں تبدیل کرنے کی غرض سے اخباری نمائندگان کو بھی دعوت دی گئی(۱۴۲)۔ پارٹی رہنماؤں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت ملک میں جلد از جلد انتخابات کرائے جائیں۔ این ڈی پی کے سربراہ نے کہا کہ انہیں

☆ مذاکرات کے اس عمل میں مسلم لیگ کے سربراہ پیر پگاڑا، پیپلز پارٹی کے غلام مصطفیٰ جتوئی، این ڈی پی کے سردار شیر باز مزاری اور تحریک استقلال کے سیکریٹری جنرل مشیر احمد پیش امام شامل تھے۔

مولانا نورانی پر مکمل اعتماد ہے کیونکہ ہم انہیں برسوں سے جانتے ہیں اس لیے یہاں اکٹھا ہونے کا مقصد باہمی افہام وتفہیم کی فضا کا قیام ہے۔(۱۴۳) ☆

۸ مارچ ۱۹۸۲ء کو پیپلز پارٹی کے رہنما عبد الحفظ پیرزادہ اور مولانا شاہ احمد نورانی کے درمیان طویل ملاقات ہوئی۔ ان مذاکرات میں پروفیسر شاہ فرید الحق کے تیار کردہ ورکنگ پیپر زیر بحث آیا جسے بعد ازاں ایم آر ڈی کے مطالعہ کے لیے عبد الحفیظ پیرزادہ کے حوالے کر دیا گیا(۱۴۴)۔

پروفیسر شاہ فرید الحق کے تیار کردہ مشترکہ اعلامیے پر تحریک پاکستان میں شامل دونوں جماعتوں کی مشترکہ کمیٹی نے ۱۱ مارچ ۱۹۸۲ء کو غور کیا۔ اس کمیٹی کے اجلاس میں مسلم لیگ پگاڑا گروپ کی طرف سے پیر پگاڑا اور محمد خان جونیجو جبکہ جے یو پی کی طرف سے مولانا نورانی، پروفیسر شاہ فرید الحق اور مولانا محمد حسن حقانی نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں کافی غور و خوض کے بعد مشترکہ اعلامیے کی منظوری دے دی گئی(۱۴۵)

۱۲ مارچ کو پاکستان جمہوری پارٹی کے سرکردہ رہنما ارشد چوہدری اور نیشنل ڈیمو کریٹک پارٹی کے عابد زبیری نے پیر پگاڑا سے ملاقات کی لیکن بعض نکات پر عدم اتفاق کی وجہ سے ان رہنماؤں کے ذہن میں تحفظات پیدا ہوگئے جو انہوں نے بعد ازاں اسی دن مولانا نورانی سے ملاقات میں ظاہر کیے لیکن مولانا نورانی نے مشترکہ اعلامیے کے حوالے سے انہیں ہر طرف سے مطمئن کیا۔(۱۴۶)

سیاسی رہنماؤں سے ملاقات اور ممکن اتحاد کے حوالے سے جو صورتحال پیدا ہوئی تھی اس پر غور و خوض کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی نے ۱۲ مارچ ۱۹۸۲ء کو جمعیت علماء پاکستان کی جنرل کونسل کا اجلاس طلب کیا(۱۴۷)۔ اس اجلاس کا مقصد دیگر امور کے علاوہ آئندہ بننے والے اتحاد کے حوالے سے پیپلز پارٹی کی شمولیت کا جائزہ لینا تھا۔ یہ اجلاس دو دن تک جاری رہا لیکن اراکین کی اکثریت پیپلز پارٹی کے ساتھ کسی بھی طرح سیاسی اتحاد و اشتراک کے خلاف تھی کیونکہ پیپلز پارٹی نے اپنے عہد حکومت میں جمہوریت کا جس طرح مذاق اڑایا تھا۔ ان وجوہات کی بناء پر جے یو پی کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ نے کثرت رائے پیپلز پارٹی

☆ اس ضیافت میں پاکستان جمہوری پارٹی (پی ڈی پی) کے رہنما محمد ارشد چوہدری اور مسلم لیگ کے محمد خان جونیجو، پروفیسر شاہ فرید الحق، مولانا محمد حسن حقانی وغیرہم بھی شریک تھے۔

کے ساتھ سیاسی اتحاد نہ کرنے کا فیصلہ کیا(۱۴۸) ☆۔ اس وجہ سے مولانا نورانی کی طرف سے یہ خبر جاری کی گئی کہ جماعتوں کا اتحاد نہیں ہوگا بلکہ ملکی مسائل پر اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔(۱۴۹)

اجلاس میں دوسرا اہم مسئلہ جو زیر بحث لایا گیا وہ جمعیت صوبہ سندھ کے صدر عبد المصطفیٰ الازہری، حافظ محمد تقی اور خلیل احمد چشتی کی رکنیت کی معطلی کا فیصلہ تھا کیونکہ ان حضرات نے مارشل لاء کے تحت نامزد کردہ ادارے مجلس شوریٰ کی رکنیت قبول کر کے جمعیت کے پالیسی امور کی صریحاً خلاف ورزی کی تھی۔ انہیں تیس دن کی مہلت دی گئی کہ وہ اگر اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں تو ان کی رکنیت بحال کردی جائے گی۔ اس فیصلے کا خوشگوار پہلو یہ تھا کہ ان تین اہم ارکان کو پارٹی سے خارج کرنے کا حتمی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ جمعیت کی طرف سے خاصی لچک کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔(۱۵۰) ☆☆

حکومتی ہتھکنڈوں کے جواب میں مولانا شاہ احمد نورانی کے لہجہ میں بھی تلخی اور تیزی آتی گئی۔ انہوں نے حکومت پر ایک بار پھر واضح کیا کہ حکومت کے اصل حقدار ملک کے عوام ہیں جنہوں نے اس کے حصول کے لیے سابقہ دور حکومت میں تحریک چلائی تھی۔ ہم اسلام کا دستور چاہتے ہیں جس میں آزادی تحریر وتقریر اور محاسبہ کرنے کا حق (عوامی نمائندوں یا جمہور کو) حاصل ہو اور ہم اس دستور کے نفاذ کے لیے ملک بھر میں بھرپور جدوجہد کریں گے۔ آج ملک میں صرف ایک جماعت (جماعت اسلامی) کی سرپرستی کی جارہی ہے اور اس سے ہاٹ لائن پر رابطہ ہے۔ جو برسر اقتدار طبقہ جانبدار ہو، اسی حکومت کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اسلامی نظام میں مارشل لاء، ہنگامی حالت اور انسانی بنیادی حقوق کی معطلی کا کوئی تصور نہیں۔ یہ کیسا اسلامی نظام ہے جس میں اظہار رائے پر پابندی عائد ہے (لہٰذا) ہم ایسے نظام کو مسترد کرتے ہیں۔(۱۵۱)

☆ اس مرحلے پر کہ مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ اشتراک عمل کی جزئیات مولانا نورانی نے (انفرادی طور پر) طے کر لی تھیں لیکن انہوں نے کثرت رائے کے (جمہوری) فیصلے کا احترام کرتے ہوئے شوریٰ کے فیصلے کو تسلیم کیا۔

☆☆ کیونکہ اگر جمعیت انہیں نکال دیتی تو یہ اراکین، جمعیت پر الزام دیتے کہ انہیں پارٹی سے نکال دیا گیا ہے۔ اس طرح جمعیت نے ترپ کی چال چلی کہ اگر انہوں نے مارشل لاء حکومت سے لاتعلقی کا اعلان نہ کیا تو یہ تصور کیا جائے گا کہ ان حضرات نے جمعیت سے تعلق ختم کرلیا ہے اس طرح جمعیت کو ایسے افراد کو پارٹی سے نکالنے کا الزام اپنے پر نہ لیا۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۵ مارچ ۱۹۸۲ء)

مولانا نورانی سے جب اخبار نویسوں کی طرف سے استفسار کیا گیا کہ جنرل ضیاء کے بقول سیاسی جماعتیں ہی انتخابی عمل کے التواء کی ذمہ داری ہیں تو انہوں نے کہا کہ ایسے عناصر کو بے نقاب کر کے قوم کو اس کے متعلق آگاہ کیا جائے کہ جمہوری عمل کے مخالف کون لوگ ہیں جنرل ضیاء کے خیال میں اگر خرابی حالات کی بناء پر الیکشن ملتوی کیے گئے تھے تو کیا پانچ سال گزر جانے کے باوجود حالات ساز گار نہیں ہوئے؟ (۱۵۲) ☆ ملکی بحران صرف انتخابات کے ذریعے ہی دور ہوسکتا ہے۔ اسی لیے تمام سیاسی جماعتوں سے رابطہ کیا جا رہا ہے تا کہ انتقال اقتدار کے متعلق مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ لیکن حکومت نے بدستور سختی کرتے ہوئے، مولانا شاہ احمد نورانی، پیر سید برکت احمد، پروفیسر شاہ فرید الحق، مولانا عبد الستار نیازی، جنرل (ر) کے ایم اظہر، اور مرکزی مجلس عاملہ کے عام شرکاء کے خلاف مارشل لاء ضوابط ۳۳ اور ۴۸ کے تحت مقدمات درج کر لیے۔ (۱۵۳)

جب ملکی تمام سیاسی پارٹیوں کی طرف سے حکومت پر انعقاد انتخابات کے لیے اصرار بڑھا تو جنرل ضیاء نے پھر تاخیری حربوں کا سہارا لیتے ہوئے اعلان کیا کہ جلد ہی اسلامی سیاسی ڈھانچے کو تشکیل دیا جائے گا۔ مزید برآں ابھی طریق انتخاب کے بارے میں بھی حتمی فیصلہ نہیں کیا گیا کہ یہ جماعتی بنیادوں پر ہوں گے یا غیر جماعتی بنیادوں پر۔ (۱۵۴) ☆☆

اس حوالے سے جب مولانا شاہ احمد نورانی سے اخبار نویسوں نے رائے مانگی تو انہوں نے واضح طور پر کہا کہ حکومت کے موقف میں بار بار تبدیلی قوم کے ذہنوں میں انتشار کا سبب بن رہی ہے (۱۵۵)۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہونے تھے اور بعد ازاں ۱۹۷۹ء کے انتخابات جو اعلان کے باوجود ملتوی کیے گئے، وہ بھی جماعتی بنیادوں پر ہونا تھے۔ اب غیر جماعتی فارمولا صرف چند جماعتوں کو خوش کرنے کے لیے بنایا گیا ہے (جو پہلے بھی چور دروازے سے اقتدار میں پہنچی تھی اور اب دوبارہ اس کوشش میں ہیں) کیونکہ حکومت کو یقین ہے کہ یہ جماعتیں جماعتی بنیادوں پر کبھی بھی شریک اقتدار نہیں ہوسکتیں (۱۵۶)

☆ اگر اتنے طویل عرصے تک بھی ملک کے حالات بدستور دگرگوں تھے تو مارشل لاء حکومت کا کیا اخلاقی اور قانونی جواز باقی رہ جاتا تھا۔ لیکن حکومت پھر بھی ڈھٹائی سے ڈٹی ہوئی تھی۔

☆☆ جنرل ضیاء نے عوام کو ذہنی انتشار میں مبتلا کرنے کے لیے یہ شوشہ چھوڑ دیا تھا کہ آئندہ انتخابات کن بنیادوں پر کرائے جائیں۔ جماعتی یا غیر جماعتی۔

مجلس شوریٰ کے وجود میں آنے کے بعد سیاسی حلقوں کی طرف سے توقع کی جا رہی تھی کہ جون ۱۹۸۲ء کو سالانہ قومی بجٹ، مجلس شوریٰ میں پیش کیا جائے گا۔ لیکن وزیر خزانہ کی طرف سے یہ وضاحت کی گئی کہ مجلس شوریٰ ایک نامزد ادارہ ہے جس پر مجلس شوریٰ کے اراکین کی طرف سے احتجاج کیا گیا (۱۵۷)۔ ☆

مولانا شاہ احمد نورانی نے ہم خیال سیاسی جماعتوں سے رابطہ کر کے دوبارہ سیاستدانوں کی گول میز کانفرنس کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں اگست ۱۹۸۲ء کو تحریک استقلال کے سیکریٹری جنرل مشیر احمد پیش امام نے مولانا نورانی سے ملاقات کی (۱۵۸۔ مولانا نورانی سے اس موقع پر کہا کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد کے سلسلہ میں ۱۹۷۰ء کی قومی اسمبلی میں شامل جماعتوں سے بات چیت اور ایجنڈا طے ہو جائے گا۔ مولانا نورانی نے اتفاق رائے کے سلسلے کو وسیع تر کرتے ہوئے بلوچستان کی سیاسی رہنماؤں کو بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ (۱۵۹)

اس سلسلے میں وہ اگست کے آخر میں کوئٹہ پہنچے، ابھی ان کا دورہ جاری تھا کہ سٹی مجسٹریٹ نے انہیں صوبہ بدری کے احکامات دکھائے اور انہیں جیکب آباد بھیج دیا گیا (۱۶۰)۔ بعد ازاں مولانا نورانی نے پیر پگاڑا سے ان کی رہائش (پیر جو گوٹھ) پر ملاقات کی جس میں یہ طے ہوا کہ مجوزہ کانفرنس کا انعقاد ستمبر ۱۹۸۲ء کو کراچی میں ہوگا اور اس میں صرف ۱۹۷۳ء کے آئین پر دستخط کرنے والی سیاسی پارٹیاں ہی شرکت کریں گی اور جماعتی الیکشن میں حصہ نہیں لیا جائے گا۔ (۱۶۱) (ہاں اگر ملک کے موجودہ سربراہ جنرل ضیاء الحق خود انتخابات میں حصہ لیں تو پھر انتخاب میں حصہ لینے کا سوچا جاسکتا تھا۔)

پنجاب میں سیاستدانوں سے رابطہ مہم کے لیے مولانا نورانی نے دورہ پنجاب ایک جامع پروگرام ترتیب دیا جو ۱۰ تا ۱۸ ستمبر ۱۹۸۲ء تک چلنا تھا لیکن اس پر عمل درآمد سے قبل ہی ان

☆ مولانا محمد شفیع اوکاڑوی نے کہا کہ وزیر خزانہ نے ان ریمارکس کے ذریعے ہماری توہین کی ہے۔ اس پر چیئرمین شوریٰ خواجہ محمد صفدر نے کہا کہ آپ لوگوں کو تو ممبر شپ دے کر نوازا گیا ہے۔ جبکہ بھوپالی مرحوم نے کہا کہ ہم اپنا کیریئر داؤ پر لگا کر آئے ہیں مذاق اڑوانے نہیں آئے۔ تاہم چیئرمین نے اپنا رویہ نہ بدلا اور ممبران شوریٰ کو ان کی اوقات میں رکھا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ ایجنسیوں کی اہلکار مجلس شوریٰ کی کارروائی نوٹ کرتے مگر ممبران شوریٰ محض تلملا کر رہ جاتے۔ اب اس امر میں کوئی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی کہ مجلس شوریٰ سیاسی تیموں کا ٹولہ تھا۔

پر صوبہ پنجاب میں داخلے پر ۹۰ دن کی پابندی عائد کردی گئی۔ مولانا نورانی نے اس حکومتی فعل کو مارشل لاء کے گھناؤنے ہتھکنڈے قرار دیا جو حکومت کی سراسیمگی کا نمایاں اظہار تھے۔ ان کے بقول جمعیت نے ہمیشہ بحالی جمہوریت کی جدوجہد کی اور اقتدار کو ٹھکرایا...... آج بھی جمعیت علمائے پاکستان پر مختلف طریقوں سے حکومت میں شمولیت کے لیے دباؤ ڈالا جارہا ہے۔ (اس سلسلے میں) پروفیسر فرید الحق کو وفاقی وزیر بنانے کی پیشکش کی گئی تھی جسے (ہماری طرف سے) مسترد کردیا گیا۔ مولانا نورانی نے بحالی جمہوریت کی جدوجہد کے لیے ہر موقع پر اور ہر پلیٹ فارم سے آواز بلند کی (۱۶۲)۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۸۲ء کو قائد کی چونتیسویں برسی کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا: ”آج کا پاکستان وہ پاکستان نہیں جو بابائے قوم چھوڑ گئے تھے۔ قائداعظم کے پاکستان میں قوم کو بنیادی حقوق، آزادی تحریر وتقریر اور ملک چلانے کے لیے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق تھا۔ عدلیہ آزاد تھی، لیکن آج وہی حقوق جن کے لیے ملک قائم ہوا عوام کو حاصل نہیں۔ ملک میں حب وطن افراد کو قلعوں اور کیمپوں میں اذیت دی جارہی ہے۔ ہماری آنے والی سات پشتوں کو غیر ملکی قرضوں کے عوض گروی رکھ دیا گیا ہے۔ قائداعظم کو خراج عقیدت پیش کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ملک میں (جلد از جلد) انتخابات کرائے جائیں اور اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل کیا جائے۔“ (۱۶۳)

ستمبر ۱۹۸۲ء کے آخر میں گول میز کانفرنس کو کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کردیا گیا۔ لیکن تمام سیاسی حلقے اس کے فوری انعقاد کے خواہاں تھے۔ اس سلسلے میں مولانا نورانی نے اپنی اتحادی جماعت مسلم لیگ سے مل کر کانفرنس کے انعقاد کے لیے ایک بار پھر اپنی کوششیں تیز کردیں۔ (۱۶۴)

پاکستان نیشنل پارٹی کے سربراہ میر غوث بخش بزنجو ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو مولانا نورانی سے ملے اور انہیں سیاستدانوں کی گول میز کانفرنس میں شرکت کی زبانی دعوت دی۔ (۱۶۵) انہوں نے مولانا نورانی سے اس سلسلے میں قریباً اڑھائی گھنٹے ملاقات کی۔ مولانا نورانی نے دوران ملاقات واضح کیا کہ اگر انہیں رسمی دعوت نامہ ملا تو وہ ضرور شرکت کریں گے۔ (۱۶۶)

اسی طرح اگلے روز کالعدم پاکستان مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل ایس ایم ظفر نے مولانا نورانی سے ملاقات کرکے گول میز کانفرنس کی جملہ تفصیلات طے کیں۔ مولانا نورانی نے ان کا استفسار پر بتایا کہ کانفرنس نومبر کے آخری ہفتہ میں ہوگی۔ ملاقات میں موجود شاہ فرید

الحق کے بقول کانفرنس کے دعوت ناموں کا مسئلہ طے ہوگیا تھا اور دعوت نامے بھی تیار کرلیے گئے تھے (۱۶۷)۔

مولانا شاہ احمد نورانی کی طلب کردہ گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تاریخ بار بار تبدیل کی گئی۔ پہلے یہ ۱۸ نومبر مقرر کی گئی لیکن بعد ازاں ۱۱ نومبر کردی گئی (۱۶۸)۔ کانفرنس کے تمام انتظامات مکمل کرلیے گئے تھے۔ ۳ نومبر ۱۹۸۲ء کی شب پیر پگاڑا نے مولانا نورانی سے ملاقات کی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ کانفرنس کسی سیاستدان کی رہائش گاہ کے بجائے کراچی کے کسی ہال میں منعقد کی جائے۔ (۱۶۹) کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں ۱۶ سیاسی جماعتوں کو دعوت نامے ارسال کیے گئے اور شرکاء کی تعداد ۴۰ تک متوقع تھی جماعت کے سربراہ اور سیکریٹری جنرل کو دعوت نامہ بھیجا گیا۔ پگاڑا، نورانی ملاقات میں یہ بھی طے پایا کہ اگر وفاقی وزیر داخلہ یوسف ہارون اگر کراچی میں موجود ہوئے تو انہیں بھی شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ (۱۷۰)

۸ نومبر تک بیگم بھٹو، پگاڑا، بزنجو اور میاں طفیل محمد کو دعوت نامے پہنچا دیئے گئے (۱۷۱)۔

دعوت نامے کا متن یہ تھا: ”ممنون ہوں گا اگر آپ غریب خانہ کو شرف بخشیں اور اپنے معتمد کے ساتھ .... میں شرکت فرمائیں۔ امید ہے مزاج گرامی مع الخیر ہوں گے۔“ (۱۷۲)

جماعت اسلامی کی طرف سے دعوت نامے کی عبارت کو مبہم اور مضحکہ خیز قرار دیتے ہوئے رد کردیا گیا۔ حالانکہ مارشل لاء کے تحت سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی۔ اس لیے دعوت نامے کے لیے حسب حال الفاظ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جب بھی جماعتوں کے رہنماؤں پر کانفرنس کے انعقاد کے مقاصد واضح تھے تو دعوت نامے کی عبارت پر اعتراض کی کوئی منطق نہیں تھی۔ کسی دوسری جماعت نے عبارت پر نکتہ چینی نہیں کی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جماعت اسلامی کانفرنس میں شریک ہونے میں متامل تھی۔ (۱۷۳)

جماعت اسلامی نے کانفرنس میں شرکت سے معذوری ظاہر کردی جس کی وجہ سے دعوت نامے کی مبہم اور ناقابل فہم عبارت بیان کی گئی۔ مزید یہ کہ جماعت اسلامی کے سربراہ میاں طفیل محمد نے واضح طور پر اعلان کیا کہ جماعت اسلامی فوج کے ساتھ محاذ آرائی کی

سیاست میں کسی صورت میں بھی شریک کار نہیں بن سکتی۔ (۱۷۴) تاہم مولانا نورانی نے جماعت اسلامی کے اس فیصلے کو کوئی اہمیت نہ دی اور کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف رہے۔

حسب معمول کانفرنس کے انعقاد کو ناکام کرنے کے لیے مارشل لاء ضوابط حرکت میں لائے گئے۔ پاکستان نیشنل پارٹی کے سربراہ میر غوث بخش بزنجو کو زبردستی کراچی سے بلوچستان بھیج دیا گیا۔ اور تین ماہ کے لیے ان کے صوبہ سندھ میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ خان عبد الولی خاں اور ارشد چوہدری (جو کہ نوابزادہ نصر اللہ خاں کے نمائندے کے طور پر آرہے تھے کیونکہ نوابزادہ ان دنوں جیل میں تھے) کو اسلام آباد میں ہی پابندی کے احکامات پہنچا دیئے گئے۔ اسی طرح تحریک استقلال کے قائم مقام سربراہ سید میر شاہ اور پاکستان ڈیمو کریٹک پارٹی کے سیکریٹری جنرل رانا ظفر اللہ خان کو بھی روک دیا گیا۔ جبکہ پیپلز پارٹی کے جنرل (ر) ٹکا خان کو فوراً سندھ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ اس طرح اس کانفرنس کا انعقاد حسب معمول اور حسب توقع ممکن نہ ہوسکا۔ اس لیے ایک دفعہ پھر اس کے التوا کا فیصلہ کیا گیا (۱۷۵)۔ مولانا نورانی نے ۱۰ نومبر کو بہ امر مجبوری کانفرنس کے ملتوی کیے جانے کا اعلان کردیا۔ یہ اعلان کانفرنس کے انعقاد سے محض ایک روز قبل کیا گیا۔ بعض سیاستدانوں کے صوبہ سندھ میں داخلے پر پابندی، بعض سیاستدانوں کی صوبہ بدری کے احکامات اور دیگر ناروا پابندیوں کے پیش نظر کانفرنس کو مؤخر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تاہم مولانا شاہ احمد نورانی نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ کانفرنس ضرور منعقد کی جائے گی اور اگلی بار مزید احتیاط اور راز داری سے کام لیا جائے گا لیکن انہوں نے کانفرنس کے آئندہ انعقاد کی تاریخ جاری کرنے سے گریز کیا۔ بعض سیاسی ماہرین کے نزدیک کانفرنس کی ناکامی کا سبب کانفرنس کی تاریخ کے اعلان سے پہلے سیاستدانوں کے درمیان بنیادی مسائل پر اتفاق رائے کا پیدا نہ ہونا تھا۔ دوسرا سبب یہ کہ سیاستدانوں نے ایک دوسرے کے خلاف تنقیدی بیان جاری کر کے باہمی افہام و تفہیم کے عمل کو نقصان پہنچایا تھا۔ تیسری یہ کہ کانفرنس کے لیے مناسب ہوم ورک نہیں کیا گیا تھا جس کی وجہ سے عین انعقاد سے پہلے مولانا نورانی اور پیر پگاڑا میں اختلاف پیدا ہوئے، چوتھے یہ کہ مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے درمیان انتخابات کے متعلق بنیادی اور آئینی امور کے متعلق شدید اختلافات موجود تھے۔ (۱۷۶)

سیاسی اور صحافتی حلقوں نے اس امر کو جمہوریت کے لیے ناقابل تلافی نقصان

اور مایوس کن عمل قرار دیا: "جمعیت علمائے پاکستان نے بعض ناگزیر وجوہ کی بناء پر گول میز کانفرنس کے التواء کا اعلان کردیا ہے۔ یہ کانفرنس گیارہ نومبر ۱۹۸۲ء کو کراچی میں منعقد ہونی والی تھی۔ جس کے لیے متعدد سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے نام دعوت نامے بھی جاری کردیئے گئے تھے۔ مولانا نورانی اور آپ کے ساتھی کئی ماہ سے گول میز کانفرنس کے انعقاد کے لیے زمین ہموار کررہے تھے۔ گذشتہ چند دنوں کے دوران ان کی یہ کوششیں انتہائی عروج پر پہنچ گئی تھیں۔ سیاستدانوں کی ایک خاص تعداد نے گول میز کانفرنس کی حمایت کی تھی...... جمعیت علمائے پاکستان کے رہنماؤں اور اس کے ساتھیوں نے جس جذبے اور محنت کے ساتھ گول میز کانفرنس کے انعقاد کے لیے کام کیا اس کے مطابق نتائج رونما نہیں ہوئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کا تفصیلی جواب تو خود مولانا نورانی ہی دے سکتے ہیں اور انہیں جلد ہی اپنے تجزیے کو سامنے لانا چاہیے تاکہ وہ تمام لوگ جو گول میز کانفرنس سے دلچسپی رکھتے تھے خود مولانا محترم کی زبان سے ان ناسازگار حالات کا ذکر سن سکیں جو کانفرنس کے التواء کا سبب بنے اور کوئی صحیح رائے قائم کرسکیں...... کانفرنس کی ناکامی کا بنیادی سبب کانفرنس کی تاریخ کے اعلان سے پہلے سیاستدانوں کے درمیان بنیادی مسائل پر اتفاق رائے کا پیدا نہ ہونا تھا۔ مولانا نورانی اور اس کے ساتھیوں نے خلوص اور حب الوطنی کے جذبے کے ساتھ ایک بڑے کام کا آغاز کیا تھا۔ ہم اس کی پوری قدر کرتے ہیں اور ساتھ ہی ہم یہ کہیں گے کہ اس ناکامی سے مایوسی کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ یہ کام صحیح خطوط پر اس تجربے کی روشنی میں بہتر انداز میں دوبارہ شروع کیا جانا چاہیے۔" (۱۷۷)

۲۲ نومبر ۱۹۸۲ء کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا نیازی نے کہا کہ گول میز کانفرنس کا انعقاد اقتدار کی پرامن منتقلی کی جانب ایک مثبت اور موثر قدم ثابت ہوسکتا تھا لیکن حکومتی رکاوٹوں کی وجہ سے اسے ملتوی کرنا پڑا لیکن اس کے باوجود سیاستدانوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے سلسلے میں کوششیں جاری رکھی جائیں گی۔ عوام کے فوج سے تصادم روکنے کے سلسلے میں سیاستدانوں کی خدمات ملک کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائیں گی۔ اگر ایک بار عوام اور فوج کے درمیان نفرت کی فضا قائم ہوگئی تو پھر اس صورتحال کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ (۱۷۸)

گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پہلے نورانی، پگاڑا اختلافات نے جو شدت اختیار

کی تھی وہ اب کھل کر سامنے آ چکی تھی۔ جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان اتحاد و تعاون کی فضا میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں اور دونوں جماعتوں کے اتحاد "تحریک تحفظ پاکستان" کو بھی ٹوٹنے کے خطرات لاحق ہو گئے۔ پیر پگاڑا اسے ۲۴ نومبر کو مردان میں تخت بائی کے مسلم لیگی رہنما حاجی عبدالمالک کی رہائش گاہ پر استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے اس بات کا اعادہ کیا کہ ہم خیال سیاستدانوں کی گول میز کانفرنس ضرور بلائی جائے۔ انہوں نے مزید کہا کہ تاہم مولانا شاہ احمد نورانی کی غلطیوں کو نہیں دہرائیں گے تاہم انہوں نے مولانا نورانی غلطیوں کی وضاحت سے گریز کیا۔(۱۷۹)

پیر پگاڑا کی طلب کردہ گول میز کانفرنس کا مقصد یہی تھا کہ مارشل لاء حکومت کو ایک ایسی قومی حکومت تشکیل دینے پر مجبور کیا جاسکے جس میں مسلم لیگ کو فعال کردار ملے۔ بلکہ انہی خطوط پر جماعت اسلامی کے رہنما بھی سوچ رہے تھے۔ جو ۱۹۷۷ء کے بعد ایک بار پھر اس کوشش میں تھے کہ مارشل لاء حکومت کے ساتھ شراکت اقتدار کو یقینی بنایا جاسکے۔ مولانا نورانی کے بقول دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کا مجوزہ اتحاد بحالی جمہوریت کے خلاف ایک سازش تھا، کیونکہ ایسا اتحاد صرف مارشل لاء کے زیر سایہ ہی میدان چڑھ سکتا تھا۔ ان کے خیال میں اگر یہ نام نہاد اتحاد وجود میں آ گیا تو ملک میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ انہوں نے جماعت اسلامی کے رویے پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ جماعت کے سامنے کے پیش نظر اس سے اتحاد کرنا مارشل لاء سے اتحاد کرنے کے مترادف تھا۔ اسی طرح انہوں نے پیر پگاڑا کی حالیہ سیاسی پیش رفت پر بھی نکتہ چینی کی اور کہا کہ اگر پیر پگاڑا حکومت بنا رہے تھے تو یہ یقیناً خوشی کی بات تھی لیکن یہ حکومت انہی کو مبارک ہو۔ مزید یہ کہ اس سارے معاملے میں جمعیت کا موقف بے حد واضح تھا۔ کہ اگر عدلیہ کے ذریعے نگران عام انتخابات کرائے جاتے تو اقتدار میں آنے کے متعلق سوچنا ممکن تھا لیکن اس میں مارشل لاء کی ملاوٹ کی صورت برداشت نہیں کی جاسکتی تھی۔(۱۸۰)

ان واقعات سے باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی پیر پگاڑا کے ساتھ اتحاد سے کس حد تک بددل ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ آیا جمعیت لیگ اتحاد برقرار ہے؟ تو انہوں نے انتہائی تلخ لہجے میں جواب دیا کہ بہتر ہے اس سوال کا جواب پیر پگاڑا سے پوچھا جائے۔(۱۸۱)

مولانا شاہ احمد نورانی جہاں ایک طرف پیر پگاڑا کے رویے سے نالاں تھے تو دوسری طرف ایم آر ڈی کی تحریک سے بھی انہیں بحالی جمہوریت کی کوئی امید دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کیونکہ وہ مارشل لاء سختیوں کی وجہ سے ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں کی کوشش زیادہ تر پرامن احتجاج تک محدود تھی۔ تاہم یہ امر اطمینان بخش تھا کہ یہ تحریک کسی نہ کسی صورت میں چل رہی تھی۔ بالفاظ دیگر وہ ایک نقطہ آتش فشاں کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی اور عوامی غیض و غضب کا جوالامکھی کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔ اس ضمن میں بی بی سی لندن کا یہ تجزیہ محل نظر ہے کہ "......ایم آر ڈی کی تحریک بالآخر جو بھی نتیجہ برآمد ہو۔ اس کی وجہ سے پاکستان کی سیاسی صورتحال کے بارے میں دو مفروضے غلط ثابت ہوئے ہیں جو ۱۴ اگست ۱۹۸۳ء سے پہلے عام تھے۔ اول یہ کہ سندھ کے واقعات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ایم آر ڈی ایسی طاقت نہیں جس کا دور ختم ہو چکا ہے۔ دوم یہ کہ اب اس بات کی پورے اعتماد سے پیش گوئی نہیں کی جاسکتی کہ موجودہ حالات میں پاکستان کے عوام سیاسی مقاصد کے لیے سڑکوں پر نکلنے کے لیے تیار نہیں۔ بہرحال اس تحریک کے پیش نظر حکومت کی حکمت عملی میں کسی تبدیلی کا اشارہ نہیں ملتا بلکہ اس کے برعکس حکومت نے اس تحریک کے سلسلے میں سخت اقدامات کا فیصلہ کیا ہے۔ حکومت کی طرف سے بقول اس کے تخریب کار عناصر کو باز رکھنے کے لیے برابر کوڑوں کی سزائیں دی جارہی ہیں...... اس تحریک کو فیصلہ کن بنانے کے لیے پنجاب میں جڑ پکڑنی ہوگی جو روایتی طور پر اقتدار کا گڑھ ہے۔ فی الحال پنجاب میں تحریک نسبتاً کم پیمانے پر جاری ہے۔ پنجاب میں ایم آر ڈی رہنماؤں کی نظر بندی کی وجہ سے تحریک منظم نظر نہیں آتی۔ صوبہ سرحد میں تحریک کا زور کم ہی اور ان رہنماؤں کو جن کا بلوچستان میں اثر ہے، ایک ہفتہ پہلے وہاں کامیاب ہڑتال کے بعد اپنی حکمت عملی کے بارے میں پورا یقین نہیں ہے۔ سول نافرمانی کی تحریک کے مستقبل کے بارے میں ایک اہم امر دائیں بازو کی جماعتوں اور مذہبی بنیاد پر قائم پارٹیوں کا رویہ ہوگا۔ جو ایم آر ڈی میں شامل نہیں۔ دوسری جانب حال ہی میں مولانا نورانی نے جو بیان دیئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تحریک کی حمایت کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ حزب مخالف کی پارٹیوں میں اتحاد اور اشتراک کا آخر کار جو بھی نتیجہ ہو، حزب مخالف صدر ضیاء کی پوزیشن کی قوت کا کم اندازہ لگانے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ فوج پوری طور پر ان (صدر ضیاء الحق) کے ساتھ ہے اور جہاں تک تجارتی حلقوں کا تعلق ہے ان میں ایم آر ڈی کو بہت کم حمایت

حاصل ہے۔"(۱۸۲)

بی بی سی کے تجزیہ میں پیش کردہ ایک اندازہ کم از کم صحیح ثابت ہوا کہ مولانا نورانی ایم آر ڈی کی تحریک کی حمایت کے متعلق سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ جس کا ثبوت ان کی طرف سے کیے گئے اس مطالبے سے ملتا ہے جو انہوں نے بالواسطہ طور پر ایم آر ڈی کی حمایت میں کیا سندھ کے حالیہ واقعات کی تحقیقات کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن قائم کیا جائے جو سندھ میں حالیہ متصادم اور تشدد کے واقعات کا جائزہ لے کر حکومتی ظلم و زیادتی کے ازالہ کے لیے اقدامات تجویز کرے۔ علاوہ ازیں دوران تحریک جو لوگ ہلاک یا زخمی ہوئے تھے انہیں فوری معاوضہ ادا کیا جائے۔(۱۸۳)

مولانا شاہ احمد نورانی کی ۱۹۸۳ء تک کی سیاسی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس تمام تر جدوجہد کا مرکزی نکتہ ملک میں جمہوریت کی بحالی رہا ہے۔ چاہیے وہ قومی اتحاد کی تحریک ہو یا اتحاد تحریک تحفظ پاکستان اور انہوں نے جو بھی اتحاد بنائے ان کا مقصد وحید صرف اور صرف ملک کو جمہوریت کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔ اگرچہ ان کا بنایا ہوا اتحاد، تحریک تحفظ پاکستان مطلوبہ نتائج حاصل نہ کر سکا کہ ابھی تک ملک پر مارشل لاء کی حکومت ہی مسلط تھی تاہم انہوں نے اپنی کوششیں ترک نہ کیں اور اصولوں پر ڈٹے رہے۔

تحریک تحفظ پاکستان، جو کہ ایم آر ڈی کے متوازی، بحالی جمہوریت کی تحریک تھی، اپنے آغاز سے اختتام تک بغیر رکے، بلا تکان، مسلسل جاری رہی اور یہ نورانی کی جمہوریت اور جمہوری عمل پر یقین کی ایک گرانقدر مثال تھی۔ یہ اتحاد جو پیر پگاڑا کی سیاسی ترجیحات میں تبدیلی ☆ کی وجہ سے غیر موثر ہوگیا۔ جمعیت کی حد تک ایک کامیاب اتحاد تھا۔ مولانا شاہ احمد نورانی جو کہ بحالی جمہوریت کے لیے جہد مسلسل پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے ایم آر ڈی میں شامل ہوئے بغیر ہی اس کی مثبت کوششوں کی برملا حمایت جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆ غالباً پیر پگاڑا کو مارشل لاء حکومت سے کوئی امید افزا اشارہ مل گیا تھا۔ مارشل لاء حکومت کے ساتھ اس تعاون کی وجہ سے بعد ازاں انتخابات ۱۹۸۵ء کے بعد پیر پگاڑا کے ایک کرم فرما محمد خان جونیجو کو وزارت عظمٰی کا عہدہ ملا۔

حوالہ جات وتعلیقات

(۱) انٹرویو شاہ فرید الحق، ۱۲ جولائی ۲۰۰۵ء

(۲) ایضاً

3- Ahamad Emajuddin, Millitary Rule and Myth of Democracy, Dacca Univeristy Press, Dacca, 1988, pp-5-12.

4- Ibid, pp-21-35.

(۵) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۵ مارچ ۱۹۷۹ء۔

(۶) ایک تو ضیاء الحق قومی اتحاد کے سیاستدانوں کی حرکتوں سے نالاں تھے۔ دوسرے بھٹو کو پھانسی دینے کے نتیجے میں عوامی سطح پر ردعمل سے بچنے کے لیے انہیں وسیع سیاسی حمایت درکار تھی جو انہیں مل گئی تھی، اب سول کابینہ ان کے لیے سوائے بوجھ اور ایک بدنامی کے داغ کے سوا کچھ نہیں تھی۔ اس صورتحال کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مارشل لاء حکومت کے فیصلے، حکومت کے اعلان سے پہلے ہی افشا کر دیئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وفاقی کابینہ میں شامل مختلف جماعتوں کے درمیان باہمی رسہ کشی شروع ہوگئی تھی اور یہ جماعتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے صوبائی وزارتوں کے مسئلہ پر الجھ پڑی تھیں بلکہ یوں بھی ہوا کہ جماعت اسلامی کے حامی حلقوں اور جرائد نے پورے زور شور کے ساتھ نوابزادہ نصر اللہ خان کے خلاف مہم شروع کر دی۔ یہ حلقے نوابزادہ نصر اللہ خان پر سیاسی وزیروں کے انتخاب کے سلسلے میں سودے بازی کے الزام لگا رہے تھے۔ اس سلسلے میں جماعت کے حلقے چوہدری محمد ارشد (نوابزادہ کے قریبی ساتھی) پر کھلے عام الزام تراشی کر رہے تھے کہ وہ قادیانی ہیں۔ نواب زادہ کے خلاف اس مہم کا پس منظر یہ تھا کہ جماعت اسلامی کے حلقوں کا دباؤ یہ تھا کہ مسٹر حمزہ یا رانا نذر الرحمٰن کو کابینہ میں شامل کیا جائے تاکہ جماعت اسلامی کی لابی اور زیادہ مضبوط بنائی جا سکے لیکن نوابزادہ نے اس ضمن میں جماعت اسلامی کے دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنی مرضی کے وزراء فائز کیے۔ مسلم لیگی

حلقوں میں بھی جماعت اسلامی کی بالادستی اور کابینہ پر کنٹرول کی وجہ سے شدید بے چینی پھیل گئی تھی۔ اس صورتحال کے تناظر میں مسلم لیگ کے حلقے برملا یہ کہہ رہے تھے کہ وہ صوبائی حکومتوں (بن) کے قیام کی توقع کی جارہی تھی، میں جماعت اسلامی کی بالادستی قبول نہیں کریں گی۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی کے سیکریٹری جنرل اور وزیر برائے بجلی و آب پاشی چوہدری رحمت الٰہی کا یہ بیان قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ صوبائی کابینہ کا کوٹہ طے کیا جائے گا۔ حالانکہ اس سے قبل میاں طفیل محمد یہ بیان دے چکے تھے کہ وزارتوں کے لیے کوئی کوٹہ مقرر نہیں کیا گیا۔ جبکہ کراچی میں مسلم لیگی حلقوں نے واضح طور پر پیر صاحب پگاڑا سے کہہ دیا تھا کہ اگر صوبائی کابینہ میں مرکز کی طرح کراچی کی نمائندگی کی اجارہ داری جماعت اسلامی کو دی گئی تو اس کے نتائج بہتر نہیں ہوں گے۔ ان حالات میں ضیاء الحق کے لیے کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ اس بھاری بوجھ سے چھٹکارا حاصل کر لیتے۔ (ہفت روزہ افق کراچی، ۱۰ تا ۱۶ ستمبر ۱۹۷۸ء ص ۳)

(۷) ادھر قومی اتحاد کی اخلاقی پوزیشن یہ تھی کہ اکثر پارٹیوں کی رائے میں موجودہ حکومت سے جو ملتا ہے لے لیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جنرل ضیاء سے ملاقات کر کے صوبائی حکومتوں کے قیام اور بلدیاتی نامزدگیوں کے لیے بھرپور دباؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ جنرل ضیاء ان کے دباؤ کے آگے ہتھیار ڈال دیتے۔ جہاں تک صوبائی حکومتوں کا تعلق تھا جنرل صاحب نے صاف کہہ دیا تھا کہ موجودہ حالات میں صوبائی حکومتوں کا تجربہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا۔ البتہ وہ بلدیاتی اداروں میں نامزدگی پر بات چیت کے لیے کسی حد تک رضا مند تھے۔ غالباً یہیں سے جنرل ضیاء الحق کو خیال آیا کہ کیوں نہ پہلے بلدیاتی انتخابات کرا کے اپنی پوزیشن کو بہتر کر لیا جائے کیونکہ ان کے سامنے ان کے پیش رو جنرل ایوب خان کا ''بنیادی جمہوریتوں'' کا تجربہ تھا جس کے ذریعے انہوں نے نہایت آسانی سے سیاستدانوں سے (وقتی طور پر سہی) جان چھڑالی تھی۔ ان حالات میں جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام کے بعض رہنماؤں کی رائے یہ تھی کہ جو ملتا ہے اسی پر اکتفا کیا جائے جبکہ مولانا مفتی محمود اور نوابزادہ نصر اللہ خان کی رائے یہ تھی کہ صوبائی حکومتوں کے بغیر بلدیاتی نامزدگیاں قبول نہ کی جائیں۔ ان اختلافات کی وجہ سے بلدیاتی نامزدگیوں کا معاملہ (جس پر جنرل صاحب رضا مند بھی تھے) کھٹائی میں پڑ گیا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے پیر پگاڑا کی مسلم لیگ بھی قومی اتحاد سے دل برداشتہ ہو کر اسے چھوڑنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ (ایضاً، ۱-۷

جنوری ۱۹۷۹ء)

(۸) روزنامہ جنگ کراچی، ۳۰ دسمبر ۱۹۷۸ء

(۹) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ۔

(۱۰) صدر ضیاء الحق کی انتخابات میں حصہ لینے کے لیے سوال کابینہ کا استعفیٰ کی شرط سے پہلے ہی اتحاد کے بعض رہنما، حکومت سے نکلنے کی سوچ رہے تھے۔ اتحاد کے بعض رہنما یہ سمجھتے تھے کہ انہیں کابینہ میں شامل ہو کر ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ بلکہ اس سلسلے میں جماعت اسلامی کے سوا تقریباً تمام جماعتوں پر اتفاق رائے ہو گیا تھا کیونکہ حکومت کی طرف سے اتحاد پر واضح کر دیا گیا تھا کہ اگر وہ انتخابات میں حصہ نہیں چاہتے تھے تو انہیں بہرصورت انتخابات سے تین ماہ قبل حکومت چھوڑنا ہوگی۔ ان حالات میں یہ رہنما پھر اسی میں بہتری خیال کرتے تھے کہ نکالے جانے سے قبل خود ہی کابینہ سے نکل جائیں۔ اس سلسلے میں نوابزادہ نصر اللہ خان، مولانا مفتی محمود، خان اشرف خان بہت زیادہ پرجوش تھے جبکہ جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد کے بقول جماعت کے امیر میاں طفیل محمد اور چوہدری رحمت الٰہی کابینہ چھوڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ وزارتیں چھوڑنے کے سلسلے میں رہنماؤں کا خیال یہ تھا کہ ایک طرف تو صوبائی حکومتوں کے قیام کا وعدہ پورا نہیں ہوا اور دوسری طرف بیوروکریسی من مانی کارروائیاں کر رہی تھی، اس لیے بہتر یہی تھا کہ مناسب موقع پر سول کابینہ کو خیر باد کہہ کر دوبارہ جمہوریت اور انتخابات کی بات شروع کر دی جائے تاکہ عوام میں گری ہوئی ساکھ دوبارہ بحال ہو سکے۔ (غالباً یہی محرک ایم آر ڈی کے قیام کا سبب بنا تھا۔) اتحاد کی نئی حکمت عملی کے مطابق اتحاد، بھٹو کیس کے فیصلے کے بعد صدر پر صوبائی کابینہ بنانے کے لیے زور دے گا اور کیونکہ صوبائی حکومتیں صدر کے پروگرام میں شامل نہیں تھیں۔ لہٰذا اسی نکتہ کو بہانے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے حکومت سے علیحدگی کا اعلان کر دیا جائے گا، قومی اتحاد کے بعض رہنماؤں کے خیال میں صدر نے اتحاد سے وعدہ خلافی کی تھی۔ (جبکہ جنرل صاحب کے خیال میں اتحاد کے وزراء کو سول کابینہ میں شامل کرنے کے مطلوبہ مقاصد پورے نہیں ہو سکے اور سول کابینہ، عوام کے مسائل حل کرنے میں متوقع کردار ادا نہیں کر سکی تھی۔ اس لیے ان کی ناکامی کے بعد صوبائی حکومتوں کے قیام کا کوئی جواز نہیں تھا۔) (ہفت روزہ افق کراچی، ۸-۱۶ فروری ۱۹۷۹ء)

(۱۱) ہفت روزہ افق، یکم تا ۷ فروری ۱۹۷۹ء، ص ۱۸-۱۹

(۱۲) ایضاً، ص ۱۹

(۱۳) شاہ فرید الحق، بحوالہ سابقہ

(۱۴) ایضاً (۱۵) ایضاً

(۱۶) اس مرحلہ پر جب کہ انعقاد انتخابات کی مجوزہ تاریخ نزدیک آرہی تھی۔ متناسب طرز انتخابات کی تجویز اپنی ہیئت میں ٹھیک ہونے کے باوجود، غلط تھی کیونکہ اس سلسلہ میں سیاستدانوں سے رائے لینا محض انتخابات کے التواء کا ایک بہانہ تھا۔ (ہفت روزہ افق کراچی، ۳۰ مارچ تا ۱۵ اپریل)

(۱۷) واضح رہے کہ متناسب نمائندگی کی تجویز پاکستان نیشنل پارٹی کے سربراہ غوث بخش بزنجو نے بھی مسترد کردی تھی۔ (ہفت روزہ افق کراچی، ۳۰ جولائی تا ۵ اگست ۱۹۷۹ء)

(۱۸) ایضاً

(۱۹) لیکن جماعت اسلامی کے رہنماؤں کو اس پابندی سے مستثنٰی رکھا گیا۔ کیونکہ ماضی قریب میں جماعت مارشل لاء کی حمایت کرتی رہی تھی اس لیے حکومت کی طرف سے اس کی سابقہ خدمات کا خیال کیا جانا فطری امر تھا۔ شاید اس وجہ سے جمعیت علمائے پاکستان نے آئندہ کسی بھی اتحاد میں جماعت اسلامی کو شامل نہ کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ جماعت کے رویہ کی وجہ سے پاکستان قومی اتحاد کا حشر سب کے سامنے تھا۔ (ایضاً)

(۲۰) غالباً مولانا نورانی کا اشارہ اتحاد میں شامل جماعتوں کی باہمی چپقلش اور اقتدار کے لیے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں کی طرف تھا۔
(ہفت روزہ افق کراچی، ۳۰ مارچ تا ۱۵ اپریل ۱۹۷۹ء)

(۲۱) ایضاً (۲۲) ایضاً، ۱۶، ۲۳ اپریل ۱۹۷۹ء (۲۳) ایضاً

(۲۴) ایضاً ۲۸ مئی تا ۳ جولائی ۱۹۷۹ء (۲۵) ایضاً (۲۶) ایضاً

(۲۷) جمعیت علمائے پاکستان کی مجلس عاملہ نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ جنرل ضیاء الحق بار بار آئین میں مجوزہ ترمیم پر اصرار اور ساتھ ہی سیاستدانوں سے مذاکرات کر رہے تھے۔ اگر صدر صاحب نے آئینی ترمیم کرنے کا تہیہ کرلیا تھا تو پھر ان مذاکرات کے کیا معنی۔ پھر یہ بھی خلاف اصول بات تھی کہ کسی جمہوری ملک میں غیر منتخب افراد کی جانب سے آئینی ترمیم کی جارہی تھی جس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالخصوص ایسے موقع پر جب دو تین ماہ بعد انتخابات ہو رہے تھے اور جس کے نتیجہ میں منتخب جمہوری پارلیمنٹ وجود میں آنے والی تھی۔ اس لیے کوئی ایسی ترمیم کرنا

کہ جس پر خود سیاسی جماعتوں کا اتفاق نہ ہو دراصل پنڈورا باکس کھولنے کے مترادف تھا۔ (ہفت روزہ افق کراچی، ۳۰ جولائی تا ۵ اگست ۱۹۷۹ء)

(۲۸) ایضاً

(۲۹) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۹ء

(۳۰) روزنامہ وفاق لاہور، ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۹ء

(۳۱) شاہ فرید الحق، بحوالہ سابقہ

(۳۲) ایضاً

(۳۳) انٹرویو جنرل (ر) خواجہ محمد اظہر (کے ایم اظہر) ۱۸ جون ۲۰۰۴ء

(۳۴) ایضاً (۳۵) ایضاً (۳۶) ایضاً (۳۷) ایضاً

(۳۸) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۰ فروری ۱۹۸۱ء

(۳۹) ایضاً (۴۰) ایضاً

(۴۱) احمد منیر، پاکستان کے سیاسی اتحاد، لاہور، ۱۹۹۶ء

(۴۲) پیپلز پارٹی چونکہ مارشل لاء کی مقہور جماعت تھی۔ اس لیے عوام کی ہمدردیاں بھٹو کی پھانسی کے بعد لامحالہ طور پر، پیپلز پارٹی کے ساتھ تھیں۔ اس لیے اگرچہ جمعیت کی طرف سے ایم آر ڈی کی حمایت، بحالیٔ جمہوریت کے عمل کی رفتار کو تیز کرسکتی تھی۔ لیکن ایک بڑی سیاسی جماعت کے ناطے اس کا تمام تر فائدہ پیپلز پارٹی کو جاتا، جو ماضی قریب میں بذات خود جمہوری عمل کی بدترین دشمن رہ چکی تھی۔ مولانا نورانی ہمیشہ پہلے نتائج عواقب دیکھنے کے عادی تھے۔ اس لیے وہ جو بھی فیصلہ کرتے سوچ سمجھ کر کرتے۔ (کے ایم اظہر، بحوالہ سابقہ)

(۴۳) میجر جنرل (ر) تجمل حسین، میجر ریاض اور لیفٹیننٹ نوید کو اس ازش کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے بالترتیب ۱۴ سال اور دس دس سال قید کی سزا سنائی گئی۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۱۶ جنوری ۱۹۸۱ء)

(۴۴) ایضاً (۴۵) ایضاً ۲۶ فروری ۱۹۸۱ء (۴۶) ایضاً ۳ مارچ ۱۹۸۱ء

(۴۷) ایضاً

(۴۸) ''الذوالفقار'' کو پیپلز پارٹی کی ذیلی تنظیم بتایا گیا تھا۔ جبکہ بیگم نصرت بھٹو کہہ رہی تھیں کہ طیارے کے اغواء کرنے والوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی پیپلز پارٹی کا الذوالفقار سے کوئی تعلق

ہے۔ لیکن حکومتی پراپیگنڈے کے تحت رائے عامہ میں بہر حال پی پی کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کردیئے گئے تھے۔

(۴۹) ایضاً (۵۰) ایضاً، ۴مارچ ۱۹۸۱ء

(۵۱) جنرل کے ایم اظہر، بحوالہ سابقہ۔

(۵۲) ایضاً

(۵۳) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ

(۵۴) ایضاً (۵۵) ایضاً

(۵۶) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۰مارچ ۱۹۸۱ء

(۵۷) ایضاً (۵۸) ایضاً

(۵۹) ایضاً ۳۰مارچ ۱۹۸۱ء (۶۰) ایضاً (۶۱) ایضاً

(۶۲) ایضاً ۳۱مارچ ۱۹۸۱ء (۶۳) ایضاً ۱۵اپریل ۱۹۸۱ء

(۶۴) ایضاً (۶۵) ایضاً

(۶۶) کے ایم اظہر بحوالہ سابقہ

(۶۷) روزنامہ جنگ، ۱۵اپریل ۱۹۸۱ء

(۶۸) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ

(۶۹) ایضاً (۷۰) ایضاً

(۷۱) انٹرویو مولانا مفتی جمیل احمد نعیمی، مہتمم جامعہ نعیمیہ کراچی، ۱۱جولائی ۲۰۰۵ء

(۷۲) دراصل ان کا اصل مقصد مجلس شوریٰ میں شمولیت کی خواہش تھا۔ اکثر چھوٹی جماعتوں کا المیہ ہوتا ہے کہ وہ زمام اقتدار سے دور ہی رہتی ہیں کیونکہ انہیں نہ تو عوام کے ووٹ کے ذریعے اتنی قوت ملتی ہے کہ وہ مسند اقتدار سنبھال سکیں اور نہ ان کے پاس اتنی نشستیں ہوتی ہیں کہ وہ حکومت بنا سکیں۔ ان کے پاس سوائے اس راستے کے کہ وہ حکومت کے ساتھ مفاہمت کر کے اکثریتی پارٹی کے زیر سایہ کام کریں۔ یا پھر اپنے اصولوں کی قربانی دے کر غیر جمہوری راستے (چور دروازے) کے ذریعے اقتدار حاصل کرلیں۔ جمعیت میں بار بار پھوٹ کی غالب وجہ یہی تھی۔ قومی رہنماؤں کے اسی رجحان نے پاکستان قومی اتحاد کو ناقابل رشک انجام تک پہنچایا تھا۔

(۷۳) ایضاً (۷۴) ایضاً

(۷۵) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ

(۷۶) ایضاً (۷۷) ایضاً

(۷۸) ان دنوں مولانا شاہ احمد نورانی تبلیغی دوروں کے سلسلے میں آسٹریلیا گئے ہوئے تھے۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ مولانا نورانی نے اپنے بیرون ملک مصروفیات کی وجہ سے پارٹی کے اکابرین کو ہدایات جاری کی تھیں کہ اگر تنظیمی امور میں کوئی مشکل درپیش آئے تو جمعیت کو اختیار ہے کہ وہ کوئی اور صدر منتخب کرلے۔ لہٰذا قائم مقام صدر کا انتخاب عمل میں لایا گیا اور طے کیا گیا کہ مولانا شاہ احمد نورانی کی غیر موجودگی میں پیر سید برکات احمد، صدر کے طور پر ذمہ داری سنبھالیں گے۔ ان حالات میں مولانا نورانی نے ضروری سمجھا کہ وہ آسٹریلیا سے وطن واپس آکر ان صورتحالات کی تردید کریں جو پارٹی اراکین اور عوام میں بے چینی اور غلط فہمیوں کو پروان چڑھا رہے تھے۔

(۷۹) روزنامہ جنگ کراچی، ۲جولائی ۱۹۸۱ء

(۸۰) ایضاً (۸۱) ایضاً

(۸۲) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ۔

(۸۳) ایضاً (۸۴) ایضاً

(۸۵) روزنامہ جنگ کراچی، یکم جولائی ۱۹۸۱ء

(۸۶) ایضاً (۸۷) ایضاً (۸۸) ایضاً

(۸۹) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ

(۹۰) ایضاً (۹۱) ایضاً

(۹۲) ''قوم کو اعتماد میں لیجئے'' اداریہ نوائے وقت ۱۳اکتوبر ۱۹۸۱ء

(۹۳) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۷اکتوبر ۱۹۸۱ء

(۹۴) ایضاً (۹۵) ایضاً ۱۹اکتوبر ۱۹۸۱ء (۹۶) ایضاً ۲۳اکتوبر ۱۹۸۱ء

(۹۷) ایضاً ۱۲نومبر ۱۹۸۱ء (۹۸) ایضاً ۱۵نومبر ۱۹۸۱ء (۹۹) ایضاً یکم دسمبر ۱۹۸۱ء

(۱۰۰) ایضاً (۱۰۱) ایضاً (۱۰۲) ایضاً ۴دسمبر ۱۹۸۱ء (۱۰۳) ایضاً

(۱۰۴) ایضاً ۲۶دسمبر ۱۹۸۱ء (۱۰۵) ایضاً ۲۸دسمبر ۱۹۸۱ء

(۱۰۶) ایضاً ۲۹دسمبر ۱۹۸۱ء (۱۰۷) ایضاً ۳۰دسمبر ۱۹۸۱ء

(۱۰۸) ایضاً ۸جنوری ۱۹۸۲ء (۱۰۹) ایضاً (۱۱۰) ایضاً

(۱۱۱) ایضاً ۹ جنوری ۱۹۸۲ء

(۱۱۲) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ،

(۱۱۳) ایضاً (۱۱۴) ایضاً (۱۱۵) ایضاً (۱۱۶) ایضاً

(۱۱۷) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۰ جنوری ۱۹۸۲ء

(۱۱۸) ایضاً

(۱۱۹) لیکن جماعت اسلامی کے رہنماؤں کو اس پابندی سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ کیونکہ ماضی قریب میں جماعت، مارشل لاء کی حمایت کرتی رہی تھی اس لیے حکومت کی طرف سے اس کی سابقہ خدمات کا خیال کیا جانا فطری امر تھا۔ شاید اسی وجہ سے جمعیت علمائے پاکستان نے آئندہ کسی بھی اتحاد میں جماعت اسلامی کو شامل نہ کرنے کاف فیصلہ کیا۔ کیونکہ جماعت کے رویہ کی وجہ سے پاکستان قومی اتحاد کا حشر سب کے سامنے تھا۔ (شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ)

(۱۲۰) ایضاً

(۱۲۱) روزنامہ جنگ، ۲۷ جنوری ۱۹۸۲ء

(۱۲۲) ایضاً

(۱۲۳) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ

(۱۲۴) ایضاً (۱۲۵) ایضاً

(۱۲۶) روزنامہ وفاق ۶ فروری ۱۹۸۲ء

(۱۲۷) ایضاً

(۱۲۸) روزنامہ جنگ کراچی، ۸ فروری ۱۹۸۲ء

(۱۲۹) ایضاً (۱۳۰) ایضاً

(۱۳۱) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ

(۱۳۲) ایضاً

(۱۳۳) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۱ فروری ۱۹۸۲ء

(۱۳۴) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۷ فروری ۱۹۸۲ء

(۱۳۵) ایضاً (۱۳۶) ایضاً

(۱۳۷) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ

(۱۳۸) ایضاً (۱۳۹) ایضاً

(۱۴۰) حبیب الرحمٰن، ''ایک سمجھوتہ جو سب کے لیے ضروری ہے'' اسلام آباد کی ڈائری ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی، ۱۵۔۲۱ فروری ۱۹۸۲ء

(۱۴۱) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۳ مارچ ۱۹۸۲ء

(۱۴۲) ایضاً ۴ مارچ ۱۹۸۲ء (۱۴۳) ایضاً

(۱۴۴) روزنامہ وفاق لاہور، ۱۲ مارچ ۱۹۸۲ء

(۱۴۵) ایضاً (۱۴۶) ایضاً ۱۴ مارچ ۱۹۸۲ء

(۱۴۷) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ

(۱۴۸) ایضاً (۱۴۹) ایضاً

(۱۵۰) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۵ مارچ ۱۹۸۲ء

(۱۵۱) ایضاً (۱۵۲) ایضاً ۱۶ مارچ ۱۹۸۲ء (۱۵۳) ایضاً

(۱۵۴) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ

(۱۵۵) مولانا شاہ احمد نورانی کا دورہ ملتان مئی ۱۹۸۲ء، بحوالہ شاہ فرید الحق محولہ بالا۔

(۱۵۶) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ

(۱۵۷) ایضاً (۱۵۸) ایضاً (۱۵۹) ایضاً (۱۶۰) ایضاً

(۱۶۱) ایضاً (۱۶۲) ایضاً

(۱۶۳) روزنامہ نوائے وقت، ۱۲ ستمبر ۱۹۸۲ء/ وفاق ۱۳ ستمبر ۱۹۸۲ء

(۱۶۴) ایضاً ۲۶ ستمبر ۱۹۸۲ء

(۱۶۵) روزنامہ جنگ ونوائے وقت کراچی، یکم نومبر ۱۹۸۲ء

(۱۶۶) ایضاً

(۱۶۷) ایک گھنٹہ تک جاری رہنے والی اس ملاقات میں یہ بھی طے پایا کہ دعوت نامہ صرف سیاسی جماعت کے سربراہ کو بھیجا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے سیکریٹری جنرل کو یا جسے وہ مناسب سمجھیں اپنے ساتھ لے کر کانفرنس میں پارٹی کی نمائندگی کریں۔ مزید برآں انہوں نے کہا کہ مولانا شاہ احمد نورانی کی پیش کردہ ضیاء الحق کو مدعو کرنے کی تجویز ختم کردی گئی ہے۔ ان کے بقول مولانا نورانی نے کہا تھا کہ باہمی صلاح مشورے کے بعد ضیاء الحق کو بھی مدعو کیا

جاسکتا ہے۔ بعد از مشورہ اس تجویز کو رد کر دیا گیا۔ (شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ)

(۱۶۸) ایضاً

(۱۶۹) روزنامہ جنگ کراچی، ۴نومبر ۱۹۸۲ء

(۱۷۰) ایضاً (۱۷۱) ایضاً ۷ اور ۹ نومبر ۱۹۸۲ء

(۱۷۲) شاہ فرید الحق بحوالہ سابقہ

(۱۷۳) ایضاً

(۱۷۴) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۲نومبر ۱۹۸۲ء

(۱۷۵) ایضاً

(۱۷۶) اداریہ روزنامہ جنگ کراچی، ۱۲نومبر ۱۹۸۲ء

(۱۷۷) اداریہ روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۲نومبر ۱۹۸۲ء

(۱۷۸) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۴نومبر ۱۹۸۲ء

(۱۷۹) ایضاً ۲۵نومبر ۱۹۸۲ء (۱۸۰) ایضاً یکم ستمبر ۱۹۸۳ء (۱۸۱) ایضاً

(۱۸۲) ایضاً ۳ستمبر ۱۹۸۳ء (۱۸۳) ایضاً ۲۳ستمبر ۱۹۸۳ء



باب چہارم

مولانا شاہ احمد نورانی اور تحریک بحالی جمہوریت (ایم۔آر۔ڈی)

ابتداء میں مولانا شاہ احمد نورانی نے ایم آر ڈی سے مکمل لاتعلقی اختیار کیے رکھی تھی۔ اس کی غالب وجہ، شاید یہی تھی کہ ماضی میں پیپلز پارٹی کی جمہوریت دشمن سرگرمیوں کی وجہ سے موجودہ مارشل لاء کی راہ ہموار ہوئی تھی۔ جیسا کہ انہوں نے نوابزادہ نصر اللہ خان سے ایک ملاقات میں کہا کہ "جمعیت علمائے پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ کسی اتحاد میں شامل نہ ہوا جائے کیونکہ یہ جماعت کل کی ظالم تھی لہٰذا آج مظلوم نہیں ہوسکتی تھی"۔(۱) بعد ازاں حالات نے جو رخ اختیار کیا بالخصوص پی آئی اے کے طیارہ کے اغواء سے یہی نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اس میں کالعدم پی پی پی کے بعض افراد ملوث تھے۔☆ اس طرح اس سے ایک طرف ایم آر ڈی کی بحالی جمہوریت کی کوششوں کو نقصان پہنچا تو دوسری طرف دائیں بازو کی پرامن سیاست کی داعی جماعتیں ایم آر ڈی سے دور ہوتی چلی گئیں (۲)۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے نہ صرف تخریب وتشدد کی سیاست کی مذمت کی بلکہ فیصلہ کرلیا کہ ایم آر ڈی سے حتی الامکان دور رہا جائے اور اگر تعاون کرنا ناگزیر ہو بھی جائے تو اس مقصد کے لیے اس اتحاد میں شامل ہوئے بغیر بحالی جمہوریت کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کی جائے (۳)۔ ویسے بھی جمعیت کی یہ خواہش تھی کہ ایم آر ڈی میں شامل اور اس سے باہر کی جماعتیں کم سے کم نکات پر متفقہ لائحہ عمل اختیار کریں تاکہ حکومت پر بحالی جمہوریت کے لیے دباؤ بڑھایا جاسکے۔ (۴)

☆ پی آئی اے کا بوئنگ ۷۲۰ طیارہ (پرواز نمبر پی کے ۳۲۶) کو ۳ مارچ ۱۹۸۱ء کو لاہور سے پشاور جاتے ہوئے اغواء کرلیا گیا۔ اس میں عملے سمیت ۱۴۸ افراد سوار تھے۔ ہائی جیکروں میں سے عالم گیر نامی فضائی قزاق کی شناخت ہوگئی تھی جس کے بارے میں بتایا گیا کہ اس کا تعلق کالعدم پی پی سے تھا۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۴ مارچ ۱۹۸۱ء) بعد ازاں ۱۹ اپریل ۱۹۸۱ء کو بی بی سی کے نمائندے مارک ٹیلی کو انٹرویو دیتے ہوئے میر مرتضٰی بھٹو نے طیارے کے اغواء میں ملوث ہونے کا اعتراف کرلیا۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۲۰ اپریل ۱۹۸۱ء)

ایم آر ڈی کی تحریک میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب ایم آر ڈی نے ۱۴ اگست ۱۹۸۳ء سے جمہوریت کی بحالی کے لیے ایک منظم اور پرزور تحریک چلانے کا اعلان کردیا(۵)۔ اس مقصد کے لیے نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے سربراہ سردار شیرباز مزاری، سیکریٹری جنرل حاجی غلام احمد بلور اور سیکریٹری اطلاعات عابد زبیری نے مولانا شاہ احمد نورانی سے ملاقات کر کے سیاسی صورتحال پر تبادلہ خیال کیا(۶)۔ مولانا نورانی نے واضح طور پر کہا کہ جب بھی جمہوریت کی بحالی کی کوئی تحریک چلی تو وہ اس سے الگ تھلگ نہیں رہیں گے(۷)۔ سردار شیرباز مزاری کے بقول جو جماعتیں ایم آر ڈی سے باہر ہیں وہ بے شک اس میں شمولیت اختیار نہ کریں لیکن وہ بحالی جمہوریت کی کوششوں کی تائید و حمایت کر کے اپنا قومی فریضہ ادا کریں۔(۸)

ایم آر ڈی کی نئی سیاسی صف بندی سے قبل ہی جنرل ضیاء نے اگست ۱۹۸۳ء میں نئے سیاسی ڈھانچے کا اعلان کردیا تھا(۹)۔ جس کا واحد مقصد صرف سیاستدانوں میں انتشار پیدا کرنا تھا۔ مولانا نورانی نے ضیاء الحق کی انکوششوں کے جواب میں کہا: "مارشل لاء انتظامیہ کو کسی نئے سیاسی ڈھانچے کے اعلان کی ضرورت نہیں کیونکہ ملک تمام سیاسی جماعتوں نے متفقہ طور پر جس آئین کو قبول کیا ہے اس میں انتخابات کے طریق کار، اقتدار کی منتقلی کے امور وطرز حکومت کے تمام اہم معاملات کا واضح تعین کردیا گیا ہے...... نیا سیاسی ڈھانچہ دراصل ان آئینی ترامیم کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے جن کا واحد مقصد مارشل لاء کو طوالت کے لیے بنیاد فراہم کرنے کے سوا کچھ نہیں...... آزاد اور غیر جانبدار انتخابات ہی ملک میں جاری بحران کا واحد حل ہیں کیونکہ سیاسی عمل کی بحالی ہی وطن عزیز کے استحکام اور سلامتی کی ضامن ہے...... میں ذاتی طور پر یہ چاہتا ہوں کہ حکومت کو ملک میں کسی ہنگامہ آرائی سے قبل ہی عام انتخابات کے لیے تاریخ کا اعلان کردینا چاہیے......"☆

ملکی صورتحال پر غور کرنے کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی نے جمعیت علمائے پاکستان کا اعلیٰ سطحی اجلاس بلایا جس میں ایم آر ڈی کی حمایت کا اصولی فیصلہ کیا گیا(۱۱)۔ مولانا نورانی

☆ مولانا نورانی نے نئے سیاسی ڈھانچے کے ضمن میں اعلان کردہ کمیشن کے اراکین سے مطالبہ کیا کہ وہ فوری طور پر مستعفی ہوجائیں کیونکہ آئین کی موجودگی میں کسی بھی قسم کے سیاسی ڈھانچے کی تیاری آئین کے منافی تھی۔ (روزنامہ نوائے وقت، ۱۴ اگست ۱۹۸۳ء)

کے بقول ان کی جماعت ہر ایسی تحریک میں ہمیشہ صف اول میں ہوگی جس کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی اور جمہوریت کی بحالی ہے۔ جمعیت علمائے پاکستان ماضی میں بھی جمہوری عمل پر یقین رکھتے ہیں اور ایم آر ڈی کی مجوزہ تحریک کے مقاصد سے کلی طور پر اتفاق رکھتے ہیں۔(۱۲)

اگست ۱۹۸۳ء میں ہی مولانا شاہ احمد نورانی رابطہ عوام مہم کے سلسلے میں سکھر گئے(۱۳)۔ وہاں جب صحافتی حلقوں نے ایم آر ڈی کی تحریک کے متعلق مولانا شاہ احمد نورانی سے استفسار کیا تو انہوں نے کہا: "پیپلز پارٹی کے سابقہ دور کی زیادتیوں کے باوجود جمعیت علمائے پاکستان پیپلز پارٹی سے نفرت نہیں کرسکتی۔ یہ ایک سیاسی جماعت ہے(اور پھر) اسلام ہمیں محبت کا درس دیتا ہے...... پی پی میں شریف اور باعزت لوگ بھی شامل ہیں اور اب جبکہ پیپلز پارٹی کے سابقہ دور کی زیادتیوں کی سزا اس کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کو مل چکی ہے تو اب کوئی جواز نہیں کہ اس کی مخالفت کی جائے۔ ہمارا اور پیپلز پارٹی کا مشترکہ مؤقف یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت انتخابات کے ذریعے اقتدار عوامی منتخب نمائندوں کو سونپ دیا جائے۔ اس آئین کی خوبی یہ ہے کہ اسے منتخب اسمبلی نے منظور کیا ہے اور آئین کے نفاذ سے ملکی وحدت اور یکجہتی برقرار رہ سکتی ہے...... موجودہ حکومت سندھو دیش کا نعرہ لگانے والوں کی سرپرستی کر رہی ہے۔ پہلے مارشل لاء کا نتیجہ بنگلہ دیش کی صورت میں نکلا جبکہ موجودہ مارشل لاء (خدانخواستہ) سندھو دیش کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے۔"(۱۴)

ایم آر ڈی نے اپنی تحریک کے آغاز کے لیے صوبہ سندھ کو چنا(۱۵)۔ ۱۴ اگست ۱۹۸۳ء کو مزار قائداعظم سے ایک بڑی ریلی نکالنے کا اہتمام کیا گیا جس سے خواجہ خیرالدین، مشیر احمد پیش امام اور غلام مصطفیٰ جتوئی نے خطاب کیا۔ بعد ازاں ریگل چوک میں ایم آر ڈی کے رہنماؤں نے گرفتاریاں پیش کیں(۱۶)۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اور معراج محمد خان کو حراست میں لے لیا گیا۔ بعد ازاں ممتاز بھٹو، بیگم نسیم ولی خان، مشیر احمد پیش امام، خواجہ خیرالدین، خورشید محمود قصوری، راؤ عبدالرشید اور چوہدری اعتزاز احسن کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ ابتداء میں اگرچہ تحریک پرامن رہی لیکن حکومتی مظالم کے ردعمل کے طور پر تحریک میں بھی تشدد کا عنصر در آیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اندرون سندھ یعنی نواب شاہ، لاڑکانہ، سکھر، میرپور ماتھیلو، دادو، شکارپور میں سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ ابتدائی ایام میں پولیس اہلکاروں

سمیت ۱۴ افراد ہلاک ہوگئے۔☆ (۱۷)

ملکی صورتحال پر غور وخوض کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی کی طرف سے جمعیت کی جنرل کونسل کا اجلاس ۲۲ اگست ۱۹۸۳ء کو لاہور میں طلب کیا گیا لیکن حکومت نے مولانا شاہ احمد نورانی کے پنجاب میں داخلے پر ۹۰ دنوں کے لیے پابندی عائد کردی (۱۸)۔ جس کی وجہ سے جنرل کونسل کے اجلاس کی صدارت پیر سید برکات احمد نے کی۔ جس میں طے پایا کہ:

۱۔ جمعیت علمائے پاکستان مارشل لاء قوانین کے خلاف شہری آزادیوں، جمہوری حقوق کی بحالی اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے عملی نفاذ کی خاطر جدوجہد جاری رکھے گی۔

۲۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ایم آر ڈی کی تحریک بحالی جمہوریت کی حمایت کی جائے گی۔ لیکن اس مقصد کے لیے ایم آر ڈی میں شمولیت اختیار نہیں کی جائے گی۔

۳۔ ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران ملک دشمن عناصر کی طرف سے تخریب کاری کے واقعات کی مذمت کی گئی۔

۴۔ حکومت سے سیاسی جماعتوں کے دفاتر کی واگزاری اور منجمد شدہ فنڈز کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا۔

۵۔ حکومت کی طرف سے کی گئی آئینی ترامیم اور مجوزہ سیاسی ڈھانچے کو مسترد کردیا گیا۔

۶۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ آزادانہ اور منصفانہ انتخاب کے سلسلے میں آل پارٹیز کانفرنس طلب کرے تاکہ بحالی جمہوریت کی راہ ہموار ہو سکے۔

۷۔ اخبارات پر عائد سنسر شپ ختم کردی جائے۔

مذکورہ لائحہ عمل پر سیاسی حمایت کے سلسلے میں مولانا شاہ احمد نورانی نے دیگر سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں جاری رکھیں۔(۱۹) اس مقصد کے لیے وہ ستمبر ۱۹۸۳ء میں ہالا (اندرون سندھ) گئے۔ جہاں انہوں نے مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ سے ملاقات کی اور ایم آر ڈی کی تحریک کی حمایت جاری رکھنے کا اعادہ کیا(۲۰)۔ اندرون سندھ حالات کا تجزیہ بعدازاں

☆ دادو میں عدالت پر حملہ کر کے عدالتی ریکارڈ کو نذرِ آتش کردیا گیا۔ جام شورو یونیورسٹی میں سندھو دیش کے حامیوں نے پاکستانی پرچم کی حامل وین کے ڈرائیور کو گولی مار کر زخمی کردیا۔ میر پور ماتھیلو میں ریلوے لائن کو اکھاڑ دیا گیا۔ (روزنامہ وفاق لاہور، ۱۶ اگست ۱۹۸۳ء)

مولانا شاہ احمد نورانی نے ان الفاظ میں کیا "اندرون سندھ حالات نازک صورتحال اختیار کر گئے ہیں۔ جن میں تمام سیاستدانوں کی تشویش ہے لیکن حکومت کو "سب اچھا ہے" کی رپورٹ مل رہی ہے (جو کہ افسوس ناک امر ہے) حکومت کو اندریں حالات صورتحال کی سنگینی کا احساس کرنا چاہیے۔" (۲۱)

انہی دنوں حکومت کی طرف سے مولانا شاہ احمد نورانی کو مذاکرات کی دعوت دی گئی (۲۲)۔ جس کی منظوری کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی نے یہ شرط رکھی کہ مذاکرات ایک باضابطہ ایجنڈا کے تحت ہوں۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے اس شرط کو منظور کرلیا گیا (۲۳)۔ ایجنڈا یہ تھا:

۱۔ سیاسی جماعتوں کی بحالی۔

۲۔ عدالتوں کے اختیارات کی بحالی اور فوجی عدالتوں کا خاتمہ۔

۳۔ مارشل لاء کا خاتمہ۔

۴۔ انتخابی شیڈول کا جلد از جلد تعین اور

۵۔ سنسر شپ کا خاتمہ☆ (۲۴)

یہ مذاکرات ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو ہونا قرار پائے (۲۵)۔ ان مذاکرات کے لیے جمعیت علمائے پاکستان کے وفد کی قیادت مولانا شاہ احمد نورانی کر رہے تھے۔ دیگر اراکین وفد میں پیر سید برکات احمد، مولانا عبدالستار خان نیازی، پروفیسر شاہ فرید الحق اور جنرل (ر) کے ایم اظہر شامل تھے (۲۶)۔ حکومت کی طرف سے جنرل ضیاء الحق کے ہمراہ وزیر اطلاعات راجہ ظفر الحق، وزیر دفاع علی احمد تالپور اور وزیر داخلہ محمود اے ہارون تھے۔ مذاکرات میں طے شدہ ایجنڈے کے تمام امور زیر بحث آئے (۲۷)۔ جنرل ضیاء نے جمعیت کے مؤقف کو وزنی قرار دیا۔ جنرل ضیاء نے یہ بھی کہا کہ وہ جلد ہی پاکستان مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام سے بھی مذاکرات کریں گے (۲۸) اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ جلد ہی ان مذاکرات کی روشنی میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچیں گے۔ (۲۹)

☆ یہ نکات کم وبیش وہی تھے جو قبل ازیں بحالی جمہوریت کے سلسلے میں اتحاد تحریک تحفظ پاکستان کی طرف سے پیش کیے گئے تھے اور اس کے ۷ فروری ۱۹۸۲ء کی نورانی، خیر الدین ملاقات میں چھ نکاتی پیکج کی صورت میں پیش کیے گئے تھے۔ اس سے مولانا شاہ احمد نورانی کی بحالی جمہوریت کے لیے کوششوں کے تسلسل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

مولانا شاہ احمد نورانی نے حکومت پر واضح کیا کہ وہ بحالی جمہوریت کے سلسلے میں ٹھوس اور جلد اقدامات کرے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اقتدار کی منتقلی کے لیے کس درجہ پر خلوص ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ سیاسی جماعتوں پر سے پابندی ہٹائی جائے اور سیاسی قیدیوں کو جلد از جلد رہا کیا جائے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ آئندہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر کرائے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ آئینی ترامیم سے حتی الامکان گریز کرے۔(۳۰) ☆

حکومت کی طرف سے مولانا شاہ احمد نورانی پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے حکومت سے مذاکرات کے بعد امور کو افشاء کر کے طے شدہ اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے امانت میں خیانت کی ہے(۳۱)۔ لیکن انہوں نے ان الزامات کی سختی سے تردید کی"ہم نے کوئی خیانت نہیں کی جس بات کو امانت بنانے کا وعدہ کیا گیا تھا وہ تو حکومت نے بتائی ہی نہیں۔ ہم نے حکومت کو سیاسی رہنماؤں کو اعتماد میں لینے کے لیے کہا اور یہ بھی کہا کہ انتخابات کے بارے میں ان کا پروگرام کیا ہے؟ مگر جنرل صاحب نے کچھ نہیں بتایا بلکہ کہا کہ سب کو بلا کر از خود فیصلے کا اعلان کروں گا اس لیے ہم نے کسی امانت میں خیانت نہیں کی...... ہم نے حکومت سے مذاکرات اس لیے کیے کہ حکومت یہ تاثر نہ دے سکے کہ سیاسی جماعتیں افہام و تفہیم کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہتیں۔ ہم نے مذاکرات کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سیاسی جماعتیں بحران کا حل چاہتی ہیں لیکن حکومت اقتدار کی منتقلی میں نہ تو مخلص ہے اور نہ عوام کے آئینی جمہوری اور بنیادی حقوق کی بحالی میں کوئی دلچسپی رکھتی ہے...... اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ حکومت سے آئندہ کسی قسم کے مذاکرات نہ کیے جائیں کیونکہ جنرل ضیاء الحق نے جس اعلان کا وعدہ کیا تھا وہ پورا نہ کر کے وعدہ خلافی کی ہے...... ملک کے بحران کا واحد حل یہی ہے کہ آئین بحال کیا جائے جو کہ ایک متفقہ آئین ہے نہ کہ کسی پارٹی کا دیا ہوا...... سندھ میں نفرت پیدا کی جارہی ہے۔ انتظامیہ نے بعض علاقوں کا پانی اور بجلی کاٹ دیئے ہیں اور اس طرح خود تشدد کر کے تشدد برائے تشدد کا جواز پیدا کیا جارہا ہے۔ اس طرح ملک میں مشرقی پاکستان جیسے حالات پیدا کیے جارہے ہیں۔ جس طرح مشرقی پاکستان کے بحران کے دوران کراچی سے بنگلہ دیش کے پرچم تیار کرا کے ڈھاکہ بھیجے گئے تھے اور وہاں حکومتی لوگوں نے

☆ مذاکرات کے بعد جنرل ضیاء الحق نے کور کمانڈروں کے اجلاس میں ملکی صورتحال پر غور کیا اور اس میں مذاکرات میں زیر بحث امور پر بھی بات چیت کی گئی۔

جلسوں میں شامل ہو کر" جئے بنگلہ" کے نعرے لگوائے تھے۔(اسی طرح سندھ میں بھی حالات جان بوجھ کر خراب کیے جارہے ہیں تاکہ سیاستدانوں کی توجہ بٹی رہے)...... سندھ کی تحریک علیحدگی کی تحریک نہیں ہے لیکن اسی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ مشرقی پاکستان کا احساس محرومی بھی بڑھ کر علیحدگی کی شکل اختیار کر گیا تھا......"(۳۲)

انہوں نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو وکلاء پر پولیس تشدد کے واقعہ کی مذمت کی اور اسے ایک افسوس ناک واقعہ قرار دیا۔ اسی شام مولانا شاہ احمد نورانی نے مسلم لیگ رہنما سید احمد سعید کرمانی کی طرف سے دیئے گئے عشائیے میں شرکت کی جس میں لاہور میں مقیم تمام اہم سیاستدان شریک ہوئے(۳۳)۔ ان رہنماؤں میں پیر پگاڑا، مولانا عبدالستار نیازی، ایس ایم ظفر، ملک محمد اکبر ساقی، پیر سید اعجاز ہاشمی، علامہ احسان الٰہی ظہیر، گوہر ایوب، ملک برکت علی عتیق، اسعد گیلانی اور میاں مسعود احمد شامل تھے(۳۴)۔ مولانا نورانی نے اس موقع پر کہا"ہماری فوج کا اولین فرض ملک کی سرحدوں کی حفاظت ہے۔ ہماری عوام اپنی فوج سے ضرور محبت رکھتی ہے لیکن اسے میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتی ہوئے دیکھنا چاہتی ہے۔ اسے سیاسی معاملات میں الجھا کر دوہری ذمہ داری نہیں ڈالنی چاہیے۔ اس لیے فوج کو جس قدر جلد ممکن ہو، واپس بیرکوں میں چلے جانا چاہیے اور یہ اس کے مفاد میں ہے اور یہی عوام کا پر زور مطالبہ بھی ہے۔"(۳۵)

بعد ازاں یکم نومبر ۱۹۸۳ء کو گوجرانوالہ میں شہداء کربلا کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا:"اگر موجودہ حکمران طبقہ پاکستان کے موجودہ سیاسی بحران کے حل کرنے کے سلسلے میں مخلص ہے تو اسے فوری طور پر ملک میں جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کرا دینے چاہیں ملک میں مارشل لاء لگنے کی وجہ سے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کا راستہ رک گیا ہے

اگر حکام اپنے وعدے کے مطابق انتخابات کرا دیتے تو شاید نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ میں تاخیر نہ ہوتی...... جمعیت علمائے پاکستان ملک میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری پارٹی نے ہمیشہ وزارتوں کی پیشکش کو ٹھکرا دیا ہے لیکن وہ لوگ جو وزارتیں حاصل کر کے اسلام آباد چلے گئے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۷۷ء میں چلنے والی تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ سے غداری کی ہے...... اپنے حقوق کی بازیابی

اور جمہوریت کی بحالی کے لیے نعرے لگانے والوں کو کوڑے لگانا غیر اسلامی ہے۔(۳۶)

اسی طرح کراچی میں دس محرم الحرام کے سلسلے میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ''امام حسینؓ دنیا کے سب سے پہلے قائد حزب اختلاف تھے جنہوں نے یزید کو اس لیے للکارا کہ وہ غیر منتخب حکمران تھا...... جبکہ تمام خلفائے راشدین منتخب ہو کر آئے تھے۔ مثال کے طور پر خلیفۂ اول سیدنا حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ۳۳ ہزار مسلمانوں نے منتخب کیا...... یزید کے حامیوں نے بھی حضرت امام حسینؓ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ مدینہ واپس جائیں اور اللہ اللہ کریں مگر آپ حق پر ڈٹے رہے۔ سیدنا امام حسینؓ اقتدار نہیں چاہتے تھے بلکہ صاحب اقتدار کی اصلاح چاہتے تھے۔ امام حسینؓ کی فکر کو آج بھی عام کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی حکومت اسلامی طریق ہائے انتخاب کے مطابق قائم کی جائے۔ ورنہ نظام زکوٰۃ تو اس دور میں بھی رائج تھا اور نماز تو یزید بھی پڑھتا تھا۔''(۳۷)

صدر ضیاء الحق نے مذاکرات برائے مذاکرات کے اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے پاکستان مسلم لیگ اور جماعت اسلامی سے بھی مذاکرات کیے(۳۸)۔ جس سے دونوں جماعتوں کی متفقہ رائے تھی کہ موجودہ حکومت عام انتخابات ۱۹۸۴ء میں کرادے گی(۳۹)۔

ان مذاکرات کے بعد دونوں جماعتوں کے قائدین نے نہ صرف اپنے رویہ میں نرمی اور لچک پیدا کرلی بلکہ ان کے درمیان اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۵ اکتوبر سے لے کر ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۳ء کے دوران میں پیر پگاڑا اور پروفیسر غفور احمد کے درمیان تین ملاقاتیں ہوئیں☆۔

اس سے صحافتی حلقوں نے اندازہ لگایا کہ موجودہ بحران کے حل کے لیے نہ صرف کالعدم مسلم لیگ اور کالعدم جماعت اسلامی کے درمیان اتحاد و اشتراک عمل کے امکانات روشن ہوگئے تھے۔ بلکہ ہم خیال سیاسی جماعتوں کے نئے اتحاد کا امکان بھی پیدا ہوگیا تھا(۴۰)۔

مولانا شاہ احمد نورانی کے سخت اور تلخ موَقف کے جواب میں حکومت نے انہیں پنجاب بدر کر کے کراچی بھیج دیا گیا(۴۱)۔ وہ ان دنوں گجرات اور گوجرانوالہ کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے حکومت پنجاب کے اس اقدام کی شدید مذمت کی۔

☆ پہلی ملاقات ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو پروفیسر غفور احمد کے دورۂ امریکہ وکینیڈا سے واپسی پر ہوئی۔ جبکہ دوسری ملاقات صدر ضیاء الحق سے مذاکرات کے بعد لاہور میں ہوئی اور تیسری ملاقات ۳۱ اکتوبر کو پیر پگاڑا کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ (روزنامہ جنگ کراچی ۲ نومبر ۱۹۸۳ء)

ان کے بقول ''حکومت ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قومی سیاسی قیادت کا رابطہ ملک کے چاروں صوبوں سے منقطع کرنے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ حزب اختلاف کی سیاسی جماعتوں کے تشخص اور وقار کو تباہ کر کے علاقائیت اور صوبائیت عصبیت کو فروغ دیا جاسکے۔(۴۲)☆

حکومت پنجاب نے جو حکم نامہ جاری کیا اس میں جمعیت کے سربراہ کے پنجاب بدر کیے جانے کی تین وجوہ بیان کی گئی تھیں۔(۴۳) حکم نامہ میں کہا گیا کہ ''مغربی پاکستان تحفظ امن عامہ آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۰ء کے تحت گورنر پنجاب کی طرف سے مولانا شاہ احمد نورانی کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ تین ماہ تک صوبہ پنجاب کی علاقائی حدود میں داخل نہ ہوں۔''(۴۴)☆

حکومت کی طرف سے پنجاب بدری کی وجوہ درج ذیل بتائی گئیں:

۱۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے لاہور اور پنجاب کے دیگر اضلاع بالخصوص ضلع گجرات میں سیاسی اجتماعات منعقد کیے تاکہ وہ سیاسی ایجی ٹیشن کو منظم کرسکیں۔

۲۔ وہ گزشتہ ایک ہفتے سے (حکومت مخالف) سیاسی بیان دیتے رہے تھے اور پریس کانفرنسز منعقد کرتے رہے تھے جن میں سیاسی مسائل پر کھلم کھلا اظہار کیا گیا تھا۔

۳۔ حکم نامہ کے آخر میں مولانا شاہ احمد نورانی کو یاد دلایا گیا کہ وہ ایم آر ڈی کے حکومت دشمن سیاسی پروگرام کی پرجوش اور سرگرم عمل وکالت کرتے رہے تھے۔(۴۵)

حکم نامہ میں مزید کہا گیا کہ: گورنر پنجاب کو اس امر پر اطمینان ہے کہ کالعدم جمعیت علمائے پاکستان کے صدر مولانا نورانی تحفظ امن عامہ کے منافی سرگرمیوں میں ملوث تھے جبکہ مارشل لاء کے ضابطہ ۳۳ اور ۴۸ کے تحت ایسی سرگرمیوں کی سخت ممانعت تھی۔(۴۶)۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے پنجاب بدر کے جانے کے حکومتی فیصلے پر سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ یہ کارروائی محض اس لیے کی گئی تاکہ نومبر ۱۹۸۳ء کو لاہور میں منعقد ہونے والے جمعیت کی مرکزی ایگزیکٹو کمیٹی اور جنرل کونسل کے مشترکہ اجلاس کو سبوتاژ کیا جاسکے۔

☆ مولانا شاہ احمد نورانی کو پنجاب کے سیکریٹری داخلہ کی جانب سے انڈر سیکریٹری (اسپیشل) کا جاری کردہ حکم نامہ منڈی بہاؤ الدین ضلع گجرات میں صبح چھ بجے موصول ہوا اور نماز فجر کے فوراً بعد ایس پی، ڈی ایس پی اور پولیس فورس نے مکان کا محاصرہ کرلیا اور پنجاب بدری کے فیصلے سے آگاہ کیا۔

☆ تاہم اس حکم نامہ میں مولانا نورانی سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ اس حکم کے خلاف حکومت کو معروضات پیش کرسکتے ہیں۔

ان کے بقول مجوزہ اجلاس میں جماعتی اور غیر جماعتی انتخابات کے سرکاری پراپیگنڈہ جمعیت کے راست اقدام پر عمل درآمد کے فیصلے کی تجدید اور حکومت سے مذاکرات جاری رکھنے یا نہ رکھنے جیسے معاملات زیر غور آنے تھے۔ تاہم...... حکومت کے ان اوچھے ہتھکنڈوں سے نظام مصطفیٰ کی جدوجہد روکی نہیں جاسکتی...... حکومت تنقید برداشت کرنے کی صلاحیت اور قوت سے عاری ہے...... میں (مولانا نورانی) گذشتہ تیس سال سے مختلف ممالک کے تبلیغی دورے کرتا رہا ہوں لیکن کہیں بھی مجھے اظہار خیال کے جرم میں علاقہ بدر نہیں کیا گیا...... پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی عہد حکومت میں صوبائی عصبیت اور علاقائیت کی سوچ اتنی پروان نہیں چڑھی جس قدر فروغ اسے مارشل لاء کے موجودہ دور میں حاصل ہوا ہے...... بظاہر بالائی سطح پر ردعمل شدید نظر نہیں آتا لیکن رفتہ رفتہ ملک کا ایک حصہ خود کو دوسرے سے الگ تھلگ محسوس کرنے لگے گا اور یہی موجودہ حکومت کی شعوری کوشش ہے...... جمعیت کے مرکزی سیکرٹری جنرل مولانا عبدالستار نیازی پر تین ماہ کے لیے لاہور سے نکلنے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اور مجھ (مولانا نورانی) پر ڈھائی سال کے بعد ایک بار پھر پنجاب میں داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔" (۴۷) ☆

جماعت اسلامی کے سربراہ میاں طفیل محمد کی بلوچستان بدری کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نورانی نے کہا کہ یہ کارروائی کالعدم جماعت اسلامی کی ساکھ بچانے کی کوشش ہے اور حکومت نے یہ بھونڈا اقدام اس وقت اٹھایا جب جماعت کے امیر خود ہی رخت سفر باندھ چکے تھے۔ (۴۸)

قبل ازیں مولانا شاہ احمد نورانی نے مارشل لاء پر سخت تنقید کی تھی۔ دارالعلوم نوریہ رضویہ بھکی شریف (منڈی بہاؤالدین) میں جلسہ دستاویز فضیلت سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا: "اسلام میں مارشل لاء کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہوتی تو سب سے پہلے مارشل لاء خود حضور ﷺ لگاتے...... مارشل لاء وفاق کے لیے خطرہ ہے۔" (۴۹)

جمعیت علمائے پاکستان کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل پروفیسر شاہ فرید الحق کے بقول مولانا شاہ احمد نورانی کی پنجاب بدری سے مفاہمت کی فضا مسموم ہوئی ہے اور حکومت کے اس طرز عمل سے صورتحال مزید بگڑنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے...... دراصل جمعیت کے سربراہ اور

☆ خیال رہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی پر صوبہ سرحد اور بلوچستان جانے پر پہلے ہی پابندی عائد تھی۔

مجھ (شاہ فرید الحق) پر سے پنجاب میں داخلے کی پابندی (قبل ازیں) اس لیے اٹھائی گئی تھی کہ بظاہر تو حکومت ہم سے مذاکرات کرنا چاہتی تھی لیکن وہ ہمیں ڈائیلاگ کے دلدل میں الجھانے کے منصوبہ پر عملدرآمد چاہتی تھی تاکہ جمہوریت اور آئین کی بحالی کی تحریک سست پڑ جائے...... مذاکرات سے ہمارا مقصد ملک کو خون خرابے، فساد اور انتشار سے بچانا تھا تاکہ حکومت اور حزب اختلاف کی سیاسی جماعتوں کے مابین مفاہمت ہو سکے اور انتقال اقتدار پر امن طریقے سے انجام پائے لیکن پنجاب کے مختلف علاقوں میں مولانا نورانی کو مذہبی اجتماعات سے خطاب کرنے کے جرم میں پنجاب بدر کر دیا گیا جس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ حکومت انتقال اقتدار کو کوئی پر امن مثال یا نظیر پیش کرنے میں مخلص نہیں ہے...... موجودہ حکومت کی سیاسی بحران کے حل کے لیے ہوش مندی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا......" (۵۰)

جبکہ ضیاء الحق حکومت نے یہ اعلان کیا کہ وہ صرف پہلے عام انتخابات ہی غیر جماعتی بنیادوں پر چاہتی ہے اس سلسلے میں سیاسی جماعتوں سے ابھی مزید مذاکرات کیے جائیں گے۔ مذاکرات کا (قبل ازیں) آدھا عمل مکمل ہو چکا ہے لیکن جن پارٹیوں سے بات چیت ہوئی ہے۔ ان میں اہم امور پر اتفاق رائے نہیں۔ (۵۱) تاہم جب تک برسراقتدار ہیں، اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ (۵۲)

پاکستان مسلم لیگ پگاڑا گروپ کے جنرل سیکریٹری ایس ایم ظفر نے واضح طور پر کہا کہ صدر سے ملاقات میں مسلم لیگ نے جماعتی بنیادوں پر انتخابات کے لیے زور دیا ہے انہوں نے مولانا نورانی کی پنجاب بدری کے عمل کو افسوس ناک قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس سے مفاہمت کے عمل کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ (۵۳)

مولانا شاہ احمد نورانی نے اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "وہ پنجاب بدری کے فیصلے کے ضمن میں گورنر پنجاب کو کسی قسم کی Representation پیش کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ بلکہ وہ حکومت پنجاب کی اس کارروائی کو عنقریب عدالت عالیہ میں چیلنج کریں گے۔ سیاستدانوں کے صوبہ بدر کرنے کے احکامات کا اجراء حکومت کے قطعی شایان شان نہیں۔ جو اسلامی اقدار کے احیاء اور نظام اسلام کے قیام کی دعویدار ہے...... اگرچہ قانون کی حکمرانی کے مسلمہ اصولوں سے انحرف اور انصاف کے حصول کی راہ میں ان گنت دشواریاں حائل ہیں لیکن اپنے بنیادی حق کے استعمال میں ہر وہ جمہوری اور آئینی طریقہ اختیار کروں گا۔

جس سے موجودہ حکومت کے ظالمانہ اقدامات بے نقاب کیے جاسکیں...... سیاستدانوں کی ملک کے مختلف صوبوں میں داخلے پر پابندی سے نہ صرف عوام میں بے چینی پھیل رہی ہے بلکہ قومی یکجہتی کی اساس پر بھی شدید ضرب پڑ رہی ہے......جن تین وجوہ کی بناء پر پنجاب بدر کیا گیا ہے وہ افسوس ناک ہیں بلکہ حکومت کی طرف سے یہ پیش کش کہ میں اپنے اخراج کے سلسلے میں اسی حکومت کو Representation بھی پیش کرسکتا ہوں، انتہائی مضحکہ خیز ہے...... جمعیت کا ۹ نومبر ۱۹۸۳ء کو ہونے والا مجوزہ اجلاس ہر حالت میں منعقد ہوگا۔ اس اجلاس کی صدارت پیر برکات احمد کریں گے۔ سنٹرل ایگزیکٹو اور جنرل کونسل کے اجلاس میں راست اقدام کے فیصلے پر غور کیا جائے گا☆(۵۴)

اس اجلاس میں درج ذیل فیصلے ہونا تھے:

- حکومت سے مزید مذاکرات کرنے یا نہ کرنے کے فیصلے کی توثیق۔
- سپریم کورٹ اور چاروں صوبوں کی ہائی کورٹس کے چیف جسٹسز پر مشتمل تحقیقاتی کمیشن کے فوری قیام کی قرارداد بھی زیرِ غور آنی تھی۔
- اجلاس میں حکومت سے مطالبہ کیا جانا تھا کہ سندھ کے مختلف اضلاع میں ضلعی انتظامیہ اور پولیس کی کارروائی سے پیدا شدہ سنگین صورتحال کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے۔
- اگر حکومت تحقیقاتی کمیشن قائم نہیں کرتی تو سیاسی جماعتیں اپنے طور پر ہائی کورٹس کے ریٹائرڈ ججوں پر مشتمل کمیشن تشکیل دیں تاکہ سندھ کے حالات کو بے نقاب کیا جاسکے۔(۵۵)

جماعت علمائے پاکستان نے ''راست اقدام'' کے پروگرام کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ ہر پلیٹ فارم سے بحالی جمہوریت کی صدا بلند کی جائے۔ بالخصوص جمعہ کے اجتماعات میں تمام مساجد میں نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ، آئین کی بحالی اور بحالی جمہوریت کے لیے قرار دادیں

☆ اگرچہ ''راست اقدام کی نوعیت کے بارے میں مولانا نورانی نے کچھ نہیں بتایا تاہم بعد ازاں حالات و واقعات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ راست اقدام سے مراد، حکومت مخالف جلسوں کا ایک مسلسل سلسلہ تھا کیونکہ جمعیت علمائے پاکستان مارشل لاء حکومت سے ٹکرانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے سامنے الجزائر میں فوجی حکومت کے مظالم روز روشن کی طرح عیاں تھے۔

منظور کی جائیں۔☆ لیکن جمعیت کی کوشش تھی کہ ایم آر ڈی کے برخلاف، تحریک کو زیادہ سے زیادہ پر امن رکھا جائے۔ جس کا اعتراف اس وقت کے گورنر سرحد لیفٹیننٹ جنرل (ر) فضل حق نے بھی کیا۔ ان کے بقول جمعیت علمائے پاکستان کی تحریک سے امن وامان کو کوئی خطرہ نہیں جبکہ ایم آر ڈی کی تحریک بے وجہ ہونے کے سبب ناکام ہوئی۔(۵۶)

جمعیت علمائے پاکستان کی بحالی جمہوریت کی جدوجہد اور ایم آر ڈی کی تحریک کے حوالے سے مولانا شاہ احمد نورانی کی پالیسی کے بارے میں معاصر صحافتی حلقوں کی رائے ملاحظہ ہو: ''ایم آر ڈی کی تحریک کے تین ماہ مکمل ہو چکے ہیں مگر جمہوریت کی منزل ہنوز دور ہے۔ وزیر داخلہ محمود اے ہارون کے بقول اس دوران سندھ کے مختلف علاقوں میں ۶۱ افراد ہلاک ہوئے۔ ۲۰۰ سے زائد زخمی ہوئے جبکہ ۴۶۹۱ افراد گرفتار کیے گئے۔ کالعدم جمعیت علمائے پاکستان کی جانب سے راست اقدام کے فیصلے سے ایم آر ڈی کے حلقوں میں ہلچل کے کچھ آثار نمودار ہوئے ہیں۔ کالعدم جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ علامہ نورانی نے پہلے کبھی ایم آر ڈی کی تحریک کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ زبانی طور پر بھی نہایت بے جگری سے اس کی حمایت کا اعلان کرتے رہے ہیں۔ بلکہ ہالہ جاکر پاکستان پیپلز پارٹی کے وائس چیئرمین مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ سے ملاقات بھی کی تھی جس کے بعد نورانی میاں نے جنرل ضیاء الحق کے ساتھ مذاکرات پر آمادگی کا اظہار کیا تھا تو اس فیصلے کی پشت پر بھی پیپلز پارٹی کی منشاء ہی سمجھی گئی۔ مولانا نورانی اور ان کے رفقائے کار کے بقول صدر ضیاء الحق سے مذاکرات کے دوران انہوں نے قوم کے جو متفقہ مطالبات پیش کئے تھے ان کے حل کے لیے اب تک کوئی پیش رفت نہیں کی گئی۔ صرف زبانی جمع خرچ میں وقت ضائع کیا جارہا ہے جبکہ ملک کے موجودہ حالات میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہے......(۵۷)

مولانا شاہ احمد نورانی نے سندھ کے عوام کی بے مثال جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ جمعیت اور ۱۹۷۳ء کے آئین کی بحالی کے لیے سندھ کے عوام جدوجہد اور مقاصد کے حصول کے لیے جس طرح صبر آزما مراحل سے گزر رہے ہیں وہ تاریخ کا ایک سنہری باب ہے...... جمہوریت اور آئین کی بحالی نیز جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کے

☆ ان قراردادوں میں مارشل لاء کی طوالت کی ملکی استحکام و سالمیت کے لیے خطرناک قرار دیا گیا۔ مزید برآں سنسر شپ کی خدمت کی گئی۔

مطالبات پوری قوم کے مطالبات ہیں جنہیں موجودہ حکومت بلا تاخیر تسلیم کر لینا چاہیے...... جمہوریت پاکستان کی بقاء کا مسئلہ ہے اس لیے آمریت کا خاتمہ ضروری ہے۔(۵۸)

۲۰ نومبر ۱۹۸۳ء کو لاہور میں جمعیت کی ۹ رکنی اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی کے ۵ ارکان کا اجلاس ہوا۔ مولانا شاہ احمد نورانی پر پنجاب میں داخلے کی وجہ سے اجلاس کی صدارت پیر سید برکات احمد شاہ نے کی اور اس میں مذکورہ تمام امور کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔(بعد ازاں ان فیصلوں سے جمعیت کے سربراہ کو آگاہ کر دیا گیا۔)(۵۹)

جن دنوں لاہور میں جمعیت کی قیادت کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مولانا شاہ احمد نورانی کے زیر قیادت سندھ یونٹی بورڈ کا وفد اندرون سندھ کے دورے پر گیا ہوا تھا(۶۰)۔ ۲۰ نومبر کو مولانا شاہ احمد نورانی اور وفد نے پاکستان نیشنل پارٹی کے رہنما عبد الحمید جتوئی سے ملاقات کی(۶۱)۔ جتوئی نے وفد کو یقین دلایا کہ موجودہ تحریک کا مقصد ہرگز ملک توڑنا نہیں بلکہ محض جمہوریت کی بحالی ہے اور ملک کے تمام طبقات کی مشترکہ کوششیں پاکستان کو متحدہ رکھنے کے لیے ہیں۔ سندھ یونٹی بورڈ کے وفد نے اندرون سندھ کے علاقوں نیو جتوئی، نوشہرو فیروز، خیر پور ناتھن، مورو، میہڑ، قاضی احمد، نواب شاہ، لاکھات، پٹیل، خان جانڈیو، سیان، ہالا اور دیگر چھوٹے گاؤں اور دیہاتوں کا دورہ کیا(۶۲)۔ اس دورے کا مقصد عوام الناس کو یہ یقین دلانا تھا کہ حکومتی مظالم کے باوجود ان کے بحالی جمہوریت کی کوششیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ بلکہ مولانا نورانی کے بقول اب تحریک میں مزید شدت پیدا ہوگی۔ مزید برآں اراکین وفد نے تحریک کے دوران کیے گئے حکومتی مظالم کے بارے میں اعداد و شمار بھی اکٹھے کیے۔(۶۳)

مولانا نورانی نے دورۂ اندرون سندھ کے دوران پاکستان پیپلز پارٹی کے قائم مقام صدر مخدوم امین فہیم سے بھی ملاقات کی اور موجودہ سیاسی صورتحال، تحریک کی موجودہ رفتار اور آئندہ کے مشترکہ لائحہ عمل پر بھی بات چیت کی(۶۴)۔ مخدوم امین فہیم نے مولانا نورانی پر زور دیا کہ وہ جمہوریت اور حقوق کی بحالی اور منصفانہ انتخابات کے انعقاد کے لیے اب اپنا موثر کردار ادا کریں(۶۵)۔ کیونکہ سندھ کے عوام ان سے گہری عقیدت رکھتے ہیں بلکہ پوری قوم کی نظریں ان پر مرکوز ہیں۔ مولانا نورانی نے کہا کہ ہماری بھرپور کوشش ہوگی کہ حکومت کو غیر جماعتی انعقاد سے روکا جائے کیونکہ وہ اس قسم کے الیکشن سے (محض) خوشامدیوں کا ایک بے ضمیر ٹولہ جمع کرنا چاہتی ہے جو مجلس شوریٰ میں موجود درباریوں کی طرح واہ واہ کرتا رہے(۶۶)

بعض حلقوں نے سندھ یونٹی بورڈ کے اس دورہ کو جمعیت پی پی گٹھ جوڑ بھی قرار دیا کیونکہ انہوں نے مولانا شاہ احمد نورانی کے پیپلز پارٹی کے رہنماؤں سے ملاقاتوں کو ہی مذکورہ بورڈ کے مقاصد قرار دیا۔ جبکہ کئی اخبارات نے اس کی تردید کرتے ہوئے اس دورے کو ملکی یکجہتی کے لیے خوشگوار قدم قرار دیا۔ مثال کے طور پر:

مولانا شاہ احمد نورانی اور ان کے رفقاء پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا گیا:

"سندھ اتحاد بورڈ کے نام سے حال ہی میں ایک گروپ تشکیل پایا ہے جس کا صدر مولانا شاہ احمد نورانی کو بنایا گیا ہے۔ ان کے ساتھ شاہ فرید الحق، محمود الحق عثمانی اور ہارون احمد وغیرہ ہیں۔ ان لیڈران نے ہالا، نوشہرو فیروز، خیر پور ناتھن، لاکھا گھاٹ اور نواب شاہ کا مختصر طوفانی دورہ بھی کر ڈالا ہے اس اتحاد نامی گروپ کے قیام کے وقت جو تاثر دیا گیا تھا۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا مقصد سندھ میں بسنے والے نئے اور پرانے سندھیوں کے درمیان بھائی چارہ کے فروغ اور حقیقی اتحاد کو قائم کرنے کے لیے باہمی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہے۔ محب وطن افراد نے اس تاثر کے پیش نظر اس اتحاد بورڈ کے قیام کو دانشمندانہ قرار دے کر اس کو سراہا تھا لیکن پہلے ہی قدم پر یعنی حالیہ دورِ سندھ سے یہ تاثر ختم ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اس لیے کہ اس دورہ میں کالعدم پاکستان پیپلز پارٹی کے وڈیرے ہی صرف اس گروپ کے میزبان ہوئے یا دوسرے لفظوں میں خود مولانا نورانی اور ان کے ساتھیوں نے اندرون سندھ رابطہ قائم کرنے کے لیے ان کا انتخاب کیا۔ ہالہ میں کالعدم پیپلز پارٹی کے قائم مقام صدر مخدوم امین فہیم کا گھیرا ان کے گرد رہا تو نواب شاہ میں سید حسن علی شاہ اور سید نور حسن شاہ جو سابق رکن قومی اسمبلی سید نور احمد شاہ کے صاحبزادے ہیں ان کو گھیرے رہے۔ آس پاس کے علاقوں میں کالعدم پیپلز پارٹی کے ارکان ہی اس اتحاد بورڈ کے لیڈروں سے مخاطب رہے۔ اس دورہ کے بعد اتحاد بورڈ کے کنوینر محمود الحق عثمانی کی رہائش گاہ پر ایک پریس کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مولانا نورانی نے ایک بار پھر بہت اچھی تجویز پیش

کی ہے کہ سندھ کی حالیہ تحریک کے نتیجہ میں پیش آنے والے واقعات کو غیر جانبدارانہ تحقیقات کے لیے دو ہفتے کے اندر اندر ایک عدالتی کمیشن تشکیل دیا جائے جو سپریم کورٹ اور چاروں صوبوں کی ہائی کورٹوں کے چیف جسٹسوں پر مشتمل ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ صوبہ سندھ میں سیاسی ایجی ٹیشن کے دوران تشدد اور ہلاکت کے واقعات کی تحقیقات ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ صوبہ سندھ اور وفاق کے درمیان اعتماد بحال رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے لیکن یہ مقصد محض حالیہ ایجی ٹیشن کے دوران تشدد اور ہلاکت کے واقعات کے لیے عدالتی کمیشن قائم کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ ون یونٹ کے قیام کے پس منظر سے اس عدالتی کمیشن کا دائرہ کار متعین کیا جائے اور آج تک جو صوبہ سندھ کے لوگوں میں احساس محرومی اور مایوسی پائی جاتی ہے اس کی تفصیلی رپورٹ حقائق پر مبنی تیار کی جائے تو یہ کمیشن ملک کے استحکام اور ملک میں مختلف طبقات کے درمیان اسلامی اخوت اور بھائی چارہ کے فروغ کے لیے یقیناً انتہائی مفید ثابت ہوگی......" (۶۷)

سندھ یونٹی کا وفد ۲۲ نومبر ۱۹۸۳ء اپنا دورہ اندرون سندھ مکمل کر کے کراچی آ گیا۔

مولانا شاہ احمد نورانی کا لہجہ اب پہلے سے سخت اور تلخ ہو چکا تھا۔ کیونکہ ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران کیے گئے مارشل لاء کے مظالم نے ان کی طبیعت پر ناگوار اثرات چھوڑے تھے۔ (۶۸)

راست اقدام کے اعلان کے تحت مولانا شاہ احمد نورانی نے پروفیسر شاہ فرید الحق اور صوبہ سندھ کے دیگر ممتاز رہنماؤں کے ہمراہ جمعہ ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو مسجد شہداء لیاقت آباد میں خطاب کیا (۶۹)۔ جو مولانا نورانی کے لہجے کی اسی تلخی کا غماز تھا۔ مولانا نورانی کے بقول:

"پہلے اور دوسرے مارشل لاء کا نتیجہ بنگلہ دیش تھا اس تلخ تجربے کی روشنی میں اگر بقیہ ماندہ پاکستان کو بچانا ہے تو ملک میں جتنی جلدی ممکن ہو سکے مارشل لاء کو خیر باد کہنا ہوگا۔ نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ اور پاکستان کا استحکام لازم و ملزوم ہیں اور یہ دونوں عوامل مارشل لاء کے دور میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے۔ ہمارا واضح اعلان ہے کہ نظام مصطفیٰ ﷺ کے قیام تک ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔ اگر گزشتہ چھ سالوں کے دوران نظام مصطفیٰ ﷺ نافذ ہوگیا

ہوتا تو زکوٰۃ دینے والے تو ہزاروں ملتے لیکن زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ہوتا۔ آج اسلام کا نام صرف طوالت اقتدار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام اور مارشل لاء دو متضاد چیزیں ہیں۔

خلافت راشدہ کے تمام عہد میں مسلمان جرنیلوں اور سپہ سالاروں نے کبھی بھی سیاسی ضرورت کے تحت اقتدار پر قبضہ نہیں کیا۔ لہٰذا مارشل لاء کا نفاذ ایک غیر اسلامی امر ہے۔" (۷۰)

مولانا شاہ احمد نورانی کی پر جوش سیاسی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے یہ خدشہ پیدا ہوگیا تھا (۷۱) کہ حکومت انہیں کسی بھی وقت گرفتار کرسکتی ہے (بلکہ یہ افواہ پورے زور وشور سے (بالخصوص کراچی میں) گردش کر رہی تھی کہ ان کو عنقریب نظر بند کردیا جائے گا)۔ مولانا شاہ احمد نورانی بھی اس امر کی توقع کر رہے تھے ان کے بقول: "وہ نظر بندی، گرفتاری غرضیکہ قید و بند کی تمام صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ اگرچہ فی الحال آزاد ہیں مگر جیل جانے کے لیے بستر باندھ لیا ہے اور منتظر ہیں کہ کب سرکار دار و رسن کی جانب بلاتی ہے...... (ان کے خیال میں) میری گرفتاری تو گزشتہ ایک ماہ سے due ہے لیکن شاید (حکومت کی طرف سے) شاید ہاتھ ڈالنے کا صحیح وقت نہیں آیا...... قید و بند ہمارے لیے نئی بات نہیں ہم تو (اس حوالے سے) پرانے "پاپی" ہیں...... میرے اپنے ذرائع نے مجھے خبردار کیا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ تاہم جو کچھ ہونے والا ہے، اب ہو ہی جائے۔ میری طرف سے تیاری مکمل ہے......" (۷۲)

حکومت تاہم بار بار یہ اعلان کر رہی تھی کہ عام انتخابات عنقریب ہوں گے بلکہ ۱۹۸۴ء کو ہوں گے۔ شیڈول کا اعلان آئندہ سال (یعنی ۱۹۸۴ء کے اوائل میں) کردیا جائے گا (۷۳)۔ جبکہ انتخابات کا عمل ایک ہفتہ میں مکمل کرلیا جائے گا۔ وفاقی وصوبائی مجالس شوریٰ (یعنی قومی وصوبائی اسمبلیوں) کی نشستوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے نئے سرے سے حلقوں کی حد بندیاں کی جائیں گی۔ (اس طرح) نئے حلقے پہلے کی بہ نسبت چھوٹے ہوں گے۔ نئی انتخابی حد بندیاں ۱۹۸۴ء کے وسط تک مکمل ہوجائے گا (۷۵)۔ مزید یہ کہ یہ فیصلہ بھی بہت جلد کرلیا جائے گا کہ انتخاب جماعتی بنیادوں پر ہوں یا غیر جماعتی بنیادوں پر۔ اس کے علاوہ شناختی کارڈ کے ذریعے ووٹ ڈالنے کا طریق کار اتنا سہل اور آسان بنایا جائے گا کہ کسی غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔ (۷۶)

عام انتخابات کے بارے میں حکومت کے بار بار اعلانات سے سیاسی حلقوں کو گمان ہونے لگا کہ شاید انتخابات جلد ہو جائیں۔ اسی مقصد کے مختلف سیاسی جماعتوں میں روابط پہلے سے زیادہ بڑھ گئے (۷۷)۔ ۲۷ نومبر ۱۹۸۳ء کو مسلم لیگ کے صدر پیر پگاڑا نے جماعت اسلامی کے مرکز کا دورہ کیا (۷۸) اور جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد اور دیگر رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ انہوں نے جماعت اسلامی کے رہنماؤں پر زور دیا کہ مختلف راستوں کے بجائے ایک ہی سمت میں چلا جائے۔ پیر پگاڑا کے جماعت اسلامی کی طرف جھکاؤ سے جمعیت کے بعض رہنماؤں نے ان پر نکتہ چینی بھی کی۔

مولانا شاہ احمد نورانی (جو جمعیت کی طرف سے اعلان کردہ راست اقدام پروگرام کے تحت خود اور اپنے رفقاء کی مدد سے ملک گیر عوامی رابطہ مہم جاری رکھے ہوئے تھے۔) ان تمام باتوں سے بے نیاز مسلسل اپنی بحالی جمہوریت کے لیے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ انہوں نے اس امر کے باوجود کہ ایم آر ڈی کے بعض رہنما ایم آر ڈی کی تحریک میں نرمی اور لچک کا عندیہ دے رہے تھے (۷۹) ☆۔ یہ اعلان کیا کہ راست اقدام کا اگلا مرحلہ پہلے سے سخت ہوگا۔ اگر حکومت کی بحالی اور جماعتی انتخابات پر رضا مند نہ ہوئی تو دیگر ہم خیال جماعتوں کے ساتھ مل کر تحریک چلائی جائے گی (۸۰)۔☆☆

جبکہ شاہ فرید الحق نے حکومت پر زور دیا کہ وہ اسلام کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ نافذ کرے جس کا عدلیہ، سرکاری دفاتر اور پولیس تھانوں پر بھی براہ راست مؤثر اطلاق ہوتا ہے اور جو انتظامیہ، عدلیہ اور حکمران سب کا یکساں احتساب کرسکتا ہو..... پاکستان کی پوری تاریخ میں اسلام کے نفاذ کا نعرہ بنیادی پالیسی کے طور پر رہا ہے لیکن یہ المیہ ہے کہ سابق حکومتوں اور بالخصوص موجودہ حکومت کا نفاذ اسلام کے پراپیگنڈے کے باوجود حقیقی اسلام نظر نہیں آتا۔ جو حکمران اور رعایا دونوں سے جواب طلبی کرسکتا ہو۔ اسلام ہمارے یہاں اسلامی نظریاتی کونسل کے ریکارڈ میں تو ملتا ہے لیکن معاشرے میں اس کے ثمرات دور دور تک نظر نہیں آتے۔ (۸۱)

☆ جیسا کہ ایم آر ڈی کے ایک رہنما ملک محمد قاسم نے واضح طور پر کہا کہ ایم آر ڈی کی تحریک میں گرفتاری دینے کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔ اب اس سلسلے میں دیگر جماعتوں سے رابطہ کیا جائے گا۔ (۲۵ دسمبر ۱۹۸۳ء)

☆☆ یہ فیصلہ مولانا نورانی نے ۶ دسمبر ۱۹۸۳ کو ہونے والے جے یو پی کے اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی کے اجلاس میں کیا۔

ابھی جمعیت علمائے پاکستان راست اقدام کے اگلے مراحل کے بارے میں سوچ بچار کر رہی تھی کہ ایک سنسنی خیز واقعے نے حکومتی اور سیاسی دونوں حلقوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس سے نہ صرف سیاسی حلقوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ بالخصوص ایم آر ڈی کی تحریک کو زبردست نقصان پہنچا (۸۲)۔ سیاسی پارٹیاں جو پہلے ہی مارشل لاء قوانین کے تحت محبوس فضا میں سانس لے رہی تھیں، اس واقعے سے مزید محتاط ہوگئیں۔ ۲ جنوری ۱۹۸۴ء کو انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) نے لاہور میں کچھ فوجی افسران کو حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں گرفتار کیا (۸۳)۔ اس سازش کیس کو پاکستان کی سیاسی تاریخ میں **Operation Galaxy** کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سازش میں ملوث افسران کو مبینہ طور پر پاکستان پیپلز پارٹی کے بعض رہنماؤں کی آشیرباد حاصل تھی اور "بغاوت" کے لیے اسلحہ بھارت نے فراہم کیا تھا (۸۴)۔ ملزمان میں درج ذیل فوجی افسران شامل تھے:

میجر آفتاب چوہدری، میجر نثار حسین بخاری، میجر محمد صادق، اسکواڈرن لیڈر فتح محمد شرزاد، میجر عبدالرزاق ملک، میجر محمد اکبر خان نیازی، میجر محمود اختر شیرازی، میجر مصطفیٰ کمال، لیفٹیننٹ کرنل خالد محمود، میجر محمد خالد، میجر عبدالقیوم، میجر ظفر اقبال، میجر اقتدار حسین اور میجر خالد وحید بٹ۔ ان کے علاوہ اس مقدمۂ بغاوت میں جو سویلین افراد شامل تھے ان میں ایک ریٹائرڈ پولیس افسر چوہدری ریاست علی، ایک ریٹائرڈ میجر ظہیر احمد اور ایک قانون دان رضا کاظم وغیرہ (۸۵)

اس واقعے کی وجہ سے کچھ عرصے تک سیاسی جماعتوں پر جمود کی سی کیفیت طاری رہی کیونکہ اس موقع پر کسی قسم کی تحریک فوج کو اشتعال دلانے کا سبب بن سکتی تھی۔ تاہم جمعیت علمائے پاکستان نے اپنے راست اقدام کے پروگرام کو پرامن طور پر جاری رکھا (۸۶)، کراچی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے شاہ فرید الحق نے کہا کہ اسلام میں حاکم اور رعایا دونوں کے لیے ایک ہی قانون ہے لیکن موجود حکومت دوہرے معیارات کی حامل ہے۔ صدر مملکت، وزراء اور ارکان شوریٰ کو براہ راست عوام سے رابطہ قائم کرنے کی کھلی اجازت ہے اور خود صدر مملکت جلسے کر رہے ہیں جبکہ دوسروں کے لیے پابندیاں ہیں اور یہ حکومتی فعل صریحاً اسلامی نظام عدل کے منافی ہے۔ (۸۷) ☆

☆ مولانا نورانی ان دنوں ماریشس کے تبلیغی دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ جس کے بعد انہوں نے طبی معائنہ بھی کرایا۔ ان کی واپسی غالباً مارچ میں ہوئی۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۲۳ جنوری ۱۹۸۴ء ایضاً)

ان حالات میں ایم آر ڈی کی تحریک پر ناکامی کے آثار چھانے لگے۔ بلکہ صحافتی حلقوں کے بقول ایم آر ڈی کی تحریک مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ضروری نہیں کہ تحریکیں اپنے مقاصد فوری حاصل کرلیں نہ ہی تحریکیں اس لیے ہی چلائی جاتی ہیں کہ فوری طور پر نتائج حاصل کرلیں۔ تحریکیں تو ایک طویل سلسلہ ہوتی ہیں۔ جو حالات کے تحت اپنی رفتار تبدیل کرتا رہتا ہے۔(۸۸)

مارچ ۱۹۸۴ء میں مولانا شاہ احمد نورانی نے جمعیت کا اعلیٰ سطحی اجلاس طلب کیا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سیاسی جماعتوں کو حالات کی نزاکت کا احساس دلایا جائے اور انہیں کہا جائے کہ بحالی جمہوریت کے لیے ایک مشترکہ لائحہ عمل اختیار کریں اور کم سے کم نکات پر اتحاد کریں۔(۸۹) کم از کم جس نکتہ پر اتفاق کی ضرورت تھی وہ آئین کے تحت انعقادِ انتخابات کا مطالبہ تھا جسے بعد ازاں ''یک نکاتی فارمولا'' کا نام دیا گیا۔ جس سے پیر پگاڑا سمیت تمام قابل ذکر سیاستدانوں نے اتفاق کیا۔(۹۰)☆

نواب زادہ نصر اللہ خان جو گذشتہ تین سالوں سے نظر بند تھے۔ انہوں نے بھی اس فارمولے کو سراہا۔ نوابزادہ کو ستمبر ۱۹۸۴ء میں رہا کر دیا گیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے نوابزادہ سے ایک طویل ملاقات کی (۹۱)☆☆۔ جس کا مقصد عام انتخابات کا انعقاد اور اس مقصد کے لیے جمہوری عمل کی بحالی تھا۔ مولانا شاہ احمد نورانی سیاستدانوں میں افہام وتفہیم کی فضا پیدا کرنے کے لیے مسلسل بیانات کے ذریعے مارشل لاء حکومت کے اقدامات کی حمایت کر رہے تھے(۹۲)۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے پیر پگاڑا کو پیغام دیا کہ اگر وہ اپنی سمت درست کرلیں تو (ایک دفعہ) پھر دونوں جماعتوں کے کارکن ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے۔ ان کے بقول جب دونوں جماعتوں کے کارکن آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔

☆ لیکن بعد ازاں پگاڑا نے بھی مارشل لاء حکومت کے تحت ہونے والے غیر جماعتی انتخابات کی حمایت کرنا شروع کردی بلکہ ان انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت میں وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی تقرری بھی پیر پگاڑا کے ایماء پر ہوئی۔

☆☆ قبل ازیں مولانا شاہ احمد نورانی دل کے بائی پاس آپریشن کے لیے جولائی تا ستمبر ہالینڈ چلے گئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں تمام جماعتی امور سینئر نائب صدر جمعیت علمائے پاکستان پروفیسر شاہ فرید الحق سرانجام دیتے تھے۔

ان کارکنوں میں کوئی فرق نہیں۔ فرق صرف بڑے بھائی اور قیادت کا ہے۔ کیونکہ ہمارا قبلہ نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ ہے جبکہ بعض کی منزل جی ایچ کیو ہے۔ اگر پیر پگاڑا بھی اپنا قبلہ درست کرلیں تو پھر معاملات بھی درست ہو سکتے ہیں (۹۳)۔☆

ان دنوں ملکی صورتحال یہ تھی کہ بھارت میں سکھوں کی آزاد ریاست (خالصتان) کے قیام کے لیے تحریک جاری تھی جو ہندو سکھ فسادات کی شکل اختیار کرتی جارہی تھی (۹۴)☆☆۔ بالخصوص گولڈن ٹمپل پر بھارتی فوج کی جارحیت نے سکھوں کے جذبات انتہائی مجروح کردیئے تھے۔ بھارت کی طرف سے پاکستان پر اس تحریک کی حمایت کا واضح الزام لگایا جارہا تھا۔ جس کی وجہ سے سرحدات پر کشیدگی بڑھ گئی تھی۔ تاہم اس صورتحال کا حکومت کو یہ فائدہ ہوا کہ سیاستدانوں اور عوام، ہر دو کی توجہ ملکی حالت خصوصاً دفاع کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان پر بھارتی حملے کا خطرہ بھی بڑھ رہا تھا۔ لہٰذا عوام الناس کی طرف سے حکومتی فیصلوں کی حمایت ایک فطری امر تھا۔ یہ فضا حکومت کے لیے اس لحاظ سے انتہائی سازگار تھی کہ وہ اپنی شرائط پر انتخابات کا اعلان کردیتی۔ کیونکہ عوامی حمایت بہرحال ضیاء حکومت کو حاصل تھی۔ اسی صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت نے اعلان کردیا کہ مجوزہ انتخابات کے انعقاد کے لیے انتخابی شیڈول اور انتخابی طریق کار کا اعلان کردیا جائے گا اور اکتوبر ۱۹۸۴ء میں انتخابی شیڈول کے اعلان کی توقع ہے تاہم یہ بات طے ہے کہ آئندہ انتخابات غیر سیاسی بنیادوں پر ہوں گے اور صدر پاکستان کا انتخاب آئندہ منتخب شوریٰ (اسمبلی) کرے گی۔(۹۵) مزید برآں صدر نے پھر وضاحت کی کہ مجوزہ انتخاب میں سیاسی جماعتوں کا کوئی کردار نہیں ہوگا اور انتخاب اسلامی اصولوں کے تحت اور انصاری کمیشن کی سفارشات کی بنیاد پر کرائے جائیں گے۔ اگر انتخابات کے نتائج مثبت ہوئے تو (توقع ہے کہ) کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا طرز حکومت اور طریق انتخابات سے متعلق اعلان مناسب وقت پر ہوگا۔(۹۶)

☆ پیر پگاڑا چونکہ جمعیت کے شروع ہی سے ہم خیال تھے اس لیے ان سے مولانا شاہ احمد نورانی کا شکوہ بجا تھا۔ لیکن پیر پگاڑا نے اپنے مؤقف میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی اور بدستور مارشل لاء اور غیر جماعتی انتخابات کی کھلے بندوں حمایت جاری رکھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلم لیگ پگاڑا گروپ اور جماعت اسلامی کی پالیسیوں میں غایت درجہ یکسانیت تھی (روزنامہ جنگ کراچی، ۲۰ ستمبر ۱۹۸۴ء)

☆☆ ۲ نومبر ۱۹۸۴ء کو وزیر اعظم انڈیا مسز اندرا گاندھی کے قتل سے حکومت کی طرف سے بھارت میں سکھوں کے لیے زمین اور تنگ کردی گئی۔

تاہم ۴ نومبر ۱۹۸۴ء کو الیکشن کمیشن کی طرف سے انتخابی حلقوں کی فہرست جاری کردی گئی اور ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء تک عام انتخابات کے لیے کیا جانے والے انتظامات کو حتمی شکل دے دی گئی (۹۷)۔ بلکہ بعد ازاں حکومت نے ٹریبونلز سے نااہل قرار دیئے گئے ۱۷۴ سیاستدانوں کو بھی انتخاب لڑنے کی اجازت دے دی تھی۔ (۹۸)

ایک طرف سیاستدانوں کی توجہ انتخابات میں الجھی ہوئی تھی تو دوسری طرف انتخابات کے جماعتی یا غیر جماعتی بنیادوں پر کرائے جانے کی بحث جاری تھی۔ اسی اثناء میں حکومت نے ایک اور پینترا بدلا اور ضیاء حکومت نے اسلامی نظام کے نفاذ کے سوال پر ریفرنڈم کرانے کا اعلان کردیا (۹۹) جماعت اسلامی اور مسلم لیگ نے ریفرنڈم کے انعقاد کی بھرپور حمایت کی۔ میاں طفیل محمد نے عام انتخابات کے انعقاد کے لیے ریفرنڈم کی کامیابی کو ضرور قرار دیا (۱۰۰)۔ ان کے بقول ریفرنڈم میں صدر کے حق میں اسی نوے فی صد ووٹ لازماً پڑنے چاہئیں تاکہ حکومت کے کسی بھی مخالف کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو کہ ریفرنڈم ہوائی ہے (۱۰۱)۔ جبکہ پیر پگاڑا نے ان سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا کہ ریفرنڈم ایک جمہوری عمل ہے جس میں ہر شخص کو حصہ لینا چاہیے۔ ہم نے مسلم لیگ کے تمام افراد کو اس میں حصہ لینے (یعنی ووٹ ڈالنے) کی اجازت دے دی ہے۔ (۱۰۲)

اس ریفرنڈم کی توجیہہ یہ پیش کی گئی کہ:

۱۔ کیا آپ (عوام) موجودہ حکومت کی پالیسیوں کی تائید کرتے ہیں؟

۲۔ کیا آپ نظریہ پاکستان پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے تحفظ کے خواہاں ہیں؟

۳۔ کیا آپ نفاذ اسلام کے عمل کی حمایت کرتے ہیں؟

۴۔ کیا آپ اس عمل کو تیز کرنے اور مستحکم بنانے کے حق میں ہیں؟

۵۔ کیا آپ ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کے (حکومت کے) اعلان کردہ پروگرام کی حمایت کرتے ہیں؟ (۱۰۳)

ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان نفاذ اسلام اور نظریہ پاکستان کے سوالات کا نفی میں جواب نہیں دے سکتا تھا لہٰذا ۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کو ہونے والے ریفرنڈم میں "ہاں" میں ڈالے گئے ووٹوں کی شرح ۷۱۔۹۷ فیصد رہی اور اسی بنیاد پر انہوں نے خود ہی اگلے پانچ برس کے لیے صدر منتخب ہونے کا اعلان کردیا۔ (۱۰۴)

چونکہ صدر پاکستان نے ریفرنڈم کے ذریعے اگلے پانچ سال کے لیے اپنی صدارت پکی کرلی تھی۔ اس لیے اب آئندہ انتخاب اور اس کے نتیجے میں بننے والی حکومت سے انہیں خطرہ نہیں تھا (۱۰۵)۔ حالانکہ ۱۴ ستمبر ۱۹۸۴ء کو اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ صدر کا انتخاب آئندہ اسمبلی میں کرے گی لیکن انہوں نے یہ خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھتے ہوئے ریفرنڈم کی صورت میں احتیاطی تدبیر اختیار کرلی تھیں۔ (۱۰۶)

اس صورت حال کے تناظر میں صدر ضیاء الحق نے غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کا اعلان کردیا جو اسی سال (۲۵ فروری ۱۹۸۵ء) منعقد ہونا تھے۔ پیر پگاڑا نے اس حکومتی اعلان کی بھرپور حمایت کی اور کہا کہ وہ جماعتی بنیادوں پر منعقدہ انتخابات کی بھرپور مخالفت کریں گے (۱۰۷)۔

حکومتی اعلان کے جواب میں ایم آرڈی نے انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کردیا (۱۰۸)۔ ایبٹ آباد میں منعقدہ اجلاس میں ایم آرڈی کی قیادت نے فیصلہ کیا کہ اگر انتخابات ۱۹۷۳ء کے آئین اور ۱۹۷۷ء کے انتخابی قواعد کے تحت کرائے جائیں گے تو ایم آرڈی بلا تاخیر اس میں حصہ لے گی۔ حکومت کو چاہیے کہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے لیے ماحول پیدا کرے (۱۰۹)۔ ایم آرڈی کے ممتاز رہنما ملک محمد قاسم نے کہا کہ حکومت کی طرف سے اعلان کردہ غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لینے والی اپنی پارٹیوں (جو ایم آرڈی میں شامل ہیں) سے خود بخود خارج ہوجائیں گے (۱۱۰)۔

جبکہ پروفیسر شاہ فرید الحق نے اگرچہ کالعدم جمعیت ایم آرڈی کے (بعض) تازہ فیصلوں سے اتفاق نہیں کرتی تاہم جمعیت (حسب سابق) اس مؤقف پر قائم ہے کہ اگر ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرائے جائیں تو ان میں حصہ لیا جاسکتا ہے (لیکن المیہ یہ ہے کہ)...... سیاسی جماعتوں کے عہدیدار انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں لیکن پھر بھی کہا جارہا ہے کہ یہ غیر جماعتی انتخابات ہیں۔ جس حکومت کو سیاسی افراد کی نامزدگی پر اعتراض نہیں تو اسی جماعتی بنیادوں (پر انتخابات کے انعقاد پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے) اور ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت انتخابات کا اعلان کردینا چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان میں حصہ لے سکیں۔ (۱۱۱)

(اگر حکومت غیر جماعتی انتخابات کے انعقاد پر ہی مصر ہے تو) جمعیت انتخاب میں

حصہ نہیں لے گی۔ (لہٰذا جمعیت کے پلیٹ فارم سے) نامزدگی کے فارم داخل کرنے والے کارکنوں کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی (۱۱۲)۔☆

(تاہم یہ طے ہے کہ) جمعیت علمائے پاکستان (دیگر کسی جماعت کے) کسی امیدوار کی مخالفت کرے گی نہ حمایت۔ (اس سے پہلے بھی پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی پر) مفتی ظفر نعمانی، علامہ ازہری، حاجی محمد حنیف طیب اور شاہ تراب الحق کو جے یو پی سے خارج کیا جا چکا ہے۔ (۱۱۳)

۲۵ فروری ۱۹۸۵ء کو ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ صدر جنرل ضیاء الحق کی نگرانی میں غیر جماعتی بنیادوں پر قومی اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے جبکہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات ۲۸ فروری ۱۹۸۵ء کو ہوئے۔ مولانا شاہ احمد نورانی کو انتخابات کے انعقاد سے قبل ہی نظر بند کر دیا گیا تھا کہ وہ رائے عامہ کو مارشل لاء حکومت کے خلاف مشتعل نہ کر سکیں۔ وہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۵ء تک نظر بند رہے۔ (۱۱۴)

مولانا نورانی نے اپنی رہائی کے بعد حکومت کی سابقہ کارکردگی پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ ۸ سال میں جن ایجنسیوں اور اداروں نے عوام پر مظالم کیے ہیں ان کی تحقیقات کے لیے سپریم کورٹ کے ججوں پر مشتمل کمیشن قائم کیا جائے جو مجرموں کے لیے قرار واقعی سزائیں تجویز کرے...... تیسری دنیا کے ملک ارجنٹائن میں مارشل لاء کے گیارہ سالہ دور کی تحقیقات ہو رہی ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ آئندہ والی نسلیں اطمینان کا سانس لے سکیں...... اسلام کی حکومت کا پہلا اصول عدل اور احتساب ہے۔ پاکستان میں جب تک عدل قائم نہیں ہوگا ملکی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی...... موجودہ حکومت نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ آئندہ صدر کسی عوامی نمائندے کے بجائے بیوروکریسی کا کوئی فرد ہوگا۔☆☆

☆ جمعیت کے حالیہ فیصلوں سے مولانا شاہ احمد نورانی کو بھی آگاہ کر دیا گیا، جو، ان دنوں ایمسٹرڈیم (ہالینڈ) میں تبلیغی دورہ کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ (۲۱ جنوری ۱۹۸۵ء جنگ کراچی)

☆☆ مولانا شاہ احمد نورانی کی یہ پیش گوئی بعد ازاں سچ ثابت ہوئی۔ اگرچہ ذرا مختلف حالات میں بیوروکریسی ہی کے ایک نمائندہ غلام اسحاق خان صدر پاکستان، سانحۂ بہاول پور کے بعد نامزد ہوئے، جو ان دنوں چیئرمین سینٹ تھے۔ غلام اسحاق خان نے بعد ازاں دو جمہوری حکومتوں کو اپنی ذاتی پرخاش کی وجہ سے رخصت کیا۔ اگر ضیاء فضائی حادثے میں جان بحق نہ بھی ہوتے تو آئندہ سیاسی منظر نامے میں غلام اسحٰق خان ہی صدر بنائے جاتے۔

دستور میں ایسی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں کہ وزیر اعظم بے بس ہو کر رہ گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وزیر اعظم جونیجو اس صورتحال سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ ہم تو فی الحال یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ پارلیمنٹ کے اراکین کا کردار کیا ہوتا ہے۔ ان اراکین نے موجودہ حکومت کی شرائط پر انتخاب لڑا ہے اور یہ بات طے ہے کہ اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل نہیں کیا جائے گا۔ پوری پارلیمنٹ ایک فرد واحد کے رحم و کرم پر ہے...... مجھے اپنی نظر بندی ختم کیے جانے پر قطعی مسرت نہیں ہوئی کیونکہ اب بھی ہزاروں سیاسی کارکن اور رہنما جیلوں اور عقوبت خانوں میں بند ہیں...... انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ درست تھا کیونکہ حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ حکومت اور بیوروکریسی کا اتحاد منتخب نمائندوں کی راہ میں بھرپور طریق سے حائل ہے۔ (۱۱۵)

مولانا شاہ احمد نورانی کے بقول:

> پاکستان میں اسلام آج جتنا بدنام اور رسوا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ اسلام کا محض نام استعمال کیا جا رہا ہے۔ آج اسلام، اسلام آباد کے دربار میں ہاتھ باندھے کھڑا ہے...... یہ اسلام کا کیسا نفاذ ہے کہ اس ملک میں منشیات خوفناک حد تک فروغ پا رہی ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ سیاستدان ناکام ہوئے ہیں۔ اگر سیاستدان ناکام ہوئے ہوتے تو عوام انہیں بھول چکے ہوتے۔ پاکستان کی ۳۷ سالہ تاریخ میں سیاستدان صرف ۸ سال کی مختصر مدت میں برسر اقتدار رہے جبکہ بقیہ عرصہ فوج اور بیوروکریسی قابض رہی۔ اسلام میں اقتدار کی خواہش اور اس کی جدوجہد کرنا حرام ہیں لیکن کسی مدمقابل کے بغیر طاقت کے بل بوتے پر خود کو مسند اقتدار پر مسلط کرنا حرام ہے۔ اسلام اور مارشل لاء ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اسلام میں مارشل لاء کا کوئی تصور نہیں۔ اسلام میں ہنگامی حالات کے دوران بنیادی حقوق سلب نہیں کیا جا سکتے۔ موجودہ آئین ملک کا آٹھواں دستور ہے جس کا مقصد مارشل لاء کو تسلسل دیتا ہے۔ ۱۹۷۳ء کا آئین ختم ہو چکا ہے کیونکہ ۲۸۰ دفعات کی اس مختصر دستاویز میں فرد واحد نے ۶۱ ترامیم کی ہیں۔ جن میں ایک

بھی ترمیم اسلام کے نفاذ کے لیے نہیں کی گئی...... جنرل ضیاء نے اسمبلی کے اراکین کی اہلیت، دیانت اور صداقت بتائی تھی لیکن ان انتخابات میں (انہی) منتخب ہونے والے ارکان نے لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کیے ہیں جن کا اعتراف خود صدر نے بھی پارلیمنٹ میں کیا ہے اور کہا کہ ایسے ارکان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جنہوں نے قانونی حدود کے دائرے میں اخراجات کیے ہیں۔ (انہوں نے تجویز پیش کی کہ) ملک کے سربراہ اور وزراء سمیت تمام ارکان اسمبلی اپنی اثاثے ظاہر کریں اور ہر سال اپنے اثاثوں کا گوشوارہ پیش کریں تاکہ یہ معلوم ہو کہ لاکھوں روپے خرچ کر کے اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنے والے ارکان نے انتخاب کو کمائی کا ذریعہ تو نہیں بنایا۔ اراکین اسمبلی کے احتساب کے لیے پارلیمانی احتسابی کمیٹی تشکیل دی جائے جس طرح بھارت، امریکہ اور دوسرے جمہوری ممالک میں ہوتی ہے...... تیزی سے روبہ تنزل معیشت کا طوق سول حکومت کے گلے میں ڈال دیا گیا ہے...... نئے منتخب اراکین اسمبلی سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں اصل جھگڑا مارشل لاء سے ہے...... خارجہ پالیسی...... کا مقصد صرف امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنا اور اس کے مفادات کا تحفظ کرنا ہے...... اگر تین لاکھ افغان مہاجرین کو اسلام کے نام پر پاکستان میں پناہ دی جاسکتی ہے تو تین لاکھ بہاریوں کو اسلام کے نام پر پاکستان کیوں نہیں لایا جاسکتا۔ افغانی مہاجرین پر ۳۶۵ کروڑ روپے سالانہ قومی خزانے سے خرچ کیے جارہے ہیں جبکہ تین لاکھ بہاریوں کے لیے چندہ جمع ہونے کا انتظار کیا جارہا ہے...... ہم دن رات اسلام کا اتنا نام لیتے ہیں لیکن جب یاسر عرفات اور اس کے چالیس ہزار ساتھیوں کو بیروت سے نکالا جارہا تھا اور انہیں کہیں جائے پناہ نہیں مل رہی تھی۔ پاکستان نے اسلام کے نام پر ان کی کیا امداد کی......؟ ۱۹۴۸ء میں کشمیر کے جہاد کو حرام قرار دینے والے آج افغانستان میں آزادی کی جنگ کو محض اس

لیے جہاد قرار دے رہے ہیں کہ اس کے لیے سی آئی اے نے ساڑھے ۵۶ کروڑ ڈالر امداد دی ہے۔ افغانیوں کی جدوجہد جہاد قرار دینے والے فلسطینیوں کی جدوجہد کو جہاد قرار کیوں نہیں دیتے...... ہماری خارجہ پالیسی ناکام اور رسوا ہوگئی ہے۔ گذشتہ آٹھ سالہ دور کے احتساب کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ ججوں پر مشتمل ہو تاکہ سب سے انصاف ہو سکے (۱۱۶)۔

انہوں نے کہا کہ آئین میں فوج کا کردار طے کردیا گیا ہے جس کے تحت وہ ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی نگہبانی کرے گی اور سیاستدان نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کریں گے۔ لیکن آج صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے...... عوام کو سڑکوں پر لانے کی ضرورت نہیں کیونکہ حکومت خود ہی ایسے حالات پیدا کردے گی کہ عوام کی دلی خواہش پوری ہو جائے گی (۱۱۷)۔☆

انہوں نے اندرون سندھ، اعتماد اور یگانگت پیدا کرنے کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب ہم سندھ یونٹی بورڈ کا وفد لے کر ہالہ پہنچے تو لوگ ہار لیے کھڑے تھے اور سندھ مہاجر بھائی بھائی کے نعرے لگ رہے تھے۔ مزید برآں انہوں نے حکومت پر زور دیا کہ صوبہ سندھ میں مقامی اور غیر مقامی کی تفریق ختم کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں ورنہ سندھ میں کوئی امن سے نہیں رہے گا۔☆☆ (۱۱۸)

ان دنوں غیر جماعتی انتخابات کے بائیکاٹ کی وجہ سے جمعیت علمائے پاکستان کی قیادت کو تنقید کا نشانہ بنایا جارہا تھا بالخصوص جب ملک میں ان انتخابات کا آئینی جواز تک ڈھونڈ لیا گیا تھا (۱۱۹)۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے اس حوالے سے نہایت واضح انداز میں کہا کہ آئین سازی اور آئین سوزی دو متضاد پہلو ہیں، ملک میں آئین کو مختلف ترامیم کی مدد سے چھلنی کر کے اس کی اصل روح کو مسخ کردیا گیا ہے۔ ان کے بقول "پاکستان اور دنیا کی مختلف

☆ وہ نیشنل تھنکر فورم کی طرف سے دیئے گئے عشائیے سے گفتگو کررہے تھے۔ (۴ اپریل ۱۹۸۵ء جنگ کراچی)

☆☆ مولانا شاہ احمد نورانی کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی جب ۱۹۸۸ء اور مابعد ایم کیو ایم ایک لسانی علاقائی جماعت کے طور پر سیاسی افق پر نمودار ہوئی جس کے بعد سندھ بالخصوص کراچی کے حالات بگڑتے چلے گئے۔

اقوام کی تاریخ میں دستور سازی ایک اہم اور کٹھن کام رہا ہے۔ دستور سازی مذاق بھی نہیں ہوتا۔ دستور سازی کے سلسلے میں ہر مجلس دستور باز اور اس کے زعما کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے مزاج کے مطابق نہیں بلکہ قومی مزاج کے مطابق دستور کی تشکیل کریں اور اس کے بعد یہ قوم پر چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے لیے طریق کار وضع کر دیتے ہیں (کہ آئندہ دستور کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے) ازاں طریقہ یہ ہے کہ جب چاہو، دوتہائی اکثریت سے اس میں ترمیم کرلو۔ یہی وہ طریقہ ہے جو ساری دنیا کے جمہوری ممالک میں رائج ہے۔ آج سے کوئی دو سو سال سے اوپر امریکہ کا آئین بنا (تاہم) یہ کوئی آسمانی صحیفہ تو نہیں تھا کہ اس میں ترامیم نہ ہوتیں لیکن دو سو سال کے طویل عرصے میں اس آئین میں ہونے والی ترمیم کی تعداد تیس سے زیادہ نہیں۔ اس طرح سے بھارت میں آئین ۱۹۴۹ء میں بنا اور نافذ ہوا۔ وہاں اب تک (یعنی ۱۹۸۵ء) تک آئینی ترامیم کی تعداد ۳۵ کے لگ بھگ ہے۔ اس صورت حال کو پیش نظر رکھ کر پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ دیکھیں تو اس میں دستور سازی کے ساتھ ساتھ دستور سازی اور دستور کشی عام نظر آتی ہے (بلکہ) یہ ایک مشغلہ بن گیا ہے۔ ہر برسر اقتدار شخص قومی خواہش کے بجائے اپنی ذاتی خواہش کے مطابق آئین کو اپنے وجود پر ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ کشمکش ہے جو جاری ہے۔ [میں (مولانا نورانی) یہ سمجھتا ہوں اور برملا کہتا ہوں کہ] ۱۹۸۵ء کا (عبوری) آئین ایک نیا آئین ہے اسے (۱۹۷۳ء کا) ترمیم شدہ (آئین) نہیں سمجھتا، اس میں کچھ اُدھر سے لیا گیا، کچھ اِدھر سے لیا گیا ہے۔ کچھ پارلیمانی لیا، کچھ صدارتی لیا (جبکہ) کچھ فرانسیسی اور انہوں نے (جنرل ضیاء الحق) نے ایک نیا ملغوبہ تیار کر کے دے دیا ہے۔ (باالفاظ دیگر) یہ فرانسیسی آئین کا نیا چربہ ہے کیونکہ ریفرنڈم بہرحال ڈیگال کا دستور ہے☆(۱۲۰)۔ جہاں پارلیمنٹ اور وزیراعظم ہو وہاں ریفرنڈم نہیں ہوتا اس لیے کہ وہاں ریفرنڈم کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی...... یہ (۱۹۸۵ء کا عبوری آئینی حکم نورانی میاں کے خیال میں) ملک کا آٹھواں دستور ہے...... (اگر ہم) پاکستان کی پوری تاریخ دیکھیں تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ (جس کی تفصیل کچھ یوں ہوسکتی ہے کہ) پرنسپل (بنیادی اصولوں کی) کمیٹی کی رپورٹ بھی دستور کا ہی ایک حصہ تھی وہ تیار ہوئی (غلام محمد کے زمانہ میں)۔ (بعدازاں) اس کا جھٹکا کیا گیا پھر اس کے بعد ۱۹۵۶ء کا دستور آیا اس کا کیا حشر ہوا؟ ۱۹۶۲ء کا شخصی آئین ختم کرنے کے بعد جنرل یحیٰ آئے۔ انہوں نے جسٹس کارنیلیکس سے (آئندہ ممکنہ) آئین تیار

کرایا۔ جس کے ساتھ لیگل فریم ورک آرڈر (L.F.O) منسلک تھا۔ اس کے تحت الیکشن ہوا، ملک ٹوٹا۔ اس کے بعد بھٹو نے آتے ہی شروع میں جو آئین دیا صدارتی تھا۔ بعد میں پارلیمنٹ کے ۲۵ ارکان پر مشتمل کمیٹی بنی۔ اس نے ۱۹۷۳ء کا دستور دیا (جواب ۱۹۸۵ء میں ختم ہوا) اب یہ ۱۹۸۵ء کا دستور آیا ہے۔ اس طرح پاکستان میں آئین کی تاریخ دستور سازی کے جتنے مراحل سے گزری ہے اس میں دستور کشی اور دستور سوزی کے بڑے ہی درد ناک اور عبرتناک واقعات آئے ہیں مگر عبرت کسی نے نہیں پکڑی۔ (۱۲۱)

جہاں تک انتخابات کے بائیکاٹ کا تعلق تھا مولانا شاہ احمد نورانی نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل موقف اختیار کیا:

> بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو اگر جدوجہد کرنی تھی تو اب جبکہ موقع مل رہا تھا تو قومی اسمبلی کے اندر جا کر جدوجہد کرنی چاہیے تھی کیونکہ ملک کی ایک معروف پارلیمانی اور مذہبی دینی جماعت ہونے کی وجہ سے جمعیت علمائے پاکستان ۱۹۷۰ء کی قومی اسمبلی میں بھی تھے، اس کی نمائندگی سینٹ میں بھی تھی۔ اس کے نمائندے ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں بھی تھے۔ اس لیے اب بھی یہی ہونا چاہیے تھا۔ اس معاملے میں اصول کی بات یہ ہے کہ جہاں تک انتخابات بڑنے کا تعلق ہے ہر سیاسی جماعت کا مقصد انتخابات لڑنا ہوتا ہے۔ کوئی سیاسی جماعت انتخابات سے انکار نہیں کرسکتی کیونکہ وہ تو قائم ہی اسی لیے ہوتی ہے (وہ) کوئی گوشہ نشین قسم کے لوگوں کی خالصتاً مذہبی جماعت ہوتی ہے۔ جس کا کام مؤدبانہ طور پر مطالبات پیش کرنا ہوتا ہے تو وہ سیاست میں آتی (ہی) نہیں۔ سیاست میں آنے کا مقصد حصول اقتدار ہوتا ہے تاکہ سیاسی جماعت اپنے منشور کو عملی جامہ پہنا سکے۔ (ہمارا بھی یہی مقصد ہے کہ انتخابات میں حصہ لیا جائے اور جیتا جائے)...... (یہ ایک الگ سوال ہے کہ) ایم آر ڈی اور جمعیت الگ کیوں ہوئے۔ (اس کا جواب یہ ہے کہ) جمعیت ایک علیحدہ تنظیم ہے۔ وہ پاکستان قومی اتحاد میں شامل رہے ہیں اور اس سے پہلے بھی بہت سے اتحادوں میں شامل

ہے ہیں۔ (ہم نے) یونائیٹڈ اپوزیشن پارلیمنٹری پارٹی تشکیل دی اس
کے بعد یو ڈی ایف (متحدہ جمہوری محاذ) کے نام سے مشترکہ جدوجہد
کی۔ (اس کے بعد ہم نے) پی این اے میں شامل ہو کر جدوجہد کی
لیکن اس کے بعد ہم ایم آر ڈی میں شامل نہیں ہوئے۔ جہاں تک ایم
آر ڈی کے جمہوری موقف کا تعلق ہے ہماری اخلاقی ہمدردیاں ہمیشہ
اس کے ساتھ رہیں۔ (لہٰذا) ہمارا موقف اور ایم آر ڈی کے موقف
میں کوئی تضاد نہیں۔ ایم آر ڈی نے انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ
دسمبر ۱۹۸۴ء میں کیا لیکن ہم نے انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ
اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ہی کر لیا تھا اور اس کا (باقاعدہ) اعلان (بھی)
کر دیا تھا۔ (اب سوال یہ ہے کہ) ہم ایم آر ڈی میں شامل کیوں نہیں
ہوئے اور باہر رہ کر بھی اس کے ساتھ کیوں ہیں؟ (بہت سی چیزیں
ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق ان کے بقول ہم اس وقت کچھ نہیں کہہ
سکتے۔ جن کے بارے میں (انشاء اللہ) آئندہ وقت آنے پر کہیں
گے۔) ایم آر ڈی کی اپنی پالیسی ہے انہیں اپنے طور پر فیصلے کرنے تھے
یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ ہم ان میں شامل ہوں یا وہ ہم (جمعیت
علمائے پاکستان) میں شامل ہوں اور اس کے بعد مشترکہ جدوجہد کی
جائے۔ ویسے بھی جدوجہد برابر چل رہی ہے۔ ہم نے اس جدوجہد پر
ان سے کبھی کوئی اختلاف کیا نہ انہوں نے ہم سے کوئی اختلاف کیا۔
ہم نے ایم آر ڈی سے باہر رہ کر جو فیصلے کیے ہیں۔ ان سے ایم آر ڈی
کی جدوجہد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے اور نہ ہی ان کے کسی فیصلے سے
ہماری جدوجہد کمزور ہوئی ہے۔ (جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ
انتخابات میں حصہ کیوں نہیں لیا۔ بات یہ ہے کہ) انتخابات میں حصہ
لینے کا مطلب یہ ہوتا کہ جنرل صاحب کی شرط پر انتخابات میں حصہ لیا
جائے...... (حالانکہ جب) ۱۹۷۷ء کے انتخابات ہونے والے
تھے...... (تو ان) میں ہم نے قومی اتحاد کی جماعتوں کے ساتھ مل کر

حصہ لینے کا باقاعدہ اعلان کیا تھا اس کے بعد جنرل صاحب نے
۱۹۷۹ء میں انتخابات کا اعلان کیا گیا وہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت
کرائے جانے تھے لیکن...... (جبکہ) ۱۹۸۵ء کے انتخابات پی سی او
(عبوری آئینی حکم (Provinsional Constitutional
Order) کے تحت ہو رہے تھے۔ پس ان انتخابات میں حصہ لے کر
فرد واحد کے آئین پر دستخط کرنا پڑتے جو ہمیں منظور نہیں۔ (۱۲۲)

مارشل لاء حکومت سے تعاون کے سلسلہ میں مولانا شاہ احمد نورانی کا موقف کچھ
یوں تھا:

> جہاں تک سیاستدانوں کے مارشل لاء سے تعاون کا تعلق ہے تو اس
> میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کی پوری تاریخ اور خصوصاً حالیہ آٹھ
> برسوں میں بعض سیاسی جماعتوں نے جن میں جماعت اسلامی پیش
> پیش رہی ہے۔ مارشل لاء حکومت سے بھرپور تعاون کر کے مارشل لاء کو
> طوالت دلائی اور ملک کو نقصان پہنچایا۔ عہدوں اور وزارتوں کے لالچ
> میں مارشل لاء حکمران کے پاس گئے لیکن خدا کا شکر ہے کہ نہ ہم ان
> کے پاس گئے نہ جھکے نہ بکے۔ مارشل لاء انتظامیہ پر ہی کیا منحصر ہے کہ
> غیر آئینی اور غیر دستوری حکومت کو ہمیشہ ایسے لوگ ملتے رہے جو
> برسر اقتدار شخصیتوں کے ہاتھوں بکتے رہے ہیں...... سیاسی جماعتوں
> کے آپس کے اختلاف بھی مارشل لاء کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ بعض
> سیاسی جماعتیں سمجھتی ہیں کہ وہ مارشل لاء انتظامیہ سے تعاون کر کے
> برسر اقتدار لوگوں کو الیکشن کرانے پر آمادہ کر سکتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ
> پاکستان قومی اتحاد ٹوٹا اور یہیں سے اختلافات شروع ہوئے۔ جنرل
> ضیاء کی تحریری دعوت پر جن لوگوں نے وزارتیں اور مشاورت
> (شوریٰ) کے عہدے قبول کیے وہ مارشل لاء کو طول دینے کے ذمہ
> دار ہیں۔ (۱۲۳)

جب مولانا نورانی سے پوچھا گیا کہ کیا اس ساری بحث کا لب لباب یہ ہے کہ

سیاستدان ناکام ہوگئے ہیں تو انہوں نے کہا:

> اگر سیاستدان ناکام ہوئے ہیں تو مارشل لاء حکومتیں ان سے زیادہ ناکام ہوئی ہیں۔ سیاستدان کی حکومت کا وقت بہت کم ہے۔ وہ آٹھ سے دس سال اقتدار میں رہے۔ فوج کے اقتدار کی مدت بہت زیادہ ہے۔۱۹۵۳ء میں غلام احمد، سکندر مرزا اور جنرل ایوب کے گٹھ جوڑ سے فوج اور بیوروکریسی کے اقتدار کا چکر چلا جو آج تک جاری ہے۔ سیاستدانوں کی حکومت تو صرف ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک رہی پھر بھٹو کے زمانے میں صرف چار سال ہی رہ سکی۔ (۱۹۸۵ء تک) ۲۷ سال فوج اور بیوروکریسی ملک پر قابض رہی ہے۔ انہوں نے ملک کو گنوایا ہی ہے دلایا کچھ نہیں۔ اب (گذشتہ) آٹھ برس میں ملک کی معیشت تباہ کر کے رکھ دی گئی ہے۔ ملک اس وقت ساڑھے چودہ کروڑ بلین ڈالر کا مقروض ہے۔ بھٹو صاحب اور پاکستان پیپلز پارٹی نے جب ملک کا اقتدار چھوڑا تو ملک پر صرف ساڑھے چار بلین ڈالر کا قرض تھا(اس سے مارشل لاء حکومت کی کارکردگی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔) یہ سوال سینٹ میں اٹھایا اور یہ ریکارڈ پر ہے کہ ذرا ۱۴ بلین امریکی ڈالر کی موجودہ سرکاری اور غیر سرکاری شرح سے روپے میں حساب تو لگایئے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء کے بعد سے اب (۱۹۸۵ء) تک ۱۴ بلین!! ملکی معیشت کا تو یہ حال ہے کہ امریکہ کے اشارے کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کے بغیر گاڑی نہیں چلتی اور جہاں تک تجارتی خسارہ کا تعلق ہے تو اس کی ہوش ربا کیفیت کا اندازہ تو تجارتی طبقہ کو بخوبی ہے۔ آج ۵۵ ارب روپے کا تجارتی خسارہ ہے جس سے ہم دوچار ہیں۔ Home Remittences۔ کا یہ حال ہے کہ گھٹ کر آدھی سے بھی کم رہ گئی ہیں اور تیزی سے گرتی جارہی ہے۔ اس سلسلہ میں کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ اب جبکہ فوج اور بیوروکریسی ناکام ہوئی ہے تو معیشت تباہ ہوئی ہے۔ (جو مارشل لاء

> حکومت کی ناکامی پر دلالت کرتی ہے نہ کہ سیاستدانوں کی ناکامی پر) جس کا طوق (جونیجو کی) سویلین حکومت کے گلے میں ڈال دیا گیا ہے۔ (اب یہ کسی کا کہنا کہ) آٹھ سال کے اندر فوج نے کوئی بڑا شاندار کارنامہ سرانجام دیا ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ اعداد وشمار موجود ہیں ان کو چیلنج کر کے ثابت کر دیں کہ ہم غلط کہہ رہے ہیں۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو لاکھوں کروڑوں خرچ کر کے اسمبلیوں میں پہنچے ہیں۔ ان کا کوئی سیاسی مقصد نہیں۔ یہ لوگ کیا چھوڑیں گے۔ یہ لگا ہوا سرمایہ واپس نہیں نکالیں گے (یقیناً) ایک کے دس بنائیں گے۔ اس کا اندازہ ایک بچہ بھی لگا سکتا ہے۔ (۱۲۴)

۲۴ مئی ۱۹۸۵ء کو مارشل لاء اٹھانے کے لیے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا(۱۲۵)۔ اسی دن قومی اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی گئی(۱۲۶)۔ چوہدری ممتاز احمد تارڑ، خان سیف اللہ خان اور مولانا گوہر رحمان کی تحریک استحقاق کو باضابطہ قرار دیتے ہوئے اسپیکر جناب فخر امام نے کہا کہ مارشل لاء ایوان کے استحقاق کے منافی ہے(۱۲۷)۔

بالفاظ دیگر جمہوری اداروں کو شدت سے اس کا احساس تھا کہ مارشل لاء اور جمہوریت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ کیونکہ اس مقولے میں بہرحال کچھ نہ کچھ صداقت ضرور پوشیدہ ہے کہ بدترین جمہوریت، بہرحال ایک بہترین مارشل لاء سے بدرجہ بہتر ہوتی ہے کیونکہ مارشل لاء کی بنیاد، ووٹ کے استحقاق کے برعکس جبراً اقتدار ہتھیانے پر رکھی گئی ہوتی ہے۔ سیاستدانوں کی غلطیوں کو سیاسی اور جمہوری عمل کی ناکامی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ایک بری جمہوریت کا علاج مزید جمہوریت ہے نہ کہ جمہوری عمل میں تعطل یا جمہوری اور سیاسی عمل میں مارشلائی رکاوٹیں۔ اس صورتحال پر مولانا شاہ احمد نورانی کا مندرجہ ذیل تبصرہ صورتحال کا بہترین عکاس تھا:

> ہندوستان میں تسلسل سے سیاسی جماعتیں برسراقتدار ہیں۔ ان میں انڈین کانگرس، جنتا پارٹی، لوک دل اور بعض علاقوں میں علاقائی جماعتیں بھی اقتدار میں رہیں۔ مدراس میں تامل ناڈو، آندھرا پردیش میں الگ جماعت کی حکومت رہی...... وہاں پاکستان سے بدتر حالات

پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ تامل ناڈو کے صوبے کے قیام کی جدوجہد، مہاراشٹر اور گجرات کی علیحدگی کی جدوجہد، پھر پنجاب میں خالصتان کی جدوجہد۔ یعنی بے شمار مسائل نے وہاں جنم لیا۔ سیاسی تحریکیں، بھوک ہڑتالیں، توڑ پھوڑ، مختلف فسادات میں ہزاروں افراد بھی مارے جاتے رہے لیکن انتخابات بھی وہاں بغیر کسی التواء کے ہوتے رہے۔ انتخابات میں بھی وہاں ہر بار تقریباً پانچ سو افراد مارے جاتے ہیں لیکن ہندوستان نے دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک کی حیثیت سے اپنے تشخص کو قائم رکھا...... پاکستان...... بھارت کے ساتھ ہی آزاد ہوا۔ ہمارے ہاں سیاسی اعتبار سے ہندوستان سے بدتر حالات کبھی نہیں ہوئے۔ سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں نے مختلف تحریکیں چلا کر جس طرح کے حالات بھارت میں پیدا کیے ایسے بدتر حالات پاکستان میں کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ جب بھارت میں تامل ناڈو اور مدراس کی تحریکیں چلیں تو وہاں کے اخبارات کے اعداد و شمار کے مطابق...... دس بارہ ہزار آدمی مارے گئے۔ اسی طرح بمبئی کو گجرات سے الگ کر کے مہاراشٹر میں شامل کرنے کی جب تحریک چلائی گئی تو اس میں بھی کئی ہزار آدمی مرے۔ پاکستان کے مقابلے میں شدید ترین تحریکیں وہاں چلیں لیکن سیاستدان ناکام ہوئے نہ سیاسی جماعتیں۔ عوام کے تعاون سے یہ سارے مسائل حل ہوتے رہے۔ پاکستان میں اصل مسئلہ سیاستدانوں کا نہیں، ان بعض مہم جو جرنیلوں کا ہے جن کو اقتدار کے بغیر تسکین نہیں ہوتی۔

جنرل ضیاء صاحب ہوں یا ان کے معاونین (بلکہ) مارشل لاء کے ذمہ دار جتنے افراد بھی ہیں ان کا مواخذہ ہونا چاہیے اور ان سیاسی جماعتوں کا بھی جنہوں نے مارشل لاء سے تعاون کیا...... بعض سیاسی جماعتیں ...... خاص طور پر جماعت اسلامی اور مسلم لیگ مارشل لاء کے استحکام کا باعث بنیں۔ جس وقت یہ جماعتیں مارشل لاء وزارتوں میں شامل

ہوئیں ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب مارشل لاء طول پکڑ جائے گا...... (جہاں تک جمعیت علمائے پاکستان کا مارشل لاء انتظامیہ سے تعاون کا سوال تھا) سب سے پہلے ہماری کوشش یہ تھی کہ کسی بھی صورت میں مارشل لاء سے تعاون نہ کیا جائے اور جس حد تک اپنی استطاعت ہے اس کے مطابق مارشل لاء کی مخالفت کی جائے۔ مارشل لاء (کے نفاذ) کے بعد کیونکہ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔ پھر سیاسی جماعتیں بھی کالعدم قرار دے دی گئیں۔ ہمارے دفاتر بھی سربمہر کر دیئے گئے۔ ان حالات میں ہم یہی کر سکتے تھے کہ کم از کم کوئی عہدہ مارشل لاء حکومت میں قبول نہ کیا جائے...... اس میں کوئی شک نہیں کہ ایم آر ڈی نے جمہوریت کی بحالی کے لیے اپنا کردار (اب تک) بھر پور طور پر ادا کیا ہے۔ بعض جماعتوں نے جو پہلے مارشل لاء کابینہ میں بھی شامل رہیں بعد میں جمہوریت کے لیے جدوجہد کر کے کفارہ بھی ادا کیا۔ یہ درست ہے کہ ہم کبھی ایم آر ڈی کے حلیف نہیں رہے لیکن کبھی حریف بھی نہیں بنے۔ ہم ایم آر ڈی میں شامل نہیں ہوئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس اتحاد میں بعض ایسی جماعتیں بھی شامل تھیں جو مارشل لاء سے بھرپور تعاون کرتی رہیں اور مارشل لاء کی ترجمان بنی رہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا طریق کار سے کلی اختلاف تھا۔ اس لیے ہم نے ایم آر ڈی میں شمولیت اختیار نہیں کی...... (فروری ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لینے کا مطلب مارشل لاء کا خاتمہ یا جمہوریت پسندی نہیں۔)...... غیر جماعتی انتخابات میں کچھ سیاستدانوں کے علاوہ دو جماعتوں نے بھی حصہ لیا۔ باقی تمام قابل ذکر سیاسی جماعتوں نے ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ جو جماعتیں انتخابات سے باہر رہ گئیں وہ باہر رہ گئیں لیکن جن دو جماعتوں نے انتخابات میں حصہ لیا۔ انہوں نے دراصل مارشل لاء کے ساتھ تعاون کیا۔ اس تعاون کی بدترین شکل یہ تھی کہ ان جماعتوں نے نیشنل اسمبلی کے ارکان کو اس

بات کے لیے ہموار کیا کہ مارشل لاء کے گزشتہ سات آٹھ سالہ دور میں ہونے والے تمام اقدامات کی توثیق کردی جائے۔ وہ گندگی اور غلاظت کے ڈھیر جو مارشل لاء کے مختلف اقدامات کا نتیجہ تھے ان سب کی پردہ داری کردی گئی۔ (یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ)...... جنرل ایوب خان اور جنرل یحییٰ خان کے دور کے اقدامات کی بھی تو ۱۹۷۳ء کے دستور میں توثیق کی گئی تھی لیکن وہ جنرل ضیاء کے اقدامات سے بہت مختلف تھے۔...... یحییٰ خاں کا زمانہ اتنا طویل نہیں تھا (مزید براں) ...... ان کے اقدامات زیادہ تر زرعی اصلاحات اور بدعنوان افسروں کی برطرفی وغیرہ پر مبنی تھے۔ بعض (ضیاء کے) مارشل لاء دور میں ظلم اور بدعنوانیوں کے بازار لگا دیے گئے...... مارشل لاء عدالتوں کے ذریعے ہزاروں افراد کو سزائیں دی گئیں۔ جبر و تشدد قدم قدم پر روا رکھا گیا اور وہ تمام اقدامات جو مارشل لاء کے اس طویل دور میں مارشل لاء کے چھوٹے افسر سے لے کر کمانڈر انچیف تک نے کیے ان سب کو اسمبلی نے تحفظ دے دیا ہے۔ یعنی اس اسمبلی نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ مارشل لاء حکام آسمانی مخلوق تھے جن کے کسی اقدام کو کوئی باز پرس نہیں کی جاسکتی تو اس طرح موجودہ اسمبلی نے جمہوریت کی بحالی اور مارشل لاء کے خاتمے کے لیے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ (۱۲۸)

جب سرکاری میڈیا کے ذریعے جنرل ضیاء کے مختلف اقدامات کو اسلامائزیشن کا نام دیا جارہا تھا اور جنرل ضیاء الحق کی حمایت یافتہ سیاستدان ان کی تعریف میں دن رات ایک کیے ہوئے تھے تو مولانا نورانی نے ان کے عزائم کا پردہ یوں چاک کیا:

جنرل ضیاء صاحب نے اسلامی نظام کے حوالے سے جو بھی اقدامات کیے وہ بددلی سے کیے۔ اگر وہ خلوص دل سے یہ تمام اقدامات کرتے تو یقیناً ہر شعبۂ زندگی کی طرف سے انہیں سراہا جاتا۔ ابتداء میں بعض تقاریر سن کر لوگوں نے جنرل ضیاء کی پر جوش حمایت کی۔ غالباً اس کی

وجہ یہی تھی کہ وہ اسلام کا نام لیتے تھے اور خود کو ایک مرد مومن کے طور پر پیش کرتے تھے۔ اس سے لوگوں کو یہ امید بندھی کہ اب اسلام اس ملک میں آجائے گا۔ لیکن جنرل ضیاء نے ان لوگوں کو بھی مایوس کیا اور وہ لوگ جو اسلام کی نسبت سے ان کے ساتھ محبت کرنے لگے تھے مجموعی طور پر مایوس کیا اور وہ لوگ بھی جو مختلف "ازموں" سے مایوس ہوکر اسلام کی طرف دیکھنا چاہتے تھے کہ کس طرح یہ نافذ ہوتا ہے۔ کیا اس کے ثمرات ہوتے ہیں؟ وہ بھی مایوس ہوئے۔

......جنرل ضیاء نے کوئی بھی قدم اسلام کی سمت میں صحیح نہیں اٹھایا۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے ان کو بڑا مبارک، بڑا حسین اور انتہائی قبل رشک موقع عطا فرمایا تھا۔ وہ گذشتہ سات آٹھ سال بلا شرکت غیرے اس ملک کے حاکم رہے۔ وہ جو چاہتے کرسکتے تھے لیکن انہوں نے نہیں کیا۔ اب صورت یہ ہے کہ اسلام چونکہ عملی طور پر نافذ نہیں ہوا بلکہ لوگوں میں تعصبات ابھرے ہیں (اس لیے) اس دور میں علاقائی عصبیتوں نے پوری شدت سے سر اٹھایا۔ منافرت پیدا ہوئی، نسلی مسائل پیدا کیے گئے۔ اسلام کی غلط تاویلات کی گئیں تو لوگ اس صورتحال میں اسلام سے بدگمان ہونے لگے۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ شاید اسلام اس قابل نہیں کہ ان کے دکھوں کا مداوا بن سکے۔

جنرل ضیاء صاحب نے اسلام کی کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے الٹا اسے نقصان پہنچایا۔ جہاں تک جنرل ضیاء سے پہلے حکمرانوں کا تعلق ہے...... انہوں نے اس طمطراق سے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ ہم اسلام لائیں گے۔ جس طرح کے جنرل ضیاء نے اس عزم کا اظہار کیا تھا۔ لوگوں کو یہ توقع تھی کہ جنرل صاحب چونکہ وردی والے ہیں۔ اس لیے جو کچھ کہتے ہیں ضرور کریں گے۔ لیکن ضیاء صاحب نے اپنے اقدامات سے لوگوں کو مایوس کیا...... کوئی سوشلسٹ، کمیونسٹ، لادین شخص اسلام کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا جتنا جنرل ضیاء نے پہنچایا۔

> جماعت اسلامی کا اگر یہ خیال ہے کہ جنرل ضیاء صاحب نے اسلامی نظام کے قیام کے لیے مستحسن اقدامات کیے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اقدامات ہیں جو نفاذ اسلام کے سلسلے میں کیے گئے ہیں۔ کیا یہ کہ انہوں نے شرعی حدود کا نفاذ کیا۔ نو ماہ مارشل لاء حکومت میں شامل رہ کر جماعت اسلامی اپنا یہ کارنامہ گنوا سکتی ہے کہ ہم نے شرعی حدود کا نفاذ کروایا۔ مفتی محمود صاحب بھی یہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے حدود آرڈیننس نافذ کروایا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ گذشتہ سات آٹھ سال میں حدود کا یہ قانون کسی کے خلاف استعمال میں لایا گیا۔ کیا ان سالوں میں ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا جس پر حدود کا نفاذ ہوتا۔ پھر یہ کہ فقط حدود کا قانون نافذ کرنا ہی اسلام نہیں ہے۔ سزا کے نافذ ہونے سے اسلام نافذ نہیں ہوا۔ وہ اسباب جن کی وجہ سے جرائم جنم لیتے ہیں ان کی بیخ کنی کرنا بھی ضروری ہے۔
>
> جماعت اسلامی کے حکومت میں شامل ہونے کے بعد لوگوں کو بہت توقع تھی کہ یہ جماعت حکومت میں چلی گئی تو اب اسلام کے نفاذ کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔ پھر حکومت سے نکلے یا نکالے جانے کے بعد بھی جماعت اسلامی مسلسل حکومت کی حمایت کرتی رہی اور میاں طفیل محمد یہ کہتے رہے کہ بوڑھا مارشل لاء اگر رخصت کیا گیا تو جوان آجائے گا۔ تو اس لیے ان ہی کو رہنے دو...... (حالانکہ) جماعت اسلامی خود کو ایک منظم جماعت کہلواتی ہے اور یہ دعویٰ بھی کرتی ہے کہ ہم نے اسلام کے عملی نفاذ کے لیے سب ہوم ورک کر رکھا ہے۔ ایسی جماعت اگر حکومت میں شریک ہوئی ہے تو (لوگ یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ) اب لازماً وہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے کوئی قدم اٹھائے گی۔ لیکن جماعت اسلامی نے (اس کے بجائے) اسلام کو بتدریج نافذ کرنے کا ایک نسخہ جنرل صاحب کو دے دیا۔ اب (سات آٹھ سال تک) جنرل صاحب اس ''بتدریجی نسخے'' سے فائدہ اٹھاتے

> رہے۔ لوگوں کو بعد میں معلوم ہوا کہ جماعت اسلامی کے ہوم ورک کے دعوے غلط تھے۔ ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ویسے ہی واپس آ گئے۔ یہ لوگ نہ خود کر سکے نہ اپنے مربی جنرل ضیاء صاحب سے کچھ کروا سکے۔ لہٰذا جہاں ہم جنرل ضیاء صاحب کو اسلام کے عدم نفاذ کے سلسلے میں موردِ الزام ٹھہراتے ہیں وہاں ہم جماعت اسلامی کو بھی برابر کا شریک قرار دیتے ہیں۔ (۱۲۹)

مولانا شاہ احمد نورانی جو کہ گذشتہ پندرہ بیس سالوں سے عملی سیاست میں سرگرم عمل تھے اور اس عرصہ کے دوران ان کا حزب اختلاف کے رہنما کی حیثیت سے بالخصوص دو حکمرانوں ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء سے سابقہ رہا۔ لہٰذا مذکورہ دونوں حکمرانوں کے طرز فکر، طریق حکومت اور مختلف پالیسیوں اور اقدامات پر گہری نگاہ رہی۔ ان دونوں حکمرانوں کا تقابل جائزہ انہوں نے اس طرح لیا:

> بھٹو کا جہاں تک تعلق تھا وہ کسی قسم کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جنرل ضیاء مخالفت تو برداشت کرتے لیکن کرتے وہی جو ان کا اپنا فیصلہ ہوتا۔ وہ ایک میٹھی چھری (بلکہ) شوگر کوٹڈ زہر کی گولی تھے۔ بھٹو منتقم المزاج تھے اور برملا ان کے رویے کا علم ہو جاتا تھا۔ جنرل ضیاء بھی بڑے منتقم المزاج تھے لیکن وہ ٹھنڈی مار مارتے۔ جہاں مناسب سمجھتے انتقام بھی لیتے۔ لاہور کے شاہی قلعے میں جنرل ضیاء کے دور میں خواتین تک کو عقوبت خانوں میں رکھا گیا۔ اٹک میں انہوں نے بے شمار بے گناہوں کو سزائیں دی، ان پر تشدد کروایا۔ اسی طرح کراچی میں ماڑی پور روڈ پر رینجر کیمپ میں ایک ٹارچر سیل قائم کیا گیا۔ جس میں کئی نوجوان بہیمانہ تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گئے...... سندھ میں ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران چھ سات سو افراد مارے گئے۔ دیہاتوں پر ہیلی کاپٹروں کے ذریعے فائرنگ کروائی گئی یہ سب کچھ اس نرم خو، نرم مزاج انسان کے دور میں ہوا۔ بھٹو کے اقدامات کے اثرات دور دور تک محسوس ہوتے تھے لیکن جنرل ضیاء کا طریق کار ذرا مختلف

تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ظلم زیادہ کرتے تھے لیکن خاموشی کے ساتھ اور بڑے سکون کے ساتھ۔

بھٹو کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ جن اقدامات پر انہیں مجبور کر دیا گیا یا انہوں نے اپنی مرضی سے کیے وہ پھر محسوس ہوتے تھے کہ کیے گئے ہیں۔ مثلاً قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مسئلہ تھا۔ شروع شروع میں تو وہ قادیانیوں کا غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر تیار نہ تھے۔ کھلم کھلا کہتے تھے کہ میں نہیں کروں گا لیکن جب وہ اس کام کے لیے تیار ہو گئے اور بات ان کی سمجھ میں آگئی تو انہوں نے عملی طور پر جن اقدامات کی اس سلسلہ میں ضرورت تھی وہ کیے۔ بھٹو اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ جمعہ کی چھٹی ہو اس بات پر بھی تیار نہیں تھے کہ شراب بند ہو۔ لیکن مجبور ہو گئے یا کر دیئے گئے اور پھر انہوں نے یہ اقدامات کیے اور لوگوں نے محسوس کیا کہ ہاں واقعی یہ اقدامات کیے گئے ہیں۔ مثلاً جمعہ کی چھٹی ہوتی سب کو نظر آرہی تھی۔ ریس بند کی گئی تو واقعتاً بند ہو گئی۔ لیکن ضیاء صاحب کے زمانے میں ریس دوبارہ جاری ہو گئی۔ بھٹو سوشلسٹ تھے، انہوں نے ریس بند کی، جو اسلام کا نام لیتا ہے اس نے کھول دی۔ (بلکہ) اخباری رپورٹ کے مطابق گذشتہ آٹھ سال کے عرصہ میں ماضی کے قابلے میں زیادہ شراب کشید کی گئی ☆۔ بھٹو دور میں جب شراب پر پابندی لگی تو کراچی میں جہاں اس کے قریب دکانیں تھیں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر شراب یوں غائب ہوئی کہ محسوس ہوتا تھا شاید زمین نگل گئی ہے۔ جنرل صاحب کے دور میں منشیات کے جگہ جگہ اڈے کھلے ہوئے ہیں۔ شراب سے بھی زیادہ بدتر ہیروئن تو متعارف ہی اس دور میں ہوئی (اس بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ) بھٹو صاحب کا دور بلاشبہ خراب تھا لیکن جنرل ضیاء کا دور خراب تر ہے (۱۳۰)۔

اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ مولانا شاہ احمد نورانی نے ظاہر کیا تھا۔ ۱۱۶ کتوبر ۱۹۸۵ء

☆ اس پر اسمبلی میں بھی خاص لے دے ہوئی۔

کو قومی اسمبلی نے آئین میں آٹھویں ترمیم ☆ کا بل منظور کر لیا (۱۳۱)۔ اس ترمیم کے ذریعے جہاں جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کو تحفظ مل گیا وہیں اس کی شق ۵۸۔۲ (ب) کے تحت صدر مملکت کو یہ اختیار بھی مل گیا کہ وہ جب مناسب سمجھیں اسمبلی کو توڑ سکتے ہیں (۱۳۲)۔ اس اقدام سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جونیجو حکومت میں منتخبہ اسمبلیوں کی کی حکومت ربڑ اسٹمپ سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ بعد ازاں کہنے کو تو ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کو پاکستان کی تاریخ کا طویل ترین مارشل لاء (۱۹۸۵ء تک) اپنے اختتام کو پہنچا۔ لیکن ابھی تک جمہوری عمل کو مکمل آزادی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ ابھی تک جمہوری عمل انتقال اقتدار کے بجائے شراکت اقتدار کے بے رحم شکنجے میں جکڑا مصنوعی عمل تنفس کے ذریعے لے رہا تھا۔ جس کا والوں بہرحال، مارشل لاء کے استبدادی ہاتھوں میں تھا، جو جس وقت چاہتے، یہ مصنوعی سلسلہ تنفس معطل و مختل کر کے رکھ دیتے۔ (جو بعد ازاں ۲۹ مئی ۱۹۸۸ کو ضیاء الحق نے کیا بھی۔)

۱۳ دسمبر ۱۹۸۵ء کو وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے اپنے پانچ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا (۱۳۳) اور کہا کہ ہم اس پر عمل کر کے پاکستان کے بنیادی مقاصد کی تکمیل کر سکیں گے۔ اس پروگرام نے چار برسوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچنا تھا۔ نکات یہ تھے:

۱۔ پاکستان کی نظریاتی بنیادوں پر ایک مستحکم جمہوری سیاسی نظام کا قیام۔

۲۔ منصفانہ بنیادوں پر ایک ایسی اقتصادی نظام کا فروغ جس سے بے روزگاری دور ہو اور عوام کی خوشحالی کو یقینی بنایا جاسکے۔

۳۔ ملک میں ناخواندگی دور کر کے قوم کو جدید سائنسی دور کے لیے تیار کرنا۔

☆ اسمبلی توڑنے کے متعلق آئین میں درج آرٹیکل ۵۸ کا متن درج ذیل تھا:

58. **Dissolution of National Assembly.**

[58(2) Notwithstanding anything contained in clause(2) of Artice 48, the president may also dissolve the National Assembly in his discretion where, in his opinion,

(b) a situation has arisen in which the Government of the Federation cannot be carried on in accordance with the provisions of the Constitution and an appeal to the electroarate is necessary.]

۴۔ معاشرے سے بدعنوانی، رشوت اور ناانصافی ختم کر کے عوام کو احساس تحفظ اور سستا انصاف فراہم کرنا۔

۵۔ مضبوط قومی دفاع، اور ایک غیر جانبدار امتوازن خارجہ پالیسی کے ذریعہ ملکی وقار اور سالمیت کا استحکام۔ (۱۳۴)

لیکن محمد خان جونیجو اپنی سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے جس قسم کی آزادی چاہتے تھے وہ مارشل لاء حکم کی زیر گرانی ممکن نہ تھی۔ اس لیے ان کی راہ میں قدم قدم پر نظر نہ آنے والی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ کیونکہ ضیاء جونیجو کی صورت میں محض ایک کٹھ پتلی وزیر اعظم چاہتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق مارشل لاء لگانے کے بعد جب یہ فیصلہ کر چکے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو ایک قتل کے مقدمے میں تختہ دار پر لٹکا کر پی پی پی کے خاتمے کے لیے انہوں نے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں (۱۳۵)۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات کے نتائج کے بعد ضیاء الحق کو کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو پی پی پی مخالفت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی دسترس میں رہتے ہوئے کسی پیپلز پارٹی مخالف قوت کو ملک میں اتنا مضبوط کر سکے کہ پیپلز پارٹی دوبارہ برسر اقتدار نہ آسکے (۱۳۶)۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ان کی نظریں ضلع سانگھڑ (سندھ) کے ایک غیر معروف سیاستدان محمد خان جونیجو اگرچہ اس وقت مسلم لیگ کے عہدیدار تھے، پر ٹھہر گئیں۔ چنانچہ ضیاء الحق نے محمد خان جونیجو کو ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء کو وزارت عظمیٰ کے لیے نامزد کر دیا (۱۳۷)۔ انہوں نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھال کر ۱۵ اپریل ۱۹۸۵ء کو اپنی کابینہ تشکیل دی (۱۳۸) اور اس طرح ایک طویل عرصہ کے بعد میں منتخب حکومت نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں محمد خان جونیجو ضیاء الحق کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے فیصلہ کن اقدامات شروع کر دیے۔ ضیاء جونیجو چپقلش اس وقت منظر عام پر آئی جب وزیر اعظم جونیجو نے صاحبزادہ یعقوب خان کو وزارت خارجہ سے ہٹا کر زین نورانی کی تقرری کر دی (۱۳۹)۔ محمد خان جونیجو ایک ایسے سیاستدان تھے جو پر امن سیاست کے قائل تھے۔ صدر ضیاء الحق نے سندھ کے لوگوں کو ریلیف دینے اور پی پی پی کی بیخ کنی کے لیے پیر پگاڑا کے کہنے پر ان کو وزیر اعظم بنایا تا کہ سندھ سے پی پی پی کو ختم کر کے مسلم لیگ کو مضبوط کیا جاسکے (۱۴۰)۔ محمد خان جونیجو خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ وہ ذہنی طور پر قطعاً وزیر اعظم بننے کے لیے تیار نہ تھے (۱۴۱)۔ صدر ضیاء نے ایک سیدھے سادھے آدمی کو

وزیر اعظم نامزد کیا تھا لیکن اس کے تمام اندازے اس وقت غلط ہو گئے جب محمد خان جونیجو نے ۳۰ مئی ۱۹۸۵ء کو سرحد اسمبلی اور یکم جولائی ۱۹۸۵ء کو پنجاب اسمبلی میں مارشل لاء کے خلاف قرار داد منظور کرنے کو کہا (۱۴۲) اور یہ قرار دادیں منظور کر لی گئیں۔ اس سے پہلے محمد خان جونیجو کہہ چکے تھے کہ ''جمہوریت اور مارشل لاء ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔'' (۱۴۳)

اس کے علاوہ محمد خان جونیجو نے آئی ایس آئی، انٹیلی جنس، بیورو، ملٹری انٹیلی جنس اور دیگر فوجی معاملات میں براہ راست مداخلت کرنا شروع کر دی۔ صاحبزادہ یعقوب خان کی برطرف اور زین نورانی کی تقرری بھی صدر ضیاء کو ناگوار گزری (۱۴۴)۔

اسی لیے ضیاء الحق نے مسلم لیگ اور حکومتی مشینری میں ایسے اقدامات کیے جس سے محمد خان جونیجو تنہا رہ گئے (۱۴۵)۔ جب صدر ضیاء الحق کو یقین ہو گیا کہ وہ ایسے افراد کو ہموا بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ وہ جونیجو کے بغیر بھی حکومت چلا سکتے ہیں تو انہوں نے ۲۹ مئی ۱۹۸۸ کو قومی اسمبلی توڑ دی (۱۴۶)۔☆

صدر ضیاء الحق نے اپنے فرمان میں کہا ''چونکہ جن اغراض و مقاصد کے لیے قومی اسمبلی منتخب کی گئی تھی وہ پورے نہیں ہوئے چونکہ ملک میں امن و امان کی صورتحال تشویش ناک حد تک خراب ہو گئی ہے۔ جس میں بے شمار قیمتی جانوں اور مال کا نقصان ہوا ہے اور چونکہ پاکستان کے شہریوں کی جان و مال اور عزت مکمل طور پر غیر محفوظ ہو گئی تھی اور پاکستان کی یکجہتی اور نظریہ کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور چونکہ اخلاق عامہ اس حد تک گر چکا تھا کہ جس کی مثال نہیں ملتی اور حکومت پاکستان کے آئین کے مطابق نہیں چل سکتی تھی اور انتخابات ضروری ہو گئے۔ اس لیے میں جنرل محمد ضیاء الحق صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان، آئین کے آرٹیکل (۵۸) کے کلاز (۲) بی کے تحت حاصل کردہ اختیارات کے تحت فوری طور پر اسمبلی توڑتا ہوں۔ جس کے نتیجے میں کابینہ بھی ٹوٹ گئی ہے۔ یہ قدم ہمیں جمہوریت کی طرف لے جائے گا۔ تین سال (کے دوران) میں، میں نے بڑی گزارشات کیں پارلیمنٹ سے خطاب بھی کیا کہ قوم کو اسلام کی طرف لائیے۔ اب میں یہ اقدامات کروں گا اور کوشش کروں گا کہ آئندہ اچھے لوگ منتخب ہو کر آئیں۔'' (۱۴۷)

☆ جونیجو اسمبلی کی بحالی کے لیے عدالت تک بھی گئے لیکن ضیاء الحق کے فضائی حادثے میں جاں بحق ہونے کی وجہ سے عام انتخابات ۱۹۸۸ء کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے عدالت عظمیٰ نے ان کو بحال نہ کیا۔

چونکہ اس خطاب میں اسلامی نظام کے عدم نفاذ کو بہانے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اس لیے محض اشک شوئی کی خاطر ضیاء الحق نے ۱۵ جون ۱۹۸۸ء کو ملک میں شریعت آرڈی نینس نافذ کردیا (۱۴۸) لیکن یہ بھی ان کے دیگر اقدامات کی طرح محض اقدام برائے اقدام ہی تھا۔

حقیقت خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن جونیجو حکومت محض نام نہاد جمہوری حکومت تھی، جس کے ثمرات بہر طور عوام الناس تک نہ پہنچ سکے تھے۔ چونکہ اس کی بنیاد ہی بدنیتی پر رکھی گئی تھی، اس لیے اس نے یہ دن ضرور دیکھنا تھا۔ کہ جس شاطر نے یہ بساط بچھائی تھی، اپنے ہی مہروں کے ہاتھوں بالآخر اسے لپیٹنے پر مجبور ہوگیا۔ امر واقعہ بھی یہی تھا کہ محمد خان جونیجو کی حکومت میں کرپشن نے پوری حکومتی ڈھانچے کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جونیجو حکومت کے پہلے سال ہی رشوت، سفارش اور بدعنوانی کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بقول چوہدری ممتاز تارڑ "پہلے عدالتیں رشوت ستانی سے محفوظ تھیں اب عدالتیں بھی بکنے لگی ہیں۔(۱۴۹)

جبکہ معروف سیاستدان جاوید ہاشمی کا کہنا تھا کہ ان دنوں سیکریٹری سطح تک رشوت سے کام لیے جاتے تھے۔ ملک بھر میں مختلف محکموں میں بھرتی کے لیے لاکھوں روپوں کی رشوت دی جاتی۔ حتیٰ کہ کانسٹیبل کی بھرتی کے لیے پیسے دینے کی روایت ان کے دور میں پروان چڑھی۔ ان کے دور حکومت میں غدار جرنیلوں نے حصہ لیا۔ ایک جرنیل نے تو اپنی انتخابی مہم میں ۸۰ لاکھ روپے تک خرچ کیے۔ یہ پیسے کہاں سے آئے۔(۱۵۰)

سندھ کے ایک رکن اسمبلی نے الزام لگایا کہ جونیجو حکومت کے دوران پرائمری ٹیچر بھرتی ہونے کا ریٹ ۷ ہزار جبکہ انجینئر کا ۵۰ ہزار تھا۔ باقی نوکری کی پیداواری اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ریٹ مقرر کیا جاتا۔ انجینئروں کو تو یہاں تک کہا جاتا کہ آپ کے علاوہ میں فلاں پراجیکٹ پر کام ہورہا ہے اور اس کی لاگت ایک کروڑ روپیہ بنتی ہے۔ اس میں سے دس لاکھ روپیہ دیدو ورنہ چارج چھوڑ دو۔(۱۵۱)

جونیجو حکومت میں "تولیہ اسکینڈل" بہت مشہور ہوا۔ جس کے ضمن میں دو اعلیٰ افسران کو برطرف کردیا گیا اور ایک وفاقی وزیر شہزادہ محسن الدین مستعفی ہوگئے تھے۔(۱۵۲) کو اپریٹو سوسائٹی کے فنڈز میں بھی بڑی مقدار میں خرد برد کی گئی جس کی پاداش میں ایک وزیر چوہدری انور عزیز جس کا تعلق شکر گڑھ سے تھا، کو مستعفی ہونا پڑا۔(۱۵۳)

جونیجو حکومت پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے پنجاب کے ترقیاتی فنڈز سے لاکھوں روپے مسلم لیگ کو دے دیے اور صرف راولپنڈی مسلم لیگ کو ۵۰ لاکھ روپے دیئے گئے۔ جونیجو حکومت کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین صاحبزادہ محمد علی شاہ نے خود اعتراف کیا تھا کہ "نوکر شاہی عوام سے رشوت وصول کرتی ہے۔ سرکاری محکمے کے لیے عام پیسے لیتے ہیں۔ لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ چور اور ڈاکوؤں کو کوئی روکنے والا نہیں۔ اقرباء پروری کی جاتی ہے۔ قومی دولت کو لوٹا جارہا ہے۔ عوامی فنڈز اور املاک میں خرد برد کی جاتی ہے۔ اس حمام میں ہر کوئی ننگا ہے۔" (۱۵۴)

اس لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانی کے دور میں سینٹ کا ادارہ بھی کسی سے پیچھے نہ رہا۔ سینٹ میں دولت کی ریل پیل کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ مالدار اور کرپٹ عناصر سینٹ کی درمیانی مدت کے لیے پیسے خرچ کر کے رکن بننے لگے اور اس طرح ملک کا یہ مقدس ادارہ بھی بدعنوانی کا مرکتب ہوتا رہا۔ ان کے دور میں پارلیمنٹ کے ۱۷ ارکان نے پلاٹوں کی خرید وفروخت میں ۴۰ کروڑ سے زائد کمائے۔ جونیجو دور کے ایک وزیر نے کہا تھا کہ "پہلے ریلوے کی نشستیں بکتی تھیں۔ اب پورے اسٹیشن بھی فروخت ہوجاتے ہیں۔" (۱۵۵)

جونیجو کے دور اقتدار میں جاگیرداروں نے بڑے بڑے قرضہ جات حاصل کر کے ان کے اصل کوائف بھی درج کرنے کی زحمت نہ کی گئی۔ پنجاب پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے ایک رپورٹ پیش کی کہ صرف صوبہ پنجاب میں ۵۰ ارب روپے کی خرد برد کی گئی جبکہ وفاقی اکاؤنٹس کی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ ملک کے سرکاری محکموں میں ہر سال ۴۰ ارب روپے کے گھپلے کیے جاتے اور ہر سال ایک کھرب روپے کے ٹیکس چوری کیے جاتے تھے۔(۱۵۶)

جونیجو حکومت میں ۸۳ ارب روپے کے قرضے مختلف دباؤ میں آکر معاف کردیئے گئے۔ جبکہ جعلی سرمایہ کار کمپنیوں نے ایک ارب سے زائد کے فراڈ کیے اور ری بیٹ کی مد میں بینکوں میں بھی کروڑوں روپے کے فراڈ ہوئے۔ اس کے علاوہ خشک دودھ کی درآمد کے مد میں ۴۰ لاکھ روپے کا فراڈ ہوا جبکہ ریلوے کو سالانہ ۱۴ کروڑ روپے کا خسارہ برداشت کرنا پڑا(۱۵۷)۔ ان حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ افراط زر کی وجہ سے زیر گردش نوٹوں کی مالیت میں ایک ارب ۱۷ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا۔(۱۵۸)

جونیجو کے حکومتی دور میں ایک خفیہ رپورٹ پیش کی گئی جس میں یہ انکشاف کیا گیا

کہ ٹیکس چوروں اور ہیروئن کے اسمگلروں کے پاس ایک کھرب ۲۲ ارب روپے کا سیاہ دھن موجود ہے۔ جونیجو حکومت پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ انہوں نے اسلام آباد اور ملک کے دیگر حصوں میں پلاٹوں کی الاٹمنٹ سیاسی بنیادوں پر کی۔(۱۵۹)

اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا:

اب پاکستان نازک دوراہے پر کھڑا ہے اس پر کوئی محب وطن جماعت اور فرد تشویش کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا...... آج کے حالات بھی تقریباً سقوط مشرقی پاکستان کی صورتحال سے ملتے جلتے ہیں بلکہ یہ صورتحال شاید اس سے بھی مخدوش تر ہے کیونکہ اس وقت پاکستان کو افغانستان کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دو اڑھائی سال قبل صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے اس ملک میں غیر جماعتی انتخابات کروائے اور ساڑھے آٹھ سال کے مارشل لاء کو تحفظ دلوانے کے بعد مارشل لاء کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ایک نئے اور انوکھے نظام کو جنم دیا۔ اس غیر جماعتی ایوان کو آخر کار جماعتی ایوان بنانا پڑا۔ اگر اس سول حکومت کے عرصہ اقتدار کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات بلا تردید کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ حکومت نے سوا دو سال کے عرصہ میں ملک کا اقتصادی موجودہ سول حکومت پاکستان کی دفاعی تقاضوں کو پورا کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ سیاچن، گلیشیئر جو پاکستان کا علاقہ تھا اس پر بھارت نے اسی دور حکومت میں قبضہ کیا۔ پھر صوبہ سرحد اور بلوچستان کی ۱۴۰۰ میل طویل جو سرحدیں ہیں ان کے آئے روز (روس کی طرف سے) خلاف ورزی ہوتی ہے۔ پاکستان کے علاقوں میں دیدہ دلیری سے بمباری کی جاتی ہے۔ ہماری حکومت ان حملوں کا منہ توڑ جواب دینے کے بجائے صرف زبانی جمع خرچ کو ہی کافی سمجھتی ہے اور یوں دشمن کا حوصلہ بڑھتا جارہا ہے۔ پاکستانی سرحدوں کے دفاع میں حکومت کی ناکامی کی وجہ سے قوم میں مایوسی اور بد دلی کا پیدا ہو جانا بھی ایک قدرتی امر ہے۔ اقتصادی صورتحال کا

جہاں تک تعلق ہے وہ بھی انتہائی تکلیف دہ ہے۔ اس وقت مہنگائی اپنے عروج پر ہے اور قرضوں کا ایک بوجھ ہے جس کے نتیجے میں ملک دبا جارہا ہے۔...... ابھی مزید قرضہ لینے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آج صورتحال یہ ہے کہ ہم ان قرضوں کا سود دینے کے قابل بھی نہیں ہیں...... بیرون ملک کام کرنے والے پاکستان کروڑوں روپے کا زر مبادلہ کما کر بھیجتے ہیں۔ لیکن مارشل لاء حکومت کی شاہ خرچیوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے یہ تمام زرمبادلہ ضائع گیا۔ اس سے کوئی صنعت نہیں لگائی جاسکی۔ یہ سرمایہ کسی پیداواری کام پر استعمال نہیں کیا جاسکا۔ اب (مارچ اپریل ۱۹۸۷ء) تو صورتحال یہ پیدا ہو چکی ہے کہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے بھی ہمیں بیرون قرضے لینے پڑ رہے ہیں۔ کراچی اور لاہور کی کارپوریشنوں نے سڑکوں کی تعمیر اور سیوریج سسٹم کے لیے قرضے حاصل کیے ہیں۔ گویا ہم ملکی سرمائے سے اپنی سڑکیں، گلیاں اور نالیاں بنانے کے قابل بھی نہیں...... حال ہی میں حکومت نے سادگی اور کفایت شعاری کے پیش نظر بڑی کاروں کے بجائے چھوٹی کاروں کے استعمال کا جو فیصلہ کیا ہے (اگرچہ ٹھیک ہے تاہم) یہ اقدامات نہایت معمولی ہے۔ حکومت کی شاہ خرچیوں اور بدعنوانیوں کا جو سمندر ہے اس میں سے ایک قطرہ کو کم کردینے سے کیا فرق پڑتا ہے...... یہ محض ایک دھوکہ اور فریب ہے۔ نہ ہی یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر یا کسی منصوبہ بندی کے تحت کیا گیا ہے، بلکہ یہ ایک وقتی طور پر کیا جانے والا قدم ہے۔ جس کے ذریعے عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی گئی ہے...... جہاں تک مارشل لاء کے خاتمے کا تعلق ہے (یہ بھی ایک نظروں کا دھوکہ ہے) دنیا کو یہ بتانے کے لیے کہ مارشل لاء ختم ہوگیا ہے اور جمہوریت بحال ہوگئی ہے، وزیراعظم جونیجو اکثر و بیشتر اس طرح کے بیانات جاری کرتے رہتے ہیں کہ اب مارشل لاء کی سیاہ رات ختم ہوگئی ہے اور مارشل لاء کی وہ سیاسی جو

پاکستان کے چہرے کو بدنام بنائے ہوئے تھی اب اسے دھو ڈالا گیا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بنیادی حقوق بحال کر دیئے گئے ہیں...... کیا وہ لوگ جن کو مارشل لاء کورٹس نے سزائیں دی ہیں ان کو یہ حق حاصل ہوگیا ہے کہ وہ ان سزاؤں کے خلاف سول عدالتوں میں اپیل کر سکیں، کیا اعلیٰ عدالتوں کو یہ اختیارات تفویض کر دیئے گئے ہیں کہ مارشل لاء کے ناجائز اور غیر آئینی اقدامات کے خلاف کوئی فیصلہ صادر کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے سول عدالتوں کو یہ اختیارات نہیں دیئے گئے تو پھر کس قسم کے بنیادی حقوق بحال کیے گئے ہیں۔ وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی آزادی دے دی ہے...... کیا انہوں نے گزشتہ سال (۱۹۸۶ء) میں یوم آزادی کے موقع پر ایم آر ڈی کو لاہور میں جلسہ کرنے کی اجازت دی اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ صرف ایم آر ڈی کے اس جلسے میں شرکت کے لیے آنے والے عام شہریوں کو بھی خون میں نہلا دیا گیا۔ بنیادی حقوق کی بحالی کا دعویٰ کرنے والوں نے وطن عزیز کی آزادی کی خوشیاں منانے کے لیے جمع ہونے والے شہریوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا اور بارہ افراد کو ہلاک کر دیا گیا۔ آج بھی سیاسی جماعتوں کو جلسہ کرنے کے لیے ڈپٹی کمشنر کو درخواست دینا پڑتی ہے اور ڈپٹی کمشنر حکومت کی پالیسی کے مطابق جلسہ کے انعقاد کی اجازت نہیں دیتے۔ لہٰذا وہ کون سی آزادی اور بنیادی حقوق ہیں جو سیاسی جماعتوں اور عام شہریوں کو میسر ہیں۔ یہ دعویٰ ابھی کیا جاتا ہے کہ ایمرجنسی ختم کر دی گئی ہے...... لیکن عملی طور پر یہ صورتحال یہ ہے کہ اب بھی حکومت جسے چاہتی ہے گرفتار کر لیتی ہے، جسے چاہتی ہے نظر بند کر دیتی ہے، دیواریں پھلانگ کر رات کی تاریکی میں پولیس بے گناہ اور معصوم شہریوں کے گھروں میں گھس جاتی ہے۔ بلوچستان میں جیوانی کے مقام پر شہریوں کو بجلی، پانی اور دیگر بنیادی سہولتیں کی فراہمی کا مطالبہ کرنے پر تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اقدامات کو

بنیادی حقوق کی بحالی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ مختلف سیاستدانوں پر اب بھی مختلف اضلاع اور صوبوں میں جانے پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ آج بھی جو اخبار حکومت کے خلاف لکھتا ہے اور بعد میں اس کا جو حشر ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اسی طرح جو اخبارات و جرائد مارشل لاء کے دور میں بند کر دیئے گئے تھے ان کی اشاعت پر آج بھی پابندی ہے...... اب بھی وہی کچھ ہو رہا ہے جو پیپلز پارٹی کے دور میں ہوتا تھا صرف زیر عتاب لوگ بدل گئے ہیں۔'' (۱۶۰)

اس دور میں سیاستدانوں اور ہیروئن کے اسمگلروں کے تعلقات عام تھے۔ ایک بین الاقوامی اسمگلر'' حاجی ہارون یعقوب عرف اونٹنی والا'' نے ملک کی اکثر شخصیات سے فوائد حاصل کرنے کی غرض سے مزار قائد کراچی کے قریب ایک عشرت کدہ بنا رکھا تھا۔ جہاں اس کی ذاتی دعوت پر ہر شب ملک کی کوئی نہ کوئی نامور شخصیت داد عیش دینے حاضر ہوتی تھی۔ عشرت کدے کے مستقل مہمانوں میں عبدالحفیظ پیرزادہ، جام صادق، ولی جاموٹ، عبدالستار گبول، مولانا کوثر نیازی اور خود محمد خان جونیجو قابل ذکر ہیں (۱۶۱)۔ ان لوگوں کے لیے غیر ملکی شراب اور حسین دوشیزاؤں کا انتخاب کیا جاتا اور عیاشی کے اس اڈے پر ایک دفعہ ایک ایماندار انسپکٹر ارشد نے اپنے عملے کے ہمراہ مذکورہ عیاشی کے اڈے پر چھاپہ مارا جس کی پاداش میں انسپکٹر مذکور اور اس کے دیگر ساتھیوں کو نہ صرف نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے بلکہ ایک جھوٹے مقدمہ میں ملوث کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ (۱۶۲) ملک کے سیاسی اداروں اور سیاست میں ایسے افراد شریک ہوئے جب سیاسی طور پر غیر تربیت یافتہ تھے اور ان میں اکثریت کا تعلق بس اسٹینڈ کے اڈوں اور دیگر عوامی مقامات سے جگا لینے والوں میں سے تھا۔ اس وقت کے ارکان اسمبلی قانون سازی اور دیگر حکومتی اقدامات کی الف ب سے بھی واقف نہ تھے جس کے اثر جمہوری اداروں پر پڑے اور جمہوریت کے سفر کی رفتار سست پڑ گئی۔ (۱۶۳)

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو بہاولپور کے نزدیک (بستی لال کمال) ایک فضائی حادثے میں جنرل ضیاء الحق اور ان کے رفقاء جاں بحق ہو گئے۔ اسی روز چیئرمین سینٹ غلام اسحاق خان نے آئین کے تحت پاکستان کے قائم مقام صدر کی ذمہ داریاں سنبھال لیں (۱۶۴)۔ جونیجو حکومت نے اسمبلیاں توڑے جانے کے اقدام کو لاہور ہائی کورٹ چیلنج کر رکھا تھا۔

۲۷ ستمبر ۱۹۸۸ء کو سپریم کورٹ نے اگر چہ ہائی کورٹ کے مذکورہ فیصلے کی توثیق کی مگر ساتھ ہی یہ بھی ریمارکس دیئے کہ کالعدم اسمبلیاں اور حکومتیں بحال نہیں ہوں گے اور انتخابات شیڈول کے مطابق منعقد ہوں گے۔(۱۶۵)

جنرل محمد ضیاء الحق (۱۹۲۴۔۱۹۸۸ء) جو محض ۹۰ دن میں انتخابات کرانے کا وعدہ لے کر آئے تھے اور منتخب حکومت کو اقتدار سونپ دینے کا اعلان کیا۔ ۱۱ سال اور ۴۲ دن تک مملکت خداداد پاکستان کے سیاہ وسفید کے مالک بنے رہے۔ انہوں نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو "آپریشن فیئر پلے" کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کیا اور ملک کے کونے کونے سے غیر پسندیدہ اور پیپلز پارٹی مخالف سیاستدانوں کی سیاسی حمایت حاصل کرنے کا عمل شروع کردیا۔ مسند اقتدار پر فائز ہونے کے چند ماہ بعد ضیاء الحق بحالی جمہوریت کا وعدہ گول کر گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ضیاء الحق کے عہد کو ایک غاصب، مداخلت کار اور آمر مطلق کا دور کہا جاتا ہے۔ وہ پہلے ہی دن سے پیپلز پارٹی کو دبانے کے لیے مارشل لاء کے کوڑے استعمال کرنے لگے۔ صدر ضیاء کے دور حکومت میں سب سے زیادہ ضعف اسلام کو پہنچایا گیا کیونکہ انہوں نے اسلام کے نام پر حکومت کی اور اسلام کے نام کو اس انداز میں اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کہ دنیا بھر کے تجزیہ نگاروں نے ضیاء الحق کے دور کو"اسلامائزیشن کی زد میں آیا ہوا دور" کہا۔(۱۶۶)

زکوٰۃ وعشر کے آرڈی نینسوں سے لے کر صلوٰۃ کمیٹیوں کے قیام اور پھر اپنی نوعیت کے انوکھے "ریفرنڈم" تک ضیاء الحق کی شخصیت کی مختلف پرتیں سامنے آتی ہیں۔ ضیاء الحق کی اس بہت بڑی اور فاش غلطی کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جو انہوں نے ملک میں زکوٰۃ وعشر آرڈی نینس کا نفاذ کر کے کی۔ یہ وہ پہلا وار تھا جو ملکی یکجہتی اور سلامتی کی جڑوں پر ضرب کاری کی صورت میں پڑا اور یہیں سے پاکستان میں فرقہ واریت کی مکروہ جنگ کی ابتداء ہوئی۔ ضیاء الحق کی لاگو کردہ زکوٰۃ کے خلاف پاکستان کے اہل تشیع نے اسلام آباد میں ایک بڑا ہجوم اکٹھا کرلیا اور سیکریٹریٹ کے سامنے ایک دن اور رات کے دھرنا دیا گیا۔ اس دباؤ کے سامنے ضیاء الحق کو جھکنا پڑا اور مجبوراً انہیں اپنے آرڈی نینس میں ترمیم کرنا پڑی لیکن یہاں سے جو مزاج ابھرا، آج اس کے بھیانک نتائج سے مفر ممکن نہیں (بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جنرل ضیاء نے اپنے فکری مخالفین کو کچلنے کے لیے پارہ چنار کے طوری قبائل پر فوج کشی کردی)۔(۱۶۷)

ضیاء الحق جو اپنی شخصیت کی نمود ونمائش اسلام کے زیر سایہ اور اسلام کا نام لے کر کرتے رہے، انہوں نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار یہ اعلان کردیا کہ دینی مدارس کی اسناد اور ڈگریاں یونیورسٹیاں اور پبلک سروس کمیشن جیسے ادارے تسلیم کریں گے۔ اس دور میں لاتعداد ایسے طلبہ کو سرکاری ملازمتیں دی گئیں جنہوں نے محض کسی دینی مدرسے سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی ہنر نہیں تھا لیکن ان کو اعلیٰ ملازمتوں پر لے لیا گیا۔(۱۶۸)

ضیاء الحق کو ذوالفقار علی بھٹو نے آٹھ سینئر جرنیلوں پر فوقیت دے کر مسلح افواج کا سربراہ بنایا تھا۔ ضیاء الحق نے اپنے اسی محسن کی حکومت ختم کی اور پھر خود اس کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا اور نواب محمد احمد خان بنام ذوالفقار علی بھٹو مقدمہ قتل دوبارہ شروع کردیا۔☆ جو بالآخر بھٹو کی سزائے موت پر منتج ہوا(۱۶۹)

جنرل ضیاء الحق کا یہ اقدام اپنے اقتدار کو طول دینے کے زمرے میں آتا ہے۔ انہوں نے اپنی کسی بھی بات اور کسی بھی اقدام میں مستقل مزاجی اور بالغ نظری کا مظاہرہ نہ کیا۔ مارشل لاء کے آغاز ہی سے بعض سیاستدانوں سے ملاقاتوں کے دوران انہوں نے قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ وہ ۹۰ دن میں انتخابات کا وعدہ پورا کریں گے۔ لیکن انہوں نے مارشل لاء کو قوم پر مسلط رکھا اور انتخابات ملتوی کردیئے اور ۱۹۸۵ء میں ایم آرڈی کے زبردست دباؤ کے تحت انتخابات کی جانب آئے۔ انہوں نے غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرائے جن کا تقریباً تمام جمہوریت پسند جماعتوں نے بائیکاٹ کیا بلکہ سیاسی جماعتوں کو ان انتخابات سے خارج ہی کردیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۷۳ء کے آئین اور جمہوری روایتوں کو بری طرح پامال کیا گیا۔ قبل ازیں دسمبر ۱۹۸۴ء میں ضیاء الحق نے نام نہاد اور "تاریخی" ریفرنڈم کے ذریعے ووٹ کی حرمت پامال کی۔ جب انہوں نے اپنے حق میں اسلامی نظام کے لیے ووٹ مانگا یہ اسلامی مملکت میں اسلام کے ساتھ ایک سنگین مذاق تھا۔ جس کی بازگشت پوری دنیا میں حیرانی کے ساتھ سنی گئی۔ اس ریفرنڈم میں ۵ اور ۶ فیصد ووٹوں کو ۹۹ فیصد کامیابی میں تبدیل کیا گیا اور اس طرح ایک سنگین بدعنوانی اور دھوکہ دہی کا ارتکاب کیا گیا۔ اصل صورتحال یہ رہی کہ عوام نے ضیاء الحق کے

☆ استغاثہ میں موقف اختیار کیا گیا کہ مقتول کو فیڈرل سیکورٹی فورسز کے ذریعے لاہور میں فائرنگ کر کے ہلاک کیا گیا۔ پہلے یہ مقدمہ لاہور ہائی کورٹ میں چلتا رہا جس نے اپنے فیصلے میں ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت کا حکم سنایا پھر سپریم کورٹ نے اس فیصلے کو بحال رکھا اور بالآخر ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔

ریفرنڈم کو یکسر مسترد کردیا اور عوام کی نفرت کا برملا اظہار ہوا۔ اس ریفرنڈم کے نتیجے میں ضیاء الحق مزید پانچ سال تک اپنے اقتدار میں اضافہ کر گئے۔(۱۷۰)

ضیاء عہد حکومت سماجی اور اخلاقی سطح پر ایک افراتفری، انتشار اور بگاڑ کا دوسرا نام تھا۔ اسی دور میں کلاشنکوف کلچر کی ابتدا ہوئی۔ ہیروئن کی بین الاقوامی سطح پر اسمگلنگ کا آغاز ہوا۔ اقرباء پروری، رشوت خوری اور پلاٹوں کی سیاست کا آغاز کیا گیا، صحافیوں کو نوازا گیا اور من پسند جرنلسٹوں کو مراعات دی گئیں۔ ۱۹۸۸ء میں اپنے ہی وضع کردہ نظام کے تحت بنائی گئی قومی اسمبلی اور وفاقی حکومت کو جنرل ضیاء الحق نے بڑی آسانی سے ختم کردیا۔ محمد خان جونیجو کے تین سالہ دور اقتدار کو مالی و سیاسی ورشوت اور اقرباء پروری کا دور قرار دیا گیا اور اپنی ایک نشری تقریر میں جونیجو حکومت کو بدعنوان قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس دور میں نچلی سطح سے لے کر اعلیٰ سطح تک بدعنوانی شروع ہوئی۔ معاشی حالت مفلوج ہوگئی اور حکومت اپنے وسائل کے بجائے سب کچھ قرضوں پر چلاتی رہی اور کراچی میں تین برسوں کے دوران جو تشدد آمیز واقعات اور خون خرابہ ہوا۔ وہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ جونیجو حکومت پر لگائے گئے ان الزامات کے تحت جنرل ضیاء الحق نے خود اپنی ہی استوار کردہ نظام کے چہرے پر تھپڑ رسید کردیا۔ ان کے اس اقدام کی ہر سطح پر مذمت کی گئی۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی جیسی، مارشل لاء کی حامی جماعت نے بھی اس امر پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔(۱۷۱)

اس وقت کی قومی اسمبلی کے اسپیکر حامد ناصر چٹھہ نے اس اقدام کو غیر ذمہ دارانہ کہا، جبکہ صوبہ سرحد کے گورنر فدا محمد خان نے اپنے عہد سے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا(۱۷۲)۔ ۹ جون ۱۹۸۸ء کو صدر ضیاء الحق نے جن اٹھارہ ارکان کو اپنی کابینہ میں شامل کیا ان میں آٹھ افراد ایسے تھے جو ضیاء الحق کی طرف سے بدعنوانیوں، لوٹ مار اور نااہل کے الزامات کے تحت برطرف کی گئی سابق حکومت میں بھی شامل تھے۔ ایسے پرانے وزراء میں محمد اسلم خان خٹک، ملک نسیم احمد، ڈاکٹر محبوب الحق، چوہدری شجاعت حسین، وسیم سجاد، سردار وزیر احمد جوگیزئی، چوہدری نثار علی اور سردار فتح محمد حسن شامل تھے۔(۱۷۳)

جونیجو حکومت کی برطرفی کے بعد ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے آئندہ انتخابات کی تیاریوں کے سلسلہ میں رابطے شروع کردیے اور ضیاء الحق پر زور دیا جارہا تھا کہ وہ انتخابات کے شیڈول کا اعلان کریں مگر ضیاء الحق انتخابات سے قبل اپنی پسند کے کچھ اقدامات کرنے پر مصر رہے۔ ۱۵ جون ۱۹۸۸ء کو انہوں نے شریعت آرڈیننس نافذ کردیا مگر اس کے نفاذ کے

اگلے روز ہی لاہور میں منعقدہ دینی جماعتوں کی کے کانفرنس نے اس آرڈیننس کو مسترد کردیا اور اسے صدر ضیاء الحق کی جانب سے اپنے اقتدار کی طوالت کی ایک کوشش قرار دیا۔(۱۷۴)

جنرل ضیاء الحق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انتخابات کو معرض التواء میں ڈالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان پر ہر طرح کا سیاسی اور عوامی دباؤ بڑھتا گیا۔ جس سے مجبور ہو کر انہوں نے ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کو انتخابات کرانے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی یہ اعلان کردیا کہ انتخابات غیر جماعتی ہوں گے۔ اس فیصلے کے خلاف بھی سیاسی جماعتوں نے شدید احتجاج کیا لیکن ضیاء الحق اس بات پر اڑے رہے کہ عوام کی اکثر غیر جماعتی انتخابات چاہتی ہے اور کوئی جماعت بھی قومی سطح پر منظم نہیں ہے اور اگلے پانچ الیکشن بھی غیر جماعتی ہونے چاہئیں۔(۱۷۵)

۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے لے کر ۲۰ مارچ ۱۹۸۵ء تک انتہائی قیمتی پلاٹ اسلام آباد میں حاصل کرنے اور اعلیٰ قسم کی قیمتی کاریں ڈیوٹی فری درآمد کرنے والوں کی فہرست منظر عام پر آئی تو عوام پر راز کھلا کہ غیر جماعتی بنیادوں پر جس شوریٰ کے ارکان کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے جنرل ضیاء الحق کو کس کس انداز میں سیاسی رشوت پیش کرنا پڑی۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے لے کر مارچ ۱۹۸۰ء تک اعلیٰ فوجی و سول حکام نے بیش قیمت ڈیوٹیو فری کاریں درآمد کیں(۱۷۶) اسی طرح پلاٹ حاصل کرنے والوں میں بھی ارکا کن پارلیمنٹ شامل تھے۔

پھر مارچ ۱۹۸۵ء سے مئی ۱۹۸۸ء تک جن ارکان پارلیمنٹ کو قیمتی پلاٹ دیے گئے اس میں ایس ایس ایم بسکٹس ملکیت نواب محمد یامین خان، میسر الیکٹرانک سسٹم ملکیت بیگم سلمیٰ احمد، میسرز گلمرک اینڈ کمپنی ملکیت شیخ رشید احمد، میسرز کھوکھر کارپوریشن ملک محمد نواز کھوکھر، میسر زعمان فوڈ پراڈکٹس ملکیت مہران خان بجارانی اور میسر پیراماؤنٹ انجینئرنگ سروسز ملکیت گورنر قطب الدین خان شامل تھے۔(۱۷۷)

جونیجو حکومت پر جس طرح بدعنوانیوں، دھاندلیوں اور لوٹ کھسوٹ کا الزام لگا کہ جنرل ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کو رات کو طول دیا اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سابقہ حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا۔ اسی طرح ضیاء حکومت بھی بدعنوانیوں اور لوٹ کھسوٹ کی ایسی داستانیں رقم کر گئی کہ جس کے قبیح اثرات سے قوم آج تک پیچھا نہیں چھڑا سکی۔ ضیاء نے ۱۹۷۸ء میں سول کابینہ تشکیل دی۔ اس دور میں کرپشن اپنے عروج پر رہی اور اس تمام تر بدعنوانیوں کو مارشل لاء کی چھتری فراہم کی گئی۔ حتیٰ کہ مارشل لاء کے احتسابی قوانین بھی اس دور میں پامال کیے گئے اور ان قوانین کے کھلے بندوں خلاف ورزی کی گئی۔ ضیاء دور میں تو

قوانین مذاق بن کر رہ گئے۔ وزراء پر مشتمل سول کابینہ کے دور میں اختیارات سے تجاوز، بدعنوانیوں کے نئے طریقوں اور قومی خزانے میں لوٹ کھسوٹ کے ایسے ایسے واقعات منظر عام پر آئے کہ ''امیر المومنین'' کہلائے جانے والے ضیاء الحق پر قوم کا اعتماد متزلزل ہوگیا۔(۱۷۸)

۱۹۷۸ء کے دوران ری کنڈیشنڈ کاروں کا ایک اسکینڈل منظر عام پر آیا۔ جس میں ۵۰ ہزار کاریں جعلی دستاویزات کے ذریعے ایسے لوگوں کے ناموں سے منگوائی گئیں جن کا نام ونشان تک بھی نہیں تھا۔ اس اسکینڈل میں ضیاء الحق کابینہ کا ایک وزیر میاں زاہد سرفراز بھی شریک تھا جس نے ایک کروڑ روپے وصول کیے۔ کاروں کے اسکینڈل میں ملوث افراد کو براہ راست وزراء کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اربوں روپے کے خرد برد کا یہ اسکینڈل مارشل لاء حکومت کے چہرے پر بدنما داغ تھا۔ اسی طرح ضیاء کابینہ کے ایک اور وزیر مصطفیٰ گوکل کے حوالے سے پاکستان شپنگ کارپوریشن کے کچھ جہازوں کی فروخت اور دیگر جہازوں کی خریداری کا ایک اسکینڈل بڑا معروف رہا۔ کابینہ کے اکثر وزراء مجوزہ سودے کے حق میں نہ تھے لیکن وزیر مذکورہ نے صدر ضیاء الحق سے کسی طرح منظوری حاصل کرلی۔ اس سودے میں بھاری کمیشن لیا گیا۔(۱۷۹)

ضیاء دور میں کیے جانے والے احتساب کا عمل ایک مذاق بن کر رہ گیا۔ اس احتساب کے نعرے کو محض ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے استعمال کیا۔ دولت لوٹنے والوں سے کروڑں روپے واپس نہ لیے گئے۔ ۷ سال کے لیے جن افراد کو نااہل قرار دیا گیا۔ ان کے الزامات اور کرپشن کی تفصیل کو بھی عوام تک نہ پہنچنے دیا گیا۔ عبوری آئین جاری کر کے اعلیٰ سول عدالتوں پر مارشل لاء عدالتیں مسلط کردی گئیں۔ جبکہ حکومت میں فوج کا کردار متعین کر کے سول اداروں پر فوج افسر شاہی مسلط کردی گئی۔ جنرل ضیاء نے سول انتظامیہ نیم سرکاری اداروں، سرکاری کارپوریشنوں اور محکمہ خارجہ میں فوج سے ریٹائرڈ اور ریٹائرمنٹ کے قریب فوجی افسروں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ ۱۹۸۱ء کے وسط میں ۴۴ پاکستانی سفیروں میں سے ۱۸ کا تعلق فوج سے تھا(۱۸۰)۔ ۱۹۸۵ء کے دوران ۹۶ فوجی افسروں کو مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدوں کے افسران کے لیے چن لیا گیا۔(۱۸۱)

کرپشن، بددیانتی، رشوت ستانی، اسمگلنگ اور منشیات کا کاروبار عروج تک پہنچا۔ ناجائز اسلحہ کا دور دورہ ہوا۔ کلاشنکوف کلچر کو فروغ ملا۔ فوج کے بعض اعلیٰ افسر رشوت ستانی کی وبا

میں ملوث پائے گئے۔ مثال کے طور پر واپڈا کے ایک فوجی (جرنیل) آفیسر نے ۵۰ کروڑ روپے تک رشوت وصول کی اور بعدازاں دوسرے ملک سفیر بنا کر بھیج دیئے گئے۔ ضیاء دور میں بعض میجر منشیات کے اسمگلنگ میں بین الاقوامی سطح پر مقبول ہوئے۔ بہت سے فوجی افسران نے امریکہ اور دیگر ممالک میں جائدادیں بنائیں اور دولت کمائی۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵ء کو جنرل ضیاء الحق نے ان تمام باتوں کا اعتراف کیا کہ وہ ملک سے بدعنوانی اور رشوت ستانی ختم نہیں کرسکے۔(۱۸۲)

اسلام کے ساتھ ضیاء الحق کی وابستگی اتنی ہی مشکوک تھی جتنی سیاست کے ساتھ۔ ضیاء الحق کا اصل مقصد خود کو امیر المومنین کے طور پر مسلط کرنا تھا تاکہ وہ حاکم کل ہوں اور انصاف یا قانون ان کے راستے میں حائل نہ ہوسکیں۔(۱۸۳)

ضیاء الحق نے ۱۹۸۵ء میں قائم ہونے والی جونیجو حکومت میں شامل افراد کو اس خوبصورتی کے ساتھ بدعنوانیوں میں دھکیلا کہ جونیجو دور میں ہر سو بدعنوانیاں ہی بدعنوانیاں نظر آتی ہیں۔ ضیاء الحق نے اپنی پوزیشن مستحکم رکھنے کے لیے نام نہاد سیاستدانوں کو وسیع پیمانے پر کرپشن کی اجازت دی اور خود انہیں پرمٹ جاری کیے اور ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنے کا اختیار دیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ضیاء الحق ''جمہوری حکومت'' کو عوام کی نظروں میں بدنام کرنا چاہتے تھے اور بین الاقوامی سطح پر اس تاثر کو مضبوط کرنا چاہتے تھے کہ پاکستان جیسے ملک میں جمہوریت نہیں پنپ سکتی اور اگر اقتدار سیاستدانوں کے سپرد کردیا جائے تو پھر سوائے کرپشن کے اور کچھ نہیں ہوسکتا(۱۸۴)۔ اس جمہوریت کش تاثر کو فروغ دینے کا ایک مقصد گزشتہ مارشلائی اقدامات اور آئندہ کے لیے جمہوریت مخالف اقدامات کو جواز دینا بھی تھا۔ جس میں وہ خاصی حد تک کامیاب رہے۔(۱۸۵)

ضیاء الحق حکومت کی بدعنوانیاں اتنی گہری ہوچکی تھیں اور اس طرح معاشرے میں سرایت کرگئی تھیں کہ جونیجو حکومت کے لیے اس سے چھٹکارا پانا آسان کام نہیں تھا۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین سردار محمد علی شاہ نے بینکوں، ریلوے، بیرونی تجارت اور کئی دوسرے سرکاری شعبوں میں خوفناک بدعنوانیاں کی جو نشاندہی کی اس کی پاکستان کی سیاسی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔(۱۸۶)

اگر ہم ضیاء دور حکومت کے اثرات سے چھٹکارا پانا چاہیں بھی تو کسی طور پر ممکن نہیں۔ پاکستان آج اپنی آزادی کے ۵۷ برس بعد بھی وہاں کھڑا ہے جہاں سفر شروع کیا تھا۔ پاکستانی قوم روز اول ہی سے تنگ دائرہ میں سفر کررہی ہے۔ جواگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ وسیع ہوتے جا رہے ہیں لیکن پھر بھی اس سفر کو کوئی منزل نہیں۔ بلکہ اگر درجہ جمہوری اصولوں کی روشنی میں تاریخ پاکستان پر نظر ڈالی جائے تو آج حالات ماقبل آزادی کے نو آبادیاتی دور سے بھی بدتر ہیں۔ آج ملک میں نہ جان و مال کا تحفظ ہے اور نہ عزت محفوظ ہے۔ قانون صرف اس بے وقت طبقے کے لیے رہ گیا ہے جو اس کی خلاف ورزی کرنے کی سکت ہی نہیں رکھتا۔ گذشتہ ۵۷ برسوں سے پاکستان پر ایک ہی طبقے نے مختلف ناموں سے حکومت کی ہے اور یہ طبقہ وہ ہے جس نے انگریزوں کی آمد سے پہلے بادشاہوں، راجوں اور مہاراجوں کی مصاحبت اختیار کی اور انگریز کی آمد کے ساتھ ہی اپنے سابقہ محسنین سے چشم طوطا چشمی اختیار کرکے نئے آقاؤں کی تابعداری کو حرز جان بنالیا۔ ان کے آباؤ اجداد نے انگریز کی وفاداری میں بارہا اپنی جان کی بازی لگائی اور کاسہ لیسی کا بے مثال مظاہرہ پیش کیا۔ شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار یہ لوگ انگریزی سامراج کے انتہائی وفادار اور قابل اعتبار چاکر کے طور پر پہنچانے گئے۔ بدقسمتی سے آزادی کے بعد ہمارے اقتدار بھی اسی طبقے کے سر پر جا بیٹھی۔ جس کی وجہ سے عوام کو حقیقی معنوں میں آزادی کو محسوس کرنے اور آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع نہیں ملا۔ گنتی کے یہی چند لوگ ہمہ قسم ملکی وسائل پر قابض ہیں اور بعد ازاں انہی لوگوں نے اپنے طبقے کے مخصوص مفادات کی تکمیل کے لیے ہر آمر، ہر ظالم اور جابر حکمران کے ہاتھ مضبوط کیے۔ اسی طبقہ کی سازشوں کی وجہ سے مملکت خداداد پاکستان میں اسلامی تعلیمات کو دقیانوسی قرار دیا گیا اور نفاذ اسلام کی کوششوں بالخصوص تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کو قرون اولیٰ کی واپسی سے تعبیر کیا گیا اور بعد ازاں اسی طبقے کے کاسہ لیسوں نے اسلام کو دہشت پسند اور تنگ نظر مذہب قرار دیتے ہوئے اعتدال پسندی اور روشن خیالی جیسے عین اسلامی تصورات کا تعلق مغربی جمہوریت سے جوڑتے ہوئے اسلام کو ایک بنیاد پرست اور غیر ترقی پسند مذہب کے طور پر متعارف کرایا۔ ان حالات میں وہ محب وطن طبقات جن کا اوڑھنا بچھونا ہی پاکستان اور صرف پاکستان ہے۔ انہیں کسی بھی سطح پر پہنچنے کا موقع نہیں ملتا۔ بالخصوص مولانا شاہ احمد نورانی جیسی شخصیات جو انتخابات کے بغیر سیاست کو بیکار محض سمجھتی ہوں اور جنہوں نے ساری عمر اقتدار کے بغیر سیاست کو اپنا مقصد زندگی بنائے رکھا ہو، بھلا کب کامیابی سے ہم کنار ہو سکتی تھیں۔ جمعیت علمائے پاکستان کی گاڑی سے سیاسی مسافر ایک ایک کر کے اترتے رہے اور مولانا شاہ احمد نورانی ان کی جدائی کا قلق لیے لیکن صبر و استقامت کے ساتھ اپنے سیاسی سفر پر، نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ کی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔

حوالہ جات وتعلیقات

(۱) روزنامہ وفاق لاہور، ۲ جولائی ۱۹۸۱ء

(۲) ایضاً

(۳) انٹرویو پروفیسر شاہ فرید الحق، ۱۲ جولائی ۲۰۰۵ء

(۴) ایضاً

(۵) روزنامہ وفاق لاہور، یکم اگست ۱۹۸۳ء

(۶) ایضاً (۷) ایضاً، ۳، اگست ۱۹۸۳ء (۸) ایضاً

(۹) جنرل ضیاء الحق نے ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کو مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں نئے سیاسی ڈھانچے کا اعلان کر دیا جس کے مطابق ۱۹۷۳ء کے آئین میں اس طرح ترامیم کی جائیں گی۔ کہ صدر کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں۔ وزیر اعظم کا تقرر صدر کرے گا۔ صدر قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرے گا۔ ایک سیکورٹی کونسل بنائی جائے گی جو ہنگامی حالات کا اعلان کر سکے۔ اس کے اراکین کو صدر نامزد کرے گا۔ بعد ازاں سیکورٹی کونسل کے قیام کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔ اس نئے سیاسی ڈھانچے کی تشکیل کے لیے ظفر احمد انصاری کی سربراہی میں ایک کمیشن تشکیل دیا گیا تا کہ اس کی سفارشات کی روشنی میں ڈھانچہ تیار کیا جا سکے۔ (ایضاً، ۱۴، اگست ۱۹۸۳ء)

(۱۰) ایضاً (۱۱) ایضاً، ۱۸ اگست ۱۹۸۳ء (۱۲) ایضاً

(۱۳) ایضاً (۱۴) ایضاً، ۱۰، اگست ۱۹۸۳ء (۱۵) ایضاً، ۱۶، اگست ۱۹۸۳ء

(۱۶) ایضاً (۱۷) ایضاً (۱۸) ایضاً، ۲۰، اگست ۱۹۸۳ء

(۱۹) ایضاً، ۲۴ اگست ۱۹۸۳ء (۲۰) ایضاً، ۲۰ ستمبر ۱۹۸۳ء

(۲۱) مولانا شاہ احمد نورانی کا کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب بحوالہ روزنامہ وفاق ۲۹ ستمبر ۱۹۸۳ء

(۲۲) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۸، اکتوبر ۱۹۸۳ء

(۲۳) ایضاً (۲۴) ایضاً (۲۵) ایضاً، ۱۹، اکتوبر ۱۹۸۳ء

(۲۶) ایضاً (۲۷) ایضاً (۲۸) ایضاً

(۲۹) ایضاً،۱۰ اکتوبر ۱۹۸۳ء (۳۰) ایضاً (۳۱) ایضاً،۱۱ اکتوبر ۱۹۸۳ء

(۳۲) ایضاً،۱۲ اکتوبر ۱۹۸۳ء

(۳۳) لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب،۱۲ اکتوبر ۱۹۸۳ء، بحوالہ جنگ کراچی، ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۳ء

(۳۴) ایضاً،۲۰ اکتوبر ۱۹۸۳ء (۳۵) ایضاً (۳۶) ایضاً

(۳۷) ایضاً،۲ نومبر ۱۹۸۳ء (۳۸) ایضاً،۳ نومبر ۱۹۸۳ء (۳۹) ایضاً

(۴۰) ایضاً (۴۱) ایضاً،۲ نومبر ۱۹۸۳ء (۴۲) ایضاً،۳ نومبر ۱۹۸۳ء

(۴۳) ایضاً،۴ نومبر ۱۹۸۳ء (۴۴) ایضاً (۴۵) ایضاً

(۴۶) ایضاً (۴۷) ایضاً (۴۸) ایضاً (۴۹) ایضاً

(۵۰) ایضاً،۵ نومبر ۱۹۸۳ء (۵۱) ایضاً (۵۲) ایضاً

(۵۳) ایضاً (۵۴) ایضاً،۷ نومبر ۱۹۸۳ء (۵۵) ایضاً

(۵۶) ایضاً،۱۶ نومبر ۱۹۸۳ء

(۵۷) عاقل، مختار، ''سندھ کی ڈائری''، روزنامہ جنگ کراچی،۱۹ نومبر ۱۹۸۳ء

(۵۸) روزنامہ جنگ کراچی،۲۰ نومبر ۱۹۸۳ء

(۵۹) ایضاً،۲۱ نومبر ۱۹۸۳ء

(۶۰) دورہ اندرون سندھ میں مولانا شاہ احمد نورانی کے ہمراہ پروفیسر شاہ فرید الحق، ہارون احمد، اسلام صدیقی، نذیر ضیاء، صابر علی جامی، نذیر اے خان، عبد الحمید خان، محمود الحق عثمانی اور غلام نبی قریشی بھی تھے۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے ہر علاقے میں عوام الناس کے اجتماعات اور ملاقات کے لیے آئے ہوئے وفود سے خطاب کیا۔ اور تحریک کے مجروحان کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ یہ جمہوری تحریک ''سندھ دیش'' کی تحریک ہرگز نہیں جسے حکومت خواہ مخواہ اس نام سے پکار کر رائے عامہ کو گمراہ کر رہی ہے۔ بلکہ یہ'' پاکستان بچاؤ تحریک'' ہے جس کے لیے حمایت حاصل کرنے کے سلسلے میں عوام سے رابطہ کرنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ تمام سندھی بھائی بھائی ہیں۔ (ایضاً)

(۶۱) ایضاً (۶۲) ایضاً،۲۲ نومبر ۱۹۸۳ء (۶۳) ایضاً

(۶۴) ایضاً،۲۴ نومبر ۱۹۸۳ء (۶۵) ایضاً

(۶۶) روزنامہ وفاق لاہور،۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء

(۶۷) ہفت روزہ افق کراچی،۲۹ نومبر تا ۱۳ دسمبر ۱۹۸۳ء

(۶۸) روزنامہ جنگ کراچی،۲۳ نومبر ۱۹۸۳ء

(۶۹) روزنامہ وفاق لاہور،۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء

(۷۰) ایضاً

(۷۱) روزنامہ جنگ کراچی،۲۷ نومبر ۱۹۸۳ء

(۷۲) ایضاً (۷۳) ایضاً،۲۸ نومبر ۱۹۸۳ء (۷۴) ایضاً

(۷۵) ایضاً (۷۶) ایضاً،۲ جنوری ۱۹۸۴ء (۷۷) ایضاً،۴ جنوری ۱۹۸۴ء

(۷۸) روزنامہ وفاق لاہور،۲۸ نومبر ۱۹۸۳ء۔

(۷۹) جمعیت علمائے پاکستان کے سیکریٹری جنرل مولانا عبد الستار نیازی نے پیر پگاڑا پر الزام لگاتے ہوئے کہا کہ پیر پگاڑا نہ تو سیاسی رہنما ہیں اور نہ مسلم لیگی۔ وہ صرف سیاسی پکنک مناتے ہیں۔ جن کا نہ ملک کو، نہ ہی قوم کو کوئی فائدہ ہے...... پیر پگاڑا نے اعلان کیا کہ وہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۴ء کو مسلم لیگی کنونشن منعقد کریں گے جبکہ انہیں اس دن مسلم لیگ کا یوم احتساب منانا چاہیے اور اس روز مسلم لیگ اپنا محاسبہ کرے کیونکہ مسلم لیگ اس ملک کی سفید زمین کو چاٹ رہی ہے اور قائد اعظم کے ارشادات و افکار کی روشنی میں کچھ کرنے کے بجائے ملک کو تباہ کر رہی ہے۔ اب پیر پگاڑا کہہ رہے ہیں کہ الیکشن جماعتی بنیادوں پر ہونا چاہیے اور تنظیم کے لیے بھی دیا جائے اگر تنظیم نہیں ہے تو پھر وہ مسلم لیگ کے صدر کس طرح بنے ہوئے ہیں۔ وہ سیاست کی آڑ میں قوم کو محض دھوکا دے رہے ہیں۔ (مولانا نیازی اور پیر پگاڑا کی نوک جھونک کافی عرصہ تک جاری رہی۔) (روزنامہ جنگ کراچی، ۷ جنوری ۱۹۸۴ء)

(۸۰) ایضاً

(۸۱) روزنامہ جنگ کراچی، ۷ جنوری ۱۹۸۴ء

(۸۲) ایضاً،۳ جنوری ۱۹۸۴ء (۸۳) ایضاً

(۸۴) مابعد تحقیقات سے پتہ چلا کہ ۸۲-۱۹۸۱ کے لگ بھگ غلام مصطفیٰ جتوئی کھرنے مسلح افواج میں (خفیہ طور پر) ایس آر ڈی (Soldiers for the Restoration of Democracy) نامی ایک گروپ قائم کیا تھا۔ یہاں فوجی افسران پر مشتمل تھا جو جنرل ضیاء

الحق سے ناخوش تھے اور سمجھتے تھے کہ فوج کا کام ملکی سیاست میں دخل دینا نہیں بلکہ سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ وہ غلام مصطفیٰ جتوئی کھر کی قیادت میں کام کرنے کے لیے اس لیے تیار ہو گئے کیونکہ ان کے خیال میں وہ ایک دبنگ آدمی تھا اور جن اصلاحات کی فوج کے نزدیک ملک کو ضرورت تھی انہیں جیسا سیاسات دان ہی نافذ کرسکتا تھا۔ (ایضاً)

(۸۵) تفتیش کے ذریعے سترہ افراد کو مقدمہ بغاوت کا ملزم قرار دیا گیا۔ جس میں ۱۴ کا تعلق فوج سے اور تین کا تعلق سویلین سے تھا۔ جنوری ۱۹۸۵ء کے وسط میں ایک خصوصی عدالت میں اس سازش کے مقدمہ کا آغاز ہوا۔ اس خصوصی عدالت کے سربراہ کا نام میجر جنرل محمد حسین اعوان تھا۔ اس مقدمہ میں رضا کاظم اور دو فوجی افسران کیپٹن سبطین اور اسکواڈرن لیڈر طاہر مقصود وعدہ معاف گواہ بنے۔ یہ مقدمہ ۲۸ مئی ۱۹۸۵ء تک جاری رہا۔ ملزمان کے وکلاء کو استغاثہ پر جرح کرنے سے منع کرنے پر ملزمان نے عدالتی کارروائی کا بائیکاٹ کردیا۔ ۱۱ جولائی کو مقدمہ کے فیصلے کا اعلان ہوا۔ ۱۲ ملزمان کو شہادتیں دستیاب نہ ہونے پر باعزت طور پر بری کردیا گیا جبکہ میجر آفتاب چوہدری، میجر نثار حسین بخاری اور میجر محمد صادق کو ۲۵ سال اور اسکواڈرن لیڈر فتح محمد شراز اور میجر محمود اختر شیرازی کو دس دس سال قید کی سزا سنائی گئی۔ یہ بھی اسی عدالت کا کارنامہ تھا کہ کیپٹن سبطین اور اسکواڈرن لیڈر طاہر مقصود کو باوجود اس کے کہ وہ وعدہ معاف گواہ بنے تھے بالترتیب ۱۰ اور ۲۵ برس کی سزائیں سنائیں۔ بعد ازاں ۱۹۸۸ء میں جب پی پی پی کی حکومت برسر اقتدار آئی تو ان باغیوں کی سزائیں معاف کر کے انہیں رہا کردیا گیا (ایضاً، ۹ جنوری ۱۹۸۴ء)

واضح رہے کہ بے نظیر بھٹو اس سازش کے افشاء ہونے سے پہلے کان کے آپریشن کے سلسلے میں پیرس چلی گئی تھی۔ جسے بعض سیاسی حلقوں نے حکومت سے ڈیل سے تعبیر کیا۔ مثلاً پیر پگاڑا کا کہنا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے ملک سے چلے جانے کے بعد بھٹو خاندان کا ملکی سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں رہا۔ ایم آر ڈی کا مستقبل صفر ہے یہ نہ تو انتخابی اتحاد ہے نہ سیاسی جماعت ہے۔ تحریک نا کام ہوگئی ہے۔ اب یہ ایک سیاسی نہیں "معانی الائنس" بن کر رہ گیا ہے۔ سیاسی نظر بندوں کو رہا کرنے کا فیصلہ گٹھ جوڑ تحریک کے خاتمے کا فطری نتیجہ ہے۔ گٹھ جوڑ کی تمام تحریکوں کا انجام وہی ہوتا ہے جو ایم آر ڈی کا ہوا۔ (ایضاً، ۱۴ جنوری ۱۹۸۴ء) یہی وجہ تھی کہ بے نظیر کی پیرس روانگی پر ایم آر ڈی کی رکن پارٹیوں نے پیپلز پارٹی سے وضاحت طلب کرلی۔ (ایضاً، ۱۳ جنوری ۱۹۸۴ء)

(۸۶) ایضاً (۸۷) ایضاً

(۸۸) روزنامہ وفاق لاہور، ۱۱ مارچ ۱۹۸۴ء

(۸۹) ایضاً، ۱۵ مارچ ۱۹۸۴ء (۹۰) ایضاً (۹۱) ایضاً، ۱۰ ستمبر ۱۹۸۴ء

(۹۲) وہ ۱۹ ستمبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں مسلم لیگی رہنما احمد سعید کرمانی کی رہائش گاہ پر اپنے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ سے خطاب کر رہے تھے۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے ملکی بالخصوص اقتصادی صورتحال اور پاکستان کے بیرون ملک امیج کے حوالے سے کئی چشم کشا باتیں کہیں۔ ان کے بقول بیرون ملک پاکستان کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ افغان مہاجرین کی وجہ سے اس ملک کی اقتصادی حالت خراب ہے اور اسے مالی امداد کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ہیروئن کی اسمگلنگ کے سلسلے میں یورپی اور امریکی باشندے سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں ۱۹۸۰ء کے بعد منشیات کی پیداوار اور برآمد کے ساتھ ساتھ اندرون ملک بھی اس کی کھپت میں اضافہ ہوا ہے۔ جنگ کراچی، ۲۰ ستمبر ۱۹۸۴ء)

(۹۳) ایضاً، ۱۲ ستمبر ۱۹۸۴ء (۹۴) ایضاً، ۱۳ ستمبر ۱۹۸۴ء

(۹۵) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۵ ستمبر ۱۹۸۴ء

(۹۶) ایضاً، ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۴ء (۹۷) ایضاً، ۵ نومبر اور ۲۱ نومبر ۱۹۸۴ء

(۹۸) ایضاً، ۸ جنوری ۱۹۸۵ء (۹۹) ایضاً، ۱۴ دسمبر ۱۹۸۴ء

(۱۰۰) ایضاً، ۱۵ دسمبر ۱۹۸۴ء (۱۰۱) ایضاً (۱۰۲) ایضاً

(۱۰۳) روزنامہ وفاق لاہور، ۱۷ دسمبر ۱۹۸۴ء

(۱۰۴) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۰ دسمبر ۱۹۸۴ء

(۱۰۵) ایضاً

(۱۰۶) روزنامہ وفاق لاہور، ۱۵ دسمبر ۱۹۸۴ء

(۱۰۷) روزنامہ جنگ کراچی، ۵ جنوری ۱۹۸۵ء

(۱۰۸) ایضاً، ۶ جنوری ۱۹۸۵ء (۱۰۹) ایضاً، ۲۰ جنوری ۱۹۸۵ء

(۱۱۰) ایضاً (۱۱۱) ایضاً (۱۱۲) ایضاً

(۱۱۳) ایضاً، ۲۳ جنوری ۱۹۸۵ء (۱۱۴) ایضاً، ۲۸ جنوری ۱۹۸۵ء

(۱۱۵) ایضاً، ۳۰ مارچ ۱۹۸۵ء (۱۱۶) ایضاً، یکم اپریل ۱۹۸۵ء

(۱۱۷) ایضاً، ۲ اپریل ۱۹۸۵ء (۱۱۸) ایضاً (۱۱۹) ایضاً

(۱۲۰) چارلس ڈیگال: Charles Andre Joseph marie de Gaulle (1890-1970) فرانسیسی جرنیل اور سیاستدان، بیسویں صدی کے وسط کی ایک نمایاں عالمی شخصیت فرانس کے صدر رہے (۱۹۵۸ء۔۱۹۶۹ء) جو ۱۹۳۰ء کی دہائی کی Merchandized warfare کے حامی اور موید۔ جب انہوں نے ۱۹۳۴ء میں Vers l'armee de metier نامی کتاب لکھی۔ دوسری جنگ عظیم کے اوائل (۱۸۴۰ء) میں جنرل کے عہدہ پر ترقی پائی۔ Paul Reynaud کی کابینہ میں شمولیت اختیار کی لیکن Franco-Germanh Ammistice کی مخالفت کی۔ اس طرح Free French in London نامی تحریک کے رہنما بنے اور فرانسیسی حب الوطنی کی نمایاں علامت قرار پائے۔ اگرچہ Free French نے اتحادی جنگی حکمت عملی میں شجاعانہ کردار ادا کیا لیکن ڈی گال برطانیہ اور امریکہ پر فرانس کے انحصار پر بعد ازاں پچھتاتے رہے۔ یہ چپقلش (فرانس اور دیگر اتحادیوں کے خلاف) جنگ عظیم دوم کے بعد بھی چلتی رہی۔ ۱۹۴۳ء میں وہ نئی بننے والی Committee of National Lìberation in Algiers کے سربراہ بنے اور بعد ازاں ۱۹۴۴ء Allied Lìberation of France کی عبوری حکومت کے بھی سربراہ بنے جس کے وہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں صدر رہے لیکن ۱۹۴۶ء میں استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۴۷ء میں Due Pueple Francais نامی اتحاد بنایا جو Unsuccessful Re-essemblement ثابت ہوا۔ اس لیے اسے ۱۹۵۳ء میں توڑ دیا گیا۔

۱۹۵۸ء میں انہیں (ریٹائرمنٹ کے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کے بعد) الجیریا کے بحران سے نپٹنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ جہاں فرانسیسی آباد کار (جنہیں الجیریا کی آزادی کی ممکنہ قیام سے خطرات لاحق تھے) میں بغاوت پھوٹ پڑنے کا احتمال تھا۔

۱۹۵۹ء میں New fifth Republic کے صدر بنے اور الجیریا کی آزادی کی طرف نمایاں پیش رفت کی۔ ۱۹۶۲ء میں ان کے دور میں یورپی ریاستوں میں امیر کی اثر سے آزادی کا نظریہ فروغ پایا جس کے سب سے بڑے محرک وہ خود تھے۔ ۱۹۶۳ء میں Nuclear Test Ban Treaty پر دستخط سے انکار کیا اور ۱۹۶۶ء میں NATO کے ملٹری اسٹرکچر سے فرانس کو علیحدہ کر دیا۔ وہ VIC کی EEC کی رکنیت کے خلاف تھے۔ مئی ۱۹۶۸ء میں طلباء اور صنعتی بے چینی نے ان کی اندرون ملک پوزیشن کمزور کر دی اور ۱۸۶۹ء میں انہیں آئینی اصلاحات پر ریفرنڈم

میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح انہیں عدہ صدارت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ (The Macmillan Ency lopedia, 1996Ed., BCA, London, 1995, p-353.)

(۱۲۱) شاہ احمد نورانی اور شاہ فرید الحق کی جنگ فورم سے گفتگو، انٹرویو نظام صدیقی، ۱۵ اپریل ۱۹۸۵ء

(۱۲۲) ایضاً (۱۲۳) ایضاً (۱۲۴) ایضاً

(۱۲۵) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۵ مئی ۱۹۸۵ء

(۱۲۶) ایضاً (۱۲۷) ایضاً

(۱۲۸) بجلی، محمد آصف، سیاستدان، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۹-۱۴۲

(۱۲۹) ایضاً (۱۳۰) ایضاً، ص ۱۳۵-۱۳۶

(۱۳۱) روزنامہ جنگ، لاہور ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۵ء

(۱۳۲) ایضاً (۱۳۳) ایضاً، ۱۴ دسمبر ۱۹۸۵ء

(۱۳۴) مختار، شاہد، پاکستانی سیاست کی نصف صدی، ص ص ۱۳۲-۱۳۳

(۱۳۵) حسین، مجاہد، پاکستان کے متنازعہ سیاستدان، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ص ۳۳۵-۳۳۶

(۱۳۶) ایضاً، ص ۳۳۷

(۱۳۷) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۴ مارچ ۱۹۸۵ء

(۱۳۸) ایضاً، ۱۱۶ اپریل ۱۹۸۵ء

(۱۳۹) حسین مجاہد، بحوالہ سابقہ ص ۳۳۹

(۱۴۰) ایضاً (۱۴۱) ایضاً

(۱۴۲) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۰ جون ۱۹۸۵ء

(۱۴۳) ایضاً

(۱۴۴) جونیجو ضیاء اختلافات اس وقت اپنے عروج پر پہنچے جب محمد خان جونیجو نے اوجڑی کیمپ کے واقعہ کی غیر جانبدارانہ انکوائری کرانے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا۔ وہ جنرل ضیاء سمیت دیگر جرنیلوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ دوسرا واقعہ جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا وہ جنرل ضیاء بطور چیف آف آرمی سٹاف کی ملازمت میں توسیع کا معاملہ تھا۔ جنرل ضیاء کی ملازمت میں توسیع کے بارے میں بل جونیجو اسمبلی میں لانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے حکومت اور

اپوزیشن کے ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنانے کا فیصلہ بھی کیا تھا۔ اس کا جب صدر ضیاء کو پتہ چلا تو وہ بہت سیخ پا ہوئے۔ یہی دو واقعات بعد ازاں جونیجو اسمبلی کی تحلیل کا باعث بنے۔ (حسین، مجاہد، بحوالہ سابقہ، ص ۳۴۸)

(۱۴۵) ایضاً ص ۳۴۹

(۱۴۶) روزنامہ جنگ، ۳۰ مئی ۱۹۸۸ء، ومجاہد حسین بحوالہ سابقہ۔

(۱۴۷) مختار، شاہد، بحوالہ سابقہ، ص ۱۳۵۔۱۳۶

(۱۴۸) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۶ جنون ۱۹۸۸ء

(۱۴۹) حسین، مجاہد، بحوالہ سابقہ ص ۳۴۸۔

(۱۵۰) ایضاً ص ۳۴۱ (۱۵۱) ایضاً (۱۵۲) ایضاً

(۱۵۳) ایضاً (۱۵۴) ایضاً (۱۵۵) ایضاً

(۱۵۶) ایضاً (۱۵۷) ایضاً (۱۵۸) ایضاً

(۱۵۹) ایضاً

(۱۶۰) بھلی، بحوالہ سابقہ ص ۱۴۷۔

(۱۶۱) حسین، مجاہد، بحوالہ سابقہ، ص ۳۵۰۔

(۱۶۲) ایضاً (۱۶۳) ایضاً ص ۳۵۱۔

(۱۶۴) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۸ اگست ۱۹۸۵ء

(۱۶۵) ایضاً ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۸ء

(۱۶۶) حسین، مجاہد، بحوالہ سابقہ، ص ص ۱۸۰۔۱۸۱

(۱۶۷) ایضاً ص ۱۸۱ (۱۶۸) ایضاً ص ۱۸۲ (۱۶۹) ایضاً

(۱۷۰) ایضاً (۱۷۱) ایضاً

(۱۷۲) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۰ اگست ۱۹۸۸ء

(۱۷۳) حسین، مجاہد، بحوالہ سابقہ ص ۱۸۳

(۱۷۴) ایضاً ص ۱۸۴ (۱۷۵) ایضاً

(۱۷۶) ان میں (نواب عباسی گورنر پنجاب، لیفٹیننٹ جنرل فضل الحق گورنر سرحد، ائیر مارشل ریٹائرڈ رحیم خان، چیف آف نیول جوائنٹ سٹاف مسٹر کرامت رحمٰن نیازی، چیئرمین جوائنٹ سٹاف جنرل محمد

شریف، لیفٹیننٹ جنرل سوار خان، وائس ایڈمرل ریٹائرڈ اے آر خان، لیفٹیننٹ جنرل رحیم خان، جنرل محمد اقبال خان، جنرل محمد موسیٰ، لیفٹیننٹ جنرل ایم ایم عباسی، لیفٹیننٹ جنرل فضل الحق (چار مرتبہ) لیفٹیننٹ جنرل رحیم گل، سابق ائر مارشل نور خان، لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ عبد الحمید خان، وائس ایڈمرل ریٹائرڈ ایم ایم ایس چوہدری، وائس ایڈمرل مظفر حسن، محمد انور شمیم ائیر چیف مارشل، سابق لیفٹیننٹ جنرل رحیم الدین (دو مرتبہ)، سابق میجر جنرل ریٹائر عبد الرحمٰن خان (صدر آزاد کشمیر) لیفٹیننٹ جنرل جہاں داد خان (دو مرتبہ) شامل تھے۔) (ایضاً ص ص ۱۸۵۔۱۸۶)

(۱۷۷) ان ارکان پارلیمنٹ میں رانا شوکت حیات نون، سینیٹر صاحبزادہ الیاس، گورنر قطب الدین خان، چوہدری امام اللہ بھروانہ، میر محمد عارف جان، سابق کیپٹن ثناء اللہ، چوہدری محمد نواز بوسال، ملک غلام احمد مجتبیٰ عازی کھر، سردار وزیر احمد جوگیزئی، دل مراد جمالی، سابق کرنل ایس ڈبلیو ہربرٹ، امان اللہ خان شاہانی، حمید خان، حاجی نادر شاہ، میر خدا داد خان ملک، حاجی جاوید اقبال عباسی، سینیٹر محمد علی خان ہوتی، سردار محمد سرفراز، نواب امان اللہ خان سیال، سید منظور حسین شاہ، چوہدری محمد بشیر رندھاوا، محمد عبد اللہ غازی، فیروز الدین انصاری، میاں ریاض احمد سردار محمد جہانگیر خان، پیر علی گوہر شاہ، چوہدری ممتاز احمد جام، آغا عطا محمد خان، میر مہران خان بجارانی، شہاب الدین شاہ، حاجی خیر محمد، محمد قاسم خان، یعقوب خان جدون، سیٹھ چمن داس، مسز ریحانہ علیم مشہدی، بیگم بلقیس شہباز، مس نور جہان پانیزئی، بریگیڈیئر ریٹائرڈ افتخار بشیر، سابق بریگیڈیئر محمد اصغر، محمد اکرم خان، پیر ثناء اللہ بودلہ، نواب یامین، میر نواز خان مروت، عطا محمد میر، ملک عبد الرؤف، صاحبزادہ محمد احمد، علامہ مصطفیٰ الازہری، غلام الدین خان مروت، بیگم بلقیس نصر من اللہ، گوہر ایوب، سینیٹر نواب زادہ شیخ محمد عمر، فتح محمد خان، ایم پی بھنڈارا، بیگم سلمیٰ احمد، میاں محمد آصف، سینیٹر مولانا سمیع الحق، راجہ محمد افضل خان، چوہدری محمد سرور، مسز فرخ مختار، صاحبزادہ محی الدین، ایم ایوب خان، سینیٹر اسحاق بلوچ، پو بروئل، فضل داد خان، محمد صالح خان، لیلیٰ، عارف حسین، صاحبزادہ نور الحسن، رائے صالح الدین خان، سینیٹر ذوالفقار علی چشتی، مقبول احمد خان، سینیٹر ملک گلاب خان، سینیٹر محمد عبد القیوم خان، سینیٹر محمد ہاشم خان، غلام محمد احمد خان، پیر محمد صابر شاہ، سینیٹر عبد الحمید قاضی، سینیٹر ملک سعد اللہ خان، رانا تنویر حسن، مول داد خان، سینیٹر حسین بخش، سینیٹر یوسف خان ساسولی، سینیٹر محمد خان، خیر محمد برگھری، قمر الزمان کھگہ، خواجہ محمد صفدر، بیگم سروری صادق،

سردار مسعود احمد خان لغاری، سینیٹر غلام محمد خان ماہر، سینیٹر سابق بریگیڈیئر عبد القیوم، مولانا محمد رحمت اللہ، بھگوان داس چاولہ، گل جی، میر ظفر اللہ خان جمالی، حاجی فضل مان، ڈاکٹر شفیق چوہدری، ملک نادر خان، سینیٹر ملک فرید اللہ خان، غلام محمد چشتی، بیگم نسیم مجید، رائے منصب علی، سینیٹر عبد الرحیم جالمی، سینیٹر منیر آفریدی، سینیٹر حبیب اللہ میمن، سینیٹر محمد افضل، ملک محبوب حسین، سینیٹر احمد میاں سومرو، ممتاز احمد تارڑ، چوہدری امیر حسین، سینیٹر پیر شجاعت حسین قریشی، امان ظفر، انور علی چیمہ، سینیٹر میاں امیر حیدر قریشی، سینیٹر سید خیل میاں، اسلام الدین شیخ، سینیٹر ملک عبد الوحید فہمید، حاجی خیال شاہ، حاجی نور شیر خان، ملک عمر دین، بنگش، سینیٹر امان اللہ شامل تھے۔ (ایضاً، ۱۸۷)

(۱۷۸) ایضاً (۱۷۹) ایضاً (۱۸۰) ایضاً

(۱۸۱) ایضاً ص ص ۱۸۷، ۱۸۸

(۱۸۲) روزنامہ جنگ کراچی، یکم جنوری ۱۹۸۶ء

(۱۸۳) ایضاً ص ۱۸۸ (۱۸۴) ایضاً ص ۱۸۹ (۱۸۵) ایضاً

(۱۸۶) چیئرمین پبلک اکاؤنٹس کمیٹی سردار زادہ محمد علی شاہ کے بقول پاکستان کے بعض حکام بیرونی سودی کاروبار میں اپنی کمیشن عبادت کی طرح وصول کرتے تھے۔ بڑے بڑے جاگیرداروں کے ذمے کروڑوں روپے کے قرضے معاف کردیئے گئے۔ لیکن ان کے نام اور اصل کوائف ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔

اسی طرح صوبائی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی اور آڈیٹر جنرل آف پاکستان کی رپورٹوں میں بھی سرکاری محکموں میں پائی جانے والی سنگین بدعنوانیوں اور قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ پر مبنی چند انکشافات ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

۱۔ پنجاب پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے ۵۰ ارب روپے کے خرد برد کا انکشاف کیا۔

۲۔ وفاقی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے مطابق ملک کے سرکاری محکموں میں ہر سال ۴۰ ارب روپے کا گھپلا ہورہا تھا۔

۳۔ ایک سرکاری دستاویز کے حوالے سے سالانہ ایک کھرب روپے کے ٹیکس چوری ہورہے تھے۔

۴۔ ۸۳ ارب روپے کے قرضوں کی مختلف قسم کے دباؤں کی وجہ سے عدم ادائیگی۔

۵۔ جعلی سرمایہ کار کمپنیوں کا قیام اور ایک ارب روپے کا فراڈ۔

۶۔ ری ہیبٹ کی مد اور بینکوں میں کروڑوں کا فراڈ۔

۷۔ پنجاب کے ۷ محکموں میں ۸ کروڑ ۶۳ لاکھ روپے کا فراڈ۔

۸۔ ریلوے کو سالانہ چار ارب روپے کا خسارہ۔

۹۔ افراط زر کی وجہ سے زیر گردش نوٹوں کی تعداد میں ایک ارب ۷ کروڑ روپے کا اضافہ۔

مندرجہ بالا حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ ضیاء الحق اپنے گیارہ سالہ دور کی سنگین بدعنوانیوں کے گاڈ فادر کے طور پر سامنے آئے لیکن وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا اعداد و شمار ضیاء دور کی مجموعی بدعنوانیوں کا محض کچھ فیصدی ہے۔ کیونکہ ابھی تک ضیاء دور کی بدعنوانیاں پر بہت بھاری پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بدعنوانیوں کے مجموعی طور پر افشا ہوجانے سے ایک ایسا قومی ادارہ براہ راست تنقید کی زد میں آتا ہے جس کی بدعنوانیوں کے بارے میں کھل کر لکھنا یا ان بدعنوانیوں کے بارے تحقیق کرنا ابھی تک رواج نہیں پاسکا۔ (ایضاً)



مولانا شاہ احمد نورانی اور پاکستان عوامی اتحاد

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاء الحق کی اعلیٰ فوجی افسران کے ہمراہ فضائی حادثے میں ہلاکت کی وجہ سے ملکی سیاسی فضا نے اچانک پلٹا کھایا (۱) اور ملک میں سیاسی عمل کی ایک دفعہ پھر بحالی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ قبل ازیں ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو جونیجو۔ ضیاء اختلافات قومی اسمبلی کی تحلیل پر منتج ہوئے تھے اور ضیاء الحق کے غیر جماعتی انتخابات پر اصرار نے ایک دفعہ پھر ۱۹۸۵ء والی صورتحال پیدا کر دی تھی۔ جس سے ملک کی سیاسی فضا پر جمود طاری ہو گیا تھا۔ تاہم ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو ہی سینٹ کے چیئرمین غلام اسحاق خان نے آئین کے تحت پاکستان کے قائم مقام صدر کی ذمہ داریاں سنبھال لیں (۲) انہوں نے اپنی نشری تقریر میں قوم کو تسلی دی اور کہا کہ پاکستان کا ہر شہری قومی ابتلاء کی اس گھڑی میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے گا اور اس کے تقاضے پورے کرنے میں پوری استقامت اور پامردی کا ثبوت دے گا (۳)۔ انہوں نے چیف آف آرمی اسٹاف کے عہدے پر جنرل مرزا اسلم بیگ کی تقرری کی (۴) اور جمہوری عمل کی بحالی پر یقین ظاہر کیا اور کہا کہ ان شاء اللہ انتخابات طے شدہ پروگرام کے مطابق ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کو ہی ہوں گے (۵)۔

سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو نے اسمبلی کی بحالی کے متعلق سپریم کورٹ کے فیصلے سے مایوس ہو کر دیگر سیاسی جماعتوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ جونیجو حکومت کو کیوں بحال نہیں کیا گیا؟ یہ سوال ہنوز جواب طلب ہے۔ کیا جونیجو کو محض اس لیے بحال نہیں کیا گیا کہ قبل ازیں وہ مارشل لاء کی چھتری تلے کام کر چکے تھے یا بدلتی ہوئی ملکی صورتحال کے تحت بالخصوص انتخابات نومبر ۱۹۸۸ء کے اعلان کی وجہ سے عدالت نے اسمبلی کی بحالی کا حکم نہیں دیا۔ یا یہ کہ فاضل عدالت کے علم میں جونیجو حکومت کی سابقہ کارکردگی بھی تھی جس کی بناء پر اس کرپٹ حکومت کی بحالی کا تکلف روا نہیں رکھا گیا۔

سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو نے جب غیر سیاسی اور غیر جماعتی اسمبلی کو ''مسلم

لیگ اسمبلی" میں تبدیل کیا تو اس میں تین طرح کے لوگ نمایاں طور پر دیکھنے میں آئے تھے۔ ایک تو سابق مسلم لیگ کے وہ ارکان تھے جو جونیجو کے قریبی ساتھی گردانے جاتے تھے۔ دوسرے وہ ارکان اسمبلی جو پہلے پیپلز پارٹی پیپلز پارٹی کا حصہ تھے یا پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے اسمبلیوں کے رکن منتخب ہو چکے تھے۔ یہ وہ افراد تھے جو سیاست کو صرف حصول اقتدار کا ذریعہ ہی سمجھتے تھے ان کا مقصد وحید محض اسمبلیوں تک پہنچنا اور پھر وزارت حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہوتا ہے۔ ان کا تعلق اس بے جڑ طبقے سے تھا جو روز اوّل ہی سے مسند اقتدار پر کسی نہ کسی نام سے فائز رہا ہے۔(۶)۔ اس لیے ان افراد کے لیے وفاداریاں تبدیل کرنا پیشہ ورانہ تقاضوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لیے ان کی سیاسی لغت میں "انتخابات کے بغیر سیاست" یا "اقتدار کے بغیر سیاست" جیسے الفاظ جگہ نہیں پاتے (۷)۔ اس نوزائیدہ حکومتی مسلم لیگ میں تیسرا گروہ ان چند ارکان اسمبلی پر مشتمل تھا جنہوں نے "غیر جماعتی انتخابات" جماعتی بنیاد پر لڑے تھے اور اپنے مکمل وسائل اور قوت استعمال کر کے ۱۹۸۰ء کی قومی اسمبلی میں ۸ اور صوبائی اسمبلیوں میں ۱۸ نشستیں حاصل کی تھیں (۸)۔☆

جنرل ضیاء الحق کی ان غیر جماعتی و غیر سیاسی اسمبلیوں میں چوتھا گروہ ان افراد پر مشتمل تھا جو جنرل صاحب کی اپنی دریافت تھے۔ جن کی جنرل ضیاء نے آمروں کے آزمودہ ہتھکنڈے استعمال کر کے بڑی محنت سے پرورش کی تھی۔ غاصب جب بھی مسند اقتدار پر براجمان ہوتے ہیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ایسے افراد ڈھونڈیں جو یا تو سابقہ حکمرانوں کے مخالفین میں سے ہوں یا ایسے نااہل اور غیر اہم و غیر نمایاں افراد جو "اہمیت و حیثیت" حاصل کرنے کے خواہشمند ہوں (۹)۔ ایسے ہی لوگوں کو آمر آگے بڑھا کر ایک وفادار اور قابل اعتماد طبقہ پیدا کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی چونکہ جڑیں عوام میں اتنی گہری نہیں ہوتیں یا اپنے شعبوں میں یہ افراد نااہل ہوتے ہیں اس لیے اپنی مشکوک اہلیت کے سبب یہ ہمیشہ مارشل لاء کے احسان مند رہتے ہیں اور مارشل لاء کے دست و بازو بن جاتے ہیں۔ چنانچہ جنرل ضیاء الحق نے جو مجلس شوریٰ، ۱۹۸۵ء کی اسمبلی سے پہلے نامزد کی تھی اس میں غالب اکثریت ایسے ہی افراد کی تھی جو عوامی حمایت سے محروم تھے۔ جس کی وجہ سے اسے

☆ جماعت اسلامی وہ جماعت ہے جس کے امیدواروں کی ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں سابق مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں سیاسی جماعتوں میں سب سے زیادہ ضمانتیں ضبط ہوئی تھیں۔

مجلس شوریٰ کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو مارشل لاء کو عوام کی نظروں میں قابل اعتماد اور قانونی بنا سکے (۱۰)۔ جونیجو اسمبلی میں محض "جمہوری خانہ پری" کے لیے تشکیل دی گئی تھی اور وزیر اعظم کے عہدے کے لیے محمد خان جونیجو کا انتخاب بھی ماضی میں ایوب حکومت سے ان کے وفاداریوں کے پیش نظر کیا گیا تھا (۱۱)۔

جونیجو حکومت کے دوران میں تین واقعات و حادثات ایسے تھے جن میں حکومتی فیصلے نہایت اہمیت کے حامل تھے۔ ان تینوں مواقع پر وزیر اعظم نے آزادی اور خود مختاری سے فیصلے کر کے صدر کے لیے خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ جو براہ راست "ضیاء سوچ" کے خلاف تھے۔ دوسرے انہوں نے افغان مسئلے پر جسے جنرل ضیاء اپنی زندگی کا سب سے سنہری کارنامہ سمجھتے تھے اور کابل میں بطور فاتح کے داخل ہونے کے تصورات میں گم تھے، جونیجو نے اقوام متحدہ کے تحت جنیوا معاہدہ پر دستخط کر کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے پروگرام کو گڑ بڑ کر دیا۔(۱۲)☆

تیسرا حادثہ اوجڑی کیمپ ۱۰ اراپریل ۱۹۸۸ء کا ہے جس کے بارے میں وزیر اعظم جونیجو نے اپنے طور پر تحقیقات کا حکم دے دیا (۱۳)۔ جنرل ضیاء کو ایک "کٹھ پتلی وزیر اعظم" کی یہ خود مختاری پسند نہیں آئی۔ جس بناء پر ان کی حکومت اور منتخب اسمبلیاں نااہلی، بد یانتی، اقرباء پروری اور اسلام سے سرد مہری اور ایسے ہی الزامات کی ایک طویل فہرست پیش کر کے توڑ دی گئیں اور ایک بار پھر غیر سیاسی اور غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ (لیکن ان کے انعقاد سے پیشتر ہی فضائی حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا) (۱۴)۔

جنرل ضیاء کی حادثاتی موت نے ان کے حامیوں کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ جبکہ پیپلز پارٹی جو طویل عرصے سے مارشل لاء کی سختیاں تقریباً سب برداشت کر رہی تھی ایک بار پھر عوام کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ قبل ازیں جونیجو دور میں بے نظیر جب ۱۰ اراپریل ۱۹۸۶ء کو جلا

☆ اگرچہ جونیجو کا یہ فیصلہ تاریخ پاکستان کا ایک متنازعہ پہلو ہے۔ بعض حلقوں کے نزدیک جونیجو کی عجلت سے افغانستان میں بعد ازاں خانہ جنگی کو جنم دیا کیونکہ ضیاء الحق روسی فوج کے انخلاء کے بعد یا مستحکم افغان حکومت کا قیام چاہتے تھے۔ ضیاء کی اسی خواہش نے اسے امریکی نظروں میں گرا دیا جو بعد ازاں ان کے فضائی حادثے پر منتج ہوا۔

وطنی ختم کر کے آئیں تو عوام نے انہیں نا قابل تصور پذیرائی بخشی (۱۵) ☆۔ کیونکہ بھٹو کو دی جانے والی پھانسی کو سیاسی رنگ ملنے کی وجہ سے عوام کی ہمدردیاں فطری طور پر بے نظیر کے ساتھ تھیں۔ (یہ امر بھی طے شدہ ہے کہ اگر بے نظیر کی جگہ میر مرتضیٰ بھٹو یا شاہنواز بھٹو بھی آیا ہوتا تو عوام انہیں بھی اتنی ہی پذیرائی بخشتے۔) یہاں مولانا شاہ احمد نورانی کی اس سیاسی بصیرت کا حامل تبصرہ دہرانا برمحل ہوگا جو انہوں نے ضیاء کے مارشل لاء کے نفاذ اور الیکشن کے بار بار التوا پر کیا تھا کہ پیپلز پارٹی کل کی ظالم ہے لہٰذا آج مظلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر جنرل ضیاء حسب وعدہ ۹۰ روز کے اندر اندر الیکشن کرا دیتے تو یقیناً پیپلز پارٹی کو شکست ہو جاتی کیونکہ پاکستان قومی اتحاد سے معاہدہ کے سلسلے میں ٹال مٹول سے کام لے کر بھٹو، عوام کی نظروں میں گر چکے تھے جسے مارشل لاء کی سختیوں اور عام پارٹی کارکنوں پر کیے جانے والے مظالم نے ایک بار پھر ہیرو بنا دیا تھا (۱۶)۔

۱۰/اپریل ۱۹۸۶ء سے لے کر ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء تک پیپلز پارٹی میں مارشل لاء کے دوران ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کا جائزہ لینے اور پارٹی تنظیم پر توجہ دینے کی بجائے پیپلز پارٹی ایک بار پھر جلسے جلوس کی سیاست پر توجہ دینے لگی (کیونکہ مرحوم بھٹو کی عوامی ہمدردی کو کیش کرنے کا اس سے حسین موقع نہیں تھا چنانچہ اگلے آٹھ سے دس سال پیپلز پارٹی نے بھٹو کی لاش پر اپنے سیاسی کاروبار کو خوب چمکایا)۔ تاہم جب انتخابات کا موقع آیا تو عوام کو پارٹی سے پہلے مایوسی اس وقت ہوئی جب پارٹی نے ایسے بے شمار لوگوں کو گلے لگا کر اہم مقام دیا اور گیارہ سال تک سزائیں بھگتنے والے کارکنوں کو نظر انداز کر کے موقع پرستوں کی اہمیت دی (۱۷)۔

ان دنوں اگر دونوں اکثریتی صوبوں پنجاب اور سندھ کی سیاست کا جائزہ لیا جائے تو ایک پہلو زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے کہ مارشل لاء اور بالخصوص ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات نے ملکی یکجہتی اور صوبائی ہم آہنگی کے عمل کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ پنجاب میں اگر ضیاء کے حامیوں کو عروج حاصل تھا تو سندھ کو پی پی کے گڑھ کی حیثیت حاصل تھی۔ اس سے

☆ محترمہ بے نظیر بھٹو کو مارچ ۱۹۸۱ء میں نظر بند کیا گیا تھا اور ان کی نظر بندی میں ۱۹۸۴ء تک توسیع کی جاتی رہی۔ ۱۰ جنوری ۱۹۸۴ء کو وہ نظر بندی کے دوران ہی علاج (کان کا آپریشن) کے لیے پاکستان سے باہر (فرانس) چلی گئیں۔ (شاہد مختار، بحوالہ سابقہ، ص ۱۳۴)

پنجاب سندھ کشمکش کا آغاز بھی ہوا (۱۸)۔ جو وفاق کے لیے خطرے کی علامت تھا۔ پھر سندھ میں پی پی کا زور توڑنے کے لیے حکومتی سرپرستی میں مہاجر قومی موومنٹ کے قیام نے سندھ کو اندرونی طور پر انتشار میں مبتلا کر دیا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ ایم کیو ایم کا عفریت اتنا منہ زور ہو گیا کہ سندھ کے اندر "جناح پور" کے نام سے ایک الگ ریاست کے قیام (حتیٰ کہ مجوزہ ریاست کے نقشے تک برآمد ہوئے) کی بھی باتیں ہونے لگیں۔

ایم کیو ایم نے (جس کے قیام کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا) جلد ہی دھونس، جبر اور تشدد کی سیاست بالخصوص کلاشنکوف کلچر کی مدد سے استفادہ کرتے ہوئے سندھ کے شہری علاقوں کراچی اور حیدر آباد میں بالادستی حاصل کر لی۔ جس کا عملی مظاہرہ ۳۱/اکتوبر ۱۹۸۶ء کو کراچی میں سہراب گوٹھ کے مقام پر مہاجروں کے پٹھانوں کے ساتھ تصادم کی صورت میں سامنے آیا جس کے نتیجہ میں ۸/افراد ہلاک اور پندرہ شدید زخمی ہوئے۔ بعد ازاں حالات اتنے خراب ہو گئے کہ حکومت کو ۱۲ دسمبر ۱۹۸۶ء کو سہراب گوٹھ میں آپریشن کلین اپ کرنا پڑا۔ لیکن حالات پر پھر بھی قابو نہ پایا جا سکا۔ آپریشن کے دوران بھی ۱۴/دسمبر ۱۹۸۶ء کو (آپریشن کے آغاز کے محض دو روز بعد) اورنگی ٹاؤن میں شرپسندوں نے علی گڑھ کالونی پر حملہ کر کے سینکڑوں افراد کو ہلاک کر دیا۔ دھونس اور دھاندلی کی اسی سیاست کو بروئے کار لا کر ایم کیو ایم نے آئندہ کے بلدیاتی انتخابات منعقدہ ۳۰ نومبر ۱۹۸۷ء کو کراچی اور حیدر آباد میں "فقید المثال" کامیابی حاصل کر لی۔ (۱۹۸۸ء کے انتخابات میں ایم کیو ایم کی کامیابی بھی انہی بلدیاتی انتخابات کی کامیابی کا ہی تسلسل اور کرشمہ تھا)۔ کراچی اور حیدر آباد جو کہ کبھی جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے پاکستان کے گڑھ ہوا کرتے تھے۔ لسانی اور قومیتی بنیادوں پر ایم کیو ایم کی طاقت کے مراکز میں تبدیل ہو گئے تھے۔

پاکستان عوامی اتحاد کا قیام

۱۹۸۸ء میں پیپلز پارٹی کا زور توڑنے کے لیے (بالخصوص اس خدشہ کے پیش نظر کہ کہیں پیپلز پارٹی کو ۱۹۷۷ء سے پہلے والی مقبولیت حاصل نہ ہونے پائے جس میں اسے اندھی عوامی حمایت حاصل تھی)، ۵/اکتوبر ۱۹۸۸ء کو اس کے مدمقابل ایک نئی انتخابی قوت تشکیل پائی جسے "اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی)" کا نام دیا گیا اور غلام مصطفیٰ جتوئی کو سربراہ بنایا گیا۔

چونکہ یہ اتحاد مقتدر قوت کے خفیہ اشارے پر تشکیل پایا تھا۔ اس لیے مولانا شاہ احمد نورانی نے اس سے کنارہ کشی اختیار کیے رکھی۔ لیکن انہوں نے دیگر ہم خیال جماعتوں سے روابط جاری رکھے۔ جن میں مسلم لیگ اور تحریک استقلال خصوصیت سے قابل ذکر تھیں۔ آپ کی ان کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۵/ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو جمعیت علمائے پاکستان، مسلم لیگ اور تحریک استقلال پر مشتمل ایک نیا سیاسی اتحاد وجود میں آیا جسے ''پاکستان عوامی اتحاد'' کا نام دیا گیا(۱۹)۔ اس سیاسی اتحاد کے لیے تمام مذاکرات جمعیت علمائے پاکستان کے مرکزی دفتر لاہور میں مکمل ہوئے۔ ۵/ اکتوبر کو ہی مذکورہ سیاسی جماعتوں کے ایک مشترکہ اجلاس میں معاونت کرنے والی ذیلی کمیٹیوں نے نشستوں کی تقسیم سے متعلق تمام فیصلہ کن امور باحسن و خوبی طے کر لیے(۲۰)۔ ۸/ اکتوبر کو چیف الیکشن کمشنر مسٹر جسٹس ایس اے نصرت نے انتخابی شیڈول کا اعلان کر دیا(۲۱)۔ جس کے تحت قومی اسمبلی کے انتخابات ۱۶/ نومبر جبکہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ۱۹/ نومبر کو ہونا قرار پائے (۲۲)۔ اس سے اگلے دن ۳۰ جماعتوں کو انتخابی نشان الاٹ کر دیے گئے (جبکہ ۲۷ درخواستیں ٹیکنیکی بنیادوں پر مسترد کر دی گئیں) پاکستان پیپلز پارٹی کو تیر، اسلامی جمہوری اتحاد کو سائیکل جبکہ پاکستان عوامی اتحاد کو ٹریکٹر کے نشانات الاٹ کیے گئے (۲۳)۔☆

قبل ازیں ۲۶/ اگست ۱۹۸۸ء کو مسلم لیگ (سرکاری دھڑے) کے انتخابات میں خان فدا محمد خان (جن کا تعلق ☆☆ صوبہ سرحد سے تھا) کو صدر، جبکہ مسٹر نواز شریف (ان دنوں نگران وزیر اعلیٰ پنجاب) کو سیکریٹری جنرل منتخب کر لیا گیا۔ محمد خان جونیجو کی اپنی مسلم لیگ کے ساتھ پاکستان عوامی اتحاد میں شمولیت کی دو وجوہات تھیں۔ اولاً سپریم کورٹ نے اسی دن (۵/ اکتوبر کو جس دن پاکستان عوامی اتحاد وجود میں آیا تھا) یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ [اگرچہ ہائی کورٹ کا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ء اسمبلیاں توڑنے کے اقدام کو غیر آئینی قرار دینے کا فیصلہ برقرار رہے گا لیکن] اسمبلیاں بحال نہیں ہوں گی۔ اس طرح انہوں نے مایوسی کے عالم میں اتحاد میں

☆ مزید برآں جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) کو کتاب، اے این پی کو لالٹین، بلوچستان نیشنل الائنس کو آری، اور پی ڈی پی کو چھتری کے نشانات الاٹ ہوئے۔

☆☆ واضح رہے کہ انتخابات ۱۹۸۸ء میں صرف دو اتحادوں نے ہی شرکت کی تھی۔ اسلامی جمہوری اتحاد اور پاکستان عوامی اتحاد۔ باقی سیاسی جماعتوں نے انفرادی سطح پر انتخابات میں حصہ لیا تھا۔

شمولیت اختیار کی۔ ثانیاً ۲۳/ اگست ۱۹۸۸ء کو مسلم لیگ کے اتحاد کے لیے اسلام آباد میں ہونے والے مذاکرات ناکام ہو گئے تھے جبکہ مسلم لیگ کے سرکاری دھڑے نے ۲۶/ اگست کو انتخابات مکمل کر لیے تھے۔ ان وجوہات کی بناء پر جونیجو کے لیے کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ کسی اور اتحاد کی طرف دیکھتے۔ (تاوقتیکہ انہیں آئی جے آئی میں شمولیت کا اشارہ نہیں مل گیا۔)

مسلم لیگ کے سرکاری دھڑے اور مسلم لیگ جونیجو گروپ نے اگرچہ ابھی تک اتحاد کی کوشش ترک نہیں کی تھی تاہم انتخابی عمل شروع ہوتے ہی دونوں اطراف کی قیادت نے اس سلسلے میں کوششیں تیز کر دیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر ۱۴/ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو مسلم لیگ متحد ہو گئی (۲۴)۔ خان فدا محمد خان اور میاں نواز شریف اپنے جماعتی عہدوں سے مستعفی ہو گئے۔ نئے سیٹ اپ میں مسلم لیگ کی صدارت محمد خان جونیجو جبکہ سیکریٹری جنرل شپ کا عہدہ خان اقبال احمد کو دیا گیا۔ چونکہ اب صورتحال تبدیل ہو چکی تھی اس لیے ۱۸/ اکتوبر کو مسلم لیگ (جونیجو گروپ) نے پاکستان عوامی اتحاد سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا (۲۵)۔ اس طرح پاکستان عوامی اتحاد اپنی قیام کی محض تیرہ دنوں کے اندر اندر شدید بحران کا شکار ہو گیا۔ چونکہ اب انتخابی عمل شروع ہو چکا تھا۔ انتخابی نشانات الاٹ ہو چکے تھے۔ قومی اسمبلی کے لیے کاغذات نامزدگی داخل کرانے کا مرحلہ مکمل ہو چکا تھا۔ اس لیے اتحاد کی وسعت کی کوششیں بے کار تھیں۔ اس لیے پاکستان عوامی اتحاد نہایت مایوسی کے عالم میں میدان سیاست میں اترا۔ کراچی میں ایم کیو ایم کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی وجہ سے مولانا شاہ احمد نورانی اپنے انتخابی حلقہ میں بری طرح ہار گئے۔ تاہم جمعیت علمائے پاکستان کو ان انتخابات میں قومی اسمبلی کی تین نشستوں پر کامیابی ہوئی۔ پاکستان عوامی اتحاد اور جے یو پی کی ناکامی کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا نورانی نے کہا:

جے یو پی کو سب سے زیادہ نقصان سیاست میں تشدد کے آنے سے پہنچا۔ ۱۹۸۸ء میں انتخابی مہم کے دوران ہم ایک بھی جلسہ بھی کر سکے جبکہ ایم کیو ایم نے بڑے بڑے جلسے منعقد کروائے۔ ہماری پوری انتخابی مہم بغیر جلسوں کے ہوتی رہی۔ چھوٹی موٹی کارنر میٹنگز تو ہم کر لیا کرتے تھے لیکن ان لوگوں (ایم کیو ایم) نے ہمارا ایک بھی جلسہ نہیں ہونے دیا۔ چونکہ ہم لوگ کلاشنکوف کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے بے دھڑک ہو کر اپنے بڑے بڑے جلسے منعقد کیے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان کے جو نعرے ''مہاجر جئے مہاجر'' ''مہاجر سپر

پاور"، "حقوق یا موت" تھے۔ ان کا زہر اتنا تھا کہ ہم اس کا کوئی توڑ نہیں کر سکے اور نہ ان کو دبا سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جمہوریت کی اصل پہچان تو تبھی ہوتی ہے کہ جب لوگوں کو اپنا نمائندہ بنانے کی آزادی دی جائے اور جب ایسا نہ ہو تو اصل قیادت کیسے سامنے آ سکتی ہے۔(۲۶)

جہاں تک اس بات کا تعلق تھا کہ کراچی کی دو بڑی مذہبی جماعتوں، جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اسلامی کے مقابلے میں ایک سیکولر جماعت نے لے لی یا بالفاظ دیگر وہ لوگ جو مذہبی جماعتوں کے ساتھ تھے انہوں نے ایک سیکولر کا ساتھ کیسے دیا۔ اس صورتحال کی وضاحت انہوں نے یوں کی:

...... جماعت اسلامی (۱۹۸۷ء کے بلدیاتی انتخابات سے قبل) بلدیاتی اداروں پر قابض تھی۔ اس لیے وہ الیکشن میں صحیح طور پر کام نہیں کر سکی۔ (یعنی مطلوبہ نتائج نہیں دے سکی) یہ لوگ آٹھ برس تک اقتدار میں رہے تو شہریوں کو بنیادی ضروریات صحیح طور پر فراہم نہیں کر سکے۔ دراصل وہ اپنی پارٹی کے خول سے باہر نہیں نکل سکے۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی والے حلقے بھی انہیں کہتے تھے کہ آپ اس جگہ غلط کر رہے ہیں لیکن جماعت کا جو دائرہ تھا، وہ اسی میں رہے۔ ان (ایم کیو ایم والوں) کے ذہن میں تھا کہ جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اسلامی چونکہ مذہبی جماعتیں ہیں اس لیے وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ ان لوگوں نے تعصب پھیلانے کے ساتھ ساتھ اپنے (مہاجر) حقوق کے چمپئن بننے کا دعویٰ بھی کیا۔ ہمارا موقف تھا کہ ہم اپنے حقوق جائز طریقے سے لینا چاہتے ہیں جبکہ ایم کیو ایم والے دوسرے طریقے (تشدد کے ذریعے) سے لینا چاہتے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ وہ غنڈہ گردی سے اپنے حقوق لے سکتے ہیں لیکن مذہبی تنظیمیں یہ حقوق نہیں لے سکتیں اور پھر انہوں نے کلاشنکوف والی سیاست کو اپنے لیے بہتر سمجھا۔ ہم یہ کہتے رہے کہ راجستھان سیکٹر کو بند کیا جائے لیکن اس طرح کسی نے دھیان نہیں دیا لیکن حکومت اب اس نتیجے پر پہنچی ہے اور اس راستے کو بند کر دیا ہے...... دوسرا ہمارا مطالبہ تھا کہ دہشت گردوں نے اپنے ٹارچر سیل بنا رکھے ہیں وہاں وہ لوگوں کو سزائیں دیتے ہیں، قتل کرتے ہیں (ان کو بند کیا جائے) بہر حال وقت نے ثابت کر دیا کہ ہمارے مطالبے درست تھے۔ اخبارات میں تو یہ سب چیزیں آئیں لیکن افسوس ٹی وی پر وہ سب کچھ نہیں دکھایا گیا۔ وہاں مظلوم لوگوں نے چیخ چیخ کر فریادیں

کیں کہ کس طرح ان کے بچوں کی آنکھیں نکالی گئیں، ٹانگوں میں ڈرل مشین سے سوراخ کیے گئے اور برآمدگی بہت سست ہے، یہ بڑا خطرناک ہے۔ یہ تو ایسا ہے کہ سانپ کی دم پر پاؤں رکھ دیا ہو...... جو جس بوتل سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے، اس کو جب تک ختم نہیں کریں گے تو آپریشن کے فوائد سب ختم ہو جائیں گے اور آگے چل کر ملک خانہ جنگی کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے پاس اسلحہ اتنا موجود ہے کہ وہ انتقامی سیاست پر اتر آئیں گے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا انتقامی ذہن ہے۔ وہ اپنے مخالفین کو اگر اس قسم کی سزائیں دے سکتے ہیں تو آگے چل کر کچھ کر سکتے ہیں...... (جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ) ہمارے جلسوں پر فائرنگ ہوتی تھی جس کے نتیجے میں ہمارا ایک رکن شہید ہو گیا۔ اور تقریباً ۲۵ کے قریب کارکن شدید زخمی ہوئے۔ ہم کہیں جا کر جلسہ بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مہاجرین کا علاقہ ہمارا (یعنی ایم کیو ایم کا) علاقہ ہے۔(۲۷)

جہاں تک کراچی میں فسادات کا تعلق تھا تو اس کی بنیادی وجوہات کی جڑیں ماضی کی ایم آر ڈی کی تحریک میں پیوست تھیں۔ (۲۸) جبکہ حکومت نے اس تحریک سے بھی اپنے حق میں فوائد کشید کیے۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے اس حوالے سے کہا کہ: "یہ فسادات بیوروکریسی نے کرائے تھے تاکہ یہ ظاہر کیا جا سکے کہ ملک میں امن و امان کی صورتحال ایسی نہیں ہے کہ مارشل لاء اٹھایا جائے۔ یہ فسادات سول انتظامیہ اور غنڈہ عناصر کی سرپرستی میں ہوئے اور مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں جب ایم آر ڈی کی تحریک چل رہی تھی تو سندھ انتظامیہ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح سندھی اور مہاجر (یعنی سندھ کے پنجابی مکینوں اور اردو بولنے والوں کو) آپس میں لڑا دیا جائے۔ انتظامیہ اس وقت یہ چاہتی تھی کہ یہ سب کچھ ہو اور وہ یہ ثابت کر سکیں کہ یہ سب کچھ ایم آر ڈی کی تحریک کی وجہ سے ہوا ہے۔ لیکن انہیں اس وقت اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس وقت ہم نے (سندھ یونٹی بورڈ کے ہمراہ) صوبہ سندھ کے مسلسل دورے کیے اور عوام کو حکومت اور انتظامیہ کی سازش سے آگاہ کر دیا......"(۲۹)

جبکہ مہاجر قومی موومنٹ کے مقاصد، مقبولیت اور اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا:

--- یہ مٹھی بھر ناراض اور گمراہ نوجوانوں کی تحریک ہے جسے سندھ حکومت اور جی

ایم سید جیسے ملک دشمن سیاستدان کی سرپرستی حاصل ہے لیکن یہ ایک وقتی تحریک ہے جو بہت جلد ختم ہو جائے گی اور مجھے یقین ہے کہ وہ مہاجر نوجوان جو ناسمجھی اور نادانی میں نسلی تعصبات اور منافرتوں کی بنیاد پر ایک تحریک کا آغاز کیے ہوئے ہیں وہ قومی مفادات اور تقاضوں کے پیش نظر اس راستہ کو ترک کر دیں گے۔ ...... ایک منظم سازش کے تحت پاکستانی قوم کو مختلف قومیتوں میں تقسیم کرنے کا عمل جاری ہے ...... جو ایک بہت بڑا قومی اور شرعی جرم ہے کیونکہ ہم مسلم قومیت پر یقین رکھتے ہیں۔ پاکستان صرف مسلم قومیت کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ اگر نسلی اور علاقائی بنیادوں پر ہی مختلف تنظیموں اور قومیتوں کا نعرہ بلند کرنا ہے تو پھر پاکستان بنانے کی کیا ضرورت تھی، جو لوگ پاکستان کے بنیادی نظریئے کو شعوری یا غیر شعوری طور پر نقصان پہنچانے کے درپے ہیں وہ دراصل پاکستان کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ایسی ہر تحریک کی شدت سے مخالفت کریں گے جو پاکستان کی اساس، مسلم قومیت کی نفی کرتے ہوئے پاکستان قوم کو مہاجر اور مقامی (یا سندھی) اور پنجابی میں تقسیم کرنے کی کوشش میں ہے ...... سیاسی جماعتوں کو غیر مؤثر بنانے کے لیے علاقائی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہونے والی تنظیموں اور تحریکوں کی سرپرستی کی جارہی ہے ...... (۳۰) اگر ملک میں ...... تسلسل کے ساتھ وقت مقررہ پر انتخابات کروائے جاتے رہیں تو علیحدگی پسند قوتیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ ملک میں انتخابات نہ ہونے اور مارشل لاء کے جبری نظام کے جاری رہنے کی وجہ سے ملک میں علیحدگی پسند تحریکوں نے جنم لیا۔ ولی خان اور جی ایم سید جس دیدہ دلیری، ڈھٹائی اور تسلسل کے ساتھ پاکستان کے خلاف باتیں کر رہے ہیں، ماضی میں کبھی ان لوگوں کو ایسی جرأت نہیں ہوئی تھی ...... (یہ کہاں کا انصاف ہے کہ) قائداعظم کے خلاف دریدہ دہنی کرنے والوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے ......(۳۱)

جہاں تک پاکستان عوامی اتحادی کی سیاسی قوت کا تعلق تھا اس میں شامل دونوں جماعتیں جمعیت علمائے پاکستان اور تحریک استقلال میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ سیاسی عمل یا سیاسی نتائج پر اثر انداز ہو سکیں۔ ایک دفعہ مولانا شاہ احمد نورانی سے استفار کیا گیا کہ ۱۹۷۹ء کے آخر یا ۱۹۸۰ء کے آغاز میں یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ پیپلز پارٹی کے بعد جمعیت علمائے پاکستان ملک کی کم از کم دوسری بڑی سیاسی جماعت ضرور ہے گی لیکن بعد ازاں ایسے محسوس ہوا کہ اس کے ثمرات کو صحیح طریقے سے کیش نہیں کرایا جا سکا۔ اس صورتحال کی وضاحت انہوں

نے یوں کی:

اس کی (سب سے بڑی) وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس وسائل نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے خلاف جو سازشیں ہو رہی تھیں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ ۱۹۷۷ء میں جب ہم پی این اے سے الگ ہوئے ہمارے دوسرے ساتھی بھی پی این اے سے الگ ہوئے ...... (لیکن) مسلسل اپوزیشن میں رہنا بھی بہت مشکل بات ہے ...... ووٹوں کا جہاں تک تعلق ہے، پیپلز پارٹی کے پاس سب سے زیادہ ووٹ ہوں گے۔ (لیکن اس کے بعد جمعیت علمائے پاکستان کے ووٹر ہیں جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ) اب ۱۹۸۸ء میں نواز شریف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جمعیت علمائے پاکستان کی وجہ سے ہمیں تقریباً ۲۵ سیٹوں کا نقصان ہوا ہے اور اگر یہ سیٹیں ہمیں مل جاتیں تو ۱۹۸۸ء میں پیپلز پارٹی برسر اقتدار نہ آتی اور پھر ان کا تجزیہ کافی حد تک صحیح بھی ہے۔ کراچی اور حیدر آباد کے علاوہ پنجاب میں بھی کئی مقامات پر ہمیں نقصان پہنچا اور یہ سب وسائل کی کمی کی وجہ سے ہوا ...... انتخابی مہم کے دوران جب میں (نورانی) کبھی ٹیکسی یا رکشہ میں جاتا ہوں تو لوگ ہنستے ہیں۔ ظاہر ہے دوستوں کی گاڑیاں کبھی مل جاتی ہیں کبھی نہیں ملتیں۔ ان کی بھی مصروفیت ہوتی ہے، بس اس طریقے سے کام چلتا رہتا ہے۔ [جمعیت کے برعکس] دوسری جماعتوں کے بھی دفاتر میں وہاں ماشاء اللہ گاڑیوں کی ریل پیل ہے۔ (۳۲)

ان دونوں جماعتوں کا پس منظر اصول پرستی اور جمہوریت پسندی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پھر یہ کہ ان کی سیاسی لغت میں اصولوں سے انحراف کی کوئی اصطلاح موجود نہیں تھی۔ اس بناء پر دونوں جماعتوں کے رہنماؤں میں ذہنی ہم آہنگی موجود تھی۔ مولانا شاہ احمد نورانی کے انداز سیاست کی یہ خوبی رہی ہے کہ وہ سیاسی حوالے سے وسیع الظرف رہے ہیں لیکن ان کے سیاسی دسترخوان پر شرف طعام صرف انہی لوگوں کو ملتا ہے جو ان کے ہم مزاج ہوں۔ بالخصوص نظام مصطفیٰ ﷺ کے بعد انہوں نے اپنی طرف سے تو اس پہلو کا اہتمام نہایت احتیاط سے کیا کہ آئندہ ممکنہ کسی بھی اتحاد میں کسی سیاسی مسافر اور سیاسی اخلاقیات سے عاری جماعت کی شمولیت نہ ہو۔ اتحاد تحریک تحفظ پاکستان میں بھی جمعیت کے دم بہ قدم صرف پاکستان مسلم لیگ پگاڑا ہی تھی جو اس وقت تک مارشل لاء کی حامی نہیں تھی۔ جبکہ جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی سے حد درجہ احتراز برتا گیا۔ بلکہ ایم آر ڈی سے دوری کی ایک وجہ بھی پیپلز پارٹی کی

اس میں شمولیت بنی۔ تاہم مولانا شاہ احمد نورانی کسی بھی ایسی جماعت سے انتخابی اتحاد کے لیے تیار نہ ہوتے جو نظریۂ پاکستان کی مخالف ہوتی۔ وگرنہ باقی امور تو سیاسی آداب کا حصہ تھے۔ جن پر کسی حد تک مصلحت پسندی کا امکان بہر حال موجود تھا۔ پھر یہ کہ مسلم لیگ پگاڑا گروپ پاکستان قومی اتحاد کی تحریک سے لے کر ۱۹۸۵ء تک غیر جماعتی انتخابات تک جمعیت کی حامی جماعت رہی تھی۔ اس لیے بہر حال مسلم لیگ سے جمعیت علمائے پاکستان کی ورکنگ ریلیشن شپ کی گنجائش موجود تھی۔ جہاں تک تحریک استقلال کا تعلق تھا تو ایم آر ڈی میں رہتے ہوئے بھی ایئر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان نے مولانا نورانی سے روابط قائم رکھے اور وقتاً فوقتاً دونوں کے مابین سیاسی مشاورت ہوتی رہتی تھی۔ اسی طرح ایم کیو ایم نے جب لسانی اور قومیتی بنیادوں پر اپنی سیاسی جدوجہد شروع کی تو مولانا شاہ احمد نورانی نے اس اندازِ سیاست کو سخت ناپسند کیا حالانکہ انتخابی ایڈجسٹمنٹ کے لیے الطاف حسین خود چل کر ان کے پاس گئے تھے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ان کی مہاجرت کا سفر پاکستان میں پہنچنے کے بعد ختم ہو گیا تھا اب وہ دل و جان سے اس ریاست کے باشندے اور شہری ہیں مہاجر ہرگز نہیں۔ اگر مولانا نورانی چاہتے تو بآسانی کراچی اور حیدر آباد کی سیاست پر قبضہ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ہمیشہ اقتدار کے بغیر سیاست کے اصول کو مقدم رکھا (۳۳)۔ پاکستان عوامی اتحاد میں بھی انہوں نے صرف اپنی جماعتوں کو شمولیت کی دعوت دی جن کے ساتھ ان کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ چونکہ عام مروجہ اصول یہی تھا کہ سیاست میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ اس لیے مسلم لیگ اتحاد کو بیچ منجدھار چھوڑ کر اسلامی جمہوری اتحاد کی حامی بن گئی کیونکہ مسلم لیگ کو اب اقتدار کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اس لیے حکومتی ایوانوں سے دوری کا قلق زیادہ دیر سہ نہ سکی اور جلد ہی اپنی کوششوں کا حصہ بن گئی جو حصول اقتدار کے لیے جائز اور ناجائز کے غلط مبحث میں پڑے بغیر سر انجام دی جاتی ہیں (۳۴)۔

جنرل ضیاء الحق کی تدفین کے بعد ان کے پسماندگان کے سامنے دو مسئلے تھے۔ ایک ضیاء کی پالیسیوں کا تسلسل اور پھر اس کے راستے میں حائل ممکنہ رکاوٹوں کو دور کرنا (۳۵)۔ بالفاظ دیگر ان دونوں مسائل کا براہ راست تعلق پیپلز پارٹی سے تھا جس کے اقتدار میں آنے کی صورت میں ضیاء باقیات کو کئی طرح کے خطرات در پیش تھے۔ ان لوگوں کے لیے ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ جنرل مرزا اسلم بیگ اور صدر غلام اسحاق خان جمہوری عمل جاری

رکھنے پر متفق، سنجیدہ اور یکسو تھے۔ جن کی طرف سے انتخابات وقت مقررہ پر کرائے جانے کو یقین دہانی مسلسل کرائی جا رہی تھی (۳۶)۔ اس صورتحال میں سابق مارشل لاء کے حمایت کنند گان میں کھلبلی مچ گئی۔ انتخابات رکوانے میں ناکامی سے ان لوگوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کرتے ہوئے انتخابی نتائج کو اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ کرنے کے لیے مختلف طریقوں کو پر غور کرنا شروع کر دیا (۳۷) اس حوالے سے ایک منصوبہ تو یہ تھا کہ انتظامیہ پر اثر انداز ہو کر انتخابی نتائج تبدیل کیے جائیں یا یہ کہ ایک ایسا انتخابی اتحاد تشکیل دیا جائے جو پیپلز پارٹی کو ٹف ٹائم دے سکے (۳۸)۔ اس صورتِ حال کے تناظر میں ایک آشنائے درون خانہ کا تبصرہ ملاحظہ ہو کہ کس طرح ان افراد نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سیاسی صف بندی کی "انتخابات کے التواء کی سازش کرنے والے اس گروہ پر نظر ڈالی جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ان مٹھی بھر افراد نے ملک میں کسی بھی جمہوری حکومت کو مستحکم نہ ہونے دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا دور اور ان کا انجام تو خیر دور کی بات ہے مگر محمد خان جونیجو جیسا وزیر اعظم بھی جسے خود جنرل ضیاء الحق نے اپنے ہاتھوں اقتدار کی کرسی پر بٹھایا تھا ان (لوگوں) کے لیے ہمیشہ بار خاطر رہا اور یہ لوگ جہاں تہاں ان کی حکومت کو بھی کمزور کرنے کی شبانہ روز کاوشوں میں مصروف رہے۔ اب اگر محمد خان جونیجو کے دور حکومت پر نظر ڈالیں تو احساس ہوتا ہے کہ جب بھی انہوں نے قدم جمانے کی کوشش کی یا جب بھی ان کی حکومت استحکام کی منزل تک پہنچتی دکھائی دی اچانک ملک کے کسی نہ کسی گوشہ میں قتل و غارت گری یا دہشت گردی کا کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ضرور ہو گیا جس کے نتیجے میں بے یقینی کی کیفیت پھر سے ہمہ گیر ہو گئی...... یہ بات بھی اب بہت حد تک زبان زدِ عام ہو چکی کہ اوجڑی کیمپ کا سانحہ دراصل افغان جہاد کے لیے آنے والے اسلحہ کا حساب کتاب غتر بود کرنے کا ایک بہانہ تھا...... مسلح افواج کی نئی قیادت نے ان عناصر کا راستہ روکنے کی اپنی سی کوشش کی مگر گیارہ برس کے کانٹے مکمل طور پر چننے میں ابھی شاید بہت وقت صرف ہو گا۔ آنے والے زمانوں کا مورخ جب حکومتی دباؤ سے آزاد ماحول میں معاملات کا جائزہ لے گا تو اسے سوچنا ہو گا کہ آخر یہ چند افراد کا مخصوص ٹولہ ہی کیوں تھا جس نے محمد خان جونیجو کی برطرفی کا راستہ کھولا، بے نظیر بھٹو کو بے آبرو کر کے گھر بھجوایا، جنرل مرزا اسلم بیگ اور بعض دوسرے جرنیلوں کی پوری خواہش اور کوشش کے باوجود غلام مصطفیٰ جتوئی کی راہ روک دی گئی اور کم از کم دو مرتبہ انتخابات کے نتائج کو اس بری طرح متاثر کیا کہ چھوٹے صوبوں خاص طور پر

سندھ میں احساس محرومی اپنی انتہا تک جا پہنچا۔(۳۹)

ملک میں عام انتخابات وقت مقررہ یعنی ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کو منعقد ہوئے جس میں پاکستان پیپلز پارٹی کی واحد بڑی جماعت کے طور پر کامیابی حاصل ہوئی۔ سندھ میں پیپلز پارٹی کی کارکردگی تقریباً وہی تھی جو ۱۹۷۰ء میں تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ مخالفین میں بہت سی پارٹیوں کے امیدواروں کی کامیابی کے مقابلے میں مارشل لاء دور میں بننے والی ایم کیو ایم کا ایک مکمل گروپ کامیاب ہوا۔ بالفاظ دیگر سندھ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی میں تقسیم ہو گیا۔ (۴۰) صوبہ سرحد میں پیپلز پارٹی کی کارکردگی ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں بہت بہتر رہی۔ اس کی دو وجوہات تھیں ایک سرحد کے روایتی سیاستدان ولی خان اور ان کی اے این پی [ماضی کی سرخ پوش اور سابق نیپ (ولی خان گروپ)] بری طرح شکست سے دوچار ہوئی۔ غالباً ۱۹۷۰ء کے بعد سیاسی لحاظ سے خان ولی خان کو شدید نقصان اٹھانا پڑا اور ان کا سیاسی قد کاٹھ پس منظر میں چلا گیا۔ سرحد میں پیپلز پارٹی کے لیے آفتاب خان شیر پاؤ نے نمایاں کام کیا تھا جو پارٹی کی کامیابی کا باعث بنا۔(۴۱)

جہاں تک صوبہ سرحد میں اسلامی جمہوری اتحاد کو ہونے والے نقصانات کا تعلق تھا اس صوبہ میں اسلامی اتحاد کے ٹکٹوں کی غیر منصفانہ تقسیم کے باعث بعض علاقوں میں اسے سخت ناکامی ہوئی۔ صوبہ سرحد کے نگران وزیر اعلیٰ جنرل فضل حق اور سابق وزیر اعلیٰ (جونیجو دور) ارباب محمد جہانگیر میں ٹکٹوں کی تقسیم پر شدید اختلافات پیدا ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی ایسے مسلم لیگی افراد جن کی کامیابی یقینی تھی، ٹکٹ حاصل کرنے سے رہ گئے (۴۲)۔ ایک طرف نگران وزیر اعلیٰ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ان کے نامزد کردہ امیدوار کی بھاری اکثریت ہی قومی اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں کامیابی سے ہم کنار ہو گی۔ اس کشمکش میں انہوں نے مسٹر محمد خان جونیجو اور ارباب محمد جہانگیر کے حامیوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ (۴۳)۔ دوسری طرف ارباب محمد جہانگیر کا دور مسلم لیگی کارکنوں کے لیے بہتر دور ثابت نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی وزارت اعلیٰ کے دور میں لیگی کارکنوں کو مسلسل نظر انداز کیے رکھا بلکہ اس کی بجائے، انہوں نے خان عبدالولی خان سے روابط بڑھائے ان دنوں جنرل فضل حق گورنر سرحد تھے (۴۴)۔ اس لیے انہیں ارباب جہانگیر کی یہ باتیں پسند نہیں تھیں جس سے ان دونوں کے درمیان خلیج بڑھتی چلی گئی۔ (۴۵) بلوچستان جہاں کی قبائلی سیاست، پارٹی سیاست سے ذرا مختلف تھی، وہاں بھی

پیپلز پارٹی ۱۹۹۰ء کے مقابلے میں قدرے بہتر پوزیشن میں تھی (۴۶)۔

اگرچہ ایم کیو ایم سے معاہدے کے بعد "سندھ کارڈ" مکمل طور پر پیپلز پارٹی کی گرفت میں تھا لیکن ملکی سیاست میں صوبہ پنجاب کو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی۔ ایک تو آبادی کے لحاظ سے ملک کی کل آبادی کا ساٹھ فی صد سے زائد یہاں آباد تھا۔ مزید یہ کہ انتظامیہ اور فوج میں بھی بالادستی پنجاب کو حاصل تھی۔ یہاں پیپلز پارٹی کا مقابلہ "ضیاء باقیات" سے تھا۔ کیونکہ جنرل ضیاء الحق مذہب کے نام پر ملکی تحفظ کا نعرہ لگا کر اور افغانستان میں جہاد کا جذباتی نعرہ استعمال کر کے پنجاب کے درمیانے اور نچلے طبقے میں اپنی ایک لابی بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے (۴۷)۔ پیپلز پارٹی کے ان موقع پرستوں کی تعداد بھی سب سے زیادہ پنجاب ہی کی تھی۔ جنہوں نے مارشل لاء کے دوران ضیاء الحق کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ تمام خارجہ عوامل بہر حال فیصلہ کن ثابت ہوئے۔

جہاں تک اندرونی عوامل کا تعلق تھا، پنجاب میں پیپلز پارٹی کی قیادت، تجربہ کار اور نوجوان خون کے ہاتھ میں تھی جن کی تربیت ان سیاسی حالات میں نہیں ہوئی تھی جو ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۲ء تک متحدہ پاکستان کے سیاسی دور میں رہے تھے۔ یہ لوگ چونکہ مارشل لاء دور میں پارٹی میں وارد ہوئے تھے اس لیے سیاسی ول سے دوری کی وجہ سے ان کی تربیت ابھی خام تھی۔ ویسے بھی پنجاب میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت کا واحد سہارا بھٹو مرحوم کی چھاپ تھی۔ اندریں حالات ۱۹۸۸ء میں پیپلز پارٹی شدید نقصان سے دوچار ہوئی۔ (۴۸) ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی نے ۸۳ میں سے ۶۲ نشستیں حاصل کی تھیں۔ جبکہ دو نشستوں پر انتخاب ملتوی ہو گیا تھا۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کی پنجاب کی ۱۱۵ سیٹوں میں ۵۷ حاصل کیں (۴۹)۔ اسی طرح صوبائی اسمبلی میں پیپلز پارٹی نے پنجاب سے ۹۸ نشستیں حاصل کیں (۵۰)۔☆

☆ نتائج کے اعتبار سے پیپلز پارٹی کو قومی اسمبلی کی ۹۲ جبکہ آئی جے آئی کو ۶۸ نشستیں ملیں۔ بعد ازاں فاٹا کے آزاد ارکان نے بھی پی پی پی کی حمایت کر دی۔ سندھ سے ایم کیو ایم نے بھی پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا۔ سندھ اور سرحد میں پی پی پی کی جبکہ پنجاب میں میاں نواز شریف کی حکومت بنی۔ جبکہ بلوچستان میں نواب اکبر بگٹی وزیر اعلیٰ بنے۔

پیپلز پارٹی چونکہ گیارہ سال تک اقتدار سے دور رہی تھی۔ اس لیے وہ ایک محتاط اور مدافعانہ پالیسی کے ساتھ میدان سیاست میں اتری۔ اس لیے مارشل لاء حکومت اور اس کے ذمہ داروں کو معاف کرنے اور درگزر کرنے کی پالیسی اپنائی گئی حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ پیپلز پارٹی جمہوریت نوازی اور جمہوریت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مارشل لاء کے ذمہ داروں کا احتساب کرتی تا کہ آئندہ کسی کو خلاف آئین اقدامات کی جرأت نہ ہوتی (۵۱)۔ مگر اس ضرورت سے زیادہ محتاط روی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ضیاء باقیات کے حوصلے بڑھ گئے۔ انھی لوگوں نے پیپلز پارٹی میں موجود اپنے ہم خیال لوگوں سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں جب فوج کی اعلیٰ ترین قیادت کے ساتھ پیپلز پارٹی کے مذاکرات جاری تھے تو اس میں زیادہ زور اس پہلو پر تھا کہ پارٹی کو وزارت عظمیٰ صرف اس صورت میں مل سکتی ہے اگر وہ صدارت مملکت کے لیے فوج کی حمایت یافتہ شخصیت کو قبول کرے۔ اس حوالے سے بے نظیر بھٹو کو دو نام ارسال کیے گئے جن میں ایک تو خود صدر غلام اسحاق خان ہی تھے جبکہ دوسرا نام صاحبزادہ یعقوب خان کا تھا۔ (۵۲)

پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت میں ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کا اصرار تھا کہ بے نظیر بھٹو کو کسی بھی قسم کی شرائط قبول نہیں کرنا چاہئیں اور مشروط اقتدار کی پیشکش مسترد کر دی جانی چاہیے۔ ان لوگوں کا اصرار تھا کہ پارٹی مرکز سے زیادہ پنجاب کو صوبائی قیادت کے حصول پر توجہ دینی چاہیے مگر پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت، اقتدار کے جلد از جلد منتقل کیے جانے کی خواہاں تھی۔ بعض لوگوں کو یہ بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ شاید بے نظیر بھٹو کہیں قبولیت اقتدار سے انکار ہی نہ کر دے۔ حالانکہ بے نظیر کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے اس انکار کا امکان ذرا کم تھا۔ جس کا عملی ثبوت اس وقت سامنے آیا جب بے نظیر از خود صدر مملکت سے ملاقات کے لیے جا پہنچیں (۵۳)۔ مزید یہ کہ انہوں نے فوج کے دو صدارتی امیدواروں غلام اسحاق خان اور صاحبزادہ یعقوب علی خان میں سے اوّل الذکر کو محض اس لیے ترجیح دی کہ وہ بطور صدر اپنے عہدہ پر موجود ہیں۔ اس لیے وہ کہیں کسی دوسرے کو بطور وزیر اعظم نامزد نہ کر دیں۔ حالانکہ عبوری دور کی وفاقی کابینہ نے اپنے آخری اجلاس میں اس امر کا قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ بے نظیر بھٹو ہی ملک کی آئندہ وزیر اعظم ہوں گی۔ (۵۴)

یوں محترمہ جو حد سے زیادہ محتاط روی کے ساتھ میدان سیاست میں وارد ہوئی تھیں،

کرسی اقتدار کو دیکھتے ہی تمام احتیاطی تدابیر بھول کر ہر قیمت پر اس کے حصول کے لیے کوشاں ہو گئیں بلکہ کابینہ نے اس حوالے سے جو شیڈول مرتب کیا تھا، اس کے مطابق محترمہ بے نظیر بھٹو کو ۱۲ دسمبر ۱۹۸۸ء کو وزیر اعظم بنایا جانا تھا لیکن محترمہ کی عجلت کے پیش نظر انہیں ۲ دسمبر کو وزیر اعظم نامزد کر دیا گیا۔ محترمہ جنہوں نے ایک صحیح اور جائز آئینی کام کا آغاز کیا تھا مگر تھوڑی سی سیاسی کج روی کے ساتھ کہ انتظامیہ کے پہلے دن ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ آئندہ حالات کیا رخ اختیار کرنے والے تھے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنی پہلی ہی پریس کانفرنس میں انتخابات کے دوران رونما ہونے والی محدود دھاندلی کے خلاف تحقیقات کروانے اور آٹھویں آئین ترمیم کے خاتمے کے اعلان کر دیا۔ بالفاظ دیگر حکومت اسٹیبلشمنٹ محاذ آرائی کی خشت اوّل اسی روز رکھ دی گئی تھی چنانچہ غلام اسحاق خان جو آٹھویں ترمیم کے ذریعہ با اختیار صدر بنے ہوئے تھے ان کے دل میں کئی طرح کے خدشات گھر کر گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک گرگ جہاندیدہ کی طرح انہوں نے اسی دن سے ہی اپنے گرد حفاظتی حصار قائم کرنا شروع کر دیا۔ (۵۵)

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پیپلز پارٹی کو حکومت بنانے کی دعوت دینے والوں کو بخوبی اندازہ تھا کہ اسٹیبلشمنٹ جو ہمیشہ سے پیپلز پارٹی کی دشمن رہی ہے اور گیارہ سالہ آمریت کے دوران حکومت کے پالیسی ساز اداروں میں قدم جما لینے والے عناصر، پیپلز پارٹی کی حکومت کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ اس پر پیپلز پارٹی نے حکومت کو بل پیش کرنے میں جلد بازی سے کام لے کر اپنی ناپختہ کاری کا ثبوت بھی دے دیا۔ حالانکہ اس کی قیادت کو اس امر کا بخوبی اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ ۶۸ نشستوں والی اتحادی حکومت ۲۳۷ ارکان کی اسمبلی میں نہیں بنا کرتی اگر پارٹی جلد بازی کر کے اسٹیبلشمنٹ کے بچائے ہوئے جال میں نہ پھنستی تو کچھ دن بعد بغیر کسی قسم کی شرائط حتی کہ اپنی شرائط پر حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔ اسٹیبلشمنٹ نے پیپلز پارٹی کو آئندہ بیس ماہ کے لیے حکومت دے کر وہ کام کیا جو اس کے سابق سرپرست جنرل ضیاء الحق اپنے گیارہ سالہ دور اقتدار میں بھی نہ کر سکے تھے۔ بیس ماہ کی حکومت کے دوران پیپلز پارٹی میں تنظیم کے فقدان، سنجیدہ پالیسی ساز افراد کی کمی اور صبر و تحمل سے طویل المعیاد منصوبہ بندی کے فقدان کی کمزوریاں نمایاں ہو گئیں۔ (۵۶) یوں محسوس ہوتا تھا کہ پارٹی نے صرف اسلام آباد شہر پر حکومت کو اپنا مقصد بنا لیا تھا۔ پیپلز پارٹی نے اس بیس ماہ میں سوائے ایک کے اور کوئی ضمنی انتخاب نہیں جیتا۔ پارٹی میں مسلسل ایک میلے کی سی کیفیت

طاری تھی اور سنجیدگی پیدا ہونے ہی میں نہیں آتی تھی۔ تنظیمی فقدان تو تھا ہی اس پر مستزاد یہ کہ ہر سیاسی رہنما جب چاہتا سیاسی بیان جاری کر دیتا۔ انہی بیان باز لیڈروں نے میاں نواز شریف کو وزیر اعلیٰ سے سیاسی لیڈر میں تبدیل کر دیا۔ تاریخ میں جب تجزیہ نگار اس دور کے حالات کا جائزہ لے گا تو وہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ ضیاء الحق نے میاں نواز شریف کو وزیر بنایا تھا۔ پیپلز پارٹی نے انہیں لیڈر بنا دیا۔ (۵۷) پیپلز پارٹی کی انہی حماقتوں کو دیکھتے ہوئے بے نظیر کی نامزدگی کے ساتھ ہی میاں نواز شریف نے بخوبی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت اسلام آباد کے بارہ میل پر پھیلے ہوئے رقبہ سے آگے نہیں بڑھ سکے گی اور انہیں عملاً صرف اسلام آباد کی وزیر اعظم بنا کر رکھ دیا جائے گا۔ (۵۸)

اور پھر ہوا بھی یہی بعد ازاں حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ جو میاں صاحب نے کہا بد قسمتی سے سچ ہوا۔ اگر وزیر اعظم بے نظیر کے پہلے خطاب کا جائزہ لیں تو صاف واضح ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ تر زور تکلم صرف سابقہ آمریت کے استرداد پر صرف کیا گیا:

مبارک باد آپ کو آپ کی کامیابی پہ، آپ کی فتح پر مبارک باد۔ یہ پاکستان پیپلز پارٹی کی کامیابی نہیں ہے الیکشن کے نتائج پوری قوم کی کامیابی ہے...... ہماری قوت کا اصل سرچشمہ عوام ہیں...... ہمارا سفر ۲۰ سال پہلے شروع ہوا تھا جب شہید ذوالفقار علی بھٹو نے ہمارے ملک کے پسماندہ اور محروم عوام کے حقوق کی حفاظت کے لیے پارٹی بنائی تھی۔ جب ایک سابقہ آمریت نے ملک کے دو ٹکڑے کر دیئے تو انہوں نے ۱۹۷۱ء میں اس ملک کو بچایا تھا۔ انہوں نے عوام میں قوت پیدا کی اور یوں ملک کی حفاظت کی...... اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حالات سنگین ہیں۔ ہمیں بہت بڑے چیلنج کا سامنا ہے لیکن ہم چیلنجوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ یہ درست ہے کہ ساڑھے گیارہ سالوں میں داخلی طور پر جو پالیسیاں اپنائی گئیں ان کا مقصد محض اپنے ذاتی اقتدار کو برقرار رکھنا تھا۔ ان پالیسیوں نے ہمارے معاشرے پر بہت سے زخم لگائے ہیں اور اس کا شیرازہ زبان، نسل اور فرقہ پرستی نے تار تار کر دیا ہے۔ چھوٹی سوچ رکھنے والی خارجہ پالیسی نے ہمارے اردگرد بلا وجہ خطرات پیدا کر دیے ہیں۔ غلط سوچ پر مبنی اقتصادی پالیسیوں نے ہماری قدرتی اور انسانی وسائل کی دولت ضائع کر دی ہے اور ہمارا پورا مالیاتی نظام دیوالیہ پن کے قریب پہنچ چکا ہے۔ ہم تباہی کے کنارے کھڑے ہیں لیکن ایک پوری نسل اپنی بے تابیوں کے تعمیری جستجو کا رنگ دینے کے لیے تیار ہے۔ ہماری قربانیاں،

ہماری جدوجہد، کوڑوں کی سزائیں اور موت کی کوٹھڑیوں میں ہمارا موت کا منہ چڑانا رائیگاں نہیں گیا ہے۔ ہمیں ان آزمائشوں نے اپنے عزم میں پختہ کیا ہے...... پاکستان کی تاریخ عوام کی بے جھجک جدوجہد کی تاریخ ہے جو وہ ایک مراعات یافتہ حکمران طبقے کی من مانیوں کے خلاف کرتے رہے ہیں۔ گزشتہ چالیس سالوں میں انہوں نے تین بار بے رحم مارشل لاء کے ہاتھوں دکھ سہے ہیں۔ چار آئین منسوخ اور معطل ہوتے دیکھے ہیں...... اس بحران کی جڑیں گہری ہیں...... ہم مرکز اور صوبوں کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں ایک نیا توانا انداز اختیار کریں گے تا کہ محرومی سے پیدا ہونے والی کشمکش پر قابو پایا جا سکے۔ یہ احساس محرومی گزشتہ ساڑھے گیارہ سال میں شدید ہو چکا ہے۔ جس سے غیرت کا جذبہ پیدا ہوا ہے...... ہم پریس کی آزادی کے منافی تمام قاعدے قوانین منسوخ کر دیں گے تا کہ پاکستان میں پریس آزاد ہو۔ ہم نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑ دیں گے...... پریس ایڈوائس کا طریقہ کار ختم کر دیا جائے گا...... بحالی جمہوریت کی جدوجہد میں جن کو نقصان اُٹھانا پڑا ہے ہم انہیں باعزت طریقے سے بحال کریں گے اور انہیں مناسب معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ ہم جمہوریت کے شہیدوں کی یادگاریں تعمیر کریں گے۔ ظلم و جبر کے خلاف تاریخی جنگ لڑنے والے جن شہیدوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔☆ تا کہ قوم کا ضمیر زندہ رہے۔ ان شہدائے جمہوریت کی یاد کو امر کرنے کے لیے ایک مستقل مشعل روشن کی جائے گی...... میں خواہش رکھتی ہوں کہ...... آج فوری طور پر جیل کے دروازوں کو کھولنے کے احکامات دے دوں مگر ہمیں "آٹھویں ترمیم" کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ایک رکاوٹ ہے۔ میں اپنے سیاسی قیدی بھائیوں کو کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کے اور ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آ سکتی...... ہم وہ طریقہ ڈھونڈیں گے جس کے مطابق آپ باعزت طریقے سے زنجیریں توڑ کر جیل کے دروازوں سے سربلند کرتے ہوئے باہر آ جائیں گے۔ (۵۹)

بے نظیر کا یہ افتتاحی خطاب جہاں ان کے آئندہ عزائم کی نشاندہی کرتا تھا وہیں مقتدر حلقوں کے لیے خطرے کی صریح گھنٹی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کی سینئر بیوروکریسی فوج کی اعلیٰ قیادت اور اسٹیبلشمنٹ کے اہم کل پرزوں نے بے نظیر بھٹو اور ان کی حکومت کو سنجیدگی

☆ واضح رہے شہداء سے مراد محترمہ بے نظیر بھٹو کے نزدیک شہدائے تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ ہرگز نہیں تھے بلکہ صرف اور صرف پیپلز پارٹی کے معتوب ارکان ہی تھے جو ضیاء آمریت کا نشانہ بنے تھے۔

سے مستقل حکومت سمجھ کر سنجیدہ اور ماتحتوں والا رویہ نہیں اپنایا بلکہ یہ ادارے اور ان کے افراد بڑے سرپرستانہ انداز سے وقت گزارتے رہے۔☆ (۶۰)

بیس ماہ کے اقتدار نے صدر کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ اسٹیبلشمنٹ (جو کہ ہمیشہ سے حکمران رہی ہے) کی خواہشات کے مطابق بے نظیر بھٹو کی حکومت کو چارج شیٹ کر کے برخواست کر دیں اور اسمبلی میں حزب اختلاف کے لیڈر غلام مصطفیٰ جتوئی کو اسمبلی ختم ہونے کے باوجود وزیراعظم مقرر کر دیں۔ صدر غلام اسحاق خان نے ۶ راگست ۱۹۹۰ء کو اسمبلیاں توڑنے کے بعد کہا:

آج جاری ہونے والے اس حکم نامے میں آئین، قانون اور مسلمہ جمہوری روایات کے منافی ان افسوس ناک سرگرمیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جس کے نتیجے میں ایک منتخب ادارے کی حیثیت سے قومی اسمبلی کی افادیت عوامی اعتماد سے محروم ہو چکی تھی۔ حکم نامے میں سیاسی وفاداریوں کی کھلے بندوں اور لگاتار خرید و فروخت ذریعہ انتخابی مینڈیٹ میں خورد برد کے قابل مذمت طرز عمل کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور آئین کے خلاف ورزی کے ان متعدد واقعات کے نشاندہی بھی جو مرکز اور صوبوں کے باہمی تعلقات، صوبائی خودمختاری کے دائرہ کار پر دست اندازی، سینٹ کے کردار، اعلیٰ عدالتوں کے احترام، حکومت کی انتظامی مشینری کے استعمال اور اس طرح کے چند امور کے سلسلے میں پیش آتے رہے۔ انتہائی وسیع پیمانے پر قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانیوں کی شرمناک وارداتوں اور سندھ میں امن و امان کی اندوہناک صورتحال کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے...... ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں (غلام اسحاق خان) اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وفاقی حکومت آئینی تقاضوں کے مطابق نہ چلائی جا رہی تھی اور نہ چلائی جا سکتی ہے اور رائے دہندگان سے دوبارہ رجوع کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ چنانچہ قومی اسمبلی توڑی جاتی ہے۔ میں نے یہ فیصلہ اپنے حلف کی پاسداری اور اس عظیم ذمہ داریوں کو نبھانے کی خاطر کیا جو آئین کی رو سے پاکستان کے اتحاد کی علامت اور آئین پاکستان کے محافظ کی حیثیت سے مجھ پر عائد ہوتی ہے...... ☆☆ (۶۱)

☆ بیشتر مواقع پر وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی موجودگی میں سینئر فوجی افسران ٹوپی نہیں پہنتے تھے تا کہ انہیں سیلوٹ نہ کرنا پڑے۔

☆☆ ان الزامات کا سلسلہ یہیں تک نہیں تھا بلکہ ایک طویل فہرست تھی۔

غلام اسحاق خان نے اگرچہ اسمبلی توڑنے کا اقدام، آٹھویں ترمیم کے ذریعے آئینی جواز کے تحت سرانجام دیا لیکن ان کا یہ فیصلہ بوجہ متنازعہ رہا:

۱۔ جس قسم کے الزام بے نظیر بھٹو اور ان کی حکومت پر لگائے گئے تھے، جمہوری ممالک میں اس قسم کے واقعات معمول کا حصہ تھے۔

۲۔ ابھی جمہوریت کو بحال ہوئے محض بیس ماہ کا عرصہ ہوا تھا، جو کہ کسی بھی جمہوری حکومت کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے نہایت مختصر عرصہ ہوتا ہے۔

۳۔ غلام اسحاق خان، جیسا کہ ان کا خود کہنا تھا، حادثاتی طور پر میدان سیاست میں آئے تھے۔ جبکہ وہ بنیادی طور پر ایک بیوروکریٹ تھے۔ اگر ان کے اقدامات کا موازنہ گورنر جنرل غلام محمد سے کیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ بالالفاظ دیگر وہ اسٹیبلشمنٹ ہی کا ایک کل پرزہ تھے۔ چونکہ ان کا کوئی سیاسی پس منظر نہیں تھا یا یہ کہ بطور سیاستدان ان کی عوام میں جڑیں گہری نہ تھیں۔ اس بناء پر ان کا تحلیل اسمبلی کا الزام متنازعہ ہی کہلائے گا۔ اگر انہیں ضیاء الحق کے بعد ملک کی دوسری متنازعہ ترین شخصیت کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ (۶۲)

غلام اسحاق خان کی ملازمت کا بہترین اصول یہ رہا کہ وہ کبھی بھی اعلیٰ افسران اور برسر اقتدار سیاستدانوں کی خوشنودی کو فراموش نہ کرتے۔ سرکاری آفیسر کی حیثیت سے غلام اسحاق خان ہمیشہ مستعد اور مقتدر لوگوں کے قریب رہے اور ہر وقت اس کوشش میں رہتے کہ وہ اس طرح اپنے اعلیٰ حکام کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال ان کے بطور سیکرٹری خزانہ اقدامات تھی۔ جب انہوں نے "عشرہ اقتصادی ترقی" کے دوران ۱۹۶۸ء میں ایوب خان کو خوش کرنے کے لیے سرکاری خزانے کو ایوب خان کے حواریوں کے لیے وقف کر دیا۔ بعد ازاں جب انہیں یحییٰ دور میں ۱۹۷۰ء میں کابینہ ڈویژن کا سیکریٹری بنایا گیا تو انہوں نے تمام تر صلاحیتیں ایوب خان کے دوران اقتدار کے لیے وقف کر دیں۔ انہوں نے یحییٰ خان کے وزیروں کو حکومتی ایوان میں نہ صرف داخل کیا بلکہ انہیں غیر قانونی مالی فوائد بھی فراہم کیے۔ بھٹو دور میں انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے لیے اپنی بہترین خدمات سرانجام دیں تو صلے کے طور پر وہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے گورنر بنے۔ جب بھٹو نے نیشنلائزیشن کا عمل شروع کیا تو غلام اسحاق خان ان کے لیے ایک بہترین اور موثر وسیلہ ثابت ہوئے۔ جو، ان کی مزید ترقی

کا باعث بنا۔ اس طرح وہ ۱۹۷۶ء میں سیکریٹری دفاع کے عہدے پر متمکن ہوئے۔ ضیاء دور ان کے کیریئر کا نقطۂ عروج تھا۔ جب ضیاء الحق نے ان کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کے لیے ان کے لیے سیکریٹری جنرل انچیف کا خصوصی عہدہ تراشا۔ بعد ازاں وہ ڈویلپمنٹ اور پلاننگ کے مشیر کی حیثیت سے بھی ضیاء کے دست بازو بنے رہے۔ اس دور میں غلام اسحاق خان پر واضح الزام لگایا گیا کہ انہوں نے ہی صدر ضیاء الحق کو اس طرح مائل کیا کہ وہ ملکی سیاستدانوں کو ترقیاتی فنڈز کا چارہ ڈال کر ان کی حمایت حاصل کر سکتے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے باقاعدہ ضیاء الحق کو ایک جامع پلان بھی تیار کر کے دیا تھا۔ کہ سرکاری خزانہ کو کیسے استحکام اقتدار کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ جس پر بعد میں ضیاء الحق نے نہ صرف عمل کیا بلکہ بدعنوان سیاستدانوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے اربوں روپیہ ضائع کیا۔ (۶۳)

بالفاظ دیگر اگر ضیاء الحق کے دور کا معروضی جائزہ لیا جائے تو ان کی بدنیتی کی حامل اکثر پالیسیوں کے پس منظر میں غلام اسحاق خان کا دماغ متحرک نظر آتا ہے۔ (۶۴) انہی خدمات کے صلہ میں وہ رکن سینٹ منتخب ہوئے۔ بعد ازاں ضیاء الحق کی پشت پناہی انہیں بالآخر چیئرمین سینٹ کے عہدہ فاخرہ تک لے گئی۔ (۶۵)

ضیاء الحق دور میں فوج کے ساتھ تعلقات، بالآخر غلام اسحاق کی مناصب ہائے اقتدار تک رسائی کے باعث بنے۔ جس طرح غلام اسحاق خان نے فوج کو میدان سیاست میں گہرائی تک رسائی بہم پہنچائی۔ اس کی مثال پیش کرنا ممکن نہیں۔ انہوں نے براہ راست جی ایچ کیو سے ہدایات کے تحت، خفیہ ایجنسیوں کو بے تحاشا مالی امداد فراہم کی ان کی انہی محنتوں کا صلہ انہیں حادثاتی طور پر یوں ملا کہ وہ ضیاء الحق کی ہلاکت کے بعد عبوری صدر بنے اور بعد ازاں انہوں نے اپنی بھرپور صلاحیتوں کا استعمال کر کے مستقل صدارت کے لیے راہ ہموار کی۔ (۶۶)

اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے مطلب کے سازشی ساستدان تلاش کیے اور ایسے لوگوں سے روابط استوار کیے جو ضیاء دور میں ان کی وسعت سے وسیع پیمانے پر مفادات حاصل کر چکے تھے۔ (۶۷)

غلام اسحاق خان نے اگرچہ اپنی ذات کو وفاق کی علامت ہونے کا دعویدار قرار دیا لیکن انہوں نے کھل کر جماعتی وفاداریاں تبدیل کرانے، لالچ اور دھمکیوں کے ذریعہ کابینہ اور

اسمبلیوں سے استعفیٰ دلوانے جیسے اعمال کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ لیکن ظاہری تاثر یہی دیا کہ وہ صاف ستھری سیاست اور آئین کی مکمل بالادستی پر یقین رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے یوم پاکستان ۲۳ مارچ ۱۹۸۹ء کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جمہوریت کا وسیع تر مفاد اور وفاق کا استحکام تقاضا کرتے ہیں کہ عوام کے مینڈیٹ کا احترام کیا جائے اور ایک دوسرے کو برداشت اور قبول کرنے کا حوصلہ اور بقائے باہمی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ یہی وفاقیت کے لازمے ہیں اور یہی وحدت کے تقاضے ہیں۔ (۶۸)

جبکہ یہ ایک بدیہی حقیقت تھی کہ وہ جمہوریت کش قوتوں کے دست راست رہے۔ ان کے تمام فیصلوں میں برابر کے شریک رہے۔ ان کے اخلاقی، سیاسی اور فکری معیارات ہمیشہ بدلتے رہے۔ مثلاً کبھی وہ وزیراعظم بے نظیر کی تعریف میں رطب اللسان رہے اور انہیں ایک تعلیم یافتہ، مہذب و شائستہ اور باصلاحیت سیاسی رہنما قرار دیتے رہے۔ جیسا کہ انہوں نے یکم دسمبر ۱۹۸۸ء کو انہیں وزیراعظم نامزد کرتے ہوئے کہا کہ وہ (محترمہ بے نظیر بھٹو) بہترین قائدانہ صلاحیتیں اور مدبرانہ بصیرت رکھتی ہیں۔ ان کے دل میں ملک سے محبت اور عوام کی خدمت کا قابل قدر جذبہ موجزن ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عوام کی پسند اور قوم کا انتخاب ہیں...... ان کی قیادت ملک و قوم کے لیے عظمت و افتخار کی نوید ثابت ہوگی۔ (۶۹)

اور پھر یہی غلام اسحاق خان تھے جنہوں نے ۶ راگست ۱۹۹۰ء کو اس انداز میں یو ٹرن لیا کہ تمام سیاسی و عوامی حلقے حیران و ششدر رہ گئے۔ انہوں نے بے نظیر حکومت پر جو الزامات عائد کیے ان میں سے چند ایک کچھ یوں تھے:

۱۔ آئینی اور انتظامی اداروں کو مفلوج کر دیا گیا۔
۲۔ قومی دولت بے رحمانہ طریقے سے لوٹی گئی۔
۳۔ سیاسی وفاداریوں کی قیمت لگائی گئی۔
۴۔ لالچ اور دھمکیوں کے ذریعے لوگوں کو بے ضمیری پر اکسایا گیا اور
۵۔ عدالت جیسے محترم ادارے کا مذاق اڑایا گیا، وغیرہ (۷۰)

ہر "عروج را زوال" کے مصداق غلام اسحاق خان کو بالآخر خود بھی نواز شریف کے پہلے دور حکومت (۱۹۹۰ء۔۱۹۹۳ء) میں مستعفی ہو کر گھر جانا پڑا۔

اگرچہ ۱۹۸۸ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کا جمہوری دور سیاسی اتار چڑھاؤ کا دور رہا

لیکن سیاستدانوں کے آئے روز کے لڑائی جھگڑے اور باہمی چپقلش سے عوامی بے چینی اور گرانی کے ساتھ ملکی ترقی کے عمل کو نقصان پہنچا۔ حکومت اسٹیبلشمنٹ مناقشت نے بالآخر ہمیشہ کی طرح اسٹیبلشمنٹ کو ہی جیت بخشی۔ اس بناء پر مولانا شاہ احمد نورانی کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی کہ صدر مملکت جنرل ضیاء الحق نے اس امر کا بخوبی انتظام کرلیا ہے کہ ملک کا آئندہ صدر ایک بیوروکریٹ ہوگا۔ اور ظاہر ہے بیوروکریسی انتظامی کا ایک اہم کل پرزہ ہوتی ہے۔ جو کسی بھی منتخب حکومت کو کھل کر کام کرنے کا موقع فراہمکرنے کی روادار نہیں۔ جس طرح پیپلز پارٹی مخالف اتحاد تشکیل دیا گیا اور دیگر اسلام پسند قوتوں کو ناکام کیا گیا، یہ اب ایک واضح حقیقت بن چکی ہے۔ اگر اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل پارٹیوں پر نگاہ ڈالی جائے تو ان اتحادی جماعتوں میں کتنی واقعی قابل ذکر جماعتیں تھیں جمعیت مشائخ، حزب جہاد، فخر امام گروپ اور اس طرح کی بہت سی کاغذی جماعتیں موجود ہیں اور ان جماعتوں کا عملی وجود کہاں تھا۔ جبکہ حقیقت یہ تھی ملک میں دو ہی بڑی سیاسی جماعتیں بنیں۔ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی۔ پہلی بہر حال ایک منقسم اور کٹی پھٹی جماعت تھی۔ جبکہ دوسری تمام تر کوششوں کے باوجود یکجا تھی جبکہ دیگر جماعتوں کی صورتحال یہ تھی کہ

الف: جماعت اسلامی اگرچہ ایک منظم جماعت تھی لیکن ایک قوت ہونے کے باوجود یہ ایک کیڈر (Cadre) پارٹی تھی۔ جو انتخابی سے زیادہ تحریکی قوت تھی اور اسی کام کے لیے ہی موزوں تھی۔

ب: اے این پی محض ایک صوبائی جماعت تھی جو رفتہ رفتہ اپنے صوبے میں ہی بے وقعت ہو کر رہ گئی۔

ج: ایم کیو ایم اور دیگر علاقائی تنظیمیں کبھی بھی ملک گیر سطح پر پذیرائی حاصل نہ کر سکیں۔(۱۷)

اصل طاقت کا کھیل ان خفیہ ہاتھوں میں تھا۔ جو الیکشن سے پہلے ہی الیکشن جیتنے کی تکنیک کو بروئے کار لا کر اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔ ان حالات میں مولانا شاہ احمد نورانی کی کوششیں بھلا کیسے کامیاب ہوتیں۔ کیونکہ حصول اقتدار کے لیے ضمیر کو گروی رکھ کر خفیہ اشاروں پر ناچنا پڑتا ہے جو کبھی بھی مولانا نورانی کی سیاست سے لگاؤ نہیں کھاتا۔ چنانچہ ان حالات کا معروضی نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان عوامی اتحاد بھی ماضی

کے کئی اتحادوں کی طرح محض ایک انتخابی اتحاد ہی ثابت ہوا۔ جو ایک ہم خیال تحریکی کوشش تو کہی جاسکتی ہے لیکن اسے ایک موثر قوت میں تبدیل ہونے کے لیے جس طرح کے وسائل اور محنت کی ضرورت تھی وہ چھوٹی جماعتوں کے لیے بروئے کار لانا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن ان سارے اعمال نے مولانا نورانی کے سیاسی جدوجہد اور عزم کو بہر حال کوئی گزند نہ پہنچائی۔ انہوں نے اپنی سیاسی اور جمہوری جدوجہد، ایک نئے ولولے، استقامت عمل اور عزم صمیم سے جاری رکھی۔

حوالہ جات وتعلیقات

(۱) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۸ راگست ۱۹۸۸ء۔

(۲) جنرل ضیاء کے طیارہ کو پیش آنے والے حادثہ کی اطلاع سب سے پہلے جی ایچ کیو پہنچی جہاں سے ایوان صدر کے چیف آف اسٹاف جنرل رفاقت حسن نے وفاقی کابینہ کے تمام اراکین، چاروں صوبائی گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کو اس سانحہ کی اطلاع دیتے ہوئے فوری طور پر ایوان صدر میں پہنچنے کی دعوت دی۔ ان لوگوں کی آمد سے پیشتر ہی جی ایچ کیو میں ایک نہایت اعلیٰ سطحی اجلاس ہوا۔ جس میں سول حکومت کے واحد نمائندہ چیئرمین سینٹ غلام اسحاق خان تھے۔ جنہیں دستور کی رو سے صدر مملکت کے منظر سے ہٹا جانے کی صورت میں ملک کی زمام اختیار سنبھالنا تھے۔ ان کی معاونت کے لیے ایک ایجنسی کونسل تشکیل دی گئی ۔ جس میں مسلح افواج کے نمائندے بھی ہوں گے اور سول حکومت کے برسر آوردہ افراد بھی۔ وفاقی کابینہ کی نمائندگی کے لیے اس کونسل میں اسلم خٹک، نسیم آہیر، محمود اے ہارون، یعقوب خان اور وسیم سجاد کے نام زیر غور آئے۔ ان کے علاوہ تینوں مسلح افواج کے سربراہ اور چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ بھی اس کونسل کے رکن بنائے گئے۔ صدر غلام اسحاق خان نے ۱۷ راگست کی شام قوم سے اپنے خطاب کے بعد ۲۰ راگست کو ایوان صدر میں ایک پریس کانفرنس کر کے واضح طور پر کہا کہ جنرل صاحب مرحوم نے غیر جماعتی انتخابات کرانے کا اعلان نہیں کیا تھا اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں دستور کے مطابق چلوں گا۔

(روزنامہ جنگ کراچی، ۱۸ راگست ۱۹۸۸ء)

(۳) ایضاً

(۴) ۲۵ راگست کو جنرل اسلم بیگ نے فوجی افسروں سے تفصیلی خطاب کیا جس میں انہوں نے کھل کر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ”ملک ایک مشکل صورتحال سے گزر رہا ہے جس میں غلط فیصلوں کی سرے سے گنجائش نہیں..... فوج کو اقتدار کی کوئی بھوک یا خواہش نہیں۔ سیاسی

رہنماؤں کا کام ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ خود اقتدار سنبھالنے کی بجائے دستوری عمل کو رواج دیں۔ اب یہ سیاسی بزرگوں اور رہنماؤں کا فرض ہے کہ آگے بڑھیں، صفیں درست کریں اور بحران سے نمٹنے کیلئے اتحاد و یگانگت کا مظاہرہ کریں۔“ (سہیل، اظہر، ایجنسیوں کی حکومت، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۶)

(۵) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۸ راگست ۱۹۸۸ء۔

(۶) انٹرویو لیفٹیننٹ جنرل (ر) خواجہ محمد اظہر ۱۳ جولائی ۲۰۰۵ء

(۷) ایضاً (۸) ایضاً (۹) ایضاً (۱۰) ایضاً

(۱۱) حالانکہ جنرل ضیاء الحق کی یہ شدید خواہش تھی کہ غلام مصطفیٰ جتوئی پیپلز پارٹی کے لیڈر کے طور پر وزیراعظم بنیں اور مارشل لاء کے مخالف پی پی کے لیڈروں بشمول بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو پیپلز پارٹی سے خارج کر دیں۔ اس طرح یقیناً پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہو کر انتشار کا شکار ہو جاتی۔ لیکن غلام مصطفیٰ جتوئی نے اس پیشکش کو قبول نہ کیا کیونکہ انہیں یہ اطلاعات ملیں کہ پیپلز پارٹی کے جس لیڈر نے بھی مارشل لاء حکومت سے تعاون کیا وہ پارٹی کی حمایت سے محروم ہو جائے گا اور پارٹی کو تقسیم کرنے کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوگا۔ (ایضاً)

(۱۲) ایضاً

(۱۳) شاید جنرل ضیاء اس واقعہ کی تحقیقات نہیں چاہتے تھے چنانچہ ان تحقیقات کا کوئی نتیجہ منظر عام پر نہیں آیا۔ اور یہ واقعہ بھی ماضی کے کئی دیگر تحقیق طلب اور بے نتیجہ واقعات کے ساتھ، دفتری فائلوں کی زینت بن گیا۔ صدر مملکت نے ان دنوں اپنی پریس کانفرنس میں یہ موقف اختیار کر کے جان چھڑائی کہ قوموں کی زندگی میں اس نوعیت کے مواقع آتے رہتے ہیں جو لوگ بڑے کام کرتے ہیں ان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ ہماری قوم گزشتہ دس برس سے ایک اسلامی جہاد کی طرف داری کر رہی ہے اس کی سزا ہمیں ملنا ہی تھی۔ محمد خان جونیجو نے تاہم نسبتاً ایک مختلف رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے کراچی سے واپس آتے ہی اس علاقہ کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل عمران اللہ کی قیادت میں ایک تحقیقاتی ٹیم مقرر کر دی جسے سانحہ اوجڑی کیمپ کے بارے میں رپورٹ دینا تھی۔ اس رپورٹ کے ساتھ ہی وزیراعظم نے پانچ وزراء کی ایک کمیٹی تشکیل دی جسے رپورٹ کا جائزہ لے کر اپنی سفارشات مرتب کر کے وزیراعظم کے سامنے پیش کرنا تھیں اور وزیراعظم ان سفارشات کو حسب وعدہ منتخب قومی نمائندوں کے سامنے پیش کرنے والے تھے۔

تب بھی اوجڑی کیمپ کے متعلق بہت سی گفتنی ناگفتنی باتیں بھی عوام کے سامنے آ چکی تھیں۔ تقریباً ہر شخص یہ جان چکا تھا کہ مذکورہ ڈپو انٹر سروسز انٹیلی جنس کے اس شعبہ کی زیرِ نگرانی چل رہا تھا جو جہاد افغانستان اور افغان مہاجرین کے حوالے سے پاکستان کے ایماء پر معاملات کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھا۔ بعض غیر ملکی اخبارات نے یہاں تک بھی لکھا کہ اصل میں یہی ڈپو جہاد افغانستان کے لیے "سپلائی ڈپو" کا کام دیتا تھا اور جنیوا سمجھوتہ کے بعد اس میں زیادہ سے زیادہ اسلحہ جمع کیا جا رہا تھا تا کہ افغانستان کے اندر مصروف پیکار مجاہدین کو کسی قسم کی کمی محسوس نہ ہو۔
ان حالات میں جنرل عمران اللہ کے سامنے دو راستے تھے ایک تو آگ پر فوری قابو پانا اور دوسرے تحقیقات رپورٹ وزیر اعظم کو پیش کرنا۔ انہوں نے دونوں کاموں پر فوری توجہ دی۔ رپورٹ بھی بر وقت دے دی اور آگ پر بھی ہفتہ بھر میں قابو پا لیا جو مشکل ہی نہیں ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ حتیٰ کہ امریکی ماہرین بھی مایوسی کے عالم میں جواب دے چکے تھے۔ (اظہر سہیل، "سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک" جنگ پبلشرز لاہور، ستمبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۰)
جنرل عمران کی رپورٹ وفاقی کابینہ کی پانچ رکنی کمیٹی کے سپرد کی گئی جن کے سربراہ اس وقت کے وزیر مواصلات و ریلوے مسٹر اسلم خٹک تھے۔ خٹک صاحب نے جنرل عمران اللہ کی رپورٹ کی روشنی میں اپنے ایک قریبی عزیز (جو کہ ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر تھے) کی مدد سے رپورٹ تیار کی جس میں فوج کی حمایت کی گئی تھی اس میں موقف اختیار کیا گیا تھا کہ اس بحث میں الجھے بغیر کہ یہ حادثہ کس کی غلطی سے اور کیوں ہوا صرف شعبہ جاتی انکوائری میں جن چھوٹے چھوٹے دو چار افسروں کے خلاف تساہل یا سہو کا الزام ہے انہیں حسب دستور سزا دے کر معاملہ ختم کر دیا جائے۔ خٹک کی اس رپورٹ کے برخلاف رانا نعیم محمود (وزیر دفاع) نے یہ موقف اختیار کیا کہ اس رپورٹ میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں کی ضرورت ہے، جسے خٹک صاحب نے مسترد کرتے ہوئے کہا کہ جسے اختلاف ہو وہ اس میں رپورٹ کے ساتھ، الگ رپورٹ بھیج سکتا ہے۔ جس میں وزیر اعظم کے ایما پر کمیٹی کے اراکین کے اختلافی نوٹس کے علاوہ ایک تیسری رپورٹ تیار کی جس میں جنرل عمران اللہ کے جوابات کی روشنی میں (جو انہوں نے کمیٹی کے روبرو دیے تھے) اس حادثہ کے ذمہ داران بڑے افسران جن میں سابق ڈی جی آئی، ایس آئی جنرل اختر عبدالرحمٰن اور موجودہ ڈی جی جنرل گل حمید کے خلاف کارروائی کی سفارش کی گئی تھی۔ صدر ضیاء آئی ایس آئی کے افسروں کے خلاف کارروائی کسی طور برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بالآخر جونیجو

کے بھی دلیرانہ اقدامات انہیں لے ڈوبے۔ (ایضاً ص ۱۰۶۔ ۱۰۸)

(۱۴) لیفٹیننٹ جنرل (ر) خواجہ محمد اظہر، بحوالہ سابقہ۔

(۱۵) ایضاً (۱۶) ایضاً

(۱۷) اس سلسلے میں پارٹی کارکنوں کو یہ طفل تسلی دی گئی کہ انتخابات کے لیے ان لوگوں کو اس لیے اہمیت دی گئی ہے کہ آئی جے آئی کے امیر امیدواروں کے مقابلے کے لیے ان کی ٹکر کے لوگ ہی انتخاب پر پیسہ لگا سکتے ہیں۔ اس پالیسی سے پیپلز پارٹی کی سیاسی پالیسیوں اور عوام کی حمایت کا فلسفہ ختم ہو گیا اور ان کی جگہ روایاتی سیاستدانوں کی پیسے اور جوڑ توڑ کی سیاست نے لے لی۔ پیپلز پارٹی کے زوال کا ضیاء باقیات سے سمجھوتہ اور تیسرا اس مسئلے کا پرچار کہ امریکہ کی مدد اور سرپرستی کے بغیر حکومت نہیں کی جا سکتی۔

(۱۸) ۱۹۸۳ء میں جب ایم آر ڈی نے بحالی جمہوریت کے سلسلہ میں تحریک چلائی تو اس میں اندرون سندھ زیادہ گڑبڑ تھی جبکہ انہی فسادات نے کراچی اور حیدر آباد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ڈرگ مافیا اور کلاشنکوف کے باعث کراچی میں فسادات نے نسلی شکل اختیار کر لی اور مسٹر الطاف حسین نے پٹھانوں اور پنجابیوں کے خلاف محاذ آرائی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مسٹر الطاف حسین نے اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران ۱۹۷۸ء میں آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے نام سے ایک تنظیم بنائی جس کے چیئرمین وہ خود تھے جبکہ عظیم طارق اس طلبہ تنظیم کے جنرل سیکریٹری بنائے گئے۔ اس تنظیم کی محاذ آرائی کا آغاز جماعت اسلامی کی ذیلی طلباء تنظیم اسلامی جمعیت طلباء سے ہوا۔ ۱۹۸۳ء کے فسادات کے باعث اپنے دونوں لیڈروں سے ۱۸ مارچ ۱۹۸۴ء کو مہاجر قومی موومنٹ کے نام سے ایک تنظیم بنائی۔ ان کے جی ایم سید کے ساتھ تعلقات تھے۔ جی ایم سید کا فلسفہ تھا کہ پہلے سندھ کے شہری اور دیہی علاقوں سے پنجابیوں کو نکالا جائے اور اس کے لیے مہاجروں اور پرانے سندھیوں کو مل کر جدوجہد کرنی چاہیے۔ اس صورتحال کے پیش نظر جب پنجابیوں اور پٹھانوں کا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ تو انہوں نے پنجابی پختون اتحاد کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کر لی اور پنجاب کے ایک متحرک تاجر ملک غلام سرور اعوان کو اس تنظیم کا صدر بنایا گیا۔ کراچی اور دیگر شہروں کے نسلی فسادات نے بڑی افسوس ناک صورتحال پیدا کر دی۔ ادھر جماعت اسلامی کی لیڈر شپ پریشان تھی کہ کراچی اور حیدر آباد میں اس کی سیاسی حیثیت کو شدید دھچکا لگے۔ مگر ایم کیو ایم کی قوت میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ الطاف

حسین نے نعرہ لگایا کہ مہاجرین کو پانچویں قومیت کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اس پر قومیتوں کا نعرہ لگانے والوں کو بھی پریشانی ہوئی۔ اس سے کراچی اور حیدر آباد میں فسادات نے پھر نیا رخ اختیار کیا اور حیدر آباد میں سندھیوں اور مہاجروں میں فسادات ہوئے اس صورتحال میں دونوں شہروں میں فوج طلب کی گئی۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات کے دوران مذکورہ دونوں شہروں کے مختلف علاقے کرفیو کی زد میں رہے اور فوج نے کراچی کے مختلف علاقوں میں بنکرز بھی قائم کیے۔ انہی دو شہروں میں ایم کیو ایم کو قومی اسمبلی میں ۱۳/اور سندھ اسمبلی کی ۲۶ نشستیں حاصل ہوئیں۔ ایم کیو ایم کے امیدواروں کو حق پرست قرار دیا گیا۔ ایک نگران صوبائی وزیر غلام مرتضیٰ جتوئی کے سوا سندھ کے نگران صوبائی وزیر اعلیٰ مسٹر اختر علی قاضی سمیت تمام وزراء ہار گئے۔ انہی انتخابات میں قومی اسمبلی کے ایک حلقہ سے ایم کیو ایم کے ٹکٹ پر منتخب ایم این اے ایس اسلم نے ایک لاکھ ۳۱ ہزار ووٹ حاصل کر کے نیا ریکارڈ قائم کیا۔ جبکہ ملک بھر میں دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے امیدواروں ڈاکٹر اعلیٰ مسٹر اختر علی قاضی سمیت تمام وزراء ہار گئے۔ انہی انتخابات میں قومی اسمبلی کے ایک حلقہ سے ایم کیو ایم کے ٹکٹ پر منتخب ایم این اے ایس اسلم نے ایک لاکھ ۳۱ ہزار ووٹ حاصل کر کے نیا ریکارڈ قائم کیا۔ جبکہ ملک بھر میں دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے امیدواروں ڈاکٹر عمران فاروق اور کنور خالد یونس کا تعلق بھی ایم کیو ایم سے تھا۔ کراچی اور حیدر آباد میں جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اسلامی کے اختلافات نے اس درجہ شدت اختیار کی کہ انہی دو شہروں میں ان کے امیدواروں کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ (طارق اسماعیل الیکشن ۸۸ء مکتبہ نوائے وقت لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۷۴۔۳۷۷)

لسانی اور قومیتی بنیادوں پر فسادات کی شدت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ ۳۰ ستمبر کو حیدر آباد میں نسلی تصادم میں سینکڑوں ہلاک ہوئے۔ یکم اکتوبر ۱۹۸۸ء کی رات حیدر آباد میں ۱۶۰/افراد قتل کیے گئے جبکہ اسی روز کراچی میں ۶۰/افراد قتل ہوئے۔ جبکہ اسی سے اگلے دن پر اسرار تخریب کاروں نے کراچی اور حیدر آباد میں ۱۴/افراد ہلاک کر دیئے۔ اکا دکا قتل کے واقعات ان دونوں شہروں میں روز مرہ کا معمول تھے۔ (جنگ کراچی، ۳۰ ستمبر، یکم اکتوبر، ۲/اکتوبر، ۳/اکتوبر ۱۹۸۸ء)

(۱۹) ابتداء میں ان جماعتوں کی تعداد ۸ تھی۔ جن میں جماعت اسلامی، این پی پی، جمعیت علمائے اسلام (درخواستی گروپ)، جمعیت اہلحدیث (مولانا لکھنوی گروپ)، آزاد گروپ، نظام مصطفیٰ

گروپ، جمعیت مشائخ اور خاکسار تحریک شامل تھیں۔ بعد ازاں ۱۸/اکتوبر ۱۹۸۸ء کو مسلم لیگ پاکستان عوامی اتحاد کو خیر باد کہ کر آئی جے آئی میں شامل ہوگئی۔ اس طرح یہ اتحاد "نوستارے" کہلایا۔ اگرچہ انتخابی عمل سے قبل اس سیاسی جھرمٹ کا ایک ستارہ خاکسار تحریک ٹوٹ گیا۔

(۲۰) ایضاً (۲۱) ایضاً، ۷/اکتوبر ۱۹۸۸ء۔ (۲۲) ایضاً

(۲۳) ایضاً، ۱۰/اکتوبر ۱۹۸۸ء۔ (۲۴) ایضاً، ۱۵/اکتوبر ۱۹۸۸ء۔

(۲۵) ایضاً، ۱۹/اکتوبر ۱۹۸۸ء۔

(۲۶) انٹرویو سہیل وڑائچ، روزنامہ جنگ کراچی، ۲۲/اکتوبر ۱۹۹۲ء۔

(۲۷) ایضاً

(۲۸) انٹرویو، ادیب جاودانی، ماہنامہ مون ڈائجسٹ، لاہور، جون ۱۹۸۸ء۔

(۲۹) ایضاً

(۳۰) بھلی، محمد آصف، سیاستدان، ماورا پبلشرز، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۱۵۰۔

(۳۱) ایضاً، ص ۱۵۱۔

(۳۲) سہیل وڑائچ، بحوالہ سابقہ۔

(۳۳) ایضاً (۳۴) ایضاً

(۳۵) لیفٹیننٹ جنرل (ر) خواجہ محمد اظہر، بحوالہ سابقہ۔

(۳۶) ایضاً (۳۷) ایضاً

(۳۸) سہیل، اظہر ایجنسیوں کی حکومت، جنگ پبلشرز، لاہور، ص ص ۲۹۔۳۰

(۳۹) ایضاً (۴۰) ایضاً

(۴۱) حسن، مہدی، ڈاکٹر، پاکستانی سیاست اور عوام، سارنگ پبلشرز، لاہور، س ن، ص ص ۶۱، ۶۲۔

(۴۲) ساگر، طارق اسماعیل، الیکشن ۱۹۸۸ء، لاہور، ص ۱۵۔

(۴۳) ایضاً (۴۴) ایضاً

(۴۵) حالانکہ ارباب محمد جہانگیر کو اقتدار پر لانے والے جنرل فضل حق ہی تھے۔ بعد ازاں جب جنرل فضل حق کو گورنر کے عہدے سے سبکدوش کیا گیا تو ان کی جگہ نوابزادہ عبدالغفور ہوتی گورنر بنے۔ ہوتی بھی گورنری پر ٹک نہ سکے تو ان کی جگہ صوبہ سرحد کے ایک حقیقی مسلم لیگی اور تحریک پاکستان کے جان نثار کارکن مسٹر فدا محمد خان کو گورنر بنایا گیا۔ مگر اس وقت اقتدار سے محروم جنرل فضل حق

اور وزیر اعلیٰ سرحد ارباب جہانگیر کے درمیان اختلافات اپنی انتہا پر پہنچ چکے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیر اعلیٰ کو اقتدار سے محروم کرنے کے لیے ایم پی اے کرنل ریٹائرڈ نور بادشاہ کی زیر قیادت سرحد اسمبلی کے ارکان پر مشتمل ایک گروپ قائم کیا گیا جس نے ارباب جہانگیر کو اقتدار سے محروم کرنے کی سعی کی مگر سرحد اسمبلی کے ارکان کی اکثریت وزیر اعلیٰ کی ہمنوا رہی۔ واضح رہے کہ کرنل نور بادشاہ جنرل فضل حق کے سمدھی تھے۔ جو ۱۹۸۵ء میں مردان سے ایم پی اے منتخب ہوئے تھے۔ اس طرح ردعمل کے طور پر جنرل فضل حق کے ایک اور سمدھی سید علی شاہ جو میونسپل کارپوریشن پشاور کے میئر تھے انہیں گرانے کے لیے ارباب جانگیر خان نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ مسٹر فدا محمد خان کے گورنر بننے سے امید پیدا ہوئی تھی کہ اس صوبہ میں مسلم لیگ کو منظم کرنے کی کوشش کو بروئے کار لایا جائے گا۔ مگر ان کی زیادہ تر توجہ اس امر کی جانب مرتکز رہی کہ جنرل فضل حق کو اقتدار سے دور رکھا جائے اس طرح فدا خان نے بھی مسلم لیگ کی تنظیم سازی پر توجہ دینے کے بجائے مزید پارٹی انتشار کو فروغ دیا۔ چنانچہ اس صورتحال کا فائدہ پیپلز پارٹی نے اُٹھایا۔ (ساگر، طارق اسماعیل، بحوالہ سابقہ، ص ۵۱)

(۴۶) ایضاً، ص ۵۲۔ (۴۷) ایضاً

(۴۸) حسن، مہدی، ڈاکٹر، بحوالہ سابقہ، ص ۶۳۔

(۴۹) ایضاً (۵۰) ایضاً، ص ص ۶۳، ۶۴

(۵۱) اس بات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنرل ضیاء کی ہلاکت کے بعد بے نظیر بھٹو نے رسمی مسرت کا اظہار کرنے یا قضا و قدر کے حوالے سے قدرت کے انتقام کا نعرہ بلند کرنے کے بجائے صرف اتنا کہا کہ ”ہم اس موقع پر کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ عوام متحد رہیں اور کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار رکھیں۔ ہم انسانی جانوں کے اس نقصان پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔“ تاہم انہوں نے اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ ملک میں دستوری حکمرانی کے لیے تسلی بخش اقدامات کیے گئے ہیں۔ (اظہر سہیل ایجنسیوں کی حکومت، دوین گارڈ بکس، لاہور، ۱۹۹۳ء)

(۵۲) سہیل، اظہر، بحوالہ سابقہ، ص ۳۳۔

(۵۳) ایضاً (۵۴) ایضاً، ص ۳۴۔

(۵۵) بالفاظ دیگر محترمہ نے اپنی زوال کی اینٹ اسی دن رکھ دی تھی۔ نواز شریف جن دنوں محض

وزیر اعلیٰ پنجاب تھے اور ان کا سیاسی قد کاٹھ، ابھی اتنا اونچا نہیں ہوا تھا کہ وہ جلد ہی ان سیاستدانوں کی صف میں جا کھڑے ہوئے جو آئندہ وزارت عظمیٰ کے لیے موزوں ترین امیدوار ٹھہرتے۔ ان کے مدمقابل محمد خان جونیجو اور غلام مصطفیٰ جتوئی کی صورت میں سیاسی میدان کے کھلاڑی (Hawks) موجود تھے لیکن قسمت کی دیوی میاں نواز شریف پر کچھ زیادہ ہی مہربان تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کو صدر مملکت کی صدارت میں وفاق کے خلاف سازشوں کے لیے ایک قدرتی حلیف میسر آ گیا۔ بلکہ جلد ہی فوج جیسے غیر جانبدار ادارے (کیونکہ ان دنوں جنرل مرزا اسلم بیگ نے محض خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنے کی ٹھانی تھی) نے بھی اس وقت بے نظیر حکومت کے خلاف سوچنا شروع کر دیا جب پیپلز پارٹی کی حکومت نے فوج کے اندر اپنی مرضی سے تبدیلیاں لانے کی کوشش کی۔ اس طرح فوج کی طرف سے بھی مزاحمت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بعد ازاں حیدر آباد کا پکا قلعہ آپریشن فوج اور پیپلز پارٹی کے درمیان فیصلہ کن موڑ تھا۔ (ایضاً ص ۳۴)

(۵۶) حسن، مہدی، ڈاکٹر، بحوالہ سابقہ، ص ۶۳۔

(۵۷) ایضاً، ص ۶۴

(۵۸) سہیل، اظہر، بحوالہ سابقہ، ص ۳۴۔

(۵۹) مختار، شاہد، پاکستانی سیاست کی نصف صدی، ص ص ۱۴۱۔۱۵۲

(۶۰) حسن، مہدی، ڈاکٹر، بحوالہ سابقہ، ص ۶۴۔

(۶۱) روزنامہ جنگ کراچی، ۷ / اگست ۱۹۹۰ء۔

(۶۲) غلام اسحاق خان کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا وہ ضلع بنوں کے ایک گاؤں اسماعیل خیل میں ۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ سول سروس کے امتحان میں کامیابی کے بعد انہیں سیکریٹریٹ سروس میں لے لیا گیا۔ غلام اسحاق خان محکمہ آبپاشی و بجلی کے سیکریٹری بنے۔ انہیں ایوب دور میں (۱۹۶۱ء میں) واپڈا کا چیئرمین بنایا گیا جو بہت کلیدی عہدہ تھا۔ ۱۹۶۸ء میں انہیں سیکریٹری خزانہ بنایا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں انہیں کابینہ ڈویژن کا سیکریٹری بنایا گیا۔ بھٹو دور میں وہ گورنر اسٹیٹ بینک آف پاکستان بنا دیئے گئے جبکہ بعد ازاں انہیں ۱۹۷۶ء میں سیکریٹری دفاع بنایا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں ضیاء الحق نے غلام اسحاق کے لیے سیکریٹری انچیف کا عہدہ پیدا کیا۔ ۱۹۷۸ء میں ضیاء نے انہیں ترقیاتی اور منصوبہ بندی کے لیے اپنا مشیر مقرر کیا۔ ۱۹۸۵ء میں غلام اسحاق خان،

جنرل ضیاء کی کوششوں سے سینٹ کے رکن بنے اور بعد ازاں انہی کی آشیر باد سے چیئرمین سینٹ بنے۔ ۱۷ راگست ۱۹۸۸ء کے حادثہ نے انہیں عبوری صدر بنا دیا گیا۔ اگلے تین جمہوری ادوار میں وہ صدر کے عہدہ پر رہے۔ نواز، اسحاق چپقلش بالآخر ان کی صدارت کے خاتمہ کا سبب بنی۔ لیکن انہوں نے اسمبلی کو دوبارہ توڑ دیا۔ ہم تو ڈوبے ہیں صدر تمہیں بھی لے ڈوبیں گے۔
(حسین، مجاہد، پاکستان کے متنازعہ سیاستدان، لاہور، ص ۲۴۳۔۲۴۹)

(۶۳) ایضاً، ص ۲۴۵۔ (۶۴) ایضاً (۶۵) ایضاً
(۶۶) ایضاً، ص ۲۴۶ (۶۷) ایضاً (۶۸) ایضاً، ص ۲۴۷۔
(۶۹) ایضاً (۷۰) ایضاً، ص ۲۴۸۔
(۷۱) سہیل اظہر، بحوالہ سابقہ، ص ص ۱۳،۳۲

باب ششم

مولانا شاہ احمد نورانی اور اسلامی جمہوری محاذ

۱۹۸۸ء میں پیپلز پارٹی نے مارشل لاء کے تربیت یافتہ انتظامیہ سے اقتدار کی ڈیل، ان کی تمام شرائط تسلیم کر کے کی تھی۔ اس لیے انہیں ہر "برسر اقتدار گروہ" کے ساتھ رہنے والے ماسہ لیس سیاسی عناصر کو بھی ساتھ ہی قبول کرنا پڑا۔ انہی لوگوں نے گیارہ سال تک مارشل لاء کی مسلسل حمایت کر کے اسے استحکام بخشا تھا۔ اندریں حالات پیپلز پارٹی اقتدار برقرار رکھنے کے لیے ان کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرنے کو تیار تھی۔ رفتہ رفتہ موقع پرستوں کا یہ گروہ پارٹی میں اتنا طاقتور ہو گیا کہ نہ صرف پارٹی کے بنیادی سیاسی نظریہ کو گزند پہنچی بلکہ عوام سے اس کا تعلق ختم ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ موقع پرستانہ سیاسی روایات کی حامل کسی بھی پارٹی سے عوام کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نہ ہی یہ لوگ عوام کو کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار ہوتے ہیں (۱)۔ انہی موقع پرستوں نے بھٹو مرحوم کے زمانہ میں ہی پارٹی میں اس حد تک اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا کہ ۱۹۷۷ء کی احتجاجی تحریک میں بھی پیپلز پارٹی کی اس وقت کی لیڈر شپ نے عوام سے رجوع کرنے کی بجائے پاکستان کی روایتی جاگیردارانہ اور سیاسی جوڑ توڑ کی روایت کو ہی فروغ دیتے ہوئے زمینی حقائق نظر انداز کر دیئے۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوج میں اقتدار پسند عناصر کو آگے بڑھنے کا حوصلہ اور موقع ملا۔ (۲)

بے نظیر بھٹو نے ۱۹۸۲ء میں جب پارٹی کی لیڈر شپ سنبھالی تھی تو ان کا پارٹی کے مقامی لیڈروں اور کارکنوں سے کوئی رابطہ نہیں تھا (۳)۔ جب تک (۱۹۸۴ء) وہ پاکستان میں رہیں مارشل لاء رکاوٹوں کی وجہ سے پارٹی کارکنوں سے رابطہ نہ رکھ سکیں۔ جب انہوں نے فرانس میں سیاسی پناہ حاصل کی تو بھی ان سے صرف وہی معدودے چند افراد مل سکتے تھے جو اہل ثروت تھے۔ اس طرح جب وہ دس اپریل ۱۹۸۶ء کو واپس آئیں تو وہ "مظلوم بے نظیر بھٹو" تھیں، جو کہ مارشل لاء کے زیر عتاب لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی تھیں اور انہیں اس مظلومیت کے چیک کو کیش کرانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی (۴)۔ پارٹی کی اس وقت کی قیادت نے

بے نظیر اور عوام میں فاصلے کو مٹنے نہیں دیا بلکہ اس فاصلے کو بتدریج بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا(۵)۔ نئی پارٹی قیادت کے توسط سے ہی ساتھ مارشل لاء کے بہت سے حامی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور پارٹی کے پالیسی معاملات پر اثر انداز ہونے لگے۔ جس کا فطری نتیجہ واضح تھا کہ پارٹی کے مخلص اور مارشل لاء صوبہ پنجاب میں اٹھانا پڑا جہاں اسے ۱۹۸۸ء میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نئی پارٹی قیادت نے اپنی شکست کے اسباب وعلل جاننے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں کی اور انتظامیہ کے پیش کردہ مشروط اقتدار کے مزے لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔(۶)

اس صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا کہ سابق مارشل لاء کے مستفید کنندگان اور سازشی عناصر کو ستانے اور سیاسی صف بندی کا سنہری موقع مل گیا۔

قبل ازیں ضیاء کی موت کے بعد جونیجو حکومت کے ایک وزیر حاجی سیف اللہ نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی تھی۔ اگرچہ اس کیس کا فیصلہ جونیجو حکومت کے حق میں ہوا کہ حکومت اور اسمبلیوں کی معزولی کو غیر قانونی قرار دینے سے متعلقہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلہ کو برقرار رکھا گیا لیکن ساتھ ہی سپریم کورٹ اسمبلیاں اور حکومت کو بحال نہ کرنے کا فیصلہ سنایا(۷)۔ جبکہ بے نظیر کی درخواست پر فیصلہ دیتے ہوئے عدالت عظمٰی نے فیصلہ دیا کہ غیر جماعتی انتخابات کا ضیاء الحق کا حکم منسوخ کیا جاتا ہے اور ہر سیاسی جماعت کو اپنے نام سے انتخابات میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔ عام انتخابات ۱۹۸۸ء کے نتیجے میں بے نظیر حکومت قائم ہوئی لیکن قیام حکومت کے محض چند دنوں کے اندر اندر گورنر بلوچستان جنرل موسیٰ خان نے اسمبلی تحلیل کر کے گورنر راج نافذ کر دیا(۸)۔ ☆ بلوچستان اسمبلی کی تحلیل کا واقعہ حکومت کے لیے ایک انتباہ تھا کہ فوج ایک دن مرکزی حکومت کو بھی رخصت کر دے گی۔(۹)

جمہوری حکومت کے پہلے ہی مہینے میں اس معرکہ آرائی کے نتیجہ میں سیاسی مبصرین واضح طور پر اس خطرے کو دیکھ رہے تھے جو پیپلز پارٹی اور حزب اختلاف کی باہمی چپقلش کے نتیجے میں وجود میں آ چکا تھا۔ انہی سیاسی حلقوں نے اس کشمکش کے پیچھے خفیہ ہاتھ کی کارفرمائی بھی صاف طور پر محسوس کر لی تھی۔(۱۰) پھر خدشات بالآخر حقیقت میں تبدیل ہوتے چلے گئے

☆ جنوری ۱۹۸۸ء میں بلوچستان ہائی کورٹ نے اسمبلی بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکومت نے اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل نہ کرنے کا اعلان کیا اور ہائی کورٹ کے فیصلے کو قبول کر لیا۔

اور ۶ راگست ۱۹۹۰ء کی شام صدر پاکستان غلام اسحاق خان نے مرکزی اسمبلی توڑنے اور بے نظیر بھٹو کی حکومت کو برطرف کرنے کا اعلان کر دیا۔ بعد ازاں صوبائی اسمبلیاں بھی توڑ دی گئیں۔ اسمبلیاں توڑتے وقت صدر کی طرف سے حکومت پر کئی طرح کے الزامات عائد کیے گئے جن میں انتظامی نا اہلی، کرپشن و اقرباء پروری، آئینی بے ضابطگیاں، اعلیٰ عدالتوں کی تضحیک اور اصلاحی ترمیم سے غفلت سرفہرست تھی۔ لیکن سیاسی پنڈتوں کے نزدیک یہ چارج شیٹ درحقیقت حقیقی اختلافات سے توجہ ہٹانے کی ایک کوشش تھی جو طاقت کے دو بڑے سرچشموں حکومت اور فوج میں پیدا ہو چکے تھے۔(۱۱)

یہ بھی حقیقت تھی کہ پیپلز پارٹی کے ماضی کو دیکھتے ہوئے، بالخصوص مارشل لاء حکام نے جو رویہ پی پی کے ساتھ روا رکھا تھا، اس کے تسلسل میں یہ بات بالکل عیاں تھی کہ فوج انتخابات سے پہلے ہی پی پی کے خلاف تھی۔ بعد ازاں سندھ، کشمیر، افغانستان کرپشن اور تقرریوں جیسے امور نے حکمران پارٹی اور فوجی انتظامیہ کے دوران کافی کشیدگی پیدا کر دی تھی(۱۲)۔ بلکہ یہ پہلو بھی کھل کر سامنے آ گیا تھا کہ فوج نے بے نظیر کو شروع سے ہی ہچکچاہٹ کے ساتھ قبول کیا تھا، بلکہ باخبر حلقوں کے بقول اگر امریکہ کی طرف سے پاکستانی انتظامیہ پر دباؤ نہ ڈالا جاتا تو بے نظیر کو کبھی بھی اقتدار نہ ملتا۔(۱۳) انہی حالات کا منطقی نتیجہ تھا کہ ملک کے سیاسی منظر سے پیپلز پارٹی کو ہٹا دیا گیا۔ پیپلز پارٹی ہٹاؤ مہم میں ملک کے تمام چھوٹے بڑے سیاسی عناصر کے علاوہ خفیہ ادارے اور انتظامیہ کے کئی سرکردہ افراد بھی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے(۱۴)۔ جنہیں آئین اور قانون کی رو سے غیر سیاسی اور غیر جانبداران رہنا چاہیے تھا۔ ان عناصر کی جانبداری تو اس وقت ہی واضح ہو گئی تھی جب ایک درجن افراد پر بددیانتی کا الزام لگا کر ۲۳۷ افراد پر مشتمل اسمبلی توڑ کر (عبوری) اقتدار، قائد حزب اختلاف (غلام مصطفیٰ جتوئی) کو دے دیا گیا تھا۔(۱۵)، اگر نگران حکومتیں بنانے کے ضمن میں اس وفاقی فارمولے پر ہی عمل کیا جانا تھا تو پھر اصولی طور پر پنجاب اور بلوچستان میں بھی اقتدار حزب اختلاف کو ملنا چاہیے تھا۔ (لیکن اس پر عمل نہ کیا گیا)(۱۶)

پیپلز پارٹی کے اقتدار کے خاتمے کے فوراً بعد کیفیت یہ تھی کہ عام لوگ واقعی نجات کی سی کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی بطور وزیراعظم تقرر کے فیصلے پر اگرچہ کسی بھی حلقے کی جانب سے بہت زیادہ پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ مگر وفاقی کابینہ میں بھی ایسے

لوگ شامل تھے جو کسی طور پر بھی غیر جانبدار نہیں کہلا سکتے تھے۔ اس سے بھی نگران حکومت کی نیک نامی کو گزند پہنچی (۱۷)۔ تاہم ۸؍ اگست ۱۹۹۰ء کو نگران وزیر اعظم پاکستان غلام مصطفیٰ جتوئی نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اپنی پوزیشن واضح کرنے کی حتیٰ المقدور سعی کی لیکن وہ اپنی مبینہ جانبداری کو بالکل نہ چھپا سکے "احتساب کے عمل کے باوجود انتخابات ۲۴؍ اکتوبر کو ہی ہوں گے اور کسی کو اس بارے میں شک نہیں ہونا چاہیے۔ گزشتہ بیس ماہ میں بے مثال کرپشن کی گئی۔ جس کا حساب ہونا چاہیے وہ چور دروازے سے نہیں آئے۔"

یہ ایک مسلمہ پارلیمانی اصول ہے کہ وزیر اعظم کے ناکام ہو جانے کی صورت میں قائد حزب اختلاف کو موقع دیا جاتا ہے۔ اسمبلیاں تڑوانے اور انہیں اقتدار دلانے میں فوج کا ہاتھ نہیں۔ میری تقرری آئینی طریقے سے عمل میں آئی ہے۔ گزشتہ دس سالوں میں مجھے قابل رشک عہدے پیش کیے گئے لیکن میں نے انکار کیا کیونکہ میں اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے دانستہ طور پر الیکشن کمیشن میں جگہیں خالی چھوڑی تھیں۔ وفاقی کابینہ نے الیکشن کمیشن کو ہدایات جاری کی ہیں کہ وہ الیکشن کرانے کی تیاریاں تیز کر دیں۔ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ قومی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے عمومی طور پر صدر اسحاق کے اقدام پر نکتہ چینی کی ہے اور بے نظیر کی حکومت کو فوج نے برطرف کیا ہے۔ سابق وزیر اعظم نے متعدد مواقع پر فوج کو اس بات پر خراج تحسین پیش کیا تھا کہ اس نے جمہوری عمل جاری رہنے دیا ہے۔ نومبر ۱۹۸۸ء میں مسز بے نظیر بھٹو کو قطعی اکثریت حاصل نہیں ہوئی تھی اور "ٹیکنیکل طور پر" انہیں وزیر اعظم نامزد نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن بعض حلقوں کے دباؤ پر انہیں یہ عہدہ دیا گیا۔

اس دفعہ فوج حفاظتی اقدام کے طور پر آئی تھی جبکہ مسز بھٹو کے سارے دور حکومت میں ہزاروں کی تعداد میں فوج سندھ کے بڑے شہروں میں گشت کرتی رہی ہے۔ انہوں نے انٹیلی جنس بیورو اور ایف آئی اے جیسے اداروں کا ریکارڈ سربمہر کرنے کا حکم دیا ہے اور فوج نے اپنے طور پر ان دونوں اداروں کو تحویل میں لے لیا ہے۔ ہم نے بھاری اکثریت سے بھٹو حکومت کی برطرفی کا خیر مقدم کیا ہے کیونکہ اس کے دور میں بدعنوانی اور بدامنی کی وجہ سے ملک میں مسلسل بحران رہا۔ ہم چاہتے ہیں کہ جمہوریت اور انصاف شانہ بشانہ چلیں۔ ٹریبونل گزشتہ بیس ماہ کے دوران ہونے والی لوٹ کھسوٹ کی تحقیقات کریں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ دیانتدار اور اہل افراد پر مشتمل اپنی وسیع المعیاد کابینہ کی توسیع دیں جو ۲۴؍ اکتوبر کو اعتماد اور فخر

کے ساتھ رائے دہندگان کے سامنے آ سکے۔ انتخابات ان کی حکومت کی اولین ترجیح ہے۔ کرپشن کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء میں سیاست دانوں کو احتساب کے عمل سے گزرنا پڑا تھا۔ اگر میرے خلاف کسی کے پاس کوئی الزام ہے تو میں اب بھی اس کا سامان کرنے کے لیے تیار ہوں اور اگر میرے کسی ساتھی کے خلاف ٹھوس ثبوت مہیا کیا جائے تو میں اسے معاف نہیں کروں گا چاہے وہ میرا کتنا ہی پیارا اور میرے کتنے ہی قریب کیوں نہ ہو۔ احتساب کا عمل انتقامی کارروائی نہیں ہے۔ ہم اس قسم کی بات سوچ نہیں سکتے۔ اس طرح مارشل لاء کے آٹھ سالوں اور جونیجو حکومت کے دوران جسے ضیاء الحق نے بدعنوانی کے الزام میں برطرف کیا تھا۔ مال بنانے والوں کے خلاف کسی نے کارروائی کا ارادہ نہیں کیا۔ ہنگامی حالات کے اعلان کے باوجود بنیادی حقوق معطل نہیں ہوئے صرف ان لوگوں کے ملک سے باہر جانے پر پابندی لگائی گئی ہے جو بدعنوانی کے مختلف الزامات کے تحت تفتیش کے لیے مطلوب ہیں۔ میں نے سابق وزیر اعظم کے خلاف دوسری تحریک عدم اعتماد پیش کرنے سے اس لیے اجتناب کیا۔ کہ اس سے پھر وہی ہارس ٹریڈنگ شروع ہو جاتی جو پہلی تحریک عدم اعتماد کے موقع پر ہوئی تھی۔ موجودہ صورت حال میں متحدہ حزب اختلاف کا کوئی وجود نہیں رہا لیکن آئی جے آئی موجود ہے۔ آئندہ انتخابات میں آئی جے آئی ایک زیادہ طاقتور اتحاد کے طور پر ابھرے گی۔ سابق دور حکومت میں بخشی ہوئی نوکریوں کی تحقیقات کرتے وقت وہ ان لوگوں کی ملازمت برقرار رکھنے کی کوشش کریں گے جو میرٹ پر بھرتی کیے گئے تھے۔ عنقریب وہ سندھ کے شہروں اور اندرونی علاقوں کا دورہ کریں گے تاکہ اس گڑبڑ والے صوبے میں امن و امان بحال کرنے کا کام تیز ہو سکے۔

سندھ میں امن و امان کی صورتحال بہتر بنانے کے لیے وہ ممکن اقدام کریں گے اور ضروری ہوا تو فوج کو دفعہ ۲۴۵ کے تحت اختیارات بھی دیں گے۔ سابق حکومت کی افغان اور کشمیر پالیسی صحیح خطوط پر نہیں تھی اور کشمیر کے سلسلے میں مسز بھٹو کے غیر ملکی دوروں کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ بہر حال اس بات کا قوی امکان ہے کہ مسز بے نظیر کے دور میں پاکستان نے کبھی کشمیریوں کو خفیہ امداد نہیں دی اور اس پالیسی کو ہم بھی برقرار رکھیں گے۔ نگران حکومت کے قیام پر اندرون ملک عوام نے زبردست خوشنودی کا اظہار کیا ہے۔ بیرون ملک اس حکومت کے قائم ہونے پر کیا ردعمل ظاہر کیا گیا ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں

کسی بیرونی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں پاکستان کے عوام ہمارے ساتھ ہیں۔" (۱۸)

غلام مصطفیٰ جتوئی کی تقریر نہ صرف یہ کہ آئی جے آئی کی برملا حمایت کا اظہار تھی بلکہ نگران حکومت کے غیر جانبدار رہنے کے مسلمہ جمہوری اصولوں کے خلاف تھی (۱۹)۔ اس جانبداری کا عملی مظاہرہ اس وقت سامنے آیا۔ جب گورنر ہاؤس پنجاب تمام سازشوں کا گڑھ بن گیا۔ جہاں صوبائی معاملات عملاً میاں نواز شریف کے زیر نگرانی چلائے جانے لگے۔ بلکہ یہاں تک بھی دیکھا گیا کہ وہ اپنی انتخابی مہم کے لیے گورنر کا طیارہ بھی استعمال کرتے۔ جہاں تک غلام مصطفیٰ جتوئی کے اس الزام کا تعلق تھا، کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نہ دانستہ طور پر الیکشن کمیشن میں جگہیں خالی چھوڑی تھیں (۲۰)۔ (تا کہ اگلے الیکشن سے پہلے پی پی اپنی مرضی کے لوگ تعینات کر کے مطلوبہ نتائج حاصل کر لیتی) دراصل ان اقدامات پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش تھی۔ جو سیکریٹری الیکشن کمیشن کی تبدیلی اور دیگر انتظامی امور کے مسئلہ میں اُٹھائے گئے تھے۔ حقیقت کچھ یوں تھی کہ نگران حکومت نے الیکشن کمیشن کے سیکریٹری حیدر محمد چوہان کو تبدیل کر کے چوہدری شوکت علی کو تعینات کر دیا تھا جو جنرل ضیاء الحق کے دور میں ان کے منظور نظر رہنے اور تیزی سے ترقی پانے کے باعث قابل قبول نہیں رہے تھے (۲۱)۔

مزید برآں الیکشن کمیشن کی تشکیل میں بھی اس امر کا خصوصی خیال رکھا گیا کہ پیپلز پارٹی کا کوئی خیرہ خواہ اس کے قیرب بھی نہ پھٹک سکے۔ بلکہ پی پی مخالف افراد کو کمیشن میں کلیدی عہدوں پر تعینات کیا گیا تا کہ حسب منشاء نتائج کے حصول میں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے۔ (۲۲)

یہ ساری پلاننگ بظاہر اسمبلیاں ٹوٹنے کے بعد کی گئی تھی لیکن یہ پہلو قابل غور ہے کہ آئی جے آئی کے رہنما ایک عرصہ سے انتخابات کی تیاریوں میں مصروف تھے (۲۳) اسمبلیاں ٹوٹنے سے محض ایک روز قبل پنجاب میں مختلف حلقوں میں متعدد تبدیلیاں اور تبادلے کیے گئے۔ پنجاب سیکریٹریٹ میں انتخابی حلقوں کی ابتدائی حد بندیوں کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ جبکہ دوسری طرف وزراء کی عوام میں بڑھتی ہوئی نامقبولیت، بیس ماہ کی خراب کارکردگی، جمہوری قوتوں خصوصاً ایم آر ڈی سے بگاڑ کی وجہ سے یہ قبل از انتخابات کی تیاریاں بے جا نہیں تھیں لیکن حکومت ناتمام عوامل سے بے نیاز چین کی بانسری بجا رہی تھی۔ (۲۴)

اس صورتحال میں جلتی پر تیل کا کام اندرونی و بیرونی مسائل نے کیا۔ بیرونی محاذ پر

کشمیر، افغانستان اور پاک بھارت تعلقات جبکہ اندرون ملک خصوصاً صوبہ سندھ کے حالات بھی حکومت کی ناکام خارجہ و داخلہ پالیسی کے غماز تھے۔ ان میں سندھ کے مسئلے نے سب سے زیادہ نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ سندھ میں فوجی کے مبینہ کردار کے حوالے سے پیپلز پارٹی اور فوج کے درمیان پہلا اختلاف ایم کیو ایم کے خلاف آپریشن پر ہوا۔ (۲۵)

سندھ کے علاوہ فوج اور پیپلز پارٹی میں ایک اور اہم اختلاف پاکستان کی جغرفیائی صورتحال کے حوالے سے تھا۔ فوجی منصوبہ ساز پاکستان، بنگلہ دیش، ایران، ترکی اور افغانستان کی ایک ایسی کنفیڈریشن تشکیل دینا چاہتے تھے جس کے ذریعے ہندوستانی اثر و رسوخ اور بالادستی کا مقابلہ کیا جا سکے (۲۶)۔ لیکن بے نظیر حکومت اس سلسلے میں پیش قدمی کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ مسئلہ کشمیر پر کمزور گرفت اور افغانستان کے مسئلہ سے عدم دلچسپی اور اس پر خلیج کی صورتحال نے حکومتی تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی (۲۷)۔ جونہی عراق نے کویت پر چڑھائی کی پاکستان میں حکومت کی تبدیلی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ حکومت کی تبدیلی کے محض چند روز بعد ہی پاکستان کی نگران حکومت نے سعودی عرب میں اپنی فوجیں بھیجنے کا فیصلہ کر لیا جبکہ محترمہ اس سلسلے میں تعاون کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتی تھیں۔ (۲۸)

ان حالات میں جب بے نظیر حکومت برطرف کر دی گئی تو اس بے طرفی کو غیر قانونی اور غیر آئینی قرار دیتے ہوئے صدارتی اقدام کو عدالت میں چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑے جانے کے خلاف سندھ، پنجاب اور سرحد کی ہائی کورٹوں میں متعدد رٹ درخواست دائر کی گئیں۔ ۱۹/ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو سندھ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں بے نظیر بھٹو کی حکومت کی برطرفی کے اقدامات کو آئینی لحاظ سے جائز قرار دیا (۲۹)۔ سندھ ہائی کورٹ کی فل بنچ نے تین درخواستوں کو مسترد کر دیا جن میں قومی اسمبلی کے توڑے جانے کو چیلنج کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سندھ ہائی کورٹ نے یہ قرار دیا کہ گورنر سندھ کی طرف سے سندھ کی صوبائی اسمبلی کو توڑے جانے کا حکم بھی جائز ہے (۳۰)۔ ☆ لہٰذا اب سوائے عام انتخابات میں حصہ لینے کے پیپلز پارٹی کے لیے کوئی چارہ کار نہیں بچا تھا۔

عام انتخابات ۱۹۹۰ء طے شدہ شیڈول کے مطابق ہوئے (۳۱) ☆☆۔

☆ واضح رہے کہ یہ فیصلہ عام انتخابات کے انعقاد سے محض دس روز پہلے آیا تھا۔

☆☆ انتخابی نتائج کی تفصیل کے لیے دیکھیے۔ انجم، زاہد، حسین، الیکشن ۱۹۹۷ء، لاہور، ۱۹۹۷ء۔

۲۴ر اکتوبر کو قومی اسمبلی جبکہ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے (۳۲)۔

ان انتخابات میں حسب معمول دینی جماعتیں خاطر خواہ کارکردگی کا ظاہرہ نہ کر سکیں کیونکہ جب تک مختلف دینی قوتیں اپنے اندر اتفاق واتحاد اور تنظیم پیدا نہیں کر لیتیں، اس وقت تک یہ ممکن نہیں کہ وہ خاطر خواہ انتخابی نتائج دے سکیں۔ مزید برآں پاکستان کی سابقہ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ دینی قوتوں کو ہمیشہ مقتدر حلقوں نے اپنی مطلب براری کے لیے استعمال کیا اور بعد ازاں انہیں کارزر کر دیا گیا (۳۳)۔ مختلف دینی جماعتوں کے فروعی اختلافات اپنی جگہ لیکن سیاسی میدان میں جس حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے فروعی اختلافات کو وقتی طور پر پس پشت بھی ڈالا جا سکتا ہے (۳۴)۔ اگر ماضی میں متحدہ جمہوری محاذ (یو ڈی ایف) اور پاکستان قومی اتحاد کی تشکیل میں فروعی مناقشت آڑے نہیں آئی تھی تو اب بھی ضرورت تھی کہ دینی جماعتیں گزشتہ سیاسی شعور کو دوبارہ بروئے کار لاتیں اور دونوں مقتدر بڑی جماعتوں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کے باری باری اقتدار کے کھیل کو ختم کرتے ہوئے ایک مؤثر تیسری سیاسی قوت کے طور پر سامنے آئیں۔ اگرچہ انفرادی سطح پر دینی سیاسی جماعتوں کی کوششیں لائق تحسین ہیں (۳۵) ☆۔ لیکن قومی سطح پر کسی بھی دین سیاسی جماعت کو مؤثر سیاسی قوت اور پذیرائی حاصل نہیں ہے (۳۶) ☆☆۔ تاہم یہ امر قابل ذکر ہے کہ دینی جماعتوں کو کبھی بھی عوامی عدم حمایت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن مختلف جماعتوں میں ووٹوں کی تقسیم سے عوامی رائے کی منقسم ہونے کے ساتھ ساتھ ووٹ کی قوت ضائع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ دینی جماعتیں اپنی قوت کو مؤثر بنانے کے لیے مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہو کر سیاسی جدوجہد کو یقینی بناتیں۔

☆ مثال کے طور پر جماعت اسلامی کی تنظیمی قوت اس ضمن میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ سیاسی جماعتیں نہ صرف اپنے اندر موثر تنظیمی عملکو فروغ دیتیں بلکہ انتخابات میں Seating Adujstment کے لیے اتحاد و اشتراک کا بھرپور مظاہرہ کرتیں۔

☆☆ اگر دینی قوتیں حصول اقتدار کے لیے بنائے گئے اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی) کا حصہ بن کر، مقتدر حلقوں کے آلہ کار کے طور پر استعمال ہو سکتی ہیں تو ان میں باہمی اتفاق و اتحاد کا نہ ہونا بعید از عقل کیوں دکھائی دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پس منظر میں خود غرضی اور لایعنی مناقشت اہم عوامل ہیں۔

جہاں تک جمعیت علمائے پاکستان کا تعلق تھا اس کی اعلیٰ قیادت کی شروع سے ہی کوشش رہی ہے کہ صرف ہم خیال سیاسی جماعتوں سے ہی اشتراک عمل کیا جائے۔ عام انتخابات ۱۹۹۰ء میں چونکہ قابل ذکر ہم خیال سیاسی جماعتیں، اسلامی جمہوری اتحاد کا حصہ بن گئی تھیں (۳۷)۔ اس لیے دوران انتخابات جمعیت کا کسی بھی ہم خیال سے انتخابی اتحاد ممکن نہ ہو سکا۔ جہاں تک انتخابی نتائج کا تعلق تھا تو مختلف سیاسی وصحافتی حلقوں نے الیکشن کے انعقاد کو ''انجینئرڈ'' قرار دیا۔ (۳۸) ☆

مولانا شاہ احمد نورانی نے بھی مقتدر حلقوں پر الیکشن میں دھاندلی کا الزام لگایا۔ ان کے بقول: ''۱۹۹۰ء کے الیکشن میں پورے پاکستان میں بہت سی جگہوں پر وسیع پیمانے پر دھاندلی ہوئی...... اس وقت ایک الیکشن سیل موجود تھا جس کے ذریعے یہ دھاندلی ہوئی۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ کراچی میں پروفیسر شاہ فرید الحق کے حلقہ کا نتیجہ (رات) گیارہ بجے ہی آ گیا جبکہ ان کے حلقے کی گنتی ابھی ہو رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پروفیسر صاحب ہار گئے...... لیاقت آباد سے عمران فاروق کے ایک لاکھ اکیس ہزار ووٹ تھے اور بارہ بجے ہی رزلٹ آ گیا کہ عمران فاروق ایک لاکھ اکیس ہزار ووٹ سے جیت گئے۔ صبح پتہ چلا کہ فاروق کے ۵۲ ہزار ووٹ ہیں جبکہ ہمارے امیدوار کے ۳۷ ہزار ووٹ ہیں۔'' (۳۹)

بعض پی پی کے حامی صحافی حلقوں نے یہاں تک بھی کہا کہ الیکشن نتائج تبدیل کرنے کے لیے ڈپٹی کمشنر کو باقاعدہ ہدایت بھیجی گئی تھیں اور کوئی بھی نتیجہ ڈپٹی کمشنر کی منظوری کے بغیر سامنے نہیں آ سکتا تھا۔ جعلی ووٹوں کے لیے نسبتاً ویران علاقوں میں نام نہاد پولنگ اسٹیشن قائم کیے گئے تھے اور ملک کے کسی بھی ایک حلقہ میں ایسا نہیں ہوا کہ اپوزیشن امیدواروں نے اپنے پولنگ ایجنٹ کو باقاعدہ گنتی کی پکی رسید نہ ملنے کی شکایت نہ کی ہو۔ ایک ایک حلقہ میں کم وبیش بیس بیس ہزار جعلی ووٹوں کا انتظام تھا۔ جہاں تک نواز شریف کے ذاتی حلقہ

☆ بعد ازاں نگران وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی نے بھی تسلیم کیا کہ انتخابی عمل میں دھاندلی کا عنصر شامل تھا۔ انہوں نے کہا کہ نگران حکومت کو انتخابی عمل میں مداخلت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مزید برآں مطلوبہ نتائج کے حصول کے لیے دھاندلی کی گئی تھی اور نوابزادہ نصر اللہ، ولی خاں اور پیر پگاڑا کو ایک سازش کے تحت ہرایا گیا۔ (منیر احمد، بحرانوں کا دور، ص ۲۴، ۲۵)

۹۵ کا تعلق تھا (جہاں کے مقابلے پر ایئر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان تھے) وہاں دھاندلی کا یہ عالم تھا کہ صرف ایک علاقہ میں (۹۵ ریلوے روڈ کے پتہ پر) ساڑھے سات سو ووٹ رجسٹر کروائے گئے۔ اس کے علاوہ میاں نواز شریف نے کم و بیش دس ہزار سرکاری ملازمتیں اپنے حلقہ انتخابات میں تقسیم کیں۔

یہ تو پنجاب کی صورتحال تھی۔ سندھ میں دینی قوتوں بالخصوص جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اسلامی کو انتخابات ۱۹۸۸ء کی طرح ۱۹۹۰ء میں بھی ایم کیو ایم کی تشدد سیاست لے ڈوبی اور کلاشنکوف کے بل بوتے پر نہ صرف دھونس دھاندلی کے ریکارڈ قائم ہوئے بلکہ ووٹروں کو بھی ہراساں کر کے مطلوبہ نتائج کے حصول کو ممکن بنایا گیا۔ مولانا نورانی کے بقول:

''ہمارے لوگ جیسا گنتی کے وقت جاتے تو ایم کیو ایم کے غنڈے کلاشنکوفوں کے ذریعے انہیں بھگا دیتے تھے۔ ہم نے شکایتیں بھی کیں۔ فوج کو بھی کہا لیکن کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔ (یہ صحیح ہے کہ) جمعیت علمائے پاکستان وہاں (سندھ میں) کبھی بھی اقتدار میں نہیں رہی لیکن جے یو پی ''وونگ پاور'' بہر حال وہاں ہے۔ جماعت اسلامی (ہمارے برعکس) حیدر آباد اور کراچی کارپوریشن پر قابض رہی ہے۔ ہم بھی بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ بہر حال ان کے مقابلے میں ہم ایک طاقت تھے۔ کلاشنکوف کی سیاست اگر ختم ہو جائے تو جمعیت علمائے پاکستان اسی پوزیشن میں ہے جو ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء میں تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوگی کیونکہ لوگوں پر (ایم کیو ایم کی) حقیقت آشکارا ہو گئی ہے۔'' (۴۰)

حالات خواہ کچھ بھی رہے ہوں تاہم اب یہ حقیقت تھی کہ ۱۹۹۰ء) کے انتخابات کے نتیجے میں اسلامی جمہوری اتحاد کو دو تہائی اکثریت حاصل ہو گئی تھی۔ فوج فی الوقت نواز شریف کے ساتھ تھی۔ صدر اسحاق خان نواز شریف کو بیٹا سمجھتے تھے اور امریکہ نواز شریف کے ساتھ (عارضی طور پر ہی سہی لیکن) خوش تھا (۴۱)۔ اس لیے بطور وزیراعظم نامزدگی کا قرعۂ فال میاں نواز شریف کے نام نکلنا ایک فطری سی بات تھی لیکن بایں ہمہ غلام مصطفیٰ جتوئی نے ۲۷ر اکتوبر سے ۳۰ر اکتوبر ۱۹۹۰ء تک پانچ روز مسلسل کوشش جاری رکھی کہ ارکان قومی اسمبلی ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں (۴۲)۔ انہوں نے صدر اسحاق خان اور جنرل اسلم بیگ سے بھی برابر روابط رکھے لیکن بے سود۔ ان کی ایک نہ چلی اور اراکین قومی اسمبلی نے یکم نومبر کو میاں نواز شریف کو پارلیمانی لیڈر چن لیا۔ حالانکہ محمد خان جونیجو جیسے وزارت اعظمیٰ کے عہدے

کے سب سے بڑے مضبوط امیدوار کو بھی حالات کے سامنے جھکنا پڑا (۴۳)۔ کیونکہ ان دنوں وہ مسلم لیگ کے صدر بھی تھے اور پارٹی ڈسپلن کا تقاضا تو یہی تھا کہ محمد خان جونیجو کو وزارت عظمیٰ کا عہدہ دے دیا جائے لیکن نواز شریف کے بقول وزیراعظم وہی بنے گا جس کو ارکان اسمبلی کی اکثریت کی حمایت و تعاون حاصل ہو گا۔ لہٰذا یکم نومبر ۱۹۹۰ء کو پارلیمانی پارٹی کے اجلاس منعقدہ اسلام آباد میں نواز شریف پر بھرپور اعتماد کا اظہار کیا گیا (۴۴)۔☆ وزارت عظمیٰ کے عہدے کے لیے نام تجویز کرنے والوں میں محمد خان جونیجو، غلام حیدر وائیں اور فدا محمد خاں شامل تھے (۴۵)۔ اسی روز اجلاس کے بعد نواز شریف پشاور چلے گئے۔ اسلامی جمہوری اتحاد کی قیادت نے سرحد میں بھی نواز شریف کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ اب صرف ایک مشکل مرحلہ باقی تھا۔ یعنی اسلامی جمہوری اتحاد کی مرکزی قیادت سے نواز شریف کے نام کی تجویز اور منظوری۔ اس مقصد کے لیے یکم نومبر کی رات ہی نواز شریف نے جتوئی سے اسلام آباد میں ملاقات کی اور انہیں مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کے فیصلوں سے آگاہ کیا۔ جنہوں نے اس بات کی حامی بھر لی کہ وہ دو نومبر ۱۹۹۰ء کو اسلام آباد میں منعقد ہونے والے اسلامی جمہوری اتحاد کے اجلاس کے دوران وزارت عظمیٰ کے لیے نواز شریف کا نام خود تجویز کریں گے (۴۶)۔ چنانچہ اگلے روز وسیم سجاد، محمد خان جونیجو، قاضی حسین احمد، فخر امام، عابدہ حسین، مولانا عبدالستار نیازی اور مولانا سمیع الحق کی موجودگی میں غلام مصطفیٰ جتوئی نے نواز شریف کا نام تجویز کر دیا۔ اس سے اگلے روز تین نومبر ۱۹۹۰ء کو نو منتخب ارکان اسمبلی نے اپنے عہدے کا حلف اُٹھایا۔ (۴۷)

اسپیکر کے عہدے کے لیے گوہر ایوب اور ڈپٹی اسپیکر کے عہدے کے لیے نواز کھوکھر کے نام پیش کیے گئے جو بالترتیب ۱۴۶ اور ۱۴۳ ووٹ حاصل کر کے مذکورہ عہدوں پر منتخب ہوئے۔ ۶ نومبر ۱۹۹۰ء کو قومی اسمبلی کے ۱۵۳ ارکان نے نواز شریف کو وزیراعظم منتخب کر لیا۔ (۴۸)

☆ اجلاس میں شامل ایم کیو ایم کے ۱۵، عوامی نیشنل پارٹی کے چھ، جمعیت علمائے پاکستان مولانا نورانی گروپ کے تین، مولانا عبدالستار خان نیازی گروپ کے دو اور چھ آزاد ارکان نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ۱۰۵ ارکان کے ساتھ مل کر نواز شریف کو وزارت عظمیٰ کا امیدوار نامزد کرنے کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ (منیر احمد، بحرانوں کا دور، ص ۲۰)

صوبوں میں نواز شریف کے حمایت یافتگان کی حکومتیں بنیں۔ بالخصوص صوبہ پنجاب میں نواز شریف نے غلام حیدر وائیں جیسے کمزور اور تابع فرمان شخص کو وزارت اعلیٰ کے لیے آگے بڑھایا جو پی پی کے رانا اکرام ربانی کے ۸ ووٹوں کے مقابلے میں ۲۰۱ ووٹ لے کر وزیر اعلیٰ منتخب ہوگئے۔ (۴۹) لیکن سندھ میں صورحال مختلف تھی۔ جہاں نواز شریف نے صدر غلام اسحاق خان کی سفارش پر جام صادق کو مجبوراً وزیر اعلیٰ کے طور پر قبول کرنا پڑا (۵۰)۔

نواز شریف حکومت کی ابتدائی دھچکا امریکہ کی بندش سے لگا (۵۱)۔ جس کی وجہ سے حکومتی مالیاتی امور میں کئی طرح کی مشکلات حائل تھیں۔ اس کے علاوہ عراق پر امریکی حملے نے داخلی ملکی فضا کو حکومت کے لیے کافی پیچیدہ کر دیا (۵۲)۔ ان حالات میں نواز شریف نے ۱۲ جنوری ۱۹۹۱ء کو مشترکہ مفادات کی کونسل کا اجلاس طلب کیا۔ جس میں وزیر اعظم نواز شریف نے صوبوں کے مطالبات کو بڑے غور سے جائزہ لیا (۵۳)۔ صوبوں کی طرف سے فنڈز کے حصول کے لیے مطالبات میں شدت آئی تو وزیر اعظم نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ امریکی امداد کی بندش، بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے سرد رویے اور سرکاری خزانے میں موجود فنڈز کی کمی کی وجہ سے سردست صوبوں کو اضافی فنڈز مہیا نہیں کیے جا سکتے۔ تاہم انہوں نے صوبوں کو مالیاتی خود مختاری دینے کے لیے متعدد اقدامات کی منظوری دی۔ (۵۴)

مالیاتی مجبوریوں اور خلیج کی جنگ کی وجہ سے نواز شریف اور جنرل مرزا اسلم بیگ کے درمیان اختلافات کی خلیج بھی بڑھتی چلی گئی (۵۵)۔ چنانچہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ء کو چیف آف دی آرمی اسٹاف مرزا اسلم بیگ نے کور کمانڈروں کے اجلاس میں نواز شریف کی خلیج پالیسی کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا اور دفاعی ضروریات کے لیے امریکی امداد بحال کروانے کے لیے متعدد تجاویز پر غور کیا۔ (۵۶)

اس تبدیلی شدہ داخلی و خارجی صورت حالات میں نواز شریف کی حد درجہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ بالخصوص ایران اور امریکہ کی طرف سے یہ دباؤ کہ وہ ملک میں عراق سفارت خانہ کے منفی سرگرمیوں کو روکیں کیونکہ عراق سفارت خانہ پر الزام تھا کہ یہاں سے پاکستان کی بعض مذہبی جماعتوں کو صدام حسین کے حق میں مظاہرے کرنے کیلئے فنڈز فراہم کیے جارہے تھے۔ لیکن نواز نواز شریف نے عوامی احتجاج کو ایک طرف رکھتے ہوئے عراق قونصلر کو اسلام آباد چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ (۵۷)

خلیج کی صورتحال میں ایک طرف تو نواز شریف کو اندرونی محاذ پر مشکلات کا سامنا تھا۔ خاص طور پر مذہبی جماعتیں بار بار حکومت پر زور دے رہی تھیں کہ حکومت فی الفور صدام حکومت کی حمایت کا اعلان اور امریکی حملے کی مذمت کرے جبکہ فوج کی طرف سے دباؤ تھا کہ سعودی عرب پر ممکنہ حملے کی صورت میں پاکستان (امریکی حمایت میں) سعودی عرب کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی فوجیں سعودی عرب بھجوائے (۵۸)۔ حکومت نے اس کا حل یوں نکالا کہ افواج کو عرب میں مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لیے بھجوایا جا رہا ہے جبکہ عوامی ردعمل سے بچنے کے لیے نواز شریف امن مشن کے نام پر مسلم ممالک کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے۔ وہ ۲۲ جنوری ۱۹۹۱ء کو ایران، ۲۵ جنوری کی شام جبکہ ۱۱ فروری کو تیونس میں فلسطینی صدر یاسر عرفات اور ۱۲ فروری کو لیبیا میں صدر معمر قذافی سے اور ۱۳ فروری کو شاہ حسین سے مراکش میں ملاقات کی (۵۹)۔ جنگ خلیج نے نہ صرف نواز شریف کے سیاسی امیج کو نقصان پہنچایا بلکہ فوج نواز اختلافات سے اپوزیشن پارٹیوں کے حوصلے بھی بلند ہوئے۔ حتیٰ کہ نواز شریف کو اسلامی جمہوری اتحاد کی پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں متعدد مرتبہ زبردست تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ بلکہ اتحاد میں شامل مذہبی جماعتیں نفاذ شریعت کے نام پر ان کے خلاف سینہ سپر ہوگئیں۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ ۴ مارچ ۱۹۹۱ء کو مولانا عبدالستار نیازی نے اپنا استعفیٰ حکومت کو ارسال کر دیا (۶۰) جبکہ جماعت اسلامی کا نواز شریف سے مطالبہ تھا کہ وزارت خارجہ یا کم از کم وزارت خزانہ کا شعبہ ان کے حوالے کیا جائے لیکن نواز شریف نے ان دونوں امکانات کو نظر انداز کرتے ہوئے وزارت خارجہ کا عہدہ صاحبزادہ یعقوب علی خان کے سپرد کر دیا تھا (۶۱)۔☆ ابھی تک صدر غلام اسحاق خان محض ایک خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے چلے آئے تھے۔ لیکن جنوری ۱۹۹۱ء میں نواز اسحاق تعلقات اس وقت کشیدہ ہوگئے جب نواز شریف کو "لاہور رن وے پراجیکٹ" میں سنگین بدعنوانی کی اطلاعات میں وزیر اعظم کی قائم کردہ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں لاہور ایئر پورٹ کے رن وے کی ناقص تعمیر کی ذمہ داری غلام اسحاق خان کے دست راست اجلال حیدر زیدی پر عائد کر دی جو کہ نواز کابینہ کے اہم رکن بھی تھے (۶۲)۔

☆ لیکن صاحبزادہ یعقوب علی خان نے جنگ خلیج میں ناقص کارکردگی کے حکومتی الزام کے پیش نظر استعفیٰ دے دیا۔ اس سے بھی حکومت کے مقتدر حلقوں سے اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ (احمد منیر، بحرانوں کا دور، ص ۳۲، ۳۳)

پی ڈی اے میں شامل اپوزیشن جماعتوں نے جب نواز شریف کے فوج اور صدر سے تعلقات کشیدہ دیکھے تو قائد حزب اختلاف محترمہ بے نظیر بھٹو پر زور دیا کہ وہ ۱۴ مارچ ۱۹۹۱ء کو ہونے والی سینٹ کے انتخابات سے قبل ہی پی ڈی اے سے مستعفی ہو جائے تاہم بے نظیر نے اس قسم کے مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے سینٹ کے انتخابات میں حصہ لیا۔ پی ڈی اے کو سینٹ میں پانچ جبکہ اسلامی جمہوری اتحاد کو ۲۴ نشستیں حاصل ہوئیں جس کی وجہ سے نواز شریف کو سینٹ میں بھی اکثریت حاصل ہوگئی (۶۳) ☆۔ نواز شریف نے چیئر مین سینٹ کے عہدے کے لیے وسیم سجاد جبکہ ڈپٹی چیئر مین سینٹ کے لیے نور جہاں پانیزئی کو نامزد کیا (۶۴)۔ ۲۱ مارچ ۱۹۹۱ء کو سینٹ کے چیئر میں اور ڈپٹی چیئر مین کے انتخابات کے لیے وسیم سجاد کو ۷۰ جبکہ ان کے مد مقابل عبداللہ شاہ کو ۷ ووٹ ملے جبکہ ڈپٹی چیئر مین کے عہدے کے لیے نور جہاں پانیزئی کو ۶۶ اور حافظ حسین احمد کو ۹ ووٹ ملے (۶۵)۔ اس طرح اسلامی جمہوری اتحاد کو دونوں ایوانوں میں دو تہائی اکثریت حاصل ہوگئی۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسی ماہ حکومت نے صوبوں میں اپنی کی تقسیم اور مالیاتی وسائل کی تقسیم جیسے پیچیدہ اور لاینحل مسائل حل کیے۔ جو کہ اس حکومت کے مثبت پہلوؤں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ اس قسم کے جرأت مندانہ فیصلوں کے پس پشت یقیناً دو تہائی اکثریت قوت تھی۔ اسی دوران نواز حکومت نے اپوزیشن سے بھی بہتر تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ نواز شریف کی خواہش تھی کہ نگران دور میں بے نظیر اور اس کے شوہر پر بنائے گئے مقدمات کو واپس لے لیا جائے۔ تاہم غلام اسحاق خان نے اس تجویز کی اس بناء پر مخالفت کی کہ بے نظیر بھٹو کے خلاف زیادہ تر ریفرنس ایوان صدر کی طرف سے تیار کر کے جتوئی حکومت کو بھیجے گئے تھے۔ نواز شریف اپنی حکومت کا امیج بہتر بنانے کی بدستور کوشش کر رہے تھے لیکن دوسری طرف سازشی عناصر ان کے اقتدار کے لیے نئی صف بندی میں مصروف تھے۔ خصوصاً نواز شریف کو مسلم لیگ اور اتحاد کے اندر چھپے دشمنوں سے زیادہ خطرات لاحق تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اور محمد خان جونیجو دونوں کا شمار ''نواز زدگان'' میں ہوتا تھا۔ اس وجہ سے ان کا نواز شریف کے خلاف متحرک ہونا ایک فطری امر تھا۔ اس کا توڑ نواز شریف نے یوں کیا کہ ایجنسیوں کے ذریعے ایسے عناصر کی بھرپور نگرانی کرائی گئی (۶۶)۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے

☆ سینٹ میں ایم کیو ایم کو ۳، این این پی کو ۳، جمہوری وطن پارٹی کو بھی تین نشستیں ملیں پختونخواہ عوامی ملی پارٹی کو ایک، جبکہ آزاد ارکان کو پانچ نشستیں حاصل ہوئیں۔

غلام مصطفیٰ جتوئی نے بے نظیر سے روابط بڑھانے شروع کر دیے۔ (۶۷) اس سے پہلے کہ نواز شریف آصف زرداری کو رہا کرنے کا کوئی خیر سگالی فیصلہ کرتے۔ ۲۶ مارچ ۱۹۹۱ء کو سنگا پور ایئر لائن کے ایک طیارے کو چار پاکستانی ہائی جیکروں جاوید اختر، یوسف، زاہد سومرو اور فدا جدون نے اغواء کر لیا جس میں ۱۳۰ مسافر سوار تھے (۶۸)۔ ہائی جیکروں نے اپنا تعلق پی پی سے ظاہر کیا اور زرداری سمیت ۱۳ سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ تاہم سنگا پور کے کمانڈوز نے چاروں ہائی جیکروں کو ہلاک کر کے ان کی لاشیں ۳ر اپریل ۱۹۹۱ء کو پاکستان بھیج دیں۔ اپوزیشن کے حلقوں نے طیارے کے اغواء کی کارروائی کو پاکستان کی ایجنسیوں کی کارروائی قرار دیا (۶۹)۔ تاہم بعد ازاں اس طیارے کے اغواء کے حوالے سے کئی حقائق پس منظر میں چلے گئے اور یہ واقعہ قصۂ پارینہ بن گیا۔

نواز شریف کے وزیر اعظم بنتے ہی اسلام آباد اور واشنگٹن کے درمیان تعلقات میں سرد مہری آنا شروع ہوگئی تھی کیونکہ نواز شریف خود انحصاری کی پالیسی کے تحت بیرون قرضوں سے نجات چاہتے تھے۔ اسی دوران پاکستان پر ایٹمی پروگرام کے حوالے سے امریکہ دباؤ بڑھنا شروع ہوگیا کیونکہ امریکہ کو شک تھا کہ پاکستان نے خفیہ طور پر ایٹمی ہتھیار تیار کر لیے ہیں۔ جبکہ پاکستانی حکومت نے ایسی خبروں کی سختی سے تردید کی۔

نواز شریف نے حکومت سنبھالتے ہی جارج بش کے مبارک بادی پیغام کے جواب میں یہ بیان دیا کہ ہم امریکی امداد پر انحصار نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ نواز شریف نے خود انحصاری پر منحصر آزاد خارجہ پالیسی کا اعلان کر دیا۔ اس طرح ابتداء میں فوج اور صدر کی طرف سے بھی نواز شریف کے مضبوط مؤقف کی حمایت کی گئی (۷۰)۔ لیکن بعد ازاں نواز شریف کو پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت حاصل تھی۔ لہٰذا ضروری تھا کہ اس اکثریت کا کوئی توڑ تلاش کیا جاتا۔ لیکن جلد ہی اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل مذہبی جماعتوں کی حکومت سے ناراضگیوں نے مقتدر طاقتوں کے حق میں فضا سازگار بنانی شروع کر دی۔ چنانچہ ۳۰ مارچ ۱۹۹۱ء کو آٹھ مذہبی جماعتوں بشمول جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلامی فضل الرحمٰن وسیع گروپ، جمعیت الحدیث، جمعیت الحدیث، علماء کونسل اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ وغیرہ نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے اتحاد کر لیا۔ (۷۱) جبکہ دوسری طرف سندھ میں وزیر اعلیٰ جام صادق کی آمرانہ روش نے حکومت اپوزیشن تعلقات کو خاصی زک پہنچائی۔ اس طرح اسلامی جمہوری

اتحاد میں خلفشار نے نواز حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ کمزور اپوزیشن کے ساتھ اسی کی شرائط پر مذاکرات کرے (۷۲) لہٰذا یکم اپریل ۱۹۹۱ء کو نواز شریف کے قریبی ساتھیوں چوہدری نثار، چوہدری شجاعت حسین، غوث علی شاہ اور ارباب جہانگیر پر مشتمل ٹیم پاکستان ڈیمو کریٹک الائنس نے (پی ڈی اے) کی سربراہ بے نظیر سے مذاکرات کیے۔ بے نظیر کی معاونت سردار فاروق لغاری، نصر اللہ بابر، افتخار گیلانی اور افضل خان کر رہے تھے۔ اسی طرح وقتی طور پر حکومت اور اپوزیشن میں مفاہمت کے امکانات پیدا ہو گئے۔ "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول کے تحت بے نظیر نے قومی اسمبلی کے آئندہ اجلاس کا بائیکاٹ ختم کرتے ہوئے ۱۰ راپریل کو ایوان میں شرکت کو یقینی بنایا تو جواباً خیر سگالی کے طور پر چوہدری شجاعت نے بے نظیر کو آصف زرداری کے ساتھ ملاقاتوں کی اجازت دیدی۔ (۷۳) اس طرح جب ۱۱ راپریل کو سرکاری شریعت بل اسمبلی میں پیش ہوا تو بے نظیر بھی اسمبلی کے اجلاس میں موجود تھیں (۷۴)۔ ☆

نواز شریف اپوزیشن کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی کوششوں میں مصروف تھے تو دوسری طرف سندھ کے روز افزوں ابتر حالات کے لیے سوہانِ روح بنے ہوئے تھے۔ اس پر جام صادق کے اپوزیشن مخالف اقدامات نے حالات میں مزید تلخی پیدا کر دی تھی۔ بے نظیر کا مؤقف تھا کہ قومی اسمبلی کی ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی کو سندھ بھیجا جائے تا کہ وہاں کے حالات کا بغور مطالعہ کر کے حکومت کو اپنی سفارشات پیش کرے لیکن جام صادق نے اسے مرکز کی طرف سے صوبے کے معاملات میں مداخلت قرار دیا۔ انہی دنوں سندھ میں چینی انجینئرز کا اغوا حکومت کے لیے دردسر بنا ہوا تھا لیکن وزیر اعلیٰ سندھ نے بجائے عملی اقدامات کرنے کے اس کے اغواء کا الزام اپوزیشن حلقوں بالخصوص ممتاز بھٹو کے سر تھوپ دیا۔ امن عامہ کی اسی خراب صورتحال کے پیش نظر ۱۲ مئی ۱۹۹۱ء کو صدر اور فوج کی طرف سے نواز شریف کو ایوان صدر طلب کر کے عوام کی جان و مال کے تحفظ کے حوالے سے اپنے خدشات کا اظہار کیا (۷۵)۔ اسی صورتحال حالات کے تحت نواز شریف کو بعض سخت فیصلے بھی کرنا پڑے (۷۶)۔ انہوں نے ۱۲ جون ۱۹۹۱ء کو "سندھ آپریشن" کی منظوری دے دی کیونکہ نواز شریف کو اطلاعات ملی تھیں کہ سندھ میں قتل و غارت گری کی وارداتوں میں ایم کیو ایم کے دہشت گرد عناصر ملوث ہیں۔ (۷۷)

☆ سرکاری شریعت بل کو مذہبی جماعتوں نے ۲۴ راپریل ۱۹۹۱ء کو مسترد کر دیا تھا لیکن بعد ازاں یہ بل ۱۶ جولائی کو پاس ہوا۔ لیکن جب یہ بل منظور ہوا تو نواز ریف کے ۱۳۶ ساتھیوں میں سے ایوان میں ۱۰۶ ر ارکان موجود تھے۔ (منیر احمد ۱۴۹)

سندھ کی تشدد پسند سیاست نے جہاں نواز شریف کو حکومت کو خطرات سے دو چار کر دیا ہے، آزاد کشمیر میں وزیر اعظم ممتاز راٹھور کی بغاوت، ۱۲ راگست ۱۹۹۱ء تک اپوزیشن کے مستعفی ہونے کی دھمکیوں نے حالات مزید مخدوش کر دیئے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ اپوزیشن کے حربوں کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا، حالات نے ایک دفعہ پھر نواز شریف کے حق میں کروٹ بدلی اور ۱۶ راگست ۱۹۹۱ء کو فوج کی کمان جنرل آصف نواز کے ہاتھ آ گئی (۷۸)۔

جن دنوں (اگست و ستمبر ۱۹۹۱ء) نواز شریف اپوزیشن کی تحریک سے نمٹنے میں مصروف تھے۔ بھارت کی کوشش تھی کہ کسی طرح پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو تباہ کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں بھارت کو اسرائیل کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ امریکی اور بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی کوشش تھی کہ انہیں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوں۔ تاہم انہیں اس سلسلے میں محدود معلومات حاصل ہوئیں کیونکہ ایٹمی پروگرام کے کیموفلاج ہونے کی وجہ سے وہاں غیر متعلقہ افراد کی رسائی ناممکن بنا دی گئی تھی۔ تاہم حکومت کو اس وقت صریح پریشانی کا سامنا کرنا پڑا جب یکم ستمبر ۱۹۹۱ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے بین الاقوامی میڈیا کو محض حکومت کی مخالفت میں بہت ساری ایسی باتیں بھی کیں جو کہ ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت سے ان کا پوشیدہ رکھا جانا ضروری تھا۔ مثلاً انہوں نے غلام اسحاق خان اور فوج پر الزام عائد کیا کہ انہیں ایٹمی پروگرام سے ہمیشہ بے خبر رکھا گیا اور یہ بات ان (بے نظیر) کے علم میں نہ تھی کہ پاکستان ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکا ہے۔ دوسری طرف مسئلہ کشمیر پر بھارت امریکی گٹھ جوڑ کئی طرح کے ہولناک خدشات لیے ہوئے تھے (۷۹)۔ تاہم جنرل مرزا اسلم بیگ کی مدت ملازمت میں عدم توسیع سے نواز شریف کو وقتی طور پر سکھ کا سانس لینے کا موقع مل گیا کیونکہ مرزا اسلم بیگ گزشتہ تین سال سے اپنے عہدے پر براجمان ہونے کی وجہ سے ملکی سیاست کی کئی نزاکتوں سے واقف ہو گئے تھے۔ فوج کے نئے سربراہ جنرل آصف نواز کو صرف ملک کے داخلی استحکام اور فوج کے سرحدوں پر کردار سے دلچسپی تھی۔ جبکہ جنرل مرزا اسلم بیگ کے مدت ملازمت کے آخری ایام میں مارشل لاء کے خطرات بڑھ گئے تھے۔ تاہم جنرل آصف نواز نے آتے ہی اس یقین کا اظہار کیا کہ فوج سیاسی امور میں عدم مداخلت کی پالیسی کو جاری رکھتے ہوئے مارشل لاء سے اغماض برتے گی۔ اسی دوران بے نظیر بھٹو کی عدم موجودگی میں بیگم نصرت بھٹو نے ۲ ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کو آرمی چیف سے ملاقات کی جس سے

جمہوریت پسند حلقوں نے یہی تاثر لیا کہ شاید یہ ملاقات حکومت اپوزیشن مفاہمت کے سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے (۸۰)۔ لیکن ابھی یہ قیام ارائیاں جاری ہی تھیں کہ کہ اگلے اروز صوبہ سرحد کی ایک اہم شخصیت جنرل فضل حق کو سرحد اسمبلی کے اجلاس سے واپسی پر نامعلوم حملہ آوروں نے قتل کر دیا۔ ابھی یہ واقعہ تازہ ہی تھا کہ ۱۰/اکتوبر کو اندرون سندھ سے دو چینی انجینئرز اغواء کر لیے گئے (۸۱)۔☆ اس کے بعد ۱۱/اکتوبر ۱۹۹۱ء کے دوران ملک میں وقفے وقفے سے بم دھماکوں اور دہشت گردی کی وارداتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے نواز شریف کو ایک مرتبہ پھر پسپائی اختیار کر کے اپوزیشن جماعتوں سے مفاہمت کی راہ اختیار کرنا پڑی۔ ۲ نومبر کو ڈی آئی خان میں نواز فضل الرحمٰن ملاقات اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ (۸۲)
تاہم ملک میں جاری امن عامہ کی نازک صورتحال سے سیاسی فوائد کشید کرنے کے لیے نوابزادہ نصر اللہ خان نے انہی دنوں آل پارٹیز کانفرنس (A.P.C.) کے نام سے ایک نیا اتحاد بنا کر حکومت مخالف تحریک شروع کر دی۔ تاہم جلد ہی اے پی سی کے غبارے سے ہوا نکل گئی کیونکہ حکومت اپوزیشن مبہمات کے وجہ سے ۲۹/اکتوبر نومرب ۱۹۹۱ء کو کانفرنس کی طرف سے طلب کیا جانے والا اجلاس بے مقصد اور لا حاصل رہا کیونکہ بے نظیر نے اس میں شرکت کرنے سے معذرت کر لی تھی (۸۳)۔☆☆

حکومت اپوزیشن مفاہمت کی انہی کوششوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے سازشی عناصر کی طرف پی پی کے رہنما سردار شوکت حیات کی بیٹی وینا حیات کی بے حرمتی کی گئی جس کا الزام صدر غلام اسحاق خان کے داماد عرفان اللہ مروت پر لگایا گیا جن کے بارے میں یہ افواہ تھی کہ انہوں نے کراچی میں ایک متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی (۸۴)۔

☆ فوج نے حکومتی درخواست پر ''راتوں رات'' آپریشن ''فل نائٹ'' کے ذریعے چینی انجینئروں کو بازیاب کرالیا۔ (منیر احمد، بحرانوں کا دور، ص ۶۴)

☆☆ بعض سیاسی حلقوں نے یہ بھی امکان ظاہر کیا کہ بے نظیر، نواز شریف کے ایماء پر کانفرنس میں شرکت کرنے کے بجائے دوبئی روانہ ہو گئی تھیں۔ اس طرح بے نظیر نے اپوزیشن جماعتوں پر یہ بات بھی ثابت کر دی کہ ان کی شمولیت وتعاون کے بغیر کوئی احتجاجی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بے نظیر نے دوبئی میں یکم سے ۵ دسمبر ۱۹۹۱ء تک قیام کیا۔ (منیر احمد، ص ۷۳ تا ۷۵)

تاہم صدر اسحاق خان نے نواز شریف کی اس تجویز سے مطلق اتفاق نہ کیا کہ جب تک وینا حیات کیس کی انکوائری مکمل نہیں ہو جاتی عرفان اللہ مروت کو حکومت سندھ کے عہدے سے علیحدہ کر دیا جائے۔ (۸۵) یہ بھی حقیقت تھی کہ نواز شریف کو بے نظیر دوستی کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ انہوں نے پیش رفت میں اپنے ہی قریبی ساتھیوں کو ناراض کرنا شروع کر دیا۔ مثال کے طور پر آئی سی آئی کے سابق سربراہ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل، (جس کے نواز شریف زیر بار احسان تھے) کو اپنے لیے خطرہ سمجھ کر نواز شریف نے جان بوجھ کر ایسی پوسٹنگ دی کہ وہ خود ہی پس منظر میں چلے جائیں۔ اس طرح وہ بھی رخصت لینے پر مجبور ہو گئے۔ ابھی ملکی سیاست میں اتار چڑھاؤ جاری تھا کہ ۱۳ فروری ۱۹۹۲ء کو جموں کشمیر لبریشن فرنٹ (J.K.L.F) کے چیئرمین امان اللہ خان نے اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ہمراہ لائن آف کنٹرول عبور کر کے آزادی کشمیر کے لیے جہاد شروع کرنے کا اعلان کر دیا (۸۶)۔ نواز شریف کی طرف سے ایسی تجویز کی سختی سے مخالفت کی گئی۔ جب امان اللہ خان کی طرف سے اصرار بڑھا تو انہیں کنٹرول لائن پر خار دار باڑ لگا کر روکنے کی کوشش میں نوبت ہنگامہ آرائی تک آ پہنچی۔ پاکستان سکیورٹی فورسز کے ساتھ جھڑپوں میں قریباً تیرہ افراد ہلاک اور ۵۰۰ سے زائد زخمی ہوئے (۸۷)۔ امان اللہ خان کو گرفتار کر لیا گیا جس کے بعد امان اللہ خان نے اعلان کیا کہ اب ہمارے اور پاکستان کے راستے جدا ہیں آئندہ الحاق کشمیر کے بجائے خود مختاریٔ کشمیر کی بات ہو گی۔ (۸۸)

اگرچہ اس موقع پر بھی اپوزیشن جماعتوں نے سیاسی مفادات کی غرض سے دوبارہ لانگ مارچ، مظاہرہ اور جلسے جلسوں کا سلسلہ شروع کیا لیکن بے سود، اسی اثناء میں ۴ مارچ ۱۹۹۲ء کو جام صادق جگر کے سرطان کے باعث انتقال کر گئے تو فوج اور حکومت نے متفقہ طور پر ۶ مارچ کو مظفر شاہ کو سندھ کا نیا وزیر اعلیٰ نامزد کر دیا (۹۰)۔ گرچہ اس موقع پر بھی غلام مصطفیٰ جتوئی نے باسی کڑھی میں ابال لانے کی کوشش کی لیکن بے نظیر کی عدم دلچسپی کے باعث جتوئی کا حکومت سندھ پر قبضہ کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ (۹۱)

تاہم جتوئی کو سبق سکھانے کی خاطر اسلامی جمہوری اتحاد کی قیادت نے ۱۳ مارچ کو جتوئی کے صاحبزادے غلام مرتضیٰ جتوئی کو کابینہ سے فارغ کر دیا۔ حتیٰ کہ ۱۸ مارچ ۱۹۹۲ء کو خود غلام مصطفیٰ جتوئی کو ان کی جماعت اے پی پی سمیت اتحاد سے نکال دیا گیا۔

داخلی انتشار سے نمٹنے کے بعد نواز شریف نے خارج محاذ پر مسئلہ افغانستان کے پر امن حل کے لیے اقدامات شروع کر دیے۔ اسی سلسلے میں ۲۱ راپریل ۱۹۹۲ء کو میاں نواز شریف نے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل جاوید ناصر سے مسئلہ افغانستان کے حل کے لیے صلاح و مشورے کے بعد قاضی حسین احمد کو پیغام بھیجا کہ وہ کوئی سیاسی حل تجویز کریں جو تمام افغان گروپوں کے لیے قابل قبول ہو (۹۲)۔ قاضی حسین احمد نے افغان مسئلہ کا جو حل تجویز کیا اس کے مطابق گل بدین حکمت یار اور برہان الدین ربانی کو بالترتیب نگران وزیر اعظم اور نگران صدر مقرر کر کے آئندہ چند ماہ کے اندر اندر نئے انتخابات کروا کر اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کرنا تھا لیکن اس موقع پر بین الاقوامی قوتوں نے نواز شریف کی ان کوششوں کو سبوتاژ کرنے کی خاطر اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کے خصوصی ایلچی "بنین سوان" (Benin Swan) کو یہ ہدایت دے کر پاکستان بھیجا گیا۔ جن کے نتیجہ میں افغانستان میں صبغت اللہ مجددی کی کمزور حکومت قائم کر دی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکمت یار اور ربانی سمیت کئی افغان گروپوں نے حکومت افغانستان سے مخاصمت کی راہ اپنائی جس سے ملک ایک دفعہ پھر خانہ جنگی میں دھکیل دیا گیا۔

(۹۳) افغانستان مسئلہ پر نواز حکومت کی اسی یوٹرین پالیسی کا منطقی نتیجہ تھا کہ ۵ مئی ۱۹۹۲ء کو قاضی حسین احمد نے جماعت اسلامی کو اسلامی جمہوری اتحاد سے نکالنے کا اعلان کر دیا۔ اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل جماعتوں میں بڑھتے ہوئے افتراق و انتشار نے نواز حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ محترمہ بے نظیر بھٹو سے مذاکرات کریں۔ ۲۸ راپریل ۱۹۹۲ء کو نواز شریف کی طرف سے محترمہ بے نظیر بھٹو کو لکھا جانے والا خط اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ حکومت کو مزید دباؤ میں لانے کے لیے بے نظیر بھٹو نے وقتی طور پر اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم ان کے آئندہ اختیار کیے گئے رویے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے خط کا خیر مقدم کیا تھا۔

اس موقع پر نوابزادہ نصر اللہ خان نے افغانستان میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کے بعد قاضی، نواز اختلافات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ۱۱ مئی ۱۹۹۲ء کو آل پارٹیز کانفرنس طلب کر لی (۹۴)۔ جب نواز حکومت نے ملک میں نئی سیاسی فضا تیار ہوتی دیکھی تو فوراً شہباز شریف کے ذریعے بے نظیر بھٹو سے روابط تیز تر کر دیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے نظیر بھٹو نے ملک میں ہونے کے باوجود اے پی سی کے اجلاس میں شرکت نہ کی انہی دنوں یہ بھی افواہ گرم تھی کہ

آٹھویں ترمیم کے خاتمے کے لیے حکومت اور بے نظیر میں خفیہ سمجھوتہ ہو چکا ہے (۹۵)۔☆ جس سے باخبر ہونے کے بعد صدر غلام اسحاق خان کی طرف سے ردعمل کا اظہار کیا جانا ایک فطری امر تھا (۹۶)۔☆☆

محترمہ بے نظیر بھٹو نے (۲۸ راپریل ۱۹۹۲ء کو حکومت کی طرف سے لکھے گئے) نواز شریف کے خط کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ حکومت کے ساتھ مذاکرات کے لیے تیار ہیں۔ تاہم اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی فضا کو سازگار بنایا جائے (۹۷)۔☆☆☆ نواز بے نظیر مفاہمت کا نواز شریف کو وقتی فائدہ یہ ہوا کہ ۱۴ مئی ۱۹۹۲ء کو پیش کیے گئے بجٹ کی منظوری میں انہیں زیادہ وقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

اسلامی جمہوری محاذ کا قیام

حکومت حزب اختلاف میں ہونے والی خفیہ سیاسی سمجھوتہ جو آگے چل کر سیاسی میوزیکل چیئر کے کھیل میں تبدیل ہونے والا تھا۔ جمہوریت کے لیے کئی بد اثرات لیے ہوئے تھے۔ کیونکہ اس طرح خفیہ مفاہمت کے عمل سے ہر برسر اقتدار حکومت (اپنے قبیح افعال کو حزب اختلاف کی طرف سے چشم پوشی اختیار کیے جانے کے صلے میں) آئندہ اقتدار میں حصہ دینے کی پابند تھی۔ جمہوری عمل میں ایسی سیاسی نورا کشتیاں بہر حال مثبت سیاسی رویے کی عکاس نہیں تھیں۔ محب وطن سیاسی اس صورتحال کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ چنانچہ مئی ۱۹۹۲ء میں جمعیت علماء پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) نے مشترکہ سیاسی جدوجہد کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے "اسلامی جمہوری محاذ" کے نام سے سیاسی اتحاد قائم کرنے کا اعلان کر دیا (۹۸)۔ جس کے صدر مولانا شاہ احمد نورانی جبکہ سیکریٹری جنرل مولانا

☆ محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف اندرون خانہ یہ سمجھوتہ کر چکے تھے کہ آٹھویں ترمیم کا خاتمہ کیا جائے تا کہ اس جمہوریت کش آئینی دفعہ سے سیاسی عمل کو درپیش خطرے کا خاتمہ ممکن ہو سکے۔ سمجھوتے کا دوسرا اہم نقطہ میڈ ٹرم الیکشن اک انعقاد تھا۔

☆☆ انہی ایام میں صدر غلام اسحاق خان نے نواز شریف حکومت کو اوپر تلے نو خطوط بھیجے جو اس کے لیے چارج شیٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔

☆☆☆ اس سے محترمہ بے نظیر بھٹو کی مراد، آصف زرداری کی رہائی تھی۔ حکومت نے آصف علی زرداری کو تو رہا نہ کیا تاہم بے نظیر بھٹو کی ملاقاتوں کو اجازت دے دی اور آصف زرداری کو جیل میں مزید سہولیات بہم کی گئیں۔ (منیر احمد، بحرانوں کا دور، ص ۹۶)

فضل الرحمٰن نامزد کیے گئے۔(۹۹)

ان دنوں ملکی حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ ملک میں امن و امان کی فضا غیر یقینی اور ملکی استحکام و سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہو چکے تھے۔ پاکستان میں بڑھتے ہوئے امریکی اثر و رسوخ، افغانستان کے مسائل، بالخصوص سندھ میں غیر ملکی مداخلت کے تحت دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات نے ملکی سیاسی فضا کو شدید اضطراب سے دو چار کر دیا تھا(۱۰۰)۔ امریکی دباؤ پر، افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کا منصوبہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ جبکہ حکومت فرانس کے ساتھ (بھٹو دور میں کیا جانے والا) ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کا سودا منسوخ ہو چکا تھا(۱۰۱)۔ جبکہ اندرون سندھ غیر ملکی ایجنسیوں "خاد" اور "را" کے مداخلت کے شواہد بمعہ ثبوت سامنے آ چکے تھے(۱۰۲)۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ امن و امان کی بھلائی کے لیے حکومت و اپوزیشن اپنا اپنا آئینی کردار ادا کریں لیکن بوجوہ ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ تاہم حکومت نے اپنے تئیں ملک کی داخلی صورتحال کے تناظر میں سندھ میں دہشت گردی کو آہنی ہاتھ سے کچلنے کا فیصلہ کر لیا(۱۰۳)۔ اس سلسلے میں نواز شریف اور جنرل آصف نواز نے سندھ میں گرینڈ آپریشن کی منظوری دی جس کے تحت ۲۷ مئی ۱۹۹۲ء کو نواز شریف نے فوج کو آئین کی دفعہ ۱۴۷ کی رو سے وسیع اختیارات دیے(۱۰۴)۔

سندھ میں آپریشن کلین اپ کی زد براہ راست ایم کیو ایم پر پڑی تھی اس لیے الطاف حسین اور ان کے ساتھیوں نے قومی اسمبلی کی نشستوں سے استعفے دے دیے۔ جس سے الطاف نواز تعلقات خاصے کشیدہ ہو گئے تھے۔ تاہم میاں نواز شریف نے اپنے معتمدین چوہدری نثار اور عبدالستار لالیکا کے ذریعے الطاف حسین سے روابط جاری رکھے۔ ایم کیو ایم نے حکومت سے صلح کے لیے گیارہ نکات رکھے جن پر قریباً ایک ماہ تک بحث مباحثہ جاری رہا۔ آخر گیارہ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو وزیر اعلیٰ سندھ مظفر حسین شاہ اور ایم کیو ایم کے درمیان معاہدہ طے پا گیا جس کے تحت ایم کیو ایم نے دوبارہ حکومت میں واپس آنے کا اعلان کر دیا(۱۰۵)۔ لیکن فوج نے اس سمجھوتے کو قطعاً پسند نہ کیا۔ جس کی وجہ سے جنرل آصف نواز اور حکومت کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ نواز شریف نے حفظ ماتقدم کے طور پر چیئرمین جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی کے کردار کا از سر نو تعین کرنے کے لئے منصوبہ بندی شروع کر دی تا کہ جنرل آصف نواز کو دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ جنرل آصف نواز نے جوابی

حکمت عملی کے طور پر حزب اختلاف سے روابط بڑھانا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے پی ڈی اے کے پلیٹ فارم سے حکومت کے خلاف ۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۲ء سے فیصلہ کن تحریک چلانے کا اعلان کر دیا(۱۰۶)۔

ادھر اسلامی جمہوری محاذ نے بھی تمام اپوزیشن جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے لیے اکتوبر ۱۹۹۲ء کو جے یو پی کے دفتر میں ایک اجلاس بلایا جس میں شرکت کے لیے تمام اپوزیشن جماعتوں کو دعوت دی گئی(۱۰۷)۔ اس اجلاس میں نوابزادہ نصر اللہ خاں، غلام مصطفیٰ کھر، مولانا فضل الرحمٰن، حافظ حسین احمد، شیخ رفیق، ملک قاسم، ایس ایم ظفر، شاہ فرید الحق، عبدالقدیر خاموش، جنرل کے ایم اظہر سمیت کئی سیاستدانوں نے شرکت کی۔ لیکن اجلاس کے دوران اسلامی جمہوری محاذ، پی ڈی اے اور نوابزادہ کی اے پی سی کسی سمجھوتے پر نہ پہنچ سکے(۱۰۸)۔ جس کے بعد جمعیت علمائے پاکستان نے اپوزیشن کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بالفاظ دیگر جے یو پی نے تینوں اپوزیشن اتحادوں پر مشتمل ایک وسیع تر الائنس بنانے کے لیے جو پیش رفت کی تھی۔ وہ ابتدائی سطح پر ہی ناکام ہو گئی۔(۱۰۹)

جے یو پی کی وسیع تر الائنس کی خواہش کو تین وجوہ کی بناء پر پذیرائی نہ مل سکی۔ ایک تو بے نظیر بھٹو کی پی ڈی اے کے پلیٹ فارم سے احتجاجی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ(۱۱۰)۔☆ دوسرے نوابزادہ کی یہ کوشش کی پی ڈی اے میں شامل تمام جماعتیں اے پی سی کا حصہ بن جائیں کیونکہ وہ دونوں آل پارٹیز کانفرنس کے نام سے ایک غیر اعلانیہ پلیٹ فارم قائم کر چکے تھے اور اس کے کنوینر کی حیثیت سے متعدد مرتبہ سیاستدانوں کو اکٹھا کر چکے تھے لیکن بے نظیر اور اصغر خان نے ہمیشہ پی ڈی اے کو اے پی سی میں شامل کرنے کی تجویز کی مخالفت کی۔ تیسرے ان دنوں بے نظیر کی خواہش تھی کہ اپوزیشن میں شامل تمام جماعتیں انہیں پارلیمنٹ میں متحدہ اپوزیشن اتحاد کا سربراہ چن لیں لیکن مذہبی جماعتوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو لیڈر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کے نزدیک عورت کی سربراہی خلاف اسلام تھی۔ ان حالات میں بے نظیر نے پی ڈی اے کے پلیٹ فارم کو متحرک کرنے کا فیصلہ کر کے اپنے اعلان

☆ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۹۲ء کو کراچی میں بے نظیر بھٹو کی زیر صدارت منعقدہ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ ۲۴ر اکتوبر کو حکومت کے خلاف فیصلہ کن تحریک شروع کر دی جائے گی اور آخری حربے کے طور پر لانگ مارچ کا وار بھی کیا جائے گا۔ (منیر احمد بحرانوں کا دور، ص ۱۳۱)

کے مطابق ۲۴؍اکتوبر ۱۹۹۲ء سے اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت کے خلاف تحریک شروع کر دی(۱۱۱)۔ تحریک کے ابتدائی مرحلے پر بے نظیر نے نوابزادہ کی اے پی سی کو نظر انداز کر دیا جس سے دل برداشتہ ہو کر نوابزادہ نصر اللہ خان نے یکم نومبر ۱۹۹۲ء کو نیشنل ڈیمو کریٹک الائنس (N.D.A.) کے نام سے ایک نیا سیاسی اتحاد قائم کر لیا جن کے چیئر مین وہ خود تھے(۱۱۲)۔ اس مجوزہ اتحاد کو بگٹی، جتوئی، کھر، مولانا کوثر نیازی، معراج محمد خان، وغیرہ کی حمایت حاصل تھی۔(۱۱۳)

ادھر امریکہ میں بل کلنٹن کے صدر بننے سے بھی نواز حکومت کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ جارج بش جو کہ افغان پالیسی پر تعاون کی وجہ سے نواز حکومت سے بہتر تعلقات استوار کیے ہوئے تھے۔ ۳؍نومبر ۱۹۹۲ء کو ہونے والے انتخابات میں بل کلنٹن کے مقابلے میں ہار گئے تھے۔ اسی بناء پر محترمہ بے نظیر ۱۰؍نومبر ۱۹۹۲ء کو حکومت کے خلاف لانگ مارچ کا اعلان کر دیا(۱۱۴)۔ چنانچہ ۱۵ نومبر ۱۹۹۲ء کو ملک بھر میں اپوزیشن جماعتوں سے تعلق رکھنے والے کارکنوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا(۱۱۵)۔ جس پر غلام مصطفیٰ جتوئی، غلام مصطفیٰ کھر اور مولانا کوثر نیازی نے لانگ مارچ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ انہی حالات کا نتیجہ تھا کہ نوابزادہ کا این ڈی اے اپنے قیام کے محض ۱۵ دنوں کے اندر اندر اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔(۱۱۶)

لانگ مارچ بتدریج اپنے اثرات دکھا رہا تھا۔ ۱۸ نومبر ۱۹۹۲ء کو لیاقت باغ راولپنڈی سے بے نظیر بھٹو کو گرفتار کر کے کراچی بھجوا دیا گیا۔ بین الاقوامی میڈیا نے ۱۵ نومبر سے ۲۱ نومبر تک مسلسل ہونے والے احتجاج کو بھرپور کوریج دی۔ لانگ مارچ کے بعد ٹرین مارچ نے رہی سہی کسر نکال دی۔(۱۱۸) ابھی حکومت ٹرین مارچ سے سنبھل نہیں پائی تھی کہ محترمہ نے روڈ مارچ کا اعلان کر دیا۔ ۳؍دسمبر ۱۹۹۲ء کو روڈ مارچ میں شرکت کے لیے بے نظیر بھٹو نے کراچی سے ملتان پہنچنا تھا لیکن ایئرپورٹ حکام نے فرضی فنی خرابی کی بناء پر طیارے کو روک دیا۔(۱۱۹)

اسی اثناء میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو سانحہ شہادتِ بابری مسجد نے عالم اسلام کو سوگوار کر دیا(۱۲۰)۔ جس کی وجہ سے عوامی توجہ تھوڑی دیر کے لیے ملکی سیاست سے ہٹ کر پاک بھارت تعلقات پر مرکوز ہو گئی۔ جس کا ایک اثر یہ ہوا کہ اپوزیشن جماعتوں کو فوری طور پر احتجاج تحریک

مؤخر کرنا پڑی۔ اسلامی جمہوری محاذ نے اس سانحہ کا سنجیدگی سے نوٹس لیا۔ محاذ کے سیکریٹری جنرل مولانا فضل الرحمٰن نے ۹ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے آل پارٹیز کانفرنس طلب کی(۱۲۱)۔ جس میں نوابزادہ نصر اللہ خان، مولانا اجمل خان، کے ایم اظہر، زاہد سرفراز، مولانا شاہ احمد نورانی، ملک حاکمین، جہانگیر بدر، احمد علی قصوری، اسلم سلیمی، سید منور حسن، امیر العظیم، حامد سرفراز، جبار بٹ، عبدالرشید قریشی، غلام ربانی کھر، ایس ایم ظفر، عبدالقدیر خاموش، مولانا امجد، سمیت متعدد سیاستدانوں نے شرکت کی۔(۱۲۲)

اس کانفرنس کی صدارت مولانا فضل الرحمٰن نے کی جو مولانا اجمل قادری کی رہائش گاہ شیرانوالہ گیٹ میں منعقد ہوئی۔ مولانا فضل الرحمٰن کی طلب کردہ آل پارٹیز کانفرنس میں طے پایا کہ پاکستان میں ہندوؤں کے مندروں کی تباہی کی مذمت کی جائے اور عوام سے اپیل کی جائے کہ وہ اسلامی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مندروں کی توڑ پھوڑ کا سلسلہ بند کر دیں(۱۲۳)۔☆ کانفرنس نے اس امر سے اتفاق کیا کہ وزیر اعظم نواز شریف نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا ہے اگر حکومت بر وقت کارروائی کرتی تو ہندوؤں کے مندر تباہ ہونے سے بچ جاتے۔(۱۲۴)

نواز شریف نے بھی دس دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کے مسئلہ پر تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں کو اعتماد میں لینے کے لیے اسلام آباد میں تمام سیاسی جماعتوں کا اجلاس طلب کر لیا تھا۔ نوابزادہ نصر اللہ خان کو وزیر اعظم کی طرف سے طلب کردہ آل پارٹیز، کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ وزیر داخلہ چوہدری شجاعت حسین نے پہنچایا جبکہ جماعت اسلامی کو☆☆ یہ دعوت نامہ جاوید ہاشمی نے پہنچایا۔(۱۲۵)☆☆☆

☆ ۹ دسمبر کو مولانا فضل الرحمٰن کی طلب کردہ اے پی سی میں جماعت اسلامی بھی موجود تھی مگر ۹ دسمبر کی رات جماعت اسلامی نے دوبارہ اپنا اجلاس طلب کیا جس میں دس دسمبر کو نوابزادہ اور میاں نواز شریف کی طلب کردہ کانفرنسز میں سے کسی ایک یا دونوں میں شرکت کرنے پر غور کیا گیا۔ غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ جماعت اسلامی ان دونوں کانفرنسز میں شرکت نہیں کرے گی۔

☆☆ واضح رہے کہ جاوید ہاشمی (مسلم لیگ ن) آج کل (۲۰۰۰ء) میں مقدمہ بغاوت کے سلسلے میں پابند سلاسل ہیں۔

نوابزادہ نصر اللہ خان نے سرکاری سرپرستی میں مندروں کو تباہ کرنے کے واقعات کا سختی سے نوٹس لیا اور کہا کہ اسلام ہمیں اس بات کا درس نہیں دیتا کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو زمین بوس کر دیا جائے (۱۲۶)۔ اگر ہندوؤں نے بابری مسجد کو تباہ کر کے ایک شرمناک حرکت کی ہے تو ہم نے پاکستان میں سینکڑوں مندر تباہ کر دیے ہیں جس کی وجہ سے عالمی رائے عامہ اب ہندوؤں کے ساتھ ساتھ ہمارے بھی حق میں نہیں رہی اور یہ سب کچھ موجودہ حکومت کی نا اہلی کی وجہ سے ہوا ہے۔ حکومت کی طرف سے طلب کردہ کانفرنس میں شرکت سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے نوابزادہ نے کہا کہ حکومت نے اجلاس طلب کرنے سے قبل ہمیں اعتماد میں نہیں لیا کیونکہ ہم پہلے ہی (اسلامی محاذ کی طرف سے طلب کردہ آل پارٹیز کانفرنس) اور دس دسمبر (نوابزادہ کی طرف سے طلب کردہ اے پی سی) کو آل پارٹیز کانفرنس طلب کرنے کا اعلان کر چکے تھے۔ ان حالات میں وزیر اعظم کو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے تھا (۱۲۷) اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میاں نواز شریف کی طرف سے طلب کردہ آل پارٹیز کانفرنس بری طرح ناکام ہو گئی (۱۲۸) ☆۔ چونکہ اس میں بہت کم سیاستدانوں نے شرکت کی جبکہ نوابزادہ کی کانفرنس اس کے مقابلے میں بہت کامیاب رہی (۱۲۹)۔ جس میں دیگر امور کے علاوہ دوبارہ احتجاجی تحریک شروع کرنے کے لیے مختلف تجاویز پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ پارلیمنٹ میں موجود اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے ارکان جلد ہی مستعفی ہو کر نواز شریف کے خلاف فیصلہ کن تحریک شروع کریں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اپوزیشن غیر ضروری طور پر غلام اسحاق خاں کو تنقید کا نشانہ نہیں بنائے گی جبکہ حکومت سے مذاکرات کی تمام تجاویز کو مسترد کر دیا گیا۔ بعد ازاں پی ڈی اے نے ۱۵ دسمبر سے ۱۲ دسمبر ۱۹۹۲ء تک مظاہرے کرنے کا اعلان کر دیا۔ جس کا مقصد حکومت کے ساتھ ساتھ صدر غلام اسحاق خان پر بھی دباؤ بڑھانا تھا جو کہ ۲۲ دسمبر کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرنے والے تھے۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۹۲ء کو صدر غلام اسحاق نے اپوزیشن کو اپنی نشستوں پر موجود نہ پا کر اطمینان کا سانس لیا کیونکہ محترمہ بے نظیر بھٹو ایک طے شدہ منصوبے کے تحت کراچی سے اسلام

☆ حکومتی سطح پر اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی کہ کسی نہ کسی طور پر نوابزادہ نصر اللہ خان اور بے نظیر اسلام آباد میں بلائی جانے والی اے پی سی میں شرکت پر آمادہ ہو جائیں لیکن تقریباً اپوزیشن رہنماؤں نے حکومت کی بلائی گئی کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔

آباد نہ آئیں (۱۳۰)۔ ☆

سیاسی محاذ پر نواز شریف کے لیے جہاں مشکلات بڑھ رہی تھیں وہیں پر وہ فوج اور امریکہ کا اعتماد بھی کھو چکے تھے۔ ۱۹۹۳ء کے آغاز سے ہی یوں لگ رہا تھا کہ حکومت کے دن گنے جا چکے ہیں۔ نواز شریف ان دنوں کسی معجزے کا انتظار کر رہے تھے۔ جو ان کے اقتدار کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دے سکے۔ جنرل آصف نواز دس جنوری ۱۹۹۳ء کو سندھ سے فوج کی واپسی کا اہم فیصلہ کرنے والے تھے جو یقیناً حکومتی تابوت میں آخری کیل ثابت ہوتا۔ کہ اچانک ۸ جنوری ۱۹۹۲ء کو جنرل آصف نواز دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے (۱۳۱)۔ نواز شریف کی حد تک یقیناً یہ خوشی کی خبر ہو گی کیونکہ جنرل آصف نواز کی وفات کے بعد انہیں احساس ہو گیا تھا کہ اب ان کے خلاف فوری طور پر کارروائی نہیں ہو گی۔ (۱۳۲)

سندھ صورتحال کے حوالے سے نواز حکومت کو فوری ریلیف ملا جب جنرل عبدالوحید کاکڑ نے ۲۳ جنوری ۱۹۹۳ء کو اعلان کیا کہ سندھ میں امن و عامہ کی صورتحال کو بہتر بنائے بغیر فوج کو واپس نہیں بلایا جائے گا۔ حالانکہ جنرل آصف نواز مرحوم نے ۳ جنوری ۱۹۹۳ء کو کور کمانڈروں کے اجلاس میں سندھ کی صورتحال پر غور و خوض کے بعد طے کر لیا کہ وہ جلد ہی (۱۰ جنوری ۱۹۹۳ء تک) فوج کو واپس بلا لیں گے۔ (۱۳۳)

قبل ازیں نواز شریف کے اپوزیشن کو کنٹرول میں کرنے کے لیے یہ اقدام کیا کہ ۱۲ جنوری ۱۹۹۳ء کو بے نظیر کو قومی اسمبلی مجلس قائمہ برائے امور خارجہ کا سربراہ مقرر کر دیا۔ نواز شریف کی خواہش تھی کہ کسی طرح آصف زرداری کو رہا کر کے اپوزیشن تعلقات کو مزید بہتر بنایا جائے۔ نواز بے نظیر مفاہمت دیگر اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ ساتھ غلام اسحاق خان کو بھی سخت ناگوار گزری۔ نواز شریف کے سامنے دو راستے تھے یا تو وہ غلام اسحاق خان کی شرائط پر کٹھ پتلی وزیر اعظم بن جاتے یا بے نظیر بھٹو کے ساتھ مل کر آٹھویں ترمیم ختم کر دیتے تا کہ غلام اسحاق خان کو بے دست و پا کیا جا سکے۔ (۱۳۴)

☆ جبکہ پچھلے سال پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کے دوران صدر غلام اسحاق خان کو خاصی خفت کا سامنا کرنا پڑا جب اپوزیشن کی طرف سے "گو بابا گو" کے نعرے لگائے گئے۔ ۱۹۹۲ء میں بھی غلام اسحاق خان کو خدشہ تھا کہ کہیں دوبارہ ان کی بے عزتی نہ ہو جائے۔

اس سے پہلے کہ نواز شریف آٹھویں ترمیم کے مسئلے پر کوئی پیش رفت کرتے ۱۸ مارچ ۱۹۹۳ء کو صدر پاکستان مسلم لیگ، محمد خان جونیجو انتقال کر گئے (۱۳۵)۔ نواز شریف نے ضروری خیال کیا کہ پہلے پارٹی معاملات کو طے کر لیا جائے کیونکہ مسلم لیگ کی صدارت سر دست ایک اہم مسئلہ تھی۔ چنانچہ نواز شریف نے پارٹی صدارت کے حصول کے لیے اراکین اسمبلی اور مسلم لیگ زعما سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ تاہم صدارت کے حصول کے لیے کئی امیدوار سامنے آ گئے۔ ان میں حامد ناصر چٹھہ پیش پیش تھے۔ جن کی پشت پناہی صدر غلام اسحاق خان کر رہے تھے تاہم ۲۷ مارچ ۱۹۹۳ء کو مسلم لیگ کے سینئر رہنماؤں نے مسلم لیگ کی صدارت کے لیے منتخب کر لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے دن حامد ناصر چٹھہ، انور سیف اللہ اور اسد جونیجو نے غلام اسحاق خان کے ایماء پر وفاقی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا (۱۳۶)۔ اس طرح مسلم لیگ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۹۳ء کو وزیر مملکت گل شیر آفریدی نے بھی استعفیٰ دے دیا جبکہ وزیر خزانہ سرحد نوابزادہ محسن علی خان کو حکومت نے کابینہ سے برطرف کر دیا کیونکہ وہ سرحد اسمبلی میں وزیر اعلیٰ پیر صاحب شاہ کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کرنا چاہتے تھے (۱۳۷)۔ اس صورتحال کے تناظر میں چیف آف آرمی اسٹاف جنرل عبدالوحید کاکڑ نے ۲ر اپریل کو کور کمانڈروں کے اجلاس میں فیصلہ کیا کہ نواز شریف کو صورتحال پر قابو پانے کا ایک موقع ملنا چاہیے کیونکہ کور کمانڈروں کی اکثریت اس بات سے متفق تھی کہ سیاسی بحران ابھی اس مقام پر نہیں پہنچا کہ وزیر اعظم کو برطرف کر دیا جائے۔ (۱۳۸) تاہم آنے والے دو ہفتوں میں نواز شریف کی توقع کے خلاف تمام کھیل نواز شریف کے ہاتھ سے نکل گیا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کے ذریعے بے نظیر بھٹو نے آٹھویں ترمیم کے خاتمہ کے متعلق نواز شریف کے منصوبہ کا غلام اسحاق خان تک پہنچایا جانا، ۱۱ر اپریل ۱۹۹۳ء کو جنرل آصف نواز کی بیوہ نزہت نواز کی پریس کانفرنس (۱۳۹) جیسے معاملات بالخصوص محترمہ بے نظیر کی طرف سے ۱۸ر اپریل ۱۹۹۳ء کو پی پی پی اراکین اسمبلی کے استعفوں نے اسمبلی کی تحلیل کے لیے حالات ساز گار بنا دیے۔ کہ غلام اسحاق خان کو آخری وار کا موقع مل گیا (۱۴۰)۔ چنانچہ اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسی رات قومی اسمبلی تحلیل کر دی اور میر بلخ شیر مزاری کو نگران وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ ۲۰ر اپریل ۱۹۹۳ء کو میر بلخ شیر مزاری نے بحیثیت نگران وزیر اعظم پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”ان کی حکومت کے سامنے کئی اہم مقاصد ہیں جن میں آزادانہ اور

منصفانہ انتخابات کا انعقاد سر فہرست ہے تا کہ ماضی کی تلخیاں اور محاذ آرائیاں ختم کی جا سکیں۔ حکومت میں عام آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد سر فہرست ہے تا کہ ماضی کی تلخیاں اور محاذ آرائیاں ختم کی جا سکیں۔ حکومت میں عام قانونی طریقوں اور عمل کی بحالی اور ایماندار اور صاف ستھری حکومت کی بحالی شامل ہیں۔ آئین کے مطابق ۱۴ر جولائی ۱۹۹۳ء کو عام انتخابات کا انعقاد ہے اور کیونکہ نگران حکومت میں دونوں پارٹیاں شامل ہیں اس لیے انتخابات مکمل طور پر منصفانہ ہونے کی ضمانت مل سکے گی۔ ان کی حکومت آئین اور آئینی اداروں کا اعتماد بحال کرے گی اور کسی کے خلاف سیاسی انتقام کی کارروائی میں ملوث نہیں ہو گی تمام امور میں قانون کی عمل داری کو برقرار رکھا جائے گا۔ اور جو لوگ قانون شکنی کی کوشش کریں گے یا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے ان کے ساتھ قانون کے مطابق سختی سے نمٹا جائے گا۔ ہم کسی کے ساتھ کوئی مخاصمت نہیں رکھتے اور ہم کسی کے خلاف بھی ناگوار زبان استعمال نہیں کریں گے۔ میں محاذ آرائی اور دشمنیوں کو مٹانے کے لیے آیا ہوں۔

پاکستان کے عوام نے محاذ آرائی کی صورت حال کے خاتمے پر سکھ کا سانس لیا ہے۔ سابق حکومت کی بدعنوانیوں اور غلط کاریوں کو حکومت عوام کے سامنے لائے گی اور اس سلسلے میں وزارت خزانہ اور وزارت خارجہ کی جانب سے صحافیوں کو بریفنگ دی جائے گی۔ جس سے آپ کو علم ہو جائے گا کہ کس طرح اصل حقائق کو عوام سے پوشیدہ رکھنے کے لیے پروپیگنڈے کا سہارا لیا جاتا رہا۔ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات میری حکومت کی اوّلین ترجیح ہے۔ کوئی انتقامی کارروائی نہیں ہو گی اور تمام جماعتوں، گروپوں اور افراد کو کسی امتیاز کے بغیر سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنے اور انتخابات میں شرکت کی مکمل آزادی حاصل ہو گی۔ ملازمتوں پر پابندی فوری طور پر ختم کر دی گئی ہے۔ پاکستان میں کوئی سٹاک ایکسچینج کریش نہیں ہوا۔ پہلے بھی سٹاک ایکسچینج میں اتار چڑھاؤ آتے رہے ہیں اور گزشتہ تین ماہ کے دوران ایسا کئی بار ہوا ہے۔“ (۱۴۱)

۱۹ر اپریل کو نواز شریف کو مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا (۱۴۲)۔ نواز شریف نے اسمبلی توڑے جانے کے صدارتی اقدام کو ۲۵ر اپریل ۱۹۹۳ء کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا (۱۴۳)۔ انہیں یقین تھا کہ سپریم کورٹ اسمبلی ضرور بحال کر دے گی۔ اسی دن نواز شریف کو ایک اور دھچکا لگا کہ نواز شریف کی طاقت کے گڑھ پنجاب میں منظور وٹو نے غلام حیدر

وائیں کے خلاف تحریک عدم اعتماد منظور کروالی اور ۱۵۴ ارکان کی حمایت سے وزیر اعلیٰ بن گئے۔(۱۴۴)

سپریم کورٹ نے نواز شریف کی درخواست کی سماعت ۸ مئی ۱۹۹۳ء سے ۱۲ مئی تک اور ۲ روز کے وقفہ سے ۱۵ مئی سے ۱۹ مئی تک مسلسل جاری رکھی۔ چنانچہ ۲۶ مئی ۱۹۹۳ء کو سپریم کورٹ نے قومی اسمبلی تحلیل کیے جانے کے خلاف رٹ پٹیشن پر سماعت مکمل کرنے کے بعد ۱۸/اپریل کے صدارتی اقدام کو غیر قانونی قرار دے دیا جس کے تحت منتخب وزیر اعظم کو اقتدار سے محروم کیا گیا تھا(۱۴۵)۔

میاں نواز شریف نے اپنی حکومت بحال ہونے کے اگلے روز قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرلیا جبکہ پنجاب میں میاں منظور وٹو نے اپنی ہزیمت سے بچنے کے لئے ۲۹ مئی ۱۹۹۳ء کو اسمبلی توڑ دی (۱۴۵)۔ میاں نواز شریف نے ۱۵ جون ۱۹۹۳ء کو اپوزیشن سے براہ راست مذاکرات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ بے نظیر بھٹو نے نواز شریف کے ساتھ صلح کے لیے شرائط پیش کیں کہ قومی حکومت بنائی جائے، آئینی اصلاحات کے لیے پیکیج تیار کیا جائے اور نئے انتخابات کی تاریخ کا اعلان کیا جائے۔(۱۴۶)

جس پر نواز شریف کی طرف سے غور وخوض کی یقین دہانی کرائی گئی۔ اس کے علاوہ سیاسی مسائل پر ڈیڈ لاک ختم کرنے کے لیے نواز شریف نے ۲۷ جون ۱۹۹۳ء کو صدر غلام اسحاق خان سے ملاقات کی لیکن بے نتیجہ رہی (۱۴۷)۔ جنرل عبدالوحید نے فریقین میں صلح کروانے کی بھر پور کوشش کی لیکن دونوں اپنے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ اس اثناء میں محترمہ بینظیر نے ۱۶ جولائی ۱۹۹۳ء کو لانگ مارچ کا اعلان کر دیا(۱۴۸) فوج نے جب حالات ہاتھ سے نکلتے دیکھے تو فریقین پر دباؤ ڈالا گیا کہ یا تو صلح کرلیں یا پھر اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں چنانچہ ۱۷ جولائی کو ۱۹۹۳ء کو نواز شریف اور غلام اسحاق خان نے اپنے استعفٰی چیف آف آرمی اسٹاف کے حوالے کر دیے(۱۴۹)۔ جس کے بعد ۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء کو معین قریشی کو نگران وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا(۱۵۰)۔ جنہوں نے ۶/ اکتوبر کو قومی اسمبلی اور ۹/ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرائے(۱۵۱) جبکہ قائم مقام صدر چیئر مین سینٹ وسیم سجاد بنے۔ نگران وزیر اعظم معین قریشی نے کہا کہ ہماری کسی فریق سے دشمنی یا دوستی نہیں۔ ہم کسی کو شکایت کا موقع نہ دیں گے اور نہ ہی کسی کو انتخابی نتائج تہہ و بالا کرنے کی

اجازت دی جائے گی۔ معین قریشی کی صدارت میں ہونے والی بین الصوبائی کانفرنس میں جس میں چاروں صوبوں کے گورنروں اور وزرائے اعلیٰ نے شرکت کی، فیصلہ کیا گیا کہ شناختی کارڈ کی شرط برقرار رکھی جائے گی۔ تمام سیاسی جماعتوں کو ریڈیو اور ٹی وی پر یکساں مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ حکومتی قطعی طور پر غیر جانبدار رہے۔ منصفانہ انتخابات کے لیے فوج کا تعاون حاصل کیا جائے۔ قومی اور صوبائی انتخابات ایک ہی دن کرانے کا فیصلہ الیکشن کمیشن پر چھوڑ دیا جائے(۱۵۲)۔ تاہم بلدیاتی ادارے توڑنے کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا گیا۔(۱۵۳)

قائم مقام صدر وسیم سجاد نے لاہور ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس ریاض احمد اور پشاور ہائی کورٹ کے جج مسٹر جج شیر خان جہانگیری کو الیکشن کمیشن کا رکن مقرر کر دیا۔ جبکہ چیف الیکشن کمشنر مسٹر جسٹس ریٹائرڈ نعیم احمد مقرر کیے گئے۔(۱۵۴)

۱۹ جولائی کو وزیر اعظم نواز شریف نے وزیر اعظم ہاؤس میں معین قریشی سے ملاقات کر کے مختلف امور پر گفتگو کی۔ آئندہ انتخابات کے حوالے سے مسلم لیگ اور اس کی حلیف جماعتوں نے تین نکاتی انتخابی حکمت عملی تیار کی:

(۱) سابق صدر کو ہدف تنقید بنایا جائے۔

(۲) بے نظیر کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کی جائے۔

(۳) دو تہائی اکثریت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔(۱۵۵)

۲۲ جولائی کو اسلام آباد سے لاہور آمد پر نواز شریف کا زبردست استقبال کیا گیا۔ نواز شریف کا استقبال کرنے والے مسلم لیگ کارکنوں نے لاہور ایئر پورٹ پر مولانا شاہ احمد نورانی کو دیکھ کر ان کے خلاف نعرہ بازی کی اور ان کی گاڑی پر پتھراؤ کیا گیا۔ سیاسی رہنماؤں نے اس حملے کی شدید مذمت کی۔ قاضی حسین احمد نے کہا کہ پہلے پیپلز پارٹی نے عالم کی پگڑی اچھالی تھی۔ اب مسلم لیگ سے یہ کام لیا جا رہا ہے۔(۱۵۶)

اس سے ایک روز قبل ۲۱ جولائی ۱۹۹۳ء کو مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ اسلامی جمہوری محاذ آئندہ انتخابات میں دینی قوتوں سے اتحاد کرے گا۔ جماعت اسلامی اور جمعیت اہلحدیث نے بھی ہم سے رابطہ کیا ہے۔ ان سے مذاکرات جاری ہیں۔ نواز حکومت کے خاتمے سے ثابت ہو گیا ہے کہ بحران حقیقی تھا۔ توقع ہے کہ فوج آئندہ بھی سیاسی استحکام کے لیے اپنا کردار ادا کرے گی۔ نواز شریف اور پیپلز پارٹی سے کسی خیر کی توقع نہیں۔ نواز شریف نے

اسلام کے نام پر دھوکہ دیا۔ لیکن محاذ کے سیکریٹری جنرل مولانا فضل الرحمٰن نے ذرا مختلف ردعمل ظاہر کیا ان کے بقول اسلامی جمہوری محاذ کسی جماعت سے اتحاد نہیں کرے گا۔ البتہ مختلف اتحادوں اور جماعتوں سے نشستوں کے سلسلے میں تعاون ہو سکتا ہے۔ ہم جمعیت علمائے اسلام کے دوسرے دھڑے کے سربراہ مولانا سمیع الحق کے ساتھ بھی مذاکرات کے لیے تیار ہیں۔ اگر مولانا عبدالستار نیازی ہمارے ساتھ آنا چاہیں تو انہیں نواز شریف کا ساتھ چھوڑنا ہوگا۔ (۱۵۷)

یکم اگست کو اسلامی محاذ کے سیکریٹری جنرل مولانا فضل الرحمٰن اور اسلامک فرنٹ کے سربراہ قاضی حسین احمد کے درمیان دو گھنٹے تک بات چیت ہوئی (۱۵۸)۔ قاضی حسین احمد کا مؤقف تھا کہ مذہبی جماعتیں انتخابات میں متحد ہو کر عوام کے پاس جائیں۔ یہ مذاکرات اس لیے نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے کہ مولانا فضل الرحمٰن کے بقول جماعت اسلامی نے اتحاد کے سلسلے میں بہت تاخیر کر رہی ہے (۱۵۹)۔ تاہم ۱۲ اگست ۱۹۹۳ء اسلامک فرنٹ اور اسلامی جمہوری محاذ کے درمیان نشستوں تقسیم کے بارے میں مفاہمت کے لیے کراچی میں بات چیت کا پھر آغاز ہوا۔ جو کہ حسب معمول بے نتیجہ رہا۔ مغربی اور استعماری قوتیں دینی جماعتوں کے اتحاد میں اپنا سازشی کردار ادا کر رہی ہیں۔ (۱۶۰) جبکہ ۱۳ اگست ۱۹۹۳ء کو نشتر پارک کراچی میں قاضی حسین احمد نے فرنٹ کے زیر اہتمام پہلے انتخابی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نواز شریف اور بے نظیر دونوں آمرانہ نظام چاہتی ہیں بے نظیر، زرداری، نواز شریف، چودھری شجاعت اور دیگر افراد نے اربوں روپے کے قرضے معاف کرا لیے۔ ہم لٹیروں سے پائی پائی وصول کریں گے۔ نواز شریف اگر واقعی پیپلز پارٹی کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو فرنٹ کے زیر سایہ آجائیں انہیں خوش آمدید کہا جائے گا۔ قاضی حسین احمد کے بقول ہمارا متحدہ دینی محاذ سے معاہدہ ہو گیا ہے۔ اس اتحاد میں مولانا احمد نورانی اور مولانا فضل الرحمٰن کو بھی بلائیں گے بشرطیکہ وہ پیپلز پارٹی کا ساتھ چھوڑ کر آئیں (۱۶۱)

۱۵ اگست ۱۹۹۳ء کو جیوے پاکستان کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ عوام نواز شریف اور بے نظیر دونوں کو مسترد کر چکے ہیں۔ یہ دونوں امریکی نمائندے ہیں۔ نواز شریف نے کراچی اور حیدرآباد میں نفرت پیدا کی۔ ان کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ دوبارہ برسراقتدار نہیں آ سکتے۔ اتحاد کے اہم رہنما مولانا فضل الرحمٰن نے مانسہرہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی جمہوری محاذ مؤثر قوت بن کر ابھرے گا اپنی جماعتوں کو

ایک دوسرے کے خلاف امیدوار کھڑا کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ (۱۶۲)

۲۱ اگست کو بری فوج کے سابق سربراہ مرزا اسلم بیگ نے عملی سیاست میں قدم رکھتے ہوئے کہا کہ وہ نظریہ پاکستان کی بنیاد پر ملک کی خدمت کا عزم لے کر سیاسی میدان میں آئے ہیں (۱۶۳)۔ اسی دن بیگم نصرت بھٹو نے میر مرتضیٰ بھٹو کی لاڑکانہ میں ووٹر فہرست میں درستی نام کی درخواست دے دی (۱۶۴)۔ تاہم ابھی وہ پاکستان واپس نہیں آئے تھے۔ تاہم ان کی اہلیہ غنویٰ بھٹو ۲۷ اگست ۱۹۹۳ء کو اپنے تین سالہ بیٹے ذوالفقار علی جونیئر کے ہمراہ دمشق سے کراچی پہنچ گئیں۔ مرتضیٰ بھٹو کی طرف سے قومی اسمبلی کی دو اور صوبائی اسمبلی کی چار نشستوں پر کاغذات نامزدگی داخل کرائے گئے (۱۶۵)۔ اسی دن (۲۷ اگست کو) وفاقی حکومت نے مالیاتی اداروں کے حسابات کی رازداری کے قانون کو ختم کر کے ہزاروں قرض نادہندگان کی فہرست جاری کر دی (۱۶۶)۔

ستمبر ۱۹۹۳ء کا مہینہ انتخابی قواعد و ضوابط کی تکمیل میں گزر گیا۔ ستمبر کے وسط تک کاغذات نامزدگی کی جانچ پڑتال ان کے منظور یا مسترد ہونے کے خلاف اپیلیں اور کاغذات نامزدگی واپس لینے کے مراحل سے گزر کر قومی اسمبلی کے لیے امیدواروں کی آخری فہرست ۱۴ ستمبر جبکہ صوبائی اسمبلیوں کے لیے امیدواروں کی آخری فہرست ۱۵ ستمبر ۱۹۹۳ء کو شائع ہوئی (۱۶۷)۔ ستمبر کا مہینہ سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے ایک بھرپور مہینہ تھا۔

اندریں حالات جے یو پی اور جے یو آئی (فضل الرحمٰن گروپ) انتخابی میدان میں سرگرم ہو گیا۔ محاذ کے سربراہ مولانا نورانی نے ۳ ستمبر ۱۹۹۳ء کو ڈیرہ اسماعیل خان میں کہا کہ امریکہ پاکستان میں دینی قوتوں کے اتحاد کو ناکام بنانا چاہتا ہے لیکن ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ دینی جماعتوں کے امیدوار ایک دوسرے کا مقابلہ نہیں کریں گے (۱۶۸)۔

جبکہ ۲۱ ستمبر کو کراچی میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دینی جماعتوں کے ووٹ تقسیم کرنے کی سازش کامیاب نہیں ہو گی۔ پیپلز پارٹی نے روٹی، کپڑا اور مکان جبکہ نواز شریف نے اسلام کے نام پر دھوکہ دیا۔ دھوکہ دینے والے اور ملکی معیشت تباہ کرنے والے عوام کی نمائندگی کا حق نہیں رکھتے۔ نواز بے نظیر دونوں نے ملک کی دولت کو لوٹا ہے۔ عوام نے جمہوریت اور حقوق کا نعرہ لگانے والوں کا اصل روپ دیکھ لیا ہے۔ (۱۶۹)

انتخابی مہم کے تسلسل میں ۲۴ ستمبر کو نشتر پارک کراچی میں اسلامی جمہوری محاذ اور

اسلامک فرنٹ کا ایک مشترکہ جلسہ منعقد ہوا جس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نورانی نے کہا: پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ ہم "لادینی" قوتوں کو اس میں دراڑیں ڈالنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ملک کو امریکہ کے پاس گروی رکھ دیا گیا ہے۔ دفاع اور معیشت بھی امریکہ کے سپرد کی جارہی ہے۔ عوام کا فیصلہ پاکستان کو ناقابل تسخیر بنا سکتا ہے۔ محمود غزنوی کا جذبہ رکھنے والوں کو برسراقتدار لایا جائے۔ (۱۷۰)

نشتر پارک کا یہ جلسہ اسلامی جمہوری محاذ کا سب سے بڑا جلسہ تھا۔ دو بڑی دینی جماعتوں کے قائدین نے تو اوپر کی سطح پر اتفاق رائے کر کے ایک انتخابی محاذ تشکیل دے لیا تو لیکن اس کے باوجود نچلی سطح پر ان دونوں جماعتوں کے حامیوں (بریلوی اور دیوبندی) کے درمیان برسوں کے شدید اختلاف موجود تھے۔ یہ جلسہ بھی انہی اختلافات کے اثرات لیے ہوئے تھا۔ جے یو پی کے حامی مولانا نورانی کے حق میں اور جے یو آئی کے کارکن مولانا فضل الرحمن کے حق میں نعرے بازی کرتے رہے۔

۲۵ ستمبر کو سیاسی حوالے سے ایک اہم پیش رفت ہوئی کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (جونیجو) نے پی پی ایف (پاکستان ڈیموکریٹک فرنٹ) کے نام سے ایک نیا سیاسی اتحاد قائم کر لیا (۱۷۱)۔ اس سلسلے میں دونوں پارٹیوں کے درمیان تحریری معاہدہ طے پا گیا جس کی رو سے دونوں جماعتیں اپنے اپنے انتخابی نشانات پر الیکشن لڑیں گی۔ ایک دوسرے امیدواروں کی مکمل حمایت کی جائے گی۔ حکومت سازی اور دیگر معاملات کا فیصلہ مشترکہ طور پر کیا جائے گا۔ ستمبر کے مہینے کو کئی بین الاقوامی اخبارات نے انتخابات اکتوبر ۱۹۹۳ء کے حوالے سے کئی تبصرے اور تجزیے شائع کیے۔

یکم اکتوبر ۱۹۹۳ء کو ایم کیو ایم کے الطاف حسین نے الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا (۱۷۲)۔ الیکشن کمیشن نے ایم کیو ایم سے کہا کہ وہ بائیکاٹ کا فیصلہ پر نظر ثانی کرے۔ کمیشن نے حکومت سندھ کو ہدایات کیں کہ وہ ایم کیو ایم کی جائز شکایات کا ازالہ کرتے ہوئے تین دن کے اندر اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس پر سندھ کے نگران وزیر اعلیٰ مدد علی شاہ نے کہا کہ ایم کیو ایم کو انتخابات میں حصہ لینے کے لیے ہر سہولت فراہم کی جائے گی۔ اسے چاہیے کہ وہ بائیکاٹ کا فیصلہ واپس لے۔ (۱۷۳)

۵/ اکتوبر کو رات گئے تک الطاف گروپ کو بائیکاٹ ختم کرنے پر آمادہ کرنے کے

لیے کوششیں جاری رہیں۔ صدر وسیم سجاد اور فوج کے اعلیٰ حکام نے اس ضمن میں ایم کیو ایم کے رہنماؤں سے مراجع کیے لیکن ایم کیو ایم کے اس ضد پر اڑ جانے کے باعث کہ انتخاب ۷ روز کے لیے ملتوی کر دیے جائیں اور ایم کیو ایم حقیقی کے تمام سرکردہ لیڈر فوری طور پر گرفتار کیے جائیں یہ کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ (۱۷۴)

۵/ اکتوبر کا دن کراچی کے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ کراچی میں جگہ جگہ فائرنگ ہوئی۔ مسلح افراد اچانک سڑکوں پر نمودار ہوتی، آتش گیر مادے پھینکتے اور فرار ہو جاتے۔ اس سے ۶ گاڑیاں نذر آتش ہوئیں جبکہ الطاف گروپ کے حامی علاقوں گلبہار ناظم آباد، پاک کالونی، شمالی آباد اور لیاقت آباد میں فائرنگ شروع ہو گئی۔ پتھراؤ معطل کر دیا گیا۔ فائرنگ سے ایک نوجوان ہلاک ہو گیا۔ لیاقت آباد میں پولیس وین پر نامعلوم افراد کے عملہ سے چھ پولیس کانسٹیبل زخمی ہو گئے (۱۷۵)۔ حیدر آباد میں بھی ۵/ اکتوبر کو بدامنی کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ سارا دن وقفے وقفے سے فائرنگ ہوتی رہی۔ موٹر سائیکل سواروں کی فائرنگ سے بارہا افراد ہلاک ہو گئے۔ انتخابات سے ایک دن پہلے جلاؤ، گھیراؤ اور فائرنگ کا مقصد لوگوں کو خوفزدہ کرنا تھا۔ تاکہ وہ ووٹ ڈالنے کے لیے گھروں سے نکلنے کی غلطی نہ کریں ورنہ سخت خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ (۱۷۶)

اسلامی جمہوری محاذ کے صدر، مولانا نورانی نے حیدر آباد میں کہا کہ پاکستان کی تقدیر نظام مصطفی ﷺ سے وابستہ ہے۔ غیر ملکی ایجنٹ مشرقی پاکستان کی تاریخ دہرانا چاہتے ہیں۔ آزمائے ہوئے کو آزمانا گھاٹے کا سودا ہوگا۔ کفر کی قوتیں پھر متحدہ ہو گئی ہیں۔ ضروری ہے کہ آئندہ انتخابات میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی قیادت کو منتخب کیا جائے۔ (۱۷۷)

بالآخر ۵/ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو انتخابی مہم اپنے اختتام کو پہنچی (۱۷۸) کیونکہ اگلا دن فیصلے کا دن تھا چنانچہ ۶/ اکتوبر کو قومی اسمبلی کی ۲۰۷ مسلم نشستوں میں سے ۲۰۱ پر انتخاب ہوئے (۱۷۹)۔ ☆ نتائج کے مطابق پیپلز پارٹی کو ۸۹ جبکہ پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) کو ۷۳ نشستیں حاصل ہوئی۔ اسلامی جمہوری محاذ اور اسلامک فرنٹ بری طرح پٹ گئے۔ محاذ

☆ کیونکہ ایک نشست پر مخدوم امین فہیم بلا مقابلہ کامیاب ہو چکے تھے۔ غلام حیدر وائیں قتل ہو چکے تھے اور چار امیدوار محمد حنیف خان، مومن خاں آفریدی، چوہدری نذیر احمد اور محمد اسماعیل انتقال کر گئے۔ ان پانچ نشستوں پر بعد ازاں ضمنی انتخابات ہوئے۔

نے کل ۵۲ امیدوار کھڑے کیے جن میں سے چار کامیاب ہوئے جبکہ اسلامک فرنٹ کی حالت مزید دگرگوں تھی۔ ان کے ۱۰۵ امیدواروں میں سے صرف تین کو کامیابی نصیب ہوئی (۱۸۰) ☆۔ متحدہ دینی محاذ دو نشستیں حاصل کر سکا۔

۱۹۹۰ء کے الیکشن میں مسلم لیگ نے اسلامی جمہوری اتحاد کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا تھا۔ اتحاد کو ۱۰۶ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ جبکہ پی ڈی اے کو صرف ۴۴ نشستیں ملی تھیں۔ اس الیکشن (۱۹۹۳ء) میں پیپلز پارٹی نے پی ڈی اے سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اپنے نام سے الیکشن میں حصہ لیا تھا۔ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کو قومی اسمبلی کی ۸۷ فی صد نشستیں مل گئیں۔ جبکہ دینی ووٹ تقسیم ہو کر شرمناک کی شکست سے دوچار ہوا اور دینی جماعتوں کے تینوں اتحادوں کو مجموعی طور پر ۹ نشستیں مل سکیں۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے اس موقع پر کہا کہ ہم انتخابات کے نتائج کو خوش دلی کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں اور ہم آئندہ بھی انتخابات میں حصہ لیتے رہے گے۔ (۱۸۱)، بعض حلقوں کا خیال تھا کہ دینی جماعتیں مسلم لیگی اور پی پی کے درمیان ووٹروں کی تقسیم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی تھیں۔ اگرچہ ان کے جلسے جلوس دونوں بڑی جماعتوں کے ہم پلہ ہوتے تھے۔ تاہم انتخابی اعداد و شمار سے با آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دینی جماعتوں نے مسلم لیگ کے ووٹ بنک کو خاصا نقصان پہنچایا (۱۸۲)۔

مولانا شاہ احمد نورانی جنہوں نے قومی اسمبلی کے حلقہ این اے ۱۲۵ سے حصہ لیا شکست سے دوچار ہو گئے اپنی شکست کے نتائج عوامل پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا:

"......اس حلقے کے لوگوں نے مجھے بڑی عقیدت اور محبت سے نوازا کامیابی اور ناکامی انتخاب کے کھیل کا ایک حصہ ہیں۔ ہم اجتماعی طور پر اس ناکامی کا اسباب کا جائزہ لے رہے ہیں۔ علاقائی تناظر میں دیکھا جائے، ناکامی کی وجہ سارا حلقہ جانتا ہے۔...... پی پی پی نے باقی حلقوں سے جماعتوں کے سربراہوں کے مقابلے میں امیدوار بٹھا دیے لیکن اس حلقہ میں پی پی پی کے امیدوار کو کھڑا رکھا گیا۔ جسے ہم کسی اور تناظر میں دیکھیں گے۔ دراصل جن طاقتوں نے

☆ نواز شریف کی کابینہ کے نصف سے زائد ارکان الیکشن ہار گئے۔ زاہد سرفراز، الٰہی بخش سومرو، غوث علی شاہ، چوہدری شجاعت، مولانا نیازی اور حاجی بلور کے علاوہ اجمل خٹک، حاجی محمد حنیف طیب، الحاج شمیم الدین، اعتزاز حسن، نادر پرویز اور مرتضیٰ بھٹو جیسے امیدوار بھی شکست سے دوچار ہو گئے۔

انتخابات میں دینی قوتوں کو بڑے پیمانے پر ایوان سے باہر رکھنے کا کھیل کھیلا یہ انہی طاقتوں کا کارنامہ ہے۔......خوشی کی بات ہے کہ انتقال اقتدار کا عمل پرامن ماحول میں جمہوری روایت کے تحت ہوا ہے۔ یہ مستقبل کے لیے آئندہ علامت ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ آئندہ بھی انتقال اقتدار اسی خوشگوار ماحول میں جمہوری انداز میں ہوتا رہے۔ انتخابات کے بعد یہ بات واضح تھی کہ پی پی پی اقتدار میں آ جائے گی اس لیے یہ سب کچھ عین اندازے کے مطابق ہوا۔ لیکن اسپیکر اور صدر کے انتخابات میں ووٹوں کا تفاوت حیران کن ہے۔ اسے ملکی مروجہ سیاست کا شاخسانہ سمجھا جائے گا......انتخابات کے نتیجے میں ضیاء الحق کی باقیات کا مکمل صفایا ہو گیا ہے اور عوام نے انہیں اقتدار سے جمہوری طرز پر محروم کر دیا ہے۔...... جہاں تک نئی حکومت سے عوام کی توقعات کا تعلق ہے نے حکومت کو بڑے اہم مسائل در پیش ہیں۔ ان میں اسلام کی بالادستی، ایٹمی پالیسی پر مضبوط مؤقف کی ضرورت ہے۔" (۱۸۳)

غرضیکہ قومی اسمبلی میں کسی پارٹی کو بھی اکثریت نہ ملنے کی وجہ سے معلق پارلیمنٹ (Hung Parliament) کا امکان پیدا ہو گیا۔ اراکین اسمبلی اپنے منصب سے گر کر ہارس ٹریڈنگ (سیاسی گھوڑوں کی خرید و فروخت) کے عمل کا حصہ بن گئے۔ آزاد اور اقلیتی اراکین اسمبلی اس تجارت سے خصوصی طور پر مستفید ہوئے۔ یہ صورتحال ایک نئے بحران کا پیش خیمہ تھی۔ جس کے زیادہ دیر جاری رہنے سے از سر نو انتخابات کی نوبت آ سکتی تھی۔ نواز شریف نے صوبائی الیکشن کے انعقاد کے بعد ۱۰ اکتوبر کو بی بی سی کو انٹرویو میں خدشہ ظاہر کیا کہ مرکز میں جو بھی حکومت بنائے گا اسے لامحالہ چھوٹی جماعتوں کا تعاون درکار ہوگا اس لیے حکومت ہم بنائیں یا کوئی اور، وفاقی حکومت مستحکم نہیں ہوگی۔ (۱۸۴)

اسی صورتحال کے تناظر میں ۱۲ اکتوبر کو نگران وزیراعظم معین قریشی نے نواز شریف اور بے نظیر میں ثالثی کی پیشکش کر دی اور مشورہ دیا کہ اقتدار کے لیے رسہ کشی نہ کی جائے لیکن بے نظیر نے مؤقف اختیار کیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت نہیں بن سکتی۔ تاہم پنجاب اگر مرکز کے ساتھ نہ ہوا تو ایک بار پھر بحران پیدا ہوگا۔ (۱۸۵)

تاہم نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ بین الاقوامی میڈیا کے ذریعے یہ تاثر سامنے لایا جانے لگا کہ معلق پارلیمنٹ کے امکان کے پیش نظر مرکز میں ایک مستحکم حکومت بنانے کے لیے ایک یہ تجویز بھی زیر غور ہے کہ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی پانچ سالہ مدت اقتدار کو آپس میں آدھا

آدھا تقسیم کر لیں۔ تاہم ایسے کسی امکان کو مختلف سیاسی حلقوں نے رد کر دیا۔

۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء کو پیپلز پارٹی اور جونیجو گروپ کے مشترکہ اجلاس میں بے نظیر کو وزیر اعظم اور یوسف رضا گیلانی کو اسپیکر کے عہدے کے لیے نامزد کر دیا گیا جبکہ پنجاب کی وزارت اعلیٰ جونیجو گروپ کو دیے جانے کا فیصلہ ہوا (۱۸۶)۔ اس سے اگلے دن پاکستان کی گیارہویں منتخب اسمبلی کے ۱۸۵ ر ارکان نے حلف اٹھایا (۱۸۷)۔ جبکہ اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کے انتخاب کے لیے قومی اسمبلی کا خصوصی اجلاس ۱۷ر اکتوبر کو ہوا۔ جس کی صدارت، صدر کے نامزد کردہ نمائندے محمود خان اچکزئی نے کی کیونکہ گوہر ایوب خود بھی اسپیکر کے عہدے کے امیدوار تھے (۱۸۸)۔ ☆

۱۹ر اکتوبر کو قومی اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں وزیر اعظم کے عہدے کے لیے ووٹ ڈالے گئے۔ بے نظیر کو ۱۲۱ ممبران اسمبلی نے ووٹ دے کر قائد ایوان منتخب کر لیا جبکہ نواز شریف کو ۷۲ ووٹ ملے۔ اسلامی فرنٹ، اسلامی جمہوری محاذ کے اراکین اور غلام مصطفیٰ جتوئی نے ایوان میں موجودگی کے باوجود، ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔ (۱۸۹)

وزارت عظمیٰ کے انتخاب کے بعد اہم مرحلہ صدارتی انتخاب کا تھا۔ جس کے لیے ۱۳ر اکتوبر ۱۹۹۳ء کو کاغذات نامزدگی داخل کرانے کی آخری تاریخ مقرر کی گئی۔ عہدۂ صدارت کے لیے ۲۷ر امیدواروں نے کاغذات نامزدگی داخل کرائے (۱۹۰)۔ ۲ نومبر کو کاغذات نامزدگی کی جانچ پڑتال کے نتیجہ میں ۱۳ر امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیے گئے (۱۹۱) اس طرح اب ۱۴ر امیدوار میدان میں رہ گئے۔

۱۳ نومبر کو صدارتی انتخاب کے لیے پولنگ ہوئی۔ کل ۴۶۴ میں سے کامیابی کے لیے ۲۳۳ ووٹ درکار تھے۔ فاروق لغاری کو مسلم لیگ کے امیدوار وسیم سجاد کے ۱۶۸ ووٹوں کے مقابلے میں ۲۷۴ ووٹ ملے۔ اور وہ آئندہ پانچ سال کے لیے پاکستان کے آٹھویں صدر منتخب ہو گئے (۱۹۲)۔ اس سے اگلے دن انہوں نے ایوان صدر میں اپنے عہدے کا حلف اُٹھایا۔ (۱۹۳)

☆ واضح رہے کہ پیپلز پارٹی نے صدر مملکت کو اپنا یہ اعتراض روانہ کیا تھا کہ گوہر ایوب چونکہ خود اسپیکر شپ کے عہدہ کے امیدوار ہیں۔ اس لیے وہ اجلاس کی صدارت کرنے کے مجاز نہیں رہے۔

یکم دسمبر ۱۹۹۳ء کو اپوزیشن کی ریکوزیشن پر قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا (۱۹۴)۔ اپوزیشن کا اصرار تھا کہ ریکوزیشن اجلاس میں (آئندہ) ضمنی انتخاب میں ممکن دھاندلی اور ایٹمی مسئلہ پر حکومتی موقوف پر بحث کی جائے جبکہ اسپیکر یوسف رضا گیلانی نے رولنگ دی کہ قواعد کے مطابق اپوزیشن کے نکات کو صرف قائد ایوان کی مرضی ہی سے ایجنڈے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اپوزیشن کی بات نہ مانے جانے پر ایوان میں ہنگامہ آرائی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نواز شریف نے کہا کہ اگر ہمیں اسمبلی کے اندر بولنے نہیں دیا گیا تو پھر باہر بات کریں گے۔ گوہر ایوب نے حکومت کے رویہ کو افسوس ناک قرار دیا۔ اس ہنگامہ آرائی کے نتیجے میں اپوزیشن اجلاس سے واک آؤٹ کر گئی۔ (۱۹۵)

۲ دسمبر کو قومی اسمبلی کی بارہ اور پنجاب اسمبلی کی آٹھ نشستوں میں ضمنی انتخابات ہوئے۔ جس کے نتائج درج ذیل رہے:

پارٹی	قومی اسمبلی	صوبائی اسمبلی
پاکستان پیپلز پارٹی	۶	۶
پاکستان مسلم لیگ (ن)	۴	۱
جمعیت علماء اسلام	۱	۰
متحدہ دینی محاذ	۰	۱
آزاد	۱	۰
کل	۱۲	۸ (۱۹۶)

ضمنی انتخاب میں کامیابی سے بے نظیر حکومت کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اب ان کی توجہ صرف اور صرف صوبہ سرحد پر مرکوز تھی جہاں مسلم لیگ کے صابر شاہ اے این پی اور آزاد ممبران کے تعاون سے وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز تھے۔ چنانچہ "مناسب تیاریوں" کے بعد ۱۶ر فروری ۱۹۹۴ء کو پیپلز پارٹی، جونیجو اور آزاد گروپ کے ۲۴ر ارکان کی جانب سے صابر شاہ کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کر دی گئی (۱۹۷)۔ شیر پاؤ نے دعویٰ کیا کہ ہمیں مسلم لیگ کے پانچ وزراء سمیت ۳۵ر ارکان اسمبلی کی حمایت حاصل ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے پانچ وزیروں اور دو مشیروں نے اپنے عہدوں سے استعفے دے دیے تھے (۱۹۸)۔ ☆

☆ جبکہ حقیقت یہ بھی کہ ۱۴ فروری کو بے نظیر حکومت نے سرحد اسمبلی کے ۲۸ر ارکان کو لاہور اور آٹھ کو کراچی منتقل کر دیا۔ انہیں کراچی میں نجی اقامت گاہوں میں ٹھہرایا گیا۔

تاہم پیر صابر شاہ کے خلاف تحریک عدم اعتماد کی کارروائی نے حکومت کو ناکوں چنے چبوائے (۱۹۹)۔ ۲۵ فروری کو صدر فاروق لغاری نے آئین کے آرٹیکل ۲۳۴ کے تحت صوبہ سرحد میں دو ماہ کے لیے گورنر راج نافذ کر دیا۔ صوبائی اسمبلی معطل، وزیر اعلیٰ سبکدوش اور کابینہ توڑ دی گئی۔ ظاہر ہے یہ سارا کھیل سرحد میں مسلم لیگ کی حکومت ختم کرنے کے لیے رچایا جا رہا تھا (۲۰۰)۔

اسلامی جمہوری محاذ کو سیاسی عمل میں ایک کامیابی اس وقت ملی جب محاذ کے سیکریٹری جنرل مولانا فضل الرحمٰن کو قومی اسمبلی کی خارجہ امور کی قائمہ کمیٹی کے چیئر مین منتخب کر لیا گیا۔ مولانا فضل الرحمٰن نے خارجہ پالیسی میں بہترین اور دور رس تبدیلیوں کی یقین دہانی کرائی (۲۰۱)۔

۲ مارچ کو قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں سینٹ کے انتخاب مکمل ہو گئے (۲۰۲)۔ نتائج کے مطابق اگرچہ سینٹ میں پی پی کو اکثریت حاصل تھی لیکن مسلم لیگ اور جے ڈبلیو پی کے اتحاد سے فضا مسلم لیگ کے امیدوار برائے چیئر مین سینٹ وسیم سجاد کے حق میں ہو گئی۔ اس طرح ۲۱ مارچ ۱۹۹۴ء کو ہونے والے چیئر مین اور ڈپٹی چیئر مین کے عہدے کے لیے انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدوار وسیم سجاد ۴۸ ووٹ لے کر تیسری مرتبہ چیئر مین منتخب ہو گئے (۲۰۳)۔ جبکہ جمہوری وطن پارٹی کے عبدالجبار بھی ۴۸ ووٹ لے کر ڈپٹی چیئر مین منتخب ہو گئے۔ چیئر مین سینٹ کے انتخابات میں کامیابی سے اپوزیشن کو یقین ہو گیا کہ حکومت کو ٹف ٹائم دیا جا سکتا ہے۔ ۲۱ راپریل کو سپریم کورٹ نے اپنے مختصر فیصلے میں گورنر راج کی مدت ختم ہونے پر صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ اور ان کی کابینہ کو بحال کر دیا لیکن اب حالات بدل چکے تھے (۲۰۴)۔ ۲۴ راپریل کو سرحد اسمبلی کے اجلاس میں صابر شاہ کو اعتماد کا ووٹ لینا تھا۔ لیکن مسلم لیگ، اے این پی اور ان کے حامی وزیر اعلیٰ مقرر کر لیا گیا۔ انہیں ۴۲ ووٹ ملے جبکہ مسلم لیگ کے دو منحرف ارکان اختر حسین شاہ اور شاہ محمد خاں نے بھی شیر پاؤ کی حمایت کی (۲۰۵)۔

سینٹ کے انتخابات کی تکمیل گویا انتخابی عمل کے اختتام کا اعلان تھا اس لیے اب کسی بھی انتخابی اتحاد کا برقرار رہنا یا نہ رہنا بے معنی تھا۔ چنانچہ قطع نظر اس امر کے کہ مولانا نورانی کو اتحاد میں شامل دوسری جماعت، جمعیت علمائے اسلام کی پالیسیوں سے اتفاق تھا یا

عدم اتفاق، انہوں نے اسلامی جمہوری محاذ کے خاتمے کا اعلان کر دیا (۲۰۶)۔ ۱۹ راپریل ۱۹۹۴ء کو اپنے دورۂ ڈیرہ غازی خان کے دوران سردار محمد خان لغاری کی رہائش گاہ پر اس کے باضابطہ مگر یک طرفہ خاتمے کا اعلان کر دیا۔ ان کے بقول اسلامی جمہوری محاذ کی ضرورت صرف انتخابات ۱۹۹۳ء تک تھی۔ اب ہمارے راستے جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) سے مختلف ہیں۔ (۲۰۷)

انتخابات ۱۹۹۳ء جو کہ ملک گیر دونوں پارٹیوں کے لیے جہاں میوزیکل چیئر کا کھیل ثابت ہوئے جن کے نتیجے میں محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی باری ملنے پر مسند اقتدار پر براجمان ہو گئیں اور نواز شریف کو اپوزیشن لیڈر کی نشست پر جانا پڑا۔ چونکہ بے نظیر حکومت کا سنگھاسن ۱۹۸۸ء کی طرح ۱۹۹۳ء میں بھی مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے نواز شریف نے محض ساڑھے تین ماہ بعد ہی (۱۸ راگست ۱۹۹۴ء) حکومت کے خلاف "کاروانِ نجات" کا اعلان کر دیا (۲۰۸) اور حسب پروگرام ۱۱ ستمبر کو مزار قائد سے ان کی قیادت میں بذریعہ خیبر میل روانہ ہوا۔ جس میں مسلم لیگ، جمعیت علمائے پاکستان، عوامی نیشنل پارٹی اور جمعیت اہل حدیث کے قائدین شامل ہیں۔ (۲۰۹)

بعد ازاں اپوزیشن کے احتجاج میں جان ڈالنے کے لیے ۱۱ راکتوبر کو پہیہ جام ہڑتال کا اعلان کر دیا لیکن کاروانِ نجات کی طرح اس ہڑتال کی کال کو بھی عوامی پذیرائی نہ مل سکی (۲۱۰)۔ تاہم آنے والے دنوں میں حکومت اپوزیشن کا چوہے بلی کا کھیل جاری رہا، تا آنکہ بے نظیر حکومت اپنی پے در پے غلطیوں کی وجہ سے اسٹیبلشمنٹ کی نظروں میں بے وقعت ہوتی چلی گئی۔ اس دوران سینٹ میں حکومت اپوزیشن محاذ آرائی، پارلیمنٹ میں ۱۴ نومبر کو ہونے والے صدارتی خطاب کے دوران ہنگامے آرائی، ان ہاؤس تبدیلی کی کوششوں کے ساتھ ساتھ دہشت گردی اور بم دھماکوں کی وارداتوں میں اضافہ۔

حوالہ جات وتعلیقات

(۱) حسن، مہدی، ڈاکٹر، پاکستان کی سیاست اور عوام، سارنگ پبلی کیشنز لاہور، س ن، ص ۹۶۔

(۲) ایضاً (۳) ایضاً، ص ۹۸ (۴) ایضاً، ص ۹۹

(۵) ایضاً، ص ۱۰۳ (۶) ایضاً، ص ۱۰۹

(۷) سلیم، احمد، ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیوروکریسی، جنگ پبلشرز لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۸۱۔

(۸) حقائق وشواہد اس امر کی نہ صرف سے نشان دہی کرتے ہیں بلکہ اس خیال کو تقویت دیتے ہیں کہ اسمبلیاں توڑنے کی کارروائی فوجی حلقوں کے دباؤ پر کی گئی۔ اسمبلیاں ٹوٹنے کے فوراً بعد محترمہ بے نظیر بھٹو نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا صدر کو اسمبلیاں توڑنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ یہ بیان اس صورتحال کا عکاس تھا کہ صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اختلافات ڈھکے چھپے نہیں رہے تھے اور حزب اختلاف کافی عرصہ سے ان پر اسمبلیاں توڑنے کے لیے دباؤ ڈال رہے تھے لیکن جب تک فوج نے صورتحال سے چشم پوشی کیے رکھی، صدر کو بڑا آئینی اقدام اُٹھانے کی ضرورت پیش نہ آئی لیکن جونہی فوجی حکومت اختلافات میں شدت پیدا ہوئی تو محض چند ہفتوں میں سیاسی بساط لپیٹ دی گئی۔ (ایضاً، ص ۲۸۲)

(۹) ایضاً (۱۰) ایضاً (۱۱) ایضاً

(۱۲) ان اختلافات کی تصویر کچھ یوں بنتی ہے کہ اختلافات کا آغاز وزیر اعظم بے نظیر کے ملٹری سیکریٹری بریگیڈیئر لطیف کی ترقی سے ہوا جنہیں آرمی سلیکشن بورڈ کی طرف سے دو مرتبہ مسترد کر دیا گیا۔ دوسری وجہ نزاع ان افسران کی بحالی سے پیدا ہوئی جو سیاسی جلاوطنی کے بعد وطن واپس آئے تھے۔ فوجی حلقوں کو سب سے شدید دھچکا اس وقت پہنچا جب بے نظیر بے صدر اور آرمی چیف کی ہچکچاہٹ کے باوجود جنرل گل حمید کو آئی ایس آئی کی ڈائریکٹر شپ سے برخواست کر دیا۔ مزید برآں ایڈمرل سروہی کی ریٹائرمنٹ کے سلسلے میں بے نظیر کے مؤقف نے فوجی حلقوں میں شکوک وشبہات کو تیز کر دیا۔ فوجی ترقیوں کے سلسلے میں آخری اختلاف لیفٹیننٹ

جنرل عالم محسود (کور کمانڈر لاہور) کی ریٹائرمنٹ کے موقع پر پیدا ہوا جسے بے نظیر ترقی دے کر ڈپٹی چیف آف آرمی اسٹاف بنانا چاہتی تھیں لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

بعد ازاں فوج نے اپنی زیر تربیت حکمت عملی دو اقدامات کیے۔ پہلے قدم کے طور پر بریگیڈیئر ریاض اللہ کو جی ایچ کیو سے باہر انٹر سروسز پبلک ریلیشنز (آئی ایس پی آر) میں بھیجا گیا۔ ان کو یہ فرض سونپا گیا کہ میرٹ کے ذریعے عوام میں پچھلے دس سالوں میں فوج کے بڑے امیج کو منوانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ ۹۰۔۱۹۸۹ء کی ضرب مومن مشقوں کے ذریعے اس سلسلے میں بہت نتائج حاصل کیے گئے۔ دوسرے اقدام کے تحت فوج نے اپنے امیج کی بہتری کے ساتھ ساتھ پیپلز پارٹی کی مقبول عام حیثیت کو کرپشن کی ان کہانیوں کے ذریعے گرانا شروع کر دیا جو زیادہ تر پارٹی کے اپنے ہی آدمیوں کے ذریعے حاصل ہوئی تھیں۔ اس طرح جلد ہی کرپشن پورے ملک میں سب سے زیادہ قابل بحث موضوع بن گیا۔ فوج کے اس کام میں پی پی پی کے ان رہنماؤں نے پورا پورا تعاون کیا جو اگرچہ پارٹی میں تاخیر سے آئے تھے لیکن اس کے اصل نمائندے بن بیٹھے تھے۔ (احمد سلیم، بحوالہ سابقہ ص ص ۲۸۴۔۲۸۵)

اسی دوران بے نظیر بھٹو پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ جب بے نظیر بھٹو حزب اختلاف کی رہنما تھیں تو ان کی ڈاک ہندوستانی مشن کے سفارتی ذرائع سے باہر بھیجی جاتی تھی۔ بالالفاظ دیگر ان کو حب الوطنی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ (ایضاً، ص ۲۸۶)

ان حالات کی بناء پر پیپلز پارٹی حکومت کی جانب ملٹری انٹیلی جنس اور آئی ایس پی آر کا جارحانہ رویہ ایک فطری امر تھا۔ مزید یہ کہ آئی ایس آئی کو سول انتظامیہ کے تحت دینے سے اس کا رول محدود ہو گیا۔ اس لیے ملٹری انٹیلی جنس کو حکومت مخالف اقدامات کے ضمن میں آگے لایا گیا۔ اس ادارے میں داخلی سیاسی امور کے لیے ایک ایسا شعبہ قائم کیا گیا تھا جس کے ذریعے حکومت کے اہم راز اور فائلیں حزب اختلاف کے علم میں لائی جاتیں جہاں سے میڈیا تک ان کی رسائی آسان ہو جاتی۔ (ایضاً)

(۱۳) پیپلز پارٹی کی جن شرائط پر اقتدار منتقل کیا گیا وہ ابھی تک صیغہ راز میں ہیں۔ بعض سیاسی حلقوں کا کہنا ہے کہ اقتدار کی منتقلی کے وقت فوج اور پیپلز پارٹی کے درمیان باقاعدہ ڈیل طے پائی تھی۔ لیکن طرفین کی جانب سے اس قسم کے کسی بھی سودے سے انکار کیا جاتا رہا۔ (ایضاً، ۲۸۳)

بعض کے نزدیک صرف دو شرائط کو عائد کی گئی تھی ایک یہ کہ فوج کے معاملات میں عدم مداخلت،

دوسرے یہ کہ مسلح افواج کے افسروں سے انتقام نہیں لیا جائے گا۔ جبکہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ پیپلز پارٹی پر کسی قسم کی شرائط عائد نہیں کی گئی تھیں صرف کچھ مشورے، نصیحت کے طور پر پیش کیے گئے تھے۔ دراصل یہ انہی نصیحت نما مشوروں ہی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو غلام اسحاق خان کو بطور صدارتی امیدوار قبول کرنا پڑا اور صاحبزادہ یعقوب علی خان کو وزیر خارجہ کے طور پر کابینہ میں شامل کرنا پڑا۔ تاہم پیپلز پارٹی نے ''مخلوط حکومت'' بنانے کی ''فوجی نصیحت'' کو نظر انداز کر دیا۔ (ایضاً، ص ۲۸۴)

(۱۴) ایضاً، ص ۲۸۵ (۱۵) ایضاً، ص ۲۸۶ (۱۶) ایضاً، ۲۹۰

(۱۷) ایضاً

(۱۸) مختار، شاہد، پاکستانی سیاست کی نصف صدی، لاہور، ص ص ۱۷۴۔۱۷۶

(۱۹) سہیل، اظہر، ایجنسیوں کی حکومت، لاہور، ص ۳۷

(۲۰) ایضاً

(۲۱) یہ صاحب بے نظیر دور میں زیر عتاب رہے تھے۔ انہیں سیکریٹری مذہبی امور کے عہدہ سے برطرف کر کے مردم شماری کمیشن میں تعینات کر دیا گیا تھا۔ سنیارٹی لسٹ میں ان کے بعد آنے والوں کو ترقی دینے کے باوجود انہیں وفاقی سیکریٹری کے عہد سے محروم رکھا گیا۔ اگرچہ اس حوالے سے بے نظیر نے اپنی صوابدید استعمال کی جوان کا قانونی حق تھا۔ چودھری شوکت علی نے اس صورتحال سے دل برداشتہ ہو کر مستعفی ہونے اور ریٹائرمنٹ سے پہلے رخصت کی درخواست دے دی جو بوجوہ معرضِ التواء ہی میں تھی کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کو رخصت ہونا پڑا۔ (اظہر سہیل، ایجنسیوں کی حکومت، ص ۳۷)، چوہدری شوکت علی اسی حکومت کے براہ راست زخم خوردہ تھے اس لیے اب انہیں گھر سے بلا کر ترقی دینے اور سیکریٹری الیکشن کمیشن مقرر کرنے کا فیصلہ ہوا تو پیپلز پارٹی نے اس پر کافی شور مچایا۔ (ایضاً)

(۲۲) ایضاً (۲۳) ایضاً

(۲۴) سلیم، احمد، بحوالہ سابقہ۔ ص ۲۸۷۔

(۲۵) ایضاً (۲۶) ایضاً، ص ۲۸۸۔

(۲۷) سہیل، اظہر، بحوالہ سابقہ، ص ص ۴۲۔۴۳

(۲۸) ایضاً

(۲۹) قبل ازیں ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۰ء کو لاہور ہائی کورٹ نے بھی متفقہ طور پر یہ فیصلہ دیا کہ ۶/اگست ۱۹۹۰ء کو جاری کیا گیا صدارتی فرمان مسٹر طارق رحیم، ڈاکٹر اے باسط اور مسٹر مظفر شاہ کی طرف سے دائر کی گئی تھیں۔ لاہور ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں نگران کابینہ کے سربراہ یا نگران وزیر اعظم کی حیثیت سے غلام مصطفیٰ جتوئی کی تقرری آئین کے آرٹیکل ۴۸ (۲) کی روشنی میں غیر استثنائی واقعہ قرار دیا۔ اس فیصلے سے قبل ۲ ستمبر کو پشاور ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں سرحد کے صوبائی حکومت کی برطرفی کو غیر قانونی قرار دیا تھا۔ اس فیصلے میں بالواسطہ طور پر ۶/اگست کے صدارتی اقدام پر نکتہ چینی کی گئی تھی اور اس امر کی نشاندہی کی گئی تھی کہ صدر نے سندھ اور سرحد کی صوبائی اسمبلیوں کو خود توڑ دیا جہاں پیپلز پارٹی حکمرانی تھی مگر پنجاب اور بلوچستان کی صوبائی اسمبلیوں کو توڑنے کا اختیار ان صوبوں کے گورنروں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا جہاں پی پی مخالف جماعتیں حکمران تھیں۔

پشاور ہائی کورٹ کی فل بنچ پانچ ججوں چیف جسٹس فخر عالم، جسٹس عنایت الٰہی، جسٹس میر احمد بھٹی، جسٹس قاضی محمد جمیل اور جسٹس سید ابن علی پر مشتمل تھی۔ پشاور ہائی کورٹ کے اکثریت فیصلے میں سرحد کی صوبائی اسمبلی کے توڑنے جانے اور صوبائی حکومت کی برطرفی کو غیر قانونی اور آئین کے منافی قرار دیا گیا تھا۔ پشاور ہائی کورٹ نے درخواست گزار آفتاب احمد شیر پاؤ کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے صوبائی اسمبلی اور شیر پاؤ کی صوبائی حکومت کو بحال کرنے کے احکامات بھی جاری کیے تھے۔ اس موقع پر عجیب ڈرامائی کیفیت دیکھنے میں آئی، پشاور ہائیکورٹ کی طرف سے اپنے فیصلے کے اعلان کے آدھے گھنٹے بعد ہی مملکت نے سپریم کورٹ کے ایک جسٹس عثمان علی شاہ سے حکم امتناعی حاصل کر لیا جو اس وقت پشاور میں موجود تھے۔ بعد میں جسٹس عثمان علی شاہ کو صدر غلام اسحاق نے وفاقی محتسب مقرر کر دیا۔ سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے جسٹس علی شاہ نے پشاور ہائی کورٹ کے جاری کردہ حکم کو معطل کر دیا تھا اور اسی دن سپریم کورٹ نے کراچی میں اپنے اجلاس میں پشاور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا۔ سپریم کورٹ کی یہ بنچ چیف جسٹس محمد افضل، مسٹر جسٹس نسیم حسن شاہ، مسٹر جسٹس عبدالقادر شیخ، مسٹر جسٹس سیف الرحمٰن، مسٹر جسٹس سعد سعود جان، مسٹر جسٹس اجمل میاں اور مسٹر جسٹس عبدالحفیظ میمن پر مشتمل تھی۔ یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پشاور ہائی کورٹ کے ایک ایڈہاک جج قاضی محمد جمیل کو صدر غلام اسحاق خان نے مستقل جج کی حیثیت سے کنفرم نہیں

کیا۔ جسٹس قاضی محمد جمیل بھی پشاور ہائی کورٹ کے ان ججوں میں شامل تھے جنہوں نے صدر کے اقدام کے خلاف اکثریت میں فیصلہ دیا تھا۔ قاضی محمد جمیل کے مطابق جنرل ضیاء الحق کے انتقال کے بعد صدر غلام اسحاق خان نے ۱۳۴ ایڈیشنل جج مقرر کیے تھے چونکہ اس وقت کوئی سیاسی حکومت موجود نہ تھی اس لیے میں واحد جج تھا جسے مستقل جج کے طور پر کنفرم نہیں کیا گیا۔ پشاور ہائی کورٹ میں چھ ایڈیشنل ایڈہاک جج تھے لیکن صدر نے صرف مجھے مستقل جج کے طور پر کنفرم نہیں کیا جبکہ باقی ماندہ پانچ ججوں کو کنفرم کر دیا گیا۔ صدر نے یہ اقدام سرحد کی صوبائی اسمبلی کے متعلق پشاور ہائی کورٹ کی طرف سے فیصلے کے اعلان کے صرف چار روز بعد کیا۔ قاضی محمد جمیل کے مطابق صدر نے یہ اقدام مبینہ طور پر جان بوجھ کر کیا تھا حالانکہ قاضی محمد جمیل کو مستقل جج کے طور پر کنفرم کرنے کی سفارش پشاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بھی کر چکے تھے۔ بعد ازاں ۴ر نومبر ۱۹۹۱ء کو سپریم کورٹ کی طرف سے جاری کیے گئے ایک غیر متفقہ فیصلے کی رو سے شیر پاؤ کیس کے متعلق پشاور ہائی کورٹ کے فیصلے کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ سپریم کورٹ کی طرف سے یہ فیصلہ چھ بجے شام جاری کیا گیا اور اس کی سماعت دن بھر جاری رہی۔
خواجہ طارق رحیم بنام وفاق پاکستان'' کیس میں ۴ نومبر ۹۱ء کے اپنے مختلف حکم میں عدالت عظمیٰ نے لاہور ہائی کورٹ کے خلاف اپیل کو بھی مسترد کر دیا۔ (احمد سلیم، بحوالہ سابقہ، ص ۳۰۹۔ ۳۱۱)

(۳۰) روز نامہ جنگ لاہور، ۲۰؍ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔

(۳۱) ایضاً، ۲۵؍ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔

(۳۲) ۱۹۹۰ء کے انتخابات سے قبل نگران وزیراعظم غلام مصطفیٰ جتوئی نے جی ایچ کیو اور ایوان صدر میں بے نظیر بھٹو کو اقتدار سے الگ رکھنے کے لیے طلب کیے جانے والے اجلاس میں شرکت کی۔ اور آئندہ الیکشن کے سلسلے کے کئی اقدامات زیر غور آئے۔ ایوان صدر میں موجود الیکشن سیل نے اس سلسلے میں جو بھی حکمت عملی مرتب کی اس سے جتوئی نے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اپنے وسیع سیاسی تجربے کی روشنی میں بے نظیر مخالف اقدامات کی حوصلہ افزائی کی۔ جتوئی کے ساتھ ہمیشہ یہ المیہ رہا کہ انہیں بھٹو خاندان کے خلاف استعمال کیا گیا اور وہ اس امید پر استعمال ہوتے رہے کہ شاید انہیں ایوان اقتدار تک رسائی حاصل ہو جائے۔ (احمد منیر، بحرانوں کا دور، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۔)

(۳۳) ایضاً (۳۴) ایضاً

(۳۵) انٹرویو، لیفٹیننٹ جنرل (ر) خواجہ محمد اظہر، ۱۵ جولائی ۲۰۰۵ء۔

(۳۶) ایضاً (۳۷) ایضاً

(۳۸) دیکھیے کالم اخبارات روز نامہ جنگ، نوائے وقت، دی نیشن، ڈان وغیرہ، ۲۵؍ اکتوبر ۱۹۹۰ء تا ۳۱؍ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔

(۳۹) مولانا شاہ احمد نورانی سے انٹرویو، سہیل وڑائچ، جنگ کراچی، ۲۸؍ اکتوبر ۱۹۹۰ء۔

(۴۰) ایضاً

(۴۱) احمد، منیر بحوالہ سابقہ، ص ۱۴۔

(۴۲) ایضاً

(۴۳) جونیجو نے نواز شریف کو وزارت عظمیٰ کا امیدوار نامزد کرنے کی حامی تو بھر لی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے حکومتی اور جماعتی عہدوں کو الگ الگ کرنے کی شرط عائد کر دی۔ تاہم نواز شریف نے اس شرط کو قبول کر لیا کیونکہ وہ ایک بڑی سیاسی اتحاد کے سربراہ تھے۔ اس لئے انہیں مسلم لیگ کی صدارت ملنے یا نہ ملنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے وقتی طور پر لچک دکھانے میں بظاہر کوئی قباحت نہیں تھی۔ (ایضاً ص ۱۹)
جبکہ غلام مصطفیٰ جتوئی کو نواز شریف کی طرف سے مرکز میں عام عہدہ دینے کی پیشکش کی گئی وہ جتوئی کو اسپیکر یا ڈپٹی اسپیکر بنانے کے لیے تیار تھے لیکن جتوئی نے مرکز میں کسی بھی عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یکم نومبر ۱۹۹۰ء کو ہی اسلام آباد میں اسلامی جمہوری اتحاد کا اجلاس منعقد ہوا۔ دیگر سیاسی پارٹیوں کے ہم خیال اراکین کو بھی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ (ایضاً)

(۴۴) ایضاً (۴۵) ایضاً (۴۶) ایضاً

(۴۷) روز نامہ جنگ، لاہور، ۴ر نومبر ۱۹۹۰ء۔

(۴۸) ایضاً، ۷ر نومبر ۱۹۹۰ء۔ (۴۹) ایضاً

(۵۰) پنجاب میں غلام حیدر وائیں کے خلاف منظور وٹو کی بغاوت اور تحریک عدم اعتماد جبکہ سندھ میں جام صادق کی شراب نوشی کے قصے نواز شریف کے لیے ابتدائی ایام میں خاصی مشکلات اور خفت کا باعث بنے۔ جام صادق کی شراب نوشی کے اعتراف نے حالات کو اس قدر خراب کر دیا کہ اسلامی اتحاد میں شامل اور اتحاد سے باہر مذہبی جماعتوں نے نواز شریف پر دباؤ ڈالا کہ قانون

سازی کے ذریعے نفاذ شریعت کو یقینی بنائیں۔ اس طرح آغاز میں ہی نواز شریف کے خلاف مختلف محاذ کھلنا شروع ہو گئے۔ (احمد، منیر، بحوالہ سابقہ، ص ۲۳)

(۵۱) ایضاً (۵۲) ایضاً

(۵۳) روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۳ جنوری ۱۹۹۱ء۔

(۵۴) احمد، منیر بحوالہ سابقہ، ص ۲۸۔

(۵۵) ایضاً

(۵۶) روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۶ جنوری ۱۹۹۱ء۔

(۵۷) احمد، منیر بحوالہ سابقہ، ص ۲۸۔

(۵۸) ایضاً (۵۹) ایضاً

(۶۰) روزنامہ جنگ، لاہور، ۵ مارچ ۱۹۹۱ء۔

(۶۱) احمد، منیر بحوالہ سابقہ، ص ۳۰۔

(۶۲) روزنامہ جنگ، لاہور، ۵ مارچ ۱۹۹۱ء۔

(۶۳) ایضاً

(۶۴) روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۶ مارچ ۱۹۹۱ء۔

(۶۵) ایضاً، ۲۲ مارچ ۱۹۹۱ء۔

(۶۶) غلام مصطفیٰ جتوئی اور محمد خان جونیجو دونوں کا تعلق سندھ سے تھا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۹۱ء کو ان دونوں سندھی رہنماؤں کے درمیان نہایت اہم ملاقات ہوئی۔ جونیجو کو دکھ تھا کہ نواز شریف نے انہیں مسلم لیگ کا صدر ہونے کے باوجود وزیراعظم نہیں بننے دیا تھا۔ اسی طرح جتوئی بھی انتخابات میں دھاندلی کروانے کے بدلے میں صلے کے امیدوار تھے۔ یقیناً نوارشریف نے ان دونوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ لہٰذا بے نظیر کی طرف جتوئی کا دوستی کا ہاتھ بڑھانا خالی از علت نہیں تھا۔ (احمد، منیر بحوالہ سابقہ، ص ص ۳۸۔۴۰)

(۶۷) ایضاً (۶۸) ایضاً

(۶۹) مرتضیٰ بھٹو نے دوٹوک الفاظ میں طیارے کے اغواء کی تردید کی تھی۔ ان چاروں ہائی جیکروں کی لاشیں جب ۳ راپریل ۱۹۹۱ء کو پاکستان پہنچیں تو سومرو اور جدون کے اہل خانہ نے لاشیں وصول کرنے سے انکار کردیا جبکہ جاوید اور یوسف کی لاشیں ان کے ورثاء نے وصول کرلیں۔ ہائی

جیکروں کے مرنے سے کئی راز آشکار ہونے سے رہ گئے اور یہ قصہ بھی کبھی نہ کھلنے والی فائلوں کی خوراک بن گیا۔ (ایضاً)

(۷۰) جنرل مرزا اسلم بیگ نے ۲۹ جنوری ۱۹۹۱ء کو واضح کردیا کہ خلیج پالیسی پر فوج اور حکومت میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان کی بیان دینے کا مقصد محض اس غلط فہمی کا ازالہ تھا کہ وہ عراق پر حملے کے خلاف ہیں۔

(۷۱) ایضاً، ص ۴۷

(۷۲) روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۲ اپریل ۱۹۹۱ء

(۷۳) احمد، منیر بحوالہ سابقہ، ص ۴۹۔

(۷۴) ایضاً

(۷۵) روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۳ مئی ۱۹۹۱ء۔

(۷۶) احمد، منیر بحوالہ سابقہ، ص ۴۹۔

(۷۷) ایضاً، ص ص ۵۳۔۵۴

(۷۸) روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۷ اگست ۱۹۹۱ء۔

(۷۹) ان دنوں ایک طرف تو بھارت پاکستان پر حملہ کرنے کے لیے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بتایا گیا کہ ۱۹۹۱ء کے وسط میں بھارتی سیکورٹی فورسز نے متعدد ایسے افراد کو گرفتار کیا جن سے جدید اسلحہ برآمد ہوا۔ بھارت نے الزام عائد کیا کہ یہ اسلحہ آئی ایس آئی کے کشمیر سیل کی طرف سے فراہم کیا گیا ہے۔ ان حالات میں امریکی حکام کی طرف سے نواز حکومت کو بار بار متنبہ کیا گیا کہ مقبوضہ کشمیر میں سرحد پار مداخلت کے امکانات کو کم کیا جائے کیونکہ اس سے عالمی امن کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ (احمد منیر بحوالہ سابقہ ص ص ۵۸،۵۹) اس کے علاوہ بھارت کی افغانستان میں مداخلت، ایران اور چین کی سردمہری نے بھی پاکستان کو جنوبی ایشیا کی (علاقائی) سیاست میں تنہا کردیا تھا۔ (ایضاً، ص ۵۸۔)

(۸۰) روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۱ء۔

(۸۱) ایضاً، ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ (۸۲) ایضاً، ۳ نومبر ۱۹۹۱ء۔

(۸۳) احمد، منیر بحوالہ سابقہ، ص ص ۷۳۔۷۵

(۸۴) باخبر حلقوں کے بقول ''وینا حیات کیس'' کے ذریعے بے نظیر کو یہ پیغام دیا گیا کہ وہ آٹھویں

ترمیم کے خاتمے کے مسئلہ پر نواز شریف سے تعاون نہ کریں کیونکہ مجرموں کی طرف سے دینا حیات کو بار بار یہ دھمکی دی گئی کہ انہیں بے نظیر بھٹو سے دوستی رکھنے کا سبق سکھایا گیا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے ۲۲ دسمبر ۱۹۹۱ء کو پہلی مرتبہ یہ انکشاف کیا کہ ان کا اپریل ۱۹۹۰ء میں نواز شریف کے ساتھ تمام اختلافی امور پر سمجھوتہ ہوگیا تھا۔ مگر میری صلح غلام اسحٰق خان نے نہ ہونے دی۔ (ایضاً، ص ۷۸)

(۸۵) ایضاً

(۸۶) روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۴ فروری ۱۹۹۲ء۔

(۸۷) ایضاً (۸۸) ایضاً (۸۹) ایضاً، ۵ مارچ ۱۹۹۲ء۔ (۹۰) ایضاً

(۹۱) احمد، منیر بحوالہ سابقہ، ص ۸۴۔

(۹۲) روزنامہ جنگ، لاہور، ۲۲ اپریل ۱۹۹۲ء۔

(۹۳) احمد، منیر بحوالہ سابقہ، ص ص ۸۶۔۸۸

(۹۴) روزنامہ جنگ، لاہور، ۳۰ اپریل ۱۹۹۲ء۔

(۹۵) احمد، منیر بحوالہ سابقہ، ص ص ۹۰۔۹۲

(۹۶) ایضاً (۹۷) ایضاً

(۹۸) احمد، منیر، پاکستان کے سیاسی اتحاد، فرنٹیئر پوسٹ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء ص ۱۷۶۔

(۹۹) ۱۹۹۱ء کے ابتدائی دنوں میں نوابزادہ نصر اللہ خان کی طرف سے اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا گیا تاکہ اسلامی جمہوری اتحاد اور پی ڈی اے کے مدمقابل ایک موثر سیاسی اتحاد کا قیام عمل میں لایا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے نوابزادہ نے صرف انہی سیاسی جماعتوں سے رابطہ کیا جو آئی جے آئی اور پی ڈی اے سے باہر تھیں۔ اس لیے نوابزادے نے جمعیت علمائے پاکستان کے صدر مولانا شاہ احمد نورانی اور جمعیت علمائے اسلام کے جنرل سیکرٹری مولانا فضل الرحمٰن سے مذاکرات کیے۔ مذکورہ دونوں دینی جماعتوں نے ابتداء میں نوابزادہ کو تعاون کا یقین دلایا۔ جس کے بعد نوابزادہ نے جمہوری وطن پارٹی کے سربراہ نواب اکبر بگٹی سے رابطہ کیا اور نئے مجوزہ سیاسی اتحاد میں شمولیت کے لیے کہا۔ اس طرح چار سیاسی جماعتوں پاکستان جمہوری پارٹی، جمہوری وطن پارٹی، جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام نے نئے سیاسی اتحاد کے قیام کے لیے مختلف تجاویز پر غور شروع کردیا۔ نوابزادہ ان دنوں آل پارٹیز

کانفرنس کے کنوینر تھے اور ملک کی تمام قابل سیاسی جماعتیں ان کی طرف سے بلائی جانے والی اے پی سی میں شرکت کرچکی تھیں۔ تاہم اچانک جے یو آئی نے نوابزادہ کے مجوزہ اتحاد میں شمولیت سے انکار کردیا۔ اس انکار کی وجوہات کے ذیل میں سیاسی حلقوں کا کہنا تھا کہ نواز حکومت نے جے یو آئی کے ساتھ مری میں مذاکرات کرکے سودے بازی کی تھی جس کے بعد جے یو آئی نے نوابزادہ کے اتحاد میں شمولیت سے انکار کردیا۔ (ایضاً)

(۱۰۰) احمد، منیر، بحرانوں کا دور، بحوالہ سابقہ، ص ۱۰۱۔۱۰۲

(۱۰۱) ایضاً (۱۰۲) ایضاً

(۱۰۳) کیونکہ ۱۹ مئی ۱۹۹۲ء کو جی ایچ کیو میں منعقدہ ایک اہم اجلاس میں جنرل آصف نواز نے دوٹوک الفاظ میں حکومت پر واضح کیا کہ اگر فوج کو مطلوبہ اختیارات نہ دیئے گئے تو وہ اپنے جوانوں کو سندھ سے بلالیں گے کیونکہ فوج نے سندھ کو دہشت گردوں اور جرائم پیشہ عناصر کے خاتمہ کے لیے ''اپریشن بلیو فاکس'' کے نام سے جو جامع پلان تشکیل دے رکھا تھا اس پر نتیجہ خیز عمل درآمد سے صورت میں ممکن تھا جب حکومت فوج کو مطلوبہ اختیارات دے دیتی۔ (ایضاً)

(۱۰۴) ۳۰ مئی ۱۹۹۲ء کو فوجی جوانوں نے دہشت گردوں اور جرائم پیشہ افراد کی سرکوبی کے لیے آپریشن شروع کیا۔ سینکڑوں افراد کو فوج کے تفتیشی مراکز میں بند کردیا گیا۔ ایم کیو ایم سے تعلق رکھنے والے ارکان اسمبلی نے اسی آپریشن کی آڑ میں ایم کیو ایم کے خلاف کارروائی قرار دیا اور صدر سے آپریشن روک دینے کی اپیل کی لیکن بے سود، جنرل آصف نواز کو اندازہ نہیں تھا کہ ایم کیو ایم کے ہاتھ اتنے وسیع ہوچکے تھے کہ انہیں فوج کے بعض ٹاپ سیکرٹ فیصلوں کی اطلاع ہوجاتی تھی اس سے ان کی سوچ میں تبدیلی آتی گئی۔ ۱۶ جون ۱۹۹۲ء کی رات ہی الطاف حسین کو علم ہوگیا تھا کہ فوج نے سندھ آپریشن کا رخ ان کی جماعت کی طرف کردیا ہے اور ان کے دو پرانے دوست عامر اور آفاق آئی ایس آئی اور فوج کے آلہ کار بن گئے ہیں۔ ۱۹ جون کو ایم کیو ایم کے دونوں اسیران حق پرست اور حقیقی میں زبردست لڑائی ہوئی لیکن چونکہ فوج کا تعاون حقیقی کے ساتھ تھا اس لیے اسے وقتی طور پر کامیابی حاصل ہوئی۔ تاہم فوج کے ایک بریگیڈیئر ہارون نے اس امر کی تردید کی کہ فوج ایم کیو ایم حقیقی کے ساتھ تھی۔ ۲۳ جون کو الطاف سمیت متعدد ارکان اسمبلی بشمول عمران فاروق، صدر باقری، اشفاق چیف، سلیم شہزاد اور خالد صدیقی کے خلاف زیر دفعہ ۳۰۲ مقدمات درج کیے گئے۔ اس سے اگلے روز حقیقی کے مرکزی یعنی عامر کے اس بیان

کے الفاظ ہی ان کی کمر توڑ دینے کے لیے کافی تھا کہ قائد تحریک الطاف حسین کراچی اور بعض دوسرے علاقوں کو ملا کر جناح پور کے نام سے ایک الگ آزاد ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن الطاف سوائے صبر کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اس تمام عرصے میں الطاف حسین صدر، وزیر اعظم، قومی رہنماؤں حتیٰ کہ فوج کے سربراہ کو خطوط لکھ لکھ کر فریاد کرتے رہے کہ ان کو دیوار کے ساتھ نہ لگایا جائے بلکہ ان افراد کے خلاف کارروائی کی جائے جنہوں نے ایک سازش کے تحت ایم کیو ایم کو تباہ کردیا۔ لیکن کوئی ان کی مدد کو نہ آیا۔ ان حالات کے نتیجے میں ۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ء کو الطاف حسین نے خرابی صحت کا بہانہ بنا کر سیاست سے علیحدگی کا اعلان کردیا۔ یہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا انوکھا واقعہ تھا کہ ایک مقبول سیاسی جماعت کے سربراہ کو پس منظر میں جانا پڑا۔ (ایضاً، ص ص ۱۰۳۔۱۱۸)

(۱۰۵) حکومت ایم کیو ایم سمجھوتے کے گیارہ نکات کچھ یوں تھے:

۱۔ ایم کیو ایم کو کابینہ میں بھی وزارتیں دی جائیں گی جو اسے جون ۱۹۹۲ء میں فوجی آپریشن شروع ہونے سے پہلے حاصل تھیں۔

۲۔ سندھ حکومت میں ایم کیو ایم کو بدستور سینئر وزیر اور سپیکر کا عہدہ ملے گا۔

۳۔ وہ سرکاری ملازمین جنہیں جون ۱۹۹۲ء میں فوجی آپریشن کے دوران گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کی رہائی کو یقینی بنایا جائے گا۔

۴۔ وہ ملازمین جنہیں فوجی آپریشن کے دوران ایم کیو ایم سے تعلق رکھنے کی پاداش میں ملازمتوں سے فارغ کردیا گیا تھا، دوبارہ روزگار فراہم کیا جائے گا۔

۵۔ سندھ میں ترقیاتی اسکیمیں ارکان اسمبلی کی سفارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار کی جائیں۔

۶۔ حکومت قانون کا احترام کرنے والے امن پسند شہریوں کو تحفظ فراہم کرے گی۔

۷۔ سندھ میں بلدیاتی انتخاب اور مردم شماری فوج کی نگرانی میں کرائی جائے گی۔

۸۔ بلدیاتی انتخابات کے جب شیڈول کا اعلان کیا جاچکا ہے اس پر نظر ثانی ہوگی۔

۹۔ سرکاری ملازمتوں کے کوٹہ سسٹم کو مارچ ۱۹۹۳ء تک بحال رکھا جائے گا۔

۱۰۔ بے افراد کو رہا کردیا جائے گا۔

۱۱۔ ایم کیو ایم دہشت گردوں کی مذمت کرتی ہے۔ (ایضاً، ۱۱۹۔۱۲۱)

(۱۰۶) ایضاً

(۱۰۷) احمد، منیر، پاکستان کے سیاسی اتحاد، بحوالہ سابقہ، ص ۱۶۸۔

(۱۰۸) ایضاً (۱۰۹) ایضاً

(۱۱۰) روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۲ء۔

(۱۱۱) ایضاً، ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۲ء۔ (۱۱۲) ایضاً، ۲ نومبر ۱۹۹۲ء۔

(۱۱۳) احمد، منیر، بحرانوں کا دور، بحوالہ سابقہ، ص ص ۱۳۲۔۱۳۳

(۱۱۴) روزنامہ جنگ، کراچی، ۶ نومبر ۱۹۹۲ء۔

(۱۱۵) ایضاً، ۱۶ نومبر ۱۹۹۲ء۔

(۱۱۶) احمد، منیر، بحرانوں کا دور، بحوالہ سابقہ، ص ۱۳۸۔

(۱۱۷) روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۹ نومبر ۱۹۹۲ء۔

(۱۱۸) احمد، منیر، بحرانوں کا دور، بحوالہ سابقہ، ص ۱۴۵۔

(۱۱۹) ایضاً، ص ص ۱۴۸۔۱۴۹

(۱۲۰) روزنامہ جنگ، کراچی، ۷ دسمبر ۱۹۹۲ء۔

(۱۲۱) ایضاً، ۱۰ دسمبر ۱۹۹۲ء۔

(۱۲۲) احمد، منیر، پاکستان کے سیاسی اتحاد، بحوالہ سابقہ، ص ۱۷۰۔

(۱۲۳) بابری مسجد کی انتہا پسند ہندوؤں کے ہاتھوں شہادت کی خبر جب ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو پاکستان پہنچی تو پورے ملک میں صف ماتم بچھ گئی۔ لوگ احتجاج کرتے ہوئے سڑکوں پر آگئے اور اگلے دن ۷ دسمبر کو پورے ملک میں ہندوؤں کے مندروں کا صفایا کردیا گیا۔ صرف لاہور میں موجود ہندوؤں کے ۴۱ میں سے ۳۹ مندروں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ جبکہ باقی بچ جانے والے دو مندروں کو بری طرح نقصان پہنچایا گیا۔ (ایضاً)

(۱۲۴) ایضاً

(۱۲۵) روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۱ دسمبر ۱۹۹۲ء۔

(۱۲۶) احمد، منیر، پاکستان کے سیاسی اتحاد، بحوالہ سابقہ، ص ۱۷۱۔

(۱۲۷) ایضاً (۱۲۸) ایضاً، ص ۱۷۲۔

(۱۲۹) نواز شریف کی طرف سے طلب کردہ کانفرنس، آل پارٹیز کانفرنس کے سلسلہ کی گیارہویں کانفرنس تھی۔ ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی آل پارٹیز کانفرنس سابق وزیر اعظم چوہدری محمد علی نے

مسئلہ کشمیر پر اپوزیشن جماعتوں کو اعتماد میں لینے کے لیے ۲۶ نومبر ۱۹۵۵ء کو طلب کی تھی۔ اس کانفرنس میں ۷۶ سیاستدانوں نے شرکت کی، جن میں علامہ عنایت اللہ مشرقی، بیگم شاہ نواز، کشمیری لیڈر چوہدری غلام عباس، حسین شہید سہروردی، آئی آئی چندریگر، غفار خان، نواب افتخار ممدوٹ، ڈاکٹر خاں، ملک فیروز خاں نون، مولانا مودودی، مولانا عبدالحمید بھاشانی، مفتی محمد شفیع، مولوی تمیز الدین، میاں افتخار الدین، ممتاز دولتانہ، مشتاق گورمانی، ایوب کھوڑو، علی محمد راشدی، سردار قیوم خان، سردار عبدالرب نشتر، سید عابد حسین اور یوسف ہارون قابل ذکر ہیں۔ یہ کانفرنس سندھ اسمبلی میں منعقد ہوئی اور تین دن جاری رہی۔ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے آزاد کشمیر کے رہنما سردار ابراہیم نے کہا کہ اگر کانفرنس ناکام ہوئی تو ہم حکومت پاکستان سے کہیں گے کہ وہ کشمیر سے فوجیں واپس بلانے اور تنازعہ کشمیر ہم خود حل کریں گے۔ مسلم کانفرنس نے اسی دن کراچی میں ایک بڑا جلسہ کیا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ حکومت پاکستان اقوام متحدہ کی رکنیت سے مستعفی ہوجائے بھارت سے سفارتی تعلقات ختم کرلیے جائیں اور کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے اعلانِ جنگ کردی جائے۔

آل پارٹیز کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم چوہدری محمد علی نے کہا کہ پاکستانی عوام اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ ہیں اور کشمیر کی آزادی کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے جائیں گے۔ مگر افسوس کہ اے پی سی کے فیصلوں پر عملدرآمد نہ ہوسکا اور مسئلہ کشمیر آج بھی حل طلب ہے۔

دوسری آل پارٹیز کانفرنس ۱۹ جولائی ۱۹۵۸ء کو اس وقت کے وزیراعظم ملک فیروز خان نون نے بلائی جس کا مقصد مجوزہ انتخابات کے حوالے سے اپوزیشن کو اعتماد میں لینا تھا۔ اس کانفرنس میں حسین شہید سہروردی، چوہدری محمد علی، حمید الحق چوہدری، محمود الحق عثمانی، مولانا مودودی اور مظفر علی قزلباش نے شرکت کی جبکہ مسلم لیگ کے صدر قیوم خان نے کانفرنس کا بائیکاٹ کیا اور الزام لگایا کہ حکومت انتخابات سے فرار چاہتی ہے اور وہ جس کا سردار قیوم خان نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ ملک فیروز خان نون ملٹری بیوروکریسی کی سازشوں کا شکار ہوگئے اور انہوں نے انتخابات ۱۵ فروری ۱۹۵۹ء تک ملتوی کردیے لیکن ان انتخابات سے قبل ہی ایوب خان کو مداخلت کا موقع مل گیا۔

فیلڈ مارشل ایوب خان نے ۱۹۵۸ء میں جمہوریت پر شب خون مارنے کے بعد سیاستدانوں کو

مکمل طور پر قابو میں کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے لیکن ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے موقع پر اسے انہی سیاستدانوں کی ضرورت پڑی جن کو وہ بدعنوان اور ملک دشمن کہہ چکا تھا۔ ایوب خاں نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں سیاستدانوں سے رابطے کیے اور انہیں دفاعی امور کے حوالے سے اعتماد میں لیا جس کے بعد سیاستدانوں نے باہمی اختلافات بھلا کر حکومت کے ساتھ تعاون کیا۔ جس کی وجہ سے افواج کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے بھارت کو شکست دی۔ ۲۶ فروری ۱۹۶۹ء کو ایوب خاں نے سیاستدانوں کی ایک گول میز کانفرنس طلب کی کیونکہ اپوزیشن حکومت کے خلاف مظاہرے کررہی تھی اور عوام سڑکوں پر نکل آئے تھے ان کا مطالبہ تھا کہ ایوب خان جلد از جلد اقتدار سے الگ ہوجائے۔ تاہم اپوزیشن نے ایوب خان کی طرف سے طلب کردہ کانفرنس میں اس وقت تک شمولیت نہ کی جب تک اس کے تمام مطالبات تسلیم نہ کرلیے گئے۔ گول میز کانفرنس میں اپوزیشن کی طرف سے نوابزادہ نصراللہ خاں، نورالدین، عبدالقیوم خان، ممتاز دولتانہ، خواجہ خیرالدین، حمید الحق چوہدری، محمود علی، مولوی فرید احمد، چوہدری محمد علی، مولانا مودودی، پروفیسر غلام اعظم، مفتی محمود، مجیب الرحمٰن، سید نذرالاسلام، ولی خاں اور مظفر احمد نے شرکت کی جبکہ کنونشن لیگ کی طرف سے ایوب خان، خواجہ شہاب الدین، قاضی محمد عیسیٰ، قاضی محمد اکبر، ہاشم الدین، چوہدری فضل الٰہی، ملک قاسم، فدا محمد خاں، فخرالدین احمد، سردار خضر حیات خان اور زین نورانی نے شرکت کی۔

ایوب خاں کی طرف سے طلب کردہ گول میز کانفرنس اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ حکومت نے اپوزیشن کے مطالبات تسلیم کرلیے لیکن ان مطالبات کو تسلیم کرنے کے باوجود حکومت نے اپوزیشن کو کچلنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے ملک میں ہنگامے شدت اختیار کرگئے اور ایوب خان نے گھبرا کر اقتدار فوج کے حوالے کردیا۔ ایسا کرنے سے قبل ایوب خاں نے یحییٰ خان سے وعدہ لیا تھا کہ حکومت اور فوج ان کی جائیداد ضبط نہیں کرے گی کیونکہ اپوزیشن کا خیال تھا کہ ایوب خان نے قومی خزانے کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے۔ یحییٰ خان نے ایوب خان کے ساتھ کیے وعدوں کو پورا کیا اور انہیں اپنے خاندان کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی۔ ایوب خان اور اس کے اہل خاندان کے اثاثوں کی بھی جانچ پڑتال نہ کی گئی۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد مجیب الرحمٰن کو مشرقی پاکستان میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تو یحییٰ خاں گھبرا گیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ مجیب اور بھٹو انتخابات میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں کرسکیں گے۔ لیکن انتخابی نتائج کو

دیکھتے ہوئے یحییٰ خاں نے مجیب الرحمٰن کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور دونوں میں یہ طے پایا کہ ملک کا آئندہ وزیراعظم مجیب ہوگا جبکہ صدر کے عہدہ پر یحییٰ خان فائز رہے گا۔ یحییٰ خان نے آئین کی تیاری کے لیے مختلف تجاویز پر غور کرنے کے لیے ڈھاکہ میں مارچ ۱۹۷۱ء کانفرنس طلب کی جس میں ذوالفقار علی بھٹو، قیوم خاں، ممتاز دولتانہ، مفتی محمود، مجیب الرحمٰن، ولی خاں، مولانا شاہ احمد نورانی، پروفیسر غفور احمد، نورالامین اور ملک جہانگیر خان نے شرکت کی۔

۱۹۷۲ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے بھارت جانے سے قبل اپوزیشن جماعتوں کو اعتماد میں لیا اور انہیں بتایا کہ وہ شملہ معاہدہ کے لیے دہلی جا رہے ہیں۔ بھٹو اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرات مری میں منعقد ہوئے اور یہ کانفرنس کامیاب رہی کیونکہ اپوزیشن نے لاہور ایئرپورٹ میں بھٹو کو نیک تمناؤں کے ساتھ الوداع کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دورِ حکومت میں دوسری آل پارٹیز کانفرنس یا گول میز کانفرنس ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلی کے الزامات کے بعد بلائی۔ اپوزیشن کا دعویٰ تھا کہ حکومت نے انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کی ہے۔ یہ گول میز کانفرنس کامیاب ہونے کے باوجود ناکام رہی کیونکہ جس وقت حکومت اور اپوزیشن کے درمیان معاہدہ طے پا گیا، اس وقت ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا دیا۔ ۵ مارچ ۱۹۸۸ء کو ضیاء الحق کی حکومت اس کے برعکس محمد خاں جونیجو نے بحیثیت وزیراعظم اپوزیشن کو مسئلہ کشمیر پر اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا اور انہوں نے سیاستدانوں کی کانفرنس طلب کر لی۔ فروری ۱۹۹۰ء میں بے نظیر بھٹو نے بھی اپوزیشن کو مسئلہ کشمیر پر اعتماد میں لینے کے لیے پارلیمانی لیڈروں کی کانفرنس طلب کی جبکہ جماعت اسلامی نے بھی ۴ فروری کو مسئلہ کشمیر پر آل پارٹیز کانفرنس طلب کی۔ (ایضاً، ص ص ۱۷۳-۱۷۴)

(۱۳۰) ایضاً

(۱۳۱) روزنامہ جنگ، کراچی، ۹ جنوری ۱۹۹۳ء۔

(۱۳۲) جنرل اشرف جو اس وقت لاہور کے کور کمانڈر تھے۔ قائم مقام چیف آف آرمی سٹاف بنے۔ ان کے نواز فیملی کے ساتھ خصوصی مراسم تھے۔ میاں نواز شریف کی بھی کوشش تھی کہ انہیں مستقل آرمی چیف بنا دیا جائے مگر ایسا ممکن نہ ہوسکا اور غلام اسحاق خان نے متعدد سینئر جرنیلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جنرل عبدالوحید کو ۱۲ فروری ۱۹۹۳ء کو فوج کا نیا سربراہ تقرر کر دیا۔

(احمد، منیر، بحرانوں کا دور، بحوالہ سابقہ ص ص ۱۵۶-۱۵۸)

(۱۳۳) ایضاً، ص ۱۶۱۔ (۱۳۴) ایضاً، ص ۱۶۴

(۱۳۵) روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۹ مارچ ۱۹۹۳ء۔

(۱۳۶) ایضاً، ۲۸ مارچ ۱۹۹۳ء۔ (۱۳۷) ایضاً، ۳۱ مارچ ۱۹۹۳ء۔

(۱۳۸) احمد، منیر، بحرانوں کا دور، بحوالہ سابقہ، ص ص ۱۶۸-۱۶۹

(۱۳۹) روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۲ اپریل ۱۹۹۳ء۔

(۱۴۰) روزنامہ جنگ، کراچی ۱۹ اپریل ۱۹۹۳ء۔

(۱۴۱) مختار، شاہد۔ بحوالہ سابقہ، ص ص ۲۰۴-۲۰۵

(۱۴۲) ایضاً، ۲۰ اپریل ۱۹۹۳ء۔ (۱۴۳) ایضاً، ۲۶ اپریل ۱۹۹۳ء۔

(۱۴۴) احمد، منیر، بحرانوں کا دور، بحوالہ سابقہ، ص ۱۷۵۔

(۱۴۵) روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۷ مئی ۱۹۹۳ء۔

(۱۴۶) ایضاً، ۱۶ جون ۱۹۹۳ء۔

(۱۴۷) احمد، منیر، بحرانوں کا دور، بحوالہ سابقہ، ص ۱۸۱۔

(۱۴۸) روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۸ جون ۱۹۹۳ء۔

(۱۴۹) سپریم کورٹ نے اس فیصلے میں لکھا کہ: قومی اسمبلی توڑنے کے اقدام کی پہلی گراؤنڈ کو اس بنیاد پر رد کیا گیا ہے کہ ہمارے آئین میں روایتی طور پر سربراہ مملکت کو وہ اختیار حاصل نہیں ہوتا جو بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے۔ نائیجیرین کیس میں اس کی تشریح کے اصول طے ہو چکے ہیں، پارلیمانی جمہوریت میں بادشاہ کو تحفظات حاصل ہوتے ہیں، وہ پارلیمنٹ کو توڑ سکتا ہے اور اسے عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے آئین میں صدر کو یہ تحفظ حاصل نہیں ہے۔ اس طرح کی دلیل کو تسلیم کرنا سیاسی ڈھانچے کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے۔ آئین کے آرٹیکل ۵۸ (۲بی) کے تحت صدر کو جو اختیار حاصل ہے اس کے صدر کسی شہری کو آئین توڑنے کا ذمہ دار قرار نہیں دے سکتے۔ صدر نے وزیراعظم کی ۱۷ اپریل کی تقریر کو آئین توڑنے کے مترادف قرار دیا۔ ہمارے قانون میں آئین توڑنا غداری کے زمرے میں آتا ہے اور یہ ہمارے ہاں انتہائی سنگین جرم ہے جو کوئی شخص ملک کے خلاف کرتا ہے۔ صدر کے پاس آئین کے تحت ایسا کوئی اختیار نہیں کہ وہ کسی شہری کو آئین توڑنے کے جرم کا ذمہ دار ٹھہرائیں۔ وزیراعظم اکثریتی جماعت کا لیڈر ہوتا ہے اس کے خلاف غداری کا الزام عائد کرنا بنیادی حقوق کے بھی منافی ہے۔ ہم نے وزیراعظم کی تقریر اور

اس کے اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے کسی لحاظ سے بھی وزیراعظم کی تقریر کو اسمبلی توڑنے کا جواز نہیں بنایا جاسکتا جبکہ صدر پاکستان نے بھی اپنی تقریر میں واضح کیا ہے کہ وزیراعظم نے اگر انکی ذات پر تنقید کی ہے تو انہوں نے اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ لہٰذا عدالت بھی اس معاملے کا نوٹس نہیں لیتی۔ جہاں تک صدر کے عہدے کو آئین میں تحفظ دیا گیا ہے اس جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ہم نے صدر اور وزیراعظم کے اختلافات کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایسے اختلافات میں تنقید کی گنجائش نکلتی ہے۔ صدر اور وزیراعظم نے طویل عرصہ تک ایک دوسرے تعاون کیا، کھلے عام ایک دوسرے کی تعریف کی اور کبھی اپنے آئینی و قانونی اختلافات سامنے لے کر نہیں آئے، اب ایسی تنقید کو آئین کی راہ میں رکاوٹ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس صورت حال کا یہ حل نہیں کہ ایک، دوسرے کو نکال دے بلکہ آئین کی پابندی حل ہے۔ صدر اور وزیراعظم کے حلف کے الفاظ ایک ہی ہیں صرف ان کے عہدوں کا فرق ہے۔ حلف کی پہلی شرط یہ ہے کہ حلف اٹھانے والا اپنے دائرہ کار اور اختیارات کا علم رکھے اور اس کے بعد اس کی وفاداری کرے۔ لہٰذا آئین کے آرٹیکل ۵۸ (۲ بی) کے تحت انہیں یہ اختیار نہیں تھا کہ وزیراعظم پر یہ الزام لگاتے۔

اسمبلی توڑنے کی تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آئینی ادارے صحیح کام نہیں کر رہے تھے اور صوبوں کو شکایت تھیں، اس ضمن میں دو وزرائے اعلیٰ کے خطوط بھی پیش کیے گئے اور مشترکہ مفادات کی کونسل کے حوالے سے شکایات کی گئی مگر ان صوبوں نے آئین کے مطابق جھگڑے کو پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنے کا مطالبہ نہیں کیا۔ انہوں نے صرف اس امر کی شکایت کہ واپڈا کی نج کاری میں انہیں مناسب نمائندگی نہیں دی گئی۔ انہوں نے صرف ان باتوں کی شکایت کی ہے جو متعلقہ اتھارٹی کے زیر غور ہیں اور جن کے بارے میں حتمی فیصلہ نہیں ہوا، ایسے معاملات میں اصلاح کی گنجائش ہوتی ہے۔ ملک میں خوشگوار تعلقات اس وقت قائم رہے ہیں جب ایک ہی سیاسی جماعت کی حکومت مرکز اور صوبوں میں ہو۔ موجودہ کیس میں بھی یہی صورتحال ہے۔ لہٰذا صوبوں کے درمیان کوئی غیر معمولی آئینی اختلاف ہوجائے تو عمومی طور پر اس طرح کے معاملات وزیراعظم کے فیصلے کے لیے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ نج کاری اور انتظامی امور میں ”شفاف“ کا لفظ کانوں کو بڑا اچھا لگتا ہے۔ جس ملک میں معلومات حاصل کرنے کی آزادی نہ ہو، جہاں مالی لین دین کو خفیہ رکھا جاتا ہو۔ وہاں ”شفاف“ کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے اور

شفاف نہ ہونے کی بنیاد کو قومی اسمبلی توڑنے کی بنیاد کیسے بنایا جاسکتا ہے، کسی چیز کا شفاف نہ ہونا مبہم ہے جبکہ عدالت پہلے ہی قرار دے چکی ہے کہ آئین کے آرٹیکل ۵۸ (۲ بی) کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ صدارتی حکم میں متعدد ایسے نکات اٹھائے گئے جو اسمبلی توڑنے کے صدر کے اختیارات سے غیر متعلق ہیں مثال کے طور پر کہا گیا کہ وفاقی حکومت ملک کی سالمیت کو درپیش خطرات کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور ملک کو سنگین معاشی مشکلات کا سامنا ہے ایسی وجوہات کو اسمبلی توڑنے کا جواز بنایا جاسکتا ہے۔

صدر پاکستان اس ضمن میں کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتے اس مقصد کے لیے پارلیمنٹ موجود ہے، اسمبلی توڑنے کی کوئی بھی ایسی وجہ بیان نہیں کی گئی جو آئین کے مطابق اسمبلی توڑنے کا جواز بنتی، اسمبلی توڑنے کا اختیار استعمال کرتے ہوئے کلی طور پر اختیار سے تجاوز کیا گیا۔ اٹارنی جنرل نے آئین کے آرٹیکل ۹ (۵) کا سہارا لیا اور کہا کہ وزیراعظم صدر کی مرضی کے مطابق عہدہ برقرار رکھ سکتا ہے اور جب صدر محسوس کریں کہ وہ اکثریت کی حمایت کھو چکے ہیں تو صدر اعتماد کا ووٹ لینے کے لیے کہہ سکتا ہے۔ ہماری آئین میں صدر کو آرٹیکل ۵۸ (۲ بی) کے تحت اسمبلی توڑنے کا اختیار ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس اختیار کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے اختیارات کو کیوں شامل کیا جاتا ہے، مالک اور ملازم کا تصور کیوں اجاگر کیا جاتا ہے جو بنیادی حقوق کے منافی ہے۔ آئینی طور پر زیادہ مناسب ہوگا کہ ایسے اختیار کو نظر انداز کیا جائے۔ چیف آف آرمی سٹاف کا تقرر کیا۔“ اس کے جواب میں وزیراعظم نے کہا کہ چیف آف آرمی سٹاف کے تقرر پر انہیں کوئی اختلاف یا اعتراض نہیں تھا۔ عدالت دونوں کے بیانات کو تسلیم کرلیتی ہے تاہم اختلاف تقرری کے اختیارات کے بارے میں ہوسکتا ہے، موجودہ صورت میں یہ اختیار صدر کو حاصل ہے۔ البتہ آرٹیکل ۲۴۳ میں ترمیم سے قبل ایئرفورس، نیوی اور آرمی چیف کا تقرر وزیراعظم کے مشورے سے ہوتا تھا۔ ایس ایم ظفر ایڈووکیٹ نے اپنے دلائل میں سیاسی انصاف پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آئین میں بنیادی حقوق کی شقوں میں بالخصوص اور بعض دیگر شقوں میں ایسا انصاف مہیا کیا گیا ہے۔ فیصلے میں مزید سیاسی جماعتوں کے بنیادی حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ آئین سیاسی جماعتوں کو حکومت بننے اور حکومت مینڈیٹ کے مطاق چلانے کا حق دیتا ہے۔ اس ضمن میں آئین کے آرٹیکل ۱۷ (۲) کی تشریح کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ آئینی درخواست نہ صرف اس بنیاد پر منظور کی جاتی ہے کہ بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہوئی بلکہ آئین توڑنے کا الزام غلط لگایا گیا

ہے۔ صدر نے وفاقی حکومت کو قبائلی علاقے میں سرگرمیاں جاری رکھنے سے روکا یہ بھی آرٹیکل ۱۷ (۲) کی خلاف ورزی ہے، لہٰذا یہ آئینی درخواست منظور کی جاتی ہے اور صدارتی حکومت کو غیر قانونی قرار دیا جاتا ہے اس کے نتیجہ میں قومی اسمبلی، وزیر اعظم اور ان کی کابینہ بحال کی جاتی ہے۔

چیف جسٹس مسٹر جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ نے اپنے تفصیلی تحریری فیصلہ میں لکھا کہ وزیر اعظم اپنی حکومت کی پالیسیوں اور حکومتی اوامر چلانے کے بارے میں صرف قومی اسمبلی کو جوابدہ ہیں نہ کہ صدر کو جوابدہ ہیں۔ چیف جسٹس مسٹر جسٹس نسیم حسن شاہ نے اپنے فیصلہ میں لکھا ہے کہ اس کیس میں کہا گیا ہے کہ حکومتی مشینری وزیر اعظم کی تقریر کی وجہ سے مفلوج ہو کر رہ گئی تھی اس لیے ریاست کے ان دوستونوں کو اکٹھے مل کر چلانا ناممکن ہو گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہر چند کہ صدر وفاق کے اتحاد کی علامت ہیں اور تمام ریاستی اداروں کو ان کا احترام کرنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ احترام انہیں تبھی حاصل ہوتا ہے اگر وہ مکمل طور پر غیر جانبدار ہیں، خود کو پارٹی سیاست سے دور رکھیں اور کسی کو یہ تاثر نہ دیں کہ وہ کسی ایک دھڑے کی حمایت اور دوسرے کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ اگر وہ اس کے برعکس پارٹی پالیٹکس کے اکھاڑے میں کودتے ہیں تو وہ بقول برطانوی وزیر اعظم اسکوئتھ کے متحارب دھڑوں میں فٹ بال بن جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے سامنے جو مواد پیش کیا گیا، اس سے بدقسمتی سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر اعظم نے یہ رائے قائم کی کہ صدر اپنی غیر جانبدارانہ حیثیت کھو بیٹھے ہیں اور ان کے حریفوں کا ساتھ دے رہے ہیں اور حکومت کو غیر مستحکم کرنے کی ان کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک ایسی رائے تھی جسے صحیح طور پر جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان حالات میں یہ الزام لگانا کہ وزیر اعظم نے ۱۷ اپریل کو تقریر کر کے آئین سے روگردانی کی جبکہ وہ اس صورتحال کے خلاف احتجاج کر رہے تھے، اُردو کہاوت ''زبردست مارے اور رونے بھی نہ دے'' کے مترادف ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ ریاست کے دوستون ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تھے تو یہ وزیر اعظم کی پیدا کردہ نہیں تھی۔ ان حالات میں صدر نے آئین کی دفعہ ۵۸ (۲ بی) کے تحت وزیر اعظم کو ان کی کابینہ سمیت برطرف کرنے و قومی اسمبلی توڑنے کا جو اختیار استعمال کیا اسے برقرار نہیں رکھا جاسکتا کیونکہ ان کا یہ اقدام اس شق کے دائرہ میں نہیں آتا۔ مزید یہ کہ یہ غیر قانونی اقدام بنیادی شق ۱۷ کی خلاف

ورزی بھی تھی جبکہ عدالت کا فرض ہے کہ وہ بنیادی حقوق نافذ کرے اور ان پر عملدرآمد کرانے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہ لے۔ جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ ان کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ اس کیس میں آئین کی دفعہ ۱۸۴ (۳) کے تحت کارروائی کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اس کے مطابق ۲۶ مئی ۱۹۹۳ء کو فریقین کے دلائل ختم ہونے پر عدالت نے اپنا آئینی فرض ادا کرتے ہوئے کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے نتیجہ میں قومی اسمبلی، وزیر اعظم اور کابینہ کو بحال کر دیا ہے اگرچہ ہم صدر کا نقطہ نظر سمجھتے ہیں جو فاضل اٹارنی جنرل نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے لیکن ہم اس کی تائید نہیں کر سکتے۔ ہماری رائے میں یہ صدر کو آئین میں تفویض کردہ کردار کی غلط تشریح کا نتیجہ ہے۔

اس صورت حال میں بری فوج کے سربراہ جنرل عبدالوحید نے صدر اسحاق، نواز شریف اور بے نظیر کے درمیان شٹل ڈپلومیسی شروع کی۔ باہمی گفت وشنید کے نتیجے میں بحران پر قابو پانے کے لیے درج ذیل طریق کار پر اتفاق رائے ہو گیا:

(۱) وزیر اعظم نواز شریف صدر کو قومی اسمبلی توڑنے کی ہدایت دیں گے۔

(۲) صدر غلام اسحاق اور وزیر اعظم دونوں اپنے عہدوں سے دستبردار ہو جائیں گے۔

(۳) قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کے نئے انتخابات کرائے جائیں گے۔

(۴) سینٹ کے چیئرمین وسیم سجاد قائم مقام صدر کا عہدہ سنبھال لیں گے۔

(۵) معین قریشی کو نگران وزیر اعظم مقرر کیا جائے گا اور

(۶) چاروں صوبوں میں موجودہ گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کی جگہ غیر سیاسی اور غیر جانبدار افراد کو مقرر کیا جائے گا۔ (ایضاً، ۱۰ جولائی ۱۹۹۳ء۔)

(۱۵۰) ایضاً، ۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء۔

(۱۵۱) ۲۳ جولائی کو عبدالستار، نثار میمن، سید بابر علی، احمد فاروق، فتح خان بندیال اور لیفٹیننٹ جنرل (ر) محمد شفیق پر مشتمل چھ رکنی کابینہ نے حلف اٹھالیا۔ یکم اگست کو وفاقی کابینہ میں تین مزید وزراء جسٹس عبدالشکور سلام، لیفٹیننٹ جنرل (ر) احمد بھٹی اور علی خان جونیجو کا اضافہ ہو گیا۔ ۱۹ جولائی کو گورنر چوہدری الطاف حسین کے مستعفی ہونے کے بعد لیفٹیننٹ جنرل (ر) محمد اقبال نے گورنر کا عہدہ سنبھالا جبکہ شیخ منظور الٰہی نگران وزیر اعلیٰ بنے۔ پنجاب اسمبلی ۲۸ جون کو وزیر اعلیٰ کی ہدایت پر توڑ جاچکی تھی۔ سندھ میں حکیم محمد سعید گورنر جبکہ جسٹس (ر) سید علی احمد شاہ نگران

وزیراعلیٰ بنے۔ صوبہ سرحد میں میجر جنرل (ر) خورشید علی خاں گورنر اور پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین مفتی محمد عباس نگران وزیراعلیٰ بنے۔ اسی طرح بلوچستان میں ۱۹ جولائی کو بریگیڈیئر (ر) سردار عبدالرحیم درانی گورنر اور میر محمد نصیر مینگل نگران وزیراعلیٰ مقرر کیے گئے۔ (ایضاً، ۱۹ جولائی ۱۹۹۳ء۔)

(۱۵۲) ایضاً، ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔

(۱۵۳) احمد، غفور، پروفیسر، بے نظیر کا عروج وزوال، القمر انٹر پرائزز لاہور، ص ۲۸۔

(۱۵۴) ایضاً، ص ص ۲۹۔۳۰

(۱۵۵) روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۹ جولائی ۱۹۹۳ء۔

(۱۵۶) ایضاً، ۲۲ جولائی ۱۹۹۳ء۔

(۱۵۷) احمد، غفور، پروفیسر، بحوالہ سابقہ ص ص ۳۰۔۳۱

(۱۵۸) روزنامہ جنگ، کراچی، ۲ اگست ۱۹۹۳ء۔

(۱۵۹) ایضاً (۱۶۰) ایضاً

(۱۶۱) احمد، غفور، پروفیسر، بحوالہ سابقہ ص ۵۰۔

(۱۶۲) ایضاً، ص ۵۳۔

(۱۶۳) روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۲ اگست ۱۹۹۳ء۔

(۱۶۴) ایضاً (۱۶۵) ایضاً

(۱۶۶) مارچ ۱۹۸۵ء کے بعد قرض معاف کرانے والوں اور جون ۱۹۹۳ء تک قرض واپس نہ کرنے والوں پر چالیس ارب روپے واجب الادا تھے۔ فہرست میں بے نظیر، نصرت بھٹو، چوہدری شجاعت، پرویز الٰہی، شہباز شریف، گوہر ایوب، الطاف حسین، لیاقت جتوئی، ظفر اللہ جمالی، عطا مری، پروین مری، نفیس صدیقی، سلمیٰ احمد مرتضیٰ پویا، اسلام الدین شیخ، اعجاز جتوئی، نصیرا ے شیخ اور انور سیف اللہ کے نام شامل تھے۔ قائم مقام صدر نے ایک آرڈیننس جاری کیا جس کے مطابق نادہندگان کو ۱۷ ستمبر تک قرض ادا کرنے کی مہلت دی گئی۔ (قومی اسمبلی کے امیدواران کی آخری فہرست ۱۴ ستمبر ۱۹۹۳ء کو جاری ہونا تھی۔) (روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۸ اگست ۱۹۹۳ء۔)

(۱۶۷) ایضاً، ۱۶ ستمبر ۱۹۹۳ء۔

(۱۶۸) پندرہ روزہ ندائے اہل سنت، لاہور، یکم تا ۱۵ ستمبر ۱۹۹۳ء۔

(۱۶۹) احمد، غفور، پروفیسر، بحوالہ سابقہ ص ۷۶۔

(۱۷۰) ایضاً، ص ۷۷۔

(۱۷۱) روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۶ ستمبر ۱۹۹۳ء۔

(۱۷۲) امریکی جریدے نیوز ویک کی رپورٹ کے مطابق:

''معین قریشی کی اصلاحات سے بے نظیر کو فائدہ اور نواز شریف کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ بے نظیر کئی اعتبار سے نواز شریف کے مقابلہ میں بہتر پوزیشن میں ہیں۔ اوّل یہ کہ فوجی طاقت بے نظیر کے ساتھ معلوم ہوتی ہے حالانکہ تین سال قبل (۱۹۹۰ء میں) فوج ہی نے انہیں اقتدار سے الگ کیا تھا۔ دوسرے نواز شریف کو اسلامی جمہوری اتحاد کی حمایت بھی حاصل نہیں جو پچھلے انتخابات میں ان کے ساتھ تھا......'' جبکہ سعودی عرب کے انگریزی روزنامے عرب نیوز کی رپورٹ میں اس رائے کا اظہار کیا گیا: ''اگر مسلم لیگ (نواز گروپ) اور اسلامک فرنٹ میں اتحاد قائم نہ ہوا تو پاکستان میں پیپلز پارٹی ایک مرتبہ پھر اقتدار میں آجائے گی۔ نواز شریف کی شکست کا سبب قاضی حسین احمد بنے گا۔'' (ایضاً، ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔)

(۱۷۳) احمد، غفور، پروفیسر، بحوالہ سابقہ ص ۹۳۔

(۱۷۴) ایضاً، ص ۹۵۔

(۱۷۵) روزنامہ جنگ، کراچی ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔

(۱۷۶) ایضاً

(۱۷۷) احمد، غفور، پروفیسر، بحوالہ سابقہ ص ۹۶۔

(۱۷۸) روزنامہ جنگ، کراچی ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔

(۱۷۹) ایضاً، ۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔

(۱۸۰) احمد، غفور، پروفیسر، بحوالہ سابقہ ص ص ۱۰۴۔۱۰۹

(۱۸۱) ایضاً (۱۸۲) ایضاً

(۱۸۳) روزنامہ عوام، کراچی، ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔

(۱۸۴) احمد، غفور، پروفیسر، بحوالہ سابقہ، ص ۱۱۴۔

(۱۸۵) ایضاً، ص ۱۱۶۔

(۱۸۶) روزنامہ جنگ، کراچی ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔

(۱۸۷) اجلاس میں چار سابق وزرائے اعظم، چھ سابق وزرائے اعلیٰ، ۲۹ سابق وزراء، چھ پارٹیوں کے سربراہ اور چار خواتین تھیں۔ گیارہ ایسے اراکین اسمبلی نے حلف نہیں اٹھایا جو مرکز اور صوبے دونوں میں جیتے تھے۔ (ان میں سے چھ کا تعلق پی پی پی سے جبکہ پانچ کا تعلق مسلم لیگ سے تھا) نواز شریف نے اپنی لاہور کی نشست خالی کردی اور ایبٹ آباد سے منتخب رکن کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ جبکہ چار نشستیں دوجگہ سے انتخاب جیتنے کی وجہ سے خالی ہوئیں۔ ۲۰۷ کے ایوان میں ۱۶ نشستوں کی صورتحال تھی جبکہ بقیہ چھ نشستیں امیدواروں کی وفات سے خالی ہوئی تھیں۔ (ایضاً، ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔)

(۱۸۸) ایضاً

(۱۸۹) روزنامہ جنگ، کراچی ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔

(۱۹۰) اہم صدارتی امیدواروں میں فاروق لغاری، وسیم سجاد، غلام اسحاق، گوہر ایوب، نوابزادہ بگٹی، سرتاج عزیز، افتخار گیلانی، بلخ شیر مزاری، آفتاب شعبان میرانی، عبدالمجید ملک، اصغرخان اور یحییٰ بختیار شامل تھے۔ واضح رہے کہ غلام اسحاق خان نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کاغذات داخل کرائے تھے لیکن بعد ازاں وہ لغاری کے حق میں دستبردار ہوگئے۔ نگران وزیر اعظم معین قریشی خواہش اور کوشش کے باوجود حمایت حاصل نہ کرسکنے کی وجہ سے کاغذاتِ نامزدگی داخل نہ کرسکے۔ (ایضاً، یکم نومبر ۱۹۹۳ء۔)

(۱۹۱) ایضاً، ۳ نومبر ۱۹۹۳ء۔

(۱۹۲) صدارتی انتخاب کا نتیجہ حسب ذیل رہا:

ایوان	فاروق لغاری پی پی پی	وسیم سجاد مسلم لیگ
قومی اسمبلی اور سینٹ	۱۷۰	۱۰۸
پنجاب اسمبلی	۲۴	۱۷
سندھ اسمبلی	۳۹	۰۱
سرحد اسمبلی	۲۰	۲۱
بلوچستان اسمبلی	۲۱	۲۱
حتمی نتیجہ	۲۷۴	۱۶۸

(ایضاً، ۱۴ نومبر ۱۹۹۳ء)

(۱۹۳) ایضاً، ۱۵ نومبر ۱۹۹۳ء۔ (۱۹۴) ایضاً، ۲ دسمبر ۱۹۹۳ء۔

(۱۹۵) احمد، غفور، پروفیسر، بحوالہ سابقہ ص ۱۵۱۔

(۱۹۶) ایضاً ص ۱۵۳۔

(۱۹۷) روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۷ فروری ۱۹۹۴ء۔

(۱۹۸) ایضاً، ۱۸ فروری ۱۹۹۴ء۔ (۱۹۹) ایضاً (۲۰۰) ایضاً، ۲۶ فروری ۱۹۹۴ء۔

(۲۰۱) نواز شریف نے مولانا فضل الرحمٰن کے تقرر کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے کہا کہ اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر سیاست کرنے والے چند لاکھ روپے میں بک گئے۔ اس طرح نام نہاد دینی رہنماؤں کے حکمرانوں کا گٹھ جوڑ بے نقاب ہوگیا۔ ذکی الدین پال کے بقول فضل الرحمٰن نے اپنے ایک انٹرویو میں قیام پاکستان کو فراڈ قرار دیا تھا۔ انہیں خارجہ کمیٹی کا چیئرمین بنانا افسوس ناک ہے۔ اصغرخاں نے بھی اس فیصلے پر ملتے جلتے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے حکومت پر سخت تنقید کی۔ (احمد، غفور، پروفیسر، بحوالہ سابقہ ص ۱۹۱۔)

(۲۰۲) سینٹ کے انتخابات کے نتائج حسب ذیل رہے:

پارٹی	پنجاب	سندھ	سرحد	بلوچستان	وفاقی دارالحکومت	میزان
پیپلز پارٹی اور حلیف جماعتیں	۵	۷	۵	۱	۱	۱۹
پاکستان مسلم لیگ (ن)	۴	......	۱	۲	......	۷
عوامی نیشنل پارٹی	......	......	۳	......	......	۳
ایم کیو ایم (حق پرست)	......	۲	......	......	......	۲
جمہوری وطن پارٹی	......	......	......	۲	......	۲

پختونخواہ ملی عوامی پارٹی	...	......	......	۱	...	۱
جمعیت علماء اسلام	...	......	......	۱	...	۱
پی این ایم (ح)	......	......	......	۱	......	۱
بی این ایم (مینگل)	......	......	۱	......	......	۱
ٹوٹل	۹	۹	۹	۹		۳۷

(۲۰۳) روزنامہ جنگ، لاہور، ۲۲ مارچ ۱۹۹۴ء۔

(۲۰۴) ایضاً، ۲۲ اپریل ۱۹۹۴ء۔ (۲۰۵) ایضاً، ۲۵ اپریل ۱۹۹۴ء۔

(۲۰۶) ایضاً، ۲۰ اپریل ۱۹۹۴ء۔ (۲۰۷) ایضاً

(۲۰۸) روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۱۹ اگست ۱۹۹۴ء۔

(۲۰۹) ایضاً، ۱۲ ستمبر ۱۹۹۴ء۔ (۲۱۰) ایضاً، ۱۳ ستمبر ۱۹۹۴ء۔

(۲۱۱) ایضاً، ۶ نومبر ۱۹۹۶ء۔ (۲۱۲) ایضاً، ۴ فروری ۱۹۹۷ء۔

(۲۱۳) ایضاً، ۱۳، ۱۱ کتوبر ۱۹۹۹ء۔

باب ہفتم

مولانا شاہ احمد نورانی ملی یکجہتی کونسل سے متحدہ مجلسِ عمل تک

سال ۱۹۹۴ء کا اختتام ملک عزیز میں فرقہ ورانہ تشدد میں شدت، بڑھتی ہوئی لاقانونیت اور حکومت ایم کیو ایم اختلافات اور رسہ کشی پر ہوا۔ بالخصوص فرقہ ورانہ قتل و غارت اور کراچی کے حالات نے بے نظیر کے اقتدار میں رہنے کے جواز کو ختم کردیا۔ ایم کیو ایم (حق پرست) کے خود ساختہ جلا وطن چیئرمین الطاف حسین نے لندن سے چیف آف دی آدمی اسٹاف جنرل عبدالوحید کاکڑ اور بعض دیگر جرنیلوں کے نام اپنے کھلے خط میں ایم کیو ایم کے ان ۸۸ کارکنوں کی تفصیلات جاری کردیں جو ۸/ اکتوبر ۱۹۹۲ء سے ۴ دسمبر ۱۹۹۴ء تک قانون نافذ کرنے والے اداروں اور دہشت گردوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ اس خط کا ایک منفی نتیجہ یہ نکلا کہ کراچی میں دہشت گردوں کو حکومت کے خلاف ردعمل کے طور پر قتل و غارت کا ایک اور سنہری بہانہ ہاتھ آ گیا۔ جس سے کراچی میں دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ خط کی اشاعت کے اگلے تین دنوں (۶ تا ۸ دسمبر ۱۹۹۴ء) میں کراچی میں ۴۴/ افراد جاں بحق اور ۲۰ ے زائد زخمی ہوئے (۱)۔ ملک میں دہشت گردی کے واقعات کی بڑھتی ہوئی شرح کا اندازہ اس ام ے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف کراچی میں ۸۶ پولیس اہلکاروں سمیت ۱۰۰۵/ افراد قتل ہوئے۔ دو ہزار سے زائد زخمی ہوئے۔ ڈکیتی کی چار ہزار سے زائد وارداتیں ہوئیں۔ ۳۵ ہزار گاڑیاں چھین لی گئیں۔ (۲)

لیکن ان حالات میں حکومتی نزلہ عضوئے ضعیف دینی مدارس پر گرا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۹۵ء کو وزیراعظم بے نظیر کی زیرِ صدارت ایک اعلیٰ سطحی اجلاس منعقدہ اسلام آباد میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ دینی مدارس پر براہِ راست غیرملکی امداد وصول کرنے پر پابندی عائد کی جائے۔ علاوہ ازیں:

1۔ دینی مدارس کو بھی سطح پر تربیتی کیمپ قائم کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہوگی۔
2۔ دینی مدارس اپنے نصاب ہائے تعلیم پر نظر ثانی کر کے انہیں جدید خطوط پر استوار کریں۔
3۔ ان کے حسابات کا باقاعدہ آڈٹ کیا جائے گا۔ اور
4۔ دینی مدارس کی رجسٹریشن کی لازمی شرط عائد کی جائے گی۔ (۳)

مولانا شاہ احمد نورانی نے اس حکومتی فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ دینی مدارس کو باہر سے ملنے والی امداد کی چھان بین کرنا ایک منصفانہ فیصلہ ہے لیکن حکومت کو چاہیے کہ وہ امریکی اشارے پر دینی مدارس کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کرنے سے باز رہے۔ مزید برآں دینی مدارس کی بندش کے خلاف حکومتی اقدام کی بھرپور مخالفت اور مزاحمت کی جائے گی۔ (۴)

لیکن اس سب کے باوجود دہشت گردی کا سلسلہ رکا نہیں۔ جنوری کے آخری ہفتے اور فروری کے پہلے ہفتے میں کراچی میں مجموعی طور پر ۶۹/ افراد جاں بحق اور ۵۸ زخمی ہوگئے۔ (۵)

دہشت گردی کے ان واقعات بالخصوص فرقہ وارانہ دہشت گردی کے ڈانڈے ہمارے ماضی قریب سے ملے ہوئے تھے۔ "جہاد افغانستان" (۱۹۷۹ء۔ ۱۹۹۱ء) کے دوران جس طرح بے حساب غیر ملکی اسلحہ تقسیم کیا گیا تھا۔ اس سے بعض مذہبی جماعتوں نے اپنے مسلح ونگ بنا لیے بلکہ یہ بھی ہوا کہ پڑوسی ممالک نے ان جماعتوں میں اپنے دہشت گرد شامل کر دیئے جو اشارہ ملنے پر مخالف مذہبی جماعتوں کے اراکین اور مذہبی رہنماؤں کو بے محابہ قتل کرنے لگے۔ (۶) مساجد اور امام بارگاہیں مذبح خانوں کا نقشہ پیش کرنے لگیں۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جب امریکہ نے اپنی ترجیحات تبدیل کر لیں تو کل کے "مجاہد" آج کے "دہشت گرد" کہلانے لگے (۷)۔ مسلمانوں کے لیے جنگجو اور انتہا پسند کے الفاظ تراش کر اسلام کی امن پسند ہیئت کو خواہ مخواہ بدنام کر دیا گیا۔ بالخصوص غیر ملکی پریس اور دیگر میڈیا نے اس سلسلے میں انتہائی گھناؤنا کردار ادا کیا۔ اس ملکی صورتحال کے تناظر میں ملک کی مذہبی سیاسی قیادت نے مذہبی سطح پر بھائی چارے کے بھولے سبق کو ایک بار پھر دہرانے کے لیے سنجیدہ کوششیں شروع کر دیں (۸)۔ اس سلسلے میں ۲۴ مارچ ۱۹۹۵ء کو مختلف مکاتب فکر سے تعلق

رکھنے والی دینی جماعتوں کے اکابرین کا ایک اجلاس اسلام آباد میں منعقد ہوا (۹)۔ جس میں ایک کونسل قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دیا جا سکے۔ گیارہ رکنی اس کونسل کا نام "ملی یکجہتی کونسل" رکھا گیا۔ جس کے سربراہ جے یو پی (نورانی گروپ) کے مولانا شاہ احمد نورانی بنائے گئے (۱۰)۔ جبکہ مولانا سمیع الحق اس کے سیکرٹری جنرل نامزد کیے گئے (۱۱)۔ مولانا شاہ احمد نورانی کے بقول کونسل مذہب اور فرقہ واریت کی آڑ میں ہونے والی دہشت گردی اور تشدد کے واقعات کے خاتمہ کی کوشش کرے گی۔ مذہب اور فرقہ واریت کے نام پر دہشت گردی اور تشدد کے واقعات میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہے۔ کیونکہ کچھ قوتیں چاہتی ہیں کہ پاکستان کو فرقہ واریت، صوبائی مخالفت اور لسانی تعصب کی بنیاد پر کمزور کر دیا جائے (۱۲)۔ مزید برآں اس اجلاس میں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ کونسل کا آئندہ اجلاس مئی کے دوسرے ہفتے میں کراچی کی دینی، سماجی اور سیاسی تنظیموں کو بطور مبصر شامل ہونے کی دعوت دی جائے گی تاکہ کراچی کے بحران اور امن قائم کرنے کے لیے مشترکہ انتظامات تجویز کیے جائیں۔ گلی گلی، محلے محلے مسجد اور امام بارگاہوں کی سطح پر مشترکہ امن کمیٹیاں تشکیل دینے کے امکانات کا بھی جائزہ لیا جائے گا (۱۳)۔ چنانچہ ملی یکجہتی کونسل کے اس ابتدائی اجلاس میں فرقہ واریت کے خاتمے اور مختلف مذہبی رہنماؤں کے خلاف بنائے گئے مقدمات کا جائزہ لینے کے لیے مذکورہ کمیٹیاں تشکیل دی گئیں (۱۴)۔ اراکین کونسل نے واضح طور پر اعلان کیا کہ ان کا کسی بھی مسلح اور دہشت گرد گروہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ملی یکجہتی کونسل کے سربراہان اور شامل جماعتوں کے ارکان متنازعہ بیانات سے گریز کریں تاکہ کونسل کامیاب ہو۔ مزید یہ کہ ملک میں تمام دینی مدارس غیر مسلح ہیں اور ان میں دہشت گردی کی کوئی تربیت نہیں دی جاتی۔ کونسل نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان علماء کو، جو مقدمات نہیں اور بغیر جرم کے نظر بند ہیں، فوری طور پر رہا کیا جائے۔

اجلاس کے اختتام پر پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نورانی نے کہا کہ ہم اس وقت بھارتی، امریکی اور اسرائیل کے گٹھ جوڑ کی زد میں ہیں۔ وہ ہمیں لسانی، علاقائی، نسلی اور فرقوں کی بنیاد پر لڑانا چاہتے ہیں تاکہ پاکستان میں خانہ جنگی ہو۔ جس سے ان طاقتوں کو اپنے عزائم پورے کرنے کا موقع ملے۔ سپاہ صحابہ اور سپاہ محمد شیعہ کی دیگر تنظیموں کو ابھار کر پاکستان اور بھارت ایران کے درمیان جنگ کروانا چاہتے ہیں...... تاکہ بعد میں

پاکستان کو بھی ختم کر دیں۔ نقشے پر دیکھیں آذر بائیجان ایران سے ملتا ہے اور نئے سروے کے مطابق مستقبل میں آذر بائیجان اور وسط ایشیائی ممالک میں عرب سرزمین سے بھی زیادہ تیل نکلے گا۔ یہود و ہنود کا مقصد مسلمانوں کی اقتصادیات کو کنٹرول کرنا ہے۔ اس لیے یہ سارا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کا باہمی امن و تعاون ان کے مقصد کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ دینی جماعتوں نے اس خطرہ کا بروقت احساس کیا ہے۔ امریکہ، بھارت، اسرائیل اور اسلام دشمن طاقتوں کو بروقت سمجھا ہے...... ہم چاہتے ہیں کہ سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج پر مشتمل ایک کمیشن تشکیل دیا جائے جو تحقیقات کرے کہ پاکستان میں شیعہ سنی شروع سے رہتے ہیں پھر فسادات کیسے شروع ہوئے۔ یہ کمیشن ذمہ دار افراد کا تعین کرے۔ میرے خیال میں کوئی بھی ذمہ دار مسلمان مساجد اور امام بارگاہوں پر حملوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسلام دشمن طاقتیں ملت اسلامیہ میں فرقہ واریت کو ہوا دے کر یکجہتی کو پارہ پارہ کر رہی ہیں۔ انہوں نے ہی قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ (۱۵)

ملی یکجہتی کونسل کے قیام کو ملک کے لیے خوش آئند قرار دیتے ہوئے روزنامہ جنگ نے ۲۶ مارچ ۱۹۹۵ء کو اپنے اداریے میں لکھا:

''ملک بھر کی گیارہ مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے فرقہ واریت کے خاتمے، امت مسلمہ کو درپیش مسائل کو حل کرنے قرآن و سنت کی بالادستی اور ملک میں اسلامی انقلاب کے لیے مل جل کر کام کرنے کے عزم کا اظہار کیا ہے اور ان جماعتوں کے سربراہوں پر مشتمل ملی یکجہتی کونسل قائم کر دی گئی ہے۔ کونسل کا سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی اور سیکرٹری جنرل سینیٹر مولانا سمیع الحق کو مقرر کیا گیا ہے۔ پاکستان اس وقت جس مذہبی فرقہ واریت اور سیاسی انتشار کا شکار ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر قسم کے نسلی، لسانی اور مذہبی تعصبات کو ترک کر کے قرآن و سنت کی بنیاد پر اتحاد و یکجہتی کے رشتوں کو مضبوط بنانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ وہ عناصر جو مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دے کر اتحاد و اتفاق کی بجائے قوم کو انتشار میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ملت اسلامی کے بدترین دشمن ہیں اور اس مشترکہ دشمن کو پہچاننا تمام فرقوں کا فرض ہے جب تک تمام مذہبی اور سیاسی جماعتیں ایسے عناصر سے اپنی صفوں کو پاک نہیں کر دیتیں مذہبی فرقہ واریت ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ نہایت اطمینان کی بات ہے کہ ملک بھر کے جید علمائے کرام اور مذہبی جماعتوں کے قائدین نے حالات کے تقاضوں کا

ادراک کرتے ہوئے ملک کو مذہبی فرقہ واریت سے پاک کرنے کا عزم کیا ہے گذشتہ دو تین سال سے ملک کے اندر مذہبی فرقہ واریت کے فروغ اور علمائے کرام اور مذہبی جماعتوں کے کارکنوں کے قتل کے واقعات میں تشویشناک اضافہ ہوا ملک کی دو مذہبی جماعتوں کے درمیان اختلافات اور تصادم کے واقعات سے دہشت گردوں اور غیر ملکی ایجنٹوں نے فائدہ اٹھا کر مساجد اور امام بارگاہوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا ہے۔ یہ صورت حال ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہونی چاہیے۔ ملی یکجہتی کونسل میں ملک کے جید اور بالغ نظر علمائے کرام کی شمولیت سے یہ بجا طور پر توقع رکھی جا سکتی ہے کہ ان کی کوششوں نہ صرف مذہبی فرقہ واریت کے خاتمے میں مدد ملے گی قرآن و سنت کی بالادستی اور اسلامی انقلاب کے لیے کام کرنے والوں کی جو حوصلہ افزائی ہو گی بلکہ دنیا بھر میں اسلامی تحریکوں کے خلاف سرگرم قوتوں اور مسلمانوں کے خلاف بنیاد پرستی کے نام پر بے بنیاد اور تعصب پر مبنی پروپیگنڈہ کا موثر جواب بھی دیا جا سکے گی۔ کونسل کے مشترکہ اعلامیہ میں کونسل کے جو اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے عزم و جدوجہد اور ایک تعمیری لائحہ عمل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے درمیان بعض فقہی اختلافات کے باوجود سب کا مشترکہ مقاصد کے لیے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونا بڑی حوصلہ افزا بات ہے۔ توقع کی جانی چاہیے کہ نئی کونسل کے قیام سے ملک میں فرقہ واریت کی موجودہ لہر کو روکنے میں نمایاں مدد مل سکے گی۔'' (۱۶)

جبکہ ندائے اہل سنت لاہور نے اس کونسل کی کارکردگی اور اس میں مولانا نورانی کے کردار کا جائزہ لیتے ہوئے اپریل کی اشاعت میں لکھا:

''خدا کا شکر ہے کہ ملک میں فرقہ واریت کے دہکتے جہنم کے شعلے کچھ مدھم پڑے ہیں۔ کم از کم چوبیس مارچ (یوم قیام ملی یکجہتی کونسل) سے اٹھائیس مارچ ۱۹۹۵ء تک اخبارات میں ایسی کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔ ان چار دنوں میں کراچی خدا کے فضل سے کسی بڑے واقعہ سے محفوظ ہے۔ کراچی کی صورتحال کے ضمن میں درج ذیل تین تجاویز قابل اعتناء ہوں گی:

الف: اس وقت ایم کیو ایم (الطاف) اور ایم کیو ایم (حقیقی) ایک دوسرے کو کاٹ رہے ہیں۔ اگر حکومت مخلص ہے تو ان دونوں پارٹیوں کو ایک میز پر بٹھایا جائے ان کے اختلاف ختم کیے جائیں۔ کراچی میں امن و امان قائم ہو جائے گا۔

ب: فوری طور پر ساڑھے تین سال سے معطل بلدیاتی اداروں کا انتخابات کروادیا جائے گا۔ اس سے لوگوں کے مسائل حل ہوں گے۔ منتخب قیادت کی طرح متوجہ ہوں گی کراچی میں قتل وغارت کا بازار بند ہوسکتا ہے۔

ج: جزوی طور پر قومی اسمبلی کے انتخاب کی مصیبت مول نہ لی جائے۔ یعنی صرف کراچی کی سیٹوں سے منتخب ارکان کو مستعفی کرواکر دوبارہ ضمنی انتخاب کسی بڑے فساد کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

یہ امر خوش آئند ہے کہ تمام مذہبی دینی سیاسی جماعتوں نے اتفاق رائے سے فرقہ واریت کے اس ماحول میں مولانا نورانی کی ذات پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔" (۱۷)

ملی یکجہتی کونسل جن حالات میں بنائی گئی وہ اس امر کے متقاضی تھے کہ کسی مقتدر سطح پر ملکی صورت حال کو بہتر کرنے کے لیے اقدامات کیے جاتے۔ کیونکہ ۸۰ء اور ۹۰ء کے عشرے، افغان جنگ کے منفی اثرات کی زد میں تھے جو آج بھی (۲۰۰۵ء) ملک عزیز کو اپنی گہری لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے عشرہ میں بھی انہی اثرات کے زیر اثر مذہبی فسادات فروغ پذیر تھے۔ کیونکہ افغان وار کا اسلحہ فرقہ ورانہ تنظیموں کے تصرف میں تھا۔ جن کے فروعی اختلافات نے صورتِ حالات کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ زیادہ تر فسادات مذہبی بنیادوں پر ہوئے۔ "سپاہ صحابہ" اور "تحریک جعفریہ" پھر اس کے بعد "سپاہ محمد" کے درمیان قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ قوم شیعہ، دیوبندی، سنی، حنفی، وہابی، بریلوی، غیر بریلوی، مقلد اور غیر مقلد کی بے معنی اور بلا جواز تفریق میں پھنسی ہوئی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پوری قوم حضور ﷺ کے عشق و محبت میں ایک نقطے پر متحد و مرتکز ہوجاتی مگر ستم بالائے ستم یہ کہ فرقہ وارانہ اختلافات، مذہبی سطح سے اتر کر شخصی اختلافات میں ڈھل گئے۔ اب عبادت گاہیں بھی باہمی تصادم سے محفوظ نہ رہیں۔ مولانا شبیر احمد ہاشمی کے بقول:

"مذہبی تصادم کا ایک ہلکا سا نقشہ چیف سیکرٹری پنجاب جناب جاوید قریشی نے یوں پیش کیا (۱۳ مارچ ۱۹۹۵ء) کہ پنجاب میں دوہزار پانچ سو (۲۵۰۰) کے قریب دینی مدارس ہیں۔ جن میں سے سات سو چونسٹھ (۷۶۴) فرقہ واریت پھیلانے کا موجب ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں مذہبی تصادم کے ۹۰ مقدمات ہوئے جن میں ۳۸/ افراد ہلاک ہوئے اور ۲۴۷ زخمی ہوئے۔ جبکہ ۱۹۹۴ء میں مذہبی تصادم کے ۱۶۰ واقعات ہوئے جن میں ۷۲/ افراد ہلاک اور

۳۱۶ زخمی ہوئے۔ گویا ۱۹۹۴ء میں گذشتہ سال سے دگنے فسادات ہوئے۔ یہ وبا ۱۹۹۵ء میں بھی رکی نہیں بلکہ اس میں مسلسل اضافہ ہو۔ پورے سال کے اعداد و شمار تو سال کے آخر میں آئیں گے۔ اس وقت صرف کراچی میں رمضان المبارک (تین فروری سے لے کر تین مارچ تک) کے دوران ۲۱۴/ افراد اس فساد کی بھینٹ چڑھ گئے۔ مذہبی تصادم اس حد تک پہنچ گیا کہ اعتکاف میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اس عذاب سے محفوظ نہ رہ سکے۔ مثال کے طور پر ۲۴ رمضان المبارک کو نماز فجر کے وقت شیعہ حضرات کی امام بارگاہ محفل مرتضیٰ اور ابوالفضل عباس (کراچی) پر وحشیانہ فائرنگ میں بیس افراد قتل کردیئے گئے۔ محفل مرتضیٰ میں ۱۶/ افراد ایک میت کو غسل دے رہے تھے کہ دو آدمیوں نے کلاشنکوف کی فائرنگ سے آٹھ افراد کو ہلاک جبکہ باقیوں کو شدید زخمی کردیا۔ ان حالات میں ملی یکجہتی کونسل واقعتاً ایک مستحسن اقدام تھا جس کی تعریف سربراہ مملکت سردار فاروق خان لغاری نے مولانا نورانی کے نام ایک مبارک بادی پیغام میں کی۔" (۱۸)

ملی یکجہتی کونسل کے قیام سے محض دو روز قبل لاہور میں ایک مقامی ماہنامے کو انٹرویو دیتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے ملکی صورت حال اور اس کے نتائج و عواقب کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا:

"۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات کے قبل ہی ضیاء الحق سے ملاقات کرکے انہیں کراچی کی بگڑتی صورت حال سے آگاہ کردیا تھا جو ان انتخابات کے نتیجے میں ملک کو پیش آنے والی تھی۔ جس زمانے میں ایم کیو ایم ابھری ہم نے روز اوّل سے اس کے فلسفہ کو قبول نہیں کیا۔ ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر خفیہ قوتیں اور جنرل ضیاء الحق ان کی پشت پر تھے۔ یہ لوگ بڑھتے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ کراچی اور حیدرآباد میں ان کا اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ ہم اگر چاہتے تو ایم کیو ایم سے مصالحت کرکے اسمبلی میں پہنچ سکتے تھے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ جب الطاف حسین مزار قائد کے سامنے قومی پرچم جلا رہے تھے، اسلحہ کی نمائش اور مہاجر قومیت کے نعرے لگ رہے تھے ٹارچر سیل معرض وجود میں آئے تھے۔ جب پنجابی، سندھی اور پٹھانوں کی لاشیں پنجاب، سندھ اور سرحد پہنچائی جارہی تھیں ہم اس وقت کراچی کے پرآشوب ماحول میں الطاف حسین کو لارنس آف پاکستان کہہ رہے تھے۔ اگرچہ ہمارے جلسوں پر مسلح حملے کیے گئے مگر ہم نے جرأت سے الطاف حسین کے فلسفہ کی مخالفت کی۔ اگر

الطاف نے جئے مہاجر کا نعرہ دیا تو ہم نے جئے مسلمان کا نعرہ دیا۔ یہ سب کراچی کو بچانے کی کوششیں تھیں۔ کراچی جو کہ پورے ملک کو ستر فیصد ریونیو دینے والا علاقہ ہے۔ معاشی تباہی کے دہانے پر ہے۔ ساٹھ فیصد انڈسٹری بند پڑی ہے۔ فوجی آپریشن بھی ناکام ہو چکا ہے۔ اس وقت کراچی میں مقیم ''را'' کے ایجنٹوں کی تعداد لگ بھگ تیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ تمام حکومتی نعروں کے باوجود ایک لاکھ کلاشنکوف ناجائز طور پر کراچی میں موجود ہے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ حکومت ایم کیو ایم اور الطاف کو آمنے سامنے میز پر بٹھائے اور مصالحت کروائے۔ کراچی میں بلدیاتی انتخابات کا فوری انعقاد ممکن بنایا جائے۔ قومی اسمبلی کے جزوی انتخابات کرانے کے بجائے اس امر کی تحقیق ہونی چاہیے کہ الطاف گروپ نے قومی اسمبلی کا بائیکاٹ کیوں کیا؟''(۱۹)

اگرچہ ملی یکجہتی کونسل کا پلیٹ فارم خالص مذہبی بنیادوں پر قائم کیا تھا جس کا مقصد ملک میں دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات بالخصوص فرقہ ورانہ تشدد کو روکنا تھا چونکہ اس میں شامل مذہبی جماعتوں کے سربراہان ممبران اسمبلی بھی تھے اس لیے اس کے دوسرے اجلاس منعقدہ کراچی موخہ ۹/ اپریل ۱۹۹۵ء ہی سے اس پلیٹ فارم کو جزوی طور پر سیاسی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ کیونکہ حکومت کے دینی مدارس کے خلاف اقدامات نے دینی جماعتوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ سیاسی اقدامات بھی کریں۔ چنانچہ اس اجلاس میں مولانا نورانی کے زیر صدارت اتفاق رائے سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ وزیر اعظم بے نظیر کی طرف سے مذہبی جماعتوں کی بیخ کنی کے لیے امریکہ اور مغربی استعماری طاقتوں سے امداد طلب کرنا، اشتعال انگیز اور ہتک آمیز ہے۔ حکومت نے اگر ایٹمی پروگرام پر سودے بازی کی تو اسے اٹھا کر پھینک دیا جائے گا۔(۲۰) بعد ازاں ۲۳/ اپریل ۱۹۹۵ء کو لاہور کے آواری ہوٹل کے وسیع ہال میں مولانا نورانی کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں قاضی حسین احمد، مولانا سمیع الحق، علامہ ساجد نقوی، مولانا اسفندیار، آغا مرتضیٰ پویا، مولانا کراروی، مولانا ضیاء القاسمی، مولانا محمد حنیف جالندھری، مولانا محمد اجمل خان، مولانا محمد اجمل قادری، جنرل کے ایم اظہر، پیر اعجاز احمد ہاشمی، صاحبزادہ محمد اکرم شاہ، سردار محمد خان لغاری، صاحبزادہ محمد محفوظ مشہدی، مولانا سید طالب حسین گردیزی، جناب بشیر احمد نظامی، مولانا خادم حسین شرقپوری، مولانا عبد الغفور الوری نے شرکت کی۔(۲۱)

ساڑھے چار گھنٹے جاری رہنے والے اس اجلاس میں مولانا نورانی نے تمام مخالف و متحارب گروپوں کو نمائندگی کا پورا پورا حق دیا(۲۲)۔ ہر ایک کی بات کو مکمل طور پر سنا۔ مافی الضمیر پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ لگائی۔ تمام شرکاء نے باضابطہ اخلاق (۲۳) ☆ کے تاریخی مسودہ کی ایک ایک شق کو پڑھا اور مکمل اتفاق رائے سے دستخط کیے۔(۲۴)

انہی ایام میں بے نظیر حکومت نے غیر ملکی دباؤ کے تحت توہین رسالت کے قانون میں ترمیم کے لیے غور و خوض شروع کر دیا۔ حکومت کے اس قسم کے فیصلے پر دینی جماعتوں کا صاد کر دینا ناممکن تھا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے کونسل کے ۲۳/ اپریل کے منعقدہ اجلاس میں واضح اعلان کیا کہ اگر حکومت نے توہین رسالت کے قانون میں ترمیم کی تو ۲۷ مئی کو پورے ملک میں پہیہ جام ہڑتال کی جائے جو پر امن ہوگی۔(۲۵)

اجلاس کے اختتام پر مولانا نورانی نے پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا۔ اس موقع پر قاضی حسین احمد، مولانا سمیع، مولانا اجمل، علامہ ساجد نقوی، مولانا قاسمی، آغا پویا، علامہ یزدانی، مولانا عبد اللطیف، صاحبزادہ فضل کریم اور صاحبزادہ سلمان روپڑی بھی موجود تھے۔ مولانا نورانی نے کہا کہ اجلاس میں مذہب کے نام پر دہشت گردی کی مذمت کی گئی اور کسی بھی اسلامی فرقے کو کافر اور واجب القتل قرار دینے کو غیر اسلامی اور قابل نفرت قرار دیا گیا۔ توہینِ رسالت کے قانون میں کسی قسم کی ترمیم کو ناقابل برداشت قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ اگر حکومت نے ایسا کیا تو پھر اسے ''تحریک نظام مصطفیٰ'' (۱۹۷۷ء) جیسی تحریک کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کے بقول امریکہ کی جانب سے پاکستانیوں میں مذہبی جنگ کی فضا پیدا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ایران اور پاکستان میں باہمی منافرت پیدا کی جائے تاکہ ان دونوں ممالک کے درمیان جنگ کرائی جائے لیکن ہم نے امریکی سازش کو ناکام بنا دیا۔ ایک سوال کے جواب

☆ یہ ضابطہ اخلاق پروفیسر ساجد میر کی دعوت پر کمیٹی کے ارکان نے بڑی محنت سے مرتب کیا۔ جو من و عن منظور ہوا۔ اس کی پہلی شق میں ۱۹۵۱ء کے منظور کردہ علماء کے متفقہ ۲۲ نکات شامل کیے گئے جبکہ چوتھی شق میں یہ عبارت خصوصی طور پر شامل کی گئی کہ ''عظمت رسول، عظمت اہل بیت اطہار و امام مہدی، عظمت ازواج مطہرات اور عظمت صحابہ کرام ایمان کا جز ہے۔ ان کی تکفیر کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج اور ان کی توہین و تنقید حرام اور قابل مذمت و تعزیر جرم ہے۔ تاہم اس عبارت میں بعد ازاں ''عظمت صحابہ کرام'' کے بعد لفظ ''خلفائے راشدین'' کا اضافہ کیا۔ (انٹرویو مولانا شبیر احمد ہاشمی)

میں مولانا نورانی نے کہا کہ ملی یکجہتی کونسل سیاسی اتحاد نہیں بن سکتا۔ ہمارے تمام مسائل دینی ہیں ان کو طے کرنے کے لیے کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اور دینی مدارس کو صرف بدنام کیا جارہا ہے۔ (۲۶) انہوں نے اکابر علماء کو ایک خط لکھا جس میں اسلام دشمن عناصر کی ریشہ دوانیوں، قانون توہین رسالت کے سلسلے میں مغربی میڈیا کی پراپیگنڈہ مہم، مختلف اسلامی ملکوں کو دہشت گرد قرار دینے کی امریکی مہم اور حکومت کی طرف سے ناموس رسالت کے مسئلہ پر معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کے ضمن میں مذکورہ یوم یکجہتی منانے کی غرض سے خطبات جمعہ میں ناموس رسالت کو مرکزی نکتہ بنائیں۔ (۲۷) مزید برآں ۲۷ مئی ۱۹۹۵ء کو تحفظ ناموس رسالت کے لیے کراچی تا خیبر مکمل ہڑتال کی جائے (۲۸) ☆ مولانا نورانی کی اپیل کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۲۶ مئی کو تمام مکاتب فکر کی مساجد میں ایک ہی موضوع پر تقاریر ہوئیں اور اس سے اگلے دن کراچی تا خیبر مکمل پہیہ جام ہڑتال ہوئی۔ (۲۹) ☆☆

اگرچہ حکومت نے ملی یکجہتی کونسل کے حوالے سے کسی قسم کے خدشہ یا تحفظات کا اظہار نہیں کیا تھا تاہم اس کے مخالفین کی کمی بھی نہیں تھی۔ (۳۰) بعض سیاسی حلقوں نے شبہ ظاہر کیا کہ سیاستدان کہیں اب بھی علماء کو استعمال تو نہیں کر رہے۔ یہ بھی خدشہ ظاہر کیا گیا کہ ''ملی یکجہتی کونسل'' کی وجہ سے موجودہ حکومت کو پانچ سال پورے کرنے کا موقع مل جائے گا اور نواز شریف (قائد حزب اختلاف) دینی شخصیات کی حمایت سے محروم رہیں گے۔ (۳۱)

حالانکہ کونسل کے سربراہ مولانا نورانی پہلے سربراہی اجلاس کے فوراً بعد ہی اس طرح کے خدشات کو رد کرتے ہوئے صاف کہہ چکے تھے کہ ''ملی یکجہتی کونسل'' کا قیام سراسر غیر سیاسی

☆ ان دنوں بے نظیر حکومت بیرونی طاقتوں کے ایماء پر ناموس رسالت کے قانون ترمیم کا سوچ رہی تھی جس کے تحت توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والوں کو سزائے موت دی جاتی تھی۔ ملی یکجہتی کونسل نے ان حکومتی عزائم کو ملکی سلامتی اور اسلام کے خلاف سازش قرار دیا۔ ملی یکجہتی کونسل نے مدارس کے خلاف اقدامات کو بھی انہی عزائم کی ایک کڑی قرار دیا اور مشترکہ کوششوں سے معاملات کے حل کے لیے اقدامات کیے۔ کونسل نے نچلی سطح تک معاملات کے حل کے لیے چند کمیٹیاں بھی تشکیل دیں، جن میں مصالحتی کمیٹی، ضابطہ اخلاق کمیٹی، کراچی وسندھ کے لیے کمیٹی، مالیاتی کمیٹی، تعلیمی کمیٹی اور سیاسی کمیٹی وغیرہ شامل تھیں۔ ان کمیٹیوں میں تمام جماعتوں کے اراکین کو شامل کیا گیا۔

☆☆ کامیاب ہڑتال کے بعد اکابر علماء کے تاثرات امید کا مظہر اور حوصلہ افزاء تھے۔ جو فرقہ ورانہ ہم آہنگی کی طرف ایک قدم تھے۔

ہے (۳۲)۔ سیاست اور انتخاب کے لیے تمام جماعتوں کے اپنے اپنے پلیٹ فارم موجود ہیں۔ مزید برآں کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ یہ کونسل دراصل دین پسند قوتوں کو تقسیم کر کے ہرانے کا منصوبہ ہے (۳۳) جبکہ کونسل میں شامل دینی جماعتوں کے رہنماؤں نے روز اوّل ہی سے یہ عزم صمیم ظاہر کیا تھا کہ کونسل نہ انتخاب میں حصہ لے گی اور نہ ہی اس کے امکانات ہیں۔ (۳۴)

ایک طرف مختلف سیاسی حلقے ملی یکجہتی کونسل کے قیام کو شکوک وشبہات کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے جبکہ دوسری طرف ملکی صورت حال یہ تھی کہ اسلام دشمن عناصر نے اسلام آباد میں ڈیرے ڈال رکھے تھے اور وہ بڑے منظم طریقے سے ملک بھر میں پھیل رہے تھے۔ عیسائی مشنریوں کو بیرون ممالک سے بے پناہ روپیہ فراہم کیا جارہا تھا اور ملکی کی نظریاتی اساس کمزور کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر کوششیں کی جارہی تھیں۔ عیسائی مشنریوں نے اپنے دو ریڈیو اسٹیشن بھی قائم کر لیے تھے۔ حالانکہ وطن عزیز میں کسی اور کو اپنا ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی اجازت نہیں (۳۵)۔ ان حالات میں ملی یکجہتی کونسل کا ساتواں اجلاس مظفر آباد میں دس اکتوبر ۱۹۹۵ء کو منعقد ہوا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے اس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ ''وطن عزیز کو کمزور کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ ان کا ادراک اور تدارک کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ وزارت مذہبی امور کے علم کے بغیر جو روپیہ پاکستان آرہا ہے اس کو روکا جائے ورنہ یہودی اور عیسائی اپنے آلہ کاروں کے ذریعے ملک کے حالات کو مخدوش کر دیں گے۔ ایسے فنڈز کی تحقیق ہونی چاہیے۔ (۳۶)

مولانا شاہ احمد نورانی نے قائد حزب اختلاف اور الطاف حسین پر الزام لگاتے ہوئے کہا کہ نواز شریف اور الطاف حسین دونوں نسل پرست ہیں۔ مسلم لیگ، ایم کیو ایم اور اے این پی تینوں اتحاد بنا کر پنجابستان، مہاجرستان اور پختونستان بنانا چاہتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ الطاف حسین قاتل ہیں۔ اگر الطاف حسین کے خلاف مقدمات واپس لینے ہیں تو پھر جیلوں کے دروازے کھول کر تمام قاتل، ڈاکو اور چور بھی رہا کر دیئے جائیں (۳۷)۔ مزید برآں کراچی میں دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات کے پس پردہ یہودی لابی کارفرما ہے۔ فرقہ واریت کی بنیاد پر ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچایا جارہا ہے۔ (۳۸)

ملی یکجہتی کونسل اگرچہ ملک میں قیام امن اور فروغ امن کے لیے ہی قائم کی گئی تھی

لیکن مختلف جماعتوں اور تنظیموں نے ملی یکجہتی کونسل کی سرگرمیوں کو ملک میں سیاسی عدم استحکام پیدا کرنے کی ایک کوشش قرار دیا۔ تاکہ حکومت اطمینان سے اقوام عالم کے ساتھ معاہدات کر کے ملک کو ایک فلاحی ریاست بنانے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ کر سکے (۳۹)۔ اس سلسلے میں نو مذہبی جماعتوں اور تنظیموں نے ۲۴/ اپریل کو ایک مشترکہ اجلاس بلایا جو کہ جمعیت علماء اہل حدیث کے چیئرمین قاضی عبدالقدیر خاموش کی رہائش گاہ پر منیر حسین گیلانی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ (۴۰) اس اجلاس میں الزام لگایا گیا کہ وزیراعظم کے دورہ امریکہ کے بعد ملی یکجہتی کونسل کا فعال کردار بہت ساری حقیقتوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس لیے کہ دورہ امریکہ میں وزیراعظم نے این پی ٹی پر یکطرفہ طور پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور امریکی حکمرانوں سے جس جرأت اور بصیرت سے سیاسی مذاکرات کیے اس سے اس خطے میں صیہونی عزائم ناکام ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے کونسل نے ایک مرتبہ پھر پاکستان میں ۱۹۷۷ء جیسے حالات پیدا کرنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ ۲۷ مئی کو ملک میں ایک ایسی ترمیم پر ہڑتال کرائی گئی ہے جسے ابھی حکومت نے پیش ہی نہیں کیا۔ مصر کے حکمرانوں نے بھی جب این پی ٹی پر دستخطوں کو اسرائیل کے ساتھ مشروط کیا تو وہاں پر بھی مذہبی جماعتیں حکومت کے خلاف متحد دکھائی دینے لگیں۔ (۴۱)

لیکن ملی یکجہتی کونسل کی طرف سے ان الزامات کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ تاہم تجزیہ نگاروں نے ایک قدم مزید بڑھ کر کہا کہ موجودہ صورت حال میں ایسا لگ رہا ہے کہ ملی یکجہتی کونسل اپنے مشن سے بہت آگے بھی جا سکتی ہے اور صرف یوم یکجہتی منانے تک محدود نہیں رہے گی۔ بلکہ یہ ایک تیسری قوت کے طور پر بھی سامنے آ سکتی ہے۔ کیونکہ دینی جماعتیں ایک عرصے سے اتحاد کی کوشش کر رہی تھیں۔ (۴۲) لیکن جہاں تک ہڑتال کی کال کا تعلق ہے تو اس ضمن میں، کونسل اس لیے حق بجانب دکھائی دیتی ہے کہ حکومت کی جانب سے وقتاً فوقتاً دیئے گئے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ناموس رسالتؐ کے قوانین میں تبدیلی کا ارادہ رکھتی ہے۔ جبکہ علمائے کرام اور دینی سیاسی رہنماؤں کا خیال ہے کہ ان قوانین کو نہ چھیڑا جائے۔ ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لیے ملکی یکجہتی کونسل کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی کی جانب سے ایک خط بھی تمام مساجد کو بھیجا گیا ہے جن میں پانچ بنیادی نکات پر خطبہ دینے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس خط کے مندرجات سے مولانا فضل الرحمٰن، قاضی حسین احمد، علامہ ساجد نقوی، مولانا ضیاء

الرحمٰن فاروقی، سمیت تمام دینی جماعتوں اور ان کے گروپوں کے اتفاق رائے کر لیا تھا۔ اس طرح یہ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ تمام مکاتب فکر کے رہنما کسی بات پر متفق ہوئے۔ ورنہ دنیا بھر میں کہیں بھی مسلمان اتنے زیادہ متحد نہیں ہوئے ملی یکجہتی کونسل نے ہڑتال کی اپیل مسلمانان اسلام کے خلاف بڑھتی ہوئی عالمی سازشوں کے پیش نظر دی ہے۔ (۴۳)

مولانا نورانی نے اس امر کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ نیو ورلڈ آرڈر کے تحت پاکستان میں شیعہ سنی فساد کرانے کے بعد پاکستان اور ایران کے مابین تصادم کرانا چاہتا تھا۔ امریکہ کے ساتھ جس ملک خصوصاً جن مسلم ممالک نے دوستی کی، ان کا جو انجام ہوا وہ مثالیں ہیں۔ انور سادات (۴۴) ☆ کے قتل کے بعد کی آئی اے کا سب سے بڑا ہیڈ کوارٹر جنرل ضیاء الحق نے اسلام آباد میں قائم کیا تھا۔ عوام نے پیپلز پارٹی کو امریکہ کی چوکیداری کا کام کرنے کے لیے مینڈیٹ نہیں دیا۔ بلکہ ان کو یہ مینڈیٹ دیا کہ وہ خدمت اسلام کے لیے کام کریں مگر یہاں پر جس طرح امریکہ کو پذیرائی اور کفر کی قوتوں کو بالا دستی دی جا رہی ہے یہ صدر اور وزیراعظم کی طرف سے اسلام کے تحفظ کا حلف اٹھانے کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ (۴۵)

پہیہ جام ہڑتال کی کامیابی نہ صرف دینی مسئلہ پر ملکی یکجہتی کا عمدہ نمونہ تھی بلکہ حکومت کے لیے ایک چشم کشا واقعے کی حیثیت رکھتی تھی۔ (۴۶) کامیاب ہڑتال کے بعد ملی یکجہتی کونسل اپنے قیام کے بعد ایک بار پھر پوری قوم کی توجہ کا محور و مرکز بن گئی۔ ۲۶ مئی کی پہیہ جام ہڑتال نے دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ پاکستان کی دینی جماعتوں کو پوری قوم کا بھرپور اعتماد حاصل ہے اور کونسل جب بھی ایسی کوئی کال دے گی تو وہ اس کا مکمل ساتھ دے گی۔ قوم نے جس یکجہتی کا

☆ محمد انور سادات (۱۹۱۸ء۔۱۹۸۱ء) مصری فوجی افسر اور سیاستدان تھے۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں جب مصری فوج نے جنرل نجیب اور کرنل ناصر کی زیر قیادت شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹا تو انور سادات کو میڈیا انچارج بنایا گیا۔ بعد ازاں (۱۹۵۵ء۔ ۱۹۵۶ء) اسلامی کانگرس کے جنرل سیکرٹری رہے، روزنامہ "الجمہوریہ" اور "الطاہر" کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۴۴ء تا ۱۹۶۹ء قومی اسمبلی کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۷۴ء میں عرب سوشلسٹ یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی سال (۱۹۷۳ء) کی عرب اسرائیل جنگ میں مصری فوجوں کی شاندار قیادت کے صلے میں سنائی میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۷۷ء کے ریفرنڈم میں مزید ۶ سال کے لیے صدر بنے اور ستمبر ۱۹۷۸ء میں کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے پر دستخط کیے۔ ۱۹۸۰ء میں مصری پارلیمنٹ نے آئین میں تبدیلی کر کے انہیں تاحیات صدر بنا دیا جبکہ اگلے سال ۶/ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو قاہرہ میں فوجی پریڈ کے دوران قتل کر دیئے گئے۔ (فیروز سنز اُردو انسائیکلو پیڈیا لاہور، ۱۹۸۴ء ص ص ۵۶۰۔۵۶۱)

مظاہرہ کیا۔ اسے یہ بات (۱۹۷۷ء کے بعد) ایک بار پھر ثابت ہوگئی کہ اگر پاکستان کے تمام مکاتب فکر کے علماء متحد ہو جائیں تو قوم ان کے شانہ بشانہ ان کی جدوجہد میں شریک ہونے کا جذبہ رکھتی ہے۔ اس سے دینی جماعتوں کو ایک نیا اعتماد ملا۔ دراصل یہ دینی جماعتوں پر ایک ذمہ داری کا ایک بارگراں تھا کہ وہ اگلے مراحل میں قوم کی کس طرح رہنمائی کرتی ہیں۔ حالانکہ مختلف حلقوں کی جانب سے یہ پراپیگنڈہ کیا گیا کہ دینی جماعتیں کبھی متحد نہیں ہوسکتیں اور نہ کبھی ایک ساتھ چل سکتیں ہیں۔ انہیں اب بھی یہ توقع نہیں تھی کہ دینی جماعتیں متحد ہو جائیں گی اور پوری قوم ان پر بھرپور اعتماد کا اظہار کرے گی۔

ہمارا یہ تاریخی المیہ ہے کہ ہمیں باہمی تفرقے کی وجہ سے ہی ہمیشہ زک پہنچی ہے۔ امت کا انتشار اس کے علماء کے انتشار کے باعث ہی پیدا ہوتا ہے اور امت کی جتنی بھی پسپائی ہوئی اور اہم اور نازک موقع پر اسے جتنے بھی صدمے اور دھچکے ملے ہیں وہ ہمارے داخلی محاذ کی کمزوری اور تفرقے کا ہی منطقی نتیجہ تھے۔ شیعہ سنی کا اختلاف بدقسمتی سے ہمارا تاریخی اختلاف تھا جس کی وجہ سے امت کئی بار صدمات سے دوچار ہوئی۔ یہ اختلاف صرف اس صورت ختم ہوسکتا تھا کہ ہم اپنے تلخ ماضی کو فراموش کر کے نئے چیلنجوں کے مقابلہ میں مشترک نکات پر اکٹھے ہو جائیں۔

ملی یکجہتی کونسل کے قیام کے بعد پہلے تین ماہ اس امر کے شاہد تھے کہ اس عرصہ کے دوران ملک کے اندر نسلی و غارت گری کا محاذ سرد ہوگیا۔ مسلم امہ کے خلاف عالمی سازشوں سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے۔ ماضی میں بھی امت کے مختلف گروہوں کے درمیان تفرقہ برپا کیا جاتا رہا۔ لسانی اور علاقائی قومیتوں کی بنیاد پر ترکوں کو عربوں سے اور ترکوں کو کردوں سے لڑا دیا گیا۔ پاکستان میں پانچ قومیتوں کا پرچار کیا گیا۔ پنجابی، پختون، سندھی، بلوچی اور مہاجر کو مسلسل مختلف طریقوں سے یہ باور کرایا گیا کہ تم ایک قوم اور امت نہیں ہو۔ دوسری طرف نوجوان نسل کو اخلاقی تباہی کے دہانے پر لاکھڑا کیا گیا۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو اگر دینی جماعتیں آج بھی اپنا قبلہ درست کرلیں تو معاشرے کو شکست و ریخت سے بچایا جاسکتا ہے۔ اسی لیے دینی جماعتوں کی کونسل کو عوامی سطح پر پذیرائی ملی۔ جس کا واضح اظہار ملی یکجہتی کونسل کے اکابرین سے ارباب اقتدار کے بڑھتے ہوئے روابط تھے۔ ملی یکجہتی کونسل کی طرف مفاہمت کا ہاتھ بڑھایا جانا کونسل کی اخلاقی فتح تھی۔ پھر ان دنوں پیپلز پارٹی کی حکومت کسی بھی سیاسی حلقے سے محاذ آرائی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ خصوصاً صوبہ پنجاب میں جہاں پیپلز پارٹی کو

مجبوراً مسلم لیگ جونیجو گروپ سے اتحاد کرنا پڑا تھا۔ معاملات خاصے حساس تھے اس بناء پر ضروری تھا کہ پنجاب کو کسی بھی حکومت مخالف تحریک سے بچایا جاتا۔ اس صورت حال کا ادراک کرتے ہوئے وزیراعلیٰ پنجاب میاں منظور احمد وٹو نے ضروری سمجھا کہ "ملی یکجہتی کونسل" سے افہام و تفہیم بڑھایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے کونسل کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی سے ملاقات کی کوششیں شروع کردیں۔ اس مقصد کے لیے وہ جون ۱۹۹۵ء کے دوسرے ہفتے میں جمعیت علمائے پاکستان لاہور کے ایک اہم رہنما پیر اعجاز ہاشمی کے گھر گئے تاکہ مولانا شاہ احمد نورانی سے ملاقات کی کوئی صورت نکالی جاسکے۔ جو ان دنوں اتفاق سے لاہور میں تھے۔ پیر اعجاز ہاشمی نے ملاقات کے انتظامات کروائے (۴۷)۔ وزیراعلیٰ منظور احمد وٹو کے ہمراہ آصف فصیح الدین، رانا اکرام ربانی اور نصیر اللہ دریشک بھی تھے۔ ناشتے کی میز پر ہونے والی بات چیت میں وزیراعلیٰ نے محرم الحرام میں قیام امن کے لیے مولانا نورانی کی خدمات کو سراہا۔ وزیراعلیٰ نے کہا کہ ہم سب مسلمان ہیں اور آپ کی بات پر لبیک کہنا سب کا فرض ہے۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ بھٹو مرحوم کی بڑی اسلامی خدمات ہیں۔ جمعہ کے روز تعطیل کا فیصلہ انہوں نے ہی کیا تھا۔ شراب پر پابندی اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا فیصلہ بھی بھٹو مرحوم کے دور میں ہوا تھا۔ لہٰذا اب ان کی بیٹی کو چاہیے کہ وہ ناموس رسالت کے قانون میں ترمیم کر کے اس پر دھبہ نہ لگائیں۔ (۴۸)

مختلف صحافتی و سیاسی حلقوں نے ملی یکجہتی کونسل کی عوام میں بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اکابرین کونسل کو مشورہ دیا کہ عوام نے محض کونسل کے دینی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے پذیرائی بخشی ہے نہ کہ اس کے سیاسی کردار کی وجہ سے اس لیے اسے کارزار سیاست سے دور رہنا چاہیے کیونکہ عوام مذہبی علماء سے سیاسی نہیں بلکہ اصلاحی کردار کے متمنی ہیں۔ (۴۹) جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک اسلامی ملک میں ایک خاتون کو دوبار وزیراعظم منتخب کیا گیا۔ (حالانکہ یہ سیاسی نظام کا کمال تھا، نہ کہ عوام کا) اور یہ فیصلہ عوام نے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں کئی بار دیا ہے (۵۰) ☆ کہ دینی جماعتوں کو کبھی مینڈیٹ نہیں دیا۔ ان حلقوں کے بقول مذہبی جماعتوں نے اگر تاریخ کی سچائیوں سے سبق سیکھ لیا اور صحیح سمت پر گامزن ہوگئے تو عوام ان کی پذیرائی کریں گے۔ اگر ملی یکجہتی کونسل نے خود کو سیاست کی دلدل سے دور رکھا تو وہ یقیناً ایک قابل فخر اور تقلیدی کردار ادا کرسکتی ہے۔ مزید یہ کہ موجودہ استحصالی سیاسی

☆ واضح رہے کہ یہ حلقے ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں قاضی حسین احمد کے اسلامک فرنٹ کی شکست کو دینی جماعتوں کی شکست سے تعبیر کرتے تھے۔ حالانکہ اسلامک فرنٹ میں تمام دینی جماعتیں شامل نہیں تھیں۔

نظام اور بگڑے ہوئے سماج میں اگر دینی جماعتیں حکومت حاصل کر بھی لیں تو وہ کوئی اسلامی ماڈل پیش نہیں کر سکیں گی۔(۵۱) ☆ ملی یکجہتی کونسل کے رہنماؤں کا موقف تھا کہ کونسل صرف وارانہ ہم آہنگی اور بڑھتی ہوئی دہشت گردی کے سدباب کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔اگر ضرورت پڑی تو ایک نئے سیاسی اتحاد کی تشکیل کی جاسکتی ہے نہ کہ موجودہ پلیٹ فارم کو ہی سیاسی یا انتخابی اتحاد میں تبدیل کر دیا جائے۔(۵۲) اسی موقف کے تحت ستمبر ۱۹۹۵ء کے اواخر میں ۱۶ سیاسی جماعتوں نے ایک متحدہ محاذ ☆☆ کے بنائے جانے کا عندیہ دیا جن میں مسلم لیگ (ن)، جماعت اسلامی، اے این پی، پی ڈی پی، ایم کیو ایم، تحریک استقلال، پیپلز پارٹی (بھٹو گروپ) تحریک جعفریہ، مسلم لیگ جونیجو (طارق چوہدری گروپ)، جے یو پی (نیازی)، جمہوری وطن پارٹی، جے یو پی (نورانی) اور پختون خواہ ملی عوامی پارٹی شامل تھیں۔اے این پی کے سربراہ محمد اجمل خان خٹک کے بقول جو کہ سیاسی رابطہ کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے۔مذکورہ سیاسی جماعتوں نے سیاسی محاذ میں شمولیت کا عندیہ دیا تھا۔جبکہ مولانا سمیع الحق کی جے یو آئی اور پروفیسر ساجد میر کی مرکزی جمعیت اہل حدیث نے بھی مجوزہ سیاسی محاذ میں نمائندگی کی درخواست کی تھی۔اس کے علاوہ پاکستان نیشنل پارٹی (پی این پی)، بلوچستان نیشنل موومنٹ (بی این ایم) کو بھی محاذ میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی۔انہوں نے کہا کہ سیاسی رابطہ کمیٹی کا قیام کوئٹہ میں منعقدہ حالیہ قومی کانفرنس میں عمل میں لایا گیا تھا اور مذکورہ سیاسی پارٹیوں کی تجویز پر ہی انہیں رابطہ کمیٹی کا چیئرمین بنایا گیا تھا جبکہ مجوزہ سیاسی محاذ کے لائحہ عمل، اغراض و مقاصد اور جدوجہد کا طریق کار طے کرنے کے لیے رابطہ کمیٹی میں شامل تمام نمائندے مل کر فیصلہ کریں گے۔رابطہ کمیٹی میں شامل تمام پارٹیاں اس یک نکاتی ایجنڈا پر متفق ہیں کہ موجودہ فاشسٹ حکومت سے نجات حاصل کی جائے۔ہم پارلیمنٹ کے اندر اور باہر دونوں محاذوں پر لڑیں گے۔(۵۳) اگرچہ نئے سیاسی محاذ کی تشکیل کی یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی تاہم اس سے

☆ علامہ ڈاکٹر طاہر القادری نے ملی یکجہتی کونسل سے اس لیے علیحدگی اختیار کر لی تھی کہ ان کے خیال میں کونسل کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جارہا تھا جبکہ ضابطہ اخلاق میں سیاست کا کوئی ذکر نہیں۔حالانکہ انہیں چاہیے تھا کہ وہ ضابطہ اخلاق کی شق کے مطابق افہام و تفہیم سے معاملات کونسل کے اندر رہتے ہوئے حل کرتے اور کونسل کو سیاست سے الگ رکھنے میں اپنا کردار ادا کرتے۔

☆☆ تاہم اتحاد کا کوئی نام فائنل نہ کیا گیا (مولف)

ملی یکجہتی کونسل کے اس دعوے کی تصدیق ضرور ہوگئی کہ کونسل کا قیام سراسر غیر سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے عمل میں لایا گیا ہے۔لیکن اس کے دم بہ قدم الزامات اور طعن و تشنیع کا سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ایک رہنما عبداللہ شیخوپوری نے مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا فضل الرحمٰن کو خدا اور شریعت محمدی کا مجرم ٹھہرایا کہ ان دونوں حضرات کی مساعی سے بے نظیر اقتدار میں آئیں۔انہوں نے عورت کی حکمرانی کو ناجائز قرار دیا۔جبکہ مذکورہ حضرات اس کے حامی ہیں۔ایسے لوگوں کی وجہ سے دیگر مکاتب فکر کے علماء کی بھی بدنامی ہوئی ہے۔لہٰذا انہیں چاہیے کہ فوراً توبہ کریں۔(۵۴)

چونکہ اس الزام میں کوئی حقیقت یا صداقت نظر نہیں آرہی تھی شاید یہی وجہ تھی کہ ہر دو حضرات نے اسے درخور اعتناء نہ سمجھا۔ملی یکجہتی کونسل کے غیر سیاسی ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ اس کے ضابطۂ اخلاق میں کوئی ایسی شق نہیں کی گئی تھی کہ جس کے ذریعے کسی بھی پارٹی پر کسی قسم کا کوئی قدغن لگایا جاتا۔چونکہ ہر دینی جماعت کا اپنا سیاسی پلیٹ فارم بھی تھا اس لیے انفرادی سطح پر ہر پارٹی اپنی سیاسی سرگرمیوں میں آزاد تھی (۵۵)۔تاکہ من حیث الجموع کونسل کی سرگرمیوں میں سیاست در نہ آئے اور کونسل اپنے مقاصد کے حصول میں یکسوئی سے کوششیں جاری رکھے۔مولانا شاہ احمد نورانی کا تعلق چونکہ جمعیت علمائے پاکستان سے تھا اس لیے انہوں نے اپنے سیاسی پلیٹ فارم پر سیاسی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔(۵۶) اسی سلسلے میں مسلم لیگ (ن) اور جمعیت علمائے پاکستان (نورانی گروپ) میں اشتراک عمل کے لیے دونوں جماعتوں کے رہنماؤں میں رابطہ ہوا۔۷/اکتوبر ۱۹۹۵ء کو مسلم لیگ (ن) کے نائب صدر خورشید محمود قصوری، سابق گورنر پنجاب میاں محمد اظہر، اور بیگم مہناز رفیع نے جمعیت کے دفتر میں مولانا شاہ احمد نورانی سے ملاقات کی۔اس موقع پر جنرل کے ایم اظہر خان اور سردار محمد خان لغاری بھی موجود تھے۔ان رہنماؤں کے درمیان ایک گھنٹے تک مذاکرات جاری رہے۔(۵۷) بقول جنرل اظہر مولانا نورانی نے ملکی مسائل پر صرف تبادلہ خیال کیا۔تاہم انہوں نے کسی قسم کی یقین دہانی نہیں کرائی (۵۸) ☆ مسلم لیگ کے لیڈروں نے گرینڈ الائنس میں شامل ہونے کے لیے زور دیا۔لیکن مولانا نورانی نے واضح طور پر کہا کہ یہ معاملہ پارٹی کی مرکزی شوریٰ کے سامنے رکھا جائے گا اور شوریٰ جو بھی فیصلہ کرے اس کے مطابق

☆ بعد ازاں مولانا شاہ احمد نورانی نے واضح موقف اختیار کیا کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) نظام مصطفیٰ کے نفاذ میں مخلص نہیں اس لیے جمعیت علمائے پاکستان ان دونوں جماعتوں کے ساتھ انتخابی اتحاد ہرگز نہیں کرے گی۔(جنگ ۲ نومبر ۱۹۹۵ء)

معاملات کو دیکھا جائے گا۔ (۵۹) انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مڈٹرم الیکشن ہونے چاہئیں لیکن ضروری نہیں کہ اس مقصد کے لیے جو بھی تحریک چلے ہم اس کا ساتھ دیں۔ تاہم ۱۹/ اکتوبر کو مسلم لیگ (ن) کی طرف سے منایا جانے والا یوم سیاہ ایک اچھا کام ہے۔ مولانا نورانی کے بقول وزیراعظم کی بھی خواہش تھی کہ اب ملک میں مڈٹرم الیکشن کرا لیے جائیں وہ کسی بھی وقت ان کا اعلان کر سکتی ہیں (۶۰)۔

مسلم لیگ (ن) کو اس امر کا ادراک ہو چکا تھا کہ اس کے ووٹ بنک کو ماضی میں جتنا نقصان جے یو پی (نورانی) نے پہنچایا تھا کسی اور جماعت نے نہیں پہنچایا تھا (۶۱)۔ اس کا برملا اظہار لندن میں شہباز شریف نے بھی کیا۔ انہوں نے مختلف شخصیات سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ جمعیت علمائے پاکستان نے ان کی ۲۳ نشستیں ہروادیں۔ جس پر ایک رہنما نے کہا کہ پہلے آپ کہتے تھے کہ جماعت اسلامی نے ۱۹ نشستیں ہروادیں۔ (۶۲) اب کہتے ہیں کہ جے یو پی نے ۲۳ نشستیں ہروادیں۔ تو پھر آپ کو ان جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے تھا۔ شہباز شریف نے اس سے اتفاق کیا کہ واقعی ان سیاسی جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے تھا لیکن اب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ (۶۳) اب یہ سیاسی جماعتیں تبدیلی کی خواہش رکھنے کے باوجود بھی تبدیلی کے حق میں نہیں۔ جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام اور پاکستان جمہوری پارٹی حکومت کی بیشتر پالیسیوں سے نالاں ہونے کے باوجود حکومت مخالف کیمپ میں جانے کے لیے آمادہ نہیں (۶۴)۔

انہی دنوں جب یوم سیاہ منایا جا رہا تھا بے نظیر بھٹو اقوام متحدہ کی پچاسویں سالگرہ کے سلسلے میں شرکت کے لیے ملک سے باہر چلی گئیں تھیں۔ اقوام متحدہ چونکہ اپنے قیام کے پچاس سالوں میں مسئلہ کشمیر سمیت کئی مسائل کے حل میں بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ اس لیے ملی یکجہتی کونسل نے اس موقع پر یوم احتجاج منانے کا اعلان کر دیا (۶۵)۔ اس فیصلے کی توثیق کونسل میں شامل تمام جماعتوں نے کی۔ اس سلسلے میں ملی یکجہتی کونسل کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے تمام جماعتوں کے رہنماؤں کو ایک خط بھی لکھا (۶۶)۔ جس میں اقوام متحدہ کو عالمی استعماری طاقتوں کا ایجنٹ قرار دیتے ہوئے اس کی سرگرمیوں کو اسلام دشمن اور مسلم کش گردانا ان کے بقول صومالیہ، فلسطین، بوسنیا، چیچنیا، کشمیر اور بھارت کے اندر مسلمانوں کے خلاف خون آشام تحریکیں اور قتل مسلم کا شغل صبح و شام جاری تھا۔ اندریں حالات ملی یکجہتی کونسل

نے فیصلہ کیا ہے کہ ۲۴/ اکتوبر ۱۹۹۵ء کے دن کو اقوام متحدہ کی سالگرہ کے طور پر منانے کے بجائے یوم سیاہ کے طور پر منائی جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ پاکستانی قوم مذہب اور مسلک اور طبقاتی تفریق کے بغیر اس نام نہاد عالمی ادارے کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ انہوں نے عوام سے اپیل کی کہ غیرت اسلامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اپنے حلقہ اثر میں سیمینارز، جلسے اور سیاہ پرچم لہرانے کی تقریبات منعقد کر کے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں کے درد میں شریک ہوں اور اقوام متحدہ کے مظالم کے خلاف آواز حق بلند کریں۔ (۶۷)

ملی یکجہتی کونسل کے پلیٹ فارم کا جمعیت علمائے پاکستان کو انفرادی طور پر یہ فائدہ پہنچا کہ اس کے دونوں بڑے دھڑے جے یو پی نورانی اور نیازی کو ایک ہی پلیٹ فارم پر کام کرنے کا موقع ملا جس سے ان دونوں دھڑوں کے رہنماؤں میں جاری سرد جنگ کم ہوئی۔ مولانا عبدالستار نیازی قبل ازیں سنی کنونشن میں دونوں دھڑوں کے اتحاد کا عندیہ دے چکے تھے۔

لہٰذا بعد ازاں جے یو پی کے دونوں دھڑوں میں اتحاد کے لیے کمیٹیاں تشکیل دے دی گئیں (۶۸)۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے اس ضمن میں جو کمیٹی بنائی اس کے چیئرمین پیر اعجاز ہاشمی اور اراکین میں علامہ حامد سعید کاظمی، صاحبزادہ سید محمد اکرم شاہ اور مولانا سید محفوظ مشہدی شامل تھے۔ جبکہ مولانا عبدالستار نیازی کی طرف سے مقرر کردہ کمیٹی میں صاحبزادہ حاجی فضل کریم، حافظ محمد تقی اور حسن علوی شامل کیے گئے۔ نورانی گروپ کی کمیٹی کے قیام کا فیصلہ ۲ نومبر ۱۹۹۵ء کو جے یو پی کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں کیا گیا۔ (۶۹) اس سے مولانا شاہ احمد نورانی جو کہ کافی عرصے سے جے یو پی کے دھڑوں میں اتحاد کے خواہاں تھے، اتحاد کے لیے زور شور سے سرگرم عمل ہو گئے۔ جس سے اتحاد کے عمل میں تیزی آتی گئی۔

ادھر اسلامی جماعتوں نے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پریشر گروپس بنانے کا فیصلہ کیا اس مقصد کے لیے مولانا فضل الرحمٰن نے مختلف سیاسی شخصیات سے رابطے شروع کر دیئے دراصل یہ پریشر گروپس ایک حکمت عملی کے تحت وجود میں لائے جا رہے تھے۔ جس کا فیصلہ کچھ عرصہ قبل ملی یکجہتی کونسل نے اتفاق رائے سے کیا تھا۔ اس گروپ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ کونسل کے مقاصد کی آئینی اور پارلیمانی حوالوں سے تکمیل کی جائے۔ (۷۰)

اس کے علاوہ اس کا ایک مقصد حکومت پر دباؤ بھی بڑھانا تھا جبکہ پارلیمنٹ پر ملی یکجہتی کونسل غیر سیاسی مقاصد بالخصوص حکومت کے اسلام مخالف اقدامات کے سد باب کے لیے موجود تھی حکومت پر دباؤ بڑھانے کے لیے ملی یکجہتی کونسل میں شامل دینی سیاسی جماعتوں نے ۲۲ دسمبر کو یوم احتجاج اور ۳۰ دسمبر کو ملک گیر ہڑتال کر اعلان کر دیا۔(۷۱) مولانا سمیع الحق نے حکومت کو خبردار کیا کہ یہ تحریک آگے چل کر پی این اے کی تحریک (۱۹۷۷ء) سے بھی بڑی تحریک بن سکتی ہے ان اقدامات کا اعلان مولانا شاہ احمد نورانی اور دیگر رہنماؤں نے ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں کیا جس میں سیکریٹری جنرل حافظ حسین، جے یو پی کے سینیئر مولانا عبدالستار خان نیازی، تحریک فقہ جعفریہ کے علامہ ساجد نقوی، جمعیت اہل حدیث کے سینیئر پروفیسر ساجد میر، جماعت اہل حدیث کے عارف سلمان روپڑی وغیرہ موجود تھے۔اس موقع پر شاہ احمد نورانی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کی طرف سے اٹھائے جانے والے اقدامات کے باعث ملک میں بڑھتی ہوئی بدامنی، مہنگائی، بیروزگاری، غیر ملکی مداخلت، الحاد، بے چینی، لوٹ کھسوٹ، رشوت ستانی اور ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے پھیلائی جانے والی بے حیائی کی پالیسیوں کے خلاف ۲۹ دسمبر کو یوم احتجاج اور ۳۰ دسمبر ۱۹۹۵ء کو ملک گیر ہڑتال کی جائے گی۔ (۷۲) جبکہ اس سے قبل ۲۲ دسمبر کو لیاقت باغ میں حکومت سے بیزاری کا اعلان کرنے کے لیے تمام دینی جماعتوں کے قائدین اکھٹے ہوں گے۔ (۷۳) مولانا شاہ احمد نورانی نے اس موقع پر ایک سوال کے جواب میں ان اطلاعات کی سختی سے تردید کی کہ ملی یکجہتی کونسل کو معروف معنوں میں انتخابی یا سیاسی اتحاد میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔جبکہ حافظ حسین احمد نے کہا کہ ہم اگرچہ اپوزیشن میں ہیں لیکن ہم نواز شریف کے ساتھ نہیں ہیں مزید یہ کہ کونسل کی تنظیم صوبائی سطح پر بھی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کے بعد اسے ڈویژن، اضلاع اور نچلی سطح تک پھیلا دیا جائے گا صوبوں میں ملی یکجہتی کونسل کا عہدیداروں کے انتخاب کے لیے کونسل کی تنظیموں کا اجلاس ۵ دسمبر کو لاہور میں، ۶ دسمبر کو کراچی میں اور ۸ دسمبر کو پشاور میں منعقد ہوگا۔جبکہ بلوچستان کے لیے اجلاس کے چند روز بعد کوئٹہ میں منعقد ہوگا۔(۷۴) تاہم حقیقت بھی یہی تھی کہ حکومتی اقدامات کے نتیجے میں نہ صرف دینی جماعتوں کو کھڈے لائن لگانے کی کوشش کی گئی تھی بلکہ دینی مدارس کو بھی ایک سوچے منصوبے کے تحت بدنام کرنے کی کوشش کی گئی اس سلسلے میں وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر کے بیانات نے دینی جماعتوں کی صفوں

میں کھلبلی مچادی۔(۷۵) ☆ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جماعتیں جو حکومت کے ساتھ نہ ہونے کے باوجود بھی اس کے خلاف کسی احتجاجی تحریک کا حصہ بننے پر آمادہ نہ تھیں۔ ۳۰ دسمبر کے احتجاج میں شمولیت کے لیے تیار ہوگئیں۔ دینی جماعتوں کے بعض کارکنوں کی گرفتاری کے ساتھ ہی ان جماعتوں نے بھی قریب ہونا شروع کر دیا جس سے ان میں نئی صف بندی کا آغاز ہوگیا۔ جمعیت علمائے پاکستان کی قیادت، پیپلز پارٹی کی پالیسیوں کو روز اوّل ہی سے تنقیدی نگاہ سے دیکھتی رہی تھی اس لیے جے یو پی کے سربراہ مولانا نورانی کو جاری صورتحال میں پیپلز پارٹی کے خلاف ہونے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ پہلے ہی اس کے مخالف تھے ان کے خیال میں پیپلز پارٹی کی پہلی (ذوالفقار علی بھٹو) حکومت نے ملک میں جو بیج بو دیئے تھے جاری حالات اسی کا ثمرہ تھے اور ان کا تدارک مشکل تھا۔ ان خرابیوں پر صرف اسلامی نظام نافذ کر کے ہی قابو پایا جا سکتا تھا۔ اگرچہ بھٹو مرحوم مولانا نورانی کی قابلیت کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سابق وزیر اعظم بھٹو نے مولانا نورانی سے خود کہا تھا کہ" اس وقت "ان (مولانا نورانی) جیسا قابل وزیر خارجہ ہونا چاہیے۔ یہ اتنے لائق ہیں کہ خارجی پلیٹ فارم پر بھی لڑ سکتے ہیں مگر ان کے منہ پر داڑھی ہے۔" (۷۶)

بہر کیف مولانا نورانی کا پیپلز پارٹی سے ہمیشہ اختلاف رائے ہی رہا جس کی ایک وجہ جمعیت علمائے پاکستان کے خیال میں پیپلز پارٹی کے اقدامات کے نتیجہ میں ایم کیو ایم وجود میں آئی۔ کوٹہ سسٹم اور بعض شہروں میں فسادات اس کی بنیاد بنے تاہم اسے تقویت، مارشل لاء دور میں ملی۔ ایم کیو ایم کے بننے سے جمعیت کے بھی زیادہ نقصان پہنچا یہی نہیں جب جمعیت کے رہنماؤں نے تبلیغی جماعت کی طرز پر اپنی تبلیغی جماعت دعوت اسلامی کی بنیاد رکھی تو اس کے کارکنوں پر بڑے ظلم کیے گئے کیونکہ اس جماعت کے کارکن بھی مولانا نورانی جیسی وضع قطع اختیار کرتے تھے جس پر ایم کیو ایم کے کارکن اس خالصتاً غیر سیاسی تنظیم کے کارکنوں کو بھی اغواء کر کے لے جاتے تھے چنانچہ انہیں اس ناخوشگوار صورتحال سے بچانے کے لیے جمعیت نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی وضع قطع تبدیل کریں چنانچہ گنبد خضراء کے رنگ پر سبز رنگ اختیار کیا

☆ نصیر اللہ بابر نے صرف یہ کہا کہ اسلام آباد کی اسلامی یونیورسٹی میں دہشت گرد موجود ہیں بلکہ انہوں نے بعض دینی جماعتوں کے کارکنوں کی گرفتاری کی بھی ہدایات جاری کیں۔ (روزنامہ جنگ، یکم دسمبر ۱۹۹۵ء)

گیا۔ (۷۷) جب مولانا نورانی کی رہائش گاہ پر اس جماعت کی بنیاد (۱۹۸۱ء) میں رکھی جا رہی تھی تو بعض رہنماؤں نے یہ بھی کہا تھا کہ مولانا جمعیت چھوڑ کر دعوت اسلامی کے سربراہ بن جائیں لیکن دوسرے رہنماؤں نے کہا کہ ان کی جمعیت کو ضرورت ہے چنانچہ وہ جمعیت میں ہی رہے اور دعوت اسلامی کی قیادت کے لیے مولانا الیاس کا انتخاب کرلیا گیا۔ (۷۸)

ملی یکجہتی نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق ۲۹ دسمبر ۱۹۹۵ء کو یوم احتجاج منایا۔ (۷۹) جس کا اعلان ۲۶ نومبر کو ملی یکجہتی کونسل کے ایک اجلاس میں گیا تھا۔ یوم احتجاج علماء کی گرفتاریوں، دینی مدارس کو دہشت گردوں کی پناہ گاہ قرار دینے اور دینی مدارس کے خلاف حکومت کی مبینہ مہم کی مذمت کے لیے منایا جارہا تھا اس کے لیے جمعہ کے دن کا انتخاب کیا گیا تا کہ نماز جمعہ کے اجتماعات میں علماء کے خلاف حکومتی اقدامات کی مذمت کی جائے۔ دینی مدارس کے خلاف مہم پر علماء وعوام کی طرف سے سخت غصے کا اظہار کیا گیا۔ اس موقع پر خطیبوں نے مختلف قراردادیں منظور کرائیں جن میں کہا گیا کہ حکومت عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لیے ایشوز پیدا کررہی ہے مزید برآں کونسل کی اپیل پر مساجد میں نماز جمعہ کے اجتماعات اور اس کے بعد جلوسوں کے شرکاء نے ۳۰ دسمبر کو مکمل پہیہ جام کرنے کا عزم کیا۔ قراردادوں میں امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ (۸۰)

کامیاب یوم احتجاج کی طرح پہیہ جام کی ہڑتال بھی کامیاب رہی اگرچہ حکومتی کوششوں کے نتیجے میں مکمل پہیہ جام نہ ہوسکا تاہم مجموعی طور پر ہڑتال کامیاب رہی ملی یکجہتی کونسل کی طرف سے ہڑتال کو ریفرنڈم قرار دیا گیا جس کے تحت عوام نے حکومت کے خلاف فیصلہ دے دیا ہے۔ (۸۱)

اگر اس پہیہ جام ہڑتال کا موازنہ تحریک نجات سے کیا جائے جو گذشتہ سال نواز شریف کی طرف سے حکومت کے خلاف چلائی گئی تھی۔ ☆ تو ایک مماثلت ضرور نظر آئے گی اور وہ یہ کہ تحریک نجات کی طرح یہ ہڑتال بھی حکومت کے اعصاب پر بری طرح سوار ہوگئی تھی چنانچہ اس لاشعوری خوف کے زیر اثر حکومت نے کونسل کی اعلان کردہ ہڑتال کو

☆ قائد حزب اختلاف ۱۹۹۴ء میں کراچی سے پشاور تک ٹرین مارچ اور ۲۰ ستمبر کو کامیاب ہڑتال کر چکے تھے۔ ان کی طرف سے پہیہ جام کی کال نے حکومت کو حواس باختہ کردیا تھا اور اس کے ناکام بنانے کے لیے اسے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔

بھی ریاستی مشینری کے بے دریغ استعمال کے ذریعے ناکام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

حکومت اور دیگر سیاسی حلقے ملی یکجہتی کونسل کے متعلق اس کے قیام کے بعد ہی سے کئی تحفظات کا شکار تھے۔ اگرچہ یہ اعتراف بھی اپنی جگہ موجود تھا کہ کونسل نے اپنے قیام کے مقاصد کے حصول میں نمایاں خدمات سرانجام دیں اس حوالے سے وہ حکمرانوں کے لیے بھی پسندیدہ قرار پائی۔ وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے لے کر وزیراعلیٰ پنجاب منظور احمد وٹو تک کونسل کی تعریف و توصیف کرتے نظر آئے۔ نوابزادہ نصراللہ خان حکومت اور حزب اختلاف میں مفاہمت پر زور دینے کے لیے ملی یکجہتی کونسل کو بطور مثال پیش کرتے لیکن اس سب کے باوجود ابتدا ہی سے کونسل کے متعلق بعض سوالات بھی پیدا ہوتے رہے۔ فرقہ واریت کے خلاف اس اتحاد میں نواز شریف کی اتحادی، جمعیت علمائے اسلام بھی موجود تھی اور غیر جانبداری کے دعویدار قاضی حسین احمد، مولانا نورانی اور علامہ ساجد نقوی بھی پیش پیش تھے حکومت کو خدشہ تھا کہ کہیں دونوں (نواز، بینظیر) کو برابر کی برائی قرار دینے والی دینی جماعتیں کونسل کو تیسری سیاسی قوت کے طور پر سامنے نہ لے آئیں۔ (۸۲) ایک امکان یہ بھی تھا کہ ملی یکجہتی کونسل کو تو اس کے بنیادی مقاصد (فرقہ واریت کے انسداد) تک محدود رکھا جائے البتہ اس میں شامل ہم خیال جماعتوں، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے پاکستان (نورانی)، جمعیت علمائے اسلام (ف) اور تحریک جعفریہ پاکستان پر مشتمل ایک سیاسی و انتخابی اتحاد تشکیل پایا جائے تاہم دینی جماعتوں کی گذشتہ کارکردگی کے پیش نظر اس کے لیے بہت زیادہ ہوم ورک کی ضرورت تھی۔

بے نظیر حکومت روز بروز عوام میں اپنی مقبولیت کھو رہی تھی کیونکہ یہ عوامی مسائل کے حل میں بری طرح ناکام ہوچکی تھی۔ حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ حکومت کے اقتدار کے رہنے کا کوئی جواز نہ تھا ان حالات میں مولانا شاہ احمد نورانی کا یہ کہنا برمحل تھا کہ ملک میں وسط مدتی (مڈٹرم) انتخابات کرادیئے جائیں۔ ان کے بقول:

جب حکومت سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ مڈٹرم انتخابات کرائے تو وہ جواب یہ دیتی کہ اسے عوام نے پانچ سال کے لیے مینڈیٹ دیا ہے ..... جس حکومت کو ۲۰۷ کے ایوان میں صرف ۸۲ نشستیں حاصل ہوں وہ کیسے یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ اسے عوام کا مینڈیٹ حاصل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آئین کے مطابق انتخابات پانچ سال کے لیے ہوتے ہیں لیکن آئین میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ مڈٹرم انتخابات نہیں ہوسکتے مڈٹرم انتخابات تو عام جمہوری ملک میں ہوتے

رہتے ہیں.... بھارت میں بھی دو مرتبہ مڈٹرم انتخابات ہوئے.... اسی طرح جاپان میں بھی مڈٹرم انتخابات ہو چکے ہیں تو یہ عمل جمہوریت کا حصہ ہے.... حالات یہ ہیں کہ رشوت، بددیانتی اور بدامنی کی انتہا ہو چکی ہے اور حکومت کراچی کے حالات پر قابو پانے میں ناکام رہی ہے۔ خارجہ پالیسی بھی ناکام ہو چکی ہے برادر ملک ایران سے بھی تعلقات میں کشیدگی آ گئی ہے۔ چین سے دوستی کے رشتوں میں کمی آئی۔ امریکہ کو خوش رکھنے کے لیے ملکی مفادات کو داؤ پر لگایا جارہا ہے اور بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دے کر اور تجارتی روابط قائم کرنے کا فیصلہ کر کے کشمیری مجاہدین کے خون سے بے وفائی کی جارہی ہے۔ قوم کی غیرت وحمیت کے داؤ پر لگایا جارہا ہے .... قوم نے حکومت کو اس لیے مینڈیٹ دیا تھا کہ وہ قوم کی غیرت کو بیچ ڈالے؟ ..... ہم بھارت کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے اور ملک میں امریکی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کی مزاحمت کریں گے۔(۸۳)

ان دنوں جب حکومت اور ملی یکجہتی کونسل کی چشمک جاری تھی ملک میں بدامنی اور محاصرے اپنے عروج پر تھے دسمبر ۱۹۹۵ء کا آخری ہفتہ اس سلسلے میں خصوصیت سے اہم تھا۔ ۲۳ دسمبر کو ڈنائٹ آپریشن میں پولیس اور رینجرز نے ایک ملزم اجمل پہاڑی کی تلاش میں کراچی میں کورنگی، داتا نگری، گبول کالونی اور مختلف علاقوں میں چھاپے مار کر ایک درجن سے زائد افراد کو گرفتار کر لیا۔ ایم کیو ایم کے ریحان کانا اور اس کے ساتھی کی تلاش میں لیاقت آباد میں ایک رات میں چودہ چھاپے مار کر پولیس نے کئی افراد کو حراست میں لے لیا۔ ۲۶ دسمبر کو نارتھ کراچی میں چھاپہ مار کر سات دہشت گرد گرفتار کر لیے گئے ان سے بھاری تعداد میں اسلحہ برآمد ہوا۔ گرفتار شدہ ایک کانسٹیبل کو ہلاک کرنے سمیت مختلف سنگین وارداتوں میں ملوث پائے گئے۔ ۲۷ دسمبر کو حیدرآباد میں چھاپے مار کر بائیس دہشت گرد گرفتار کر لیے گئے ایک ٹارچر سیل پکڑا گیا۔ آتش گیر مادہ اور مدفون اسلحہ بھی برآمد ہوا۔ ۲۹ دسمبر کو پولیس مقابلہ میں پانچ افراد ہلاک ہوگئے۔ ہلاک شدگان میں ایم کیو ایم کا ایک سابق کونسلر شبیر حسین عابدی بھی شامل تھا جو اورنگی میں پولیس مقابلہ میں ہلاک ہوا۔ پولیس ذرائع کے مطابق اس سے ایک کلاشنکوف اور میگزین برآمد ہوئی۔ مقتول عابدی متعدد وارداتوں میں ملوث بتایا گیا اس کی گرفتاری پر حکومت کی جانب سے انعام بھی مقرر تھا۔ الطاف حسین نے عابدی کے قتل کو حکومتی دہشت گردی قرار دیا۔ ۲۷ دسمبر کو وزیراعظم بے نظیر نے کہا کہ بھارت الطاف گروپ کی مدد کررہا

ہے۔ دہشت گردوں کی تربیت کے لیے بھارت میں چالیس کیمپ قائم ہیں جبکہ نصیر اللہ بابر نے اس روز یہ بیان دیا کہ اگر ایم کیو ایم ہتھیار پھینک دے تو اس سے مذاکرات ہو سکتے ہیں۔(۸۴)

یکم جنوری ۱۹۹۶ء کو کراچی میں صدر فاروق لغاری کی صدارت میں ایک اعلیٰ سطح کا اجلاس ہوا جس میں کراچی میں امن وامان کے قیام پر غور کیا گیا۔(۸۵) صدر نے انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اس کو قیام امن کے لیے اپنے اقدامات جاری رکھنے کی ہدایت کی لیکن اس سب کے باوجود دہشت گردی کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ اسی روز کراچی میں اٹھارہ افراد کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ یکم جنوری ہی کو سی آئی اے اور پولیس نے کراچی میں مختلف جگہوں پر چھاپے مار کر تیرہ مبینہ دہشت گردوں کو گرفتار کر لیا ان سے بھاری تعداد میں اسلحہ بھی برآمد ہوا۔ دو جنوری کو مزید سات افراد دہشت گردی کی نذر ہوگئے۔(۸۶)

دہشت گردی کی ان وارداتوں کے ساتھ ساتھ حکومت نے دہشت گردوں کے صفایا کی مہم بھی جاری رکھی کئی سرکردہ دہشت گرد جن میں ریحان کانا، فہیم بھولا، جمیل کمانڈو وغیرہ پولیس مقابلوں میں ہلاک کر دیئے گئے۔(۸۷)

چار جنوری کو لندن میں نواز الطاف ملاقات ہوئی جس میں حکومت کے خلاف مشترکہ حکمت عملی اور لائحہ عمل طے کرنے کے لیے بات چیت ہوئی۔(۸۸) اسی ملاقات کے تسلسل میں سات جنوری ۱۹۹۶ء کو نواز شریف نے لاہور میں مسلم لیگ اور اس کی اتحادی جماعتوں کی سپریم کونسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کے خاتمے کا فیصلہ کن مرحلہ آگیا ہے۔ انہوں نے ۱۹۹۶ء کو تبدیلی کا سال قرار دیا۔(۸۹) اجلاس میں طے کیا گیا کہ آئندہ صدر کو نہیں بلکہ وزیراعظم کو ہدف بنایا جائے اور صدر پر دباؤ بڑھایا جائے کہ وہ ملک کو بحران سے نکالنے کے لیے اپنا آئینی کردار ادا کریں اور قومی اسمبلی کو توڑ کر کابینہ کو برطرف کریں(۹۰)۔ نواز شریف نے اپنے ایک مضمون میں حکومت سے تعاون کے لئے اپنے پانچ نکاتی فارمولے کا اعلان بھی کیا:

(۱) کراچی کے بحران کا منصفانہ اور پائیدار حل تلاش کیا جائے۔

(۲) پارلیمنٹ کی بالادستی اور عدلیہ کی آزادی اور غیر جانبداری کو یقینی بنانے کے لیے دستور میں ترمیم کی جائے۔

(۳) قانون نافذ کرنے والے اداروں کی غیر جانبداری، غیر وابستگی اور ان پر عوامی اعتماد کی بحالی کے لیے ایک پیکج تیار کیا جائے اور اس پر عمل کو یقینی بنایا جائے۔
(۴) اقتصادی حالت کی درستگی اور معاشی خوش حالی کے لیے موثر اقدامات کیے جائیں۔
(۵) ملکی دفاع کو مضبوط بنایا جائے۔(۹۱)

لیکن ارباب اقتدار نے اس پانچ نکاتی فارمولے کو لائق توجہ نہیں سمجھا۔

تاہم ملی یکجہتی کونسل نے اپنی حکومت مخالف سرگرمیوں کو شد و مد سے جاری رکھا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۹۶ء کو ملی یکجہتی کونسل کے زیر اہتمام مجوزہ انتخابی اصلاحات اور فحاشی و عریانی کے خلاف پارلیمنٹ ہاؤس اور سٹیشن ٹیلی ویژن کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا گیا جس میں کونسل میں شامل جماعتوں کے سربراہوں، کارکنوں اور ارکان پارلیمنٹ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ دوسرے شہروں میں بھی احتجاجی جلسے اور جلوسوں کا اہتمام کیا گیا۔ بعض مقامات پر پولیس نے لاٹھی چارج اور فائرنگ کر کے مظاہرین کو منتشر کیا متعدد افراد زخمی ہوئے جبکہ بیتیس علماء سمیت تقریباً ایک سو افراد گرفتار کر لیے گئے۔(۹۲)

اس اثناء میں (۲۰ مارچ ۱۹۹۶ء) کو سپریم کورٹ نے اپنا تاریخی فیصلہ دیا کہ ججوں کی تقرری کے معاملہ میں صدر، چیف جسٹس کے فیصلے کا پابند ہے(۹۳)۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے مستقل چیف جسٹس صاحبان کی سفارش کے بغیر صدر کی جانب سے ججوں کی تقرری اور منتقلی کو غیر آئینی اور غیر موثر قرار دے دیا گیا۔ قائم مقام چیف جسٹس صاحبان مشورہ دینے کے اہل نہیں۔ سپریم کورٹ کا جج ہائی کورٹ کا قائم مقام چیف جسٹس نہیں ہو سکتا۔ چیف جسٹس یا کسی مستقل جج کی مرضی کے بغیر وفاقی شرعی عدالت میں اس کی تقرری غیر آئینی ہے۔ ہائی کورٹ کے ججوں کا تبادلہ بطور سزا نہیں کیا جا سکتا۔ ایڈہاک ججوں کی تقرری غیر آئینی ہے۔ سپریم کورٹ میں مستقل ججوں کی آسامیوں کی موجودگی میں ایڈہاک جج مقرر نہیں کیے جا سکتے انہیں مستقل کیا جائے یا واپس بھیج دیا جائے۔ تین صوبوں میں قائم مقام چیف جسٹسوں کی تقرری عدلیہ کی آزادی اور آئین سے متصادم ہے۔(۹۴)

سپریم کورٹ نے اپنے اس اہم فیصلے میں ۳۰ دن کے اندر سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس میں ججوں کی تقرری کو متعلقہ چیف جسٹس صاحبان کی سفارش کے مطابق بنانے، تمام صوبوں میں مستقل چیف جسٹس مقرر کرنے اور سپریم کورٹ میں مستقل آسامیوں پر ایڈہاک

جج مقرر نہ کرنے کا حکم دے دیا فیصلہ میں صراحت کی گئی کہ انتظامیہ آئین کی عدالتی تشریح کی پابند ہے۔(۹۵)☆

اس فیصلہ کے دو روز بعد ۲۲ مارچ ۱۹۹۶ء کو وزیر اعظم نے کہا کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ غصہ پر مبنی ہے ججوں کی تقرری کا اختیار صدر کو حاصل ہے نہ کہ عدلیہ کو۔ یہ فیصلہ حکومت کے نہیں بلکہ خود عدلیہ کے خلاف ہے۔ عدلیہ کو روشن خیال ججوں کی ضرورت ہے وزیر داخلہ کے بقول جج صاحبان آئین کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ وہی جج ہیں جنہوں نے ہر مارشل لاء اور ہر ڈکٹیٹر کا ساتھ دیا اور اسے جائز قرار دیا۔(۹۶) (ایضاً) ان بیانات سے حکومت عدلیہ محاذ آرائی کی صورتحال پیدا ہوگئی۔ بالالفاظ دیگر حکومت کے لیے ایک نیا محاذ کھل گیا۔

۱۲ اپریل کو سپریم کورٹ نے تفصیلی فیصلہ دیا (۹۷) اسی روز لاہور کے ایک ہوٹل میں پیپلز پارٹی کے زیر اہتمام اس کے سیکریٹری جنرل شیخ رفیق کی صدارت میں ایک سیمینار منعقد ہوا جو عملاً ججوں کے خلاف ایک جلسہ عام میں تبدیل ہوگیا۔ مقررین نے اس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کچھ لوگ عدلیہ کے چور دروازے سے حکومت کو غیر مستحکم کر رہے ہیں جب عوامی حکومت آتی ہے تو جج اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیتے ہیں سیاسی اور فوجی آمریت غلط ہے تو عدالتی آمریت بھی ہمیں قبول نہیں۔ ہمیں اقتدار عوام نے دیا ہے ہم اس پر کسی کو ڈاکہ ڈالنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ پارلیمنٹ کا اختیار کسی اور کو نہیں دیا جا سکتا خواہ وہ فوج ہو یا عدلیہ۔ ہم لوگ تو فوج سے بھی نہیں ڈرتے۔ یہ لوگ ہمارے سامنے کیا چیز ہیں۔ بے نظیر نے بغاوت کے تمام راستے بند کر دیئے ہیں دیکھا جائے تو سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف ہرزہ سرائی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ یہ محض ایک عام عدالتی فیصلہ تھا لیکن پیپلز پارٹی نے کسی جواز، وجہ اور ضرورت کے بغیر صدر اور عدلیہ کے علاوہ فوج سے بھی محاذ آرائی

☆ ۱۲ اپریل ۱۹۹۶ء کو سپریم کورٹ نے اعلیٰ عدالتوں میں ججوں کی تقرری کے بارے میں ۲۷۷ صفحات پر مشتمل تفصیلی فیصلہ جاری کر دیا جس میں کہا گیا کہ ججوں کی تقرری کے بارے میں صدر مملکت چیف جسٹس صاحبان سے مشورہ کے پابند ہو۔ کسی امیدوار کی موزونیت کے بارے میں صدر کی جانب سے ٹھوس اسباب تحریری شکل میں نہ ہونے کی صورت میں صدر کو چیف جسٹس کی رائے قبول کرنا ہوگی۔
(احمد، غفور، بحوالہ سابقہ، ص ۵۰۶)

مول لے لی۔(۹۸)

حکومت نے ملی یکجہتی کونسل کے اقدامات کے رد کے لیے کئی طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ عوامی احتجاج کو ریاستی دہشت گردی کے ذریعے دبا دیا گیا۔ ملی کونسل کے قیام کے بعد چونکہ امن و امان کے قیام میں مدد ملی تھی لیکن ساتھ ہی متحارب قوتیں بھی یکجا ہوگئی تھیں جس سے حکمران پریشان ہوگئے اس لیے ملکی حالات کو خراب سے خراب تر کرنے کی کوشش کی گئی۔ ملی یکجہتی کونسل کے فیصلوں کے اثرات زائل کرنے کے اقدامات کیے گئے۔ اس میں شامل جماعتوں سپاہ صحابہ اور سپاہ محمد کو پھر ایک دوسرے کے مقابل لانے کی کوششیں شروع کی گئیں۔ دعوت اسلامی کے امیر مولانا محمد الیاس قادری پر قاتلانہ حملہ کیا گیا جس کے نتیجے دو کارکن محمد زاہد قادری اور محمد سجاد قادری شہید ہوگئے۔ جب حکومتی ایجنسیوں کو اپنی ان مساعی میں ناکامی دکھائی دی تو کونسل کے خلاف سرکاری بنچوں سے پراپیگنڈہ شروع کردیا گیا کہ ملی یکجہتی کونسل حکومت کی پروردہ ہے جسے مسلم لیگ کے خلاف بنایا گیا ہے تاکہ انتخابات میں دینی ووٹ تقسیم ہوکر پی پی کے اقتدار کی راہ ہموار ہوسکے (۹۹)۔ حالانکہ کونسل میں شامل جماعتوں میں مولانا نیازی اور پروفیسر ساجد میر کی جماعتیں مسلم لیگ کی اتحادی تھیں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے قائد کے خلاف بننے والے اتحاد میں شریک ہوتیں۔ تاہم اس سے اپوزیشن کا کونسل سے بدگمان ہونا ایک فطری امر تھا۔ لہٰذا اپوزیشن بچ بھی حکومت کی راگنی میں شریک ہوگئے۔ (۱۰۰) اس پر بھی جب حکومت کو مطلوبہ مقاصد حاصل نہ ہوئے تو حکمرانوں نے کونسل کے بڑھتے ہوئے اثرات کو کم کرنے کے لیے ایک سرکاری کونسل "اسلامی یکجہتی کونسل" کے نام سے جمعیت اہل حدیث کے قاضی عبدالقدیر خاموش اور جماعت اسلامی (مودودی گروپ) کے حیدر فاروق مودودی کی مدد سے کھڑی کردی (۱۰۱) ☆ اس کے علاوہ ملی یکجہتی کونسل میں شامل جماعتوں کے سربراہوں پر الزام تراشیوں کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔ مثلاً جے یو آئی کے مولانا فضل الرحمٰن پر الزام لگایا گیا کہ وہ خارجہ کمیٹی کے چیئرمین ہیں اور

☆ یہ اسلامی یکجہتی کونسل ۲۲ دسمبر ۱۹۹۵ء سے قبل بنائی گئی تھی تاکہ ملی یکجہتی کے احتجاجی پروگراموں کو سبوتاژ کیا جاسکے۔ ملی یکجہتی کونسل میں پھوٹ ڈالنے کے لیے یہ جھوٹا پراپیگنڈہ بھی کرایا گیا کہ مولانا فضل الرحمٰن ملی یکجہتی کونسل کو چھوڑ کر اس سرکاری کونسل میں شامل ہوگئے ہیں۔ (بٹر، سردار محمد اکرم، "کیا یہ قائد اعظم کا پاکستان ہے؟" ماہنامہ ندائے اہل سنت لاہور، فروری ۱۹۹۶ء، ص ۱۰

انہوں نے اپنے عہدے کا غلط استعمال کرتے ہوئے اپنے بھائیوں کو تعلیمی اداروں میں داخل کروانے کے لیے میرٹ کا خیال نہیں کیا۔ ڈیزل لائسنس اور سٹیٹ بینک آف پاکستان سے ایک ایک روپے والے نوٹوں کی تقسیم کے لائسنس حصول کے الزام اس کے علاوہ تھے۔(۱۰۲) یہ بھی کہا گیا کہ وہ ایک کروڑ سے زیادہ کے نوٹ فروحت کرچکے تھے ان پر یہ بھی الزام تھا کہ وہ پشاور میں ایک کثیر المنزلہ پلازہ تعمیر کررہے تھے مزید یہ کہ فروری ۱۹۹۶ء تک ہونے والی کونسل کے آٹھ مرکزی اجلاسوں میں سے محض دو میں شرکت بھی ان کے کردار کو مشکوک بنا رہی تھی جس سے کونسل کے مخالفین کو پراپیگنڈے کا موقع ملا (۱۰۳) ☆ لیکن اس سے کونسل کی سرگرمیوں پر کوئی فرق نہ پڑا جو حکومت کی مخالفت میں جاری و ساری تھیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے حکومت کے عدلیہ مخالف رویے پر بھی کڑی تنقید کی ملتان میں انہوں نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ اگر حکومت نے سپریم کورٹ کے فیصلے کو تسلیم نہ کیا تو اس کے نتیجے کچھ بھی نکل سکتے ہیں.... سپریم کورٹ ہی آئین اور قانون کی تشریح کیا کرتی ہے اور اگر حکومت ججوں کے تقرر کے بارے میں فیصلے تسلیم نہیں کرتی تو اس کا واضح مطلب ہے کہ حکومت آئین کی خلاف ورزی کررہی ہے۔(۱۰۴)

اسی دوران جے یو پی کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی جو اپوزیشن جماعتوں سے روابط رکھے ہوئے تھے، نے ۲۵ اپریل ۱۹۹۶ء کو نواز شریف سے ملاقات کی (۱۰۵)۔ دونوں رہنماؤں میں انتخابات کے انعقاد اور اس کے لیے غیر جانبدارانہ حکومت کے قیام پر اتفاق رائے ہوگیا۔ دونوں کے درمیان ہونے والی پونے دو گھنٹہ کی تفصیلی ملاقات میں نواز شریف کے ہمراہ چوہدری شجاعت حسین، میاں شہباز شریف، میاں محمد اظہر اور چوہدری پرویز الٰہی تھے۔ جبکہ مولانا شاہ احمد نورانی کی معاونت پیر اعجاز ہاشمی اور صاحبزادہ اکرم شاہ نے کی (۱۰۶)۔ مولانا نورانی نے کہا کہ یہ درست ہے کہ آئین میں جانبدارانہ حکومت کی گنجائش نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ گنجائش معین قریشی کے لیے کیسے بنی۔ ہم انتخابی اصلاحات کو بھی مسترد کرتے ہیں اور ہمارا موقف ہے کہ موجودہ حکومت کو ہٹائے بغیر اور غیر جانبدارانہ الیکشن کمیشن بنائے بغیر منصفانہ اور آزادانہ انتخابات کا انعقاد ممکن نہیں۔ نواز شریف نے بھی مولانا نورانی

بلکہ ۱۷ مارچ ۱۹۹۶ء کو راولپنڈی میں ہونے والے سربراہ اجلاس میں بھی فضل الرحمٰن نے شرکت نہیں کی دیگر غیر حاضرین میں قاضی حسین، اسفند یار اور ساجد نقوی تھے۔ (جنگ لاہور، ۱۸ مارچ ۱۹۹۶ء)

کے موقف کی تائید کی۔(۱۰۷)

۷ جولائی کو اسلام آباد میں نواز شریف، اجمل خٹک، مولانا نورانی اور علامہ ساجد نقوی نے ایک مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہماری جماعتوں مسلم لیگ، اے این پی، جے یو پی اور تحریک جعفریہ نے موجودہ حکومت سے نجات کے لیے مشترکہ جدوجہد پر اتفاق کر لیا ہے۔ ہم نے ملک سے یزیدیت (یعنی ظلم وجبر) کے نشانات مٹانے کا عزم کر لیا ہے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ نگران حکومت کے تحت اسی سال وسط مدتی انتخابات کرائے جائیں۔ (۱۰۸) اسی روز مختلف سیاسی جماعتوں اے این پی، جے یو پی، پختون خواہ ملی عوامی پارٹی، این ڈی اے، پی پی پی (شہید بھٹو گروپ)، تحریک جعفریہ اور پی این پی کے سینیٹروں نے سینٹ میں ایک آزاد پارلیمانی گروپ قائم کر لیا اس گروپ کے قیام کا مطلب اپوزیشن کے جائز مطالبات کی حمایت اور حکومت کے جمہوریت کش اقدامات کی مخالفت تھا۔ (۱۰۹)

بہرحال اب حکومت کے دن گنے جا چکے تھے حکومت مخالف عناصر ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا رہنا شروع ہو چکے تھے حکومت مخالف تحریکوں کا یہ سلسلہ بے نظیر کی برطرفی تک رکا نہیں۔ اس پر قاضی کے دھرنا پروگرام اور ٹرین مارچ نے رہی سہی کسر نکال دی۔ نواز شریف جو کہ حکومت کے خلاف لنگوٹ کس کے میدان میں آ چکے تھے (۱۱۰)۔ ان کی دعوت پر ۲۴ جولائی ۱۹۹۶ء کو اسلام آباد میں اپوزیشن کی ۱۴ سیاسی جماعتوں کا سربراہی اجلاس ہوا (۱۱۱)۔ جس میں شرکاء نے کہا کہ پاکستان، جمہوری نظام، پاکستانی عوام اور ملک کی دینی و اسلامی اقدار کی بقاء اور تحفظ کے لیے موجودہ حکومت کا اقتدار سے ہٹایا جانا ضروری تھا۔ حکومت کو آئینی طریقے سے ہٹا دیا جائے اور ایک غیر جانبدار حکومت کے تحت آئین میں طے شدہ اصول کے تحت ایک آزاد اور خود مختار الیکن کے زیر اہتمام عام انتخابات کرائے جائیں۔ الیکشن کمشنر اس امر کو یقینی بنائے کہ انتخابات میں حصہ لینے والے امیدوار آئین کی دفعہ ۶۲ اور ۶۳ میں طے کردہ معیار پر پورے اترتے ہوں (۱۱۲)۔

اسی نوعیت کا ایک اجلاس ۱۷ اگست ۱۹۹۶ء کو چوہدری شجاعت حسین کی رہائش گاہ پر ہوا۔ ''پاکستان بچاؤ تحریک'' کے نام سے ۱۳ جماعتی اتحاد کی صوبائی کمیٹی کے اس اجلاس کی صدارت مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل سردار ذوالفقار کھوسہ نے کی جس میں متحدہ اپوزیشن کی

لاہور میں ہونے والی احتجاجی ریلی کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف تجاویز پر غور کیا گیا۔ اجلاس کے دوران ڈویژنل اور ضلعی سطح پر عوام رابطہ کمیٹیاں بھی تشکیل دی گئیں (۱۱۳)۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے ملی یکجہتی کونسل کو کوششوں کو دھچکا اس وقت لگا جب حکومت کے ایماء پر ملک میں قتل و غارت کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ ملی یکجہتی کونسل میں شامل جماعت سپاہ محمد کے سالار اعلیٰ علامہ مرید یزدانی کا قتل (۱۲ ستمبر ۱۹۹۵ء) اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا بادی النظر میں اس کا مقصد واحد یہی تھا کہ اپوزیشن کے اتحاد کی کوششوں کو نقصان پہنچایا جائے۔ اس صورتحال کا مولانا شاہ احمد نورانی نے سختی سے نوٹس لیا ان کے بقول ملک میں امریکی مداخلت کے تحت پھر فرقہ واریت شروع ہو گئی ہے اور حکومت الٹا مذہبی و دینی جماعتوں پر پابندی لگانے کا سوچ رہی ہے ایسی صورتحال کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا (۱۱۴)۔

لیکن حکومت نے ایجنسیوں کی مدد سے جو کھیل رچایا تھا وہ الٹا اسی کے لیے موت کا پیامبر ثابت ہوا۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۶ء کی شب بے نظیر کے سگے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو یوسف گوٹھ سرجانی ٹاؤن کراچی میں ایک جلسہ سے خطاب کر کے واپس آ رہے تھے کہ ان کی رہائش گاہ ۷۰ کلفٹن کے نزدیک پولیس اور دیگر ایجنسیوں کی بھاری تعداد نے ان کی گاڑی کو گھیر کر روک لیا اور انہیں گرفتار کرنے کی کوشش کی اسی دوران مرتضیٰ بھٹو کے محافظوں اور پولیس میں تلخ کلامی کے بعد فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو گیا جس کے نتیجے میں مرتضیٰ بھٹو شدید زخمی ہو گئے ان کے سینے میں پانچ گولیاں لگیں اور ایک گولی گلے کے پار ہو گئی ان کی گاڑی بھی گولیوں سے چھلنی ہو گئی زخمی ہونے کے ۵۵ منٹ بعد انہیں مڈایسٹ ہسپتال پہنچایا گیا، وہ دو تین گھنٹے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہے جس ہسپتال میں انہیں پہنچایا گیا اس میں مناسب سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ انہیں کسی اور ہسپتال میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی ان کی جان بچانے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور وہ رات بارہ بجے دم توڑ گئے۔ مرتضیٰ بھٹو کے علاوہ ان کے قریبی ساتھی عاشق جتوئی بھی فائرنگ کے نتیجے میں چھ افراد سمیت ہلاک ہو گئے۔ (۱۱۵) تاہم میر مرتضیٰ کی ہلاکت بے نظیر حکومت کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔

بڑی اپوزیشن جماعت مسلم لیگ (ن) جس نے ۲۷ اگست کو یہ اعلان کیا تھا کہ ۷

اکتوبر کو ایک حکومت مخالف احتجاجی ریلی نکالی جائے گی حسب اعلان مذکورہ تاریخ پر ایک ریلی کا اہتمام کیا جو پروگرام کے مطابق نیلا گنبد لاہور سے نکلی اور اسمبلی چوک تک اختتام پذیر ہوئی۔ شرکاء میں مولانا نورانی، مولانا نیازی، اجمل خٹک وغیرہ شامل تھے۔ (۱۱۶)

ریلی کے نکالے جانے کا ایک نکاتی پروگرام یہی تھا کہ "پاکستان بچاؤ، بے نظیر ہٹاؤ" جس میں خواتین کی بڑی تعداد بھی موجود تھی اور بلا مبالغہ ہزاروں افراد نے ریلی میں شرکت کی۔ نواز شریف نے اس موقع پر کہا کہ عوام کے بے مثال مارچ نے فیصلہ دے دیا کہ بے نظیر کی چھٹی ہوگئی اس ریلی کا ایک غیر اخلاقی پہلو یہ تھا کہ کچھ لوگوں نے پنجاب اسمبلی کی عمارت پر حملہ کر کے اس کا مرکزی دروازہ اور بالکونی توڑ ڈالی اور اندر گھس کر توڑ پھوڑ کی۔ سابق وزیر اعظم جونیجو اور سابق صدر ضیاء الحق کی تصاویر کے شیشے توڑ ڈالے۔ قائد اعظم کی تصویر کو کھینچ کر نیچے گرا دیا اسی دوران یہ افواہ پھیل گئی کہ پولیس نے چار کارکنوں کو گرفتار کرلیا ہے اس پر مشتعل ہجوم نے اسمبلی کے دروازے کو آگ لگا دی جنگلے اور لائٹیں توڑ دیں پولیس نے زبردست شیلنگ کی جسکی شدت سے متعدد افراد بیہوش ہوگئے ایک شخص پیٹ میں گولی لگنے سے زخمی ہوگیا۔ (۱۱۷)

۱۸ اکتوبر کو قائد اعظم کی تصویر کی بے حرمتی کے واقع پر سینٹ میں زبردست ہنگامہ آرائی ہوئی حکومت نے کہا کہ اس سے اپوزیشن کے چہرہ بے نقاب ہوگیا جبکہ جواب آں غزل کے طور پر الزام لگایا کہ عوامی ردعمل کا رخ موڑنے کے لیے حکومت نے ایجنسیوں کے ذریعہ بابائے قوم کی تصویر کی بے حرمتی کا قابل مذمت واقعہ کرایا۔ (۱۱۸)

اسی روز مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا فضل الرحمٰن اور غلام مصطفیٰ جتوئی نے صدر فاروق خان لغاری سے ملاقاتیں کیں۔ جتوئی سے بات چیت کرتے ہوئے صدر نے کہا کہ اگر حکومت نے میرے خط (۱۱۹) ☆ کو سنجیدگی سے نہیں لیا تو اسے پچھتانا ہوگا۔ مولانا نورانی کے بقول صدر پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ مارچ سے قبل کچھ ہونے والا تھا (۱۲۰)۔

۱۷ اکتوبر کو صدر لغاری نے وزیر اعظم کے نام اپنے ایک خط میں ان کی توجہ اس

☆ ۶ اگست کو صدر لغاری نے وزیر اعظم کو متنبہ کیا کہ اسمبلیوں کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں۔ قانون سازی کے بجائے آرڈیننس جاری کرنا پڑتے ہیں ملک و قوم کے مفاد میں نہ ہوا تو اسمبلی توڑنے کے آئینی اختیار کے استعمال کی نوبت آسکتی ہے۔ (غفور، ۵۶۰)

جانب مبذول کرائی کہ بعض وفاقی وزراء اور حکومتی ارکان پارلیمنٹ مملکت کے انتظامی معاملات میں بے جا مداخلت کے مرتکب ہو رہے تھے۔ وزیر اعظم اس امر کو یقینی بنائیں کہ آئندہ سرکاری افسران کی تقرریوں، تبادلوں اور دیگر امور میں مداخلت نہیں ہوگی۔ وزیر اعظم ہاؤس میں اس خط سے کھلبلی مچ گئی۔ بے نظیر نے صدر کو یقین دلایا کہ ان کی تجاویز پر سختی سے اور سنجیدگی سے عملدرآمد کرایا جائے گا۔ (۱۲۱)

صدر فاروق لغاری نے بے نظیر کے نام ایک اور خط میں یہ اعتراض کیا کہ حکومت نے احتساب بل کے مسودہ کی کابینہ میں منظوری لینے اور اسے اسمبلی میں پیش کرنے سے قبل صدر کو باضابطہ طور پر اطلاع نہ دے کر آئین کے آرٹیکل ۴۶ کی خلاف ورزی کی تھی (۱۲۲)۔ اس آرٹیکل کے تحت وزیر اعظم کا فرض تھا کہ وہ صدر کو کابینہ کے فیصلوں اور قانون سازی کے بارے میں تجاویز سے مطلع رکھیں۔ صدر نے اسپیکر سے قومی اسمبلی سے احتساب کے بارے میں قانون سازی کی تفصیل طلب کرلی نواز شریف نے کہا کہ مذکورہ بل عدلیہ کو یرغمال بنانے اور آئینی اداروں کو حکومت کا تابع فرماں بنانے کی ایک سازش تھی۔ ☆ (۱۲۳)

وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے صدر لغاری سے ۱۲ اکتوبر کو ملاقات کر کے احتساب بل سے متعلق اپنا موقف واضح کیا لیکن اس ملاقات میں تعلقات میں کسی بہتری کے بجائے مزید تلخیوں ہی میں اضافہ ہوا۔ بعد ازاں بے نظیر نے آرمی چیف سے بھی ملاقات کی لیکن یہ بھی بے فائدہ ثابت ہوئی (۱۲۴)۔ بے نظیر نے اس حقیقت کے کماحقہ ادراک کے باوجود کہ انہیں پارلیمنٹ میں مطلوبہ اکثریت حاصل نہیں، انہوں نے تیرہویں آئینی ترمیم کا بل قومی اسمبلی میں پیش کردیا جو صدر مملکت سے مزید مخالفت کا سبب بنا۔ (۱۲۵)

اپوزیشن پارٹیوں کے احتجاجی پروگرام اپنے عروج تھے۔ جماعت اسلامی، جے یو پی اور دیگر جماعتوں نے ۲۷ اکتوبر کو اسلام آباد میں دھرنا دینے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ جس کی زور و شور سے تیاریاں کافی عرصے سے جاری تھیں۔ دھرنے سے نپٹنے کے لیے حکومت نے بھی جوابی اقدامات کر رکھے تھے۔ تاہم چاروں طرف سے ناکہ بندی کے باوجود ہزاروں افراد دھرنا پروگرام میں شرکت کے لیے مری روڈ راولپنڈی پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ قاضی جب

☆ اس سرکاری بل میں ۳۲ ارکان اسمبلی کو یہ اختیار دینا تجویز کیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی جج کو جبری چھٹی پر بھیج سکتے تھے جو کہ سراسر غیر آئینی اقدام تھا۔

اچانک مری روڈ پر نمودار ہوئے تو ان کا پرجوش نعروں سے استقبال کیا گیا۔ دھرنے میں قاضی صاحب، مولانا شاہ احمد نورانی، اعجاز الحق، شیخ رشید احمد، جاوید ہاشمی، جنرل کے ایم اظہر، سید منور حسین، حافظ ادریس، میاں مقصود، ڈاکٹر کمال، مولانا عبدالجلیل، تحریک جعفریہ کے رہنما و اراکین، اور دیگر گئی رہنما کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے اسلام آباد کی طرف بڑھے، تو زبردست شیلنگ شروع ہوگئی۔ فیض آباد چوک سے لیاقت آباد تک آٹھ کلومیٹر کا علاقہ سارا دن میدان جنگ بنا رہا۔ ہزاروں کی تعداد میں شیل اور گولے پھینکے گئے اس کے باوجود قاضی، مولانا نورانی، اور دیگر رہنما ٹرک پر بیٹھے رہے (۱۲۶)۔ قاضی نے مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم لاٹھی اور گولی سے خوفزدہ نہیں وزیر اعظم ہاؤس خالی کرائیں گے مولانا نورانی نے کہا کہ حکومت کو گرا کر دم لیں گے۔ آنسو گیس کے بادلوں میں جلوس نے مولانا نورانی کی قیادت میں نماز ظہر ادا کی۔

اس سے اگلے دن بھی ہزاروں مظاہرین رکاوٹوں، وحشیانہ لاٹھی چارج، اندھا دھند شیلنگ اور فائرنگ کے باوجود سید منور حسین کی قیادت میں پارلیمنٹ ہاؤس پہنچنے میں کامیاب ہو گئے سینکڑوں کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ ۲۹ اکتوبر کو بھی جلسے جلوسوں کا سلسلہ جاری رہا (۱۲۷)

حکومت ابھی دھرنے کے صدمے سے سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ منظور وٹو کیس کے فیصلے کے دن قریب آگئے سماعت کی تکمیل کے بعد عدالت عالیہ نے اپنا فیصلہ محفوظ کر لیا تھا (۱۲۸)۔ وٹو کی وزیر اعلیٰ کے عہدہ پر بحالی کے قوی امکانات کے پیش نظر حکومت نے پنجاب اسمبلی کے اراکین کو مختلف محفوظ مقامات پر منتقل کرنا شروع کر دیا صدر نے عدالتی فیصلے سے قبل ہارس ٹریڈنگ کی اطلاعات پر اپنی تشویش کا اظہار کیا اور ہدایت کی کہ عدالتی فیصلوں پر اس کی روح کے مطابق عمل کرایا جائے اور بدعنوانیوں کی روک تھام کی جائے۔ (۱۲۹)

بے نظیر نے یکم نومبر ۱۹۹۶ء کو ایوان صدر سے ملاقات کر کے منظور وٹو کیس پر تبادلہ خیال کیا اور ان کی ہدایت پر عمل درآمد کی یقین دہانی کرائی (۱۳۰) لیکن اس یقین دہانی کے باوجود ۲ نومبر کو پنجاب اسمبلی کے متعدد ارکان کو مری، پشاور، مظفر آباد، سوات اور کراچی منتقل کر دیا گیا اور دس صوبائی وزراء کو نگرانی کے لیے ان کے ہمراہ مختلف مقامات پر بھیجا گیا۔ (۱۳۱)

اس صورتحال کے تناظر میں منظور وٹو نے صدر لغاری کے نام ایک خط لکھا کہ وہ ان غیر آئینی اقدامت کو رکوائیں۔ (۱۳۲)

حسب توقع ۳ نومبر ۱۹۹۶ء کو لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خلیل الرحمن، مسٹر جسٹس منیر اے شیخ اور مسٹر جسٹس ملک محمد قیوم پر مشتمل فل بنچ نے وٹو حکومت بحال کر دی اس طرح وہ چھٹی مرتبہ وزیر اعلیٰ بنے (۱۳۳)۔☆

وٹو کی بحالی کے فوراً بعد پیپلز پارٹی اور اس کی حلیف جماعتوں کے ۸۵ ارکان اسمبلی نے اسی روز ایک بج کر ۲۵ منٹ پر ان کی حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد، اسمبلی سیکریٹریٹ میں جمع کرادی (۱۳۴)۔ یہ اس بات کی پیش بندی تھی کہ وہ اسمبلی توڑنے کی ہدایت نہ دے سکیں کیونکہ آئینی لحاظ سے جس سربراہ حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد داخل کرائی جا چکی ہو وہ اسمبلی کی ایڈوائس نہیں دے سکتے اسی روز وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے اس ایوان صدر میں صدر لغاری سے ایک اہم ملاقات کی (۱۳۵)۔ بری فوج کے سربراہ بھی اس ملاقات میں موجود تھے وٹو حکومت کی بحالی کے مضمرات اور گورنر پنجاب راج سروپ کو سبکدوش کرنے کے معاملات زیر غور آئے لیکن اب حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ بے نظیر کے ترکش میں کوئی تیر اور شاہی کھیل کا کوئی پتہ باقی نہیں بچا تھا۔ صدر فاروق لغاری نے منگل ۵ نومبر کی شب دو بجے آئین کے آرٹیکل ۵۸ (۲) بی (۱۳۶) کے تحت اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے قومی اسمبلی کو توڑ دیا جس کے نتیجے میں بے نظیر حکومت برطرف کر دی گئی۔☆☆

حکومت کے خاتمے کے اعلان سے قبل ہی تمام ایئر پورٹ سیل کر دیئے گئے تھے مسلح افواج نے ملک کے اہم مقامات اور حساس تنصیبات پر اپنے فرائض سنبھال لیے۔ پاک فوج نے وزیر اعظم ہاؤس کا انتظام سنبھال کر وہاں موجود سیکیورٹی کے عملے کو فارغ کر دیا (۱۳۷)۔ فوج نے رات کے سوا ایک بجے گورنر ہاؤس لاہور کا بھی محاصرہ کر لیا خاردار تاریں

☆ عدلیہ نے اپنے متفقہ فیصلے میں لکھا کہ گورنر دس روز سے پہلے ان سے اعتماد کا ووٹ لینے کے لیے نہیں کہیں گے نیز گورنر ارکان اسمبلی کی حاضری اور اسی ماحول کو یقینی بنائیں جس میں وہ آزادانہ ماحول میں اپنے ووٹ کا حق استعمال کر سکیں نیز ہارس ٹریڈنگ کی روک تھام کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

☆☆ اسمبلی توڑے جانے سے قبل صدر اور وزیر اعظم کے درمیان قریباً چھ گھنٹے تک طویل ملاقات ہوئی صدر کے اصرار کے باوجود بے نظیر اسمبلی توڑنے کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اس ملاقات کے بعد صدر نے اپنے ساتھیوں کو طلب کیا اور اسمبلی برخواست کرنے کا فرمان تیار کرنے کی ہدایت جاری کر دی۔ (غفور، بحوالہ سابقہ، ص ۶۱۹)

بچھا کر اس کا راستہ بند کر دیا گیا کراچی میں بھی گورنر ہاؤس اور وزیر اعلیٰ ہاؤس پر رینجرز متعین کر دی گئی فوج کو اپنے اقدامات کے خلاف کہیں بھی کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بینظیر سمیت تمام ارکان اسمبلی کے بیرون ملک جانے پر پابندی لگا دی گئی (۱۳۸)۔ وزیر اعظم سیکریٹریٹ، وزیر اعظم ہاؤس، انٹیلی جنس بیورو، وزیر اعظم اور حیدر آباد، کوئٹہ، نوشہرہ اور مردان کے بیورو دفاتر کا ریکارڈ سیل کر دیا گیا۔ (۱۳۹)

صدر لغاری نے قومی اسمبلی کے سابق اسپیکر ملک معراج خالد کو نگران وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ ۶ نومبر کی شام ایوان صدر میں معراج خالد اور ان کی کابینہ کے نو اراکین، صاحبزادہ یعقوب، شاہد حامد، عمر خان آفریدی، عابدہ حسین، شفقت محمود، ارشاد حقانی، جاوید جبار، بریگیڈیئر صادق نواز اعوان، اور ڈاکٹر زبیر نے ایک سادہ تقریب میں اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا۔ صدر لغاری نے ان سے حلف لیا۔ اگلے دن وفاقی کابینہ میں مزید تین وزراء فخر الدین جی ابراہیم، فرید اللہ خان اور عبداللہ جے میمن کا اضافہ ہو گیا بعد ازاں مزید تین وفاقی وزراء افضل خان، ڈاکٹر غفار جتوئی اور ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ نے اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا۔ (۱۴۰)

قومی اسمبلی کی تحلیل اور وفاقی حکومت کی برطرفی کے بعد چاروں صوبوں میں بھی نگران حکومتیں بنائے جانے کے عمل کا آغاز ہو گیا۔ سندھ، سرحد اور بلوچستان میں اس کی تکمیل جلد ہو گئی لیکن صوبہ پنجاب میں قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے اس میں تاخیر ہو گئی۔ ۱۱ نومبر کو پیپلز پارٹی کے رہنما اور سابق وزیر خارجہ طارق رحیم کو پنجاب کا گورنر بنا دیا گیا۔ ۱۶ نومبر کو وزیر اعلیٰ وٹو سمیت پنجاب اسمبلی کے ۱۳۸ اراکین نے اپنے استعفیٰ پیش کر دیے۔ (۱۴۱) اگرچہ عدم اعتماد کی تحریک نمٹانے کے لیے سپریم کورٹ نے حکم دیا تھا کہ وہ ۱۷ نومبر کو اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کریں۔ لیکن وہ اس سے ایک روز قبل خود ہی مستعفی ہو گئے۔ گورنر نے پیپلز پارٹی کے میاں افضل حیات کو پنجاب کا نگران وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ (۱۴۲)

۱۸ نومبر کو صدر نے احتساب آرڈیننس ۱۹۹۶ء جاری کر دیا جس کے تحت کرپٹ افراد کے لیے سات سال قید تمام جائیداد کی ضبطی، سرکاری عہدہ سے برطرفی اور عوامی نمائندگی کے لیے پانچ سال تک نااہل قرار دیا جانا شامل تھا صدر مملکت، گورنر اور مسلح افواج کے سربراہوں کو احتساب سے استثنیٰ دیا گیا۔ (۱۴۳)

بے نظیر حکومت اپنی آئینی مدت کا محض نصف ہی طے کر سکی تھی کہ اس کے خلاف آئینی اقدامات نے اسے طاقت کے تمام مراکز سے محاذ آرائی کی طرف دھکیل دیا اور وزیر اعظم مسائل کے گرداب میں دھنستی چلی گئیں۔ اگست ۱۹۹۰ء میں اپنی حکومت کی پہلی برطرفی کے بعد بے نظیر نے اعتراف کیا تھا کہ اپنے دور حکومت میں ان سے بہت سی غلطیاں سرزرد ہوئیں۔ فوج اور صدر کے ساتھ انہوں نے افہام و تفہیم سے کام نہیں لیا ان کی صفوں میں تجربہ کار افراد کی کمی تھی انہیں اگر دوبارہ اقتدار مل گیا تو وہ ایسی غلطیوں کا اعادہ نہیں کریں گی۔ توقعات کے خلاف بے نظیر کو جلد ہی اکتوبر ۱۹۹۳ء میں دوسری مرتبہ اقتدار حاصل ہو گیا لیکن اب تجربہ کار بے نظیر نے سابقہ غلطیوں کو زیادہ شدت کے ساتھ دہرایا۔ ہر ایک سے زبردست محاذ آرائی مول لے لی اصلاح کے ہر مشورہ کو پائے استحقاق سے ٹھکرا دیا اپنی پارٹی کے صدر لغاری کو ان کے عہدہ کے شایان شان مقام دینے کی بجائے ہر کرپشن اور آئینی خلاف ورزی میں انہیں اپنی ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو ۳ نومبر ۱۹۹۶ء کو بہت تاخیر کے ساتھ بے نظیر نے اعتراف کیا کہ انہوں نے فوج، عدلیہ اور صدر کی مخالفت مول لے لی۔ اس آخری گھڑی میں بے نظیر نے ۳ نومبر ہی کو صدر لغاری کے ساتھ ایک طویل ملاقات کی جس میں دونوں کے درمیان کوئی مفاہمت نہ ہو سکی۔ جو بالآخر اسمبلی کی تحلیل پر منتج ہوئی۔ بے نظیر کا دوسرا دور حکومت ارباب اختیار کے لیے کئی طرح کے درس ہائے عبرت لیے ہوئے تھا مگر صاحبان اقتدار اپنی غلطیوں سے کم ہی سیکھتے ہیں۔

ملی یکجہتی کونسل، نواز شریف دور میں
(۱۹۹۷ء......۱۹۹۹ء)

بے نظیر کی حکومت ۴ اور ۵ نومبر ۱۹۹۶ء کی درمیانی شب ختم کی گئی اور پیپلز پارٹی کے ہی ایک کہنہ مشق مگر سادہ طبیعت سیاستدان ملک محمد معراج خالد کو نگران وزیراعظم مقرر کر دیا گیا (۱۴۴)۔ جن کے ذمہ ۹۰ روز کے اندر اندر انتخابات کروا کر اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کر دینا تھا وہ ان چند ایک افراد میں شامل تھے جنہیں صدر فاروق خان لغاری نے قومی اسمبلی کی تحلیل سے قبل اعتماد میں لے کر بتایا تھا کہ وہ بے نظیر حکومت کو رخصت کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کرانے میں ملی یکجہتی کونسل میں شامل دینی سیاسی جماعتوں نے بالخصوص جماعت اسلامی نے انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد نے لانگ مارچ، ٹرین مارچ اور دھرنے دینے کا سلسلہ شروع کر کے بے نظیر حکومت کی بنیادیں ہلا دیں۔ بے نظیر بھٹو کو بخوبی علم تھا کہ قاضی حسین احمد کے سردار فاروق خان لغاری کے ساتھ خصوصی روابط تھے اور ان کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کی پشت پر لغاری تھے (۱۴۵)۔

بے نظیر، لغاری اختلافات میں ایک بات یہ بھی تھی کہ انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ میجر مسعود شریف نے ایوان صدر سے جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر منصورہ لاہور میں قاضی حسین احمد کی کی جانے والی کالیں ٹیپ کی تھیں۔ انٹیلی جنس رپورٹوں کے مطابق صدر نے قاضی کو یقین دہانی کرائی تھی کہ آئندہ سیٹ اپ میں انہیں نمایاں مقام ملے گا (۱۴۶) لیکن ایسا بوجوہ ممکن نہیں تھا کیونکہ جماعت اسلامی کا امیج، مغربی دنیا کی نگاہ میں ایک بنیاد پرست مذہبی جماعت کے طور پر جانا جاتا تھا۔ جب بے نظیر کو اپنی حکومت کے خلاف ہونے والی سازشوں کا علم ہوا تو انہوں نے ۲ ستمبر ۱۹۹۶ء میں اپنے بھائی میر مرتضٰی کی ہلاکت کے بعد نواز شریف سے

رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ اپوزیشن ان کے ساتھ مل کر آٹھویں ترمیم ختم کرنے کے لیے مذاکرات پر آمادہ ہو جائے جبکہ میاں نواز شریف کا مطالبہ تھا کہ نئے انتخابات مارچ ۱۹۹۷ء سے قبل کرائے جائیں جبکہ بے نظیر بھٹو کی خواہش تھی کہ اپوزیشن جنوری ۱۹۹۸ء میں انتخابات پر آمادہ ہو جائے۔ تاہم ایک وقت پر بے نظیر اس کے لیے تیار تھیں لیکن جسٹس سجاد علی شاہ سے اختلافات اور ایوان صدر سے ہونے والی سازشوں کے باعث وہ بیک وقت کئی محاذوں پر الجھ کر رہ گئیں (۱۴۷)۔ ایک طرف انہیں پنجاب میں میاں منظور وٹو سے خطرہ تھا تو دوسری طرف سندھ میں ایم کیو ایم نے ان کے خلاف اعلان بغاوت کر رکھا تھا جبکہ بلوچستان میں نواب اکبر بگٹی مسلسل اس کوشش میں تھے کہ کسی نہ کسی طرح پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہو جائے اس طرح رفتہ رفتہ حالات محترمہ بے نظیر بھٹو کی گرفت سے نکلتے چلے گئے۔ (۱۴۸)

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جس حکمران کو فوج یا صدر نے اقتدار سے محروم کر کے الیکشن کروائے ہوں وہ اقتدار میں آجائے۔ بے نظیر کو اس صورتحال کا بہت اچھی طرح ادارک تھا یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ۳ فروری ۱۹۹۷ء کو ہونے والے انتخابات میں دلچسپی ظاہر نہ کی اس کے برعکس وہ اس کوشش میں تھیں کہ ان کی پارٹی کسی اور شخص کو پارلیمانی لیڈر منتخب کرے (۱۴۹)۔

لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود تھی کہ عوام اب بھی ووٹ پیپلز پارٹی کو نہیں بلکہ بھٹو خاندان کو دیتے تھے اگر بے نظیر نے عام انتخابات میں حصہ نہ لیا تو پیپلز پارٹی کی جیت کے امکانات ہو جاتے بہتر تھا کہ بے نظیر اس فیصلے پر قائم رہتی کیونکہ اس طرح ان کا بھرم باقی رہ جاتا کیونکہ آئندہ حالات ان کے لیے اور ان کی پارٹی کے لیے نہایت سخت تھے انہیں بھی اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ آنے والے دنوں میں ان کی پارٹی کے ساتھ کیا ہونیوالا تھا تاہم اس بات سے قطع نظر اس کے پیش نظر لغاری سے انتقام لینا سرفہرست تھا (۱۵۰)۔ اس لیے انھوں نے پہلی فرصت میں نواز شریف سے ملاقات کر کے انہیں لغاری سے محتاط رہنے کی تلقین کی۔ نواز شریف کو بھی ۱۷ نومبر ۱۹۹۶ء تک یہ علم نہ تھا کہ لغاری کیسا کھیل کھیلنا چاہتے تھے تاہم ۱۸ نومبر کو وہ اس وقت چوکنا ہوئے جب لغاری نے فوج کی مدد سے احتساب سیل قائم کر دیا اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک ایسا آرڈیننس جاری کیا جس کی رو سے احتساب کا عمل ۱۹۸۶ء سے شروع کرنے کا اعلان ہوا (۱۵۱)۔ اس منصوبے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے

وزیر قانون فخر الدین جی ابراہیم نے کہا کہ احتساب کے عمل کو تیزی کے ساتھ مکمل کرنے کے لیے تین رکنی عدالتیں قائم کی جائیں جو دو ماہ کے اندر کرپٹ عناصر کے خلاف فیصلہ کرلیں گی اور ان عدالتوں سے سزا پانے والے سیاستدانوں کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی (۱۵۲)۔ اس فیصلے کے اعلان کے بعد صدر لغاری نے جسٹس (ریٹائرڈ) غلام محمد مرزا کو احتساب کمشنر مقرر کردیا۔ نواز شریف نے جب یہ دیکھا کہ ان کے گرد جال بنانا شروع کر دیا گیا ہے تو انہوں نے نگران حکومت پر یہ بات واضح کردی کہ اگر انہیں احتسابی عمل کا نشانہ بنا کر سیاست سے آؤٹ کرنے کی کوشش کی گئی تو انتخابات کے بائیکاٹ پر مجبور ہوجائیں گے (۱۵۳)۔ صدر لغاری نے نواز، بے نظیر روابط کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر نواز شریف سے رابطہ کر کے انہیں یقین دلایا کہ نگران حکومت انہیں پارلیمانی سیاست سے دور کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ ادھر بے نظیر نے عدالتی جنگ کے ذریعے اپنی حکومت کی بحالی کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انجام انہیں بھی معلوم تھا (۱۵۴)۔ سپریم کورٹ نے ۱۲ جنوری ۱۹۹۷ء کو متفقہ طور پر یہ فیصلہ دیا کہ آٹھویں ترمیم آئین کا جائز حصہ ہے اور یہ ترمیم پارلیمانی نظام کے حق میں بہتر ہے سید سجاد علی شاہ کی سربراہی میں قائم فل بنچ نے ۲۹ جنوری ۱۹۹۷ء کو ۵ نومبر ۱۹۹۶ء کے تحلیل اسمبلی کے صدارتی اقدام کو درست قرار دے دیا۔

ملی یکجہتی کونسل میں شامل دینی سیاسی جماعتوں کو سردار فاروق احمد خان لغاری سے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ وہ محض پیپلز پارٹی کو شکست دلوانے کے لیے قرضہ چوروں اور ٹیکس نادہندگان کو خصوصی قوانین بنا کر تحفظ فراہم کریں گے کیونکہ ۱۰ نومبر ۱۹۹۶ء کو جب قاضی حسین احمد نے ایوان صدر میں صدر سے ملاقات کی تو انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ آئین کی دفعہ ۶۲ اور ۶۳ پر پوری طرح عمل ہوگا جس کا مطلب تھا کہ حکومت کسی بدعنوان اور بری شہرت کے حامل سیاستدان کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دے گی لیکن عملی طور پر ۱۹ دسمبر ۱۹۹۶ء کو تمام اصول بالائے طاق رکھ دیئے گئے (۱۵۶)۔ یہ وجہ تھی کہ قاضی نے ۲۰ دسمبر ۱۹۹۶ء کے بعد انتخابات کا بائیکاٹ کرنے پر غور شروع کردیا (۱۵۷)۔

جمعیت علمائے پاکستان اور ملی یکجہتی کونسل کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی اس صورتحال کا نہایت غور سے جائزہ لے رہے تھے انہوں نے قاضی کی آواز کے ساتھ آواز ملاتے ہوئے انتخابات ۱۹۹۷ء کا بائیکاٹ کردیا اور اپنے تمام قومی وصوبائی اسمبلیوں کے امیدواروں

کو ہدایت کی کہ وہ اپنے کاغذات نامزدگی واپس لے لیں اور انتخابات کا بائیکاٹ کریں۔ مولانا شاہ احمد نورانی اور جنرل (ر) کے ایم اظہر نے کراچی سے تحصیل علی پور میں اپنے الیکشن انچارج ملک غلام شبیر لنگڑیال ایڈووکیٹ کو ہدایت کی کہ وہ علی پور سے ان کے کاغذات نامزدگی واپس لے لیں اسی طرح ملتان شہر، این اے ۱۱۵ سے جمعیت علمائے پاکستان کے امیدوار مولانا حامد سعید کاظمی کو بھی اسی قسم کی ہدایات جاری کردی گئیں۔ جے یو پی کے قریبی حلقوں کے مطابق بائیکاٹ کا فیصلہ کراچی میں جمعیت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے کیا۔ (۱۵۸)۔

جمعیت کے سربراہ مولانا نورانی نے ایک پرہجوم پریس کانفرنس میں الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان کیا انہوں نے کہا کہ احتساب تیز رفتاری کے ساتھ ہونا چاہیے تھا لیکن اس کی رفتار افسوس ناک حد تک سست ہے اس سے قوم میں جو مایوسی پھیل رہی ہے ہمیں اس پر اعتراض نہیں قرضوں اور یوٹیلٹیز کے بلوں کو وصول نہ کیا جائے لیکن آرٹیکل ۶۲ اور ۶۳ پر موثر عمل درآمد کو یقینی نہیں بنایا گیا جس کی وجہ سے قوم کو خدشہ ہے کہ وہی بھیڑیئے، بدعنوان اور بددیانت لوگ جن کو نکالا گیا ہے دوبارہ برسر اقتدار آسکتے ہیں۔ (۱۵۹)

تاہم بعض صحافتی حلقوں نے جماعت اسلامی اور جے یو پی کے انداز سیاست کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا:

انتخابات کا بائیکاٹ کرنے والوں کا پلیٹ فارم وسیع ہوتا جارہا ہے جو ایک سے بڑھ کر تین ہوگئے ہیں اور جمعیت علمائے پاکستان نورانی گروپ بھی بالآخر جماعت اسلامی کا ہم رکاب بن گیا ہے جبکہ تحریک منہاج القرآن نے سب سے پہلے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کیا تھا...... جماعت اسلامی کا کاروانِ احتساب بھرپور طریقے سے جاری ہے جس کے پشاور، لاہور، کوئٹہ اور کراچی کے منظم اور پرامن کاروانوں سے سیاسی حلقوں میں اس تاثر نے شدت پکڑی ہے کہ ان کاروانوں کو در پردہ سرکاری سرپرستی حاصل تھی.... جماعت اسلامی نے جس انداز سے ان کاروانوں کی صف بندی کی ہے اور تنظیم کا مظاہرہ کیا ہے ایک مثبت امر ہونے کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتوں کے لیے ایک سبق بھی ہے لیکن جماعت کی تحریک آئندہ کیا رخ اختیار کرتی ہے اس کے بارے میں حتمی فیصلہ تو وقت ہی کرے گا البتہ جہاں تک جمعیت علمائے پاکستان (نورانی) گروپ کا تعلق ہے تو گزشتہ ایک برس سے جے یو پی اور مسلم لیگ کے مابین "مذاکرات" کا کھیل جاری ہے کہ جے یو پی کے دونوں دھڑوں کو یکجا کیا جائے اور

ایک موثر قوت کی شکل دے کر اس کو مسلم لیگ کے ساتھ ملایا جائے ''مذاکرات مذاکرات'' کے اس کھیل میں جے یو پی کے دونوں دھڑوں کے پیر حضرت یعنی (یعنی نیازی گروپ کے پیر صاحبزادہ فضل کریم، نورانی گروپ کے پیر اعجاز ہاشمی اور دیگر حضرات) یہ کھیل کھیلتے رہے۔ جس میں کامیابیوں کی رپورٹس میاں شہباز شریف تک تواتر سے پہنچائی جاتی رہیں بعد ازاں میاں شہباز شریف کی گارڈن ٹاؤن میں پیر اعجاز ہاشمی کی رہائش گاہ پر باضابطہ ملاقاتیں بھی ہوئیں مگر بلآخر ٹکٹوں کی تقسیم کے مرحلے پر یہ ملاقاتیں بے نتیجہ ہوگئیں اور وہ تمام رنگ کافور ہو گئے جو جے یو پی کو منظم کر کے پاکستان مسلم لیگ کے ساتھ ملانے کے لیے مذاکرات کے کھیل میں خوش رنگ دکھائی دیئے تھے ....۸ جنوری کو شب دیر گئے تک جے یو پی اور مسلم لیگ کے مابین مذاکرات کا کھیل کھیلا گیا جس کے بعد جے یو پی کی طرف سے .... سر تسلیم خم کر لیا گیا البتہ مولانا نیازی نے یہ بیان جاری کر کے اپنی ''طرح داری'' کو ضرور برقرار رکھا ہے کہ مسلم لیگ نے جے یو پی کے بعض ایسے اہم امیدواروں کو ٹکٹ نہیں دیا جو نہ صرف آئین کی دفعات ۶۲ اور ۶۳ پر پورے اترتے تھے بلکہ سیاسی پس منظر کے حامل تھے اور علاقے میں با اثر بھی تھے ان کو ٹکٹ نہ دیا جانا افسوس ناک ہے .....جس انداز میں جے یو پی نیازی گروپ کی طرف سے مسلم لیگ کو انتباہ کیا گیا اسی طرح کا روایتی انداز جے یو پی نورانی گروپ نے بھی اختیار کیا جس کی جانب ایک طرف دینی جماعتوں کے اتحاد کے اجلاس میں اسلام آباد میں شرکت کی گئی مگر الیکشن لڑنے یا نہ لڑنے کا فیصلہ دو روز تک موخر کرنے کا اعلان کیا گیا جبکہ تحریک جعفریہ پاکستان، جمعیت علمائے اسلام کے دونوں دھڑوں کی طرف الیکشن بائیکاٹ نہ کرنے کا اعلان کر دیا جبکہ نورانی گروپ کی جانب سے ..... مسلم لیگ کی طرف سے مثبت جواب کی توقع برقرار رکھی گئی اور بلآخر جے یو پی نے الیکشن کا بائیکاٹ کر کے جماعت اسلامی کی ہم رکاب ہونے کا اعلان کر دیا...(۱۶۰)

ابھی سیاسی جماعتوں کی صف بندیوں اور بعض کے بائیکاٹ کا عمل جاری ہی تھا کہ ملکی حالات میں ایک دفعہ پھر دہشت گردی کا عنصر در آیا دسمبر ۱۹۹۶ء کے آخری ہفتے میں صوبائی محتسب جسٹس منیر اور تحریک جعفریہ کے مرکزی رہنما ذوالفقار نقوی کو قتل کر دیا گیا (۱۶۱)۔ یوں محسوس ہوتا تھا بعض نادیدہ قوتیں انتخابی عمل کو سبوتاژ کرنے کے لیے میدان میں اتر چکی تھیں ان واقعات سے عوام میں جس طرح بے چینی پھیلی اسے فوجی حلقوں میں بہت شدت سے

محسوس کیا گیا ان حالات میں فوج کے سربراہ جنرل جہانگیر کرامت کے سامنے کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ ملک میں مارشل لاء لگا کر نگران حکومت کو ہٹا دیتے اور کوئی نیا سیاسی سیٹ اپ سامنے لے آتے لیکن بین الاقوامی تناظر میں حالات اس امر کی اجازت نہیں دیتے تھے لہٰذا کور کمانڈروں کے ساتھ طویل صلاح و مشورے کے بعد فوج نے ''قومی و دفاعی و سلامتی کونسل'' بنانے کا فیصلہ کیا فوج ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کے سانحے کے بعد اس قسم کی کونسل کا تجربہ کر چکی تھی جو جنرل مرزا اسلم بیگ کی سرکردگی میں بنائی گئی تھی اس طرح ٦ جنوری ١٩٩٧ء کو وفاقی کابینہ کے اجلاس میں دس رکنی کونسل کی قیام کی تجویز منظور کر لی گئی اس طرح نگران سیٹ اپ چھیڑے بغیر ایک سپر کابینہ کا قیام عمل میں آ گیا جس میں فوج کے چار نمائندے شامل تھے یعنی چیئر مین جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی اور تینوں مسلح افواج کے سربراہ اس کے علاوہ وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب علی خان اور جاوید برکی بھی کونسل میں شامل تھے صدر اور وزیر اعظم کی کونسل میں موجودگی محض نمائشی (Show Piece) کے لیے تھی انتخابات کے انعقاد سے ایک ماہ قبل قومی و دفاعی کونسل کا قیام ہرگز ایک مستحسن قدم نہیں تھا اور ان اس کے لیے کوئی مناسب طریق اختیار کیا گیا لیکن اس کے باوجود مسلم لیگ نے کونسل کے قیام کی حمایت کر دی جبکہ بے نظیر بھٹو نے اسے سول مارشل لاء قرار دیا۔ جماعت اسلامی کے نزدیک کونسل کا قیام غیر آئینی اقدام تھا۔ (۱۶۲)

سینٹ میں کونسل کے قیام کے خلاف زبردست تقریریں ہوئیں اور پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ۱۹۷۷ء کے بعد پہلا موقع تھا کہ سیاستدانوں نے فوج کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا تاہم کونسل نے قائم ہونا تھا اور وہ ہو کر رہی فوج کی نگرانی میں عام انتخابات ۱۹۹۷ء کا انعقاد ہوا لیکن جس طرح حالات نواز شریف کے حق میں پلٹا کھایا وہ کسی کے سان گمان میں بھی نہیں تھا نتائج کے مطابق قومی اسمبلی میں ۲۰۲ کے ایوان میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کو ۱۳۴ سیٹیں ملیں جبکہ پیپلز پارٹی کو ۱۸ سیٹیں ملیں۔ پیپلز پارٹی کو پنجاب اور سرحد میں قومی اسمبلی کی کوئی سیٹ نہ مل سکی جبکہ بلوچستان میں صرف ایک نشست حاصل ہو سکی صوبائی نتائج کو صورتحال کچھ یوں تھی کہ پنجاب میں ۲۴۸ کے ایوان میں نواز شریف کو ۲۱۲ نشستیں ملیں جبکہ پیپلز پارٹی کو پنجاب میں صرف تین نشستیں ملیں (۱۶۳

نواز شریف نے انتخابات میں کامیابی کے بعد عمرہ ادا کیا اور ۸ فروری ۱۹۹۷ء کو

ایوان صدر جا کر صدر لغاری سے ملے (۱۶۴)۔ اس سے اگلے روز وہ فوج کے سربراہ جنرل جہانگیر کرامت سے ملے (۱۶۵)۔ پاکستان مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی کا پہلا اجلاس ۱۴ فروری ۱۹۹۷ء کو منعقد ہوا (۱۶۶)۔ جس کے دوران اے این پی کے اسفند یار ولی نے وزیراعظم کے لیے نواز شریف کا نام تجویز کیا جسے اجلاس نے متفقہ ور پر منظور کر لیا جبکہ ۱۵ فروری کو قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں ارکان اسمبلی نے اپنی نئی ذمہ داریوں کا حلف اٹھایا (۱۶۷)۔ ۱۷ فروری ۱۹۹۷ء کو نواز شریف نے وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا نواز شریف کو ۱۷۷ جبکہ پیپلز پارٹی کے آفتاب شعبان میرانی کو ۱۶ ووٹ ملے (۱۶۸)۔ ۱۹ فروری کو نواز شریف نے قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لیا اس روز انہیں ملنے والے ووٹوں کی تعداد ۱۸۱ ہو گئی (۱۶۹)۔ یوں ملک میں ایک نئے پارلیمانی دور کا آغاز ہو گیا ملی یکجہتی کونسل جسے ۱۹۹۵ء میں فرقہ واریت اور دہشت گردی کی روک تھام کے لیے ایک غیر سیاسی اور غیر انتخابی اتحاد کے طور پر سامنے لایا گیا تھا اپنے ضابطہ اخلاق کے تحت آخر دم تک غیر سیاسی ہی رہی یقیناً اس کو غیر سیاسی رکھنے میں اس کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی کا بڑا ہاتھ تھا (۱۷۰)۔ ان کے قول وفعل کی یہی یکسانیت ان کے انداز سیاست کا طرح امتیاز تھی اگرچہ کونسل کو ناکام بنانے کی ہر سطح پر کوشش کی گئی اسی طرح کے الزامات اور طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا گیا لیکن اس میں شامل دینی جماعتوں نے با اشتعال اس کے مقاصد کے حصول کے لیے اپنی کوشش جاری رکھیں تاہم یہ حقیقت بھی محل نظر رہے کہ اس میں شامل جماعتیں اپنے اپنے پلیٹ فارم سے حکومت مخالف تحریکیں چلاتی رہیں جس میں سب سے کامیاب تحریک جماعت اسلامی کی تھی جو بالآخر حکومت کے خاتمہ کا سبب بنی (۱۷۱)۔ ملی یکجہتی کونسل کے کار پردازان اگر دینی ووٹ کو ایک موثر قوت کے طور پر استعمال کرنے کے لیے ملک کی تمام دینی جماعتوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر کھڑا کرتے تو یقیناً نواز شریف کی حکومت کو ایک مضبوط اپوزیشن کا سامنا کرنا پڑتا اور حالات نواز شریف کی شخصی آمریت کی طرف کبھی بھی نہ بڑھتے جنہوں نے اپنی پیش رو بے نظیر کی غلطیوں سے سبق سیکھنے کی بجائے غلطیوں کو مزید شدت سے دہرایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو تہائی کسی زائد مینڈیٹ والی حکومت کو خاموش فوجی انقلاب کا سامنا کرنا پڑا۔ عدلیہ سے محاذ آرائی اور آٹھویں آئینی ترمیم کے خاتمہ جیسے اقدامات نے نواز شریف کو بند گلی میں دھکیلنا شروع کر دیا (۱۷۲)۔
یکم اپریل ۱۹۹۷ء کو آٹھویں ترمیم ختم ہونے کے بعد نواز شریف اور سردار فاروق احمد خان

لغاری کے درمیان اقتدار کی جس جنگ کا آغاز ہوا تھا اس نے ۹ ماہ کے اندر جمہوری اداروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس طرح دو افراد کے درمیان شروع ہونے والی چپقلش ریاست کے تینوں ستونوں کے لیے خطرہ بن گئی (۱۷۳)۔

اگرچہ نواز شریف نے متعدد مواقع پر یقین دہانی کرائی تھی کہ ان کا عدلیہ سے کبھی جھگڑا نہیں ہوگا لیکن وہ زیادہ دیر اس بات پر قائم نہ رہ سکے اور قیام حکومت کے ۲ ماہ بعد یہ انہوں نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ کے ساتھ خصوصی عدالتوں کے قیام کے مسئلہ پر اختلافات پیدا ہو گئے ☆۔ مئی ۱۹۹۷ء میں اچانک دہشت گردی کی وارداتوں میں شدت آ گئی ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حکومت دہشت گردوں کے ہاتھوں بے بس ہو چکی تھی۔ ۶ مئی ۱۹۹۷ء کو وزیر داخلہ چوہدری شجاعت حسین کے قریبی عزیز اور جڑانوالہ کے ایس ایس پی اشرف مارتھ کو دہشت گردوں نے قتل کر دیا (۱۷۴)۔ جس کے بعد پنجاب میں خصوصی عدالتوں کے قیام پر غور کیا گیا پنجاب کے وزیراعلیٰ میاں شہباز شریف کی رائے یہ تھی کہ ایکٹ ۱۹۷۵ء کو بحال کر کے دہشت گردوں کو کم سے کم وقت میں سزا دینے کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کر دی جائیں اور حکومت نے سید سجاد علی شاہ کو اس تجویز سے آگاہ کیا تو انہوں نے کہا خصوصی عدالتوں کا قیام ملک میں متوازی عدالتی نظام قائم کرنے کے مترادف ہوگا (۱۷۵)۔
سید سجاد علی شاہ نے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف درج کیے جانے والے مقدمات ہائی کورٹس کو بھیج دے جن پر ایک ماہ کے اندر فیصلہ کر دیا جائے گا لیکن نواز شریف نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا کیونکہ معمول کے طریق کار پر عمل کرنے سے سنگین نوعیت کے مقدمات کا جلد فیصلہ ممکن نہیں تھا (۱۷۶)۔ چنانچہ میاں نواز شریف نے ۲۰ مئی ۱۹۹۷ء کو سید سجاد علی شاہ سے ملاقات کی اور انہیں امن عامہ کی صورتحال کے حوالے سے تفصیلی طور پر اپنے موقف سے آگاہ کرنے کے بعد قائل کرنے کی کوشش کی کہ خصوصی عدالتوں کے قیام کی تجویز منظور کر لیں مگر وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے (۱۷۷)۔ البتہ سجاد علی شاہ نے یہ رائے ظاہر کی سنگین نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ ۳ سے ۷ روز کے اندر کر دیا جائے گا جب نواز شریف نے دیکھا کہ سجاد علی شاہ کسی طور نہیں مان رہے تو ان کی چھٹی کا فیصلہ کر لیا گیا (۱۷۸)۔

☆ ایسی عدالتیں ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں بھی بنائی گئی تھیں اور انہیں سیاسی مخالفین کے خلاف مقدمات کا فیصلہ جلد کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

میاں نواز شریف نے حکومت اور عدلیہ کے درمیان تنازعہ شروع ہوتے ہی اقدامات شروع کردیئے سب سے پہلے انہوں نے صدارتی احتساب آرڈیننس کو غیر موثر کرایا جو نگران دور میں جاری کیا گیا تھا نواز شریف نے ۲۸ مئی ۱۹۹۷ء کو پارلیمنٹ سے ترمیمی احتساب بل منظور کرایا جس کے تحت صدر، وزیر اعظم اور گورنر حضرات بھی احتساب کے دائرے میں آگئے جبکہ احتساب کا عمل ۱۹۸۵ء کے بجائے ۱۹۹۰ء سے شروع کرنے کا قانون منظور کرلیا گیا۔ (۱۷۹)

اپوزیشن نے اس حکومتی اقدام پر زبردست احتجاج کیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ نواز شریف نے یہ فیصلہ محض اپنی کرپشن چھپانے کے لیے کیا (۱۸۰)۔ دراصل میاں منظور احمد وٹو نے نواز شریف کے خلاف ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۰ء تک کا وہ تمام ریکارڈ اکٹھا کر رکھا تھا جس کا تعلق صوابدیدی فنڈز کے غلط استعمال اور پلاٹوں کی سیاسی بنیادوں پر الاٹمنٹ سے متعلق تھا ترمیمی احتساب بل منظور پر لغاری بھی خاصے سیخ پا ہوئے کیونکہ وہ بھی اب احتساب کی زد میں آگئے تھے۔ تاہم اس وقت وہ حکومت کے خلاف بلا جواز کوئی بھی اقدام نہیں اٹھا سکتے تھے (۱۸۱)۔

دوسری طرف نواز شریف نے سید سجاد علی شاہ کی مخالفت کے باوجود انسداد دہشت گردی کی عدالتیں قائم کرنے کے لیے مسودہ قانون تیار کرالیا چنانچہ ۱۳ اگست ۱۹۹۷ء کو خصوصی عدالتوں کے قیام کا بل پارلیمنٹ سے منظور کروالیا گیا۔ (۱۸۲)

لیکن سجاد علی شاہ وقتی ہزیمت کے باوجود ہار نہ مانے اور صدر مملکت کو خط لکھا کہ وہ ۲۰ مارچ ۱۹۹۶ء کے فیصلے کی رو سے سپریم کورٹ کی پانچ خالی آسامیوں کو پر کریں بعد میں چیف جسٹس نے ۵ نئے جج مقرر کرنے کی سفارش کردی اور اس مقصد کے لیے صدر کو ایک سمری بھجوائی جس میں ججوں کی تعداد ۱۷ سے کم کرکے ۱۲ کرنے کی سفارش کی گئی تھی یعنی حکومت نے سپریم کورٹ کے پانچ خالی نشستوں پر نئے جج مقرر کرنے کے بجائے ان آسامیوں کو ہی ختم کردیا (۱۸۴)۔ سجاد علی شاہ کے استفسار پر صدر نے وضاحت کی کہ ان کے خط سے قبل ہی وہ ججوں کی کمی کے متعلق حکومتی سمری پر دستخط کرچکے تھے اسی اثناء میں نواز شریف نے ایک چال اور چلی کہ فوجی حلقوں کو مطمئن کرنے کے لیے انہوں نے جنرل جہانگیر کرامت کو چیئرمین جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی کا اضافی عہدہ بھی دے دیا جس کے باعث عسکری قیادت کے نواز شریف کے ساتھ اختلافات کی افواہیں دم توڑ گئیں۔ (۱۸۵)

میاں نواز شریف نے جب محسوس کیا کہ سید سجاد علی شاہ کے رویہ میں کوئی لچک نہیں

اور وہ معاملات سو فیصد اپنی مرضی کے مطابق سلجھانا چاہتے ہیں تو وہ بھی اپنے اصولی موقف پر ڈٹ گئے تاہم انہوں نے صورتحال کی نزاکت کے پیش نظر ۱۵ ستمبر ۱۹۹۷ء کو رات گئے اٹارنی جنرل چوہدری فاروق کو ہدایت کی کہ وہ اگلے روز سپریم کورٹ میں سید سجاد علی شاہ کے روبرو پیش ہوکر عدلیہ کو آگاہ کریں کہ حکومت ججوں کی تعداد میں کمی کا فیصلے کو واپس لے رہی ہے (۱۸۶) حالانکہ حکومت نے ۱۳ ستمبر کو شام ایک مسودہ قانون تیار کرلیا تھا جس کو پارلیمنٹ کے اجلاس میں پیش کرکے ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر میں کمی کرنا مقصود تھا۔ اس طرح چیف جسٹس کی عمر کو ۶۵ سال سے کم کرکے ۶۲ سال اور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی عمر ۶۲ سے کم کرکے ۶۰ سال کردیا جاتا لیکن صدر اور فوج کی مخالفت کے باعث وہ اسے پارلیمنٹ میں پیش نہ کرسکے (۱۸۷)۔ لیکن جسٹس سجاد علی شاہ نے بھی کسی قسم کی لچک کا مظاہرہ نہ کیا اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو ان کی سربراہی میں قائم ایک فل بنچ نے ۱۴ آئینی ترمیم معطل کردی نواز شریف نے استحکام اقتدار کے لیے پختہ اقدامات کر رکھے تھے انہوں نے ارکان اسمبلی کی بغاوت کے سدباب اور ہارس ٹریڈنگ کے توڑ کے لیے ۱۳ ویں جبکہ آٹھویں ترمیم کی خاتمہ کے لیے ۱۴ ویں ترمیم کروا کر اپنی طرف سے حکومت کے خلاف تمام خدشات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا تھا لیکن جسٹس سجاد انہیں اس طرح مضبوط نہیں دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ مضبوط وزیر اعظم کسی بھی لمحے کسی بھی طاقتی ستون کے خلاف کچھ بھی کرسکتا تھا (۱۸۸)۔ ۱۴ ویں آئینی ترمیم کی معطلی پر نواز شریف اور اس کے حامیوں کی طرف سے ردعمل ہونا ایک فطری امر تھا چنانچہ نواز شریف نے سید سجاد علی شاہ پر کھل کر تنقید کی اور انہوں نے رائے عامہ بیدار کرنے کے لیے مسلسل یہ اختیار کیا کہ چیف جسٹس نے لوٹا کریسی بحال کردی ہے جس کا چیف جسٹس نے سخت نوٹس لیا اور نواز شریف کو تین نومبر کو توہین عدالت کا نوٹس بھجوادیا۔ (۱۸۹)

نواز شریف کو سپریم کورٹ کے اس اقدام پر ذرا حیرت نہیں ہوئی کیونکہ وہ تو اس بات کی بھی توقع کر رہے تھے کہ سپریم کورٹ انہیں صفائی کا موقع دیئے بغیر ہی وزارت عظمٰی سے محروم کرسکتی ہے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۷ء کی رات نواز شریف کے پاس دو ہی راہیں تھیں کہ آئین میں ترمیم کرکے سجاد علی شاہ کو فارغ کردیا جائے یا سپریم کورٹ کی سفارشات کو تسلیم کرلیا جائے (۱۹۰)۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ موخر الذکر آپشن پر عمل کیا جائے لیکن اس کے لیے محض ایک نوٹیفکیشن جاری کرنے کے بجائے نواز شریف خود پارلیمنٹ سے خطاب کریں گے جنرل

جہانگیر کرامت کو انہوں نے ۳۱ اکتوبر کی صبح ہی بتا دیا تھا کہ وہ سپریم کورٹ کو پانچ جج دے رہے ہیں۔ (۱۹۱)

چنانچہ اسی روز پارلیمنٹ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے نواز شریف نے اعلان کیا وہ سپریم کورٹ کے سفارشات کو منظور کرتے ہوئے پانچ ججوں کا تقرر کر رہے ہیں اس کے ساتھ ہی حکومت نے قومی اسمبلی میں آئینی ترمیم کا بل پیش کر دیا جس کے ذریعے سپریم کورٹ کے ججوں کی تعداد ۱۷ مقرر کر دی گئی اصولاً تو یہی ہونا چاہیے تھا کہ عدلیہ حکومت کے اس فیصلے کے بعد پرانی رنجش کو رفع دفع کر دیتی لیکن ایسا نہ ہو سکا بلکہ سجاد علی شاہ نے نواز شریف کو توہین عدالت کے جرم میں سزا دینے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس دوران ایک ایسا واقعہ بھی ہوا جس نے سجاد علی شاہ کی پوزیشن کو خاصا کمزور کر دیا (۱۹۲)۔ سنیارٹی لسٹ پر اختلافات نے سجاد علی شاہ کے خلاف ججوں میں خاصی نفرت پیدا کر رکھی تھی مزید یہ کہ سید سجاد علی شاہ نے محض نواز شریف کو سبق سکھانے کے لیے سپریم کورٹ کے ججوں کا جس بے دردی سے کراچی، پشاور، کوئٹہ اور لاہور تبادلہ کیا تھا ججوں میں بے چینی کا سبب بنا تھا اور وہی جج جو کل سید سجاد علی شاہ کے دست و بازو تھے اب اس تاک میں تھے کہ کب موقع ملے اور وہ فیصلہ کن وار کر کے چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ کی چھٹی کرا دیں۔ (۱۹۳)

۲۱ نومبر ۱۹۹۷ء کو توہین عدالت کیس کی سماعت بعض ناگزیر و نامعلوم وجوہات کی بناء پر ۲۸ نومبر ۱۹۹۷ء تک ملتوی کر دی گئی حالانکہ اس سے پہلے کیس کی سماعت تقریباً روزانہ کی بنیاد پر ہوتی رہی (۱۹۴)۔ اور کسی بھی لمحے فیصلہ متوقع تھا لیکن سماعت کے التواء سے حکومت کو صف بندی کا موقع مل گیا اس دوران جسٹس سجاد علی شاہ نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے جسٹس مختار جونیجو کو قائم چیف الیکشن کمشنر مقرر کر دیا جسٹس مختار، ان چند ججوں مس شامل تھے جنہوں نے عدلیہ حکومت تنازعہ میں سجاد علی شاہ کا بھرپور ساتھ دیا تھا (۱۹۵)۔ ان کے تقرر سے حکومتی حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہو رہا تھا کہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کسی نہ کسی مقدمے کا فیصلہ کر کے نواز شریف کو وزارت عظمیٰ سے ہٹانے کے لیے کوئی نہ کوئی ریفرنس جسٹس مختار جونیجو کو بھجوا دیں گے (۱۹۶)۔ اس لیے جوابی کاروائی کے طور پر نواز شریف کے حاشیہ نشینوں نے سپریم کورٹ کوئٹہ بنچ سے رجوع کر لیا جس نے ۲۶ نومبر ۱۹۹۷ء کو چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو معطل کر دیا جبکہ سجاد علی شاہ نے کوئٹہ بنچ کے فیصلے کو معطل کر کے ان دونوں

ججوں کو اپنے فرائض کی انجام دہی سے روک دیا جنہوں نے ان کو معطل کیا تھا۔ ان ججوں میں جسٹس خلیل الرحمٰن اور جسٹس ارشاد حسن خان شامل تھے (۱۹۷)۔ لیکن ان دونوں حضرات نے ترکی بہ ترکی چیف جسٹس کے احکامات کو غیر قانونی قرار دے دیا اور اگلے روز معمول کے مطابق اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہے۔ ۲۸ نومبر ۱۹۹۷ء کی صبح توہین عدالت مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تو پولیس کی بھاری جمعیت کی موجودگی کے باوجود مسلم لیگی کارکنوں کی کثیر تعداد گیٹ پھلانگ کر سپریم کورٹ کی عمارت میں داخل ہوگئی (۱۹۸)۔ صورتحال کی گھمبیرتا کو دیکھتے ہوئے چیف جسٹس نے فوری طور پر مقدمہ کی سماعت ملتوی کر دی اب صورتحال یہ تھی کہ سپریم کورٹ کے کوئٹہ بنچ کے بعد پشاور بنچ نے بھی (جو جسٹس سعید الزماں صدیقی اور جسٹس فضل الٰہی خان پر مشتمل تھا) نے بھی سید سجاد علی شاہ کو معطل کر دیا اور ان کے اختیارات محدود کرتے ہوئے انہیں کام سے روک دیا (۱۹۹)۔ جسٹس سعید الزماں نے سید سجاد علی شاہ کی سنیارٹی کا مسئلہ طے کرنے کے لیے ۱۵ ججوں پر مشتمل فل کورٹ تشکیل دے دیا (۲۰۰)۔ سپریم کورٹ پشاور بنچ کا یہ فیصلہ بذریعہ فیکس صدر، وزیر اعظم اور چیف آف آرمی اسٹاف کو بھیج دیا گیا اور مقدمے کی سماعت کے لیے یکم دسمبر ۱۹۹۷ء کی تاریخ مقرر کر دی گئی (۲۰۱)۔ چیف جسٹس نے ۲۸ نومبر ۱۹۹۷ء کو خط لکھا جس میں سپریم کورٹ کی حفاظت کے لیے اسلام آباد کو فوج کے حوالے کرنے کے لیے کہا گیا اور توہین عدالت کی سماعت کرنے والے ججوں کو بھی فوج کی سکیورٹی فراہم کرنے کی استدعا کی گئی تھی (۲۰۲)۔ صدر لغاری نے سجاد علی شاہ کا خط فوری طور فوج کے سربراہ کو بھیج دیا تاہم جنرل جہانگیر کرامت نے اس میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی یکم دسمبر ۱۹۹۷ء کو توہین عدالت کیس کی سماعت سجاد علی شاہ کے چاہنے کے باوجود نہ ہو سکی کیونکہ اگر سجاد علی شاہ اس پر بضد تھے دوسری طرف جسٹس سعید الزماں صدیقی اپنے دس ساتھی ججوں کے ہمراہ فل کورٹ اجلاس شروع کر کے چیف جسٹس کی قسمت کا فیصلہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ (۲۰۳)

اس صورتحال میں پاکستان بار کونسل کے سربراہ عابد حسن منٹو نے اپنے ساتھی وکلاء کے ہمراہ چیف جسٹس سجاد اور جسٹس صدیقی سے ملاقاتیں کیں اور طے ہوا کہ فریقین آج کسی مقدمے کی سماعت نہیں کریں گے اس کے بعد تمام ججوں سے درخواست کی گئی وہ اپنے معاملات افہام و تفہیم سے طے کریں تاہم معاملات طے نہ ہو سکے نواز شریف نے اس خدشہ

کے پیش نظر کہ سید سجاد علی شاہ ۱۳ ویں ترمیم کالعدم قرار نہ دے دیں جوابی حکمت عملی کے طور پر یہ افواہ پھیلا دی کہ انہوں نے صدر کے مواخذے کی تحریک تیار کر رکھی ہے (۲۰۴)۔ کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ صدر لغاری کہیں ۵۸ (۲بی) بحال ہوتے ہی عجلت میں اسمبلی نہ توڑ دیں۔(۲۰۵)

تاہم ۲ دسمبر ۱۹۹۷ء کے سپریم کورٹ جہاں ایک طرف جسٹس سعید لزماں صدیقی اپنے دس ساتھیوں کے ساتھ ہر قسم کی صورتحال کا سامنا کرنے کے لیے موجود تھے تو دوسری طرف سید سجاد علی شاہ نے بطور چیف جسٹس آئین کی تیرہویں ترمیم کو معطل کر کے آئین کی دفعہ ۵۸(۲بی) کو بحال کر دیا (۲۰۶)۔ اس فیصلے کی حمایت سید سجاد علی شاہ، جسٹس بشیر جہانگیری اور جسٹس عارف چوہدری پر مشتمل بنچ نے کی۔ ۵۸ (دو) بی کی بحالی کے ساتھ ہی سپریم کورٹ کے دس رکنی بنچ نے سعید الزماں صدیقی کی سربراہی میں حکومتی درخواست پر سید سجاد علی شاہ کا فیصلہ معطل کر دیا اور افسوس کا اظہار کیا کہ چیف جسٹس نے اپنے اختیارات محدود کیے جانے کے باوجود اس قسم کا فیصلہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی فل کورٹ نے صدر اور وزیر اعظم کو ہدایت کی کہ وہ جسٹس اجمل میاں کے بطور قائم مقام چیف جسٹس تقرری کے لیے سمری بھجوادی جائے لیکن صدر نے اس سمری پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ مواخذے کی تحریک انہیں نوشتہ دیوار کی طرح دکھائی دے رہی تھی اس لیے انہوں نے ۲ دسمبر ۱۹۹۷ء کی شام اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ (۲۰۸) جس کے بعد سینٹ کے چیئر مین وسیم سجاد قائم مقام صدر بن گئے اور سید سجاد علی شاہ ۳ دسمبر ۱۹۹۷ء کو ۶ جنوری تک کے لیے رخصت پر چلے گئے (۲۰۹)۔ جس میں بعد ازاں ۱۵ فروری تک توسیع کر دی گئی جبکہ چیف جسٹس اجمل میاں نے ۲۳ دسمبر ۱۹۹۷ء کو مستقل چیف جسٹس کی حیثیت سے حلف اٹھالیا (۲۱۰)۔ حق بہ حق دار رسید۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۷ء کو صدارتی الیکشن میں مسلم لیگ کے امیدوار رفیق تارڑ ۳۷۴ ووٹ لے کر ملک کے دسویں صدر منتخب ہو گئے (۲۱۱)۔ ان کے مدمقابل امیدوار آفتاب شعبان میرانی کو ۵۸ اور مولانا شیرانی کو ۲۲ ووٹ ملے صدر تارڑ نے یکم جنوری ۱۹۹۸ء کو صدر کے عہدے کا حلف اٹھایا اور اس روز سید سجاد علی شاہ نے ریٹائرمنٹ تک چھٹی لے لی۔ (۲۱۲)

جب میاں نواز شریف نے ۳ فروری ۱۹۹۷ء کے انتخابات کے بعد اقتدار سنبھالا تو ملکی تاریخ ان کے سامنے تھی لیکن انہوں نے اس سے کوئی سبق حاصل نہ کیا انہوں نے جنرل

جہانگیر کرامت، فاروق لغاری اور سجاد علی شاہ سے چھٹکارا پانے کے بعد اپنی تمام توجہ ملٹری بیوروکریسی پر مرکوز کر دی۔ نواز شریف اور فوج کے درمیان اختلافات کی کہانی کوئی نئی بات نہ تھی اپنے پہلے دور حکومت میں وہ جنرل عبدالوحید کاکڑ (پ ۱۹۳۷ء) سے ٹکر لے چکے تھے لیکن انہوں نے اس سے بھی سبق سیکھنے کی بجائے دوبارہ فوج سے محاذ آرائی مول لے لی۔ جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ کے بعد انہوں نے کئی سینئر جرنیلوں کو نظر انداز کر کے جنرل پرویز مشرف کو فوج کا سربراہ نامزد کر دیا جو بعد ازاں ان کے لیے دردسر بنے۔ نواز شریف کو آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین نے رپورٹ دی کہ جنرل مشرف ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے پہلے ان کی حکومت ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس رپورٹ کی روشنی میں نواز شریف نے مشرف کو فارغ کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن یہ راز فاش ہو گیا اور ایک سازش کے تحت نواز شریف نے جنرل مشرف کو چیئرمین جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی مقرر کر کے ان کی ملازمت کو تحفظ فراہم کر دیا لیکن جنرل مشرف نے ممکنہ خطرے کی بو سونگھ کر آہستہ آہستہ اپنے بااعتماد ساتھیوں کو اعلیٰ عہدوں پر تعینات کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا (۲۱۳)۔ اور انہوں نے کور کمانڈر کوئٹہ لیفٹیننٹ جنرل طارق پرویز کو یہ الزام لگا کر برطرف کر دیا کہ انہوں نے نواز شریف سے سیاسی ملاقات کی تھی نواز شریف نے دور اندیشی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے جرنیلوں کو بھی اسی طرح خریدنا شروع کر دیا جس طرح انہوں نے جسٹس تارڑ اور اپنے بعض دوسرے ساتھیوں کی مدد سے سجاد علی شاہ کو فارغ کر کے عدلیہ کو تباہ کیا تھا لیکن اب حالات مختلف تھے فوج کے اندر کارگل سے پسپائی کے باعث نواز شریف کے ساتھ نفرت بڑھ چکی تھی اور جب انہوں نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جنرل مشرف کو برطرف کر کے آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل ضیاء الدین کو فوج کا نیا سربراہ مقرر کیا تو جنرل مشرف جو ان دنوں سرکاری دورے پر سری لنکا گئے ہوئے تھے نے واپس آ کر نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ (۲۱۴)

نواز شریف کے دور اقتدار (۱۹۹۷ء۔۱۹۹۹ء) اور بعد ازاں جنرل مشرف کے دور حکومت قبل از وقت انتخابات ۲۰۰۲ء کے پانچ سالوں میں ملی یکجہتی کونسل اپنی اہمیت کھوتی چلی گئی اگرچہ اس کے خاتمے کا ابھی باضابطہ اعلان نہیں کیا گیا لیکن انتخابات ۱۹۹۷ء میں دینی جماعتوں کے باہمی اختلافات و انتشار کے باعث نہ صرف ان کا ووٹ بنک کھو گیا بلکہ ملی یکجہتی کونسل جو قوم میں یکجہتی پیدا کرنے کے لیے بنائی گئی تھی خود بھی منتشر ہو کر اپنی

موت آپ مرگئی۔

ملی یکجہتی کونسل کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی جنہوں نے دینی جماعتوں کے غیر سیاسی وغیر انتخابی اتحاد کا خوشگوار اور امید افزاء تجربہ کیا تھا انہوں نے گذشتہ پانچ سالوں کے دوران ملکی حالات کا سنجیدگی سے تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر مذہبی سیاسی جماعتوں کے ووٹ کو ایک پلیٹ فارم پر مرکوز کر دیا جائے تو خاطر خواہ نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے ہم خیال دینی سیاسی جماعتوں سے رابطے شروع کر دیے تا کہ اگر حکومت کسی بھی مرحلے پر انتخابات کا اعلان کرے تو ۱۹۷۷ء کے قومی اتحاد کی طرح ان کی تیاری مکمل ہو اور وہ جب چاہیں ایک موثر سیاسی اتحاد کا اعلان کر دیں۔ جنرل مشرف کو سپریم کورٹ نے ملکی حالات سنوارنے کے وعدے پر تین سال کی مہلت دی تھی جو ۲۰۰۳ء میں ختم ہونے والی تھی اگرچہ فوجی آمریت سے ایفائے عہد کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی تاہم جنرل پرویز مشرف نے اپنے پیش رو آمروں کی قائم کردہ روایت سے کلی انحراف کرتے ہوئے اپنا کہا سچ کر دکھایا اور انتخابات کا اعلان کر دیا جو شیڈول کے مطابق ۲۰۰۲ء میں منعقد ہونا تھے۔

الیکشن ۲۰۰۲ء اور متحدہ مجلس عمل (ایم ایم اے)

ابھی مشرف کو حکومت سنبھالے چند ماہ ہوئے ہوں گے کہ دینی جماعتوں کو اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ اسٹیبلشمنٹ کی تیار کردہ دونوں سیاسی پارٹیاں ناکام ہوگئی ہیں اور وقت کی اہم ضرورت تھی کہ دینی جماعتیں میدان عمل اتر کر اس خلاء کو پر کریں۔ (۲۱۵)۔☆ چنانچہ اس سلسے میں دینی جماعتوں نے رابطے تیز کر دیئے اس طرح جولائی ۲۰۰۱ء میں ملک کی چھ بڑی دینی جماعتوں نے ایک نئے اتحاد ''متحدہ مجلس عمل'' کے قیام کی منظوری دے جس کا مقصد ملک میں فرقہ واریت ہم آہنگی کے لیے اسلامی نظام کے قیام اور لادینی عناصر کی یلغار کا مقابلہ کرنا تھا اور اس مقصد کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنے کا عزم ظاہر کیا گیا (۲۱۶)۔ اس نئے اتحاد میں کوئی عہدہ نہیں رکھا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ اس اتحاد میں شامل تمام جماعتیں اتفاق رائے سے اپنا کردار کریں گی۔ قاضی حسین احمد کی رہائش گاہ پر ہونے والے اس اجلاس میں جمعیت علمائے پاکستان کے مولانا شاہ احمد نورانی، جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد، جمعیت علمائے اسلام (ف) کے مولانا فضل الرحمٰن، تحریک جعفریہ کے علامہ ساجد علی نقوی، جمعیت اہلحدیث کے علامہ ساجد میر اور جے یو آئی کے مولانا سمیع الحق نے شرکت کی۔

مولانا نورانی کے بقول ''آج کا اجلاس اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ ہم پاکستان کی آزادی، سلامتی، خودمختاری، استحکام اور اسلامی تشخص کے لیے مشترکہ جدوجہد کریں گے اس سلسلے میں ان چھ مذہبی جماعتوں نے متحدہ مجلس عمل کے پلیٹ فارم سے مشترکہ کوششیں کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارا اصل ہدف ملک میں حقیقی اسلامی جمہوری نظام کا قیام ہے۔ آج کا اجلاس اعلان کرتا ہے کہ پاکستان کی بنیاد اسلام ہے اور ۱۹۷۳ء کا آئین، اسلام ہی کی بنیاد پر پارلیمانی جمہوریت اور وفاقی نظام میں حکمرانی کے قیام کا ضامن ہے۔ آئین کی بحالی اور دستور کے فریم ورک میں قرآن وسنت کی ہدایت، اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق

☆ مولانا شاہ احمد نورانی نے جولائی ۲۰۰۰ء میں ہی اس ضرورت کی طرف توجہ دلائی تھی۔ (انٹرویو ندائے اہل سنت، اگست ۲۰۰۰ء)

ایک ایسی ریاست کے قیام کی جدوجہد کی جائے گی جو عوام کی آزادی، دینی روایت، ملی تہذیب وتمدن، معاشی انصاف اور خوشحالی کی ضامن ہو۔ دینی وسیاسی مسائل پر متفقہ موقف اختیار کیا جائے گا مسئلہ کشمیر ہی بھارت کے ساتھ تمام تنازعات کی اصل وجہ ہے اس کا حل کشمیری عوام کی خواہشات اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق نکالا جانا چاہیے ....(مزید برآں یہ) ملی یکجہتی کونسل کا دوسرا نام نہیں بلکہ ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں سے اس میں شامل چھ جماعتیں اتفاق رائے سے مشترکہ حکمت عملی مرتب کریں گی ....جنرل پرویز مشرف کے ساتھ مجوزہ ملاقات میں ان چھ جماعتوں کے سربراہان مشترکہ طور پر شرکت کریں گے۔ میں (مولانا شاہ احمد نورانی) پہلے سے طے شدہ ایجنڈے اور اتفاق رائے کے تحت مجلس کی ترجمانی کروں گا۔"

بعد ازاں مولانا شاہ احمد نورانی کو متحدہ مجلس عمل کی چیئرمین شپ سونپ دی گئی کیونکہ انکی ذات میں ایک ایسی شخصیت موجود تھی جو غیر متنازعہ اور سب کے لیے قابل قبول ہو (۲۱۸)۔ متحدہ مجلس عمل میں شامل دینی جماعتوں نے ابتداء ہی سے بڑی سرگرمی کا ثبوت دیا اور ایسے تمام خدشات کو دور کر دیا کہ یہ اتحاد بیرون طاقتوں یا ملکی ایجنسیوں کی سرپرستی میں بنایا گیا ہے متحدہ کے پلیٹ فارم سے تین فروری ۲۰۰۲ کو "متحدہ دفاع پاکستان علماء کنونشن" کا اہتمام کیا گیا (۲۱۹)۔ متحدہ مجلس عمل کے چیئرمین مولانا شاہ احمد نورانی نے اس موقع پر کہا کہ "پاکستان اسلام کا قلعہ ہے اور اس کا وجود اسلام دشمن طاقتوں کو کھٹکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی طاقتیں اس کے اسلامی تشخص اور نظریے کو ختم کرنے کے لیے کئی جال بُن رہی ہیں جن سے ہمیں کئی چیلنجوں کا سامنا ہے تاہم حالات سے مایوس ہونے والی کوئی بات نہیں اسلامی پاکستان سے ٹکرانے والی سیکولر قوتیں پاش پاش ہو جائیں گی۔ (۲۲۰)

.....لوگ سمجھتے ہیں کہ افغان جہاد کو ختم کر دیا گیا ہے لیکن شہداء کی راکھ سے نکلنے والے شعلے سے افغانستان کے نام نہاد فاتحین کو آج بھی چین نہیں مل سکا۔ عیسائی، یہودی اور ہندو، مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں جو صلیبی جنگ کا پیش خیمہ ہیں ....ملک کے لیے دس لاکھ شہداء نے خون دیا ہے جو رنگ لائے گا اور اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کا حافظ ہے .... پاک فوج رسول اللہ ﷺ کے دیوانوں کی فوج ہے۔ اس سے محمود غزنوی، احمد شاہ ابدالی اور شہاب الدین غوری پیدا ہوں گے جو اسلامی تشخص کی حفاظت کریں گے۔ (۲۲۱)

اس موقع پر متحدہ علماء کنونشن نے ایک مشترکہ اعلامیہ کی منظوری دی جس کے مطابق

"متحدہ دفاع پاکستان علماء کانفرنس اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ حکومت کی خراب کارکردگی، قول وفعل میں تضاد اور قومی سطح پر غلط پالیسیاں اختیار کرنے کی وجہ سے ملک کا اسلامی نظریاتی تشخص اور جغرافیائی وجود بڑے خطرات سے دو چار ہے۔ ۵۴ سال سے پاکستان انگریز استعمار کے تربیت یافتہ گروہ کے ہاتھ سے نہیں نکل سکا۔ غربت، بیروزگاری اور مہنگائی عوام کے لیے جان لیوا بن چکی ہے۔ بے لاگ احتساب کا حکومتی دعویٰ مذاق بن کر رہ گیا ہے حکومت امریکہ اور مغربی طاقت کے دباؤ اور معیشت کی بحالی کے جھوٹے دعوؤں کے لالچ میں کمزوری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ جس کی وجہ سے حکمران اسلامی نظریاتی تشخص، دینی مدارس، مجاہدین اور جہادی تنظیموں کے خلاف پابندیوں کے اقدامات کر رہے ہیں۔"

کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ ملک کو خطرات سے نکالنے کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ دینی وسیاسی جماعتیں اور تمام مکتبہ فکر کے علماء مشائخ کرام، ملک کو امریکی ومغربی لادین تہذیب کے اثر ونفوذ سے بچانے کے لیے عوام الناس کو ساتھ لے کر ملک کے اسلامی نظریاتی کردار اور دینی مدارس کے تحفظ، دستور کی بحالی، ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالت، انتخابی عمل کے آغاز، غیر دستوری راستہ سے دستوری ترامیم کو رکوانے، آزاد وخود مختار با اختیار الیکشن کمیشن، پارلیمنٹ کی بالادستی اور عبوری حکومت کے قیام کے لیے تحریک چلائیں تاکہ پاکستان کو قرآن وسنت کی بالادستی اور نفاذ شریعت کا مرکز بنایا جائے .... دینی مدارس کے معاملات میں غیر قانونی حکومتی مداخلت بند کی جائے مدارس سے باہر کی اتھارٹی قبول نہیں کی جائے گی۔ دینی مدارس کے معاملات میں غیر قانونی حکومتی مداخلت بند کی جائے۔ مدارس سے باہر کی اتھارٹی قبول نہیں کی جائے گی۔ سیاسی ودینی جماعتوں پر عائد پابندیاں ہٹائی جائیں، انتخابات آئین کے آرٹیکل ۶۲، ۶۳ کے مطابق جماعتی اور متناسب نمائندگی کی بنیاد پر کرائے جائیں ... مسئلہ کشمیر کے بارے میں حکومت شکوک وشبہات کا ازالہ کرے۔ امریکی فوجیوں کو پاکستان چھوڑنے پر مجبور کیا جائے۔" (۲۲۲)

ملک میں آئندہ انتخابات کے پیش نظر تمام قابل ذکر دینی جماعتوں نے فیصلہ کیا کہ انتخابات کے حوالے سے مشترکہ حکمت عملی اختیار کی جائے (۲۲۳)۔ ملک کے تین بڑی دینی جماعتوں جماعت اسلامی، جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام نے فیصلہ کیا کہ آئندہ انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کے پلیٹ فارم سے آئندہ انتخابات میں حصہ لیا جائے

(۲۲۴)۔ متحدہ مجلس عمل کے سربراہ مولانا نورانی کا خیال تھا کہ نائن الیون کے وقوعہ کے بعد افغانستان پر حملے کے بعد امریکہ نے وہاں جو تباہی مچائی تھی اس نے پاکستانی عوام کی سوچ کو دینی جماعتوں کے قریب کردیا تھا اور آئندہ انتخابات میں عوام کسی بھی ایسی جماعت کو ووٹ نہیں دیں گے جس نے اس مسئلہ پر حکومت کی تائید کی ہو چنانچہ ان انتخابات میں امریکہ مخالف ووٹ متحدہ مجلس عمل کو ہی ملے گا اور اس میں شامل دینی جماعتیں ملک گیر کامیابی حاصل کریں گی۔ (۲۲۵)

متحدہ مجلس عمل نے آئندہ انتخابات میں شرکت اور انتخابی ایڈجسٹمنٹ کے لیے دیگر جماعتوں سے روابط تیز کر دیئے تھے۔ بالخصوص مسلم لیگ (ن) کے ساتھ انتخابی حوالے سے بات چیت چل رہی تھی اور توقع کی جارہی تھی کہ جلد ہی اتحاد کے لیے معاملات طے پا جائیں گے۔ متحدہ میں شامل دینی جماعتوں کی اکثریت اس بات پر متفق تھی کہ جن حلقوں میں ضروری وہ وہاں پر دوسری پارٹیوں کے ساتھ ہی سیٹ ایڈجسٹمنٹ کر لی جائے تاکہ کامیابی کی شرح کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جاسکے۔ (۲۲۶)

دینی جماعتوں نے ۱۹ مارچ ۲۰۰۲ء کو متحدہ مجلس عمل (کے نام سے قائم کیے گئے اتحاد) کو باقاعدہ اتحاد میں تبدیل کر دیا۔ جس کا اعلان مولانا شاہ احمد نورانی نے ایک پریس کانفرنس میں کیا (۲۲۷) ان کے بقول دینی جماعتوں نے محسوس کیا تھا کہ حکومت پر آئین کی اسلامی دفعات ختم کرنے اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی دفعہ واپس لینے کے لیے دباؤ ڈالا جارہا ہے (۲۲۸)۔ دوسری طرف این جی اوز ملک کا اسلامی تشخص کم کرنے کے درپے تھیں۔ ان حالات میں دینی جماعتوں نے متفقہ فیصلہ کیا تھا کہ مستقبل کے خطرات کو روکنے اور سیکولر قوتوں کا راستہ روکنے کے لیے متحد ہو کر انتخابات میں حصہ لیا جائے (۲۲۹)۔ ان کے خیال میں دینی جماعتوں کا ووٹ بنک تقسیم ہوگیا تو اس سے متفقہ دستور خطرے میں پڑ جائے گا (۲۳۰) یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ جلد ہی مجلس عمل کے مشترکہ انتخابی منشور کی منظوری دے دی جائے گی۔ (۲۳۱) جو بعد ازاں ۲ اپریل کو دے دی گئی (۲۳۲)۔ متحدہ مجلس عمل نے متفقہ طور پر دستور اور منشور منظور کر کے تمام جماعتوں کو دیا تاکہ وہ اپنی اپنی شوریٰ سے اس کی توثیق کرائیں (۲۳۳)۔ مولانا نورانی کے بقول متحدہ مجلس عمل نے فیصلہ کیا کہ اس منشور سے اتفاق رکھنے والی سیاسی جماعتوں سے ایڈجسٹمنٹ کی جائے گی اور امیدواروں کو ٹکٹ جاری کرنے

کے لیے مرکزی اور پانچ صوبائی پارلیمانی بورڈ تشکیل دیئے جائیں گے۔ (۲۳۴)

متحدہ مجلس عمل کی قیادت نے آئندہ ہونے والے صدارتی ریفرنڈم پر کڑی نکتہ چینی کی اور اعلان کیا کہا س کے خلاف ملک گیر تحریک چلائی جائے گی مولانا نورانی کے بقول وفاقی آئین میں ریفرنڈم کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ آئین میں صدارتی نظام کے لیے واضح طریق کار موجود ہے۔ (۲۳۵)

جنرل پرویز مشرف نے جب دیکھا کہ اسلام پسند قوتیں ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو کر ریفرنڈم کے خلاف تحریک چلانے کے لیے پر تول رہی ہیں تو ضروری خیال کیا کہ متحدہ مجلس عمل کے مرکزی رہنماؤں کو باضابطہ دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی ملاقات کے لیے ۶ اپریل ۲۰۰۲ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ (۲۳۶) تاہم اس ملاقات میں فریقین ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکے کیونکہ مجلس عمل کے اعلیٰ سطحی وفد نے حکومتی شرائط پر صدر سے ملاقات سے انکار کردیا۔ (۲۳۷) مولانا شاہ احمد نورانی کا موقف تھا کہ ریفرنڈم کا مقصد وحید یہ تھا کہ ملک میں امریکی مداخلت کو خلاف آئین قرار دیا جائے (۲۳۸) انہوں نے عدالت عظمیٰ سے مطالبہ کیا کہ ریفرنڈم کے اعلان کا نوٹس لے (۲۳۹)۔

نشتر پارک کراچی میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ریفرنڈم آئین اور سپریم کورٹ کے فیصلے کی خلاف ورزی ہے قوم کسی قیمت پر اسے قبول نہیں کرے گی۔ لہٰذا اس کی بھر پور مزاحمت کی جائے مولانا نورانی نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ ریفرنڈم کا ڈھونگ پارلیمنٹ پر بالادستی کے لیے رچایا جارہا تھا (۲۴۱)۔ ان کے بقول ہمیں عدالتوں سے انصاف کی توقع تھی لیکن سپریم کورٹ کے فیصلے نے ثابت کر دیا کہ عدالتوں میں جرأت ہی نہیں (۲۴۲)۔ مزید برآں سپریم کورٹ کے فیصلے نے آئین کو دفن کردیا۔ (۲۴۳)

تاہم مجلس عمل نے حکومت کے خلاف تحریک چلانے کے فیصلے کو ملتوی کر دیا اور فیصلہ کیا کہ انتخابات میں بھر پور حصہ لیا جائے اس مقصد کے لیے مجلس عمل نے ایک ہی انتخابی نشان پر الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا۔ (۲۴۴) مزید برآں متحدہ مجلس عمل نے باضابطہ منشور کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ مجلس عمل برسر اقتدار آ کر ملک میں نظام مصطفیٰ نافذ کرے گی۔ نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے اعلان کر کے دینی و سیاسی جماعتوں نے ۱۹۷۷ء کے بعد ایک مرتبہ پھر مولانا نورانی پر اپنے اعتماد کا اظہار کر دیا تھا جو ان کی اخلاقی فتح بھی تھی۔ (۲۴۵)

مجلس عمل کے منشور میں کہا گیا کہ: ''اس مقصد (یعنی نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ) کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کی'' سفارشات کی روشنی میں قانون سازی کی جائے گی۔ ریاستی تشدد کا خاتمہ کیا جائے گا صوبوں کو حقیقی آئینی خودمختاری دی جائے گی قدرتی وسائل سے آمدنی میں سے صوبوں کا حصہ (رائلٹی) یقینی بنایا جائے گا۔ منشور کے مطابق حکمرانوں، منتخب نمائندوں، عدلیہ، افواج اور انتظامیہ کا بلاتمیز اور بے لاگ احتساب کیا جائے گا۔ اقلیتوں کے حقوق کا مکمل تحفظ کیا جائے گا۔ قومی خزانے اور سائل کے ناجائز استعمال کو روکا جائے گا اور دولت کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنایا جائے گا۔ بیرونی قرضوں اور امداد پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود انحصاری کی بنیاد پر معاشی ترقی اور خوشحالی کی منزل حاصل کی جائے گی سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق سودی نظام کا خاتمہ کیا جائے گا۔ ہر شہری کے لیے خوراک رہائش، علاج اور تعلیم کی ضمانت دی جائے گی، ظالمانہ ٹیکسوں کا خاتمہ کیا جائے گا، اصول انصاف پر مبنی ٹیکس کلچر کو فروغ دیا جائے گا خواتین کو قرآن وسنت پر مبنی حقوق دلائے جائیں گے مزدوروں کا کارخانوں میں حصہ ہوگا ان کے روزگار کا تحفظ کیا جائے گا۔ یونین سازی کا حق دیا جائے گا، تالہ بندی اور چھانٹیوں سے نجات دلائی جائے گی اور تنخواہوں اور مراعات میں اضافہ کیا جائے گا۔ زرعی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کی جائے گی۔ زراعت پر سے غیر ضروری ٹیکسوں کا خاتمہ کیا جائے گا۔ آزادانہ اور باوقار خارجہ پالیسی تشکیل دی جائے گی مسلم ممالک سے تعلقات کو فروغ دیا جائے گا۔ مسلم ممالک کا موثر اور مضبوط بلاک تشکیل دیا جائے گا کشمیر کے عوام کو حق خودارادیت دلایا جائے گا اور ہر قسم کی بیرونی مداخلت کا سدباب کیا جائے گا پاکستان کے دفاع کو مضبوط بنایا جائے گا سائنس اور ٹیکنالوجی میں تیز رفتاری پیدا کی جائے گی جبکہ منشیات، سمگلنگ کی لعنتوں کا خاتمہ کیا جائے گا نظام تعلیم کو ملک کی نظریاتی اساس سے ہم آہنگ کر کے طبقاتی نظام تعلیم کا خاتمہ کیا جائے گا تعلیم کو عام کر کے شرح خواندگی میں اضافہ کیا جائے گا آزادی صحافت اور اظہار رائے پر ہر قسم کی پابندیوں کا خاتمہ کیا جائے گا۔'' (۲۴۶)

ملکی حالات کے تناظر میں صرف متحدہ مجلس عمل ہی سرگرم عمل نہیں تھی بلکہ دیگر سیاسی قوتیں بھی حکومت مخالف کوششوں کو ایک پلیٹ فارم پر مرتکز کر رہی تھیں ان میں اتحاد برائے بحالی جمہوریت (Allieance for the Restoration of Democracy (A.R.D.) پیش پیش تھا جو نوابزادہ نصر اللہ خان کی سربراہی میں قائم کیا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۹ مئی

۲۰۰۲ء کو اے آر ڈی کے زیر اہتمام کیا آل پارٹیز کانفرنس (اے پی سی) کا انعقاد کیا گیا جس میں متحدہ مجلس عمل کی جماعتوں سمیت ملک بھر کی ۳۵ سیاسی اور مذہبی جماعتیں شریک ہوئیں (۲۴۷)۔ اے پی سی کی صدارت نوابزادہ نصر اللہ خان کر رہے تھے اس کے ایجنڈے میں ریفرنڈم کے بعد ملکی حالات سرحدوں پر جنگی صورتحال، بڑھتی ہوئی مہنگائی، بیروزگاری اور دہشت گردی کے واقعات پر غور وخوض شامل تھا۔ (۲۴۸)

اس اے پی سی میں اس امر پر اتفاق ہوگیا کہ موجودہ صورتحال میں سرحد حالات کو دیکھتے ہوئے جنرل پرویز مشرف اپنا آئینی کردار ادا کرتے ہوئے سرحدوں کی حفاظت کریں اور ملکی امور چلانے کے لیے فوری طور پر سیاسی جماعتوں پر مشتمل قومی حکومت بنائی جائے تاکہ وہ متحد ہو کر بھارتی جارحیت کا مقابلہ کر سکے۔ اے پی سی کے کنوینر نوابزادہ نصر اللہ خان نے حکومت کو خبردار کیا کہ بھارت پاکستان پر لازم حملہ کرے گا اور دشمن کے حملے کو روکنے اور ناکام بنانے کے لیے فوج سرحدوں پر جائے اور آئینی وقومی فرض ادا کرے۔ (۲۴۹)

مولانا شاہ احمد نورانی نے بھی جنرل پرویز مشرف پر زور دیا کہ وہ اپنی تمام توجہ ملکی دفاع پر مرکوز کریں اور سیاسی کام سیاستدانوں پر چھوڑ دیں۔ ملک عزیز پر کڑا وقت آن پڑا ہے اور ملک سنگین بیرونی اور اندرونی مسائل سے دوچار ہے اس وقت تمام سیاسی مصلحتوں اور اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قوم کے ہر فرد کو سیسہ پلائی دیوار بن کر وطن عزیز کا دفاع کرنا چاہیے۔ امریکہ کو پاکستان کی ایٹمی قوت ایک آنکھ نہیں بھاتی جبکہ وہ ہندوستان کو ہر قسم کا حساس اور دفاعی اسلحہ فراہم کر رہا ہے پاکستان عالم اسلام کی واحد ایٹمی طاقت ہے جسے امریکہ تباہ کرنا چاہتا ہے امریکہ ہمیشہ اسلام اور عالم اسلام کا دشمن رہا ہے اور پاکستان پر ممکنہ فوج کشی سی آئی اے، موساد اور را کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے جس کا مقابلہ قوت ایمان کے ساتھ کرنا چاہیے امریکہ افغانستان میں اپنے مقاصد حاصل کر کے اب پاکستان کے خلاف درپردہ جارحیت پر تلا ہوا ہے اس وقت ملک کو سنگین چیلنجوں کا سامنا ہے لیکن پاکستان کی افواج اس کا مقابلہ کرنے کے لیے قوم کی آرزوؤں پر پورا اتریں گی۔ ساری قوم فوج کے ساتھ ہے۔ (۲۵۰) اس حالات میں مولانا نورانی نے سیاستدانوں پر زور دیا کہ پرویز مشرف کی دعوت پر سیاسی جماعتوں کو اس اہم مسئلہ پر اے پی سی میں شرکت سے انکار نہیں کرنا چاہیے سیاست کے لیے بہت وقت پڑا ہے اصل چیز ملکی سلامتی ہے انہوں نے جنرل مشرف کو مشورہ

دیا کہ وہ اب معذرت خواہانہ رویہ چھوڑ کر سپہ سالار بن جائیں اور دشمن کی ممکنہ جارحیت کا منہ توڑ جواب دیں۔ (۲۵۱) انہوں نے میزائیلوں کے کامیاب تجربہ پر جنرل پرویز مشرف کو مبارکباد بھی دی اور کہا کہ انہوں نے بڑی بے خوفی کے ساتھ میزائل تجربات مکمل کیے ہیں۔ (۲۵۲)

اگرچہ سرحدوں پر صورتحال سخت کشیدہ تھی اور اس موقع پر قومی یکجہتی کی ضرورت تھی لیکن حکومت ایسی نازک صورتحال میں بھی حکومت امریکی ایجنڈے کی تکمیل میں مصروف تھی جسکے تحت دینی مدارس کے خلاف کارروائیاں شروع کر دی گئیں اور ان پر رجسٹریشن کی پابندی لگا دی گئی اس موقع پر مولانا نورانی نے حکومت کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ جمہوریت بیلٹ سے آتی ہے دینی مدارس کے خلاف کاروائیاں اور ان کی جسٹریشن پر پابندی کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ (۲۵۳) انہوں نے مزید کہا کہ دینی مدارس آرڈیننس موجودہ حالات میں پیچیدگیوں کا باعث بنے گا۔ (۲۵۴) انہوں نے دینی اور سیاسی جماعتوں پر زور دیا کہ ممکنہ آئینی ترامیم کو رکنے کے لیے مشترکہ جدوجہد کریں۔ (۲۵۵)

نئے انتخابات چونکہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو ہونا تھے اس لیے متحدہ مجلس عمل نے ۲۳ جولائی سے انتخابی مہم چلانے کا اعلان کر دیا مولانا نورانی نے کہا کہ دینی جماعتوں کا حالیہ اتحاد مستقل ہے اور وہ ایک انتخابی نشان پر انتخاب لڑیں گی کیونکہ انتخابی عمل میں شرکت کے ذریعے ہی سیکولر طاقتوں کو روکا جا سکتا تھا۔ (۲۵۶) ان کے خیال میں آئینی ترامیم سے پارلیمنٹ کا وجود ختم ہو جائے گا۔ (۲۵۷)

حکومت کو آئینی ترامیم سے روکنے کے لیے متحدہ مجلس عمل کی قیادت نے صدر سے ملاقات کی جو ناکامی پر ختم ہوئی تاہم حکومت نے یقین دلایا کہ آئین کی اسلامی دفعات تبدیل نہیں کی جا رہیں نہ ہی ملک کو سیکولر اور لادین بنایا جا رہا ہے مولانا نورانی نے صدر پر واضح کیا کہ ترامیم محاذ آرائی کا سبب اور نظام میں تعطل پیدا کرنے کا باعث ہوں گی مزید برآں سپریم کورٹ نے صدر کو آئینی ڈھانچہ بدلنے کا اختیار نہیں دیا (۲۵۸)۔ اس لیے ضروری ہے کہ آئینی ترامیم کا کام آئندہ پلیٹ فارم پر چھوڑ دیا جائے (۲۵۹)۔ اس کے جواب میں صدر نے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہا کہ وہ مدارس پر کنٹرول نہیں چاہتے نہ ہی سیکولرازم آئے گا بلکہ اسلامی دفعات برقرار رہیں گی (۲۶۰)۔ اور وہ مدارس کی سابقہ رجسٹریشن بحال کرنے پر

غور کریں گے اس پر مولانا نورانی نے صدر مشرف سے مطالبہ کیا کہ علماء سے مشاورت کے بغیر مدارس کی رجسٹریشن کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ (۲۶۱)

نائن الیون کے سانحہ کے بعد عالمی صورتحال یکسر تبدیل ہوگئی وہ طالبان جو کل تک روس کے خلاف مزاحمت کا ایک نمایاں حصہ تھے سویت انخلاء کے بعد ہونے والی خانہ جنگی کے کامیاب فاتح کے طور پر ابھرے تھے جسے بالخصوص پاکستان سیاسی و فوجی حلقوں میں ستائشی نگاہوں سے دیکھا گیا کیونکہ حالات خواہ کچھ بھی رہے ہوں پاکستان کی مغربی سرحدات تاریخ میں پہلی بار محفوظ ترین تصور ہونے لگی تھیں اگر اس دور کے اخبارات کا محض سرسری جائزہ ہی لیا جائے تو اس برملا حمایت کے نتیجے میں بادی النظر میں یہی سمجھا جانے لگا تھا کہ طالبان کی حکومت پاکستانی خفیہ ایجنسیوں ہی کی قائم کردہ ہے اگرچہ ان طالبان کی غالب اکثریت سرحد اور بلوچستان کے مدارس کی فارغ التحصیل تھی لیکن تخلیق طالبان کے نظریہ کو اس وقت سخت دھچکا لگا بلکہ عالمی سطح پر کافی حیرت کا باعث بھی بنا جب طالبان نے نائن الیون کے بعد اسامہ بن لادن پر بیرونی بالخصوص پاکستانی ڈکٹیشن لینے سے انکار کر دیا پاکستان پالیسی سازوں کے لیے طالبان کا یہ فعل کسی سکتے سے کم نہیں تھا جنرل محمود (ان دنوں سربراہ آئی ایس آئی) کے افغانستان کے تمام چکر اکارت گئے اور طالبان نے اسامہ کے مسئلہ پر کسی بھی قسم کی بات چیت سے یکسر انکار کر دیا جبکہ عالمی ردعمل روز بروز طالبان کے خلاف شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں جب امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان پر حملہ کیا تو پاکستان کو بادل نخواستہ عالمی برادری کا ساتھ دینا پڑا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد طالبان کی جڑوں کی تلاش کے ڈانڈے جب پاکستان دینی مدارس سے ملا دیئے گئے تو عالمی دباؤ یہی تھا کہ دہشت گردی کے ان اڈوں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ یہ صورتحال آغاز میں یقیناً جنرل پرویز مشرف اور اس کے رفقائے کار کے لیے سخت پریشانی کا باعث رہی ہوگی مگر جلد یا بدیر پاکستان کی حکومت کو عالمی دباؤ کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے مدارس کے خلاف کاروائی کرنا پڑی۔ (۲۶۲)

تاہم دینی مدارس کے لیے یہ صورتحال ناقابل برداشت تھی چنانچہ مدارس مخالف حکومتی کاروائیوں کی ہر سطح پر بھرپور مذمت کرتے ہوئے انہیں ناقابل برداشت قرار دیا گیا۔ اس سلسلے میں ۳۰ جولائی ۲۰۰۲ء اسلام آباد میں مدارس کنونشن کا انعقاد عمل میں لایا گیا جو "اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ پاکستان" کے زیر اہتمام منعقد ہوا کنونشن کے اعلامیہ اور قراردادوں میں

پکستان کے قائدین اور حکومت کے وزراء کے درمیان باہمی افہام و تفہیم کے نتیجے میں مدارس سے متعلق مجوزہ قانون (مدارس آرڈیننس) کو از سر نو مرتب کرنے کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ اس پر مکمل عمل کیا جائے گا اور اسے محض دباؤ ختم کرنے کی حکمت عملی کے طور پر استعمال نہیں کیا جائے گا (۲۶۳)۔ خیر مقدمی اقدام کے طور پر اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ نے ۷ اگست ۲۰۰۲ء کو لاہور میں آل پارٹیز تحفظ مدارس دینیہ کانفرنس ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی توقع ظاہر کی کہ حکومت بھی آئندہ مدارس کے سلسلے میں مثبت رویہ برقرار رکھے گی (۲۶۴)۔ کنونشن نے اس موقع پر مختلف قراردادیں بھی پاس کیں ان میں سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ کے امتناع کے بارے میں ۱۹۹۹ء کے متفقہ فیصلے کو آئینی قانونی اور شرعی قرار دیا اور مطالبہ کیا گیا کہ اس کی روشنی میں ملک سے سودی نظام فوری ختم کیا جائے۔ ایک اور قرارداد میں قادیانیوں کی تعلیم ادارے واپس کرنے کی مذمت کرتے ہوئے مطالبہ کیا گیا کہ مذکورہ فیصلہ جلد از جلد واپس لیا جائے اجلاس میں اساتذہ پر لاٹھی چارج کی مذمت کی گی اس کے علاوہ علمائے کرام کی گرفتاریوں پر تشویش ظاہر کی گئی شرکاء اجلاس کی طرف سے امریکہ اور مغربی کی جانب سے دینی مدارس جماعتوں کے خلاف مذموم پروپیگنڈہ کی مذمت بھی کی گئی۔ (۲۶۵)

۳۱ جولائی کو بنوری ٹاؤن کراچی میں مولانا سلیم اللہ خان کی زیر صدارت ایک بہت بڑے جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس میں مدارس کے تحفظ کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا عندیہ ظاہر کیا گیا (۲۶۶)۔ اس جلسے سے اکابر علماء نے خطاب کیا جن میں مولانا سمیع الحق، حافظ حسین احمد، مولانا شاہ احمد نورانی، سید منور حسین، علامہ حسن ترابی، مفتی منیب الرحمٰن، قاری حنیف جالندھری، مفتی رفیع عثمانی، مولانا یوسف قصوری، مولانا غلام عمر سیالوی اور دیگر علماء نے خطاب کیا (۲۶۷)۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے اس موقع پر کہا کہ پاکستان میں مستقبل صرف اسلام کا ہے سیکولر قوتوں نے این جی اوز کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اب تک پاکستان کی این جی اوز کو ۸۰ کروڑ روپے قادیانیوں کی معرفت مل چکا ہے جو کہ لمحہ فکریہ ہے (۲۶۸)۔ تاہم دینی جماعتوں کے اتحاد سے اسلام کے پاکستان میں مستقبل کو بچایا جا سکتا ہے لادین عناصر اور قادیانی ۸۰ کروڑ روپے خرچ کر کے پاکستان کا اسلامی تشخص نہیں مٹا سکے بلکہ اگر وہ ۸۰ ارب روپے بھی صرف کر ڈالیں تب بھی کم ہی رہیں گے دینی جماعتوں کے پاس وسائل نہیں لیکن

قوت ایمانی ہے جذبہ جہاد زندہ ہو تو قوم مردہ نہیں ہوتی۔ (۲۶۹) اس موقع پر ۲۰ ہزار کے لگ بھگ علماء موجود تھے۔ (۲۷۰)

مولانا شاہ احمد نورانی متحدہ مجلس عمل اور جمعیت علمائے پاکستان دونوں پلیٹ فارموں پر ڈٹے ہوئے تھے انہوں نے یقین ظاہر کیا کہ عام انتخابات میں لادین قوتوں کو نشان عبرت بنا دیا جائے گا۔ (۲۷۱) اور ملک کی صرف دینی جماعتیں ہی اپنی مساعی جمیلہ سے بحران سے نکال سکتی ہیں۔ (۲۷۲)

آئندہ انتخابی اتحاد کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی نے مختلف سیاسی جماعتوں سے بات چیت جاری رکھے ہوئے تھے تاہم انہوں نے کہا کہ اتحاد کا حتمی فیصلہ متحدہ مجلس عمل کی قیادت ہی کرے گی۔ (۲۷۳)

ایم ایم اے اپنی انتخابی مہم زور و شور سے جاری رکھی اور بالآخر یوم فیصلہ بھی آن پہنچا۔ ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو ملکی تاریخ میں پہلی بار قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ایک ہی دن منعقد ہوئے اور نتائج جس طریق سے سامنے آئے وہ کسی کے سان گمان میں بھی نہیں تھے دینی جماعتوں کے اتحاد کو عوام الناس نے پذیرائی بخشی اور حکومتی سرپرستی میں قائم شدہ مسلم لیگ (ق) کے بعد ایم ایم اے کو واضح اکثریت حاصل ہوئی اور ملک کی ایک بہت بڑی سیاسی قوت بن کر ابھری اور حکومت تشکیل دینے کی پوزیشن میں آ گئی۔ (۲۷۴)

ایم ایم اے کے قائد مولانا نورانی نے کہا کہ عوام نے اسلام پسندوں پر اعتماد ظاہر کر کے سیکولر قوتوں کے موقف کی نفی کی ہے (۲۷۵)۔ ہماری خارجہ پالیسی واضح ہے ہم دنیا سے عالمی قوانین (جو برابری کی بنیاد پر ہیں) کا احترام کرتے ہیں اقوام متحدہ سمیت تمام ہمسایہ ممالک سے پر امن تعلقات کا قیام ہمارا اولین ترجیح ہوگا ہم اسلامی نظام قائم کریں گے پر تعیش نظام حکومت کے بجائے سادگی کا نظام حکومت متعارف کرائیں گے اور کسی ملک کی ڈکٹیشن برداشت نہیں کریں گی متحدہ مجلس عمل صدر پرویز مشرف کے ساتھ چل سکتی ہے کہ نہیں اس کا فیصلہ پالیمانی کرے گی۔ (۲۷۶)

متحدہ مجلس عمل کی غیر معمولی کامیابی نے نہ صرف سیاسی پنڈتوں بلکہ ملکی پالیسی سازوں کو بھی حیران و پریشان کر دیا کیونکہ ملک میں عوامی سطح پر ابھرنے والی اتنی بڑی تبدیلی کو ملک کے دانشور، کالم نگار ار تجزیہ نگار محسوس نہ کر سکے تھے اور اس نے ملکی دانشوروں اور تجزیہ

نگاروں کی عامیانہ سوچ اور سطحی پن کھل کر سامنے آ گیا متحدہ مجلس عمل کی اس کامیابی کو زیادہ حیران کن اس لیے بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ مملکت خداداد پاکستان مذہب کے نام پر وجود میں آیا اور پاکستان میں مذہبی جماعتیں بہت طاقتور تھیں اور ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے پہلے یوم شوکت اسلام اور جمعیت علماء پاکستان کا سیاسی ظہور اس بات کی علامت تھی کہ مذہبی طاقتیں اپنا اثر و رسوخ رکھتی تھیں۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جمعیت علماء اسلام نے صوبہ سرحد میں انتخابات کے بعد وزارت اعلیٰ حاصل کر لی تھی بلوچستان میں بھی مذہبی طاقتیں اقتدار میں ساجھے دار تھیں سندھ کے اندر قائد حزب اختلاف جمعیت علمائے پاکستان کا تھا اور پنجاب میں قومی اسمبلی کی لگ بھگ دس نشستیں مذہبی جماعتوں نے حاصل کی تھیں۔ ۱۹۷۷ء میں انہی مذہبی جماعتوں نے پاکستان کے پہلے سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور مضبوط ترین وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے حکومت کا نہ صرف تختہ الٹا بلکہ بھٹو کو پھانسی تک جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں قدم بہ قدم شریک رہیں۔ بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد مذہبی جماعتوں کے درمیان دوریاں پیدا ہوتی گئیں جس کے نتیجے میں مذہبی جماعتوں کی طاقت بکھر گئی لیکن انتخابات ۲۰۰۲ء میں مذہبی جماعتیں جس طرح سے عقائد کے اختلاف اور فرقوں کی تفریق کو بالائے طاق رکھ کر متحد ہو کر عوام کے سامنے آئیں اس نے عوام کے مورال کو بہت بلند کیا اور عوام نے جواباً بھرپور مینڈیٹ کا مظاہرہ کیا بالخصوص کراچی میں جہاں ایم کیو ایم تشدد کے ذریعے انتخابی نتائج کو تبدیل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی مجلس عمل نے پانچ نشستیں حاصل کر کے اس کو دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

ممتاز صحافی اقبال پاریکھ کے بقول "الیکشن سے قبل یہ کہا جا رہا تھا کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) نے قومی اسمبلی کی بہت سی نشستوں پر ایڈجسٹمنٹ کی ہے دونوں جماعتیں مل کر مرکز میں حکومت بنائیں گی اور مخدوم امین فہیم وزیر اعظم ہوں گے۔ پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بے نظیر بھٹو نے الیکشن سے ایک روز قبل لندن میں اے آر وائی کو دیئے گئے انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ نواز شریف کے ساتھ مل کر حکومت بنائیں گی وزیر اعظم کے لیے انہوں نے کسی فرد کا نام لینے سے احتراز کیا تھا تاہم انہوں نے مخدوم امین فہیم کی تعریف کی تھی لیکن اب جو صورتحال سامنے آئی اس میں یہ کہنا مشکل ہے (کہ آئندہ) وزیر اعظم کون ہوگا البتہ اگر مسلم لیگ قائد اعظم، پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر حکومت بناتی تو امین فہیم کے وزیر اعظم بننے کے امکانات

روشن ہو جائیں گے.... اگر متحدہ مجلس عمل پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) نے حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تو ایک بدترین سیاسی بحران پیدا ہو جائے گا کیونکہ مسلم لیگ قائد اعظم آزاد ارکان قومی اسمبلی کو ملا کر بھی شاید حکومت بنانے کی پوزیشن میں نہیں بہر حال اس کی نوبت شاید نہ آئے کیونکہ پاکستانی سیاستدانوں کے لیے اقتدار سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں (جیسا کہ بعد میں پاکستان پیپلز پارٹی پیٹریاٹ نے کر دکھایا) اس تناظر میں وفاق میں قائد اعظم مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت بنانے کا قوی امکان ہے۔" (۲۷۷)

یہی وجہ تھی کہ ایم ایم اے کے زعماء اپنی حکومت کے قیام کے صاف طور پر دیکھ سکتے تھے اور وہ اپنے ان دعووں میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے اگر ان دیکھی طاقتیں اپنی کرشماتی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے پاکستان پیپلز پارٹی پیٹریاٹ تشکیل دینے میں کامیاب نہ ہوتیں تو صورتحال یقیناً ایم ایم اے کے حق میں ہوتی لیکن عالمی قوتیں نہیں چاہتی تھیں کہ پاکستان میں اسلام پسندوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملے۔ (۲۷۸)

اسی لیے جب صدر پرویز مشرف نے یکم نومبر کو اقتدار نئے وزیر اعظم کو منتقل کرنے کا اعلان کیا تو وفاق، پنجاب اور سندھ میں سیاسی جوڑ توڑ اور گٹھ جوڑ کا سلسلہ اپ [illegible] ج کو پہنچ گیا اور متحدہ مجلس عمل کو چارہ ڈالنے کے لیے مسلم لیگ (ق)، پیپلز پارٹی اور نیشنل الا [illegible] نے رابطے تیز کر دیئے گئے اب واضح طور پر دو دھڑے میدان میں تھے مرکز میں حکومت کی تشکیل کے لیے ایک طرف پاکستان مسلم لیگ قائد اعظم نے نیشنل الائنس اور آزاد ارکان کو ملا کر حکومت سازی کے لیے کوششیں تیز کر دیں جبکہ دوسرے دھڑے میں پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹرین اور پاکستان مسلم لیگ (ن) تھیں اب صورتحال یہ بھی کہ یہ دونوں دھڑے ایم ایم اے کے بغیر حکومت نہیں بنا سکتے تھے لہٰذا ایم ایم اے سے ان دھڑوں نے رابطے تیز کر دیئے۔ (۲۷۹)

ان حالات میں قومی حکومت بنائے جانے کی افواہیں بھی گردش کرنے لگیں، اکثر تجزیہ نگار اس رائے کا کھلم کھلا اظہار کر رہے تھے کہ تمام محب وطن قوتوں کو ایک میز پر بٹھا کر معاملات طے کر لیے جائیں ان لوگوں کا خدشہ کسی حد تک بجا تھا: "..... منقسم (Split) مینڈیٹ سامنے آنے کے بعد حکومت (مجبور ہو جائے گی کہ اسے) بڑے ناموں میں سے ہی

کوئی چننا پڑے گا یا پھر مختلف جماعتوں کے درمیان جس نام پر اتفاق رائے ہوگا، اسے لانا پڑے گا۔ بھارت میں جب اس طرح کا سپلٹ یا منقسم مینڈیٹ سامنے آیا تو پھر دیوگوڑا، وی پی سنگھ اور آئی کے گجرال وزیراعظم بنے تھے۔ ان تینوں کے ادوار بڑے مختصر رہے پاکستان کی مخلوط حکومت کو بھی ایسے ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا مخلوط حکومت کے مقابلے میں قومی حکومتوں کی کارکردگی بہتر رہتی ہے ..... پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں قومی مفادات کے بجائے سیاسی مخالفین اور رنجشوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے پالیسیوں پر اتفاق رائے کے بجائے شخصی اختلاف زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس وقت پاکستان کو اتحاد کی جتنی ضرورت آج ہے شاید (پہلے) کبھی نہیں تھی مگر پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کو ناپسندیدہ عناصر سمجھا جارہا ہے۔ بے نظیر بھٹو، نواز شریف اور الطاف حسین سے اس وقت مدد حاصل کرنے میں کیا امر مانع ہے، وہ سب ہر لحاظ سے محب وطن ہیں۔ اگر اس وقت ملک کے منتخب نمائندہ اور ملک کی سیاسی جماعتوں کو اکھٹے بٹھا کر ایک قومی ایجنڈا تشکیل دے دیا جائے تو اس بات کا امکان ہے کہ حکومت ۵ سال کا عرصہ پورا کرے گی۔ فوجی حکومت کے حکمت کاروں کو بھی انتخابات کے نتائج کے بعد سمجھ لینا چاہیے کہ ملک میں سب ٹھیک نہیں ہے اگر ملک میں سیاسی عناصر کے ساتھ ڈائیلاگ کرکے ملک کے معاملات کو نہ چلایا گیا تو پاکستان میں بھی تیونس کی سی صورتحال پیدا ہوسکتی ہے۔

مذہبی جماعتوں کے اتحاد مجلس عمل نے ان انتخابات میں کامیابی حاصل کی ہے اگر یہ عناصر جمہوری عمل سے مایوس ہوگئے یا انہیں ان کے مینڈیٹ کے مطابق اقتدار میں حصہ نہ ملا تو الجزائر یا مصر کی طرح تشدد پسند کارروائیاں ہوسکتی ہیں خوش قسمتی یہ ہے کہ متحدہ مجلس عمل کے سارے قائدین جہاندیدہ اور تجربہ کار ہیں ..... قاضی حسین احمد ہوں یا مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا فضل الرحمٰن ہوں یا مولانا سمیع الحق بھی سیاسی نزاکتوں سے آگاہ ہیں اس لیے مجلس عمل کی طرف سے انتہا پسندانہ لائن لینے کا کوئی چانس نہیں ہے تاہم فوجی حکومت کو قومی تقاضوں کا احساس کرتے ہوئے قومی مصالحت کی طرف قدم بڑھانا چاہیے تمام سیاسی رنجشوں کو بھلا دینا چاہیے اگر کوئی مصلحت کے حوالے سے تاخیر کی گئی تو منقسم مینڈیٹ کے جو اشارات انتخابات میں نظر آئے ہیں وہ کل کو ملک میں انارکی، فضا کو جنم دے سکتے ہیں اور پھر لبرل اور مذہبی عناصر کے درمیان ایک نئی مخاصمت شروع ہوگی جس کی انتہا کشت وخون پر منتج ہوگی۔ (۲۸۰)

ابھی ملک میں سیاسی صورتحال کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھا تھا کہ ایم ایم اے نے حکومت کے لیے ایک پریشانی اور کھڑی کرکے حکومت سازی عمل کو مشکلات سے دوچار کردیا کہ متحدہ مجلس عمل عبوری آئین حکم (P.C.O. Provisional Constitution Order) کے بجائے آئین کے تحت حلف اٹھانے کا اعلان کردیا۔ (۲۸۱)

یہ حکومت پر دباؤ بڑھانے کا ایک حربہ بھی ہوسکتا تھا اگرچہ ایم ایم اے کا موقف صحیح تھا مگر پھر بھی متحدہ مجلس عمل سیاسی عمل میں بھرپور طرح پر شریک تھی متحدہ مجلس عمل نے سیاسی جماعتوں سے اتحاد کے لیے روابط مسلسل جاری رکھے اور کسی مرحلے پر کوئی التوائی حربہ استعمال نہیں کیا اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ایم ایم اے پی سی او کے تحت حلف نہ اٹھانے کے عمل کو اصولی بنیادوں پر نکتہ اختلاف بنایا تھا بالفاظ دیگر متحدہ مجلس عمل نے ہر مرحلہ پر سیاسی بلوغت کا مظاہرہ کیا جس کی واحد وجہ اس میں شامل دینی سیاسی جماعتوں کے اکابرین تھے جنہوں نے ۱۹۷۰ء سے لے کر ۲۰۰۲ء تک تیس بتیس برس تک خارزار سیاست کی خاک چھانی تھی چنانچہ سیاسی روابط کے تحت متحدہ مجلس عمل نے سیاسی جماعتوں سے اتحاد پر مذاکرات کے لیے چار رکنی کمیٹی تشکیل دے دی کمیٹی کے ذمہ یہ کام تھا کہ دیگر سیاسی گروپوں سے اقتصادی اور خارجہ پالیسی سمیت اسلامی قانون سازی پر مشتمل مجلس عمل کے تین نکاتی ایجنڈا پر بات کرے ان نکات میں آئین کی بحالی، اقتصادی مسائل کا حل، پارلیمانی نظام کا تحفظ، ملک میں بیرونی مداخلت کا خاتمہ اور کشمیری وافغان عوام کی اخلاقی وسیاسی مدد وغیرہ بطور ذیلی نکات شامل تھے۔ (۲۸۲) مزید برآں مجلس عمل کے جنرل سیکریٹری مولانا فضل الرحمٰن وزارت عظمٰی کے امیدوار جبکہ نائب امیر جماعت اسلامی لیاقت بلوچ کو اسپیکر کے لیے نامزد کیا گیا مذکورہ چار رکنی کمیٹی لیاقت بلوچ کی سربراہی میں قائم کی گئی جن میں دیگر ممبران حافظ حسین احمد، قاضی عبدالطیف اور پیر اعجاز ہاشمی شامل تھے۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے کمیٹی کے قیام کے بعد خطاب کرتے ہوئے کہا کہ متحدہ کی سپریم کونسل نے وزیراعظم اور اسپیکر کے لیے اپنے امیدوار نامزد کردیئے ہیں (۲۸۳)۔ انہوں نے انتخابات کے انعقاد کے سلسلہ میں حکومت پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ انتخابات عمومی طور پر درست تھے مگر انتخابات کے انعقاد کے ساتھ ساتھ شفاف اور منصفانہ انتخابات کرانے کا وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا نہیں کیا گیا بلکہ نچلے لوگوں نے دھاندلی کرائی کراچی میں کئی سیٹوں پر

دھاندلی ہوئی۔ ۱۰ قومی اور ۱۲ صوبائی حلقوں کا رزلٹ ۳۲ گھنٹے روکا گیا کئی جگہوں پر پولنگ ایجنٹوں اور پریزائڈنگ افسروں کو اغواء کر کے ووٹ ڈلوائے گئے اگر ان علاقوں میں جہاں اعتراضات ہیں دوبارہ الیکشن کروائے جائیں تو کچھ دھاندلی کے اثرات کم ہو جائیں گے (۲۸۴)۔ تاہم مولانا نورانی نے امید ظاہر کی کہ متحدہ مجلس عمل قومی سطح پر مفاہمت کی کوششیں جاری رکھے گی (۲۸۵)۔ کیونکہ ان کے بقول حالات کی نزاکت کا تقاضا یہ ہے کہ مفاہمت کے عمل کو فروغ دیا جائے اور پھر یہ کہ جنرل مشرف کی جانب سے انتقال اقتدار میں کوئی رکاوٹ نہیں جو کہ صورت حال کے مثبت ترین پہلو تھا۔ (۲۸۶)

متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کو اگرچہ عوامی سطح پر بہت پذیرائی کی نظر سے دیکھا گیا تھا لیکن عالمی سطح پر اسے رجعت پسند عناصر کا غلبہ قرار دیا گیا ان حالات میں حکومت نے عالمی برادری کو باور کرایا کہ قاضی، نورانی اور فضل الرحمٰن ذمہ دار لوگ ہیں اور پاکستانی سیاست کے دھارے میں شامل ہیں یہ لوگ طالبان کے نہیں بلکہ پاکستان کے حامی ہیں اس وقت کے وزیر داخلہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر کے بقول دنیا کو متحد مجلس عمل کے آنے سے پریشان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس میں شامل لوگ جب حکومت میں آئیں گے تو پاکستان کے مفاد اور علاقائی اور بین الاقوامی تقاضوں کے تحت اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ متحدہ مجلس عمل کے لیڈروں نے کبھی دہشت گردوں کی حمایت نہیں کی اور یہ لوگ فرقہ واریت کے خلاف کام کرتے رہیں ہیں اگر انہوں نے امریکہ کی پالیسیوں سے اختلاف کیا ہے یہ ان کا حق ہے لیکن انہیں بھی ملکی مفاد عزیز ہے کیونکہ قومی دھارے میں شامل لوگ ایک طویل عرصے سے میدان سیاست میں ہیں۔ مزید برآں ابھی تک امریکہ نے ایم ایم اے کی کامیابی پر کسی قسم کی تشویش یا تحفظات کا اظہار نہیں کیا۔ (۲۸۷)

۱۸ اکتوبر ۲۰۰۲ء تک متحدہ مجلس عمل اور مسلم لیگ (ق) کے درمیان رابطے انتہائی اہم مراحل میں داخل ہوگئے۔ متحدہ کی طرف سے قومی اسمبلی کے اسپیکر سمیت پانچ سے زائد وزارتیں اتحاد کو دینے کی تجویز کو مسلم لیگ (ق) نے خوش دلی سے قبول کر لیا جبکہ مجلس عمل متحدہ کے حافظ سلمان بٹ کو ریلوے وزارت دینے پر بھی رضامندی ظاہر کر دی (۲۸۸)۔ تاہم مجلس عمل نے واضح کیا کہ وہ وزارت عظمیٰ کے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوگی۔ (۲۸۹) جس سے ڈیڈلاک کی کیفیت پیدا ہوگئی اس صورتحال سے نکالنے کے لیے متحدہ مجلس عمل نے مولانا نورانی

کو مکمل اختیارات دے دیئے (۲۹۰) کہ وہ اپنی اسی بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے فیصلہ کریں کہ آیا حکومت سازی کے لیے تعاون کیا جائے یا اپوزیشن میں بیٹھا جائے (۲۹۱)۔ اس مقصد کے لیے مولانا نورانی کی سربراہی میں کمیٹی قائم کردی دیگر ممبران میں مولانا عبدالغفور حیدری، لیاقت بلوچ، پیر اعجاز ہاشمی اور قاضی عبداللطیف کو شامل کیا گیا اس کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں متحدہ کے آئندہ اقدامات کا انحصار تھا۔

مولانا شاہ احمد نورانی کی شخصیت پر متحدہ مجلس عمل کے اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ ان کی بطور سربراہ کامیاب کارکردگی کو سراہتے ہوئے انہیں بدستور اتحاد کا صدر رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ قبل ازیں مولانا شاہ احمد نورانی کا انتخاب چھ ماہ کے لیے عمل میں لایا گیا تھا جس کی مدت اختتام کے بعد صدر کا عہدہ حسب ضابطہ قاضی حسین احمد کو دے دیا جاتا۔ تاہم قاضی حسین احمد نے درخواست کی کہ مولانا نورانی کی زیر قیادت متحدہ مجلس عمل کامیاب رہی ہے اور اس لیے وہ بدستور صدر کی حیثیت سے کام کریں جسے مولانا نورانی نے طوعاً کرہاً قبول کرلیا۔ (۲۹۲)

جب ق لیگ سے تمام معاملات طے نہ ہوئے تو مولانا نورانی نے واضح اعلان کر دیا کہ اپوزیشن میں بیٹھنا پسند کریں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مولانا نورانی دیگر سیاسی جماعتوں سے بھی برابر روابط میں مصروف تھے چنانچہ ۵ نومبر ۲۰۰۲ء کو اے آر ڈی اور مجلس عمل کے درمیان طویل مذاکرات ہوئے جن میں وزارت عظمیٰ سمیت تمام عہدوں، آئینی ترامیم، ایل ایف او، پارلیمنٹ کی بالادستی کے ساتھ ساتھ حکومت بنانے کی صورت میں داخلہ خارجہ اقتصادی اور دیگر اہم شعبوں میں پالیسیوں پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ (۲۹۳) لیکن معاملات میں تاخیر پیدا ہونا شروع ہوگئی نوابزادہ نصر اللہ خان (جو ان دنوں بھی جوڑ توڑ کی سیاست کے ماہر جانے جاتے تھے) نے اسمبلی کے اجلاس کے التواء اور حکومت سازی پر ڈیڈلاک ختم کرنے کے لیے آل پارٹیز کانفرنس (اے پی سی) بلانے کا اعلان کر دیا۔ (۲۹۴) (تاہم اس سے بھی ڈیڈلاک ختم کرنے کے سلسلے میں کوئی حل نہ نکل سکا۔) اندریں حالات صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے متحدہ مجلس عمل کی مرکز قیادت نے شرکت کی یہ اجلاس بھی حکومت سازی کے ضمن میں کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا (۲۹۵)۔ تاہم مولانا شاہ احمد نورانی نے اجلاس میں کچھ اہم فیصلے بھی کیے ان کے بقول:

اب چونکہ صدر مملکت نے اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا ہے اس لیے جو کچھ بھی ہوگا

اسمبلی کے اندر ہوگا مولانا فضل الرحمٰن اب بھی ہماری وزارت عظمٰی کے امیدوار ہیں اور ہم یہ بات ثابت کر دینا چاہتے ہیں کہ قوت کا اصل مرکز عوام اور منتخب ایوان ہے اور سیاستدان اس ایوان میں تمام مسائل حل کر سکتے ہیں۔ مسلم لیگ (ق) سے مذاکرات میں لیگل فریم ورک آرڈر کی کسی شق پر اتفاق نہیں ہوا اور اب جو بھی فیصلہ ہوگا قومی اسمبلی میں ہوگا ہم نے اپنے اصولی موقف سے صدر مملکت کو آگاہ کر دیا ہے کہ آئین کی رو سے انہیں آرمی چیف کا عہدہ چھوڑنا ہوگا (۲۹۶)۔ ہم صدارتی ریفرنڈم کو تسلیم نہیں کرتے اس کا بہتر حل یہ ہے کہ مشرف آئینی طریقے سے صدر بنے...اس وقت ملک میں مارشل لاء کا کوئی امکان نہیں اور نہ ہی ملک کا مارشل لاء کا متحمل ہو سکتا ہے مجلس عمل نے ایم کیو ایم سے مذاکرات کے لیے کمیٹی تشکیل دے دی ہے جو مذاکرات کر رہی ہے ہم اپنے موقف پر قائم ہیں اور بہت زیادہ لچک کا مظاہرہ کر رہے ہیں کیونکہ متحدہ مجلس عمل جمہوری اداروں کی سلامتی اور بقاء کی جنگ لڑ رہی ہے اور جمہوریت کے لیے تمام آئین کھلے ہیں۔ (۲۹۷)

بالآخر ۲۱ نومبر ۲۰۰۲ء کو قومی اسمبلی کے منعقدہ اجلاس میں بلوچستان کے میر ظفر اللہ خان جمالی کو وزیر اعظم منتخب کر لیا گیا انہیں ۱۷۲ ووٹ کی سادہ اکثریت حاصل ہوئی (۲۹۸)۔ اس کے مد مقابل مجلس عمل کے مولانا فضل الرحمٰن ۸۶ جبکہ پیپلز پارٹی پارلیمنٹرین کے شاہ محمود قریشی ۷۰ ووٹ حاصل کر سکے انہیں ۶۰ روز کے اندر اندر اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے کہا گیا۔ (وزیر اعظم کے انتخاب قومی اسمبلی کے ایوان کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ہوا ارکان اپنے پسند کے امیدوار کے لیے مختص گیلری میں گئے بعد ازاں ہر گیلری میں ارکان کی گنتی کے ذریعے موصولہ نتیجے کی بنیاد پر اسپیکر چوہدری امیر حسین نے حتمی نتیجے کا اعلان کیا۔ (۲۹۹)

وزیر اعظم کے انتخابات سے ملکی سیاسی فضا پر بے یقینی کے چھائے ہوئے بادل چھٹ گئے کیونکہ اگر سیاسی تعطل یونہی جاری رہتا تو عین ممکن تھا کہ ملک میں مارشل لاء لگا دیا جاتا جو یقیناً ملک وقوم کی بدقسمتی ہوتی اب متحدہ مجلس عمل نے اپنی تمام تر توجہ صوبائی معاملات اور بحالی آئین کی طرف مرکوز کر دی اس مقصد کے لیے متحد مجلس عمل نے حکومت سے مذاکرات جاری رکھنے کا اعلان کر دیا لیکن مولانا نورانی نے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ باوردی صدر تسلیم نہیں کیا جائے گا البتہ اگر صدر مشرف وردی اتار دیں تو انہیں مملکت کا دستوری سربراہ بنانے میں مجلس عمل بھرپور تعاون کرے گی..... ان کے بقول ہم جمالی حکومت کو نہیں

گرائیں گے لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ ہم نے حکومت کی حمایت کی ہماری حمایت مشروط ہے ہماری خواہش ہے کہ جمہوری عمل قائم رہے .....صوبائی معاملات کا جائزہ لینے، مقامی تنظیموں کو مضبوط بنانے اور عوامی شکایت کا جائزہ لینے کے لیے مولانا فضل الرحمٰن کی زیر سرکردگی ایک کمیٹی قائم کر دی گئی ہے...(۳۰۰)

اسی طرح متحدہ کی سپریم کونسل کا اجلاس ۱۷ دسمبر کو پشاور میں بھی طلب کیا گیا جس میں وردی کا مسئلہ، آئینی طریقہ سے صدر بننے، صوبہ سرحد اور بلوچستان کی صوبائی حکومتیں چلانے کے امور پر تعاون، لیگل فریم ورک آرڈر، نیشنل سکیورٹی کونسل، آرٹیکل ۵۸ (ٹو) بی سے تعلق معاملات پر اہم فیصلے کیے گئے (۳۰۱)۔☆

متحدہ مجلس عمل اور مسلم لیگ (ق) کے درمیان جن مذاکرات کے جاری رکھنے پر مولانا نورانی نے اتفاق ظاہر کیا تھا وہ بوجوہ ناکام ہو گئے متحدہ مجلس عمل کی قیادت نے حکومت کے ساتھ مذاکرات کا ناکامی کا اعلان کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ متحدہ وزیر اعظم جمالی کو اعتماد ووٹ نہیں دے گی اور قومی اسمبلی میں اپوزیشن کے بنچوں پر بیٹھے گی مجلس عمل نے باوردی صدر، ۵۸ (ٹو) بی اور نیشنل سکیورٹی کونسل کو مسترد کرتے ہوئے ۱۹۷۳ء کے آئین کی اصل شکل میں بحالی اور اعلیٰ عدلیہ کے ججوں سے آئین کے تحت دوبارہ حلف لینے کا مطالبہ کر دیا اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں امریکیوں کو آپریشن کی اجازت نہیں دی گئی۔ (۳۰۲)

دراصل عوام کو شروع دن سے ان امر کا یقین تھا کہ متحدہ مجلس عمل اور (ق) لیگ کے مابین مذاکرات کی بیل منڈھے نہیں چڑھ سکے گی کیونکہ مجلس عمل نے حکومت کے ساتھ تعاون کے لیے جو شرائط رکھی تھیں انہیں تسلیم کرنا جمالی حکومت کے بس کی بات نہ تھی جبکہ دوسری طرف اگر مجلس عمل اپنی ان شرائط سے دستبردار ہوتی تو اپنے کارکنوں، حامیوں اور ووٹرز کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتی اور ان کی نظروں سے گر جاتی۔ اندریں حالات وزیر اعظم جمالی کی طرف سے امریکی انتظامیہ کی عہدیدار کرسٹینا روکا کے متوقع دورہ پاکستان کے موقع پر دہشت گردی کے خلاف امریکہ عالمی مہم میں تعاون جاری رکھنے کے اعلان نے اس ضمن میں فیصلہ کن کردار ادا کیا

☆ واضح رہے کہ اس وقت تک صوبہ سرحد اور بلوچستان میں متحدہ مجلس عمل کی حمایت یافتہ حکومتیں بن چکی تھیں۔ صرف سندھ میں حکومت سازی کا معاملہ باقی تھا جن کے مختلف سیاسی پارٹیوں میں مذاکرات جاری تھے۔

اور مجلس عمل کے قائدین کو حکومت کے ساتھ مذاکرات کی ناکامی کا اعلان کرنا پڑا۔(۳۰۳) تاہم مجلس عمل کے قائدین نے ہی کہ کر گیند حکومتی کورٹ میں پھینک دی کہ اب مذاکرات اور رابطوں کی بحالی کی ذمہ داری مکمل طور پر ق لیگ عائد ہوتی ہے لیکن جمالی کی طرف سے ایل ایف او، آئینی ترامیم اور خارجہ پالیسی کے حوالے سے سرف حکومت کے اقدمات وتائید کے بعد اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ق لیگ، متحدہ مجلس عمل کے مطالبات کو تسلیم کرنے میں کسی لچک کا مظاہرہ کرتی ادھر مجلس عمل کی پوزیشن یہ تھی کہ اسے اپنے کارکنوں، حامیوں اور رائے عامہ کے شدید دباؤ کا سامنا تھا کہ وہ مشرف حکومت کے ساتھ تعاون سے گریز کرے (۳۰۴)۔ یہی وجہ تھی کہ متحدہ کے قائد نے سیاسی معاملات پر اپنی واضح اور دوٹوک موقف سے ذرہ بھر ابروگرداں نہ کی اور ۳ جنوری ۲۰۰۳ء کو عراق پر ممکنہ امریک حملے کے خلاف ملک گیر یوم احتجاج کی کال دے دی ایم ایم اے کے بعض قائدین عراق پر حملے کو پاکستان پر حملہ تصور کرتے تھے اس کے علاوہ صوبہ سرحد ار قبائلی علاقوں میں آپریشن کرنے کی اجازت نہ دے کر بھی مجلس عمل اور جمالی حکومت کے درمیان فاصلے بڑھ گئے (۳۰۵)۔ لیکن جمالی حکومت کے لیے ایم ایم اے کا تعاون ہر قیمت پر ضروری تھا۔ اسی لیے جمالی حکومت کو اپنے تیور بدلنا پڑے جمالی کا یہ بیان کہ وہ محمد خان جونیجو کی راہ (مارشل لاء حکومت سے تعاون) پر نہیں چلیں گے ان کی بدلتی ہوئی سوچ کا غماز تھا لیکن یہ دو کشتیوں کی سواری تھی جس کا مظاہرہ کرنے والا کبھی ساحل تک نہیں پہنچتا۔ اگر جمالی ایم ایم اے کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اس حد تک چلے جاتے تو عین ممکن تھا کہ سیاسی نظام کی بساط ہی لپیٹ دی جاتی۔ لیکن اگر وہ ایم ایم اے کی طرف دست تعاون نہ بڑھاتے تو انہیں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں مشکلات پیش آسکتی تھیں (۳۰۶)۔ ان حالات میں مولانا شاہ احمد نورانی کی طرف سے بار بار یہ اعلان کہ جمالی حکومت کا اعتماد کا ووٹ نہیں دیں گے حکومت کے لیے خاصی پریشانی کا سبب تھا کیونکہ مولانا نورانی نے جمالی کو اعتماد کا ووٹ صدر مشرف کی وردی سے مشروط کر دیا تھا ان کا کہنا تھا کہ اگر جنرل پرویز مشرف ۲۳ مارچ ۲۰۰۳ء کو آرمی چیف کا عہدہ چھوڑ دیں تو متحدہ ق لیگ کے ساتھ پرویز مشرف کو آئینی صدر بنانے کا اور جمالی حکومت کو اعتماد کا ووٹ دینے پر تیار ہیں ان کے بقول "متحدہ مجلس عمل موجودہ حکومت کو وقت دینا چاہتی ہے ہم نہیں چاہتے کہ جمہوری عمل کسی قسم کے تعطل کا شکار ہو تاہم ہماری طرف سے حکومت کے سامنے چار شرائط رکھی گئی ہیں کہ

جنرل پرویز مشرف آئینی صدر بننا چاہتے ہیں تو وہ وردی اتارنے، ۵۸ (ٹو) بی اور نیشنل سکیورٹی کونسل کو ختم کرنے کا اعلان کریں.... لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت ۵۸ (ٹو) بی کی بحالی پارلیمنٹ کی بالادستی کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ۱۹۷۳ء کا آئین غیر متنازعہ دستور ہے جسے متنازعہ نہیں بننا چاہیے تاہم لیگل فریم ورک آرڈر بھی دو تہائی اکثریت کے ساتھ دستور کا حصہ بنایا جاسکتا ہے ورنہ یہ قابل قبول نہیں۔ (۳۰۷)

۲۰۰۳ء کا سال آغاز سے ہی سیاسی سرگرمیوں کے عروج کی طرف گامزن تھا کیونکہ فروری میں سینٹ کے انتخابات ہونا تھے۔ جنرل پرویز مشرف کے جاریکردہ ایک حکم کے مطابق چاروں صوبوں میں سینٹ کے انتخابات ۴ فروری کو جبکہ اسلام آباد اور فاٹا کی نشستوں کے لیے انتخابات ۸ فروری کو ہونا قرار پائے لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت سینٹ کی ۱۰۰ نشستوں پر انتخابات کرائے جانے تھے۔ جس میں ہر صوبے کے لیے ۲۲ نشستیں مخصوص کی گئی تھیں۔ اس میں ۱۴ جنرل نشستیں، ۴ خواتین جبکہ ۴ ٹیکنو کریٹس کے لیے تھیں۔ سینٹ کی ان ۸۸ نشستوں پر ۱۴ فروری کو انتخابات ہونا تھے۔ (۳۰۸)

اس صورتحال کے تناظر میں متحدہ مجلس عمل کی سپریم کونسل کا اجلاس ہوا جس میں سینٹ کے انتخابات کے لیے حکمت عملی کی منظوری دی گئی علاوہ ازیں متحدہ مجلس عمل نے قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کے لیے ریکوزیشن دینے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں طے یہ کیا گیا کہ حزب اختلاف کی دیگر جماعتوں سے رابطہ قائم کر کے ریکوزیشن دی جائے گی۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے حکومتی حلقوں پر الزام عائد کیا کہ حکومت ضمنی انتخابات میں من پسند نتائج حاصل کرنے کے لیے سرکاری مشینری اور وسائل استعمال کر رہی ہے۔ انہوں نے چیف الیکشن کمشنر سے مطالبہ کیا کہ وہ ضمنی انعقاد تک متعلقہ انتخابی حلقوں میں وفاقی وصوبائی اور مقامی حکومتوں کو ترقیاتی منصوبوں کی منظوری دینے سے روک دیں سینٹ کے انتخابات کے حوالے سے انہوں نے واضح کیا کہ ٹکٹوں کی الاٹمنٹ کے حوالے سے ایم ایم اے میں کوئی اختلاف نہیں ان انتخابات کے لیے مشترکہ حکمت عملی تیار کر لی گئی ہے۔ (۳۰۹)

۱۵ جنوری ۲۰۰۳ء کو ضمنی انتخابات کا انعقاد عمل میں لیا گیا نتائج کے مطابق مسلم لیگ (قائداعظم) نے قومی اسمبلی کی ۵، متحدہ مجلس عمل نے ۳، جبکہ مسلم لیگ فنکشنل اور متحدہ قومی موومنٹ نے ایک ایک نشست حاصل کی۔ سرکاری مداخلت کے باوجود ایم ایم اے کے لیے

۳ نشستیں حاصل کرنا ایک معرکے سے کم نہیں تھا مولانا نورانی نے کہا کہ سرکاری مشینری کے بے دریغ استعمال کے باوجود راولپنڈی، چارسدہ اور ٹیکسلا میں ایم ایم اے کی شاندار کامیابی اس بات کی دلیل ہے کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے بعد اب ملک بھر میں قوم تبدیلی چاہتی ہے اس کامیابی سے جمالی حکومت کو اپنی وقعت کا اندازہ لگالینا چاہیے۔(۳۱۰)

سینٹ کے انتخابات میں مولانا شاہ احمد نورانی کی نامزدگی عام انتخابات کے فوراً بعد ہی کر دی گئی تھی۔ مولانا نورانی اس ضمن میں پس و پیش سے کام لیتے رہے تھے لیکن ان کے رفقاء بالخصوص قاضی حسین احمد نے انہیں قائل کیا کہ ایوان بالا میں ان کی موثر آواز کی ضرورت ہے اس لیے بالآخر مولانا نورانی کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہاں کرنا پڑی(۳۱۱)۔ لیکن ادھر صورتحال یہ تھی کہ مولانا نورانی کو سینٹ کے انتخابات میں شکست دینے کے لیے حکومتی وزراء سرگرم عمل ہوگئے۔ وفاق اور سندھ حکومت میں شامل بعض جماعتوں کے رہنما اور وزراء کی یہ کوشش تھی کہ مولانا شاہ احمد نورانی کو سینٹ سے باہر رکھ کر ایم ایم اے کے اندر اختلافات پیدا کیے جائیں۔(۳۱۲)

تاہم یہ ہم سازشیں کامیاب نہ ہوسکیں اور مولانا شاہ احمد نورانی سینیٹر منتخب ہوگئے۔ چاروں صوبوں میں ۸۸ نشستوں کے لیے سینٹ کے انتخابات ۲۴ فروری ۲۰۰۳ء کو پایہ تکمیل تک پہنچے۔ نتائج کے مطابق ق لیگ نے ۳۱، مجلس عمل نے ۱۸ اور پیپلز پارٹی پارلیمنٹرین نے مجموعی طور پر ۱۱ نشستیں حاصل کیں۔ سندھ میں حکومتی اتحاد نے ۱۴ جبکہ اپوزیشن نے ۸ نشستیں حاصل کیں۔ سندھ، پنجاب اور بلوچستان میں ق لیگ جبکہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل سرفہرست رہی(۳۱۳)۔ اسی اثناء میں پوری دنیا میں امریکہ مخالف مظاہرے شروع ہوگئے کیونکہ مارچ میں عراق پر امریکی حملہ متوقع تھا جس کی پوری دنیا میں مذمت کی جارہی تھی۔ متحدہ مجلس عمل نے عراق مسلمانوں سے اظہار یکجہتی کے لیے ۲ مارچ ۲۰۰۳ء کو ملین مارچ کی کال دے رکھی تھی اس دن پاکستان بھر میں بلا مبالغہ لاکھوں لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور امریکہ کی بھرپور مذمت کی۔(۳۱۴) اور امریکی مصنوعات کے بائیکاٹ کے اعلان کی ایک اندازے کے مطابق صرف کراچی میں ۳۵ لاکھ سے زائد افراد نے ملین مارچ میں شرکت کی۔(۳۱۵)۔

۹ مارچ ۲۰۰۳ء کو راولپنڈی میں ہونے والے ملین مارچ میں بھی ہزاروں لوگوں نے شرکت کی(۳۱۶)۔ ۱۲ مارچ کو چیرمین اور ڈپٹی چیئرمین سینٹ کا انتخاب عمل میں آیا اور

ق لیگ کے محمد میاں سومرو بلا مقابلہ چیرمین سینٹ جبکہ کمانڈر خلیل الرحمٰن ڈپٹی چیئرمین سینٹ منتخب ہوگئے۔(۳۱۷)

جیسا کہ متوقع تھا ۲۰ مارچ ۲۰۰۳ء کو امریکہ نے عراق پر حملہ کر دیا۔ جس کی مذمت کے لیے ملک بھر میں ملین مارچ منعقد کیے گئے لوگ جہاد جہاد جہاد کے نعرے لگاتے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے۔ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں لوگوں کی ایک کثیر تعداد سڑکوں پر نظر آئی۔(۳۱۸) حالات کی نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے ۹ اپریل ۲۰۰۳ء کو ایم ایم اے کا اجلاس منعقد ہوا جس میں خارجہ پالیسی اور ایل ایف او پر حکومتی موقف مسترد کر دیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی کے بقول:

ایل ایف او پر ہمارے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ صدر مشرف نے وردی نہ اتاری تو مشرقی پاکستان جیسا سانحہ رونما ہوسکتا ہے۔ امریکہ جنگی مجرم ہے اور اقوام متحدہ نے جنگ رکوانے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا لہٰذا کوفی عنان مستعفی ہوجائیں۔ پاکستانی عوام امریکی و برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں۔ چودہ اپریل کو حیدرآباد، بعد ازاں مظفرآباد اور جیکب آباد میں ملین مارچ ہوں گے۔ متحدہ مجلس عمل عراق کے نہتے عوام اور شہری آبادی سمیت پاکستان کے سفارتخانے، روسی قافلے، ہسپتال، کالج یونیورسٹی اور صحافیوں پر امریکی و اتحادی افواج کی بے رحمانہ فائرنگ کی شدید مذمت کرتی ہے امریکہ افغانستان میں ۳ لاکھ افراد کے قتل کا ذمہ دار ہے اور اس نے جنیوا کنونشن کی دھجیاں بکھیر دی ہیں.... عراق پر حکومت کی پالیسی تذبذب خوف اور بزدلی کا شکار ہے موجودہ عالمی بحران میں نئے اقدامات اور نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے جہاں تک لیگل فریم ورک آرڈر کا تعلق ہے اس پر جنرل مشرف اور میر ظفر اللہ جمالی کا موقف غیر آئینی، غیر جمہوری اور غیر اخلاقی ہے متحدہ مجلس عمل نے کبھی ایل ایف او کو تسلیم نہیں کیا یہ متنازعہ اور فرد واحد کا دیا ہوا ہے جبکہ آئین میں ترامیم آئینی طریقے سے ہی ممکن ہے، متحدہ مجلس عمل کا موقف ایل ایف او پر دوٹوک اور واضح ہے اس حوالے سے اب تک ہونے والے تمام مذاکرات بے نتیجہ رہے ہیں۔(۳۱۹)

یہ ایم ایم اے کا دوٹوک موقف ہی تھا جس نے حکومت کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں حکومت کی کوشش تھی کہ پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے قبل متحدہ مجلس عمل کو قائل کر لیا جائے تاکہ مشترکہ پارلیمنٹ سے جنرل پرویز مشرف کے خطاب کو ممکن بنایا جاسکے لہٰذا اہتمام متناز

امور پر بات چیت کے لیے ایم ایم اے کو دعوت دیتے رہے ۲۵ اپریل کی تاریخ مقرر ہوئی۔ تاہم حکومت نے یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ حکومت صدر کی وردی پر بات چیت کے لیے بھی تیار ہے۔ لیکن وردی اتارنے کے ٹائم فریم کے حوالے سے ایم ایم اے کو اپنے موقف میں لچک پیدا کرنا ہوگی۔ (۳۲۰)

دیگر اختلافات کے علاوہ ایم ایم اے کو چیئر مین سینٹ کے حوالے سے شکایت تھی کہ ان کا رویہ غیر جانبدار اور منصفانہ نہیں رہا☆۔ اس لیے عدم اعتماد لانے کا آپشن بھی استعمال کیا جاسکتا تھا (۳۲۰)

جہاں تک وردی کے مسئلہ پر لچک اور ٹائم فریم کا تعلق تھا ایم ایم اے نے کافی غور وخوض کے بعد ۱۴ اگست ۲۰۰۳ء کی ڈیڈ لائن مقرر کر دی۔ (۳۲۲)

☆ جبکہ اسپیکر کا موقف یہ تھا کہ ان کیلیے حکومتی اور اپوزیشن اراکین سینٹ یکساں اہمیت رکھتے تھے۔ ان کی کوشش ہے کہ سینٹ میں معاملات افہام وتفہیم کے ساتھ چلیں، اور ایوان میں ڈیڈ لاک پیدا نہ ہو۔

ایل ایف او، پر حکومت۔ اپوزیشن مذاکرات

پہلا دور:

ایل ایف او، پر حکومت اپوزیشن مذاکرات مقررہ تاریخ (یعنی ۲۵/اپریل ۲۰۰۳ء) کو ہوئے۔ جس میں حکومتی پینل میں وزیراعظم جمالی کے ہمراہ، چوہدری شجاعت، فاروق لغاری، راؤ اسکندر اقبال، آفتاب شیر پاؤ، حامد ناصر چٹھہ، صفوان اللہ، جسٹس (ر) عبدالرزاق تھہیم، اور منیر خان اورک زئی نے حصہ لیا جبکہ متحدہ مجلس عمل اور دیگر اپوزیشن جماعتوں کی طرف سے مولانا شاہ احمد نورانی، قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا سمیع الحق، علامہ ساجد نقوی، پروفیسر ساجد میر، امین فہیم، سید نوید قمر، چوہدری اعتزاز احسن، مخدوم جاوید ہاشمی اور اسحاق ڈار نے بات چیت کی۔ ہونے والے مذاکرات میں متحدہ اپوزیشن نے یک نکاتی ایجنڈے ایل ایف او پر اپنے تحفظات پیش کیے۔ حکومت نے مؤقف اختیار کیا کہ اپوزیشن ایل ایف او پر ترمیمی بل پارلیمنٹ میں پیش کرے حکومت کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا (۳۲۳)۔ پارلیمنٹ کا فیصلہ سب کو قبول کرنا چاہیے (۳۲۴)۔☆

دوسرا دور:

چنانچہ فریقین کے پانچ پانچ ارکان پر مشتمل مشترکہ کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا سربراہ وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی (یا ان کا نمائندہ) بنائے گئے اس گیارہ رکنی کمیٹی نے ایل ایف او کے مسئلہ پر متفقہ ڈرافٹ ۵ مئی سے قبل تیار کرنا تھا۔ اس بات کا فیصلہ حکومت اپوزیشن مذاکرات کے دوسرے دور میں ہوا جو ۲۸/اپریل کی شب وزیراعظم ہاؤس اسلام آباد میں ہوئے (۳۲۶)۔

☆ قاضی حسین احمد کے بقول لیگل فریم ورک آرڈر کے حوالے سے، صدر مملکت کے پاس آرمی چیف کا عہدہ رکھنے، صوابدیدی اختیارات، ججوں کی مدت ریٹائرمنٹ میں توسیع، ۵۸ (ٹو) بی کے تحت اسمبلی تحلیل کرنے کا اختیار، نیشنل سکیورٹی کونسل کا قیام اور شیڈول ۶ میں کچھ ادارے شامل کرنا، جیسے ۷ امور کی نشاندہی کی گئی۔
(روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی، ۱۶/اپریل ۲۰۰۳ء) (۳۳۵)

تیسرا دور:

مئی کے پہلے ہفتہ میں حکومت اپوزیشن مذاکرات کا تیسرا دور ہوا جس میں طے کیا گیا کہ ایل ایف او کے اختلافی نکات پر مرحلہ وار بحث ہوگی۔ حکومت نے ایل ایف او پر مشاورت کلا مسودہ اجلاس میں پیش کر دیا۔ یہ بے طے پایا کہ مشترکہ کمیٹی جلد از جلد سفارشات مکمل کر کے وزیر اعظم کی سربراہی میں ہونے والی سیاسی جماعت کے سربراہی اجلاس میں پیش کی جائیں گی۔ (۳۲۷)

چوتھا دور:

مذاکراتی کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۱۲ مئی ۲۰۰۳ء میں نیشنل سیکریٹری کونسل کو آئینی کے بجائے قانونی ادارہ بنانے پر اتفاق کیا گیا (۳۲۸)۔ چونکہ سفارشات کی ڈیڈ لائن ۱۵ مئی مقرر کی گئی تھی اس لیے یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ضرورت محسوس ہوئی تو ۱۵ مئی کے بعد بھی کام جاری رہے گا۔ (۳۲۹)

پانچواں دور:

مذاکراتی کمیٹی نے ۱۳ مئی کو بھی سیاسی اور آئینی معاملات پر سفارشات مرتب کرنے کا کام جاری رکھا۔ یہ اجلاس قومی اسمبلی کے اسپیکر چوہدری امیر حسین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں قومی اسمبلی توڑنے کے صدر کے صوابدیدی اختیار پر اتفاق رائے ہو گیا۔ جبکہ صدر کی یونیفارم کا معاملہ آئندہ زیر بحث لایا جائے گا اس مقصد کے لیے اپوزیشن لیڈروں کا وفد صدر مشرف سے براہ راست بات چیت کرے گا (۳۳۰)۔ ☆ طے پایا کہ آئندہ اجلاس ۱۸ مئی کو ہوگا۔ دونوں کے وقفے کے دوران ممبران کمیٹی اپنی اپنی جماعتوں کے رہنماؤں سے مجوزہ سفارشات پر رہنمائی حاصل کریں گے۔ تا کہ اگر ان سفارشات پر اتفاق رائے نہ ہو سکا تو سربراہی اجلاس میں ان کا الگ الگ مسودہ پیش ہوگا اور حتمی فیصلے کا اختیار قائدین کو ہوگا۔ مزید برآں اس امر کو طے شدہ حقیقت (Settled Fact) قرار دیا گیا کہ آئینی پیکج کو پارلیمنٹ میں لایا جائے گا۔ جہاں دو تہائی اکثریت سے اس کی منظوری لی جائے گی۔ کمیٹی نے اس امر پر اطمینان کیا کہ معاملات خوش اسلوبی اور مثبت طریقہ سے چل رہے تھے اور عین ممکن تھا کہ اگلے دو تین اجلاسوں میں حتمی سفارشات مرتب کر لی جائیں۔ (۳۳۱)

چھٹا دور:

چھٹے مذاکراتی دور میں آئین کے چھٹے شیڈول میں شامل احکامات کی فہرست کے اضافے اور آرٹیکل ۲۷۰ (ب) میں قوانین کو توثیق کے امور پر بحث کو مکمل کیا گیا۔ مزید یہ کہ کمیٹی نے مجموعی طور پر آئین کے تحفظ، آئین کی غیر متنازعہ حیثیت برقرار رکھنے اور پارلیمنٹ کی بالادستی بحال کرنے کے امور پر تبادلہ خیال کیا۔ یہ بھی طے پایا کہ حکومت اور اپوزیشن کے نمائندے اپنی تجاویز ۱۹ مئی کو منعقدہ اجلاس میں پیش کر دیں گی۔ بعد ازاں ان تجاویز اور سفارشات پر وزیر اعظم جمالی کی زیر صدارت سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کے اجلاس میں غور ہوگا۔ (۳۳۲)

ان چھ اہم ادوار میں سوائے وردی کے مسئلہ کے، تمام امور زیر بحث آئے اور ان پر معاملات خوش اسلوبی سے طے پا گئے۔ تاہم ایم ایم اے اس بات پر قائم رہی کہ ایل ایف او کو پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے۔ مولانا نورانی کے بقول اگر پارلیمنٹ اسے دو تہائی اکثریت سے منظور کرے تو اسے آئین کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔ (۳۳۳)

نئی سیاسی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے ۲۷ مئی ۲۰۰۳ء کو ایم ایم اے کی سپریم کونسل کا اجلاس ہوا جس میں صدر کے وردی اتارنے کے لیے ۲ سال کی مدت دینے کے مسئلہ پر بحث ہوئی۔ اگرچہ متحدہ کی قیادت اس بات پر مصر تھی کہ حکومت کی طرف سے باضابطہ طور پر وردی کے مسئلہ پر دو سال کی مدت نہیں مانگی گئی لیکن متحدہ کے سیکریٹری جنرل مولانا فضل الرحمٰن نے اپنے ساتھیوں کو اس امر پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ صدر کے لیے آرمی چیف کا عہدہ محدود مدت کے لیے رکھنے کی درخواست کو قبول کر لیا جائے۔ مولانا فضل الرحمٰن نے سپریم کونسل کے اجلاس قبل مولانا نورانی سے ٹیلی فون پر رابطہ کر کے اس بات کا عندیہ دیا کہ وردی کے معاملہ پر حکومت کی درخواست پر غور کیا جائے۔ ازاں بعد مولانا فضل الرحمٰن نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر ایل ایف او کے مسئلہ پر محاذ آرائی میں شدت پیدا ہوگئی تو اس سے نہ صرف نظام کو شدید خطرات لاحق ہو جائیں گے بلکہ سرحد اور بلوچستان کی صوبائی حکومتوں کو بھی

☆ پانچویں دور میں آئین کے آرٹیکل ۴۱ (۷)، ۵۸ (۲) بی، نیشنل سکیورٹی، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کی تقرریوں اور ریٹائرمنٹ کی عمر میں توسیع کے امور پر تجاویز مرتب کی گئیں۔ (جنگ لاہور، ۱۴ مئی ۲۰۰۳ء)

ختم کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ قاضی حسین احمد کا اصرار تھا کہ فی الحال حکومت کو وردی کے مسئلہ پر کوئی رعایت نہیں دی جانی چاہیے۔ بلکہ حکومت پر احتجاج (دھرنے) کے ذریعے دباؤ بڑھایا جائے (انہوں نے اسلام آباد میں دھرنا دینے کے متعلق بھی رائے مانگی)۔ (۳۳۴)

تاہم متحدہ کی سپریم کونسل کا اجلاس کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ ۲۷ مئی ۲۰۰۳ء کی رات مولانا شاہ احمد نورانی نے قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمٰن، لیاقت بلوچ اور حافظ حسین احمد کے ہمراہ وزیراعظم جمالی اور چوہدری شجاعت حسین سے وزیراعظم ہاؤس میں ملاقات کی۔ اس ملاقات میں فریقین کے علاوہ آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل احسان، میجر جنرل احتشام ضمیر بھی موجود تھے۔ اس ملاقات (جو رات گیارہ بجے سے صبح ۴ بجے تک جاری رہی) میں صدر مملکت کو دو سال کے لیے وردی پہنے رکھنے کی مہلت دینے کا معاملہ زیر بحث رہا۔ تاہم ایم ایم اے کی قیادت وردی کے بارے میں اپنے مؤقف پر سختی سے قائم رہی اور اس بات پر زور دیا کہ صدر مزید دو سال کے لیے وردی کے مسئلہ پر لچک دار رویہ رکھتے ہیں لیکن ان کے ساتھی سخت مؤقف اختیار کیے ہوئے ہیں (۳۳۵)۔

لیکن جب ایم ایم اے نے یہ دیکھا کہ وردی کے مسئلہ پر بدستور ڈیڈلاک برقرار ہے تو حکومت پر دباؤ بڑھانے کے لیے ایم ایم اے کی سپریم کونسل سے تنبیہہ کی کہ اگر معاملات طے نہ ہوئے تو حکومت کو آئندہ بجٹ منظور کرنے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ اور ایل ایف او سمیت دیگر متنازعہ امور پر جاری مذاکرات کا حتمی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو بجٹ میں قومی اسمبلی اور سینٹ میں احتجاج جاری رہے گا (۳۳۶)۔ مزید برآں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ مجلس عمل اسلام آباد تک احتجاج مارچ کرے گی اور دس جون سے رابطہ عوام مہم شروع کر دی جائے گی۔ (۳۳۷)

چنانچہ ۷ جون کو بجٹ اجلاس کے دوران قومی اسمبلی اور سینٹ میں اپوزیشن ارکان ایل ایف او کے خلاف مسلسل نعرے لگاتے رہے اور ڈیسک بجاتے رہے۔ اپوزیشن رہنماؤں نے واضح اعلان کیا کہ اگر ایل ایف او کا معاملہ طے نہ ہوا تو بجٹ منظور نہیں کریں گے۔ (۳۳۷)

تاہم یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ متحدہ مجلس عمل کے رہنما حکومتی رویے سے خوش نہیں تھے۔ انہیں سب سے بڑا شکوہ یہ تھا کہ وزیراعظم جمالی ایل ایف او اور وردی کے مسئلے پر ہونے

والے مذاکرات کو ناکامی کی طرف لے جا رہے تھے۔ جبکہ وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات شیخ رشید احمد بے موقع اور بے تکے بیانات دے کر معاملات کو الجھا رہے تھے۔ ایم ایم اے کے اراکین کا شکوہ اس لحاظ سے بجا تھا کہ جمالی ایم ایم اے کے احسانات بھول کر اسے دیوار سے لگانے کی کوشش کر رہے تھے (۳۳۹)۔ متحدہ مجلس عمل نے ابھی تک معقول رویہ اپنایا تھا اور صدر جنرل مشرف کو آئندہ پانچ سال کے لیے سویلین صدر منتخب کرنے پر تیار تھے بشرطیکہ وردی اتارنے کا اعلان کرتے۔ اس میں متحدہ مجلس عمل نے یہ لچک رکھی کہ وہ فوری طور پر وردی اتارنے کے بجائے صرف وردی اتارنے کی تاریخ دے دیتے لیکن مشرف اس پر تیار نہیں تھے۔ اس طرح حکومتی رویے سے شاکی مجلس عمل نے رابطہ عوام شروع کر دی تا کہ حکومت کے خلاف عوام کو متحرک کیا جا سکے (۳۴۰)۔ ساتھ ہی ایم ایم اے نے حکومت کو ڈیڈلائن دے دی کہ اگر ۱۴ اگست ۲۰۰۳ء تک صدر نے وردی نہ اتاری تو حکومت اور مجلس عمل کے راستے جدا جدا ہو جائیں گے۔ ان حالات میں ایک افواہ یہ بھی گردش کر رہی تھی کہ صدر مشرف عین موقع پر وردی اتارنے کی تاریخ دے سکتے تھے جس کے بعد قومی سیاست کا نقشہ بدل جاتا اور ایم ایم اے کو حسب وعدہ مشرف کو آئندہ پانچ سال کے لیے صدر منتخب کرنا پڑ جاتا۔ (۳۴۱)

صدر کی جانب سے ان کے پرنسپل سیکریٹری طارق عزیز سمیت بہت سی اہم شخصیات نے ایم ایم اے کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔ جس کا جائزہ لینے کے لیے مجلس عمل کا لاہور میں ہنگامی سربراہی اجلاس منعقدہ ہوا جس میں مختلف حکومتی شخصیات کی پیشکشوں اور وعدوں کا بھی جائزہ لیا گیا۔ مولانا فضل الرحمٰن کی بقول جنرل مشرف کی طرف سے جو لوگ ملاقات یا مذاکرات کے لیے آئے تھے ہر ایک کی رائے دوسرے سے مختلف ہوتی (۳۴۲)۔ شاید یہ حکومت کی طرف سے کنفیوژن پیدا کرنے کی ایک کوشش تھی تاہم مجلس عمل کے رہنماؤں نے ہنگامی اجلاس میں شرکت اور مشترکہ پریس بریفنگ سے یہ ثابت کیا۔ پہلے یہ میٹنگ جے یو پی کے رہنما پیر اعجاز شاہ ہاشمی کے گھر بلائی گئی لیکن قاضی حسین احمد کی خرابی طبیعت کی وجہ سے اس کا انتظام ڈاکٹرز ہاسپٹل کے میٹنگ روم میں کیا گیا اور تمام رہنما بھی وہیں پہنچ گئے۔ جہاں قاضی نے خود تمام رہنماؤں کا استقبال کیا۔ اجلاس کے بعد بریفنگ کا انتظام پیر اعجاز ہاشمی کے گھر پر کیا گیا۔ کہ ان میں اختلافات اس شدت کے نہیں جس سے اتحاد ٹوٹنے کا خطرہ ہو۔ (۳۴۳)

اس ہنگامی اجلاس میں صوبہ سرحد کی صورتحال، بجٹ اور ایل ایف او پر حکومت سے ہونے والے مذاکرات کا جائزہ لیا گیا۔ اجلاس میں جمالی اور رشید شیخ کے رویے پر سخت برہمی کا اظہار کیا، تاہم رہنماؤں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ شیخ رشید جس قسم کے بیانات دے رہے تھے وہ حکومتی سرپرستی کے بغیر ناممکن تھے۔ اس لیے انہیں زیادہ لفٹ نہ کرائی جائے تو بہتر تھا۔ اس کا احتجاج وزیراعظم جمالی اور چودھری شجاعت حسین سے براہ راست کیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ سربراہی اجلاس کے بعد کسی بریفنگ کے دوران کسی رہنما نے شیخ رشید کا نام نہیں لیا۔ اجلاس میں ایک رہنما نے قومی اجلاس کے بجٹ اجلاس کا بائیکاٹ کرنے کی تجویز دی جسے قبول نہیں کیا گیا اور بجٹ سیشن کے دوران اسمبلی کے اندر احتجاج جاری رکھنے پر اتفاق کیا گیا (۳۴۴)۔ متحدہ مجلس عمل کے رہنما حکومتی پالیسیوں کی مخالفت ضرور کرتے رہے تھے لیکن وہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کی طرح انتہا پسندانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ بے نظیر بھٹو ایم ایم اے کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھیں۔ مولانا فضل الرحمٰن نے کھل کر یہ بات کہی کہ بے نظیر بھٹو کے بہت سے بیانات ایسے تھے جن پر ایم ایم اے کو شدید اختلافات تھے لیکن اپوزیشن کو انتراق سے بچانے کی خاطر ان بیانات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ مولانا فضل الرحمٰن نے بھی انکشاف کیا کہ سرحد حکومت کے خاتمے کے لیے امریکی دباؤ موجود تھا۔ کیونکہ امریکہ صوبہ سرحد میں علماء کی حکومت کا روادار نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ امریکہ کے وفادار ایم ایم اے کی حکومت ختم کر کے سرحد میں گورنر راج کا نفاذ چاہتے تھے (۳۴۵)۔ ان حالات میں سب سے افسوس ناک بات یہ تھی کہ ایل ایف او کو قابل قبول بنانے کے لیے متحدہ مجلس عمل پہلے ہی اپنی سفارشات پیش کر چکی تھی لیکن حکومتی حلقوں کی طرف سے اس بات کا اشارہ تک نہیں دیا گیا کہ کون کون سے نکات حکومت کو قبول تھے اور کن نکات پر مزید گفتگو کی ضرورت تھی۔ اس لیے ایم ایم اے کے بعض رہنما جمالی حکومت کے نمائندوں سے مذاکرات کے بجائے صدر جنرل مشرف سے براہ راست مذاکرات کے حامی تھے۔ (۳۴۶) اس پر مستزاد یہ کہ اسپیکر قومی اسمبلی کا رویہ بھی ایم ایم اے کے نزدیک، غیر جانبدار اور منصفانہ نہیں تھا۔ اس لیے اسپیکر کے خلاف تحریک عدم اعتماد لائی گئی جس پر رائے شماری ۲۳ جون ۲۰۰۳ء کو ہونا تھی، لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ رائے شماری کے دن مجلس عمل کے ارکان حزب اختلاف کی دیگر جماعتوں کے ساتھ پارلیمنٹ لاجز سے پارلیمنٹ ہاؤس تک مارچ

کریں گی۔ اس طرح لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت مدت ملازمت میں توسیع قبول نہ کرنے کی ججوں سے اپیل کے لیے پارلیمنٹ ہاؤس سے سپریم کورٹ تک احتجاجی مارچ کیا جائے گا۔ (۳۴۷)

تاہم اسپیکر کے خلاف تحریک عدم اعتماد کامیاب نہ ہو سکی۔ ادھر جنرل پرویز مشرف نے مولانا فضل الرحمٰن کے بقول ایل ایف او پر سمجھوتہ کرنے کی غرض سے دینی مدارس کی اسناد کو حل کرنے اور سرحد حکومت کو تحفظ فراہم کرنے کی پیشکش کی تھی۔ تاہم مولانا فضل الرحمٰن نے یہ واضح کیا کہ اگر دینی مدارس کی اسناد کو منسوخ کیا گیا تو متحدہ مجلس عمل سپریم کورٹ میں ان کا دفاع نہیں کرے گی کیونکہ جن ججوں نے ایل ایف او کے تحت مدت ملازمت میں توسیع حاصل کر رکھی ہے ان سے انصاف کی کوئی توقع نہیں رکھی جا سکتی (۳۴۸)۔ ان کے بقول ایم ایم اے نے حکومت کو راستہ دیا۔ نرم رویہ اختیار کیا لیکن حکومت اس سے قطعی فائدہ نہ اٹھا سکی جبکہ الٹا الزام دیا گیا کہ ایم ایم اے والے تعاون نہیں کرتے لیکن خود حکومت نے آئینی کمیٹی کی سفارشات پر سربراہی اجلاس نہ بلایا۔ جنرل مشرف نے شریعت بل کی مخالفت دینی مدارس اسناد اور ناظمین کے تنازعات پیدا کر کے محاذ آرائی شروع کر دی۔ حکمران ایسی جماعت کو جھکانا چاہ رہے تھے جس نے ہمیشہ جمہوریت کے لیے جدوجہد کی ایک تنہا شخص (مشرف) دنیا کو یہ تاثر دے رہا تھا کہ پارلیمنٹ بے معنی ہے، آئین جمہوریت سب سے بے معنی تھے۔ جنرل مشرف کو چاہیے تھا کہ وہ جمالی کی جگہ خود فرنٹ لائن پر آئیں تا کہ ان سے براہ راست مذاکرات کیے جا سکیں۔ (۳۴۹)

تاہم اندریں حالات سیاسی و آئینی بحران کے حل کی کوئی صورت نہ تھی۔ ایم ایم اے وردی کے مسئلہ پر مزید کوئی لچک دکھانے کے لیے تیار نہ تھی (۳۵۰)۔ بحران کا ایک ہی حل تھا کہ حکومت پر دباؤ ڈال کر اسے براہ راست پر آنے کے لیے مجبور کر دیا جائے۔ چنانچہ ایم ایم اے نے ۶ جولائی ۲۰۰۳ء کو جماعت اسلامی کے ہیڈ کوارٹر منصورہ (لاہور) میں آل پارٹیز کانفرنس (اے پی سی) کا انعقاد کیا۔ جس میں صدر جنرل پرویز مشرف کے خلاف ۱۴؍ اگست کو (لیاقت باغ راولپنڈی میں بڑے احتجاجی جلسہ سے) تحریک شروع کرنے، کوئٹہ کی امام بارگاہ و مسجد میں جمعہ کو ہونے والی دہشت گردی کے خلاف ۱۱ جولائی کو ملک بھر میں یوم احتجاج اور یوم سوگ منانے کے اعلانات کیے گئے۔ اے پی سی میں شریک رہنماؤں نے

حکومت پر واضح کیا کہ اگر حکومت نے پالیسیاں نہ بدلیں تو مجلس عمل اسمبلیوں کی رکنیت سے مستعفی ہونے کا آپشن استعمال کرے گی (۳۵۱)۔ اے پی سی میں اے آر ڈی کے سربراہ نوابزادہ نصر اللہ، متحدہ مجلس عمل کے صدر مولانا شاہ احمد نورانی، قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمٰن، جاوید ہاشمی، مولانا سمیع الحق، حافظ حسین احمد، علامہ سبطین کاظمی، مصباح الرحمٰن اور جنرل (ر) حمید گل سمیت ۴۶ سے زیادہ سیاسی رہنماؤں اور بائیس جماعتوں نے شرکت کی (۳۵۲)۔ مجلس عمل کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے اس موقع پر کہا کہ ملک کی آزادی و سلامتی کے لیے جدوجہد قومی فریضہ ہے۔ قوم اس بات پر متفق ہے کہ چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کیلیے آگے بڑھا جائے۔ ہم حکومت کی آمرانہ روش کے خلاف مشترکہ جدوجہد کریں گے ایم ایم اے نے کبھی مذاکرات سے انکار نہیں کیا۔ لیکن جن کے پاس اختیار ہے وہ خود مذاکرات کے لیے آئیں ۳۵۳)۔ کانفرنس کے اختتام پر مشترکہ اعلامیہ پیش کیا گیا۔ جس میں کہا گیا:

"کانفرنس کی رائے میں جنرل پرویز مشرف پاکستان کے صدر نہیں۔ انہیں اپنے حالیہ دور میں پاکستان کی نمائندگی کرنے اور مطالبات تسلیم کرنے کا سرے سے کوئی حق نہیں تھا۔ اس کے باوجود کیمپ ڈیوڈ میں صدر صدر بش کے ساتھ مذاکرات میں جنرل پرویز مشرف کے اسرائیل کو تسلیم کرنے، ایٹمی صلاحیت محدود کرنے، ایران کے خلاف امریکی اقدامات میں تعاون کرنے پر رضا مند ہونے جیسے اقدامات پر پورا ملک شدید تشویش میں مبتلا ہو گیا ہے۔ مسئلہ کشمیر پر امریکہ نے بھارت کی رضا مندی کے بغیر کوئی کردار ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کے برعکس صدر بش نے جنرل مشرف پر پھر دباؤ ڈالا کہ مقبوضہ کشمیر میں سرحد پار دہشت گردی کم ہوئی ہے لیکن اسے پورے طور پر ختم نہیں کیا گیا۔ امریکہ کو اس اندوہناک صورتحال سے کوئی تشویش نہیں کہ بھارت کی ساتھ لاکھ فوج برسوں سے مقبوضہ کشمیر میں ظلم کے پہاڑ ڈھا رہی ہے۔ اب تک تقریباً ۸۰ ہزار کشمیریوں کو بے رحمی کے ساتھ شہید کیا جا چکا ہے۔ امریکہ نے محض تین بلین ڈالر کی ادائیگی کا وعدہ کیا جو کانگریس کی منظوری سے مشروط ہے اور جو پانچ برسوں پر محیط ہو گی۔ اس رقم کا بھی بڑا حصہ اسلحہ کی خرید اور قرضوں کی ادائیگی میں صرف ہو جائے گا۔ جنرل مشرف کی جانب سے یہ یک طرفہ اقدامات انتہائی دور رس مضمرات رکھتے ہیں اور یہ عوام اور فوج کے درمیان دوری کا سبب بن رہے ہیں۔ جنرل مشرف کے یہ آمرانہ اور عاقبت اندیشانہ اقدامات فوج کے نیک نامی اور ساکھ کو متاثر کر رہے ہیں۔ بالخصوص عراق

میں پاکستانی فوج بھیجنے کا یکطرفہ فیصلہ ملک و ملت کے مفادات کے منافی ہے۔ ہم اس فیصلے کو سختی کے ساتھ مسترد کرتے ہیں اور اپنی فوج کو کرائے کے سپاہی نہیں بننے دیں گے۔" (۳۵۴)

کانفرنس پاکستان میں متفقہ آئین کے تحفظ کے لیے ہر ممکن اقدامات کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ کوئی فرد واحد کو آئین میں من مانی ترامیم کرنے کا سرے سے کوئی حق حاصل نہیں، آئین میں تبدیلی کے طریقے وہی ہو سکتا ہے جو آئین میں درج ہے (۳۵۵)۔ جنرل مشرف نے ایل ایف او کے ذریعے متفقہ آئین کا حلیہ بگاڑ دیا۔ تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں مرتکز کر لیے۔ قومی اسمبلی تحلیل کرنے کا اختیار حاصل کر لیا۔ انہیں اصرار ہے کہ آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ صدر بھی رہیں گے اور آرمی چیف بھی، نیشنل سکیورٹی کونسل کی تشکیل سے پارلیمنٹ ذیل ادارہ بن گئی ہے۔ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی مدت ملازمت میں تین سال کی توسیع کر کے عدلیہ کی آزادی، اعتماد اور وقار کو بھی مجروح کر دیا گیا۔ اسی اہم ترین قومی مسئلہ میں حکومت کی ہٹ دھرمی اور ضد نے پارلیمنٹ کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ (۳۵٦)

کانفرنس کی طرف سے سپریم کورٹ بار کے دفاتر کی تالا بندی کی مذمت کی گئی اور وکلاء برادری کی جانب سے آئین کی بالادستی، عدلیہ کی آزادی اور وقار کے لیے جانے والی مساعی اور جدوجہد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ شرکائے کانفرنس نے وکلاء کو بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ شرکاء نے کہا کہ موجودہ سیاسی بحران کو مذاکرات اور مفاہمت کے ذریعے حل کرنے کے بجائے حکومت محاذ آرائی کے راستہ پر گامزن ہے۔ الیکشن کمیشن کی جانب سے ڈگری کو تسلیم کرنے کے باوجود متحدہ مجلس عمل کے ایک رکن قومی اسمبلی (مفتی ابرار) کو نا قابل قرار دے دیا گیا (۳۵۷)۔ یہ فیصلہ عدالتی نہیں سراسر سیاسی ہے۔ جس کا مقصد اپوزیشن پر ناروا دباؤ ڈالنا ہے۔ جنرل پرویز مشرف صوبہ سرحد کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے اور آئینی تقاضوں سے گریز کر کے آئین کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ صوبائی خود مختاری میں دخل اندازی سالمیت پاکستان کے خلاف ہے جبکہ دوسری جانب صوبہ سندھ میں انتہا پسند عناصر کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے حکومت میں شامل ایک جماعت (متحدہ قومی موومنٹ) کھلم کھلا علیحدگی کے نعرے بلند کرتی ہے اور اس سے تعرض نہیں کیا جاتا۔ (۳۵۸)

شرکائے کانفرنس نے ملک بھر میں پانی اور بجلی کے بحران، ہر روز بڑھتی ہوئی گرانی،

بیروزگاری، بدامنی اور حکومت کی طرف سے عوام کے جان و مال کے تحفظ میں ناکامی پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ حکومت عوامی مسائل کو حل کرنے کے بجائے اپنی تمام تر توجہ اور قوت اپوزیشن کو کچلنے اور اس کی آواز دبانے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ اس کا یہ طرز عمل ملکی اور قومی مفاد کے سراسر خلاف ہے (۳۵۹)۔ ایک جانب تو سویلین ملازمتوں میں چھانٹی کر کے لوگوں کو بیروزگار کیا جا رہا ہے اور دوسری جانب سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں حاضر اور ریٹائرڈ اعلیٰ فوجی افسر اعلیٰ مناصب پر بھاری مشاہروں اور مراعات کے عوض تعینات کیے جا رہے ہیں۔ جن کے نہ تو وہ اہل ہیں اور نہ ہی ان مناصب کے لیے تربیت یافتہ۔ کانفرنس کی رائے میں قومی احتساب بیورو اپنے فرائض کی انجام دہی میں سراسر ناکام رہا ہے۔ نیب کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا اور منظور نظر افراد کے قرضوں کو معارف غور یاری شیڈول کیا گیا (۳۶۰)۔ اس بناء پر کل جماعتی کانفرنس اتفاق رائے سے اعلان کرتی ہے کہ:

(۱) ایل ایف او آئین کا حصہ نہیں، آئین میں ترمیم کا اختیار کسی فرد واحد کو نہیں بلکہ صرف پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔

(۲) جنرل پرویز مشرف کا خود کو پی سی او اور ریفرنڈم کے ذریعے ملک کا صدر قرار دینا غیر آئینی اقدام تھا۔ وہ ملک کے صدر نہیں، آئین کے مطابق پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں سے صدر کا انتخاب کرایا جائے۔

(۳) جنرل پرویز مشرف بری فوج کے سربراہ کی حیثیت سے اکتوبر ۲۰۰۱ء میں ریٹائر ہو چکے ہیں۔ کسی مجاز اتھارٹی نے ان کے عہدہ میں توسیع نہیں کی۔

(۴) پارلیمنٹ کی بحالی اور وزیر اعظم کے منتخب ہونے کے بعد پارلیمانی روایات کے مطابق پالیسی امور میں بیرونی دوروں اور مذاکرات کا اختیار صرف وزیر اعظم کو حاصل ہے۔ اس لیے جنرل پرویز مشرف کا حالیہ بیرون دورہ پارلیمانی نظام کی نفی ہے۔ ملک اور قوم ان کے کیے گئے وعدوں پر عمل کرنے کی پابند نہیں۔

(۵) ملک میں سیاسی سازگار فضا کے قیام کے لیے سیاسی بنیادوں پر قید آصف علی زرداری سمیت تمام سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کو رہا کیا جائے۔ بیرون ملک موجود قومی رہنماؤں محترمہ بےنظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کی وطن واپسی میں

رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ ملک کانفرنس کے شرکاء اپنے اس عزم صمیم کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم کامل اشتراک عمل کے ساتھ ملکی سالمیت بقاء، ترقی اور خوش حالی، آئین کی بحالی، ایل ایف او کا خاتمہ، پارلیمنٹ کی بالادستی صوبائی خود مختاری، عدلیہ کی آزادی، عوامی مسائل اور مصائب کے حل کے لیے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ اس ضمن میں پاکستان کے ۵۷ ویں یوم آزادی کے موقع پر ۱۴راگست ۲۰۰۳ء کو راولپنڈی میں مشترکہ عظیم الشان جلسہ عام منعقد ہوگا جو تحریک کا آغاز ثابت ہوگا۔ کانفرنس نے آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کرنے اور پروگرام کو عملی شکل دینے کے لیے نوابزادہ نصر اللہ خان اور مولانا شاہ احمد نورانی پر مشتمل اسٹیئرنگ کمیٹی تشکیل دے دی ہے۔ کمیٹی دیگر ارکان کو شامل کرنے کی مجاز ہوگی۔ عوام مایوس اور بددل ہونے کے بجائے ملک کو بحران کی دلدل سے نکالنے اور اپنے مسائل کے حل کے لیے آئینی، قانونی اور پرامن جدوجہد میں عملی تعاون کریں تاکہ مشکلات سے چھٹکارا حاصل کر کے ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

جیسا کہ اس مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا تھا کہ اپوزیشن حکومت سے مذاکرات کے دروازے کھلے رکھے گی۔ اس لیے ۷ جولائی ۲۰۰۳ء کو قومی اسمبلی میں وزیر اعظم کی اس پیشکش کے جواب میں کہ حکومت اپوزیشن سے جلد مذاکرات کی خواہشمند ہے۔ اپوزیشن نے ڈپٹی اسپیکر کے خلاف تحریک عدم اعتماد واپس لے لی۔

جبکہ مولانا شاہ احمد نورانی نے ملتان میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''حکومت کے خلاف کسی تحریک کا آغاز نہیں کیا جا رہا اور نہ ہی ایجی ٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔ ایم ایم اے نے فیصلہ کیا ہے کہ ۱۴راگست کو راولپنڈی میں جلسہ عام کیا جائے گا۔ یوم آزادی کے حوالے سے ہر ایک کو جلسہ کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر حکومت نے جلسہ روکا تو پھر تحریک بن سکتی ہے۔ آل پارٹیز کانفرنس میں احتجاج تحریک کے حوالے سے کوئی ایسی کمیٹی بھی نہیں بنائی جس کے چیئرمین نوابزادہ نصر اللہ خان ہیں۔ ہم باہمی مشورے سے کمیٹی مکمل کریں گے۔ جو آگے چل کر جلسوں کے انتظامات اور رابطہ عوام کی مہم شروع کرے گی۔ ایل ایف او کے جھگڑے کے باعث اپوزیشن لیڈر کا فیصلہ نہیں ہو سکا جہاں تک حکومت سے مذاکرات کا تعلق ہے تو دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ملک کے مسائل باہمی مفاہمت سے حل

کیے جائیں اسی مقصد کے لیے مذاکراتی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ کمیٹی نے ترامیم وزیراعظم کے پاس بھجوائیں لیکن افسوس کہ ڈیڑھ ماہ گزرنے کے باوجود وزیراعظم نے کوئی اجلاس نہیں بلوایا۔ حکومت سے افہام وتفہیم کا امکان موجود ہے اگر وہ ضد چھوڑ دے۔ دستور کا تنازعہ بنانے کے بجائے ایل ایف او کو پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے...... دنیا میں صدارتی اور پارلیمانی دو الگ نظام ہیں۔ پاکستان میں کون سا نظام ہے۔ جنرل پرویز مشرف صدر کے اختیارات کو چیک اینڈ بیلنس کا نام دیتے ہیں اور میں نے جنرل پرویز مشرف سے ملاقات میں کہا تھا کہ جناب اس نظام میں ''چیک'' وزیراعظم اور ان کی کابینہ کے پاس اور ''بیلنس'' آپ کے پاس ہے...... تحریک عدم اعتماد لانا اراکین پارلیمنٹ کا حق ہے اور اس تعلق سے کوئی بھی قانون پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر نہیں بن سکتا۔ اس کے متعلق لازموجود ہیں...... امریکی امداد وہ رزق ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی، تین ارب ڈالر کا پیکج کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بھی اڑھائی ارب ڈالر امریکہ میں ہی رہیں گے۔ باقی رقم پانچ سالوں میں ملے گی امریکہ ہمارے نظام کو بدلنا چاہتا ہے۔ جہادی قوتوں کو ختم کرنا چاہتا ہے...... حکومت بہت سارے پگڑی والوں کو دیکھ کر گھبرا گئی ہے اسمبلیاں ٹوٹتی ہیں تو ٹوٹ جائیں، ممبری ہی جائے گی منبر تو قائم رہے گا......'' (۳۶۳)

اپوزیشن کے بدلتے تیور دیکھ کر اور ایک حکومت مخالف ایک گرینڈ الائنس کے امکانی خدشہ کے پیش نظر وزیراعظم جمالی نے یہی غنیمت جانا کہ وہ اپوزیشن کے ساتھ مصالحانہ رویہ رکھیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مختلف سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انہوں نے ۱۳ جولائی ۲۰۰۳ء کو متحدہ مجلس عمل کے سیکریٹری جنرل مولانا فضل الرحمن، پارلیمانی لیڈر قاضی حسین احمد اور مسلم لیگ (ن) کے جاوید ہاشمی سے ان کی رہائش گاہوں پر الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ یہ ملاقاتیں دراصل اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھیں۔ جب ۷ جولائی ۲۰۰۳ء کو قومی اسمبلی کے ایوان میں انہوں نے ڈپٹی اسپیکر کے خلاف تحریک عدم اعتماد واپس لینے کے حزب اختلاف کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ مذاکرات کے عمل کو آگے بڑھایا جائے گا۔ (۳۶۴)

جبکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ حکومت اپوزیشن کے ۱۴ راگست کے جلسہ عام سے خائف ہو چکی تھی جو کسی بھی وقت حکومت مخالف تحریک کا نقطہ آغاز بن سکتا تھا۔ کیونکہ اپوزیشن سے

راولپنڈی میں جس جلسے کی کال دی تھی اسے دھرنے میں تبدیل کرنے پر بھی غور کیا جا رہا تھا۔ ایم ایم اے نے ۶ جولائی کی کل جماعتی کانفرنس میں جس اسٹیرنگ کمیٹی کی تشکیل دی تھی۔ حکومت کو خدشہ تھا کہ یہ متحدہ اپوزیشن (C.O.P.) میں تبدیل ہو جائے گی۔ جبکہ ایم ایم نے حکومتی حلقوں پر واضح کر دیا کہ وہ دو تین معاملات پر کسی قسم کے مذاکرات کے روادار نہ تھی۔ مثلاً سرحد حکومت کے مسئلہ پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ وفاقی حکومت جو اقدام بھی کرے گی اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہی فیصلہ کیا جائے گا۔ اس طرح ایم ایم اے کے ارکان کی اسناد سے متعلق حکومت سے کوئی بات نہیں ہوگی۔ ایم ایم اے کا موقف تھا کہ یہ معاملات انفرادی نوعیت کے تھے جبکہ وہ صرف اجتماعی سیاسی مفادات کو موضوع بحث بنانا چاہتے تو جس کا مرکزی نکتہ ایل ایف او تھا (۳۶۵) جبکہ دوسری طرف حکومت اپوزیشن سے شاکی تھی کہ اپوزیشن دوہری چال چل رہی تھی ایک طرف تو وہ مذاکرات کی میز پر آرہی تھی اور دوسری طرف جلسوں اور دھرنوں کے پروگرام بھی تشکیل دیئے جا رہے تھے، جس کا حکومت کے خیال میں واضح مطلب یہی تھا کہ وہ مذاکراتی عمل کو سبوتاژ کرنا چاہتی تھی یا پھر دباؤ ڈال کر کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی (۳۶۶)۔ جبکہ حکومت کوئی کمزوری دکھا کر عوام میں یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ اپوزیشن مضبوط ہو گئی ہے اور حکومت آئین میں ترامیم کو واپس لینے یا ان میں مزید ترمیم کرنے پر آمادہ ہے۔ اگر اپوزیشن مذکرات میں حکومت کو راضی کر لیتی تو پھر حکومت بعض ترامیم واپس لینے پر تیار تھی۔ جبکہ دوسری طرف اپوزیشن عوام کو یہ دکھانا چاہتی تھی کہ حکومت دب گئی ہے۔ (۳۶۷)

تاہم ۲۷ جولائی ۲۰۰۳ء کو پراگرام کے مطابق ایم ایم اے نے حکومت سے مذاکرات کیے...... اجلاس میں ایم ایم اے کی طرف سے بقول شیخ رشید احمد، جنرل پرویز مشرف کو اکتوبر ۲۰۰۴ء تک صدر اور آرمی چیف کے طور پر قبول کرنے کی تجویز پیش کی گئی اور آئینی پیکج تیار ہونے کی صورت میں متحدہ مجلس عمل جنرل پرویز مشرف کو آئندہ پانچ سال کے لیے صدر منتخب کرے گی۔ مدت اس وقت شروع ہوگی جب انہیں ۳ سال کے لیے صدر منتخب کر لیا جائے گا۔ مذاکراتی اجلاس میں ایل ایف او کے تین متنازعہ نکات پر بھی بات چیت ہوئی۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس جلد بلایا جائے۔ (۳۶۸)

چنانچہ اس نئی سیاسی صورتحال پر غور وخوض کے لیے ۲۸ جولائی ۲۰۰۳ء کو وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی کی زیر صدارت اسلام آباد میں اعلیٰ سطحی اجلاس ہوا۔ جس میں متحدہ مجلس عمل

کی طرف سے پیش کیے گئے نکات کی روشنی میں آئینی پیکیج کی تیاری شروع کرنے کا جائزہ لیا گیا۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ (قائداعظم) کے مرکزی صدر چودھری شجاعت حسین، وزیراعظم کے سینئر ایڈوائزر سید شریف الدین پیرزادہ سمیت آئینی، قانونی اور سیاسی ماہرین شریک ہوئے۔ متحدہ مجلس عمل نے آئینی مسائل کے حل کرنے کیلیے بعض نئی تجاویز پیش کی تھیں۔ جن پر ماہرین نے تفصیلی غور کیا تا کہ آئینی مسائل پر پیشکش کو ممکن بنایا جا سکے۔ (۳۶۹) بعدازاں وزیراعظم جمالی اور چودھری شجاعت نے صدر جنرل مشرف سے ملاقات کر کے مجلس عمل کے ساتھ مذاکرات کی جاری صورتحال سے آگاہ کیا۔ (۳۷۰)

اس دوران حکومت نے معاملات طے کیے بغیر ہی قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا فیصلہ کر لیا۔ صورتحال اپوزیشن جماعتوں کر لیے پریشان کن ہونے کے ساتھ ساتھ ناقابل برداشت بھی تھی کیونکہ ابھی کچھ معاملات زیرالتواء تھے جن پر بحث کے بعد انہیں مجوزہ آئینی پیکج کا حصہ بنایا جاتا تھا (۳۷۱)۔ اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ اگر حکومت نے آئینی پیکج پر اپوزیشن کے ساتھ اتفاق رائے کے بغیر قومی اسمبلی کا اجلاس بلایا تو ایم ایم اے ایک بار پھر ۲۷ جولائی سے پہلے والی صورتحال پر چلی جائے گی۔ حکومت نے معاملات طے کرنے کے بعد وعدہ خلافی اور بداخلاقی کا مظاہرہ کیا ہے (۳۷۲)۔ ان کے بقول یہ تاثر غلط تھا کہ ایم ایم اے حکومت کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ حکومت میں شامل ہونا چاہتی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم نائب وزیراعظم، اسپیکر اور چیئرمین سینٹ کے عہدوں کی پیشکش نہ ٹھکراتے، ہماری اصلی جدوجہد ۱۹۷۳ء کے آئین کو غیر متنازعہ بنایا ہے۔ (۳۷۳)۔ یہ ایک متفقہ آئین ہے۔ ایک ٹھوس دستاویز ہے۔ اس میں کوئی فرد واحد کسی قسم کی ترمیم کا حق نہیں رکھتا۔ جو بھی ترمیم ہوگی دو تہائی اکثریت سے ہوگی۔ ہم لیگ فریم ورک آرڈر کو اِل لیگل فریم ورک آرڈر سمجھتے ہیں۔ ایم ایم اے اکیلی حکومت سے ان معاملات پر مذاکرات نہیں کر رہی بلکہ سب کر رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی نے تو حکومت کے ساتھ مستقل رابطے کے لیے پیٹریاٹ گروپ بنا رکھا ہے جو حکومت میں ان کی نمائندگی بھی کر رہا ہے (۳۷۴)۔ ایم ایم اے دیگر پارلیمانی گروپوں کے ساتھ مل کر اسمبلی کے اندر اور باہر کام کر رہی تھی مگر اے آر ڈی کے پارلیمانی گروپ بنایا گیا ہے یہ مذاکرات کے وقت تو بالکل تھا۔ حالانکہ یہ تمام پارلیمانی گروپ جن میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) شامل تھیں۔ اسمبلی میں وزیراعظم جمالی کی پیشکش پر

مذاکرات کی دعوت قبول کر چکے تھے۔ اسپیکر کی سربراہی میں ہونے والے پارلیمانی پارٹیوں کے اجلاس میں ایل ایف او کی ۲۹ متنازعہ شقوں میں سے ۲۲ پر اتفاق ہو گیا تھا جبکہ ۷ پر اختلاف رائے گھا مگر اس کے بعد وزیراعظم نے سربراہی اجلاس نہیں بلایا (۳۷۶)۔ اب جب بعد از خرابی بسیار ۲۷ جولائی کو انہوں نے بلایا تو ہم نے بات وہیں سے شروع کی جہاں ٹوٹی تھی۔ ہمیں صرف ایل ایف او پر نہیں حکومت کی خارجہ اور داخلہ تمام پالیسیوں پر اختلاف ہے۔ مگر ہم سب سے پہلے یہ چاہتے ہیں کہ اختیارات جو ایک شخص کے پاس ارتکاز کر گئے ہیں انہیں واپس پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔ (۳۷۷)

چنانچہ ۶/ اگست کو مذاکرات کا سلسلہ پھر وہیں سے جوڑا گیا جہاں سے ٹوٹا تھا مذاکرات کے دوسرے دور میں وزیراعظم جمالی اور چوہدری شجاعت احمد نے مولانا شاہ احمد نورانی، قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمٰن اور لیاقت بلوچ سے ملاقات کی۔ تاہم یہ مذاکرات بھی صرف باہمی افہام و تفہیم اور مذاکرات جاری رکھنے کے عزم کے ساتھ ختم ہوئے۔ (۳۸۰) جس پر بالآخر ایم ایم اے کو کہنا پڑا کہ حکومت آئینی بحران پر مذاکرات میں تاخیری حربے استعمال کر رہی تھی۔ اب (۱۰ اگست ۲۰۰۳ء) ایم ایم اے کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ اپنے زیر ترتیب احتجاجی پروگرام کو آگے بڑھاتے۔ اس پروگرام کے تحت لیاقت باغ راولپنڈی میں ۱۴/ اگست کو احتجاجی جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ مجلس عمل کے قائدین نے حکومتی حلقوں پر واضح کیا کہ اگر ایل ایف او پر اپوزیشن کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو اسلام آباد میں دھرنا دیا جائے گا۔ (۳۷۹) ۱۴/ اگست کے دھرنے کی دھمکی نے خاطر خواہ اثر کیا اور حکومت نے مجلس عمل کو پھر مذاکرات کی دعوت دے دی۔ (۳۸۰)

جواباً ایم ایم اے کے قائدین نے حکومت پر واضح کیا کہ اگر آئینی پیکج نہ لائی تو پھر وہ مذاکرات کے لیے دستیاب نہیں ہوں گے۔ مزید یہ کہ جنرل پرویز مشرف کے پاس پارلیمنٹ کی بالادستی تسلیم کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں (۳۸۱) چنانچہ ۲۴/ اگست ۲۰۰۳ء کو پھر مذاکرات ہوئے اور ق لیگ کے سینئر ایس ایم ظفر کی رہائش گاہ پر ایل ایف او، آئینی پیکج کی تیاری او دیگر آئینی معاملات پر بات چیت ہوئی جس میں مجلس عمل کی طرف سے لیاقت بلوچ اور حافظ حسین احمد جبکہ حکومت کی طرف سے ایس ایم ظفر اور طارق عظیم نے حصہ لیا۔ ایس ایم ظفر کے بقول ہم نے صرف آئینی پیکج تیار کرنا تھا باقی معاملات قائدین نے طے کرنا تھے۔

(۳۸۲) ۲۷ اگست کو فریقین کی انہی ٹیموں نے پھر مذاکرات کے لیے جس میں آئینی پیکج کو اسمبلی میں لانے پر اتفاق ظاہر کیا گیا۔ (۳۸۳) جبکہ ۲ ستمبر ۲۰۰۳ء کو حکومت نے مجلس عمل کے قائدین سے رابطہ کر کے پھر یقین دہانی کرائی کہ آئینی پیکج کو بہت جلد حتمی شکل دے دی جائے گی۔ مجلس عمل کی سپریم کونسل نے اپنے اجلاس میں فیصلہ کیا کہ بعد حکومت سے مشاورتی عمل کو جاری رکھا جائے گا مزید یہ کہ آئینی ترامیم پیش کی جانے والی تجاویز سے اپوزیشن کی دیگر جماعتوں کو اعتماد میں لیا جائے گا۔ (۳۸۴) ۶ ستمبر ۲۰۰۳ء کو ہونے والے حکومت ایم ایم اے مذاکرات میں اس بات کو دہرایا گیا کہ آئینی ترامیم کا بل پارلیمنٹ میں لایا جائے گا۔ (۳۸۵) چنانچہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۳ء کو وزیر اعظم میر ظفر اللہ جمالی اور چوہدری شجاعت نے صدر مشرف سے ملاقات کی۔ ملاقات میں یہ طے پایا کہ پارلیمنٹ میں آئینی ترامیم کا بل مجلس عمل پیش کرے گی اور حکومت بل کی منظوری میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گی۔ یہ بھی طے پایا کہ وزیر اعظم حلیف جماعتوں کو اعتماد میں لینے کے لیے سربراہ اجلاس بلائیں گے۔ (۳۸۶) جس میں ایم ایم اے کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ اس کے لیے ۱۶ ستمبر کو تاریخ مقرر کی گئی۔ (۳۸۷) اس کے علاوہ ۱۳ ستمبر کو ۸ سیاسی رہنماؤں کو دعوت نامے بھجوائے گئے جبکہ اے آر ڈی کے کسی لیڈر کو مدعو نہیں کیا گیا اس کی وجہ یہ ظاہر کیا کہ اے آر ڈی ایک غیر پارلیمانی اتحاد ہے جبکہ سربراہی اجلاس میں صرف حکومتی اتحاد اور ایم ایم اے کو بلایا جا رہا تھا۔ (۳۸۸)

چنانچہ ۱۶ ستمبر کو طلب کردہ سربراہی اجلاس میں حکومت اور ایم ایم اے کے درمیان مذاکرات ہوئے لیکن متنازعہ آئینی امور پر کوئی اتفاق رائے نہ ہو سکا (۳۸۹)۔ حکومت نے متنازعہ امور پر صدر سے مشاورت کے لیے دو دن کی مہلت مانگ لی۔ ان امور میں صدر کا انتخاب اور آرمی چیف کا عہدہ چھوڑنے کی مدت کا تعین شامل تھا (۳۹۰)۔ لیاقت بلوچ کے بقول صدر کا انتخاب اور ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء تک صدر کے وردی اتارنے کے معاملات طے ہونے کے بعد آئینی پیکج تیار ہو گا (۳۹۱)۔ ☆ ۱۸ ستمبر کو صدر، جمالی اور شجاعت کی ملاقات ہوئی

☆ مذاکرات میں حکومت کی وزیر اعظم جمالی، ق لیگ کے سربراہ چوہدری شجاعت، پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کا سربراہ سکندر اقبال، نیشنل الائنس کے سربراہ فاروق لغاری، متحدہ قومی موومنٹ کے پارلیمانی لیڈر سید صفوان اللہ اور مسلم لیگ (ف) کے سینئر جسٹس (ر) عبدالرزاق تھہیم جبکہ ایم ایم اے کی طرف سے مولانا شاہ احمد نورانی، قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا سمیع الحق، علامہ ساجد نقوی، لیاقت بلوچ اور حافظ حسین احمد شریک ہوئے۔

اور انہوں نے صدر کو مذاکرات کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ جس کے بعد ۱۹ ستمبر کو وفاقی کابینہ نے آئینی پیکج کی منظوری دے دی۔ (۳۹۲)

مولانا نورانی نے اس پر اظہار اطمینان کیا اور کہا کہ اگر مجلس عمل اس پیکج کو فوری طور پر تسلیم کر لیتی ہے تو پھر اسے آئینی ترمیمی بل کی صورت میں قومی اسمبلی میں پیش کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ پیکج کے قبول یا رد کا حتمی فیصلہ ۲۳ ستمبر ۲۰۰۳ء کو متحدہ مجلس عمل کے سپریم کونسل کے اجلاس میں کیا جائے گا (۳۹۳)۔ لیکن جہاں تک حقیقی صورتحال کا تعلق تھا ایم ایم اے کی طرف سے اس بل کے دستبرداری کا امکان زیادہ تھا۔ جس کے بعد مذاکرات میں تعطل روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ کیونکہ اس پیکج میں حکومت نے متحدہ کے ۸ میں سے ۴ نکات کو تسلیم کیا تھا جبکہ سے زیادہ متنازعہ نکات پر حکومت نے حتمی پیکج میں صرف اپنا مؤقف شامل کیا تھا (۳۹۴)۔ جبکہ ایم ایم اے ۲۰۰۴ء تک صدر کے وردی اتارنے کے مطالبے ریٹائرمنٹ میں توسیع کے معاملے کو بھی پیکج میں زیر التوا رکھا گیا تھا۔ (۳۹۵) چنانچہ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا مجلس عمل نے اعلان کیا کہ مذاکرات کا دروازہ بند ہو گیا، اب اپوزیشن سے مل کر تحریک چلائی جائے گی۔ (۳۲۹۶)

جبکہ مذاکرات کے دروازے کئی دفعہ بند اور کوئی دفعہ کھلے تھے۔ حکومت روز اوّل ہی سے اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات مذاکرات کا چوہے بلی کا کھیل کھیل رہی تھی۔ ایم ایم اے کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ڈیڑھ صوبے کی حکومت کے لالچ میں بری طرح پھنس چکے تھے اور ان کے لیے یہ حکمرانی نہ تو اگلی جانے والی تھی نہ نگلی جانے والی۔ دوسرے انھیں اس نفسیاتی کوفت کا شکار بنا دیا گیا تھا کہ مشرف کے بعد کوئی اور فوجی آ جائے گا۔ تیسرے یہ کہ اگر جنرل مشرف گئے اور نواز شریف اور بے نظیر آ گئے تو ایم ایم اے کی لیڈر شپ پس پشت چلی جائے گی۔ چوتھے ان سے یہ کہا جا رہا تھا کہ جنرل صاحب اس وقت وردی اتار دیں گے جب موجود سینئر جنرل حضرات اکتوبر ۲۰۰۴ء میں ریٹائرڈ ہو جائے گے۔ لیکن یہ نہایت بودی دلیل تھی اگر جنرل مشرف کے شاگرد جنرل حضرات اوپر آ جائیں گے تو جنرل صاحب کے بقول اس وقت ان کی ریٹائرمنٹ سودمند رہے گی اور ان کو سرے سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ درحقیقت جنرل پرویز بھی اسی تھیوری کے تحت جنرل بنائے گئے تھے کہ چونکہ وہ بڑے صوبے سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور ان کا کوئی بڑا خاندان اور لابی نہیں تھی اگر انہیں چیف آف دی آرمی اسٹاف بنایا

جائے تو وہ شکر گزار ہوں گے اور حکومت کے تختہ الٹنے کا خطرہ نہیں رہے گا۔ اسی نظریہ کو کبھی بھٹو مرحوم نے جنرل ضیاء کو چیف آف دی آرمی اسٹاف بناتے وقت ذہن میں رکھا تھا۔ لیکن ان دونوں جنرل حضرات نے بالترتیب بھٹو اور نواز شریف کی قانونی حکومت کو ختم کر دیا تھا۔ اگر جنرل پرویز مشرف کی بات مان لی جائے تو پھر یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا جنرل صاحب اپنے سینئر جنرلوں کی ریٹائرمنٹ کے بعد مضبوط ہو جائیں گے یا کمزور ہوں گے تو پھر وردی کیوں اتاریں گے۔ مضبوط آدمی کا کسی وعدے کا پابند ہونا ضروری نہیں۔ جہاں تک مولانا فضل الرحمٰن کو ڈیڑھ صوبے میں حکومت کے چھن جانے کا ڈر تھا تو پھر سوال یہ تھا کہ یہ صوبے رہیں گے یا نہیں۔ دیکھنا یہ تھا کہ شہری حکومتوں (City Governments) کے بعد صوبائی حکومتوں کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی تھی۔ اقتدار کی تقسیم میں شہری حکومتیں ہی صوبے ہیں۔ جنرل صاحب نے شہری حکومتیں بالآخر سوچ سمجھ کر بنائی تھیں۔ اس لیے تو نہیں بنائی تھیں کہ صوبے ان پر گرفت کر لیں (اور وہ اس وقت بھی (۲۰۰۵ء) تو شہری حکومتوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔)

یہ بھی درست تھا کہ ماضی قریب میں جب کبھی تحریک چلی تو کوئی اور فوجی حکمران بن گیا (جیسا کہ ایوب کے بعد یحیٰی خاں کی آمد) کیا جنرل صاحب کے اقتدار کے سامنے سر تسلیم خم کر کے تحریک چلانے اور فوجی حکومت سے نجات کے آئین کو خیر باد کہ دیا جاتا اور کیا فوجی کرسی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنانے کو اوپر مسلط کر لیا جاتا۔ یہ انہی تحریکوں کا صلہ تھا کہ پاکستان میں جمہوریت کی بات کی جاتی ہے۔ جہاں تک جنرل مشرف کا تعلق تھا۔ وہ اپنے پیش رو فوجی طالع آزماؤں کی طرح بہت عرصہ تک پاکستان پر حکمرانی کرنا چاہتے تھے اور یہ بھی طے شدہ حقیقت تھی کہ وہ طوالت اقتدار کے لیے زیادہ سے زیادہ فوجی افسران کو سول عہدے سونپ رہے تھے اور یہ بھی حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ ان کے اقتدار کا واحد اور آخری سہارا فوجی وردی ہی تھی۔ ان کی ذاتی طاقت کیا تھی نہ بڑا خاندان، نہ عوامی حمایت، نہ کوئی ان کی سیاسی پارٹی، فوج کی سربراہی نے ہی ان کو ڈھال فراہم کر رکھی تھی۔ وہ اسے کیوں چھوڑتے۔ آج یا اکتوبر ۲۰۰۴ء۔ کیوں؟ مسلم لیگ (ق) ان کی پارٹی نہیں تھی نہ ہی اس پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔

ایک اور پہلو جس کا ذکر کیا جانا ضروری ہے ان دنوں خاصی پیچیدگیوں اور نزاکتوں کا حامل تھا۔ مولانا شاہ احمد نورانی اور قاضی حسین احمد کا ان دنوں یہ کہنا کہ ایم ایم اے کا مسئلہ داخلی ہی نہیں خارجی بھی ہے تو سوال یہ بھی پیدا ہوتا تھا کہ کیا جنرل مشرف کے بس میں تھا کہ وہ ایم ایم اے سے معاہدے کے بعد خارجہ پالیسی بدل سکتے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کبھی بھی اس قابل فخر نہیں رہی کہ ہماری آئندہ نسلیں اس پر فخر کر سکیں۔ جنرل صاحب نے امریکہ کو خوش کرنے کے لیے جس طرح مراکش، الجزائر، سعودی عرب، قطر اور ابوظہبی کے مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر دے دیا، اس نے مسلم امہ میں پاکسان کو نہایت رسوا کر دیا تھا۔ ان حالات میں جنرل صاحب سے ایم ایم اے کا معاہدہ پاکستانی مسلمانوں کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دیتا۔ ایم ایم اے کو ووٹ امریکہ مخالف سے ملے تھے اور پورے ملک میں لوگ ان کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ جب سے ایم ایم اے نے حکومت کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھانا شروع کیں، اس کی عوامی مقبولیت کا گراف تیزی سے گرنا شروع ہو گیا۔ مقبولیت ہمیشہ عوامی جذبات کا خیال رکھنے، اصولوں پر قائم رہنے اور بہادری دکھانے سے حاصل ہوتی ہے۔ جب قاضی حسین احمد نے بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خلاف اسلام آباد میں مظاہرہ کیا تھا اور زخمی ہو گئے تھے تو پورا ملک ان کے لیے پریشان ہو گیا تھا کہ قاضی صاحب کا کیا حال ہے۔ جنرل مشرف سے معاہدہ کے بعد ایم ایم اے کی مقبولیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نہ ان کی صوبائی حکومتیں بچتیں اور نہ ہی عوامی طاقت ان کے ساتھ ہوتی۔☆ اس پر ایم ایم اے نے جنرل صاحب کو اکتوبر ۲۰۰۵ء تک وردی کی بات کر کے اپنی مقبولیت کو بٹہ لگا لیا اور اگر ایم ایم اے اصولوں پر سودا کر لیتی تو پھر وہ کہیں کی نہ رہتی۔ پھر نواز، بے نظیر کے آنے یا نہ آنے کے مسئلہ سے ایم ایم اے کو بے نیاز ہو جانا چاہیے تھا کہ ان لوگوں کے آنے سے وہ پس پشت چلے جاتے وہ حکومت کے ساتھ مفاہمت کر کے ویسے بھی پس پشت جانے والے تھے۔ صرف اس لیے کہ انہوں نے اپنا مقدمہ مشرف کے اشارہ ابرو سے وابستہ کر لیا تھا۔

☆ یہاں مولانا فضل الرحمٰن کی سیاسی پالیسی کا جائزہ لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن کو ڈیڑھ صوبائی اقتدار کی فکر اس قدر زیادہ تھی کہ وہ اپنے مؤقف پر حکومتی چھاپ لگانے کے لیے تیار رہتے جیسا کہ انہوں نے اپنے دورہ بھارت (۲۰۰۳ء) کے دوران پالیسی اپنائی۔ ان کی یہی بات ایم ایم اے کے لیے نقصان دہ تھی۔

یہ سراسر غلط سوچ اور غلط حکمت عملی تھی۔ ایم ایم اے کی طاقت اور ساکھ کا راز اس میں پنہاں تھا کہ وہ جنرل مشرف کی فوجی حکومت کے خلاف کس قدر واضح حکمت عملی اپنانے اور اس کے خلاف کس ثابت قدمی سے کھڑے ہوتے۔ جہاں تک دوسری جنرل کے آنے کا خوف تھا تو اس کے خلاف بھی عزم صمیم سے محاذ کھول لیا جاتا۔ ایل ایف او، اور، وردی پر کسی سمجھوتے کے نہ ہونے میں ہی ایم ایم اے کی بقاء کا انحصار تھا۔

اندریں حالات ایم ایم اے صرف حکومت کو گیدڑ بھبھکیاں دینے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ گزشتہ ایک سال سے حکومت نے ایم ایم اے کو چکرا کے رکھ دیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ حکومت نے اپوزیشن کے خلاف جارحانہ حکومت عملی اپنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے پنجاب، سندھ کی حکومتوں کی حزب اختلاف پر نظر رکھنے اور گڑ بڑ کرنے پر سخت ایکشن لینے کا حکم دے دیا اور وردی کہ معاملات پر متحدہ مجلس عمل سے مزید مذاکرات نہ کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ اس کے علاوہ کے معاملے پر دفاع کی بجائے جارحانہ حکمت عملی اپنائی جائے گی۔ یہ بھی طے پایا کہ پارلیمنٹ میں وردی کے معاملے پر قرارداد میں منظور کرائی جائے گی تا کہ اندرون ملک اور عالمی سطح پر یہ باور کرایا جاسکے کہ صدر مشرف کی وردی کوئی متنازعہ معاملہ نہیں بلکہ انہیں پارلیمنٹ کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔ اس بات پر بھی اتفاق ہوا کہ پارلیمنٹ کے اندر اپوزیشن ارکان کے خلاف کارروائی کریں گی۔ صدر جنرل پرویز مشرف کے حق میں پنجاب اور سندھ اسمبلی سے بھی قراردادیں منظور کرائی جائیں گی۔ جبکہ اہم ایم ایم اے نے جوابی حکومت عملی کے طور پر عوام سے رجوع کرنے اور عدالتوں میں جانے کا عندیہ دیا۔ ادھر اعلیٰ حکومتی شخصیات نے مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا فضل الرحمن سے ایک مرتبہ پھر رابطہ کیا اور انہیں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ دسمبر ۲۰۰۴ء تک وردی چھوڑ دینے کے حوالے سے زبانی معاہدے کے لیے تیار ہیں تاہم اس سلسلے میں کوئی تحریری معاہدہ نہیں ہوگا۔ جبکہ ایم ایم اے نے اس بات پر زور دیا کہ حکومت آئین کے آرٹیکل ڈی (ون) ۸۳ کو بحال کرے جو ابھی تک معطل تھا۔ اس شق کے مطابق ملک کا صدر صرف وہی شخص بن سکتا تھا جو پارلیمنٹ کی ممبر شپ کے لیے کوالیفائی کرسکتا تھا اور جس کے پاس پہلے ہی کوئی منفعت بخش عہدہ ہو اسے پارلیمنٹ کی ممبر شپ یا کسی اور اہم عہدے کو حاصل کرنے کے لیے اسے چھوڑنا ہوگا۔ اس لحاظ سے جنرل مشرف آئین کے مذکورہ آرٹیکل پر پورا نہیں اترتے تھے۔ ان کے لیے بہتر یہی تھا

کہ وہ وردی چھوڑنے کی حتمی تاریخ کو آئینی پیکج کا حصہ بناتے۔ (۳۹۷)

ایم ایم اے کے سربراہ مولانا نورانی اس ساری صورتحال کا بغور جائزہ لے رہے تھے، اسمبلیاں توڑنے کے صدر کے آئین کے جواب میں ان کا یہ کہنا بڑا صائب تھا کہ "ایم ایم اے نئے انتخابات نہیں چاہتی بلکہ ہم آئین کی بالادستی چاہتے ہیں لیکن اگر صدر مشرف اسمبلیاں برطرف کرتے ہیں تو صرف ایم ایم اے کا نقصان نہیں ہوگا ایم ایم اے پھر اسمبلیوں میں آجائے گی۔" (۳۹۸)

متحدہ مجلس عمل ایک طرف صدر کی وردی اتارنے کے لیے دباؤ میں مسلسل اضافہ کر رہی تھی اور دوسری طرف رابطہ عوام بھی شروع کی جارہی تھی۔ حکومت اور متحدہ مجلس عمل کے درمیان ۷ میں سے ۶ نکات پر اتفاق رائے ہو چکا تھا تاہم صدر کی وردی اتارنے کا معاملہ لٹک گیا تھا۔ ایم ایم اے کا کہنا تھا کہ وردی سمیت تمام امور پر اتفاق رائے ہو گیا تھا اور حکومت نے تحریری معاہدے کی یقین دہانی کرائی تھی۔ لیکن بعد میں حکومت کا رویہ ہی بدل گیا۔ جہاں تک وردی اتارنے کی تحریری یقین دلانی کی بات تھی (۳۹۹)۔ مولانا نورانی نے اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ اگر وردی اتارنے کے معاملے پر فوج کے ڈسپلن میں کوئی فرق پڑتا تھا کہ وہ اس طرح کوئی تحریری شکل دینے کے بجائے آئین کے اس آرٹیکل کی ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء تک بحالی شامل کر لیتے ہیں جس کے تحت صدر کوئی منفعت بخش عہدہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ (۴۰۰)

سوال یہ تھا کہ اگر مذاکرات کامیاب ہوتے تو ملک وقوم کو کیا فائدہ ہوتا جہاں تک مذاکرات کا تعلق تھا اگر فریقین میں کوئی سمجھوتہ نہ ہوتا تو ملک میں افراتفری یقینی اور مشرف مخالف قوتیں سرگرم عمل ہو جاتیں (۴۰۱)۔ ایم ایم اے کی ایک صوبے میں حکومت تھی جبکہ بلوچستان میں بھی وہ صرف ساجھے دار تھے۔ اگر ایم ایم اے کی پوزیشن کمزور ہوتی تو لازماً اے آر ڈی کی اپوزیشن کی قیادت کا موقع ملتا۔ جبکہ اے آر ڈی یا مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی تو چاہتی ہی یہی تھیں کہ ایم ایم اے سیاسی منظر سے ہٹے تا کہ ملک میں نئے انتخابات کی راہ ہموار ہوتی یا یہ مشرف کے ہٹنے کی صورت میں ان پارٹیوں کے قائدین کی وطن واپسی کی راہ ہموار ہوتی جبکہ ایم ایم اے کی ترجیحات میں یہ دونوں باتیں شامل نہیں تھیں (۴۰۲)۔ سسٹم کے خاتمے کا سب سے زیادہ نقصان مسلم لیگ (ق) اور ایم ایم اے کا ہوتا۔ جبکہ فائدے میں پی

پی پی اور مسلم لیگ رہتیں۔ حکومت اور ایم ایم اے دونوں کو اس امر کا احساس تھا اور یہی خوف یا احساس انہیں کسی معاہدے تک پہنچا سکتا تھا (۴۰۳)۔ اسی احساس کے تحت "مذاکرات برائے محض مذاکرات" کا یہ عمل جو کہ گزشتہ برس سے ست روی سے چل رہا تھا، جاری رہا، متحدہ مجلس عمل نے حکومت کے پیش کردہ آئینی پیکج کو ان کی حالیہ شکل میں مسترد کرتے ہوئے اس کے بعض امور پر وضاحت کے لیے وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی سے دوبارہ رابطے کا فیصلہ کیا۔ جس کے تحت مجلس عمل کی تین رکنی کمیٹی نے ۲۴ ستمبر ۲۰۰۳ء کو وزیراعظم سے ملاقات کی ☆ (۴۰۴)۔

ملاقات میں تمام متنازعہ امور کی وضاحت مانگی گئی مگر تسلی بخش جواب حاصل نہ ہو سکا جس کی وجہ سے مولانا شاہ احمد نورانی نے آئینی پیکیج مسترد کر دیا۔ (۴۰۵) بعد ازاں وزیراعظم جمالی کے دورہ امریکہ کی وجہ سے حکومت کو ستانے کا کچھ موقع مل گیا۔ اس نے ایم ایم اے سے درخواست کی کہ وزیراعظم جمالی کی واپسی تک معاملات جوں کے توں رکھے جائیں۔ اس دوران حکومت طے پا جانے والے نکات کو پراسیس کرے گی۔ جبکہ مولانا شاہ احمد نورانی نے سابقہ مؤقف کو دہراتے ہوئے کہا کہ وردی پر تحریری معاہدہ تک مزید مذاکرات نہیں ہوں گے۔ (۴۰۶)

جمالی نے دورہ امریکہ سے واپسی پر ایم ایم اے کو پھر ایل ایف او کے تین متنازعہ امور پر مذاکرات کی دعوت دے دی۔ یہ پیغام حکومتی عہدیداروں رانا نذیر اور یحییٰ منور نے لیاقت بلوچ سے ملاقات کر کے پہنچایا۔ (۴۰۷) تاہم مولانا نورانی نے مذاکرات کی تجویز کو رد کرتے ہوئے رابطہ عوام مہم شروع کرنے کا عندیہ دیا۔ (۴۰۸) اور حکومت کو ۱۷ دسمبر ۲۰۰۳ء کی ڈیڈ لائن دے دی گئی جس سے اگلے دن حکومت مخالف تحریک شروع ہو جانا تھی۔ (۴۰۹) لیکن ۱۸ دسمبر کو احتجاجی تحریک بلکہ اس کے بعد کسی بھی احتجاجی تحریک کی نوبت نہ آ سکی۔ اس دوران پاکستانی سیاست اور ایم ایم اے کو ایک ایسی عظیم سانحے سے دوچار ہونا پڑا جس نے ایم ایم اے کی کمر توڑ کر رکھ دی اور اس کے بعد تاریخ پاکستان نے وہ موڑ لیا کہ ایم ایم اے بطور سیاسی جماعت اور تحریک کے اپنے مقاصد سے دور ہٹتی چلی گئی۔ ۱۱ دسمبر ۲۰۰۳ء کو مولانا شاہ احمد نورانی جو کہ ایک طویل عرصہ سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ اسلام آباد میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے (۴۱۰)۔ وہ اس روز بارہ بجے پارلیمنٹ ہاؤس کے کمیٹی

روم میں پریس کانفرنس سے خطاب کرنے والے تھے وہ مذکورہ کانفرنس میں شرکت کی تیاری کے لیے سیکٹر ایف ایٹ فور میں اپنی رہائش گاہ پر موجود تھے کہ اچانک دل کا شدید دورہ پڑا (۴۱۱)۔ ان کے ہمراہ موجود ان کے ترجمان حسنات احمد قادری نے انہیں ہسپتال لے جانے کی کوشش کی مگر وہ راستے میں ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی وفات کے بعد ایم ایم اے پھر کبھی نہ سنبھل سکی۔ کیونکہ نورانی ایم ایم اے کے لیے جہاں اتحاد کی علامت تھے وہاں ان کی بے باکی اور حق گوئی نے ایم ایم اے کو حکومت کے ساتھ کسی بھی شرمناک معاہدے سے محفوظ و مامون رکھا ہوا تھا۔ (۴۱۲)

متحدہ مجلس عمل مولانا نورانی کے بعد:

مولانا شاہ احمد نورانی کی وفات کے بعد متحدہ مجلس عمل اس تیقن کے ساتھ میدان عمل میں اتری تھی کہ مولانا شاہ احمد نورانی مشن کو جاری رکھا جائے گا مگر افسوس کہ ان کا یہ مشن ۲۵ دسمبر ۲۰۰۳ء یعنی ان کی وفات کے محض دو ہفتوں تک ہی جاری رہ سکا اور متحدہ مجلس عمل نے حکومت سے ۱۹ دسمبر تک تمام معاملات طے کر لیے، یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس معاہدے کی راہ میں مولانا نورانی آخری کانٹا تھا۔ جس کے نکل جانے سے فریقین کو حد درجہ اطمینان ہوا تھا (۴۱۳)۔ محض آئندہ پانچ دنوں کے اندر اندر مجلس عمل نے سمجھوتہ کر لیا اور ۲۸ دسمبر کو آئین میں ۱۷ ویں ترمیم کا بل منظور ہو گیا (۴۱۴)۔ یہ وہی مجلس عمل تھی جو ایل ایف او پر کسی سمجھوتے کی روادار نہ تھی، وقت آنے پر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ قومی اسمبلی سے منظور ہونے کے بعد مذکورہ آئینی بل اگلے روز (۲۹ دسمبر ۲۰۰۳ء) سینٹ میں پیش کر دیا، سینٹ نے بھی اس بل کو ۷۲ ووٹوں سے منظور کر کے صدر کو بھجوا دیا گیا۔ صدر نے بھی اس کی منظوری دے دی۔ (۴۱۵)

مختلف سیاسی پارٹیوں نے متحدہ مجلس عمل کے حکومت کے ساتھ معاہدے کو عوامی مینڈیٹ کی توہین اور جمہوریت کے لیے ایک خطرناک فعل قرار دیا۔ بالخصوص قوم پرست جماعتیں ایم ایم اے پر تنقید میں پیش پیش تھیں۔ روز اوّل سے صدر کے اقدامات کی مخالفت کرنے والی جماعت پشتون خواہ ملی عوامی پارٹی کے مرکزی سیکریٹری جنرل سید اکرم شاہ نے اس معاہدے کو ملک میں دائمی مارشل لاء کی راہ ہموار کرنے کے مترادف قرار دیتے ہوئے ایم ایم اے کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ بلوچستان نیشنل پارٹی کے سربراہ اختر مینگل نے معاہدے کو

تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ ایم ایم اے نے انتخابی مہم کے دوران ایل ایف او کے خلاف نعرہ کی بنیاد پر ووٹ حاصل کیے۔ اب اس نے یوٹرن لے کر عوام کو دھوکہ دیا ہے(۴۱۶)۔ جبکہ جمہوری وطن پارٹی اور نیشنل پارٹی نے معاہدے کو جمہوریت اور جمہوری اداروں کے خلاف سازش قرار دیا۔ (۴۱۷)

یہ بھی درست تھا کہ ایل ایف او پر معاہدے کے لیے متحدہ مجلس عمل کو مرکزی قیادت کی اپنی ترجیحات بھی تھیں۔ مثلاً بلوچستان کی حد تک جمعیت علمائے اسلام کی جانب سے مرکزی قیادت پر یہ دباؤ تھا کہ وہ حکومت کے ساتھ محاذ آرائی میں اتنی دور تک نہ جائے جس سے پارٹی کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو (۴۱۸)۔ کیونکہ بلوچستان میں متحدہ مجلس عمل کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے ارکان قومی اسمبلی وسینٹ کا تعلق جمعیت علمائے اسلام سے تھا۔ صوبائی اسمبلی میں ایم ایم اے کی ۱۸/ارکان میں سے خواتین کی مخصوص نشستوں پر کامیاب ہونے والے ۲/ارکان کے سوا باقی تمام ارکان اسمبلی کا تعلق بھی جے یو آئی سے تھا۔ علاوہ ازیں بلوچستان میں حکومت سازی کے وقت متحدہ مجلس عمل نے مسلم لیگ (ق) کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا کہ اس کی رو سے صوبے کی تمام اہم وزارتیں جے یو آئی کو مل گئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف عام سیاسی حلقے بلکہ خود مسلم لیگ (ق) کے ناراض ارکان کہ رہے تھے کہ صوبے میں دراصل متحدہ مجلس عمل کی حکومت قائم تھی (۴۱۹)۔ بلوچستان حکومت میں بہت بڑا حصہ ملنے اور بعض دیگر وجوہات کی بناء پر متحدہ مجلس عمل بلوچستان یہ نہیں چاہتی تھی کہ ایل ایف او پر دفاعی سطح پر مفاہمت نہ ہو جبکہ ایک رائے یہ بھی تھی کہ اگر وفاقی سطح پر حکومت کے ساتھ متحدہ مجلس عمل کی مفاہمت نہ ہوتی تو ایل ایف کے خلاف اس کی تحریک بلوچستان میں زیادہ مؤثر نہ ہوتی (۴۲۰)۔ انہی وجوہات کی بناء پر ایم ایم اے کو صوبوں پر سودا بازی کرنا پڑی اور اس میں شریک بعض جماعتوں کے سیاسی مفادات نے حکومت کے ہاتھ مضبوط کیے۔ نئے سال ۲۰۰۴ء کا آغاز بھی صدر مشرف کے لیے کامیابیوں کی نوید لے کر آیا۔ کیونکہ اب ان کے اعتماد کے ووٹ کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہی تھی (۴۲۱)۔ چنانچہ صدر نے یکم جنوری ۲۰۰۴ء کو اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا۔ نتائج کے مطابق کل ۱۱۷۰ ووٹوں میں سے ۶۵۸/اراکین قومی وصوبائی اسمبلی وسینٹ نے صدر کی حمایت میں ووٹ دیا۔ جبکہ ۳۳۴/اراکین غیر حاضر تھے۔ ۱۷۵ نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔ ان کی مخالفت میں صرف ایک ووٹ جمعیت اہل حدیث کے سینیٹر

ساجد میر کا آیا۔ (۴۲۲)

قومی اسمبلی میں ۱۹۱، پنجاب اسمبلی میں ۱۵۴، سرحد اسمبلی میں ۳۰ اور بلوچستان اسمبلی میں ۲۸/ارکان نے صدر کے حق میں ووٹ دیا۔ (۴۲۳)

صدر کے انتخاب کے بعد ایم ایم اے ایک بار پھر کڑی تنقید کی زد میں تھی۔ لیکن اب حملہ ذرا مختلف انداز سے کیا گیا۔ متحدہ مجلس عمل پر الزام یہ لگایا گیا کہ ایم ایم اے کا قیام اور مذہبی قائدین کو اسمبلیوں تک پہنچانے کا مقصد جنرل پرویز مشرف کی حکمرانی کو آئینی و قانونی جواز دلانا تھا جو ۱۷ ویں ترمیم کے ذریعے حاصل کر لیا گیا۔ اس ضمن میں ایک واضح دلیل یہ موجود تھی کہ ماضی میں بھی مذہبی رہنما فوجی حکومتوں کی معاونت کرتے رہے تھے اور اس طرح مذہبی جماعتوں کا اسٹیبلشمنٹ سے غیر اعلانیہ اتحاد موجود تھا اور ایم ایم اے نے ۱۷ ویں ترمیم کے حق میں ووٹ دے کر اس اتحاد کو تحریری حیثیت بھی دے دی تھی۔

۱۹۷۷ء کی قومی اتحاد کی تحریک اور اس کے نتیجے میں مارشل لاء لگنے کے بعد اسلامی نظام کے نفاذ کے نام پر مولانا مفتی محمود اور جماعت اسلامی نے جس طرح ضیاء مارشل لاء کے ہاتھ مضبوط کیے اور اس کی طوالت کا سبب بنے، ریکارڈ پر موجود ہے۔ اس تناظر میں الزام میں کسی حد تک صداقت دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اس بار مذہبی جماعتوں سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے ایم ایم اے کی قیادت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دی جس نے بکنا اور جھکنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب تک مولانا شاہ احمد نورانی اس کے سربراہ رہے، حکومت اپنے مطلوبہ مقاصد میں ناکام رہی کیونکہ ان کی سیاسی ترجیحات میں حصول اقتدار آخری نمبر پر آتا تھا۔ ان کا خود یہ کہنا تھا کہ اگر ممبری چلی گئی تو کیا ہوگا، منبری تو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ بقول ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی، مولانا نورانی کبھی بھی ۱۷ ویں آئینی ترمیم کے حق میں نہیں تھے تاوقتیکہ اسے ایک آبرومندانہ معاہدے میں نہ ڈھال لیتے (۴۲۴)۔ وہ مرتے دم تک اس پر قائم رہے اور اسمبلی کے اندر اور باہر احتجاج جاری رکھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے ۱۸ دسمبر ۲۰۰۴ء کو احتجاجی تحریک کی کال بھی دے رکھی تھی لیکن ان کی وفات کے بعد یہ تحریک ایک خاموش احتجاج کے سوا آگے نہ بڑھ سکی۔ (۴۲۵)

ایم ایم اے نے اصولوں پر سودا بازی کر کے جمہوریت کو جو نقصان پہنچایا تھا اس کی تلافی ممکن نہ تھی۔ تیرھویں آئینی ترمیم کی مدد سے جنرل پرویز مشرف کے بطور چیف ایگزیکٹو

اقدامات بالخصوص ایل ایف او، ریفرنڈم، لوکل گورنمنٹ پلان وغیرہ کو آئینی تحفظ مل گیا۔ اس کا سب سے زیادہ نقصان دو بڑی اپوزیشن جماعتوں کو اٹھانا پڑا، کیونکہ تیرھویں آئینی ترمیم میں یہ آرٹیکل بھی منظور ہوا تھا کہ کوئی بھی شخص دو سے زائد مرتبہ وزیرِاعظم نہیں بن سکتا تھا۔ یہ آرٹیکل بطور خاص بے نظیر اور نواز شریف کو سیاسی منظر سے ہٹانے کے لیے شامل کیا گیا تھا۔ ایم ایم اے کو بعد ازاں کئی سیاسی شکستیں ہوئیں۔ مثلاً پارلیمنٹ میں اپوزیشن لیڈر کے تقرر اور نیشنل سکیورٹی کونسل کے قیام کی مزاحمت میں ناکامی وغیرہ۔ فی الوقت جنرل پرویز مشرف اور ان کا تخلیق کردہ سیاسی نظام پورے طمطراق سے چل رہا تھا۔ جس کے حسن و قبح کو آنے والا مؤرخ ہی منصۂ شہود پر لا سکے گا۔

حوالہ جات وتعلیقات

(۱) قتل ہونے والے میں ٹریفک مجسٹریٹ ارشد مغل اور رینجرز کا ایک اہل کار بھی شامل تھا۔ ایم کیو ایم کے حامی اخبار "پرچم" کے منیجر غلام صمدانی کو ان کے دفتر میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ بجلی کے کئی ٹرانسفارمر اڑا دیئے گئے۔ پاک کالونی میں نقاب پوشوں کی فائرنگ سے دس افراد ہلاک ہوئے، سرجانی ٹاؤن میں اسکول پرنسپل کو ہلاک کر دیا گیا۔ سوسائٹی آفس کے نزدیک مسجد اکبر میں مسلح افراد نے فائرنگ کر کے امام مسجد سمیت آٹھ افراد کو شہید کر دیا۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۹ دسمبر ۱۹۹۴ء)

(۲) روزنامہ نوائے وقت کراچی، یکم جنوری ۱۹۹۵ء

(۳) ایضاً، ۲۴ جنوری (۴) ایضاً

(۵) گلشن اقبال میں جامعہ احیاء العلوم کے طلباء پر کار سواروں نے اندھا دھند فائرنگ کر کے دو طالب علموں کو ہلاک اور چار کو زخمی کر دیا۔ انجمن سپاہ صحابہ پاکستان کے ایک کارکن کو اغواء کر کے قتل کر دیا گیا۔ نارتھ کراچی میں نماز تراویح کے دوران مسجد میں نمازیوں پر فائرنگ کی گئی۔ لیاقت آباد میں حرکت الانصار کے مرکزی کیمپ پر کار میں سوار پانچ حملہ آوروں نے فائرنگ کی۔ مسجد اور کیمپ پر فائرنگ سے ۲۴/ افراد جاں بحق ہوئے۔ لیکن حکومتی اعلانات اور یقین دہانیوں کے باوجود رمضان کے دوسرے عشرے میں پولیس کے چودہ اہلکاروں سمیت ۸۹/ افراد جاں بحق ہوئے جبکہ آخری عشرہ میں بھی ۴۵/ افراد جاں بحق اور متعدد زخمی ہو گئے۔ جبکہ حفاظتی اقدامات کے باوجود عید کے تین دنوں میں دہشت گردی کی تین وارداتوں میں چار سپاہیوں سمیت ۲۹/ افراد جاں بحق ہو گئے (غفور احمد، بے نظیر حکمت کا عروج و زوال، القمر، لاہور، ۲۰۰۱ء ص ۳۳۶)، حتیٰ کہ ۸ مارچ کا مہینہ بھی قتل و غارت اور جلاؤ گھیراؤ سے بھرپور تھا۔ (دیکھئے اخبارات روزنامہ جنگ، نوائے وقت کراچی۔ ڈان، دی نیوز۔ دی نیشن کراچی، ۲۶ جنوری تا ۱۰ فروری ۱۹۹۵ء)

(۶) انٹرویو جنرل کے۔ ایم اظہر۔ ۱۵ جولائی ۲۰۰۵ء۔

(۷) ایضاً

(۸) قبل ازیں ۱۳ مارچ ۱۹۹۵ء کو مولانا ساجد نقوی اور مولانا سمیع الحق میں طویل ملاقات ہوئی جس میں ملکی صورتحال پر غور وخوض کے لیے دینی سیاسی جماعتوں کا ایک اجلاس ۲۲ مارچ کو طلب کرنے پر زور دیا گیا۔ اس مجوزہ اجلاس میں قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمٰن، ساجد نقوی، ضیاء القاسمی، عبدالستار نیازی اور طاہر القادری سمیت متعدد رہنماؤں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ دونوں رہنماؤں نے اس امر پر اتفاق ظاہر کیا کہ سامراجی قوتیں اپنے نیو ورلڈ آرڈر پر عمل درآمد کے لیے مساجد، امام بارگاہوں اور دینی مدارس کو نشانہ بنا کر اپنے شرمناک مقاصد کی تکمیل کے لیے فرقہ واریت کا ہوا کھڑا کر رہی ہے۔ اس ملاقات میں سینئر علامہ جواد ہادی جبکہ جے یو آئی کے نائب امیر مولانا قاری محمد امین اور مولانا عبدالرحیم نقشبندی بھی موجود تھے۔ (روزنامہ جنگ لاہور، ۱۴ ر مارچ ۱۹۹۵ء)

مزید برآں سپاہ صحابہ اور تحریک جعفریہ کی طرف سے قاضی حسین احمد کو ثالث کے طور پر کام کرنے کی پیشکش کی گئی۔ چنانچہ پیشکش کو قبول کرتے ہوئے قاضی حسین احمد نے اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ ۱۳ مارچ ہی کو انہوں نے اسلام آباد میں تحریک جعفریہ کے سربراہ علامہ ساجد نقوی کے ساتھ ان کے دفتر میں ملاقات کی۔ ملاقات میں دونوں رہنماؤں نے اتحاد امت کے لیے متفقہ لائحہ عمل طے کرنے اور مشترکہ پلیٹ فارم پر تمام مسلمانوں کو جمع کرنے کے مقصد سے اتفاق کیا۔ ملاقات میں طے پایا کہ تحریر یا تقریر میں ایسا مواد لانے سے احتراز کیا جائے جس کے ذریعے کسی بھی فرقے کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہو۔ اس کے علاوہ دونوں رہنماؤں نے فرقہ واریت کے خاتمہ کے لیے مذہبی جماعتوں کے تمام رہنماؤں کو درج ذیل فریم ورک کے مطابق مل جل کر کام کرنے کے مقصد سے اتفاق کیا۔ بالخصوص درج ذیل چار نکات پر زور دیا گیا:

(۱) فرقہ ورانہ کشیدگی کی روک تھام کے لیے اشتعال انگیز تحریر و تقریر سے احتراز کیا جائے مزید یہ کہ ایک ایسی مشترکہ کمیشن کا قیام جو کشیدگی والے علاقوں کا دورہ کرے۔

(۲) تمام فرقوں کے ۳۱ علماء کے متفقہ ۲۲ نکات اور اسلامی نظریاتی کونسل کی متفقہ سفارشات کی روشنی میں اسلامی نظام کے لیے سفارشات طے کر کے توہین رسالت ﷺ کے مسئلے پر متفقہ مہم چلائی جائے۔ اس کے علاوہ مشترکہ نکات طے کرنے کے لیے کمیٹی قائم کی جائے۔

(۳) سیکولرازم اور مغربی ممالک کی بڑھتی ہوئی مداخلت کا مقابلہ کیا جائے۔

(۴) مشترکہ لائحہ عمل کو عوام کے سامنے لانے کے علاوہ مختلف طبقوں کے لوگوں اور تمام فرقوں کے علماء کرام اور مذہبی جماعتوں کو مشترکہ پلیٹ فارم پر لایا جائے۔ (ایضاً)

اسی ملاقات کے ایک مثبت پہلو یہ بھی سامنے آیا کہ سپاہ صحابہ نے فرقہ واریت کے خاتمہ کے لیے مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا اجمل کو ثالث مان لیا بلکہ سپاہ صحابہ اور تحریک جعفریہ نے ایک دوسرے کے خلاف مقدمے واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ (جنگ لاہور، ۲۰ مارچ ۱۹۹۵ء)

(۹) ایضاً، ۲۵ مارچ ۱۹۹۵ء (۱۰) ایضاً

(۱۱) واضح رہے کہ "ملی یکجہتی کونسل" بنانے کا خیال قبل ازیں قومی وملی یکجہتی کانفرنس میں زیر بحث آیا اور اتفاق رائے سے مذکورہ کونسل بنائے جانے کی راہ ہموار ہوئی۔ یہ کانفرنس جے یو آئی (سمیع گروپ) کے مولانا سمیع الحق نے طلب کی تھی۔ اس کانفرنس میں دیگر شرکاء کے علاوہ امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد، جے یو پی (نیازی) گروپ کے مولانا عبدالستار نیازی، تحریک فقہ جعفریہ کے مولانا ساجد نقوی، جے یو آئی فضل الرحمٰن گروپ کے مولانا اجمل خان، سپاہ صحابہ پاکستان کے مولانا ضیاء القاسمی، سواد اعظم پاکستان کے مولانا اسفندیار، جمعیت اہل حدیث کے مولانا ساجد میر، حزب جہاد کے مولانا آغا مرتضیٰ پویا، منہاج القرآن کے مولانا سید عتیق الرحمٰن شاہ اشاعت توحید وسنت کے مولانا اشرف علی، جمعیت اہل حدیث کے مولانا عارف سلمان رو پڑی اور تبلیغی جماعت کے مولانا مفتی ضیاء الحق شریک ہوئے۔ تاہم سپاہ محمد نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا۔ (ماہنامہ ندائے اہل سنت، اپریل ۱۹۹۵ء، ص ۳۵)

اسی کانفرنس میں مولانا شاہ نورانی نے تجویز پیش کی تھی کہ سپریم کورٹ کے ججوں کے حالیہ فرقہ وارانہ تشدد میں شدت کی تحقیقات کرائی جائیں اور تمام مذہبی گروپوں کو غیر مسلح کر کے اور ہر قسم کی دہشت گردی سے لاتعلقی کا اظہار کیا جائے۔ ان کے بقول دینی و مذہبی جماعتوں کو واضح طور پر اعلان کرنا چاہیے کہ وہ بیرونی امداد حاصل نہیں کر رہے۔ (ایضاً)

(۱۲) ایضاً (۱۳) ایضاً

(۱۴) ان میں سے ایک کمیٹی نے فرقہ واریت کے خاتمہ اور یکجہتی پیدا کرنے والے مشترکہ نکات پر غور فکر کر کے ایک جامع رپورٹ تیار کرنا تھی۔ جو ۲۲ نکات، اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات، اتحاد بین المسلمین کے لیے مولانا عبدالستار نیازی کی مرتب کردہ رپورٹ، سینٹ کی مذہبی امور کی

اسٹینڈنگ کمیٹی کی تجاویز کو سامنے رکھ کر تیار کی جائے گی۔ ساجد میر کو اس کمیٹی کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ جبکہ دیگر اراکین میں جے یو آئی (س) کے سابق سینیٹر مولانا قاضی عبداللطیف، جماعت اسلامی کے نائب امیر سینیٹر پروفیسر خورشید احمد، تحریک جعفریہ کے سینیٹر علامہ جواد ہادی، جے یو پی (نورانی) کے مولانا شبیر احمد ہاشمی اور اتحاد العلماء کے مولانا عبدالمالک شامل تھے۔ مختلف مذہبی رہنماؤں کے خلاف بنائے گئے مقدمات کا جائزہ لینے کے لیے سابق رکن قومی اسمبلی اور جماعت اسلامی لاہور کو امیر سلیم بٹ ایڈووکیٹ، علامہ افتخار نقوی، سردار محمد لغاری، علی غضنفر کرار دی اور ندیم اقبال ایڈووکیٹ شامل تھے۔ (انٹرویو مولانا شبیر ہاشمی، ۱۵ جولائی ۲۰۰۵)

(۱۵) ایضاً

(۱۶) روزنامہ جنگ لاہور، ۱۴ مارچ ۱۹۹۵ء

(۱۷) ماہنامہ ندائے اہل سنت لاہور، بحوالہ سابقہ، ص ۷۔

(۱۸) ہاشمی، شبیر احمد بحوالہ سابقہ

(۱۹) انٹرویو مولانا شاہ احمد نورانی، ماہنامہ ندائے اہل سنت لاہور، مئی ۱۹۹۵ء، ص ۱۵۔

(۲۰) احمد، پروفیسر غفور، بے نظیر حکومت کا عروج و زوال، القمر پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۵۸۔

(۲۱) غیر مطبوعہ ڈائری، مولانا شبیر احمد ہاشمی، ص ۸۶۔

(۲۲) ایضاً (۲۳) ایضاً

(۲۴) ضمیمہ ۱۰ ''ملی یکجہتی کونسل کا ضابطہ اخلاق''، بحوالہ ماہنامہ ندائے اہل سنت لاہور، اگست ۱۹۹۵ء، ص ۲۷۔۲۹

(۲۵) تحریک تحفظ ناموس رسالت ﷺ نے ۲۹ اپریل کو نفاذ شریعت اور قانون توہین رسالت کے سلسلے میں ملک گیر ہڑتال کرنے کا جو اعلان کیا تھا وہ فیصلہ واپس لے لیا گیا۔ تاہم تحریک تحفظ ناموس رسالت کے کارپردازان نے ۲۷ مئی کی ہڑتال میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ مذکورہ اجلاس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ عالمی برادری سے اظہار یکجہتی کے لیے ۲۶ مئی کو یوم اتحاد منایا جائے گا۔ اس روز اجتماعات ہوں گے۔ قرار دادیں پیش کی جائیں گی اور احتجاجی مظاہرے بھی ہوں گے۔ ملی یکجہتی کونسل کا یہ اجلاس مولانا شبیر ہاشمی کے بقول ساڑھے چار گھنٹے جاری رہا۔ (انٹرویو مولانا ہاشمی، ۱۵ جولائی ۲۰۰۵ء) اس میں مختلف جماعتوں کے ۲۷ ارکان شریک ہوئے۔ (روزنامہ جنگ لاہور، ۲۴ اپریل ۱۹۹۵ء)

(۲۶) ایضاً، ۲۲ اپریل ۱۹۹۵ء۔

(۲۷) تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمہ ۹ ''چیئرمین ملی یکجہتی کونسل کا خط''۔

(۲۸) ایضاً

(۲۹) روزنامہ جنگ لاہور، ۲۷ مئی ۱۹۹۵ء۔

(۳۰) بخاری، ضیاء اللہ، سید، ''ملی یکجہتی کونسل کا قیام اور حقائق و خدشات''، روزنامہ خبریں لاہور، ۲۷ اپریل ۱۹۹۵ء

(۳۱) ایضاً

(۳۲) انٹرویو شاہ فرید الحق، ۲۳ جولائی ۲۰۰۵۔

(۳۳) بخاری، بحوالہ سابقہ۔

(۳۴) شاہ فرید الحق، بحوالہ سابقہ۔

(۳۵) ماہنامہ ندائے اہل سنت لاہو، نومبر ۱۹۹۵ء، ص ۹۔

(۳۶) ایضاً

(۳۷) روزنامہ جنگ لاہور، ۲۳ مارچ ۱۹۹۵ء۔

(۳۸) ایضاً، ۲۶ مارچ ۱۹۹۵ء۔ (۳۹) ایضاً، ۳۰ مارچ ۱۹۹۵ء۔

(۴۰) اس اجلاس میں جمعیت علماء اہل حدیث کے سیکریٹری جنرل علامہ ریاض الرحمٰن یزدانی ایڈووکیٹ، مولانا محمد اصغر فاروق، جماعت اسلامی (مودودی گروپ) کے امیر سید حیدر فاروق مودودی، جمعیت علمائے پاکستان (محمود شاہ گجراتی گروپ) کے سید سعید شاہ گجراتی، پاکستان سنی کونسل کے چیئرمین علامہ سعید الرشید عباسی، تحریک تحفظ ناموس صحابہ کے چیئرمین ڈاکٹر شیخ محمد حبیب اللہ، پاکستان علماء مشائخ کونسل کے سربراہ صاحبزادہ خلیل الرحمٰن ظہیر، پاکستان یونٹی فورم کے سیکریٹری چوہدری فضل حسین، تحریک عزم عباس کے سید جعفر شیرازی، اہل حدیث یوتھ فورس کے سیکریٹری جنرل مولانا عبدالخالق آفریدی اور دیگر علماء اور دینی عمائدین نے شرکت کی۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۲۵/ اپریل ۱۹۹۵ء)

(۴۱) ایضاً (۴۲) ایضاً، ۲۷ مئی ۱۹۹۵ء (۴۳) ایضاً

(۴۴) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے۔ سادات، محمد انور (۱۹۸ء۔ ۱۹۸۱ء) فیروز سنز اُردو انسائیکلو پیڈیا لاہور، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۸۴ء، ص ص ۵۶۰۔۵۶۱۔

(۴۵) روزنامہ جنگ لاہور، ۴ جون ۱۹۹۵ء۔

(۴۶) مولانا شاہ احمد نورانی جن کا بنایا ہوا اسلامیہ جمہوری محاذ اگرچہ سیاسی میدان میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن داعی اتحاد بین المسلمین کی حیثیت سے ایک اہم اور بے مثال رہنما کی حیثیت سے سامنے آئے تھے۔ اگرچہ انہیں اور ان کی جمعیت کو آئندہ انتخابات ۱۹۹۷ء میں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی تاہم آنے والے دنوں میں انہیں ایک اور سیاسی اتحاد متحدہ مجلس عمل کا سربراہ بننے کا موقع ملا جو انتخابات ۲۰۰۲ء سے مابعد ان کی وفات ۱۱ دسمبر ۲۰۰۳ء (تک) ملکی تاریخ کا ایک کامیاب سیاسی اتحاد ثابت ہوا۔ جو دیگر سیاسی جماعتوں کے دم بہ قدم ایک کامیاب حزب اختلاف کی صورت میں ڈھل گیا۔ اس اتحاد کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملک اور صوبوں میں ایم کیو ایم کی کی حکومتیں قائم ہیں جنہیں کسی بھی طور پر تا حال (۲۰۰۵ء تک) کمزور نہیں کیا جا سکا۔

ملی یکجہتی کونسل کا میاب تجربہ بالآخر ۲۰۰۲ء میں بننے والی متحدہ مجلس عمل (ایم ایم اے) کی بنیاد بنا۔ اگرچہ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں ایجنسیوں کی ملی بھگت سے بے نظیر بھٹو کو ناکام کر کے نواز شریف کو ''بھاری مینڈیٹ'' دلوایا گیا جو بالآخر نواز شریف کی شخصی آمریت اور محاذ آرائی کی پالیسیوں کے باعث ۱۹۹۹ء کے فوجی انقلاب پر منتج ہوا۔ اس لیے ۱۹۹۷ء میں مذہبی جماعتوں کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کارنر کر دیا گیا۔ تاہم ۲۰۰۲ء میں عوام کی بھاری اکثریت نے مذہبی جماعتوں کو ملی تاریخ میں پہلی بار بھاری مینڈیٹ دیا۔ (شاہ فرید الحق، بحوالہ سابقہ۔)

(۴۷) روزنامہ جنگ لاہور، ۱۷ جون ۱۹۹۵ء۔

(۴۸) ایضاً

(۴۹) نظامی، قیوم، ''ملی یکجہتی کونسل ضابطہ اخلاق کی پابندی کرے''، روزنامہ جنگ لاہور، ۲۲ جون ۱۹۹۵ء۔

(۵۰) ایضاً (۵۱) ایضاً

(۵۲) شاہ فرید الحق، بحوالہ سابقہ۔

(۵۳) روزنامہ جنگ لاہور، ۲۶ ستمبر ۱۹۹۵ء۔

(۵۴) ایضاً

(۵۵) شاہ فرید الحق، بحوالہ سابقہ۔

(۵۶) ایضاً

(۵۷) روزنامہ جنگ لاہور، ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۵ء۔

(۵۸) ایضاً (۵۹) ایضاً (۶۰) ایضاً (۶۱) ایضاً

(۶۲) ایضاً (۶۳) ایضاً (۶۴) ایضاً

(۶۵) مزید تفصیل کیلئے دیکھئے مولانا شاہ احمد نورانی کا خط مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور، ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۵ء۔

(۶۶) روزنامہ جنگ لاہور، ۱۷ جون ۱۹۹۵ء۔

(۶۷) ایضاً (۶۸) ایضاً، ۲ نومبر ۱۹۹۵ء۔ (۶۹) ایضاً، ۳ نومبر ۱۹۹۵ء۔

(۷۰) ایضاً، ۱۸ نومبر ۱۹۹۵ء۔ (۷۱) ایضاً، ۲۷ نومبر ۱۹۹۵ء۔ (۷۲) ایضاً

(۷۳) ایضاً (۷۴) ایضاً (۷۵) ایضاً، یکم دسمبر ۱۹۹۵ء۔

(۷۶) مرغوب، صہیب، ''دینی جماعتوں کی نئی صف بندی''، جنگ لاہور، جمعہ میگزین، یکم دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۔

(۷۷) ایضاً (۷۸) ایضاً

(۷۹) روزنامہ جنگ لاہور، ۳۰ دسمبر ۱۹۹۵ء۔

(۸۰) ایضاً (۸۱) ایضاً

(۸۲) شاہ فرید الحق، بحوالہ سابقہ۔

(۸۳) روزنامہ جنگ لاہور، ۱۷ جنوری ۱۹۹۶ء۔

(۸۴) احمد، غفور، بحوالہ سابقہ۔ ص ص ۳۴۵۔۳۴۶۔

(۸۵) روزنامہ جنگ لاہور، ۲۱ جنوری ۱۹۹۶ء۔

(۸۶) احمد، غفور، بحوالہ سابقہ، ص ۴۷۱

(۸۷) ایضاً

(۸۸) روزنامہ جنگ لاہور، ۵ جنوری ۱۹۹۶ء۔

(۸۹) ایضاً، جنوری ۱۹۹۶ء۔ (۹۰) ایضاً

(۹۱) احمد، غفور، بحوالہ سابقہ، ص ۴۷۹

(۹۲) مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۹۶ء کو کونسل کے زیر اہتمام مجوزہ انتخابی اصلاحات اور فحاشی و عریانی کے خلاف پارلیمنٹ ہاؤس اور ٹی وی اسٹیشن کے سامنے زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔ شرکاء میں قاضی

حسین، مولانا سمیع الحق، مولانا نیازی، حافظ حسین احمد، ساجد نقوی، آغا مرتضیٰ پویا، پروفیسر ساجد میر، حافظ سلمان روپڑی اہم تھے۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے عزم ظاہر کیا کہ پاکستان کے اسلامی تشخص کو مغربی یورپی اور بھارتی ایجنٹوں کی دست برد سے بچایا جائے۔ ٹی وی کی آر میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے اس کا پاکستان اور اسلامی ثقافت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ بھارتی ثقافت کا عکاس ہے۔ حکومت اور اس کے کارندے ایسے ہتھکنڈوں سے قوم کی غیرت کا جنازہ نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم مغربی تہذیب کے پروردہ اور بھارتی ثقافت کے ایجنٹوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا۔ (روزنامہ جنگ لاہور، ۲۰ مارچ ۱۹۹۶ء)

(۹۳) ایضاً، ۲۱ مارچ ۱۹۹۶ء۔

(۹۴) احمد، غفور، بحوالہ سابقہ، ص ۴۹۴

(۹۵) ایضاً　(۹۶) ایضاً

(۹۷) روزنامہ جنگ لاہور، ۱۳/اپریل ۱۹۹۶ء۔

(۹۸) احمد، غفور، بحوالہ سابقہ، ص ۵۰۹

(۹۹) ایضاً　(۱۰۰) ایضاً

(۱۰۱) بٹ، محمد اکرم، سردار، ''کیا یہ قائداعظم کا پاکستان ہے؟'' ماہنامہ ندائے اہل سنت لاہور، فروری ۱۹۹۶ء، ص ۱۰

(۱۰۲) ایضاً　(۱۰۳) ایضاً

(۱۰۴) روزنامہ جنگ لاہور، ۲۵/اپریل ۱۹۹۶ء

(۱۰۵) ایضاً، ۲۶/اپریل ۱۹۹۶ء۔　(۱۰۶) ایضاً　(۱۰۷) ایضاً

(۱۰۸) ایضاً، ۸ جولائی ۱۹۹۶ء

(۱۰۹) احمد، غفور، بحوالہ سابقہ، ص ۵۴۷

(۱۱۰) قبل ازیں ۲۹ جون کو نواز شریف نے مولانا شاہ احمد نورانی سے جبکہ ۳۰ جون کو قاضی حسین احمد سے ملاقاتیں کیں۔ مولانا نورانی سے ملاقات میں دو نکات پر مشتمل ایک سمجھوتہ کو حتمی شکل دی گئی۔ اول یہ کہ مسلم لیگ اور کونسل میں شامل جماعتیں موجودہ حکومت کے خاتمے کے لیے مشترکہ جدوجہد کریں گے۔ دوسرے یہ کہ انتخابات کے موقع پر پیپلز پارٹی اور اس کی حلیف جماعتوں کے خلاف مشترکہ امیدوار لانے کے لیے نشستوں پر ایڈجسٹمنٹ کے طریق پر عمل کیا

جائے گا۔ مولانا نورانی پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا کہ انہیں کونسل نے اختیار نہیں دیا تھا کہ وہ اس کی جانب سے مسلم لیگ سے کوئی معاہدہ کریں۔ اس سے صرف ایک روز قبل تو خود مولانا نورانی نے ایک پریس کانفرنس میں چھ دینی جماعتوں پر مشتمل ایک انتخابی اتحاد کا اعلان کیا تھا۔ (غفور، بحوالہ سابقہ ص ۵۴۰) اس سے اگلے دن نواز شریف نے منصورہ میں قاضی سے ملاقات کی اور حکومت سے نجات کے لیے باہمی تعاون اور رابطوں پر اتفاق کیا۔

(۱۱۱) نواز شریف کی جانب سے بلائے گئے سربراہ اجلاس میں درج ذیل رہنماؤں نے شرکت کی۔ قاضی حسین احمد، منور حسن (جماعت اسلامی)، اجمل خٹک، اعظم ہوتی (این این پی) اشتیاق اظہر، اجمل دہلوی (ایم کیو ایم)، پیر عبدالجبار، فدائے نور (جمہوری وطن پارٹی)، مولانا سمیع الحق (جے یو آئی س)، کے ایم اظہر (جے یو پی نورانی)، پروفیسر ساجد میر (جمعیت اہل حدیث)، علامہ ساجد نقوی، وزارت حسین نقوی (تحریک جعفریہ پاکستان) صاحبزادہ فضل کریم (جے یو پی نیازی)، ممتاز بھٹو (یونائیٹڈ نیشنل الائنس)، حاصل بزنجو، یوسف مستی خیل (پی این پی)، معراج محمد خان، خواجہ سلیم (قومی محاذ آزادی)، ظفر اللہ جمالی (آزاد گروپ)، صاحبزادہ عارف سلمان روپڑی (جماعت اہلحدیث)۔ (روزنامہ جنگ لاہور، ۲۵ جولائی، ۱۹۹۶ء)

(۱۱۲) ایضاً، ۱۳ جولائی ۱۹۹۶ء۔

(۱۱۳) روزنامہ جنگ لاہور، ۲۸/اگست ۱۹۹۶ء۔

(۱۱۴) ایضاً، ۲۹ ستمبر ۱۹۹۶ء۔

(۱۱۵) احمد، غفور، بحوالہ سابقہ، ص ص ۵۸۰۔۵۸۱۔

(۱۱۶) ایضاً، ۸/اکتوبر ۱۹۹۶ء۔

(۱۱۷) احمد، غفور، بحوالہ سابقہ، ص ۵۹۳۔

(۱۱۸) ایضاً　(۱۱۹) ایضاً، ص ۵۶۰۔　(۱۲۰) ایضاً، ص ۵۹۴

(۱۲۱) ایضاً، ص ۵۹۹۔　(۱۲۲) ایضاً، ص ۶۰۲۔　(۱۲۳) ایضاً

(۱۲۴) روزنامہ جنگ لاہور، ۲۲/اکتوبر ۱۹۹۶ء۔

(۱۲۵) ایضاً، ۳۱/اکتوبر ۱۹۹۶ء۔

(۱۲۶) احمد، غفور، بحوالہ سابقہ، ص ص ۶۰۹۔۶۱۱

(۱۲۷) ایضاً

(۱۲۸) روزنامہ جنگ لاہور، یکم نومبر ۱۹۹۶ء۔

(۱۲۹) ایضاً (۱۳۰) ایضاً، ۲۶ نومبر ۱۹۹۶ء۔

(۱۳۱) احمد، غفور، بحوالہ سابقہ، ص ص ۶۱۵۔۶۱۶۔

(۱۳۲) ایضاً، ص ۶۱۶۔

(۱۳۳) روزنامہ جنگ لاہور، ۴ نومبر ۱۹۹۴ء

(۱۳۴) ایضاً (۱۳۵) ایضاً

(۱۳۶) روزنامہ جنگ لاہور، ۶ نومبر ۱۹۹۶ء۔

(۱۳۷) ایضاً

(۱۳۸) احمد، غفور، بحوالہ سابقہ، ص ۶۲۰۔

(۱۳۹) ایضاً، ص ۶۲۲ (۱۴۰) ایضاً

(۱۴۱) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۷ نومبر ۱۹۹۶ء

(۱۴۲) احمد، غفور، بحوالہ سابقہ، ص ۶۳۰

(۱۴۳) روزنامہ جنگ لاہور، ۱۹ نومبر ۱۹۹۶ء

(۱۴۴) ایضاً، ۷ نومبر ۱۹۹۶ء

(۱۴۵) احمد، منیر، بحرانوں کا دور، نواز شریف کے عروج و زوال کی کہانی، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۰۷۔۲۰۸

(۱۴۶) ایضاً (۱۴۷) ایضاً (۱۴۸) ایضاً (۱۴۹) ایضاً، ص ۲۱۶۔

(۱۵۰) ایضاً (۱۵۱) ایضاً، ص ۲۱۸ (۱۵۲) ایضاً

(۱۵۳) ایضاً، ص ۲۱۹۔ (۱۵۴) ایضاً

(۱۵۵) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۳ جنوری ۱۹۹۷ء۔

(۱۵۶) ایضاً

(۱۵۷) روزنامہ جنگ لاہور، ۲۶ نومبر ۱۹۹۶ء۔

(۱۵۸) ایضاً، ۹ جنوری ۱۹۹۶ء۔ (۱۵۹) ایضاً

(۱۶۰) حسین، ارشد، ''جے یو پی اور جماعت اسلامی کی ہم نوائی''، بحوالہ روزنامہ جنگ لاور، ۱۲ جنوری ۱۹۹۷ء۔

(۱۶۱) روزنامہ جنگ لاہور، ۲۶ دسمبر ۹۹۶ء۔

(۱۶۲) احمد، منیر، بحوالہ سابقہ، ص ۲۳۶، ۲۳۷۔

(۱۶۳) تفصیل کے لیے دیکھیے، نتائج الیکشن ۱۹۹۷ء، انجم، زاہد حسین، الیکشن ۱۹۹۷ء، لاہور، ۱۹۹۷ء۔

(۱۶۴) روزنامہ جنگ لاہور، ۹ فروری ۱۹۹۷ء۔

(۱۶۵) ایضاً، ۱۰ فروری ۱۹۹۷ء۔ (۱۶۶) ایضاً، ۱۵ فروری ۱۹۹۷ء۔

(۱۶۷) ایضاً، ۱۶ فروری ۱۹۹۷ء۔ (۱۶۸) ایضاً، ۱۸ فروری ۱۹۹۷ء۔

(۱۶۹) ایضاً، ۲۰ فروری ۱۹۹۷ء۔ (۱۷۰) شاہ فرید الحق، بحوالہ سابقہ۔

(۱۷۱) ایضاً (۱۷۲) ایضاً (۱۷۳) ایضاً

(۱۷۴) روزنامہ جنگ لاہور، ۷ مئی ۱۹۹۷ء۔

(۱۷۵) احمد، منیر، بحوالہ سابقہ، ص ۲۵۲۔

(۱۷۶) ایضاً (۱۷۷) ایضاً، ص ۲۵۷ (۱۷۸) ایضاً

(۱۷۹) ایضاً، ص ۲۸۸ (۱۸۰) ایضاً (۱۸۱) ایضاً، ص ۲۹۰

(۱۸۲) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۱۴ اگست ۱۹۹۷ء۔

(۱۸۳) احمد، منیر، بحوالہ، ص ۲۹۶۔

(۱۸۴) ایضاً (۱۸۵) ایضاً، ص ۲۹۹۔

(۱۸۶) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۷ ستمبر ۱۹۹۷ء۔

(۱۸۷) احمد، منیر، بحوالہ سابقہ، ص ۳۱۱۔

(۱۸۸) ایضاً

(۱۸۹) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۴ نومبر ۱۹۹۷ء۔

(۱۹۰) احمد، منیر، بحوالہ سابقہ، ص ۳۳۲۔

(۱۹۱) ایضاً (۱۹۲) ایضاً، ص ۳۳۳۔ (۱۹۳) ایضاً

(۱۹۴) روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۲ نومبر ۱۹۹۷ء۔

(۱۹۵) احمد، منیر، بحوالہ سابقہ، ص ۳۳۳۔

(۱۹۶) ایضاً

(۱۹۷) یہ وہی جسٹس ارشاد حسن خان ہیں جو مشرف دور میں چیف الیکشن کمشنر تھے اور جن کی زیر نگرانی

ریفرنڈم ۲۰۰۱ء ہوا اور الیکشن ۲۰۰۲ء ہوئے تھے (مؤلف)۔

(۱۹۸) روز نامہ جنگ لاہور، ۲۹ نومبر ۱۹۹۷ء۔

(۱۹۹) ایضاً (۲۰۰) ایضاً (۲۰۱) ایضاً

(۲۰۲) ایضاً، ۲۹، ۳۰ نومبر ۱۹۹۷ء۔ (۲۰۳) احمد، منیر، بحوالہ سابقہ، ص ۳۳۴۔

(۲۰۴) ایضاً (۲۰۵) ایضاً

(۲۰۶) روز نامہ نوائے وقت لاہور، ۳ دسمبر ۱۹۹۷ء۔

(۲۰۷) ایضاً (۲۰۸) ایضاً

(۲۰۹) ایضاً، ۴ دسمبر ۱۹۹۷ء۔ (۲۱۰) ایضاً، ۲۴ دسمبر ۱۹۹۷ء۔

(۲۱۱) ایضاً، یکم جنوری ۱۹۹۸ء۔ (۲۱۲) ایضاً، ۲ جنوری ۱۹۹۸ء۔

(۲۱۳) احمد، منیر، بحوالہ سابقہ، ص ۳۲۵۔

(۲۱۴) روز نامہ نوائے وقت لاہور، ۱۳؍اکتوبر ۱۹۹۹ء۔

(۲۱۵) انٹرویو، مولانا شاہ احمد نورانی، ندائے اہل سنت، اگست ۲۰۰۱ء۔

(۲۱۶) ایضاً (۲۱۷) ایضاً (۲۱۸) ایضاً

(۲۱۹) ایضاً، ۳ فروری ۲۰۰۲ء

(۲۲۰) روز نامہ جنگ لاہور، ۴ فروری ۲۰۰۲ء

(۲۲۱) ایضاً (۲۲۲) ایضاً، ۶ فروری ۲۰۰۲ء۔

(۲۲۳) شاہ فرید الحق، بحوالہ سابقہ۔

(۲۲۴) ایضاً

(۲۲۵) خان، عمران یعقوب، "دینی جماعتیں کیا لائحہ عمل اختیار کریں گے"، روز نامہ جنگ لاہور، سیاسی ایڈیشن، ۱۲ مارچ ۲۰۰۲ء۔

(۲۲۶) ایضاً

(۲۲۷) روز نامہ جنگ کراچی، ۱۹ مارچ ۲۰۰۲ء۔

(۲۲۸) روز نامہ مشرق پشاور، ایضاً۔

(۲۲۹) ایضاً

(۲۳۰) ورچانہ (روز نامہ) وحدت پشاور، (پشتو)، ۲۰ مارچ ۲۰۰۲ء۔

(۲۳۱) ایضاً

(۲۳۲) خلیج ٹائمز، و روز نامہ ایکسپریس کراچی، ۱۳؍اپریل ۲۰۰۲ء۔

(233) Daily The Statesam Peshawar, April 3, 2002.

(۲۳۴) روز نامہ جنگ کراچی، ۳؍اپریل ۲۰۰۲ء۔

(۲۳۵) روز نامہ جات ڈان، جنگ، نوائے وقت، خبریں، امت، خاور، عوامی کراچی، نوائے وقت و جنگ لاہور، ۳؍اپریل ۲۰۰۲ء۔

(۲۳۶) روز نامہ خبریں کراچی، جنگ لاہور، ۵؍اپریل ۲۰۰۲ء۔

(۲۳۷) روز نامہ جنگ لاہور، ۷؍اپریل ۲۰۰۲ء۔

(۲۳۸) روز نامہ عوام کراچی، ایضاً۔

(۲۳۹) روز نامہ خاور کراچی، ایضاً۔

(۲۴۰) روز نامہ جرأت کراچی، ایضاً۔

(۲۴۱) روز نامہ نیا بنگالہ (بنگالی) کراچی، ۱۲؍اپریل ۲۰۰۲ء،

(242) Daily The Dawn Karachi, April 25, 2002.

(243) Daily The Statesman Peshawar, April 28, 2002.

(۲۴۴) روز نامہ انصاف لاہور، ۱۴ مئی ۲۰۰۲ء۔

(۲۴۵) روز نامہ جنگ لاہور، ۱۵ مئی ۲۰۰۲ء۔

(۲۴۶) ایضاً (۲۴۷) ایضاً، ۲۰ مئی ۲۰۰۲ء۔ (۲۴۸) ایضاً

(۲۴۹) ایضاً

(۲۵۰) روز نامہ خبریں لاہور، ۲۲ مئی ۲۰۰۲ء۔

(۲۵۱) روز نامہ دن کراچی، ۲۲ مئی ۲۰۰۲ء۔

(۲۵۲) روز نامہ جرأت کراچی، ۳۱ مئی ۲۰۰۲ء۔

(253) Daily The Dawn Karachi, June 30, 2002.

(۲۵۴) روز نامہ جنگ کراچی، ۴ جولائی ۲۰۰۲ء۔

(۲۵۵) روز نامہ خبریں لاہور، ۵ جولائی ۲۰۰۲ء۔

(۲۵۶) ایضاً، ۱۶ جولائی ۲۰۰۲ء۔

(۲۵۷) روزنامہ کائنات کراچی، ۲۲ جولائی ۲۰۰۲ء۔

(۲۵۸) روزنامہ انصاف ٹائمز کراچی ۲۳ جولائی ۲۰۰۲ء۔

(۲۵۹) روزنامہ اسلام کراچی، ۲۳ جولائی ۲۰۰۲ء۔

(۲۶۰) روزنامہ خبریں لاہور، ۲۳ جولائی ۲۰۰۲ء۔

(۲۶۱) ایضاً

(۲۶۲) انٹرویو جنرل (ر) کے ایم اظہر، ۱۵ جولائی ۲۰۰۵ء۔

(۲۶۳) ایضاً (۲۶۴) ایضاً

(۲۶۵) روزنامہ جنگ کراچی، یکم اگست ۲۰۰۲ء۔

(۲۶۶) ایضاً (۲۶۷) ایضاً (۲۶۸) ایضاً

(۲۶۹) روزنامہ اسلام کراچی، یکم اگست ۲۰۰۲ء۔

(۲۷۰) ایضاً

(۲۷۱) روزنامہ جنگ کراچی، یکم اگست ۲۰۰۲ء۔

(۲۷۲) ایضاً، ۱۳ اگست ۲۰۰۲ء۔

(۲۷۳) روزنامہ اسلام کراچی، ۷ اگست ۲۰۰۲ء۔

(۲۷۴) روزنامہ جنگ لاہور، ۱۲/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۷۵) ایضاً (۲۷۶) ایضاً

(۲۷۷) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۲/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۷۸) ایضاً

(۲۷۹) روزنامہ جنگ ملتان، ۱۴/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۸۰) وڑائچ، سہیل، ''نیا وزیر اعظم کون ہوگا؟''، روزنامہ جنگ لاہور، سیاسی ایڈیشن، ۱۵/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۸۱) روزنامہ سیاست کراچی، ۱۵/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۸۲) روزنامہ اوصاف اسلام آباد، ۱۷/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۸۳) ایضاً (۲۸۴) ایضاً

(۲۸۵) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۲۰/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۸۶) روزنامہ کائنات کراچی، ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۸۷) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۸۸) روزنامہ جنگ لاہور، ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۸۹) ایضاً، ۲۱/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۹۰) روزنامہ ایکسپریس کراچی، ۲۵/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۹۱) روزنامہ خبریں لاہور، ۲۵/ اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۹۲) روزنامہ جانباز کراچی، ۷/ نومبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۹۳) روزنامہ جنگ لاہور، ۶ نومبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۹۴) روزنامہ جنگ ملتان، ۷ نومبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۹۵) روزنامہ عوام کراچی، ۱۴ نومبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۹۶) ایضاً (۲۹۷) ایضاً

(۲۹۸) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۲ نومبر ۲۰۰۲ء۔

(۲۹۹) ایضاً

(۳۰۰) روزنامہ نوائے وقت کراچی، یکم دسمبر ۲۰۰۲ء۔

(۳۰۱) ایضاً، ۱۹ دسمبر ۲۰۰۲ء۔ (۳۰۲) ایضاً، ۱۳ دسمبر ۲۰۰۲ء۔

(۳۰۳) ایضاً (۳۰۴) ایضاً، ۱۶ دسمبر ۲۰۰۲ء۔

(۳۰۵) ایضاً، ۲۲ دسمبر ۲۰۰۲ء۔ (۳۰۶) ایضاً، ۲۵ دسمبر ۲۰۰۲ء۔

(۳۰۷) روزنامہ عوام کراچی، ۲۶ دسمبر ۲۰۰۲ء۔

(۳۰۸) روزنامہ جنگ لاہور، یکم جنوری ۲۰۰۳ء۔

(۳۰۹) روزنامہ ڈان کراچی، ۹ جنوری ۲۰۰۳ء۔

(۳۱۰) روزنامہ جسارت کراچی، ۱۷ جنوری ۲۰۰۳ء۔

(۳۱۱) انٹرویو ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی، ۲۳ جولائی ۲۰۰۵ء۔

(۳۱۲) روزنامہ اسلام، ۲۱ جنوری ۲۰۰۳ء۔

(۳۱۳) ملک بھر سے جیتنے والے اہم رہنماؤں میں مولانا شاہ احمد نورانی، میاں رضا ربانی، محمد میاں سومرو، نثار میمن، ڈاکٹر عبدالحفیظ شیخ، عباس کمیلی، پروفیسر خورشید احمد، شوکت عزیز، جاوید اشرف، اسحاق

ڈار، مولانا سمیع الحق، محمد علی درانی و دیگر اہم رہنما شامل ہیں۔ سندھ میں حکومتی اتحاد کے جنرل نشستوں پر ۸ ٹیکنو کریٹس و علماء اور خواتین کے لیے مخصوص نشستوں پر ۱۳،۳ امیدوار کامیاب ہوئے جبکہ پیپلز پارٹی اور متحدہ مجلس عمل کے اپوزیشن اتحاد کے جنرل نشستوں پر ۶ اور علماء و ٹیکنو کریٹس اور خواتین کے لیے مخصوص نشستوں پر ایک ایک امیدوار کامیاب ہوا۔ سینٹ کے لیے ووٹنگ سندھ اسمبلی بلڈنگ کے کمیٹی روم نمبر ایک میں ہوئی جو صبح نو بجے سے شام چار بجے تک جاری رہی۔ سندھ اسمبلی کے تمام ۱۶۸ ارکان نے ووٹ ڈالے۔ جنرل نشستوں پر ایک، ٹیکنو کریٹس کی مخصوص نشستوں پر دو اور خواتین کے لیے مخصوص نشستوں پر ایک ووٹ مسترد ہوا۔ غیر سرکاری نتائج کے مطابق سندھ سے سینٹ کی جنرل نشستوں پر کامیاب امیدواروں میں محمد میاں سومرو اور ڈاکٹر عبدالحفیظ شیخ (مسلم لیگ ق)، امین دادا بھائی (متفقہ امیدوار)، بابر غوری، عباس کمیلی اور احمد علی (متحدہ قومی موومنٹ)، آصف مصطفیٰ جتوئی (نیشنل الائنس) اور جسٹس (ر) عبدالرزاق تھہیم (مسلم لیگ فنکشنل)، علماء اور ٹیکنو کریٹس کے لیے مخصوص نشستوں پر یاسمین شاہ (مسلم لیگ ق) اور عابدہ سیف ایڈووکیٹ اور نگہت مرزا (متحدہ قومی موومنٹ) شامل ہیں۔ جبکہ اپوزیشن کی جنرل نشستوں پر کامیاب ہونے والوں میں میاں رضا ربانی، ڈاکٹر صفدر عباسی، انور بیگ، ڈاکٹر عبداللہ ریاض اور عبداللطیف رضی (پیپلز پارٹی) اور مولانا شاہ احمد نورانی (متحدہ مجلس عمل) ٹیکنو کریٹس کے لیے مخصوص نشست پر فاروق احمد نائیک ایڈووکیٹ (پیپلز پارٹی) اور خواتین کے لیے مخصوص نشست پر رخسانہ زبیری (پیپلز پارٹی) شامل ہیں۔ ٹیکنو کریٹس کے لیے مخصوص نشست پر متحدہ قومی موومنٹ کے پروفیسر محمد سعید صدیقی اور پیپلز پارٹی کے نفیس صدیقی اور خواتین کے لیے مخصوص نشستوں پر متحدہ قومی موومنٹ کی نگہت مرزا اور پیپلز پارٹی کی ملیح ملک (محمد میاں سومرو کی ہمشیرہ) کے درمیان سخت مقابلہ رہا۔ نفیس صدیقی اور ملیحہ ملک پوائنٹس پر ہار گئے۔ آزاد امیدوار اور سندھ کے سابق ممبر بلدیات دیوان محمد یوسف فاروق بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ جنرل نشست پر امیدوار تھے۔ انہیں سات ووٹ ملے جبکہ کامیابی کے لیے ۱۲ ووٹ درکار تھے۔ بلوچستان سے سینٹ کی ۲۲ نشستوں میں مسلم لیگ (ق) ۹ نشستیں حاصل کر کے پہلے اور متحدہ مجلس عمل ۶ نشستیں حاصل کر کے دوسرے نمبر پر رہیں، دیگر جماعتوں میں سے پختون خواہ ملی عوامی پارٹی اور نیشنل الائنس نے دو دو اور بلوچستان نیشنل موومنٹ، نیشنل پارٹی (مینگل) اور جمہوری وطن پاورٹی نے ایک ایک نشست حاصل کر لی۔ خواتین کی چار مخصوص نشستوں میں

سے مسلم لیگ (ق) نے تین نشستیں حاصل کرلیں۔ بلوچستان اسمبلی کی کل ۶۵ ارکان میں سے ۶۴ نے ووٹ ڈالے جبکہ آزاد رکن اسمبلی نوابزادہ بالاچ مری ووٹ ڈالنے کے لیے اسمبلی نہیں آئے۔ انتخابات میں سینٹ کی جنرل اور ٹیکنو کریٹس کی نشستوں پر کوئی ووٹ مسترد نہیں ہوا جبکہ خواتین کی مخصوص نشستوں کے لیے ڈالے گئے چھ ووٹ مسترد قرار دیئے گئے۔ سینٹ کی ۱۴ عام نشستوں میں سے مسلم لیگ (ق) نے پانچ، متحدہ مجلس عمل نے چار، پشتونخواہ ملی عوامی پارٹی نے دو اور نیشنل الائنس بلوچستان نیشنل موومنٹ اور بلوچستان نیشنل پارٹی (مینگل) نے ایک ایک نشست حاصل کی۔ ٹیکنو کریٹس کی چار نشستوں میں سے متحدہ مجلس عمل نے دو اور مسلم لیگ (ق) اور جمہوری وطن پارٹی نے ایک ایک نشست حاصل کی، خواتین کی چار مخصوص نشستوں میں سے تین مسلم لیگ (ق) نے حاصل کیں بلکہ ایک نشست مسلم لیگ کی اتحادی جماعت نیشنل الائنس نے حاصل کر لی۔ بلوچستان سے جو امیدوار سینیٹر منتخب ہوئے ان یں مسلم لیگ (ق) کے محمد نصیر مینگل، ایاز کان مندوخیل، محمد سرور خان کاکڑ، میر ولی محمد بادن، محمد اکرم ولی، سعید احمد ہاشمی، پیر گل آغا، مسز روشن خورشید پراچہ اور کلثوم پروین، متحدہ مجلس عمل کے ڈاکٹر عزیز اللہ ساگوئی، رحمت اللہ کاکڑ ایڈووکیٹ، ڈاکٹر محمد اسماعیل بلیدی، حاجی لیاقت بنگلوئی، کامران مرتضیٰ ایڈووکیٹ اور آغا محمد نیشنل الائنس کے مبہم خان بلوچ اور شیریں نور، پشتون، خواہ ملی عوامی پارٹی کے نواب محمد ایاز خان جوگیزئی اور رضا محمد رضا، بلوچستان نیشنل موومنٹ کے سید محمد اسلم بلیدی، بلوچستان نیشنل پارٹی (مینگل) کے ثناء اللہ بلوچ اور جمہوری وطن پارٹی کے امان اللہ کنرائی ایڈووکیٹ شامل ہیں۔ سرحد سے سینٹ کی ۲۲ نشستوں میں سے ۱۴ جنرل نشستوں میں متحدہ مجلس عمل نے ۷، پاکستان مسلم لیگ (ق) نے ایک، پی پی پی (شیر پاؤ) نے ایک اور تین آزاد امیدواروں نے کامیابی حاصل کر لی ہے جبکہ پی پی پی (پارلیمنٹرین) کا امیدوار صرف ایک ووٹ حاصل کر سکا۔ نتائج کے مطابق متحدہ مجلس عمل کے امیدواران پروفیسر خورشید نے ۹، سید مراد علی شاہ نے ۹، مولانا گل نصیب نے ۱۰ اور سید ہدایت اللہ شاہ نے ۹ ووٹ لے کر کامیابی حاصل کر۔ اس طرح آزاد اراکین میں گلزار احمد نے ۱۰ اور ان کے بیٹے وقار احمد نے ۱۱ ووٹ جبکہ اعظم خان سواتی نے ۱۱ ووٹ لے کر کامیابی حاصل کی۔ پی پی پی (شیر پاؤ) کے شجاع الملک نے ۱۰ جبکہ مسلم لیگ (ق) کے کمانڈر خلیل نے ۹ ووٹ لے کر کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں اضافہ ووٹوں کی تقسیم اور ترجیحات کے نتیجے میں متحدہ مجلس عمل کے مزید دو اراکین مولانا راحت

حسین اور صاحبزادہ خالد جان بھی کامیاب ہوگئے۔ حتمی نتائج کے مطابق متحدہ مجلس عمل ۷، پی پی (شیر پاؤ) ایک، ایک این پی ایک اور مسلم لیگ (ن) ایک، مسلم لیگ (ق) ایک اور تین آزاد آزار ارکین جنرل نشستوں پر کامیاب ہوگئے۔ عام نشستوں کے لیے ڈالے گئے اضافہ ووٹوں کی تقسیم کے نتیجے میں اے این پی اسفند یار ولی خان، ایم ایم اے کے پروفیسر ابراہیم اور مسلم لیگ (ن) کے سردار مہتاب عباس بھی کامیاب ہوگئے۔ خواتین کے لیے مختص ۴ نشستوں پر متحدہ مجلس عمل کی ممتاز بی بی اور ڈاکٹر کوثر فردوس، پیپلز پارٹی شیر پاؤ کی ہیسہ زاہد، طاہر خیلی اور مسلم لیگ (ق) کی بیگم فوزیہ فخر الزماں کامیاب قرار پائیں جبکہ علماء ٹیکنوکریٹس کی سیٹوں پر متحدہ مجلس عمل کے مولانا سمیع الحق، ڈاکٹر محمد سید، پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز کے فرحت اللہ اور اے این پی کے الیاس بلور کامیاب ہوئے۔ پنجاب اسمبلی کے ارکان نے ۱۴ جنرل نشستوں پر مسلم لیگ (ق) کے ۹ پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز کے ۲، مسلم لیگ (ن) کے دو اور نیشنل الائنس نے ایک امیدوار کو منتخب کرلیا۔ پنجاب سے سینٹ کی ٹیکنوکریٹس اور خواتین کی چار چار مخصوص نشستوں پر مسلم لیگ (ق) کے ۶ امیدوار چوہدری انور بھنڈر، ڈاکٹر خالد رانجھا، ایس ایم ظفر، بیگم زرینہ شمیم عالم، بیگم گلشن سید، ڈاکٹر نگہت آراء، پیپلز پارٹی کے محمد اکبر کوانجہ اور مسلم لیگ (ن) کی سعیدہ عباسی بلا مقابلہ سینیٹر منتخب ہوئے۔ قومی اسمبلی کی چار اور فاٹا کی ۸ نشستوں پر ۲۷ فروری کو پولنگ ہوگی جس کے بعد سینٹ کی تشکیل کے بعد جمہوری اداروں کی تکمیل مکمل ہوجائے گی۔ ۲۴ فروری ۲۰۰۳ء کو چاروں صوبوں میں ۸۰ نشستوں کے لیے ۱۲۵ امیدواروں نے حصہ لیا۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۲۵ فروری ۲۰۰۳ء)

(۳۱۴) تفصیل کے لئے دیکھئے قومی اخبارات، روزنامہ ہائے ڈان، دی نیوز، دی نیشن، نوائے وقت، جنگ کراچی۔ اور مقامی اخبارات کراچی: تعمیر سندھ، عوام، جرأت، جسارت، خاور، ریاست وغیرہ برائے مارچ ۲۰۰۳ء۔

(۳۱۵) روزنامہ عوام کراچی، ۳ مارچ ۲۰۰۳ء۔

(۳۱۶) روزنامہ جنگ کراچی، ۱۰ مارچ ۲۰۰۳ء۔

(۳۱۷) ایضاً، ۱۳ مارچ، ۲۰۰۳ء۔ (۳۱۸) ایضاً، ۲۱ مارچ ۲۰۰۳ء۔

(۳۱۹) روزنامہ اوصاف کراچی، ۱۰ اپریل ۲۰۰۳ء۔

(۳۲۰) روانامہ جانباز کراچی، ۲۰ اپریل ۲۰۰۳ء۔

(۳۲۱) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۰ اپریل ۲۰۰۳ء۔

(۳۲۲) روزنامہ جنگ لاہور ۲۶ اپریل ۲۰۰۳ء۔

(۳۲۳) روزنامہ جنگ لاہور، ۲۶ اپریل ۲۰۰۳ء۔

(۳۲۴) روزنامہ نوائے وقت راول پنڈی، ۲۶ اپریل ۲۰۰۳ء۔

(۳۲۵) ایضاً

(۳۲۶) ان مذاکرات میں فریقین نے ایل ایف او کی متنازعہ شقوں پر اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ مذاکرات میں حکومت کی جانب سے وزیراعظم جمالی، چوہدری شجاعت، راؤ سکندر، سردار لغاری، شیخ رشید، آفتاب شیر پاؤ، صفوان اللہ، اعجاز الحسن چٹھہ، عبدالرزاق تھہیم، جبکہ متحدہ حزب اختلاف کی جانب سے مولانا نورانی، قاضی حسین احمد، مولانا سمیع، مولانا فضل الرحمٰن، ساجد میر، علامہ نقوی، جاوید ہاشمی، اسحاق ڈار، امین فہیم، اعتزاز احسن، شاہ محمود قریشی اور لطیف کھوسہ نے مذاکرات میں شرکت کی جبکہ ڈاکٹر طاہر القادری، عمران خاں، اسفندیار ولی، عبدالرؤف، محمود خاں اچکزئی، اسلم سلیری اور مولانا اعظم طارق نے پہلی بار حصہ لیا۔ (ایضاً)

(۳۲۷) روزنامہ جنگ لاہور، ۹ مئی ۲۰۰۳ء۔

(۳۲۸) ایضاً، ۱۳ مئی ۲۰۰۳ء۔ (۳۲۹) ایضاً

(۳۳۰) ایضاً، ۱۴ مئی ۲۰۰۳ء۔ (۳۳۱) ایضاً، ۲۴ مئی ۲۰۰۳ء۔

(۳۳۲) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۱۷ مئی ۲۰۰۳ء۔

(۳۳۳) ایضاً، ۱۸ مئی ۲۰۰۳ء۔ (۳۳۴) ایضاً، ۲۸ مئی ۲۰۰۳ء۔

(۳۳۵) یہ امر قابل ذکر ہے کہ وزیراعظم جمالی کی صدر جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کے بعد وزیراعظم کی ایم ایم اے کے قائدین سے ملاقات ہوئی۔ یہ بھی واضح رہے کہ جمالی نے اس ملاقات کو خفیہ رکھا جبکہ مولانا نورانی نے یہ بیان دیا کہ ان کی صدر سے ملاقات ہوئی نہ وزیراعظم سے۔ اخبارات بے پر کی اڑا رہے ہیں۔ بعض اخبارات نے یہاں تک لکھا کہ وردی پر سمجھوتہ کے بعد نیشنل سیکورٹی کونسل میں ایم ایم اے کے دو نشستیں دینے کی پیش کش بھی کی گئی۔

(۳۳۶) روزنامہ جنگ لاہور، ۶ جون ۲۰۰۳ء۔

(۳۳۷) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۶ جون ۲۰۰۳ء۔

(۳۳۸) روزنامہ جنگ کراچی، ۸ جون ۲۰۰۳ء۔

(۳۳۹) نقوی، علی جاوید، ''متحدہ مجلس عمل کا سربراہی اجلاس''، روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۱۱ جون ۲۰۰۳ء۔

(۳۴۰) ایضاً (۳۴۱) ایضاً (۳۴۲) ایضاً (۳۴۳) ایضاً

(۳۴۴) ایضاً (۳۴۵) ایضاً (۳۴۶) ایضاً

(۳۴۷) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۱۱ جون ۲۰۰۳ء۔

(۳۴۸) روزنامہ دن کراچی، ۶ جولائی ۲۰۰۳ء۔

(۳۴۹) ایضاً

(۳۵۰) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۷ جولائی ۲۰۰۳ء۔

(۳۵۱) ایضاً (۳۵۲) ایضاً

(۳۵۳) روزنامہ جنگ کراچی، ایضاً۔

(۳۵۴) ایضاً (۳۵۵) ایضاً

(۳۵۶) روزنامہ عوام کراچی، ۷ جولائی ۲۰۰۳ء۔

(۳۵۷) ایضاً

(۳۵۸) روزنامہ دن کراچی، ۷ جولائی ۲۰۰۳ء۔

(۳۵۹) ایضاً (۳۶۰) ایضاً

(۳۶۱) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۷ جولائی ۲۰۰۳ء۔

(۳۶۲) روزنامہ جنگ لاہور ۸ جولائی ۲۰۰۳ء۔

(۳۶۳) روزنامہ نوائے وقت ملتان، ایضاً۔

(۳۶۴) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۱۴ جولائی ۲۰۰۳ء۔

(۳۶۵) مزید تفصیل کے لئے صہیب مرغوب، ''حکومت۔ اپوزیشن مذاکرات''، روزنامہ جنگ لاہور ۱۵ جولائی ۲۰۰۳ء۔

(۳۶۶) ایضاً (۳۶۷) ایضاً

(۳۶۸) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۲۸ جولائی ۲۰۰۳ء۔

(۳۶۹) روزنامہ جنگ لاہور ۲۹ جولائی ۲۰۰۳ء۔

(۳۷۰) ایضاً (۳۷۱) ایضاً (۳۷۲) ایضاً

(۳۷۳) روزنامہ عوام کراچی، ۳ اگست ۲۰۰۳ء۔

(۳۷۴) روزنامہ جنگ لاہور، ایضاً

(۳۷۵) روزنامہ خاور کراچی، ۴ اگست ۲۰۰۳ء۔

(۳۷۶) روزنامہ جنگ لاہور، ایضاً

(۳۷۷) ایضاً

(۳۷۸) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۷ اگست ۲۰۰۳ء۔

(۳۷۹) ایضاً ۱۶ اگست ۲۰۰۳ء۔

(۳۸۰) روزنامہ جنگلاہور، ۲۴ اگست ۲۰۰۳ء۔

(۳۸۱) ایضاً (۳۸۲) ایضاً، ۲۵ اگست ۲۰۰۳ء۔ (۳۸۳) ایضاً، ۲۸ اگست ۲۰۰۳ء۔

(۳۸۴) ایضاً، ۳ ستمبر ۲۰۰۳ء۔ (۳۸۵) ایضاً، ۷ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

(۳۸۶) ایضاً، ۱۲ ستمبر ۲۰۰۳ء۔ (۳۸۷) ایضاً، ۱۳ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

(۳۸۸) ایضاً، ۱۴ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

(۳۸۹) نوائے وقت کراچی، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

(۳۹۰) ایضاً، ۳ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

(۳۹۱) روزنامہ جنگ کراچی، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

(۳۹۲) ایضاً

(۳۹۳) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

(۳۹۴) روزنامہ عوام کراچی، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

(۳۹۵) ایضاً

(۳۹۶) روزنامہ جنگ لاہور، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

(۳۹۷) روزنامہ خبریں کراچی، ۲۲ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

(۳۹۸) نقوی، علی جاوید، ''وردی کا مسئلہ اٹکا ہوا ہے''، روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۲۲ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

(۳۹۹) ایضاً (۴۰۰) ایضاً (۴۰۱) ایضاً (۴۰۲) ایضاً

(۴۰۳) ایضاً

(۴۰۴) روزنامہ نوائے وقت کراچی، ۲۴ ستمبر ۲۰۰۳ء۔

(۴۰۵) روزنامہ جنگ لاہور، ۲۵ ستمبر ۲۰۰۳ء۔
(۴۰۶) ایضاً، ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۳ء۔ (۴۰۷) ایضاً، ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۳ء۔
(۴۰۸) ایضاً، ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۳ء۔ (۴۰۹) ایضاً، ۱۰ دسمبر ۲۰۰۳ء۔
(۴۱۰) ایضاً، ۱۲ دسمبر ۲۰۰۳ء۔ (۴۱۱) ایضاً
(۴۱۲) ایضاً (۴۱۳) ایضاً، ۲۰ دسمبر ۲۰۰۳ء۔ (۴۱۴) ایضاً، ۲۹ دسمبر ۲۰۰۳ء۔
(۴۱۵) ایضاً، ۳۰ دسمبر ۲۰۰۳ء۔
(۴۱۶) روزنامہ جنگ لاہور، یکم جنوری ۲۰۰۴ء۔
(۴۱۷) ایضاً ۲ جنوری ۲۰۰۴ء۔ (۴۱۸) ایضاً
(۴۱۹) روزنامہ عوام کراچی، ۲ جنوری ۲۰۰۴ء۔
(۴۲۰) ایضاً (۴۲۱) ایضاً
(۴۲۲) روزنامہ جنگ لاہور، ۲ جنوری ۲۰۰۴ء۔
(۴۲۳) ایضاً
(۴۲۴) انٹرویو ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی، ۲۳ جولائی ۲۰۰۵ء۔
(۴۲۵) روزنامہ جنگ لاہور، ۸ جنوری ۲۰۰۴ء۔

مولانا شاہ احمد نورانی کا اندازِ سیاست......
ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے ۹۰ سالہ دور میں علمائے حق بالخصوص علمائے اہل سنت کی دینی سرگرمیاں لائق تحسین ہیں۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد اکابرین اہل سنت کا قافلہ سست پڑ گیا۔ اس طرح ۱۹۴۷ء سے لے کر ستر کی دہائی کے آغاز تک ملت اسلامیہ کے بطل جلیل شاہ فضل حق خیر آبادی کی شجاعانہ وراثت کے یہ امین سرکار و دربار کے کاسہ لیس بن گئے۔ جس سے نہ صرف سواد اعظم اہل سنت کی بدنامی ہوئی بلکہ اغیار کو بھی طعنہ زنی کا موقعہ ملا۔ مولانا عبدالحامد بدایونی کی وفات سے لے کر انتخابات ۱۹۷۰ء تک کا دور جمعیت علماء پاکستان پر بڑا بھاری گزرا۔ ۲۳ سال کا یہ درمیانی عرصہ جمعیت کے لیے یوں بھی نقصان دہ تھا کہ اس دوران علماء کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا جس کے منہ کو اقتدار کا خون لگ گیا۔ جس سے طبقہ علماء میں چند ایسے سوداگر پیدا ہو گئے جن کا قبلہ وکعبہ محض کوچہ اقتدار ٹھہرا۔

یوں ان کے شاہانہ مزاج سے بالکل تکلف ومختلف مولانا شاہ احمد نورانی سیاسی میدان عمل میں اترے تو اس طبقہ کو ان کی آمد بالکل نہ بھائی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی کی مخالفت شروع ہوگئی۔ اس طبقہ علماء مشائخ کو فوری حمایت اس سادہ لوح طبقہ علماء کی ملی جو پیری مریدی کو ہی اصل دین سمجھتے تھے۔ گویا سرکار دو عالم کی جہاں رنگ و بو میں آمد کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ صرف پیری مریدی کا ادارہ قائم فرمائیں۔ یہ سادہ لوح حضرات اپنے پیروں کی اندھا دھند تقلید، جائز و ناجائز حمایت اور ان کے ہر اقدام کو عین منشائے قرآن ثابت کرنے پر تلے رہے۔ دینی مدارس سے فارغ التحصیل یہ جوان ضروری بلکہ فرض سمجھتے تھے کہ کسی نہ کسی پیر کی بیعت کریں۔ جبکہ دوسری طرف ان کے پیرانِ عظام کی حالت یہ تھی کہ انہوں نے اپنی گدی بچانے کی خاطر ہر آمر وقت حکومت سے سمجھوتہ کرلیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ قیام پاکستان

کے بعد کون سی حکومت ایسی آئی ہے جس نے خلوص نیت سے قیام پاکستان کے جواز کو صحیح ثابت کرتے ہوئے اسے عین اسلامی فلاحی ریاست بنانے کی سعی کی ہو۔ اگر یقیناً ایسا نہیں تو پھر مذہب کے سوداگروں نے اہل حکومت کی ہم نوائی کس بنیاد پر کی۔ یہ حضرات ہر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے وزیر مشیر اور دست و بازو کیوں بنے۔

یوں بھی پاکستان میں مذہبی سیاست ہمیشہ ایک عجیب کشش و پیچ میں مبتلا رہی ہے۔ قائداعظم نے پاکستان کو ایک جمہوری ریاست بنایا تھا۔ اور جمہوریت کا بنیادی اصول "چرچ اور اسٹیٹ" کی علیحدگی ہے۔ یعنی ایک جمہوری ریاست میں مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے اور ریاستی معاملہ ہوتا ہے اور ریاستی معاملات میں مذہبی عناصر کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ جملہ معترضہ ہے لیکن عجب طرفہ تماشہ ہے کہ قیام پاکستان کی ابتدا اور قائداعظم کی رحلت کے بعد ایک طرف تو حکمران جماعت مسلم لیگ کے جاگیردار عناصر، بیوروکریسی اور ملٹری نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے جمہوری حکومتوں کا خاتمہ کیا۔ قائداعظم کے دست راست پاکستان کے پہلے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان قتل کر دیئے گئے۔ دوسری طرف مذہبی سیاست دانوں یعنی ملاّ عناصر نے پاکستان کو ایک جمہوری فلاحی ریاست نہ بنائے جانے میں جاگیرداروں، بیوروکریسی اور ملٹری کا بھرپور ساتھ دیا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ بھارت کی طرح یہاں زرعی اصلاحات نہ ہو سکیں جبکہ خارجی محاذ پر پاکستان مکمل طور پر امریکی کیمپ میں چلا گیا اور ملک کے سب سے بڑے صوبے بنگال سے زیادتیوں کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جہاں کی قیادت متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ پاکستان میں مذہبی سیاست کی علمبردار بعض جماعتیں قیام پاکستان سے قبل قائداعظم کو کافر اعظم قرار دیتی تھیں اور پاکستان کی مخالفت کرتی تھیں۔ تاہم مولانا شاہ احمد نورانی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی طرح تحریک پاکستان میں سرگرم رہے اور تحریک پاکستان کے دوران نیشنل گارڈ فورسز کے مسلم نوجوانوں کو منظم کیا گیا۔ بعد ازاں انہوں نے جمعیت علمائے پاکستان کے پلیٹ فارم سے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔

مولانا شاہ احمد نورانی کی سیاست میں آمد سے مذہبی سیاست میں خوشگوار تبدیلی آئی۔ انہوں نے روایتی اندازِ سیاست ترک کر کے ارباب اقتدار و اختیار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی روش کو فروغ دیا۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ جنرل یحییٰ

خان کو انہوں نے اس وقت شراب نوشی سے منع کر دیا جب وہ کسی کی بات سننا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ ان کے اس اقدام نے سیاست کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ یحییٰ کے بعد بھٹو عہد حکومت میں بھی انہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر بھٹو کی مخالفت کی اور بھٹو کی طرف سے جان سے مار دینے کی دھمکیوں کے باوجود راہِ حق پر ڈٹے رہے۔

مولانا شاہ احمد نورانی پارٹ ٹائم ملاّ یا جز وقتی سیاست دان نہ تھے۔ ان کے نزدیک سیاست اور دین ایک ہی سکے کے دو رخ تھے ان کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۹۷۳ء کے وفاقی جمہوری اور کسی حد تک اسلامی آئین کی تشکیل میں اس حکومت سے مفاہمت اور تعاون ہے جس کی پالیسی اور نظریاتی منشور سے انہیں بنیادی اختلاف تھا لیکن جہاں ملک کے لیے ایک مستقل آئین کی ضرورت اور ریاستی تشخص کا سوال تھا تو وہ اس حکومت سے آئین سازی کے عمل پر مفاہمت کے لیے نہ صرف خود تیار ہوئے بلکہ ان سیاست دانوں کو بھی جو بھٹو حکومت کے مخالف تھے کی تیار کردہ اس عظیم دستاویزی تیاری کے لیے آمادہ کیا۔

وہ آئین پاکستان میں ۱۹۷۳ء میں ۲۰۰ کے قریب ترامیم تجویز کرنے کے باوجود اس پر دستخط نہیں کیے کیونکہ وہ انہیں مکمل طور پر اسلامی نہیں سمجھتے تھے۔ آئین پاکستان میں متفقہ طور پر مسلمان کی تعریف درج کرنے کا کریڈٹ بھی انہیں کو جاتا ہے، جس سے قادیانیوں کے اقتدار میں آنے کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ بعد ازاں کسی صلے لالچ، دھونس، دھمکی کی پرواہ کیے بغیر انہوں نے قومی اسمبلی میں ارتداد قادیانیت کی قرارداد پیش کی۔ بھٹو جیسے ضدی اور منتقم مزاج شخص کو مسئلہ ختم نبوت اسمبلی میں لائے جانے پر قائل کرنا بھی انہیں کا کام تھا۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات سے قبل پاکستان قومی اتحاد کی تشکیل اور جمعیت علمائے پاکستان کے منشور کو اتحاد کے منشور کے طور پر قابل قبول بنانا اور بعد ازاں حکومت مخالف تحریک کو تحریک نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ بدل دینا، انہی کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ پھر اس جرم کی پاداش میں پاکستان کے گرم ترین علاقہ گڑھی خیرو کی جیل میں بغیر سہولیات کے قید و بند کی صعوبت برداشت کر کے انہوں نے اپنے پیش روؤں کی روایت سے انحراف کر کے انہیں عزت سے جینے کا درس دیا۔ یہ انہی کی اتحاد برآور شخصیت کی مساعی جلیلہ کا ثمرہ تھا کہ مبصرین نے قومی اتحاد میں شامل جماعتوں کے متعلق لکھا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ اتحاد میں شامل تمام جماعت ایک سا انداز فکر رکھتی ہیں اور ان کے رہنما ایک جیسی باتیں کرتے ہیں۔ این ڈی پی کا طرز فکر

کچھ اور ہو سکتا تھا لیکن بیگم نسیم ولی خاں اور سردار شیر باز مزاری کی تقریریں بھی نظام مصطفیٰ ﷺ کے عنوانات کے تحت ہوتیں۔ ایک طرف تو فکری وحدت و یگانگت کا یہ عالم تھا کہ ان تمناؤں کی تقریروں میں نہ صرف موضوع بلکہ الفاظ بھی ایک جیسے استعمال ہوتے۔ جو کچھ پروفیسر غفور احمد سوچتے وہی مولانا مفتی محمود کرتے۔ مولانا نورانی جو بات اپنی تقریروں میں کرتے وہی دوسرے رہنماؤں کی بھی ہوتی۔

مولانا شاہ احمد نورانی اصولی سیاست کے علمبردار تھے کبھی اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ کبھی چور دروازے سے اقتدار قبول نہیں کیا۔ نہ کبھی اقتدار کی خواہش کی نہ ہی کوشش۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی مخالفین تک ان کا نام نہایت احترام سے لیتے تھے۔ تحریک پاکستان سے لے کر تحریک ختم نبوت اور تحریک نظام مصطفیٰؐ سے لے کر حالیہ دور کی پارلیمنٹ کی بالادستی کی تحریک تک انہوں نے کبھی اصولوں پر سودے بازی گوارہ نہ کی۔

۱۹۷۸ء میں جنرل ضیاء الحق نے مولانا نورانی کو پیغام بھیجا کہ وہ ان کی جماعت کو حکومت میں شامل کرنے اور انہیں مرکز اور دو صوبوں میں اہم وزارتیں دینے کے لیے تیار ہیں۔ مزید برآں اس پیغام کے ذریعے یہ بات بھی ان کے علم میں لائی گئی کہ مولانا مفتی محمود کی جمعیت علمائے اسلام، نوابزادہ نصر اللہ خان کی پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی، جماعت اسلامی، مسلم لیگ اور پاکستان قومی اتحاد میں شامل دیگر جماعتیں بھی حکومت میں شامل ہونے کی حامی بھر چکی ہیں۔ اب وزارتوں کی تقسیم کے لیے ان کا عندیہ ملنے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ مولانا شاہ احمد نورانی پیغام سننے کے بعد سخت غصہ میں آگئے اور چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے پیغام لانے والے سے کہا کہ سیاستدان اپنے افکار و نظریات، اپنے خیالات اور اپنے سیاسی تصورات کے علاوہ جمہوریت اور جمہوری عمل سے کمٹڈ ہوتا ہے۔ میں ملک کے جمہوری عمل سے وابستہ ہوں اور میرے لیے یہ قطعی طور پر ممکن نہیں ہے کہ میں جمہوریت پر شب خون مارنے والے ایک مطلق العنان فوجی آمر کے ہاتھ پر بیعت کرلوں اور وزارت حاصل کرنے کے لیے اپنے ذہن، ظرف اور ضمیر کا سودا کرلوں۔ اقتدار کے لیے سودے بازی اور سمجھوتہ ہمارے بزرگوں کا وطیرہ نہیں رہا۔ جنرل ضیاء کی حکومت میں جسے بھی شامل ہونا ہو اپنی مرضی سے شامل ہو جائے، میں آمروں کی صفوں میں شامل ہونے والوں میں اپنا نام درج نہیں کرا سکتا۔ اسی بے باکی، حق گوئی اور مارشل لاء مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی جمعیت علماء

پاکستان کے کئی ٹکڑے کر دیئے گئے۔ حاجی محمد حنیف طیب، ظہور الحسن بھوپالی کے علاوہ کئی رہنما ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور اپنے علیحدہ گروپ بنا لیے۔ ان کی سیاست کا طرۂ امتیاز یہ رہا کہ کبھی حاکم وقت سے ملاقات کی خواہش یا کوشش نہ کی اور جہاں ملک و قوم کا مفاد دیکھا ملاقات کے لیے بلانے پر ضرور گئے بلاوجہ کبھی انکار نہ کیا، کئی مواقع آئے جب اگر وہ چاہتے تو تھوڑی سی لچک دکھا کر بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے مفاد پرستی اور حرص و طمع کی سیاست سے گریز کیا۔

مارشل لاء حکومت کے ایماء پر جب کراچی میں مذہبی سیاسی جماعتوں کا زور توڑنے کے لیے لسانی بنیاد پر سیاست چمکانے کے قبیح عمل کا آغاز ہوا تو اس کی مخالفت میں فقط مولانا نورانی کی آواز اٹھی۔ یہاں بھی ان کی روایت اصول پسندی آڑے آئی اور انہوں نے اصولوں پر سمجھوتہ سے قطعاً انکار کر دیا۔ جب ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ آپ مہاجر ہو کر بھی مہاجروں کا ساتھ دینے سے گریزاں کیوں ہیں تو ان کا سادہ سا جواب یہ تھا کہ میں جب میرٹھ سے چلا تو مہاجر تھا، جب پاکستان پہنچا تو میری مہاجرت ختم ہو گئی۔ اب میں دل و جان سے اول آخر اس ریاست کا شہری ہوں۔ پھر وقت نے ثابت کیا کہ انہوں نے اپنے قول و فعل میں کبھی تضاد پیدا ہونے نہیں دیا۔

ضیاء مارشل لاء کے بعد جمہوری دور ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۹ء میں اگرچہ وہ انتخابی سیاست میں ناکام رہے اور کسی حکومتی حامی اتحاد کا حصہ نہیں بنے اور نہ ہی کسی کو چہ اقتدار تک پہنچنے کے لیے کسی بھی بڑی جماعت کے حامی و مورد بنے چاہے وہ اسلامی جمہوری اتحاد ہو یا پیپلز ڈیموکریٹک فرنٹ۔ تاہم وہ شروع دن سے ہی ہم خیال سیاسی جماعتوں کے حامی رہے اور ضرورت پڑنے پر اتحاد تشکیل بھی دیے۔ جن میں متحدہ جمہوری محاذ (U.D.F)، پاکستان قومی اتحاد (P.N.A)، تحریک تحفظ پاکستان، پاکستان عوامی اتحاد، اسلامی جمہوری محاذ (I.D.F) اور متحدہ مجلس عمل (M.M.A) شامل ہیں۔

ضیاء مارشل لاء کے قبیح اثرات میں قومیت پرستی اور فرقہ وارانہ دہشت گردی سرفہرست ہیں۔ ان کے سدباب کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی نے مذہبی سیاسی جماعتوں کے اشتراک و تعاون سے ملی یکجہتی کونسل تشکیل دی۔ ان کی انہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مساجدوں، امام بارگاہوں میں بم دھماکوں اور فائرنگ کے واقعات میں نمایاں کمی دیکھنے میں آئی اور جو

انہوں نے کردکھایا وہ بڑی بڑی سیاسی جماعتوں سے ممکن نہ ہوسکا۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے فرقہ واریت کے لیے جو کوششیں کیں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔ ان کی ذات تمام فرقوں کے پیروکاروں کے لیے قابل احترام تھی۔ انہوں نے کبھی اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ اپنے عقیدے پر بھی سختی سے کاربند رہے۔ کبھی سیاست کو انفرادی مقصد کے حصول کا ذریعہ بھی نہیں بنایا۔ کبھی کسی سیاسی مخالف کی سیاسی مخالفت سے خوفزدہ نہیں ہوئے اور کبھی اپنے رویے سے کسی سیاسی مخالف کو خوفزدہ نہیں کیا۔ انہوں نے کبھی سیاسی اختلاف کو ذاتی اختلاف میں تبدیل نہ کیا یہی وجہ ہے کہ وہ ملک کے طول وعرض میں ایک غیر متنازعہ شخصیت کا درجہ حاصل کر چکے تھے اور یقیناً یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر مولانا نورانی بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث اور اثناء عشری مکاتب فکر کے گوناگوں اختلاف کے باوجود اتحاد بین المسلمین کی منزل حاصل کر لی تھی اور تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کے مشترک مقاصد کا تعین کر کے انہیں نکتہ اتحاد پر متفق کرلیا کرتے۔ ملی یکجہتی کونسل کے کامیاب تجربہ نے دینی سیاسی جماعتوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ آئندہ کسی بھی قومی مسئلہ پر مذہبی سیاسی جماعتیں کسی طور پیچھے نہ رہیں۔ بعد ازاں یہی قومی سوچ نائن الیون کے واقعہ کے بعد "دفاع افغانستان و پاکستان کونسل" کے قیام کا سبب بنی۔ دینی جماعتوں کے اسی اتحاد فکر کا نتیجہ تھا کہ ٹھیک ایک سال بعد انتخابات ۲۰۰۲ء کے موقع پر ملک کی چھ بڑی دینی جماعتوں کو اتنا بڑا عوامی مینڈیٹ کبھی نہیں ملا تھا جتنا اب کی بار ملا۔ یہ نتائج یقیناً تاریخ ساز تھے۔ کیا اس سے پہلے سوچا جاسکتا تھا کہ جمعیت علماء اسلام شمال مغربی سرحدی صوبہ میں تن تنہا حکومت بنا پائے گی؟ لیکن دینی جماعتوں کے اشتراک عمل اور اتحاد کی برکت سے یہ ناممکن بھی ممکنات میں شامل ہوگیا۔ یقیناً یہ میر کارواں مولانا شاہ احمد نورانی کی شخصیت کی برکت تھی کہ وہ دینی جماعتیں جو اس سے پہلے کلام وطعام کی روادار نہیں تھیں سیاسی طور پر یک جان و دو قالب ہوگئیں۔ قاضی حسین احمد اور مولانا فضل الرحمٰن کے آپسی مناقشات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں لیکن مولانا نورانی کی موجودگی میں ان دونوں شخصیات کے اختلافات دبے رہے کیونکہ ان کی شخصیت متفق علیہ تھی جو بلا کسی خوف اور لالچ کے ان کے درمیان موجود تھی۔

مولانا شاہ احمد نورانی کو ابتداء میں ایک سال کے لیے صدر مجلس چنا گیا تھا کیونکہ یہ طے پایا تھا کہ ہر سال ہر جماعت کے سربراہ کو باری باری متحدہ مجلس عمل کی صدارت کا موقع

دیا جائے گا۔ لیکن سال گزرنے کے بعد جب نئے صدر کو باری ملنا تھی تو اتحاد میں شامل جماعتوں کے سربراہوں بالخصوص قاضی حسین احمد نے اصرار کیا کہ مولانا شاہ احمد نورانی کو ہی آئندہ پانچ سالوں کے لیے صدر رہنے دیا جائے جو کافی رد و قدح کے بعد آئندہ دو سالوں کے لیے نئے سرے سے متحدہ مجلس عمل کے صدر منتخب کر لئے گئے۔ کیونکہ ان کی شخصیت ہی ایسی تھی جو اتحاد میں شامل تمام جماعتوں کو مطمئن رکھ سکتی تھی۔ یہ مولانا شاہ احمد نورانی کی شخصی فتح تھی کہ اتحاد میں شامل ہر جماعت کے رہنما نے انہی کی ذات پر اظہار اعتماد کیا۔ کیونکہ جیسا کہ سابقہ اتحادوں کا تجربہ شاہد ہے، مولانا شاہ احمد نورانی نے محض اتحاد کو رواں دواں رکھنے کی خاطر اپنی ذات اور جماعت کو قربانی کے لیے پیش کیا۔ پاکستان قومی اتحاد ۱۹۷۷ء کے لیے جب مختلف جماعتوں میں گفت وشنید چل رہی تھی اور ایک مرحلہ پر محض سیٹ ایڈجسٹمنٹ کے مسئلہ پر اختلافات اس درجہ شدت اختیار کر گئے تھے کہ اتحاد کا قیام ہی خطرے میں دکھائی دیتا تھا۔ یہ مولانا نورانی کی ذات ہی تھی جس نے جمعیت علمائے پاکستان کے لیے متعین کوٹہ سے کہیں کم نشستوں پر رضامندی ظاہر کر کے اتحاد کو بکھرنے سے بچالیا۔ اسی طرح متحدہ مجلس عمل کی انتخابی مہم کے دوران ان کی شخصی قربانی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے محض متحدہ مجلس عمل کی انتخابی مہم کی کامیابی کی خاطر اپنے کاغذات نامزدگی جمع نہ کرائے اور مجلس عمل کی کامیابی کے لیے دن رات ایک کردیا۔ کسی اور سیاسی جماعت کے سربراہ کی طرف سے اس قسم کی قربانی دینا ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انتخابات ۲۰۰۲ء کے بعد اتحاد میں شامل مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے آپ کو سیاسی میدان عمل سے الگ تھلگ نہ کریں کیونکہ قوم کو ابھی ان کی ضرورت ہے۔ ان پر زور دیا جارہا تھا کہ وہ سینٹ کے انتخابات کے لیے اپنے کاغذات نامزدگی ضرور داخل کرائیں لیکن مولانا شاہ احمد نورانی نے متعدد مرتبہ انکار کیا۔ اس پر قاضی حسین احمد نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ سینٹ میں اپوزیشن کو ان کی موثر آواز کی ضرورت ہے اور حکومت کے لیے یوں میدان کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے طوعاً کرہاً سینٹ کے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے رضامندی ظاہر کردی۔ یوں دیکھا جائے تو ۲۰۰۳ء کا سال مولانا شاہ احمد نورانی کے شخصی عروج کا سال تھا۔ بطور سیاستدان انہوں نے اتنی کامیابیاں سمیٹ لی تھیں جس کا کوئی بھی سیاستدان محض تصور ہی کرسکتا تھا۔ مولانا شاہ احمد نورانی وہ شخصیت تھی جنہوں نے "سیاست بلا اقتدار" کی

منفرد سیاسی روش کی بنیاد رکھی اور اپنی تمام سیاسی کیریئر کے دوران اس پر روبہ عمل رہے۔ ان کی تمام سیاسی سرگرمیوں کی مناط، بحالی جمہوریت کی جدوجہد تھی نہ کہ سوئے اقتدار، یہی وجہ تھی کہ وہ بلاخوف حق بات کہہ دیا کرتے تھے۔

متحدہ مجلس عمل کے ڈپٹی پارلیمانی لیڈر حافظ حسین احمد کے بقول انہوں نے تمام عمر آئین کے تحفظ کے لیے جدوجہد کی اور موجودہ دور کی آئینی ترامیم کے خلاف جدوجہد کر کے ۱۹۷۳ء کا آئین بچانے کی کوشش کی اور اپنی عمر کے آخر تک وہ اس دستور کو بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ آج اگر متحدہ مجلس عمل آئینی ترامیم کے خلاف اپنی جدوجہد آگے بڑھاتے ہوئے جس مقام پر پہنچی ہے وہ سب مولانا شاہ احمد نورانی کی زیرک قیادت کے نتیجے میں ہے۔ حکومت کے ساتھ معاملات میں سے مولانا نورانی ایک معتدل مزاج رہنما تھے۔ وہ معاملات کو افہام وتفہیم اور بہت سلجھے ہوئے انداز سے حل فرماتے تھے۔

مولانا شاہ احمد نورانی مشرف حکومت کے ناقدین ومخالفین میں شمار ہوتے تھے۔ شروع میں جب جنرل پرویز مشرف برسراقتدار آئے تو انکا رویہ کچھ کچھ مصالحت آمیز اور نرم تھا۔ مگر جب متحدہ قومی موومنٹ نے حکومت میں شمولیت اختیار کی تو مولانا نورانی کا مؤقف سخت ہوگیا۔ وہ جب بھی حکومت پر تنقید کرتے تو کراچی کے حالات اور کراچی کے "مجرموں" کو اقتدار دیئے جانے کی بات ضرور کرتے تھے۔ ۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد جب مشرف حکومت نے امریکی پالیسیوں کو تحفظ دینا شروع کیا تو مولانا نورانی کی طرف سے حکومت کی مخالفت میں بھی شدت آتی چلی گئی۔

بظاہر مولانا شاہ احمد نورانی متحدہ مجلس عمل کے سربراہ تھے اور ہماری سیاسی روایت کے تناظر میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ جو بھی پارٹی یا اتحاد کا سربراہ ہوتا ہے وہ فائنل اتھارٹی ہوتا ہے لیکن مجلس عمل کی سربراہی کی صورت حال مروجہ روایت سے انحراف کرتی ہوئی دکھائی دی۔ انہوں نے کسی بھی معاملے میں اپنی رائے کو مسلط نہ کیا۔ ان کی گفتگو ہمیشہ "مجھ فقیر کی رائے یہ ہے......" اور "......آگے جو فیصلہ ہو" کے سابقوں اور لاحقوں میں ملفوف ہوتی۔ چونکہ مولانا نورانی کی پارٹی جمعیت علمائے پاکستان نے عام انتخابات ۲۰۰۲ء میں بہت ہی کم نشستیں حاصل کی تھیں۔ اس لحاظ سے متحدہ مجلس عمل میں مولانا فضل الرحمٰن کی جمعیت علمائے اسلام کی حیثیت سے بڑی پارٹی کی تھی۔ چنانچہ اکثر معاملات میں انہی کی مرضی چلتی تھی۔ تاہم مولانا نورانی نے

ہمیشہ رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اتحاد میں شامل کسی بھی پارٹی کی حق تلفی نہ ہونے دی۔

مجلس عمل نے روز اوّل سے ہی حکومت مخالف سیاست کی اور عام انتخابات میں عوام کو مشرف حکومت کے خلاف برانگیختہ کر کے کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں حالات کی نزاکت کے پیش نظر بالخصوص صوبہ سرحد میں مجلس عمل کی حکومت کو بچانے کے لیے جمالی حکومت کے ساتھ مذاکرات کا ڈول ڈالا گیا۔ حتیٰ کہ متحدہ اپوزیشن کی دیگر پارٹیوں سے الگ مذاکرات بھی کیے گئے۔ اس اقدام میں بھی مولانا فضل الرحمٰن اور ان کی پارٹی کے ایماء پر تمام قائدین نے رواداری کا مظاہرہ کیا۔ جبکہ مولانا فضل الرحمٰن کی خواہش تھی کہ سانپ بھی مرجائے (یعنی جمالی حکومت سے بھی معاملات طے پاجائیں) اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے (مجلس عمل کی پالیسی بھی قائم رہے۔) اسی لیے حکومت سے مجلس عمل مذاکرات رک رک کر چلتے رہے اور چل چل کر رکتے رہے بالآخر پارلیمنٹ میں آئینی پیکج لانے کے لیے ۱۷ دسمبر ۲۰۰۳ء کی ڈیڈ لائن دے دی گئی۔

مولانا فضل الرحمٰن چوہدری شجاعت سے خصوصی مذاکرات بھی کر چکے تھے۔ مجلس عمل کی (لیاقت بلوچ اور حافظ حسین احمد پر مشتمل دو رکنی ٹیم بڑی سرگرمی سے مختلف حکومت ٹیموں سے مذاکرات کر کے ان کا رخ بدل چکی تھی۔ بلکہ آخری دنوں میں متحدہ مجلس عمل نے ۹ دسمبر کو اسلام آباد میں اپنی سپریم کونسل کا اجلاس طلب کرلیا تھا تاکہ حکومت سے معاملات طے کرنے کے لیے حتمی پالیسی طے کی جائے سپریم کونسل کے اس اجلاس میں مولانا شاہ احمد نورانی نے صدارت کرتے ہوئے اپنے ابتدائی کلمات میں ہی حکومت کی داخلہ وخارجہ پالیسیوں پر سخت تنقید کی تھی۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے واضح الفاظ میں کہا تھا "۱۱ ستمبر کے بعد مشرف نے سب سے زیادہ امریکہ کا ساتھ دیا ہے۔ افغانستان میں بے گناہوں کو قتل کیا گیا۔ ابھی بے شمار پاکستانی افغانستان میں قید ہیں۔ آئے روز پاکستان میں امریکی ایجنسیوں کے ساتھ مل کر چھاپے مارے جارہے ہیں۔ دینی مدارس غیر محفوظ ہیں۔ قبائلی علاقوں میں آپریشن جاری ہیں۔ یک طرفہ طور پر سیز فائر کا اعلان کردیا گیا ہے اور یوں مسئلہ کشمیر کو نظرانداز کیا جارہا ہے۔ سیاچن اس میں شامل نہیں تھا۔ بعد میں انڈیا کے کہنے پر اس کو بھی شامل کرلیا گیا۔ بھارتی تاجروں سے ملاقات میں جنرل مشرف نے کسی مطالبہ کے بغیر یکطرفہ فضائی رابطوں کی بحالی کا اعلان کردیا۔ اب واجپائی کی آمد پر غوری میزائلوں کے ماڈل ہٹا دیئے ہیں۔ بھارت نے بارڈر پر باڑلگانی شروع کردی ہے اور انہوں نے (مشرف) نے کہوٹہ لیبارٹری کے سائنس

دان پکڑ کر امریکہ کے حوالے کر دیے ہیں۔ مشرف اور موجودہ حکومت ملک وقوم کے وقار کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ ایسے میں آپ دیکھ لیں ان کے ساتھ کس طرح معاملات کرتے ہیں۔" جاری صورت حال کے تناظر میں اصول پسندی نورانی سے اسی قسم کے ردعمل ہی کی توقع کی تھی۔ مولانا نورانی کی صدارت میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ۱۷دسمبر ۲۰۰۳ء کی ڈیڈ لائن حتمی ہے۔ اس میں تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ اس طرح (معاملات طے نہ ہونے کی صورت میں) ۱۸ دسمبر سے چلنے والی "مشرف ہٹاؤ تحریک" بھی اعلان کردہ پروگرام کے مطابق ہی چلے گی۔ سب سے اہم فیصلہ یہ ہوا کہ متحدہ مجلس عمل پرویز مشرف کو اعتماد کا ووٹ کسی صورت نہیں دے گی۔ حتیٰ کہ یہ بھی طے ہوا کہ صوبہ سرحد میں کوشش کی جائے گی کہ مشرف کو ہرایا جائے۔ اسی طرح سینٹ میں بھی مولانا نورانی اور پروفیسر ساجد میر کی طرف سے حکومتی پالیسیوں پر زبردست تنقید کی گئی۔ مولانا نورانی دیگر اراکین اپوزیشن کے ساتھ احتجاج کرتے ہوئے سینٹ کے اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے اور بعد ازاں متحدہ اپوزیشن کے دیگر رہنماؤں کے ساتھ چل کر حکومت کے خلاف پریس کانفرنس کی جو کہ ان کی زندگی کی آخری پریس کانفرنس تھی۔ اس طرح وہ آخری سانس تک حکومت کی جمہوریت کش پالیسیوں کے مخالف رہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی کے انتقال سے مذہبی، سیاست کا ایک باب ختم ہو گیا۔ انہوں نے سیاست کے لیے مذہب کا پلیٹ فارم ضرور استعمال کیا مگر مذہب کے نام پر اپنی دکان سجانے کی کوشش کبھی نہ کی۔ سیاست میں آ کر انہوں نے وہی کچھ کیا جس کی مذہب کے نام پر اپنی دکان سجانے کی کوشش کبھی نہ کی۔ سیاست میں آ کر انہوں نے وہی کچھ کیا جس کی مذہب میں جتنی گنجائش تھی۔ خاص طور پر نظریاتی تحریکوں اور آئین سازی میں مولانا نورانی کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ملک جب بھی کبھی سیاسی بحران سے دوچار ہوا یا فوجی آمروں کی وجہ سے دستور پاکستان کو خطرات لاحق ہوئے۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے ایک مدبر اور رہنما کا کردار نبھایا۔ ہمارے سیاستدانوں میں قومی امور پر اختلافات کوئی نئی بات نہیں۔ وہ کبھی کسی قومی مسئلے پر نظریاتی طور پر ایک نہیں ہوئے مگر یہ مولانا شاہ احمد نورانی کا کمال تھا کہ انہوں نے ہمیشہ اپنی خداداد فہم وفراست سیاستدانوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا اور اسلامی دینی اقتدار اور بحالی جمہوریت کی تحریکوں میں نمایاں طور پر جدوجہد کرتے رہے۔

قومی مسائل پر ان کی سوچ ہمیشہ مثبت رہی۔ حکمرانوں سے کبھی فضولیات پر بحث نہیں کی بلکہ انہوں نے حکومت اور سیاستدانوں کے درمیان پل کا کردار ادا کیا۔ انہی کی بردباری اور معاملہ فہمی کا ہی نتیجہ تھا کہ انہی کی کاوش کی رہین منت "متحدہ مجلس عمل" نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار حکومتی اور امریکی ان کی قیادت کو ہلا کر رکھ دیا۔ بلکہ ملکی حکمرانوں کو بھی پہلی مرتبہ مذہبی جماعتوں کے وجود کا احساس ہوا۔ اگر بعد میں حکومت، مجلس عمل سے مذاکرات پر آمادہ ہوئی تو اس کا سہرا بھی بلاشبہ مولانا نورانی کے سر تھا۔

ملی یکجہتی کونسل اور متحدہ مجلس عمل کی صدارت ایک بہت کٹھن اور صبر آزما کام تھا۔ کونسل میں بسا اوقات گرما گرم بحث ہوتی اور ماحول میں ایسا تناؤ پیدا ہو جاتا تھا کہ کونسل کے وجود ہی کو خطرات لاحق ہو جاتے مگر مولانا نورانی اپنی حکیمانہ دانش وبصیرت اور محبت بھرے انداز سے حالات پر قابو پالیا کرتے تھے۔ اسی طرح متحدہ مجلس عمل کی قیادت دوران جب انتخابات ۲۰۰۲ء کا مرحلہ آیا تو سیٹوں کی تقسیم بڑا مشکل کام تھا۔ کئی مواقع پر اجلاسوں میں بحث وتکرار شدید اختلافات کی صورت اختیار کر لیتی اور اشتعال انگیز ماحول پیدا ہو جاتا تھا۔ ایسے ہر موقع پر صدر مجلس مولانا نورانی ہی اپنی ذمہ داری نبھاتے اور سب کے جذبات ٹھنڈے کرتے اور کوئی قابل عمل حل تجویز کرتے، بلکہ انتخابات کے بعد مختلف مواقع پر مختلف ذمہ داریوں اور عہدوں کے حوالے سے بھی مولانا اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مشکل گتھیاں سلجھاتے۔

مولانا شاہ احمد نورانی نہ صرف صلح کل کے قائل تھے بلکہ ملی یکجہتی کی روح اور عملی تصویر تھے۔ وہ اتحاد بین المسلمین اور عظیم تر اتحاد عالم اسلام بہت بڑے داعی وعلم بردار بھی تھے۔ وہ پاکستان اور باقی دنیا کے درمیان مکالماتی پل تھے۔ یورپ سمیت دنیا کے کئی ممالک نے اسلامی تعلیمات اور تبلیغ وابلاغ کا وسیلہ مولانا نورانی کی ذات کو بنایا۔ ان کی ایک بین الاقوامی شناخت اور شناسائی تھی۔

مولانا نورانی بازار سیاست کے بہت بڑے رمز آشنا تھے۔ انہوں نے ہمیشہ لسانیت، قومیت، تشدد اور لاشوں کی سیاست کو ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا۔ ملکی سیاست ہو یا تحریک ختم نبوت، قادیانیت کا فتنہ ہو یا مغربی تحریک وثقافت کی یلغار، مولانا نورانی نے کبھی ریاستی جبر وتشدد کی پرواہ نہ کی۔ وہ حقیقی معنوں میں اسٹیبلشمنٹ مخالف عالم دین اور مذہبی

وسیاسی رہنما تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جتنے حکمران برسرِ اقتدار آئے وہ الیکشن جیت کر آئے، چور دروازے سے آئے یا نگران وزیر اعظم بنا دیئے گئے ان کی پالیسیوں اقدامات اور نظام اقتدار پر مولانا کی گہری نگاہ تھی۔ خلاف آئین چلنے والی ہر حکومت کے وہ بے ریا نقاد اور بے رحم محتسب تھے۔ اسلامی روح سے متصادم قوانین پر گرفت کے لیے مولانا نورانی نے بڑے سے بڑے جمہوریت پسند سے بڑھ کر قربانی دی۔

جمہوریت سے ان کی کمٹمنٹ ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ آمریت کی ہر شکل ان کو ناگوار تھی۔ چاہے وہ ایوب خان کی آمریت ہو یا یحییٰ خان کی شرمناک حکمرانی، جنرل ضیاء الحق کی کمرشلائزڈ اسلامائزیشن ہو یا بے نظیر ونواز شریف کی جمہوریتوں کی غیر جمہوری پالیسیاں، انہوں نے ان سب کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ لیکن وہ بُری سے بُری جمہوری حکومت کو اپنی معیاد پوری کرنے کی اجازت دینے کے حامی تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ طالع آزما اور مہم جو آمروں کے عزائم اور ارادوں کے نباض تھے۔ ان کے بقول ''ان لوگوں کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ دیکھیے، بنگلے، کاریں بینک بیلنس اور وسیع کاروبار۔ جب چاہا حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اقتدار پر قابض ہو کر ترقی وخوشحالی کا راگ الاپتے رہتے ہیں قوم غربت اور بے بسی کی چکی میں پستی رہتی ہے۔'' ان کا نظریہ تھا کہ جمہوریت کے ٹاٹ میں آمریت کا مخمل لگانا ملک کی سیاسی ونظریاتی بقاء کے لیے سنگین خطرہ ہے۔ حکومت جمہوری ہوتی ہے یا پھر ڈکٹیٹر شپ، آدھا تیتر آدھا بٹیر والا نظام کبھی نہیں چلتا۔

یہ بات بھی ایک طے شدہ امر کی حیثیت رکھتی ہے کہ اسلام کے نظام حیات کو مغربی یلغار اور تہذیبی ریلے سے بچانے میں حق پر علماء کرام کی کوششوں ہی سے ملت اسلامیہ کا تشخص قائم ہوا۔ اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان تصادم اور اس سے متعلق بش ڈاکٹرائن پر عمل درآمد سے بہت پہلے مولانا شاہ احمد نورانی نے اہل مغرب سے ڈائیلاگ کی ضرورت کا احساس دلایا۔ انہیں جنرل مشرف کی اسلام کے بارے میں معذرات خواہانہ پالیسی سے سخت چڑ تھی۔ وہ اسے پاکستانی قوم کی توہین سے تعبیر کرتے۔ بھارت سے دوستی کی بابت وہ ایک خاص نقطہ نظر رکھتے تھے۔ ہندو ذہنیت اور برہمنی سیاست کے زہر سے ان کی آشنائی اور گہرے ادراک کے تناظر میں وہ ارباب اقتدار واختیار سے یہی توقع رکھتے کہ وہ بھارت کے ساتھ قومی معاملات کے حل کے لیے اپنے سخت موقف سے قطعی پسپائی اختیار نہ کریں۔

مولانا شاہ احمد نورانی ایک متحرک، فعال اور قوم وملک کا درد رکھنے والی ایسی شخصیت تھے، جنہوں نے اپنی عمر قیام کے پاکستان کے مقصد اوّلیں لا الہ الا اللہ کے نعرے کو عملی صورت دینے میں صرف کردی۔ اور اسے اپنی سیاست کے نکتہ ارتکاز کے طور پر لیا اور اسے نعرے کو دیگر سیاسی جماعتوں سے اتحاد کے وقت ''ہم خیالی'' کی بنیاد بنایا۔

اگر ہم تاریخ پاکستان کے تناظر میں اتحادوں کی سیاست کا جائزہ لیں تو ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض اتحاد نہایت سطحی مقاصد کے حصول کے لیے معرض وجود میں لائے گئے۔ زیادہ تر اکثریت ایسے اتحادوں کی ہے جسے صرف ''حکومت ہٹاؤ'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یا پھر ملکی وسائل پر قبضہ کے لیے ''حصہ بقدر جثہ'' کے زریں اصول کے تحت انہیں مل بانٹ کر کھانے کے لیے کوچۂ اقتدار میں داخلہ کی ایک سیڑھی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ بعض اتحاد محض حکومت کو دباؤ کے تحت رکھنے کے لیے بھی بنائے گئے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو اتحادوں کی سیاست کوئی لائق تحسین امر نہیں۔ جہاں تک انتخابی اتحادوں کا تعلق ہے تو پاکستانی سیاست میں مروجہ روایت کے تناظر میں انہیں محض حصول اقتدار کی ایک کوشش ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ تاہم مولانا شاہ احمد نورانی کے انداز سیاست کا مثبت پہلو یہی ہے کہ انہوں نے مختلف سیاسی اتحاد بناتے وقت ایسی کسی سوچ کو بھی قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ انہوں نے ہر سیاسی اتحاد کی بنیاد بحالی جمہوریت کی جدوجہد رکھی اور اپنی سیاست کا حصول نفاذ نظام مصطفی ﷺ قرار دیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مولانا شاہ احمد نورانی نے صاف ستھری سیاست کو فروغ دیا۔ ان کی تحریک پر بنائے گئے تمام اتحادوں کے بنظر غائر مطالعہ سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اتحاد بین المسلمین کے علمبردار مولانا نورانی ہی ''وجہ اتحاد'' اور ان کے روح رواں تھے۔ آپ نے جس بھی اتحاد کو خیر باد کہا وہ اپنی موت آپ مرگیا۔ اگر ان کے بنائے ہوئے آخری اتحاد متحدہ مجلس عمل ہی کا جائزہ لیا جائے تو ہم کہہ سکتے کہ اس کی تشکیل وتسلسل میں مولانا شاہ احمد نورانی کی ذات ہی متحرک رہی۔ وہ جب تک زندہ رہے، اصولوں پر سمجھوتہ نہ کیا لیکن ان کی وفات کے بعد محض دو ہفتوں کے اندر اندر متحدہ مجلس عمل کی سیاست نے بھی یوٹرن لیتے ہوئے نہ صرف وردی پر سمجھوتہ کرلیا بلکہ سترہویں آئینی ترمیم (جو کہ لیگل فریم ورک آرڈر ہی کا دوسرا نام تھا) کو تسلیم کرکے باقاعدہ آئین کا حصہ بنا دی گئی۔ آج متحدہ مجلس عمل کی حیثیت حکومت کی موید اور معاون نمائشی اپوزیشن سے زیادہ کچھ نہیں۔ جس سے کسی بھی حکومت مخالف تحریک

کی توقع کرنا عبث ہے۔ اگر مولانا نورانی بقید حیات ہوتے تو یہ سوچنا بھی ناممکن تھا کہ حکومت نے اس نوعیت کا کوئی سمجھوتے کرتے۔ اس طرح یہ بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی ہم خیال مگر بااصول اتحادی سیاست کے روحِ رواں تھے۔

ضمیمہ ا

مراد آباد سنی کانفرنس

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کی ابتدا میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو مرتد بنانے اور قتل کرنے کے لیے شدھی کی تحریک کا آغاز کیا اور ہر قسم کے ساز وسامان سے لیس ہو کر اپنی سکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میدانِ عمل میں اتر آئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایسی درسگاہیں اور ٹریننگ سنٹر کھولنے شروع کر دیئے جس میں نوعمر ہندوؤں کو اسلام کے خلاف نفرت کا درس دیا جانے لگا اور فنونِ حرب سے آگاہ کرنے کا بندوبست کیا گیا تا کہ مسلمانوں کا نام ونشان مٹا کر خالص ہندوازم کا معاشرہ تشکیل دیا جاسکے۔

ہندوؤں کے اس ناپاک منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے علماء مشائخ دیوانہ وار میدان میں کودے اور اس خبیث اور شیطانی سکیم کو ملیامیٹ کر دیا۔ حضرت امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری، صدر الافاضل حضرت مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، مبلغ اسلام حضرت شاہ عبدالعلیم میرٹھی، مفتیٔ اعظم ہند شاہ مصطفیٰ رضا خان، تاج العلماء مفتی محمد عمر نعیمی، مولانا نثار احمد کانپوری، مولانا سید غلام قطب الدین برہمچاری، حضرت میر غلام بھیک نیرنگ انبالوی قدس اسراہم اور ان کے متعین نے اس سلسلے میں عدیم النظیر کارنامے سرانجام دیئے۔ ان حضرات نے مختلف طریقوں سے اس فتنہ کو کچلنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ سیّد جماعت علی شاہ کی قائم کردہ انجمن خدام الصوفیاء نے جو تاریخ ساز کردار ادا کیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ انہوں نے اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے طوفانی دورے کیے۔ سینکڑوں مبلغ میدان ارتداد میں بھیجئے۔ کئی مدرسے قائم کیے اور اس سلسلے میں ان کا ہیڈ کوارٹر عرصہ دراز تک آگرہ میں رہا۔

لیکن ہندو اپنی سرشت سے مجبور ہو کر آئے دن نت نئی سکیمیں بناتا رہا تا کہ برصغیر سے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ ان حالات میں حضرت مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی نے یہ نظریہ قائم کیا کہ اگر شدھی تحریک کے فتنہ کی ابتداء ہی میں سرکوبی نہ کی تو چند سال بعد

ہندوؤں کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے برصغیر کے علمائے اہلسنت کی توجہ اس مہیب خطرے کی طرف دلائی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ملک کے تمام علماء و مشائخ کو مراد آباد مدعو کیا۔

سید جماعت علی شاہ کو صدر اور حضرت مولانا محمد نعیم مراد آبادیؒ کو ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا۔

چنانچہ ۱۶ تا ۱۹ مارچ ۱۹۲۵ء میں مراد آباد (بھارت) میں علمائے اہل سنت کی چار روزہ کانفرنس☆ ہوئی جس میں اہل سنت و جماعت کی تنظیم "الجمعیۃ العالیۃ المرکزیۃ" آل انڈیا سنی کانفرنس کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی صدر اور حضرت محدث علی پوری پیر سید جماعت علی شاہؒ۔ اس تنظیم کے حسب ذیل مقاصد تھے:

۱۔ ہندوستان کے سنی مسلمانوں کی کثیر تعداد کے انتشار کو دور کر کے ان کی تنظیم کرنا اور انفرادی طور پر مذہبی کام کرنے والوں میں ایک ربط پیدا کر کے متحدہ قوت بنانا۔

۲۔ ہندوستان کے ہر شہر اور قصبات و دیہات میں اسلامی انجمنیں قائم کرنا اور موجودہ انجمنوں کو جمعیت عالیہ، کے ساتھ مربوط کرنا۔

۳۔ تبلیغی کام کو ایک نظم محکم کے ساتھ، وسیع کرنا اور اس کے لیے مفید ذرائع اختیار کرنا۔

۴۔ تبلیغ کی تعلیم دینے کے لیے خاص مدارس کھولنا۔

۵۔ مذہبی تعلیم عام کر کے مسلمانوں کے ہر طبقے کو مذہب سے باخبر اور شائستہ بنانا۔

(الف) انگریزی خواں طلبہ کے لیے مذہبی تعلیم کا خاص اہتمام اور آسان ذرائع بہم پہنچانا۔

(ب) مزدوروں اور پیشہ وروں کی تعلیم کے لیے مدارس شبینہ جاری کرنا۔

۶۔ مسلمانوں کو تجارت کی طرف مائل کرنا اور ان کی معاشرت میں اصلاح کرنا۔

۷۔ مسلمانوں سے قرض کی عادت چھڑوانا اور ایسی تدابیر اختیار کرنا کہ مسلمان اپنی

☆ یہ کانفرنس ۲۰ شعبان تا ۲۳ شعبان ۱۳۴۳ھ (۱۶ مارچ تا ۱۹ مارچ 1925ء کو جامعہ نعیمیہ کے میدان میں منعقد ہوئی۔ صدر مجلس استقبالیہ مولانا حامد رضا خاں صاحب علیہ الرحمہ تھے جن کی طرف سے خطبۂ صدارت پڑھا گیا۔ "خطبۂ صدارت جمہوریت اسلامیہ، مطبوعہ مراد آباد ۱۹۲۶ء")

ضرورتیں خود پوری کریں اور غیر اقوام کے سامنے قرض کے لیے ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے محفوظ رہیں۔

۸۔ مقروض مسلمانوں کے لئے وہ تدابیر اختیار کرنا کہ وہ ایک محدود مدت میں قرض سے سبکدوش ہو جائیں۔

۹۔ بے کار مسلمانوں کے لیے ذریعہ معاش تجویز کرنا اور انہیں کام پر لگانا۔

آل انڈیا سنی کانفرنس اور تحریکِ پاکستان

آل انڈیا سنی کانفرنس کی تشکیل کے بعد ہندوستان کے طول و عرض میں اس کے اجلاس ہوئے اور بہت سی مفید قرار دادیں پاس کی گئیں۔☆

اسی طرح آل انڈیا سنی کانفرنس کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنایا گیا۔ تاج العلماء مفتی محمد عمر نعیمی کے بقول:

☆ ۱۶ مئی تا ۱۸ مئی ۱۹۲۷ء کو پوکھریرا (ضلع مظفر پور، صوبہ بہار) میں آل انڈیا سنی کانفرنس کا سہ روزہ اجلاس ہوا جس کے مستقل صدر مولانا حامد رضا خاں صاحب علیہ الرحمہ اور صدر جلسہ مولانا سید محمد شاہ محدث کچھوچھوی علیہ الرحمہ اس میں مذہبی، اقتصادی اور سیاسی اہمیت کی بہت سی قرار دیں پاس ہوئیں۔

۱۳/ اگست ۱۹۲۸ء کو آل انڈیا سنی کانفرنس کا اجلاس مراد آباد میں ہوا جس میں جموں و کشمیر میں محدث علی پوری، پیر سید جماعت علی شاہ صاحب کے داخلے پر پابندی۔ گجراتی اخبار ہندو (سورت) کی دریدہ ذہنی اور اس کے جواب میں سلمان ابراہیم مدیر رسالہ آفتاب اسلام (احمد آباد) کی کتاب کے بارے میں قرار دادیں پاس ہوئیں۔

۱۸ ستمبر ۱۹۲۸ء کو مراد آباد ہی میں ایک اور اجلاس ہوا جس میں نہرو کمیٹی کی رپورٹ کے خلاف قرارداد پاس ہوئی اور لازمی تعلیم کے ساتھ جزوی طور پر مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دینے کے حق میں بھی قرارداد پاس ہوئی۔

انجمن اہل سنت و جماعت کی بنیاد قصبہ نبی پور (ضلع بھروچ، گجرات) میں ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ (۱۹۲۸ء) کو زیر صدارت پیرزادہ بڑے صاحب میاں سجادہ نشین علامہ شاہ وجیہ الدین علوی رحمتہ اللہ علیہ قصبہ نبی پور میں رکھی گئی۔

راج کوٹ (کاٹھیاواڑ) میں مولوی ابوالکمال مراد آبادی کی کوشش سے ۱۱ محرم ۱۳۴۹ھ کے اجلاس میں آل انڈیا سنی کانفرنس کی شاخ قائم کرنے کی قرارداد منظور کی گئی۔

''ہندوستان کے لیے مراعات طلب کرنے میں اگر ہندوؤں نے مسلمانوں کی پروا نہیں کی تو مسلمان اپنی آواز خود علیحدہ کیوں نہ اٹھائیں، اپنے لیے ضروری اور مناسب مراعات کیوں نہ طلب کریں، اپنے حقوق کے مطالبہ سے کیوں زبان روکیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب علامہ اقبال اس طرف متوجہ ہوئے اور اپنا مشہور خطبہ الٰہ آباد (۱۹۳۰ء/۱۳۴۹ھ) پیش کیا۔ ۲۰ مئی سے ۲۲ مئی ۱۹۳۰ء کو بہرال (ضلع مالوہ بنگال) میں آل انڈیا سنی کانفرنس کا سہ روزہ اجلاس ہوا۔ ۲۰ مئی کو مولانا مفتی محمد عمر نعیمی اور مولانا محمد نعیم مراد آبادی کے شیخ طریقت حضرت شاہ ابو احمد محمد علی حسین اشرفی جیلانی (سجادہ نشین کچھوچھہ شریف) بحیثیت صدر کانفرنس تشریف لائے...... ۲۱ مئی کو مولانا مراد آبادی تشریف لائے...... روزانہ دو اجلاس ہوتے تھے، صبح سے ۱۱ بجے تک اور پھر عصر سے رات گئے تک (ماسوائے وقفہ نماز)...... آخری اجلاس میں مولانا مراد آبادی نے چار گھنٹے تقریر فرمائی۔ اس کانفرنس میں درج ذیل قرارداد منظور کی گئی:-

۱۔ یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کانگرس کی تحریکات سے علیحدہ رہنا ضروری ہے، مذہب کا یہی حکم ہے اور اقتصادی مصالح کا بھی یہی اقتضاء ہے۔

۲۔ یہ جلسہ جمعیۃ العلماء کی گمراہ کن پالیسی پر اظہارِ نفرت کرتا ہے، جو اس نے ہندوؤں کے اشارے سے مسلمانوں کو کانگرسی تحریکات کی تائید پر ابھارنے میں اختیار کر رکھی ہے، اور ظاہر کر دینا چاہتا ہے کہ جمعیۃ العلماء صرف چند خود غرض شخصیتوں کا نام ہے جو کٹھ پتلی کی طرح بالکل ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں...... یہ جماعت مسلمانوں کی نمائندہ نہیں، نہ مسلمان اس کو اعتماد کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

۳۔ یہ جلسہ فلسطین کانفرنس بمبئی کی منظور شدہ تجاویز کی تائید کرتا ہے۔ (واضح رہے یہ قرارداد ناظم محکمہ تبلیغ آل انڈیا سنی کانفرنس قاضی محمد احسان الحق نعیمی نے پیش کی۔)

بنگال کی اس سہ روزہ کانفرنس کے بعد صدر الافاضل دوسرے مقامات سے ہوتے ہوئے ۳ جون ۱۹۳۰ء کو، بھاگلپور تشریف لائے۔ یہاں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے

کانگریسی تحریکات کے ساتھ اشتراکِ عمل کے مضر پہلوؤں پر روشنی ڈالی: ☆

''جمعیۃ العلماء نے کانگریسی تحریکات کی شرکت منظور کر کے مسلمانوں میں ایک نئے تفرقہ و اختلاف کی بنیاد ڈالی ہے اور اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ مسلمان آپس میں کٹ مریں گے اور ان کی قوتیں باہمی مخالفت پر ضائع ہو جائیں گی۔''

۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء میں مولوی عبدالرشید صاحب نے بنارس آل انڈیا کانفرنس کے اجلاس منعقد کیے اور پاک و ہند کے تمام خانقاہوں اور آستانوں کو اپنے اپنے نمائندے بھیجنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت السواد الاعظم (شعبان معظم ۱۳۴۹ھ میں شائع ہوئی۔ اس پر فاضل مدیر تاج العلماء نے جو دردمندانہ تبصرہ فرمایا ہے وہ قابلِ مطالعہ ہے۔ آپ نے فرمایا:

''آج دنیا کی ہر قوم اپنی ترقی کے لیے دشوار ترین منزلیں حوصلہ مندی کے ساتھ طے کر رہی ہے، مگر ہم ایک جسم مردہ کی طرح بے حس و حرکت پڑے ہیں۔ ہم مٹتے جا رہے ہیں اور ہمیں اپنی حفاظت کا خیال تک بھی نہیں آتا کاش کہ ہم آثار حیات عود کریں، ہماری آنکھ کھلے، ہمارے ہوش درست ہوں۔ ہم میں جذبۂ عمل پیدا ہو وہ اسلاف جن کے ناموں پر فخر کیا کرتے ہیں جن کے کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کر کے اپنے وقار و اقتدار کے سکے جمایا کرتے ہیں، اے کاش ہم ان کی راہ پر دو چار ہی قدم چل سکیں...... مبارک ہے وہ شخص جس کے دل

☆ ۲۰ محرم ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) قصبہ نبی پور (گجرات) کی جامع مسجد میں انجمن اہل سنت و جماعت کا جلسہ ہوا جس کی صدارت قاضی اسماعیل نے کی۔ اس جلسہ میں یہ قرارداد منظور کی گئی:

۱۔ یہ جلسہ گاندھی کی موجودہ تحریک آزادی و سول نافرمانی میں موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ہندوؤں کے ظلم و ستم کا خیال کرتے ہوئے، مسلمانوں کو گاندھی کی آندھی میں شرکت کرنے سے منع کرتا ہے۔

۲۔ یہ جلسہ جمعیۃ العلماء ہند دہلی جو دیوبندیوں، وہابیوں پر مشتمل ہیں اور آج کے کل گاندھی نما شکلوں کے ہاتھ کھلونا بنی ہوئی ہے اور جنہوں نے ہندوؤں کے ساتھ اس موقع پر اتحاد کیا اور وہ کانگرس اور گاندھی کی تحریک آزادی و سول نافرمانی میں جذب ہوگئے اس کو ہم انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

میں درد ملت ہو۔" (تاج العلماء...... مدیر السواد الاعظم)

آل انڈیا سنی کانفرنس☆ کا آغاز ۱۹۲۵ء میں مرادآباد کی سرزمین پر جس سادگی سے ہوا، اس کا انجام ۱۹۴۶ء میں سرزمین بنارس میں نہایت ہی شاندار ہوا۔ اس کانفرنس سے کچھ قبل ۸ ربیع الاوّل ۱۳۶۵ھ کو پھپھوند (ضلع اٹاوہ، بھارت) میں آل انڈیا سنی کانفرنس کا اجلاس ہوا، جس میں مفتی سید مصباح الحسن صاحب سجادہ نشین آستانہ صمدیہ، پھپھوند اور صدر جماعت استقبالیہ سنی کانفرنس کا خطبۂ صدارت پڑھ کر سنایا گیا اس میں مفتی صاحب نے مولانا محمد نعیم مرادآبادی کی خدمات کو سراہتے ہوئے فرمایا:

"مقام مسرت ہے کہ آل انڈیا کانفرنس کے عالی قدر ناظم حضرت صدر الافاضل مولانا حافظ محمد نعیم الدین صاحب مرادآبادی مدظلہ اور کانفرنس کے دوسرے اکابر و کارکنان نے تین سال سے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد سنی کانفرنس کی تشکیل کا مبارک آغاز فرمایا اور آج الحمدللہ اس ادارے کی ہر صوبہ کے اندر شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور سنی کانفرنس کی اہمیت و ضرورت کا احساس طبقۂ اہل سنت میں پیدا ہوتا جا رہا ہے...... عصر حاضر میں مسلمانِ ہند کی سیاست نے ۱۹۴۲ء سے جو نئی کروٹ بدلی ہے اور مسئلہ پاکستان یعنی قیام حکومت اسلامیہ کا جو جذبہ عوام و خواص میں پیدا ہو رہا ہے، اسے ہمارے طبقۂ علمائے اہلسنت نے یہی نہیں کہ دور بیٹھ کر صرف مطالعہ ہی کیا بلکہ ہماری جماعت کے محترم علماء مجاہدانہ حیثیت سے از اوّل تا آخر اس جذبہ کے

☆ جس کسمپرسی کے عالم میں آل انڈیا سنی کانفرنس قائم کی گئی اور اس کے اجلاس بلائے گئے اس کا کچھ اندازہ اس پرسوز اپیل سے ہوتا ہے جو تاج العلماء نے ان الفاظ میں پیش کی تھی: "ظاہر ہے کہ دنیا کا سر و سامان ہمارے پاس نہیں، ہمارا طبقہ کا طبقہ غریب ہے، نادار ہے، بے زر ہے، ہم دوسروں کی طرح کثیر اموال خرچ کرنے کے قابل نہیں، ہم میں وسعت نہیں کہ اپنے اکابر اور حامیانِ ملت کو جمع کرنے کے لیے ان کے مصارف سفر کا تکلف بھی کر سکیں۔ ہم میں طاقت نہیں کہ ہم ان کی شان کے لائق میزبان کی خدمتیں انجام دے سکیں۔ اس لیے ہم دردمندانِ ملت سے التجا کرتے ہیں کہ اگر وہ اس اجتماع کو دین و ملت کے لیے نافع خیال فرمائیں تو زحمت سفر برداشت کریں۔"

محرک و موئید بنے ہوئے ہیں اور کانگرس جیسی ہندو جماعت کے مقابلے پر دس سال کے طویل زمانے سے بے پناہ خدمات انجام دے کر کانگرس کی ہر تحریک کو مردہ کر چکے ہیں۔"

علماء اہلسنت کی مجاہدانہ کارگزاریوں کا نقطۂ عروج بنارس کی آل انڈیا سنی کانفرنس☆ کے وہ چار روزہ اجلاس تھے جو تحریک پاکستان میں نہایت موثر اور انقلاب انگیز ثابت ہوئے۔

ان اجلاس میں پاک و ہند کے تقریباً دو ہزار علماء کرام اور ۶۰ ہزار دوسرے عام حاضرین شریک تھے۔ خطبہ صدارت حضرت مولانا شاہ سید محمد محدث کچھوچھری علیہ الرحمہ (م ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) نے دیا۔ یہ خطبہ تاریخی اور سیاسی حیثیت سے نہایت اہم ہے۔

آل انڈیا سنی کانفرنس میں جو تجاویز منظور ہوئیں ان میں نظریہ پاکستان کی خاص طور پر حمایت کی گئی ہے۔ چنانچہ ۲۹/ اپریل ۱۹۴۶ء کو بوقت ۹ بجے تا ایک بجے دوپہر باغ فاطمہ میں جو اجلاس ہوا اس میں پاکستان کے بارے میں یہ قرارداد منظور کی گئی:

"آل انڈیا سنی کانفرنس کا یہ اجلاس مطالبۂ پاکستان کی پرزور حمایت کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ علماء و مشائخ اہلسنت اسلامی حکومت کی قیامت کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ہر امکانی قربانی کے واسطے تیار ہیں اور یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایک ایسی حکومت قائم کریں جو قرآن حکیم اور حدیث نبویہ کی روشنی میں فقہی اصول کے مطابق ہو۔"

اسلامی حکومت کے مستقل دستور و لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے مندرجہ ذیل علماء کی ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جس کا اس قرارداد میں ذکر موجود ہے۔

مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی، صدرالافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی، مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی، مولانا امجد علی اعظمی، مولانا عبدالعلیم میرٹھی صدیقی، مولانا عبدالحامد بدایونی، دیوان سید آل رسول سجادہ نشین درگاہ اجمیر شریف، ابوالبرکات مولانا سید احمد

☆ ۲۴ جمادی الاوّل تا ۲۷ جمادی الاوّل ۱۳۶۵ھ (۲۷ اپریل تا ۳۰ اپریل ۱۹۴۶ء) بنارس میں آل انڈیا سنی کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے۔ چاروں دن اجلاس کی صدارت محدث علی پوری حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب (م ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء نے فرمائی)

الوری، مولانا خواجہ قمر الدین سیالوی، مولانا شاہ عبدالرحمٰن بھرچونڈی شریف، زین الحسنات پیر مانکی شریف، ابوالحسنات مولانا محمد احمد الوری۔

ماخذ:

(۱) احمد، محمد مسعود، پروفیسر، "تحریکِ آزادی ہند اور سواد الاعظم"، لاہور، ۱۹۷۹ء ص ص ۲۴۵، ۲۵۸

(۲) قصوری، محمد صادق، "اکابرین تحریک پاکستان" لاہور۔

(۳) قصوری، محمد صادق، "مراد آبادی سنی کانفرنس کی داستان"، مشمولہ ماہنامہ ترجمان اہلسنّت کراچی، سنی کانفرنس ملتان نمبر، اکتوبر نومبر ۱۹۷۸ء۔

ضمیمہ ۲

علماء کے ۲۲ نکات

اسلامی آئین سازی کے سلسلہ میں پہلا قدم

آئین سازی کے ضمن میں علماء نے ملک میں نفاذِ اسلام کے لیے ۲۱ جنوری سے ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء تک کراچی میں ایک اجلاس منعقد کیا اور جن ۲۲ نکات پر اتفاق رائے کیا ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) خدا کی حاکمیت اعلیٰ۔

(۲) ملک کے تمام قوانین قرآن وسنت کی بنیاد پر بنائے جائیں اور کوئی قانون قرآن و سنت کے طے شدہ اصولوں سے متصادم نہ ہو۔

(۳) ریاست کی بنیاد جغرافیائی، لسانی یا نسلی تعصبات پر رکھنے کی بجائے اسلامی نصب العین کی بنا پر اتحاد ملت پر رکھی جائے۔

(۴) ریاست 'معروف' کو قائم کرے گی 'منکر' کو ختم کرے گی اور تعلیم کو اسلامی مکاتیب فکر کے طے شدہ اصولوں پر ڈھالے گی۔

(۵) ریاست کی خارجہ پالیسی ملت اسلامی کے اتحاد کی بنا پر تشکیل دی جائے گی۔

(۶) اسلامی ریاست عوام کی بنیادی ضروریات بشمول، روٹی، کپڑا، مکان، طبی امداد اور تعلیم کی ذمہ داری ہوگی اور معذوروں اور بے روزگاروں کی کفالت ریاست کی ذمہ داری ہوگی۔

(۷) ریاست اسلامی قانون کے تحت عوام کے حقوق ادا کرے گی ان میں جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ، عبادت، نقل وحمل، پیشہ اظہار رائے اور جماعت سازی کی آزادی اور سرکاری ملازمت کے حصول کے مساوی مواقع مہیا کرنا شامل ہوں گے۔

(۸) قانون کے تحت دفاع کا موقع دیئے بغیر اور کسی عدالت کے فیصلے کے بعد مندرجہ بالا حقوق سے کسی کو محروم نہیں کیا جائے گا۔

(۹) اسلام کے تسلیم شدہ فرقوں کو حق ہوگا کہ قانون کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے مذہب کا پرچار کریں۔ اپنے متعلقین کو اپنے عقائد کی تعلیم دیں "شخصی قانون" کے تحت آنے والے امور میں ہر فرقہ پر اس کی اپنی فقہ کے ضابطے نافذ ہوں گے۔

(۱۰) ملک کے غیر مسلم باشندوں کو قانون کی حدود کے اندر مذہب، عبادت کی مکمل آزادی ہوگی۔ ان کی تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کو تحفظ حاصل ہوگا، شخصی قانون، میں ان پر ان کے مذہب اور رواج کا اطلاق کیا جائے گا۔

(۱۱) ریاست غیر مسلموں کے بارے میں شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے جو ذمہ داریاں قبول کرے گی ان کا پورا احترام کیا جائے گا۔

(۱۲) ریاست کا سربراہ ہمیشہ ایک ایسا مسلمان مرد ہوگا جس کے تقویٰ، فہم اور علم پر عوام یا ان کے نمائندوں کو اعتماد ہو۔

(۱۳) ملک کے انتظام کی ذمہ داری سربراہ مملکت پر ہوگی۔ اگرچہ وہ اپنی ذمہ داری کسی اور فرد یا ادارے کو تفویض کر سکے گا۔

(۱۴) سربراہ مملکت آمرانہ طریقے سے نہیں بلکہ 'شورائی طریقہ' سے اپنے فرائض پورے کرے گا یعنی وہ امور حکومت کو سرانجام دینے میں ذمہ دار ارکان حکومت اور عوام منتخب نمائندوں سے مشورہ کرے گا۔

(۱۵) سربراہ مملکت کو دستور کو جزوی یا کلی طور پر معطل کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ شوریٰ کے بغیر حکومت چلانے کا مجاز ہوگا۔

(۱۶) جو ادارہ سربراہ مملکت کو منتخب کرنے کا مجاز ہوگا وہ کثرت رائے سے اسے معزول کرنے کا بھی حق رکھے گا۔

(۱۷) سربراہ مملکت شہری حقوق کے بارے میں دوسرے شہریوں کے برابر ہوگا اور وہ قانون سے بالاتر نہیں ہوگا۔

(۱۸) تمام شہری خواہ ارکان حکومت ہوں، سرکاری افسران ہوں یا عوام ایک ہی قانون کے تابع ہوں گے اور ان کو ایک ہی طرح کی عدالتوں میں پیش ہونا ہوگا (یعنی کسی

کے ساتھ خصوصی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔)

(۱۹) عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ رکھا جائے گا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں انتظامیہ سے متاثر نہ ہو۔

(۲۰) ایسے نظریات کی اشاعت ممنوع ہوگی جو اسلامی ریاست کے اسی نظریات سے متصادم ہوں۔

(۲۱) ملک کے مختلف حصے محض انتظامی یونٹ ہوں گے۔ لسانی، قبائلی یا نسلی بنیادوں پر یونٹ نہیں بنائے جائیں گے ان یونٹوں کو مرکز کی بالاتری میں ایسے فرائض سونپے جاسکتے ہیں جو انتظامات کے لیے ضروری ہوں انہیں مرکز سے کٹنے کا حق نہیں ہوگا۔

(۲۲) دستور کی کوئی ایسی تعبیر جو قرآن وسنت سے متصادم ہو، قابل قبول نہیں ہوگی۔

ماخذ: نوائے وقت کراچی، ۲۵ جنوری ۱۹۵۱ء

ضمیمہ ۳

قومی اسمبلی میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے بارے میں پیش کردہ قرارداد

۳۰ جون ۱۹۷۴ء کو قومی اسمبلی میں اپوزیشن نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے لیے جو قرارداد پیش کی تھی، اس کا متن درج ذیل ہے:

جناب سپیکر قومی اسمبلی پاکستان

محترمی!

ہم حسب ذیل تحریک پیش کرنا چاہتے ہیں:

ہرگاہ کہ یہ ایک مکمل مسلمہ حقیقت ہے کہ قادیان کے مرزا غلام احمد نے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔

نیز ہرگاہ کہ نبی ہونے کا اس کا جھوٹا اعلان، بہت سی قرآنی آیات کو جھٹلانے اور جہاد کو ختم کرنے کی اس کی کوششیں، اسلام کے بڑے بڑے احکام کے خلاف غداری تھی۔

نیز ہرگاہ کہ وہ سامراج کی پیداوار تھا اور اس کا واحد مقصد مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کرنا اور اسلام کو جھٹلانا تھا۔

نیز ہرگاہ کہ پوری امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار چاہے وہ مرزا غلام مذکور کی نبوت کا یقین رکھتے ہوں یا اسے اپنے مصلح مذہبی رہنما کسی بھی صورت گردانتے ہوں، دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

نیز ہرگاہ کہ ان کے پیروکار، چاہے انہیں کوئی بھی نام دیا جائے، مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر اور اسلام کا ایک فرقہ ہونے کا بہانہ کر کے اندرونی اور بیرونی طور پر تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

نیز ہرگاہ کہ عالمی مسلم تنظیموں کی ایک کانفرنس میں، جو مکہ المکرمہ کے مقدس شہر میں

رابطہ العالم الاسلامی کے زیر انتظام ۶ اور ۱۰/۱۱ اپریل ۱۹۷۴ء کے درمیان منعقد ہوئی اور جس میں دنیا بھر کے تمام حصوں سے ۱۴۰ مسلمان تنظیموں اور اداروں کے وفود نے شرکت کی، متفقہ طور پر یہ رائے ظاہر کی گئی کہ قادیانیت، اسلام اور عالم اسلام کے خلاف ایک تخریبی تحریک ہے، جو ایک اسلامی فرقہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔

اب اس اسمبلی کو یہ اعلان کرنے کی کارروائی کرنی چاہیے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار، انہیں چاہے کوئی بھی نام دیا جائے، مسلمان نہیں اور یہ کہ قومی اسمبلی میں ایک سرکاری بل پیش کیا جائے تا کہ اس اعلان کو موثر بنانے کے لیے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر ان کے جائز حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے احکام وضع کرنے کی خاطر آئین میں مناسب اور ضروری ترامیم کی جائیں۔

محرکین قرارداد

۱۔ مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی
۲۔ مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری
۳۔ مولانا مفتی محمود
۴۔ پروفیسر غفور احمد
۵۔ مولانا سیّد محمد علی رضوی
۶۔ مولانا عبدالحق (اکوڑہ خٹک)
۷۔ چوہدری ظہور الٰہی
۸۔ سردار شیر باز خان مزاری
۹۔ مولانا محمد ظفر احمد انصاری
۱۰۔ جناب عبدالحمید جتوئی
۱۱۔ صاحبزادہ احمد رضا قصوری
۱۲۔ محمود احمد اعظم فاروقی
۱۳۔ مولانا صدر الشہید
۱۴۔ مولانا نعمت اللہ

۱۵۔ جناب عمران خان

۱۶۔ مخدوم نور محمد

۱۷۔ جناب غلام فاروق

۱۸۔ سردار مولا بخش سومرو

۱۹۔ سردار شوکت حیات خان

۲۰۔ حاجی علی احمد تالپور

۲۱۔ جناب راؤ خورشید علی خان

۲۲۔ جناب رئیس عطا محمد خان مری

بعد میں حسب ذیل ارکان نے بھی قرارداد پر دستخط کیے:

۲۳۔ نوابزادہ میاں محمد ذاکر قریشی

۲۴۔ جناب غلام حسن خان دھاندلا

۲۵۔ جناب کرم بخش اعوان

۲۶۔ صاحبزادہ محمد نذیر سلطان

۲۷۔ مہر غلام حیدر بھروانہ

۲۸۔ میاں محمد ابراہیم برق

۲۹۔ صاحبزادہ صفی اللہ

۳۰۔ صاحبزادہ نعمت اللہ خان شنواری

۳۱۔ ملک جہانگیر خان

۳۲۔ جناب عبدالسبحان خان

۳۳۔ جناب اکبر خان مہمند

۳۴۔ میجرل جنرل جمالدار

۳۵۔ حاجی صالح محمد

۳۶۔ جناب عبدالمالک خان

۳۷۔ خواجہ جمال محمد کوریجہ

ماخذ: افکارِ نورانی، مرتبہ صاحبزادہ فیض الرسول نورانی ص ۴۴، ۴۵

ضمیمہ ۴

منشور پاکستان قومی اتحاد ۱۹۷۷ء

☆ ہم ایمان رکھتے ہیں کہ
اللہ تعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلاشرکت غیر حاکم مطلق ہے۔
حضرت محمدؐ اللہ کے آخری نبی ہیں جن کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا۔
قرآن پاک اللہ کی آخری کتاب ہے اور یہ کہ
نظریۂ پاکستان کی بنیاد قرآن وسنت ہیں۔

☆ ہمارا یقین ہے کہ
پاکستان کے تمام شہریوں کو بلاتفریق مذہب اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ آزادی کی نعمتوں سے مالا مال ہوں۔

☆ ہمیں احساس ہے کہ
موجودہ حکمران ان وعدوں کو پورا کرنے میں بُری طرح ناکام ثابت ہو چکے ہیں جو انہوں نے عوام سے کیے تھے۔ جس کے نتیجہ میں آج باشندگانِ ملک شدید ترین پریشانیوں اور ناقابل برداشت مصائب میں گھرے ہوئے ہیں۔
ہم پاکستان کے روشن مستقبل پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ پاکستان اللہ کے کرم سے قدرتی خزانوں سے مالا مال ہے۔ ہمارے عوام بے مثال صلاحیتوں کے مالک ہیں لیکن بدقسمتی سے ان صلاحیتوں کو ایک طویل عرصہ سے کچلا اور پامال کیا جارہا ہے۔ وطن عزیز جسے پوری دنیا کے لیے مشعل ہدایت بننا تھا آج دانستہ طور پر ایک منظم سازش کے تحت خود برائیوں میں ملوث کیا جارہا ہے۔ عوام کو جو ملک کی اصل قوت اور طاقت ہیں خود انہی کو سیاسی، معاشی اور معاشرتی استحصال کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔
ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم انشاء اللہ تعالیٰ عوام کو تمام ناروا پابندیوں، خوف و ہراس،

معاشی بدحالی اور معاشرتی پستی سے نجات دلا کر انہیں ان کا جائز مقام دلائیں گے تاکہ ہر شہری عزت اور وقار کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اتحاد اور اتفاق ملک کی بہت بڑی ضروری ہے۔ لہٰذا آل جموں و کشمیر کانفرنس، پاکستان جمہوری پارٹی، پاکستان مسلم لیگ، تحریک استقلال، جماعت اسلامی، جمعیۃ علمائے اسلام، پاکستان خاکسار تحریک، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی نے متحد اور مجتمع ہو کر پاکستان قومی اتحاد کو تشکیل دیا ہے۔

مقاصد

پاکستان قومی اتحاد اپنے ملک کے عوام سے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرنے کا عہد کرتا ہے کہ :-

۱۔ قرآن و سنت کی مکمل پابندی کی جائے اور ہر مسلمان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی زندگی اسلامی تقاضوں کے مطابق بسر کر سکے۔

۲۔ ملک کے تمام باشندوں کو یکساں حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔

۳۔ ملک کے مختلف حصوں میں بسنے والے لوگوں کے مابین محبت، اخوت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کیے جائیں تاکہ نسلی، لسانی، علاقائی اور طبقاتی تعصبات کا خاتمہ ہو اور ایک مثالی اسلامی برادری کا نمونہ بنیں۔

۴۔ ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کیا جائے جس میں سب کے ساتھ انصاف ہو تاکہ ملک کے مختلف حصوں اور افراد کے مابین پایا جانے والا موجودہ فرق کم سے کم مدت میں دُور ہو جائے۔

۵۔ ظلم، استحصال اور ناانصافی کی ہر شکل کو مٹایا جائے۔

۶۔ زمین، محنت، سرمایہ اور دوسرے ذرائع پیداوار کو زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ بہتری کے لیے استعمال کیا جائے۔

۷۔ روزمرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتوں کو عام آدمی کی قوتِ خرید کے اندر لایا جائے۔

۸۔ ہر شہری کو غذا، لباس، مکان، تعلیم اور علاج کی فراہمی کی ضمانت دی جائے۔

۹۔ ہر شہری بلا امتیاز عہدہ و مرتبہ قانون کی نظر میں یکساں ہو اور ایک ایسی آزاد عدلیہ

موجود ہو جو بلا روک ٹوک انصاف کے تقاضے پورے کر سکے۔

۱۰۔ عورتوں کو ان کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی حقوق کی ضمانت دی جائے تاکہ وہ معاشرے میں مفید اور تعمیری کردار انجام دے سکیں۔

۱۱۔ جو افراد کسی بھی منصب پر فائز ہوں وہ بددیانتی سے پاک ہوں اور خود اپنی عملی زندگی سے ایمانداری، کفایت شعاری اور سادہ بود و باش کا قابلِ تقلید نمونہ پیش کریں۔

۱۲۔ ایک ایسی آزاد خارجہ پالیسی پر عمل کیا جائے جو قومی امنگوں کے مطابق ملکی مفاد اور عالمی امن کی ضامن ہو۔

۱۳۔ مسلم ممالک کے ساتھ نہایت قریبی و دوستانہ اور برادرانہ تعلقات کو فروغ دینے اور مسلم دنیا کے مابین اتحاد کو مضبوط تر بنانے کے لیے کوششیں تیز کی جائیں۔

۱۴۔ الف۔ ریاست جموں و کشمیر کے عوام کے بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حق خود ارادیت کے حصولوں کے لیے پاکستان ریاست جموں و کشمیر اور عالمی سطح پر جدوجہد کو موثر طور پر منظم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں تمام ممکن ذرائع استعمال کیے جائیں۔

ب۔ جنگ بندی لائن کے اس طرف کشمیری عوام کو تحریکِ آزادی کے مقاصد کے لیے متحد اور منظور کرنے کے لیے آزاد کشمیری کا موجودہ انتظامی ڈھانچہ کالعدم قرار دے کر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر فوری طور پر ازسرنو آزادانہ انتخابات کرائے جائیں۔ گلگت، بلتستان میں بھی عوام کی آزادانہ رائے سے نیا انتظامی ڈھانچہ منظم کیا جائے۔

ج۔ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں تعمیر و ترقی کے لیے موثر طور پر امداد دی جائے اور ریاست جموں و کشمیر کے آزاد علاقوں کو مثالی حیثیت دی جائے۔

د۔ پاکستان میں مقیم ریاست جموں و کشمیر کے مہاجرین اور دوسرے باشندوں کے مسائل کی طرف فوری اور موثر توجہ دی جائے۔

۱۵۔ قبائلی علاقہ جات کے باشندوں کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق دیا جائے اور آزاد قبائل کی ترقی اور ان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے۔

۱۶۔ پاکستان میں ایک ایسی حقیقی جمہوری حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے جس میں ملک کے باشندے کاروبارِ حکومت میں شریک ہوسکیں اور اپنی آزادانہ مرضی سے حکومت منتخب بھی کرسکیں اور ہٹا بھی سکیں تاکہ آمریت کی ہر شکل کا مکمل طور پر خاتمہ ہوجائے۔

دستور

۱۔ موجودہ دستور میں کی جانے والی ہر اس ترمیم کو منسوخ کیا جائے گا جس سے باشندگانِ ملک کے بنیادی حقوق متاثر ہوئے ہیں۔

۲۔ دستور کی ایسی غیر جمہوری دفعات منسوخ کی جائیں گی جن میں وزیراعظم اور وزرائے اعلیٰ کو غیر معمولی تحفظ اور اختیارات دیئے گئے ہیں۔

۳۔ صوبائی حکومتوں کو دستور کے مطابق پوری آزادی سے کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

۴۔ عوام کو بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جائے گی جن کے اصول کے لیے انہیں عدالتوں سے رجوع کرنے کا ناقابل تنسیخ حق حاصل ہوگا۔

۵۔ دستور میں اس بات کی ضمانت دی جائے گی کہ کسی شہری کی آزادی، عدالتی فیصلے اور اس کو صفائی کا موقع دیئے بغیر سلب نہیں کی جاسکے گی۔

۶۔ الیکشن کمیشن کو ایسے دستوری اختیارات دیئے جائیں گے جن سے وہ ایک بااختیار اور موثر ادارہ بن سکے جو آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کراسکے اور انتخابی بدعنوانیوں کے خلاف موثر قدم اٹھاسکے۔

۷۔ سرکاری ملازمین کی ملازمتوں کو ختم کرنے کے موجودہ آمرانہ قوانین منسوخ کرکے ان کے لیے دستوری تحفظ بحال کیا جائے گا۔

۹۔ بلدیاتی اداروں میں نمائندگی کے لیے براہِ راست انتخاب لازمی قرار دیا جائے گا اور بلدیاتی انتخابات بلاتاخیر کرائے جائیں گے۔

۱۰۔ قانون سازی کی بنیاد قرآن وسنت پر ہوگی۔ تمام ایسے قوانین کو جو قرآن وسنت کے خلاف ایک سال کے اندر تبدیل کرکے قرآن وسنت کے مطابق بنایا جائے گا

اور اسلامی شریعت نافذ کی جائے گی۔

۱۱۔ اُردو کو ایک سال کے اندر اندر دفتری زبان کے طور پر رائج کردیا جائے گا۔

ملکی قوانین

۱۔ ہنگامی حالات کے اعلان کو ختم کیا جائے گا تاکہ شہریوں کو ان کے حقوق واپس مل سکیں اور آئندہ ہنگامی حالات کے اعلان کا اختیار صرف دشمن سے جنگ کی مدت تک کے لیے ہوگا۔

۲۔ ڈی۔ پی۔ آر اور اس جیسے دوسرے کالے قوانین کو منسوخ کیا جائے گا اور ان کے تحت دی گئی سزاؤں کو کالعدم قرار دے دیا جائے گا۔

۳۔ ضابطۂ دیوانی اور فوجداری میں اس طرح اصلاح کی جائے گی کہ عدالتیں مقدمات کے فیصلے چھ ماہ کے اندر اندر کردیں۔

۴۔ کورٹ فیس ختم کرکے ہر شہری کو مفت انصاف مہیا کیا جائے گا۔

۵۔ تمام ایسے قوانین اور ضابطوں کو منسوخ کردیا جائے گا جن سے پریس یا عوام کی آزادی مجروح ہوتی ہو۔

۶۔ شراب کا استعمال ایک ماہ کے اندر قطعی طور پر بند کردیا جائے گا اور بقیہ اسلامی حدود اور تعزیرات کا نفاذ بھی اسی عرصہ میں کردیا جائے گا۔

۷۔ بدکاری، ریس، جواء، سٹہ، فحاشی، عریانی، بردہ فروشی اور مخرب اخلاق محکموں، کتابوں اور اشتہارات کو قوانین کے ذریعے روک دیا جائے گا۔

۸۔ سود کو ختم کیا جائے گا۔

۹۔ شرعی اوامر ونواہی کو قانونی شکل دے کر عملاً نافذ کیا جائے گا۔

۱۰۔ ایک اعلیٰ اختیارات کا حامل کمیشن قائم کیا جائے گا جو مشرقی پاکستان کے سانحہ کی ذمہ داری کا تعین کرے گا اور ذمہ دار حضرات پر مقدمات چلائے جائیں گے۔

پریس، ریڈیو اور ٹی وی

شہری آزادیوں کے تحفظ، معاشرے سے برائیوں کو دور کرنے، عوامی بیداری اور شعور نے سرکاری پالیسیوں کی تشکیل میں حکومت کی صحیح رہنمائی کرنے کے لیے ہم پریس کی

آزادی کی ضمانت دیں گے۔ اس مقصد کے لیے ہم یہ اقدامات کریں گے:

۱۔ نیشنل پریس ٹرسٹ توڑ دیا جائے گا۔

۲۔ پریس اور پبلیکیشن سے متعلق کالے قوانین ختم کردیئے جائیں گے۔ اخبارات اور رسائل کے منسوخ شدہ ڈیکلریشن بحال کیے جائیں گے۔

۳۔ صحافیوں کے لیے شرائط ملازمت کو بہتر بنایا جائے گا۔

۴۔ اخبارات کو ان کی اشاعت کی مناسبت سے سرکاری اشتہارات دیئے جائیں گے۔

۵۔ اخباری کاغذ ضرورت کے مطابق فراہم کیا جائے گا اور اس کی تقسیم پر سے سرکاری کنٹرول ہٹالیا جائے گا۔

۶۔ ریڈیو اور ٹی وی کارپوریشن کو آزادی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے کا موقع دیا جائے گا اور ان کا غلط سرکاری استعمال ختم کردیا جائے گا تاکہ نشر واشاعت کے یہ موثر ذرائع ملک وقوم کی تعمیر اور ترقی کے لیے کام کرسکیں۔

۷۔ ریڈیو اور ٹی وی کارپوریشن کو قومی اسمبلی کی ایک ایسی کمیٹی کے سامنے جوابدہ ٹھہرایا جائے گا جس میں حکمران پارٹی اور حزبِ اختلاف کی مساوی نمائندگی ہوگی۔

تعلیم

ملک کی معاشی اور اخلاقی اور ذہنی ترقی کا دار و مدار تعلیم پر ہے۔ ہم اس شعبہ کو موجودہ انتشار سے نکالنے کے لیے حسبِ ذیل اقدامات عمل میں لائیں گے:-

۱۔ تعلیم کو اسلام کے تقاضوں کے مطابق جدید ترین خطوط پر استوار کیا جائے گا اور کئی متعدد تعلیمی نظاموں کو بتدریج ختم کرکے ایک ہی تعلیمی نظام رائج کیا جائے گا۔

۲۔ ہم آج کے طالب علموں کو اس طرح صحت مند بنیادوں پر تعلیم دیں گے کہ وہ کل کی ذمہ داریاں بطریق احسن نبھاسکیں۔

۳۔ ہم تعلیم کو بامقصد بنائیں گے۔ فنی تعلیم کے فروغ، طلبہ کو ان کے رجحان کے مطابق تعلیم دینے ان کو مناسب ماہرانہ مشورہ کی فراہمی اور قابل عمل تعلیمی منصوبوں کے ذریعے تعلیم یافتہ افراد کو روزگار کی ضمانت دی جائے گی۔

۴۔ ہم اساتذہ کو ان کا جائز مقام دلائیں گے انہیں ملازمتوں کا تحفظ دیا جائے گا۔

اپنے دائرہ کار میں وہ ہر قسم کی ناجائز مداخلت سے آزاد ہوں گے اور ان کے ایسے مشاہرے مقرر کیے جائیں گے کہ وہ سوسائٹی میں باعزت اور خوشحال زندگی بسر کرسکیں۔

۵۔ یونیورسٹیوں کو قومی تعلیمی پالیسی کی حدود کے اندر پوری پوری خودمختارانہ حیثیت دی جائے گی۔

۶۔ تعلیمی اداروں میں فوجی تربیت کا انتظام کیا جائے گا تاکہ ملک کے نوجوان دفاع کے لئے تیار ہوسکیں۔

۷۔ ہائی اسکول تک تعلیم کو مفت کیا جائے گا اور طلبہ کو دیئے جانے والے سرکاری وظائف میں معقول اضافہ کیا جائے گا۔

۸۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے قیام کی اجازت دی جائے گی۔ جو حکومت کی نگرانی میں سرکاری ضابطوں کے مطابق چلائے جائیں گے۔

۹۔ دینی مدارس کو قومی تحویل میں نہ لینے کی ضمانت دی جائے گی۔

۱۰۔ بے وسیلہ بچوں کو قابلیت اور موزونیت کی بنیاد پر ہر قسم کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع اور وسائل فراہم کیے جائیں گے۔ فارغ التحصیل طلبہ کو روزگار کی ضمانت دی جائے گی۔

۱۱۔ صنعتی اور زرعی مزدوروں کو اپنی پیشہ ورانہ مہارت کو مزید بہتر بنانے کے لئے سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

۱۲۔ تعلیم بالغاں کے لئے ایک ایسا منصوبہ بروئے کار لایا جائے گا جس سے ہر بالغ شہری لکھنا پڑھنا سیکھ سکے۔

۱۳۔ لڑکیوں کے لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کی سطح تک علیحدہ تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں گے۔

۱۴۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلے اہلیت کی بنا پر دیئے جائیں گے۔

پبلک انتظامیہ

ہمارے نزدیک ملک کی اصلاح کے لیے کوئی اچھے سے اچھا پروگرام عملاً اس وقت

تک مفید ثابت نہیں ہوسکتا جب تک اسے عمل میں لانے کے لیے ایک دیانت دار قابل اعتماد اہل اور فرض شناس انتظامیہ موجود نہ ہو۔ اس غرض کے لیے ہم یہ تدابیر اختیار کریں گے:۔

۱۔ سرکاری ملازمین کو ملازمت کا دستوری تحفظ دیا جائے گا اور کسی ملازم کو صفائی کا موقع دیئے بغیر ملازمت سے علیحدہ نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ سرکاری محکموں سے رشوت، خیانت، عدم کارکردگی اور دوسری بدعنوانیوں کو دور کرنے کے لئے موثر تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ تنخواہوں کا تناسب ایک اور پانچ مقرر کیا جائے گا اور ماہرین اقتصادیات کا ایک مستقل کمیشن قائم کیا جائے گا جو وقتاً فوقتاً تنخواہوں کی شرح مقرر کرے گا۔

۳۔ ملازمین اور بالخصوص کم تنخواہ پانے والے ملازمین کی تنخواہوں، دیگر مراعات بالخصوص رہائش کے انتظام اور پنشن کی رقوم کا تعین اس طرح کیا جائے گا کہ ان میں رشوت کا مرض نہ پھیل سکے۔

۴۔ سرکاری ملازمین کی مالی حیثیت کا مسلسل جائزہ لینے کا انتظام کیا جائے گا اور ایسے افراد کا بلا تاخیر محاسبہ کیا جائے گا جو اپنی حیثیت سے زیادہ معیارِ زندگی اختیار کریں۔

۵۔ سرکاری افسران کی زیادتی اور اختیارات کے بے محابا استعمال کی شکایات سننے اور ان کے تدارک کا فوری اہتمام کرنے کے لیے ایک اعلیٰ اختیارات رکھنے والا محکمہ احتساب قائم کیا جائے گا۔

۶۔ سرکاری دفاتر سے سرخ فیتے کی لعنت کو ختم کیا جائے گا اور ہر انتظامی یونٹ کو اپنے معاملات کا فوری اہتمام کرنے کے اختیارات تفویض کیے جائیں گے۔

۷۔ ایک عدالتی کمیشن مقرر کیا جائے گا اور سادہ رہائش کا عملی نمونہ پیش کرنے کے لیے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ رکھنے والے گورنمنٹ ہاؤس، درسگاہوں، لائبریریوں اور پارکوں میں تبدیل کرکے عوامی استعمال کے لیے کھول دیئے جائیں گے۔

۸۔ ایک عدالتی کمیشن مقرر کیا جائے گا تا کہ وہ سربراہان حکومت، وزیراعظم، وزراء اعلیٰ وزراء، نائب وزرا اور دیگر عوامی نمائندوں وغیرہ کے ایسے معاملات کی تحقیقات کرے جن میں انہوں نے اپنے عہدہ کا ناجائز استعمال کرکے یا اپنے خاندان کے لیے ذاتی فائدے اٹھائے ہوں یا کسی کو جبر وتشدد کا نشانہ بنایا ہو اور اس کے لیے

انصاف کا حصول ناممکن بنا دیا ہو۔

۹۔ جن افراد نے بنیادی حقوق کی بحالی، شہری آزادیوں کے حصول، قانون کی بالادستی اور پاکستان کی سالمیت، بقا اور استحکام کی جدوجہد میں مصائب جھیلے ہیں اور مالی نقصانات برداشت کیے ہیں ان کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کی تلافی کی جائے گی اور ان کی خدمات کا مناسب صلہ دیا جائے گا۔

۱۰۔ جیل کے قواعد کو ازسرنو مرتب کیا جائے گا تا کہ جیل خانے، عذاب گھر اور جرائم کی تربیت گاہیں بننے کی بجائے قیدیوں کی اخلاقی اور ذہنی اصلاح کا ذریعہ بن سکیں۔ ایسے طریقے رائج کیے جائیں گے جن سے قیدی جیل سے رہا ہو کر شریفانہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔

۱۱۔ بیرونی ممالک میں پاکستان کے سفارت خانوں کی اصلاح کے لیے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں گی انہیں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ ملک سے باہر مقیم یا آنے جانے والے پاکستانیوں کو ہر ضروری تعاون اور مدد فراہم کرسکیں۔

معاشی نظام

موجودہ حکومت نے جو نام نہاد اصلاحات نافذ کی ہیں۔ انہوں نے ملک کی معاشی زندگی کو شدید بحران میں مبتلا کردیا ہے۔ مبہم غیر واضح اور مستقل سرکاری معاشی پالیسی نے زرعی، صنعتی اور تجارتی ترقی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ قومیائی ہوئی صنعتوں کو خود حکومت کے لیے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ قومی وسائل کو بے دریغ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے صرف کیا جارہا ہے۔ غیر پیداواری اخراجات میں بے پناہ اضافہ، کرنسی کے مسلسل پھیلاؤ، اندھادھند لے جانے والے اندرونی اور بیرونی قرضے اور ان کا غیر دانشمندانہ استعمال۔ غیر ضروری اشیاء کی درآمد میں اضافہ اور برآمدات میں کمی اور ایسے ہی دیگر اسباب معاشی دشواریوں کو جنم دے رہے ہیں۔

اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے ہماری معاشی پالیسی کے بنیادی اقدامات یہ ہوں گے:۔

☆ ایسی واضح صنعتی پالیسی جس سے محنت اور سرمایہ کاری کو تحفظ اور باہم منصفانہ تعاون

حاصل ہوتا کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جائے۔

☆ ایک ایسی زرعی پالیسی جس سے ملک غذا کے معاملے میں جلد از جلد خود کفیل ہوسکے۔
☆ مزدوروں کو منافع اور انتظامیہ میں موثر شرکت۔
☆ نجی سرمایہ کاری کے لیے سازگار فضا کا قیام اور اس کا تحفظ۔
☆ دولت کی معاشرے میں منصفانہ تقسیم۔
☆ سماجی انصاف کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانا اور استحصال کی تمام صورتوں کا خاتمہ۔
☆ ہر شہری کے لیے بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی۔
☆ تمام شہریوں کے لیے ترقی کے مساوی مواقع کی فراہمی اور
☆ معاشی ترقی کے فوائد کو ملک کے عام افراد تک پہنچانا۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمارا پروگرام درج ذیل اجزاء پر مشتمل ہوگا:-

(۱) صنعت وتجارت، (۲) زراعت، (۳) مزدوروں اور کم تنخواہ پانے والے ملازموں کے حقوق، (۴) عام معاشی اصلاحات۔

صنعت وتجارت

۱۔ سرکاری تحویل میں چلے جانے والے صنعتی اور تجارتی اداروں کو نفع اندوزی کی بجائے عوام کی بہتری کے لیے استعمال کیا جائے گا اور انہیں عوامی نمائندوں کے سامنے جواب دہ ٹھہرایا جائے گا۔

۲۔ جن دوسروں کو سرکاری تحویل میں لیا جاچکا ہے۔ ان کا معاوضہ مقرر کرنے اور اس کی ادائیگی کے طریقے پر نظرِثانی کی جائے گی تاکہ ان کے سابقہ مالکان کو مناسب معاوضہ بلا تاخیر مل سکے اور ان کے ساتھ کی گئی ناانصافی کی تلافی ہوسکے۔

۳۔ کلیدی اور دفاعی صنعتیں پبلک سیکٹر میں بنیں گی۔

۴۔ کلیدی بنیادی اور دفاعی صنعتوں میں عوامی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جائے گی لیکن اجارہ داری قائم نہیں ہونے دی جائے گی۔

۵۔ نجی شعبہ کو معقول تحفظ دیا جائے گا۔

۶۔ سرکاری اور نجی کارخانوں میں ناروا منافع خوری کا موثر سدباب کیا جائے گا۔ قومی سرمایہ سے چلنے والی صنعتوں کو نفع اندوزی کی بنیاد پر نہیں چلایا جائے گا۔

۷۔ کسب مال کے تمام غیر شرعی طریقوں، جیسے سٹہ، جوا، ذخیرہ اندوزی، گراں فروشی، اسمگلنگ اور کرپشن وغیرہ کو سختی کے ساتھ ختم کیا جائے گا۔

۸۔ موجودہ انکم ٹیکس ایکٹ منسوخ کر کے ٹیکس کا ایک ایسا نظام رائج کیا جائے گا۔ جو منصفانہ آسان اور قابل فہم ہو اور جو شہریوں کو اپنی کارکردگی بڑھانے اور مصنوعات میں اضافہ کرنے کے لیے کشش پیدا کرے۔

۹۔ زکوٰۃ اور عشر کو شرعی قانون کے تحت وصول کرنے کے لیے مناسب مشینری قائم کی جائے گی۔

۱۰۔ تمام ملک میں خصوصاً پسماندہ علاقوں میں صنعتوں کو پھیلانے کی کوشش کی جائے گی تاکہ ترقی کے فوائد چند علاقوں تک محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔

۱۱۔ دفاع کے لیے اسلحہ سازی کی صنعت کو فروغ دیا جائے گا۔

۱۲۔ بنکاری اور انشورنس کے نظام کو مسلم ممالک کے تعاون سے سود کی بجائے اسلامی اصول شرکت، مضاربت اور تعاون باہمی کے ساتھ استوار کیا جائے گا۔

۱۳۔ پاکستان کو قلیل ترین مدت میں اپنی تیل کی ضروریات میں خود کفیل کیا جائے گا۔ گیس اور دیگر معدنیات کی تلاش کو اوّلیت دی جائے گی۔

زراعت

اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بہترین زرعی زمینوں کے ساتھ باہمت، جفاکش اور انتھک محنت کرنے والے اور اہلیت رکھنے والے زرعی کارکن بھی فراہم کیے ہیں لیکن آج کل لاکھوں کسان بے زمین ہیں۔ ملکی وسائل جو افتادہ زمینوں کو زیرِ کاشت لانے اور سیم وتھور پر قابو پانے پر صرف ہونا چاہیے تھے، سیاسی اغراض کی بھینٹ چڑھائے جارہے ہیں۔ ملک کا کثیر سرمایہ غیر پیداواری منصوبوں پر ضائع کیا جارہا ہے۔ پاکستان کے محدود وسائل اس سیاسی تعیش کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ ہمارے تمام وسائل زمینوں کی نگہداشت اور پانی پر صرف ہونا چاہئیں۔ ہمارا کسان ہماری معیشت میں ریڑھ کی ہڈی ہے۔ لیکن اسے آج تک نظر انداز کیا گیا ہے۔

فریب دیا گیا ہے اور دھوکہ میں رکھا گیا ہے۔

اپنی منصوبہ بندی میں زراعت کو فوقیت دیں گے کیونکہ زرعی معیشت کو مجموعی طور پر ملکی معیشت کی ترقی کی ضامن ہے۔ اس لیے ہم یہ اقدامات کریں گے:۔

۱۔ قابلِ کاشت سرکاری زمینوں کو وسائل آبپاشی مہیا کر کے بے زمین کاشتکاروں یا گزارہ یونٹ سے کم رقبہ رکھنے والے مالکان میں جلد از جلد تقسیم کر دیں گے اور اس معاملہ میں علاقے کے لوگوں کا حق مقدم رکھا جائے گا۔

۲۔ سیلابوں کی روک تھام کے لیے موثر انتظامات کیے جائیں گے اور ایک منصوبے کے تحت ڈیم تعمیر کیے جائیں گے تاکہ بارش کا ہر قطرہ کاشت کے لیے استعمال ہو سکے۔

۳۔ زرعی اجناس کی خرید پر سرکاری اجارہ داری ختم کی جائے گی۔ کاشتکاروں کا استحصال ختم کرنے کے لیے زرعی اجناس کی معقول قیمت خود مقرر کی جائے گی۔ اس مقصد کے لیے حسب ضرورت سرکاری وسائل سے مدد مہیا کی جائے گی اور خرید کا مناسب بندوبست کیا جائے گا۔

۴۔ زرعی آلات، زرعی مشینری، کھاد، بیج، تیل، بجلی، آلات زراعت، ٹریکٹر اور ٹیوب ویل وغیرہ سستے داموں مہیا کیے جائیں گے۔

۵۔ زرعی آلات، زرعی مشینری اور ٹریکٹر کی درآمد پر کسٹم ڈیوٹی ختم کر دی جائے گی۔

۶۔ زرعی ضروریات کے لیے بلا سود قرضے دیئے جائیں گے۔

۷۔ دیہاتوں میں گھریلو صنعتوں کے قیام کو فروغ دیا جائے گا اور اس کے لیے حکومت کی طرف سے امداد دی جائے گی۔

۸۔ سابقہ حکمرانوں میں سیاسی رشوت کے طور پر جاگیریں عطا کی ہیں اور جو افتادہ زمینیں ہیں وہ واپس لے لی جائیں گی اور بے زمین اور گذارہ یونٹ سے کم اراضی کے مالکان میں تقسیم کر دی جائیں گی۔ مزارعت کا ہر طریقہ جو شریعت کے خلاف ہو ختم کر دیا جائے گا اور شرعی احکام کے مطابق بالآخر زمین اسی کی ہوگی جو اس کو کاشت کرے گا۔

۹۔ آبیانے پر تمام ناروا اضافے ختم کر دیئے جائیں گے۔

۱۰۔ چھوٹے مالکان کو زرعی مشینری کرائے پر فراہم کی جائے گی۔

۱۱۔ زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے چھوٹے مالکان میں امداد باہمی کے طریقے کو بتدریج رائج کیا جائے گا۔

۱۲۔ جنگلات کی حفاظت، توسیع اور صحیح استعمال کے لیے ضروری تدابیر اختیار کی جائیں گی۔

۱۳۔ فصلوں اور مویشیوں کی انشورنس کے نظام کو بتدریج رائج کیا جائے گا۔

۱۴۔ زرعی آلات، مشینری اور ٹریکٹر سازی کے کارخانے قائم کرنے کو اوّلیت دی جائے گی۔

۱۵۔ ایسی صنعتوں کو جن میں استعمال ہونے والا خام مال کسی علاقہ میں پایا جاتا ہے انہیں اسی علاقہ میں قائم کرنے کو ترجیح دی جائے گی۔

۱۶۔ دیہاتوں میں آٹا، شکر، تیل، گھی اور دیگر ضروریات کی تقسیم کے لیے معقول انتظامات کیے جائیں گے۔ کھاد، بیج کاشتکاروں کو لاگت کے مطابق ارزاں قیمت پر مہیا کیے جائیں گے۔

مزدوروں اور کم تنخواہ پانے والے ملازمین کے حقوق

۱۔ صحت مند یونین سازی اور یونین سرگرمیوں میں حوصلہ افزائی کی جائے گی اور ان عائد شدہ ناروا پابندیوں کو ختم کر دیا جائے گا۔

۲۔ مزدوروں کو روزگار کی ضمانت دی جائے گی۔

۳۔ مزدوروں اور ان کے اہلِ خاندان کے لیے فیئر پرائس شاپس قائم کی جائیں گی۔ جہاں سے وہ رعایتی قیمتوں پر اشیائے صرف خود خرید سکیں۔ جس کے خسارے کو متعلقہ ادارے کی آمدن سے پورا کیا جائے گا۔

۴۔ مزدوروں کے مکانات کی فراہمی، علاج کی سہولتیں بہم پہنچانے اور ان کے بچوں کے لیے مفت تعلیم کے انتظامات کو اوّلیت دی جائے گی۔

۵۔ مزدوروں کو منافع اور انتظامیہ میں بامعنی شرکت دلائی جائے گی اور مزدوروں اور صنعت کاروں کے تعلقات کو خوشگوار بنایا جائے گا۔

عام معاشی اصلاحات

۱۔ ملک کی معاشی منصوبہ بندی میں منتخب نمائندوں کو شریک کیا جائے گا اور تمام منصوبے اسمبلیوں کی منظوری کے بعد نافذ کیے جائیں گے۔

۲۔ اشیائے تعیش اور دیگر غیر ضروری چیزوں کی درآمد روک دی جائے گی۔

۳۔ بیرونی منڈیوں میں پاکستان کی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کر کے برآمدات میں اضافہ کر دیا جائے گا۔

۴۔ کم آمدنی رکھنے والے لوگوں کے لیے سستے مکانات کی تعمیر کا انتظام کیا جائے گا۔

۵۔ خود رہائشی مکانات پر پراپرٹی ٹیکس ختم کر دیا جائے گا۔

۶۔ کچی آبادیوں اور دیہی علاقوں میں علاج، صاف پانی اور بجلی کی فراہمی کا بندوبست کیا جائے گا اور ذرائع آمد و رفت کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔

۷۔ ملک کے پسماندہ علاقوں کو ترقی دے کر دوسرے علاقوں کے ہم پلہ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

۸۔ ملکی وسائل کے نفع بخش استعمال کے لیے بڑے بڑے مکانات کی تعمیر روک دی جائے گی۔ مکانات کے رقبہ اور تعمیری اخراجات پر مناسب پابندی عائد کی جائے گی۔

۹۔ بے گھر لوگوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے قطعات اور تعمیر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے بلا سود قرضے دیئے جائیں گے۔

قومی صحت

آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ آج بھی علاج کی سہولتوں سے محروم ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ باشندگان ملک کی عام صحت کو جو تیزی سے گرتی جا رہی ہے سنبھالا جائے اور کوئی ایک فرد بھی ناداری کی بناء پر علاج سے محروم نہ رہ جائے۔ اس غرض کے لیے یہ تدابیر عمل میں لائی جائیں گی:-

۱۔ صحت سے متعلق ایک قومی پالیسی نافذ کی جائے گی تاکہ طبی سہولتیں ملک کے کونے کونے میں فراہم ہو سکیں۔

۲۔ دیہی علاقوں میں ڈسپنسریوں، ہسپتالوں اور زچہ خانوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے

گا۔ ایک منصوبے کے تحت دیہاتوں میں ڈاکٹروں کو تعینات کیا جائے گا۔ خاندانی منصوبہ بندی کے مراکز کو ختم کر کے شفاخانوں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

۳۔ تربیت یافتہ افراد کی کمی کو پورا کرنے اور ہسپتالوں میں مناسب عملہ کی فراہمی کے لیے ڈاکٹروں اور نرسوں کے لیے ایک ہیلتھ سروس تشکیل کی جائے گی۔ ڈاکٹروں، نرسوں اور دوسرے ماہرین کے لیے تنخواہ اور شرائط ملازمت میں ایسی کشش پیدا کی جائے گی کہ ان کے اندر ملک سے باہر جانے کا رجحان ختم ہو۔

۴۔ معیاری دوائیں اندرون ملک کے لیے کارخانوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

۵۔ نجی شعبہ میں ہسپتالوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور انہیں قومی ملکیت میں نہ لینے کی ضمانت دی جائے گی۔ یہ ہسپتال سرکاری نگرانی اور قواعد کے پابند ہوں گے۔

۶۔ علاج کی سہولتیں عام کرنے کے لیے یونانی طب اور ہومیو پیتھی شفاخانے بھی سرکاری طور پر قائم کیے جائیں گے۔

۷۔ غذا اور دواؤں میں ملاوٹ کو قطعی طور پر ختم کیا جائے گا اور اس کے ذمہ دار افراد کو عبرتناک سزائیں دی جائیں گی۔

غیر مسلم اقلیتیں

اقلیتوں کے بارے میں ہماری پالیسی یہ ہوگی:-

۱۔ اقلیتوں کو ان کی آبادی کے تناسب، ان کے براہِ راست ووٹوں کے ذریعے نمائندگی دی جائے گی۔

۲۔ سرکاری ملازموں، فنی درسگاہوں میں انہیں ان کی آبادی کے لحاظ سے حصہ دیا جائے گا۔

۳۔ ایسی جائیداد کو تحفظ دیا جائے گا جو اقلیتوں کی عبادت سے وابستہ ہوں۔

۴۔ ان کے تمام شہری اور قانونی حقوق کی حفاظت کی جائے گی اور حکومت ان کی مال و جان، آبرو اور شہری آزادیوں کے تحفظ کی پوری طرح ذمہ دار ہوگی۔

۵۔ اپنے معاشرے کی اصلاح کے لیے وہ جس قسم کے قوانین منظور کرانا چاہیں بشرطیکہ وہ دوسروں کے حقوق پر اثر انداز نہ ہوں۔ انہیں پاس کروانے میں ان کی مدد کی جائے گی۔

۶۔ ان کے اپنے تعلیمی و مذہبی معاملات میں حکومت کے وسائل سے جس جائز مدد کی ضرورت ہو کشادہ دلی کے ساتھ دی جائے گی۔

۷۔ اُن کے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں کوئی بے جا مداخلت نہ ہونے دی جائے گی۔ انہیں اپنے مذہب کے مطابق عمل کی مکمل آزادی دی جائے گی، لیکن کسی فرد یا جماعت کو عقیدۂ ختم نبوت اور دیگر مسلمہ اسلامی اصولوں کے خلاف تبلیغ و اشاعت کی اجازت نہیں ہوگی اور ایسا کرنا قابلِ تعزیر جرم ہوگا۔ اس سلسلہ میں دستور میں دوسری ترمیم کے ضمن میں عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے قانون سازی کے فیصلہ پر مکمل عمل درآمد کیا جائے گا۔

۸۔ انہیں حدودِ قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کو اپنے مذہبی قانونی یا رسم و رواج کے مطابق چلانے کا حق حاصل ہوگا۔

خارجہ پالیسی

ہماری خارجہ پالیسی کے اصول اور مقاصد یہ ہوں گے:-

۱۔ پاکستان کے ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے، لہٰذا ہماری خارجہ پالیسی اسلام کے تقاضوں کے مطابق ہوگی۔ ہم آزاد خارجہ پالیسی پر عمل پیرا ہوں گے۔ ہم دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ اور بالخصوص اپنے پڑوسی ملک کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں بشرطیکہ یہ تعلق و دوستی و اتحاد ہمارے جائز قومی مفادات اور ہماری آزادی اور خودمختاری پر کسی طرح اثر انداز نہ ہو۔

۲۔ ہم عالمِ اسلام کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس امر کی پوری کوشش کریں گے کہ مسلم ممالک متحد ہو کر ترقی اور خوشحالی کے لیے اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں باہمی تعاون کے حصول کے لیے ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کریں۔

۳۔ ہم جموں و کشمیر کے عوام کو سیکورٹی کونسل کے فیصلے کے مطابق استصواب کے ذریعے حق خودارادی دلوانے کی بھرپور کوشش کریں گے اور اس اصول سے متصادم جملہ معاملات کو رد کرتے ہیں۔

۴۔ ہم دنیا کی بڑی قوموں کی کشمکش سے پاکستان کو الگ تھلگ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے سیٹو جیسے فوجی معاہدوں سے پاکستان کی وابستگی ختم کردی جائے گی۔

۵۔ ہم ہر نوع سامراجیت اور استعماری نظام کے خاتمہ کے لیے اپنی انتہائی کوشش کریں گے۔ ہماری امداد و تائید ہمیشہ مظلوم قوموں کے ساتھ ہوگی۔ ہم غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کی معاشی آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے۔

۶۔ افغانستان اور بنگلہ دیش کے ساتھ تعلقات کو برادرانہ پر استوار کیے جائیں گے۔

دفاع

ہماری افواج ملک کا اہم ترین سرمایہ ہیں جن سے ہمارا قومی وقار وابستہ ہے۔ پاکستان تین مرتبہ بیرونی جارحیت کا شکار ہو چکا ہے، اس لیے بھی یہ شعبہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ ہم اس بات پر صَرفِ نظر نہیں کریں گے۔ ہمارا پڑوسی ملک بھارت اس میدان میں کتنی ترقی کر رہا ہے۔ ہمارے لیے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ ہم اپنی افواج کو ہر لحاظ سے اس قابل بنائیں کہ وہ کسی بھی خطرہ کا پورے اعتماد کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

ہم دفاعِ پاکستان کو اوّلیت دیں گے اور اس سلسلے میں یہ اقدامات کریں گے:-

۱۔ ہم اپنے تمام وسائل مجتمع کر کے پاکستانی افواج کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کریں گے۔

۲۔ ہم مسلم ممالک کے تعاون اور اشتراک سے پاکستان کو اسلحہ سازی کے معاملے میں خودکفیل بنائیں گے۔

۳۔ اٹھارہ سے پینتالیس سال تک کے تمام مردوں کے لیے فوجی تربیت لازمی قرار دی جائے گی۔ تاکہ پوری قوم افواج پاکستان کے دوش بدوش ملکی سالمیت کا تحفظ کرنے کے قابل بن سکے۔

۴۔ ہم ہر شہری کو اپنے واپنے خاندان اور ملک وقوم کا دفاع کرنے کے لیے اسلحہ رکھنے کی اجازت دیں گے۔

پاکستان قومی اتحاد کے پاس اللہ کے فضل سے آزمائش اور ابتلا کی بھٹی سے گزرے ہوئے تربیت یافتہ، دیانت دار، مخلص، بے لوث اور اہل کارکنوں اور جوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ اس کو صفوں میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اور ماہرین موجود ہیں اور جس نے قومی زندگی کے اس اہم ترین موڑ پر باہمی تعاون اور اتحاد کا مظاہرہ کر کے عوام کے دل جیت لیے ہیں۔

ہم پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ انشاء اللہ تعالیٰ پاکستان قومی اتحاد بطریق احسن اپنے فرائض انجام دے گا اور عوام کے اعتماد پر پورا اترے گا۔

(مخزونہ علامہ سید شبیر احمد ہاشمی)

ضمیمہ ۵

پاکستان قومی اتحاد کے عظیم راہنما
مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کی والدہ محترمہ کا بیان

جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی کی ۸۰ سالہ والدہ محترمہ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ مجھے چند روز کے اندر سینکڑوں ٹیلیفون اور پیغامات ملے ہیں جن میں میرے لڑکے کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے بارے میں استفسار کیے گئے تھے میں ان تمام لوگوں کے ساتھ جو مولانا نورانی کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں پر افسوس کرتے ہیں یہ ہدایت کرنا چاہتی ہوں کہ وہ اظہار افسوس کی بجائے خدا کا شکر کریں کہ اس نے ان کے راہنما کو حق بات کے لئے سختیاں جھیلنے کی سعادت عطا کی۔ انہوں نے کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں عمر کی اس منزل میں ہوں جہاں ہر وقت اپنے بیٹے کی قربت کی خواہش محسوس کرتی مگر اس کے باوجود مجھے اپنے بیٹے پر فخر ہے کہ اس نے عظیم باپ مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی رحمتہ اللہ علیہ کی لاج رکھ لی ہے اور اس ملک میں نظام مصطفیٰ ﷺ کی تحریک کو اس منزل پر لے جا رہا ہے جہاں سے کامیابی کا راستہ مختصر نظر آتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جنت البقیع مدینہ منورہ میں میرے شوہر اپنے بیٹے کی کامیابی پر نازاں ہونگے۔

انہوں نے کہا حق اور صداقت کے راستے میں نورانی نے جو سختیاں جھیلی ہیں وہ ایک ماں کے دل کے لئے تکلیف دہ ضرور ہیں مگر ان کے شوہر کو حق کے لئے اس سے بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میاں نورانی کا حوصلہ بلند ہے اگر قومی زندگی کے اس مرحلہ پر وہ کسی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ کرتے تو میں مرتے دم تک ان کو کبھی معاف نہ کرتی خود کو یہ سوچ کر کہیں میری تربیت میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔ مگر آج میں خوش ہو کہ حشر میں حضور ﷺ کے روبرو مجھے شرمندگی نہیں اُٹھانی پڑے گی اور نہ ہی میں اپنے شوہر کے روبرو شرمسار ہوں گی۔ میں ان تمام بہنوں کو بھی خراج تحسین پیش کرتی ہوں جن کے شوہروں، بچوں اور

بھائیوں نے نظام مصطفیٰ ﷺ کی راہ میں جانیں دیں۔

واضح ہو کہ جناب مولانا شاہ احمد نورانی کو ایشیا کے گرم ترین علاقے جیکب آباد کے ایک تھانے کی بغیر چھت کی کوٹھڑی میں رکھا گیا ہے۔

مذمت

ہم اہل ساہیوال اس چیز کی پر زور مذمت کرتے ہیں اور متعلقہ حکام سے اپیل کرتے ہیں کہ جناب شاہ احمد نورانی اور دیگر قائدین کو جیل میں اے کلاس دی جائے۔

منجانب پاکستان قومی اتحاد ساہیوال نوائے وقت، وفاق ۲۴/ مئی ۱۹۷۷ء (مخزونہ: علامہ شیر محمد فریدی، کارکن تحریکِ نظام مصطفیٰؐ، مہتمم مدرسہ انوارِ پناہؒ کمیر شریف ساہیوال)

ضمیمہ ۶

انتباہ

ساہیوال کے غیور عام اپنے شہر میں قومی اتحاد کی احتجاجی تحریک کو پورے ایک ماہ سے نہایت پُر امن طریقہ سے چلاتے آ رہے ہیں۔ جس کے سبب اس شہر میں آج تک ہر طرح کا باہمی شہری میل جول اور مکمل امن و امان برقرار ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بھٹو جسے ملک و قوم کی بھلائی سے زیادہ اقتدار عزیز ہے نے کل ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے پیپلز پارٹی کے لوگوں کو بھی چلتے چلتے اس بات پر ابھارا ہے کہ وہ اپنے دفاع کی آڑ لے کر قومی اتحاد کی تحریک سے متصادم ہوں۔ اس لئے ہم آپ کو آگاہ کرتے ہیں کہ بھٹو اور اُس کا اقتدار آنی جانی شے ہے۔ جبکہ ہم نے اور ہماری اولادوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اِسی شہر میں بسنا ہے اس لئے ہماری جانیں اور مال ایک دوسرے کے لئے قابلِ احترام ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ احترام برقرار رہے تو بھٹو کی بات پر گمراہ ہونے سے بچیں بصورت دیگر جو بھی حالات رُونما ہونگے اس کی تمام تر ذمہ داری پیپلز پارٹی اور اس کے کرتے دھرتوں پر ہی ہوگی۔

(مخزونہ: علامہ شیر محمد فریدی، کارکن تحریکِ نظام مصطفیٰؐ، مہتمم مدرسہ انوار پناہؒ، کمیر شریف ساہیوال)

ضمیمہ ۷

قومی اتحاد اور حکومت کے مسوّدات

یہ معاہدات بھٹو حکومت اور پاکستان قومی اتحاد کی مصالحاتی کمیٹیوں کے مابین طے پائے

ہرگاہ کہ پاکستان قومی اتحاد نے یہ دعویٰ کیا کہ مارچ ۱۹۷۷ء میں ہونے والے انتخابات میں حکومت اور انتظامیہ نے وسیع پیمانے پر دھاندلی اور اس طرح عوام کے ارادے کو ناکام کردیا اور انتخابی عمل کو ایک فراڈ بنادیا۔

اور ہرگاہ کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے دعویٰ کیا کہ پاکستان قومی اتحاد نے انتخابات میں جس پیمانے پر دھاندلی ہونے کا الزام لگایا ہے اس پیمانے پر دھاندلی نہیں ہوئی اور اس نے (پیپلز پارٹی نے) ووٹوں کی اکثریت حاصل کی۔

اور ہرگاہ کہ نتیجۃً ملک میں ملک گیر سطح پر ایسی احتجاجی تحریک شروع ہوئی، جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس تحریک کے نتیجے میں مارشل لاء نافذ ہوا۔ لیکن اس اقدام سے بھی ملک میں پیدا شدہ سیاسی مسائل کو حل کرنے یا ان پر قابو پانے میں مدد نہ ملی۔

اور ہرگاہ کہ برادر اسلامی ملکوں خصوصاً سعودی عرب، کویت، لیبیا اور متحدہ عرب امارات نے تنازعات ختم کرنے اور معاہدہ پر عملدرآمد کرانے کی یقین دہانی کرانے کی پیشکش کی۔ ان کی مخلصانہ مساعی کے نتیجہ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے نمائندوں اور پاکستان قومی اتحاد کے مابین موجودہ سیاسی بحران کو حل کرنے، آزادانہ، منصفانہ اور صحیح انتخابات کرانے کی ضمانت فراہم کرنے اور بدعنوانیوں کی روک تھام اور انتخابات کے لیے ضروری مناسب ماحول اور باہمی اعتمادی فضا پیدا کرنے اور طاقت کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے مذاکرات ہوئے اور اب فریقین مندرجہ ذیل معاہدہ پر متفق ہوگئے ہیں:

(۱) اسمبلیوں کو توڑنا

قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں ۷ جولائی ۱۹۷۷ء کو ختم ہوجائیں گی اور صوبائی وزراء اعلیٰ اور صوبائی وزراء اس تاریخ سے اپنے عہدوں پر نہیں رہیں گے۔

(۲) نئے انتخابات

قومی اسمبلی کے انتخابات ۶/ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو اور صوبائی اسمبلیوں کے ۱۰/ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو ہوں گے۔

(۳) سینٹ

۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد قائم ہونے والی قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں نے سینٹ کے جو ارکان منتخب کیے ہیں۔ وہ اس تاریخ کے بعد سینیٹ کے ممبر نہیں رہیں گے اور یہ خالی نشستیں آئین کی دفعہ ۵۹ میں بتائے گئے طریق کار کے مطابق وہ نئی قومی اور صوبائی اسمبلیاں پُر کریں گی۔ جو سمجھوتہ کے تحت ہونے والے انتخابات کے نتیجہ میں معرض وجود میں آئیں گی۔ سینیٹ کے جو ارکان اگست ۱۹۷۷ء میں ریٹائر ہوں گے۔ وہ اور ایڈیشنل سینٹر اس وقت ممبر رہیں گے۔ جب تک نئی قومی اور صوبائی اسمبلیاں ان کی جگہ نئے ممبر منتخب نہ کردیں۔

(۴) سپریم عملدرآمد کونسل

سمجھوتہ پر عملدرآمد اس کی پوری وفاداری کے مکمل پابندی کے مقاصد کے حصول کے لیے ایک سپریم عملدرآمد کونسل قائم کی جائے گی۔ (جسے بعدازاں کونسل کہا جائے گا۔)

(۵) یہ کونسل

(i) وہ فرائض ادا کرے گی اور ان اختیارات سے بہرہ ور ہوگی۔ جن کا تعین سمجھوتہ اور اس کے شیڈول الف میں کیا گیا ہے۔

(ii) سمجھوتہ کے مطابق انتخابات کے بعد نئی صوبائی حکومتیں قائم ہونے تک صوبائی گورنروں اور صوبائی حکومتوں سے متعلق صدر اور وفاقی حکومت کے اختیارات کو بروئے کار لائے گی۔

(iii) قبائلی علاقوں سے متعلق صدر اور صوبوں کے گورنروں کے اختیارات کونسل کی

ہدایات کے تحت استعمال ہوں گے۔

(iv) آزاد جموں و کشمیر سے متعلق صدر پاکستان اور وفاقی حکومت کے اختیارات کی ہدایات کے تحت استعمال ہوں گے۔

(۶) صوبائی حکومتیں

صوبائی اسمبلیاں ختم ہونے کے بعد صوبوں کی انتظامیہ اور قانون سازی کے اختیارات کونسل کی ہدایت اور کنٹرول کے تحت، صوبوں کے نئے گورنروں کو حاصل ہوں گے جو اس سمجھوتہ کے فریقین کی باہمی رضامندی سے مقرر ہوں گے اور جو آئین پاکستان کے تحت صوبائی گورنر کو جو اختیارات حاصل ہیں، ان کو بروئے کار لائیں گے۔

(۷) ایکٹ۔ آرڈی ننس ریگولیشنز اور آرڈر

مقننائیں کوئی قانون نہیں بنائیں گی اور صدر یا صوبہ کے گورنر اس وقت تک کوئی آرڈیننس ریگولیشن یا آرڈر نافذ نہیں کریں گی جب تک اس سلسلہ میں کونسل کی پیشگی منظوری حاصل نہ کر لی جائے۔

کلیدی تقرریاں

(i) کونسل کو تمام کلیدی آسامیوں پر نئی تقرریاں کرنے، ان پر نظر ثانی کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ ان آسامیوں میں وفاقی اور صوبائی وزراء اور ڈویژنوں کے سیکرٹری، تمام سرکاری شعبوں کے سربراہ شامل ہیں۔ بشمول قانون نافذ کرنے والے اداروں اور سیکورٹی و تفتیش کرنے والے اداروں کے سربراہوں، ڈویژنل کمشنروں، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، ڈپٹی کمشنروں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کے مذکورہ بالا عہدوں پر تقرریاں اور تبدیلیاں کونسل کے کنٹرول میں ہوں گی۔

(ii) وفاقی حکومت صوبائی حکومت کے کسی عہدیدار کو کوئی تحریری یا زبانی حکم نہیں دے گی تا کہ صوبائی انتظامیہ کی غیر جانبداری قائم رہ سکے۔

(۸) بلوچستان

بلوچستان میں متعین مسلح افواج معاہدہ کے بعد پندرہ دن کے اندر اندر امن زمانہ کی چھاؤنیوں میں بلا لی جائیں گی اور عوام کے اعتماد بحال کرنے اور ایسی فضا پیدا کرنے کے لیے

فوری اقدامات کیے جائیں گے کہ لوگ انتخابات میں حصہ لینے کے لیے اپنے گھروں میں واپس آسکیں۔ بلوچستان میں جن افراد کو گھر بار چھوڑنا پڑا تھا یا جو زخمی ہوئے تھے ان کی اور ان کے اہل خانہ کی بحالی کے لیے مناسب مالی اور انتظامی اقدامات کیے جائیں گے۔

فروری ۱۹۷۳ء کے بعد حکومتی اقدامات کے نتیجہ میں جن لوگوں کی زندگیاں ضائع ہوئیں ان کے کنبوں کو مناسب امداد دی جائے گی۔ اس سمجھوتہ کے نتیجہ میں بیرون ملک یا پاکستان کے اندر جو شخص (یا اس کا کنبہ) اپنے گھر واپس آئے گا۔ اسے ہراساں کرنے اور ڈرانے دھمکانے سے احتراز کیا جائے گا اور نہ ہی ان میں سے کسی کے خلاف کسی قسم کے ارتکاب جرم میں مقدمہ چلایا جائے گا۔

(۹) آزاد جموں و کشمیر

آزاد جموں و کشمیر اسمبلی اور کونسل ۱۴-۷-۷۷ کو توڑ دی جائے گی اور موجودہ صدر، وزیر اعظم اور وزراء اپنے عہدوں پر برقرار نہیں رہیں گے اور آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی رضامندی سے نیا نگران صدر مقرر کیا جائے گا۔ جس کو حکومت آزاد کشمیر کے صدر کے تمام اختیارات حاصل ہوں گے۔

آزاد جموں و کشمیر کے عبوری آئین کے ایکٹ ۷۴ء میں یک طرفہ ترمیمیں کی گئی ہیں وہ واپس لے لی جائیں گی اور ۱۵-۱۰-۷۷ کو آزاد کشمیر کے عہدہ کے لیے انتخابات ہوں گے۔ الیکشن کمیشن کا تقرر اور دوسرے انتظامات آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے مشورے سے کیے جائیں گے۔

(۱۰) آئینی ترمیمیں

پاکستان کے آئین میں جتنی ترمیمیں کی گئی ہیں جن سے آئین میں دیئے گئے بنیادی حقوق پر اثر پڑا ہے جن سے عدالتوں کے اختیارات ختم یا محدود ہوئے ہیں اور اعلیٰ عدالتوں کے عدالتی اختیارات پر زد پڑی ہے (جیسا کہ شیڈول ب میں بتایا گیا ہے) وہ اس معاہدہ کی رو سے فی الفور غیر موثر ہو جائیں گے۔

(۱۱) ہنگامی حالت کا خاتمہ

ہنگامی حالت فوراً ختم کر دی جائے گی۔ تمام بنیادی حقوق بحال ہو جائیں گے۔ ان

حقوق کو محدود، معطل یا ختم نہیں کیا جاسکے گا۔ سمجھوتہ کی مدت کے دوران ہنگامی حالت از سرِ نو نافذ نہیں کی جائے گی۔ سوائے کونسل کی پیشگی منظوری کے اور ان پابندیوں کے تحت جو کونسل نافذ کرے گی۔

(۱۲) ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس کا خاتمہ

ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس فی الفور واپس لے لیا جائے گا اور اس کے تحت جو ٹریبونل قائم ہیں وہ ختم ہوجائیں گے۔ اس آرڈیننس کے تحت جن لوگوں کو سزائیں ملی ہیں یا جن پر مقدمے چل رہے ہیں ان کو رہا کردیا جائے گا اور ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت جو مقدمے چل رہے ہیں وہ واپس لے لیے جائیں گے۔

(۱۳) خصوصی عدالتیں

کسی بھی قانون کے تحت قائم ہونے والے ٹریبونل اور خصوصی عدالتیں فی الفور ختم ہوجائیں گی۔ ان عدالتوں یا ٹریبونلوں سے سزایاب ہونے والے تمام افراد رہا کردیے جائیں گے۔ خواہ سزا کی معیاد باقی ہو جتنی سزا وہ بھگت چکے ہیں وہی ان کی قید تصور ہوگی۔ کسی بھی خاص عدالت یا ٹریبونل میں جو مقدمے زیرِ سماعت ہیں یا سماعت طلب ہیں حکومت ان پر نظرِثانی کرے گی اور اگر مقدمے کی سماعت کی ضرورت ہوگی تو یہ مقدمات عام عدالتوں میں پیش کیے جائیں گے اور ان کی سماعت تمام قوانین کے تحت ہوگی۔

(۱۴) آرمی ایکٹ ۱۹۵۲ء

ایکٹ ۱۹۷۷ء یا دوسرے قوانین کے ذریعے آرمی ایکٹ ۱۹۵۲ء میں جو ترمیمیں کی گئی ہیں اور جن کی رو سے سویلین لوگوں کا کورٹس مارشل ہوسکتا ہے فی الفور واپس ہوجائیں گے اور ان کے تحت جن لوگوں کو سزائیں مل چکی ہیں وہ رہا کردیے جائیں گے۔

(۱۵) قیدیوں اور نظربندوں کی رہائی

حفاظتی امتناعی قوانین کے تحت جن لوگوں کو نظربند یا حراست میں رکھا گیا ہے یا جن کو قانون نافذ کرنے والے اداروں، مسلح افواج نے حراست میں رکھا ہے، جن پر مقدمے چل رہے ہیں یا جن کو انتخابات یا یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں "ارتکاب جرم" پر سزا دی ہے ان کو فوراً رہا کردیا جائے گا اور ان کے خلاف درج یا فیصلہ طلب

مقدمات یا ان کی نقل و حرکت محدود کرنے سے متعلق تمام احکام واپس لے لیے جائیں گے اگر ضروری ہو تو حکام قانون اپیل کے مرحلہ میں بھی یہ کارروائی کریں گے سیاسی کارکنوں کے خلاف نئے مقدمے قائم نہیں کیے جائیں گے نہ ہی ایسے افراد کو گرفتار یا نظربند کیا جائے گا۔

فریقین کے ارکان جو دونوں طرف سے برابر تعداد میں ہوں گے پر مشتمل کمیٹی ان تمام معاملات و مقدمات کا جائزہ لے گی جو حکومت کے خیال میں اس پیراگراف کے ذیل میں نہیں آتے۔ اس سلسلے میں حکومت دو ہفتوں کے اندر ایسے افراد کی فہرست مہیا کرے گی۔

(۱۶) سزایافتہ سیاسی کارکن

یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد جن سیاسی لیڈروں یا کارکنوں کو ان کی سیاسی سرگرمیوں کی بناء پر گرفتار کیا گیا ہے یا ان پر مقدمات چلائے گئے ہیں اور جن کو ٹریبونلوں یا عدالتوں نے سزائیں دیں وہ فوراً رہا کردیے جائیں گے اور ان کو بری تصور کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں تمام مقدمات جو عدالتوں یا ٹریبونلوں میں فیصلہ طلب پڑے ہیں یا تفتیش کرنے والے اداروں کے پاس ہیں وہ فوراً واپس ہوجائیں گے۔

(۱۷) ریلیف اور امداد

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے دوران یا اس کے بعد انتخابات کے عواقب کے نتیجہ میں جن لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں، ان کے کنبوں کو مناسب امداد دی جائے گی۔ مذکورہ بالا حالات میں جو لوگ زخمی ہوئے یا جن کو نقصان پہنچا ان کو معقول مالی امداد دی جائے گی۔

(۱۸) جلاوطن

وہ تمام پاکستانی جن کو پاکستان سے جلاوطن کردیا گیا ہے یا جن کو پاکستان واپس آنے کی اجازت نہیں ہے ان کو بلاخوف و خطر ملک میں واپس آنے کی آزادی ہوگی۔

جن لوگوں کو صوبوں میں گرفتار کیا گیا اور ان صوبوں سے باہر لے جایا گیا اور حراست میں رکھا گیا وہ واپس لائے جائیں گے اور رہا کردیے جائیں گے اور کونسل کو اس امر کی اطلاع کی جائے گی۔

(۱۹) انتخابات سے متعلق سرگرمیاں

انتخابات سے متعلق سرگرمیوں حصہ لینے پر کسی شخص کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔

حراست میں نہیں رکھا جائے گا اس پر مقدمہ نہیں چلایا جائے گا اور نہ ہی ہراساں کیا جائے گا۔

(۲۰) سیاسی سرگرمیوں پر پابندی

سیاسی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے لیے دفعہ ۱۴۴ یا کسی اور قانون کے تحت کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی لاؤڈ سپیکر کا استعمال ممنوع کیا جائے گا۔

(۲۱) پریس

آزادیٔ صحافت پر تمام پابندیاں ختم ہو جائیں گی۔ یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد جن اخباروں یا جرائد کے ڈیکلریشن منسوخ کیے گئے یا واپس لیے گئے ہیں وہ فوراً بحال ہو جائیں گے۔ نئے ڈیکلریشن حاصل کرنے کی آزادی ہوگی۔ جو پرنٹرز پبلشرز اور صحافی سزایاب ہوئے ہیں، یا حراست میں ہیں وہ فوراً رہا کر دیئے جائیں گے۔

ضبط شدہ پریس اور جائیداد واپس کردی جائے گی اور جرمانے کی رقوم واپس کردی جائیں گی۔ نیوز پرنٹ کا کوٹہ اور حکومتی اور نیم حکومتی اداروں کے اشتہار دینے میں امتیازی پالیسی فوراً ختم کردی جائے گی۔

(۲۲) سرکاری ذرائع ابلاغ

جو ذرائع ابلاغ سرکاری ملکیت یا کنٹرول میں ہیں وہ خبریں اور نظریات توازن، غیر جانب داری کے ساتھ پیش کریں گی۔ پاکستان ٹیلی ویژن، پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات و جرائد پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد کی خبروں کو یکساں طور پر پیش کریں گے اور یکساں جگہ یا وقت دیں گے جو ذرائع ابلاغ سیاسی جماعتوں اور کارکنوں کی کردار کشی نہیں کریں گے اور کونسل کے کنٹرول میں ہوں گے اور اس کی ہدایات کی پابندی کریں گے۔

(۲۳) ٹریڈ یونینز

تمام قانونی ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور ان پر عائد پابندیاں ختم کردی جائیں گی۔ کسان اور مزدور لیڈر اور کارکن جو حراست میں ہیں فی الفور رہا کر دیئے جائیں گے۔

(۲۴) الیکشن کمیشن

الیکشن کمیشن، کمیشن کے چیئرمین اور چار ایسے ارکان پر مشتمل ہوگا جو قومی اتحاد کے مشورے سے مقرر ہوں گے الیکشن کمیشن کو ایسے افسر اور اہلکار اور عدالتی افسر مقرر کرنے کا اختیار ہوگا جن کی تقرری فرائض کی بجا آوری کے لیے ضروری ہوگی۔ الیکشن کمیشن کو ایسے افراد کو سزا دینے کا اختیار ہوگا جو ڈسپلن کی خلاف ورزی کریں گے یا کسی بدعنوانی، غیر قانونی اقدام یا بے قاعدگی کے مرتکب ہوں گے۔

(۲۵) الیکشن کمیشن کا اختیار

الیکشن کمیشن کو معقول قانونی مالی اور انتظامی اختیارات دیئے جائیں گے اور اسے اشاعتی یا لازمی اور ضبطی کے احکام جاری کرنے کا اختیار ہوگا۔ انتخابات منصفانہ، آزادانہ اور صحیح طور پر کروانے کے لیے کمیشن کو افراد کی رہائی یا گرفتاری کے احکام معطل کرنے کے لیے ہائی کورٹ کے اختیارات حاصل ہوں گی۔ شیڈول سے کے مطابق انتخابی قوانین میں فوراً ترمیمیں کی جائیں گی۔

(۲۶) مسلح افواج انتخابی کمیشن کی مدد کریں گے

عوامی نمائندگی کے قانون ۱۹۷۶ء میں آئین کی دفعہ ۲۴۵ کے حوالے سے مناسب ترمیمیں کی جائیں گی تاکہ کمیشن انتخابات کروانے کے لیے پاکستان کی مسلح افواج سے امداد و عملہ حاصل کر سکے اور فیڈرل سیکورٹی فورس، رینجرز اور پولیس کو انتخابات کے سلسلے میں کوئی سا فریضہ سونپ سکے۔

(۲۷) انتخابات کے نتائج

الیکشن کے نتائج کا اعلان الیکشن کمیشن کرے گا اور عوامی ذرائع ابلاغ بشمول ریڈیو، ٹیلی ویژن اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات نتائج کے بارے میں الیکشن کمیشن کے تحریری اختیار کے بغیر کوئی اطلاع جاری نہیں کریں گے۔

(۲۸) انتخابی عذرداریاں

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے سلسلے میں دائر شدہ تمام انتخابی عذرداریاں ختم تصور

ہوں گی۔ مذکورہ بالا انتخابات کے سلسلے میں جس امیدوار نے انتخابات اخراجات کا گوشوارہ داخل نہیں کیا اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

(۲۹)

پاکستان قومی اتحاد کونسل کو ان وفاقی اور صوبائی افسروں کی ایک فہرست پیش کرے گا جنہوں نے اس کے خیال میں ۷ جنوری ۱۹۷۷ء کے بعد بدعنوانیاں کیں اور وحشیانہ مظالم ڈھائے۔

کونسل ان افراد کے خلاف الزامات کی تحقیقات کرائے گی اور الزامات ثابت ہونے کی صورت میں مناسب انضباطی یا قانونی کارروائی کی جائے گی۔

(۳۰)

(i) یکم جنوری ۱۹۷۷ء کے بعد اسلحہ کے جتنے لائسنس جاری کیے گئے ہیں، وہ معطل کیے جائیں گے اور ان لائسنسوں کے تحت جاری ہونے والا اسلحہ قریبی فوجی اسلحہ خانہ میں جمع کرایا جائے گا۔

(ii) یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد ممنوعہ بور کے اسلحہ کے جتنے لائسنس جاری کیے گئے ہیں ان کی تفصیلات اور لائسنس ہولڈروں کے کوائف، اسلحہ کی تفصیل اور لائسنس جاری کرنے والے حکام کی فہرست سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے بعد ایک ہفتہ میں کونسل کو پیش کی جائے گی اور کونسل اس پر مناسب کارروائی کرے گا۔

(۳۱) جرائم کے مرتکب افراد کے خلاف کارپوریشن

الیکشن کمیشن نے مارچ ۱۹۷۷ء کے دوران جن امیدواروں، افسروں اور دیگر افراد کے خلاف تحقیقات کیں اور بظاہر معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا انتخابی قانون کی خلاف ورزی کی یا منصفانہ انتخابات کے عمل میں رکاوٹ پیدا کی یا دیگر جرائم کا ارتکاب کیا۔ ان کے خلاف فی الفور مقدمے چلائے جائیں گے۔

(۳۲) ایف ایس ایف کا کنٹرول

فیڈرل سیکورٹی فورس آرمی جنرل ہیڈکوارٹر کی کمان اور کنٹرول میں دے دی جائے گی۔

(۳۳) مشکلات کا ازالہ

جونہی کونسل کو محسوس ہوگا کہ اس معاہدہ پر عملدرآمد میں مشکلات حائل ہیں تو وہ صدر کو ایسے آرڈیننس آرڈر کا مسودہ بھیجے گی جس سے اس کے خیال میں یہ مشکلات دور ہو سکیں۔ صدر مسودہ ملتے ہی اس پر دستخط کر کے اس کو نافذ کر دیں گے اور اگر انہوں نے ۲۴ گھنٹوں میں ایسا نہ کیا تو یہ تصور کیا جائے گا کہ انہوں نے دستخط کر دیئے ہیں اور وہ قانون پاکستان کا حصہ بن جائے گا۔

صورت حال کو جوں کی توں برقرار رکھنا

(i) سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے بعد اور اس کے بعد انتخابات مکمل ہونے تک وزیراعظم اور ان کی حکومت پالیسی پر مبنی کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گی جس سے ملک کے مالیات اور جائیداد پر اثر پڑے اور اگر کسی وجہ سے ایسا فیصلہ ناگزیر ہو جائے تو وہ کونسل کی رضامندی سے کیا جائے گا۔

(ii) سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے بعد انتخابات ہونے تک وفاقی اور صوبائی حکومتیں پاکستان میں کسی سیاسی جماعت یا تنظیم پر پابندی عائد کرنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کریں گی۔

(iii) اگلے عام انتخابات تک آئین میں کوئی ترمیم نہیں کی جائے گی۔ سوائے ان ترامیم کے جو اس سمجھوتہ پر عملدرآمد کے سلسلے میں ضروری ہوں گی۔

عملدرآمد

(i) سمجھوتہ کی شق ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۱۰، ۱۱، ۲۵، ۲۶ اور ۲۷ پر عمل درآمد کے لیے عارضی آئینی ترامیم کی ضرورت ہوگی اور ان ترامیم کا اہتمام پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے چیئرمین کی ذمہ داری ہوگی۔ اس سمجھوتہ پر عملدرآمد کے لیے قانون سازی اور ترامیم کا اہتمام اور ہدایت اور نوٹیفکیشن کا اجراء جلد از جلد ہوگا۔

(ii) وفاقی اور صوبائی حکومتیں سمجھوتے پر عملدرآمد کے سلسلے میں ہر ضروری اقدام کریں گی اور کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گی، نہ اس کی اجازت دیں گی جس سے معاہدہ پر عملدرآمد میں رکاوٹ پیدا ہو۔

شیڈول (الف)

سپریم عملدرآمد کونسل

۱۔ ماسوائے اس امر کے جو آئین کے منافی ہو پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد کے درمیان طے پانے والے سمجھوتے پر پوری طرح عملدرآمد کے لیے ایک سپریم عملدرآمد کونسل قائم کی جائے گی (جسے بعدازاں کونسل کہا جائے گا)

۲۔ کونسل کی ہیئت ترکیبی یہ ہوگی:

(i) پاکستان پیپلز پارٹی پانچ ارکان نامزد کرے گی۔

(ii) پاکستان قومی اتحاد پانچ ارکان نامزد کرے گا۔

۳۔ کونسل کو مکمل اختیار ہوگا کہ:

اگر اس کا کوئی رکن کوئی حوالہ پیش کرے یا یہ خود تحریک کرے یا کوئی شکایت وصول ہو تو یہ مسئلہ پر جس کا تعلق سمجھوتہ پر عملدرآمد یا اس کی خلاف ورزی سے ہو غور کر کے فیصلہ صادر کرے۔

۴۔ کونسل کے فیصلے متفقہ ہوں گے۔ اختلاف کی صورت میں مسئلہ خود بخود سپریم کورٹ چلا جائے گا۔

۵۔ متعلقہ سپریم کورٹ کے تین سب سے سینئر ججوں کے سامنے پیش ہوگا وہ عملدرآمد کونسل کے ارکان کو نوٹس جاری کر کے اور بند کمرے میں کونسل کے یا حاضر ارکان کی موجودگی میں مسئلہ پر غور کر کے ۷۲ گھنٹوں کے اندر اکثریت رائے سے فیصلہ صادر کریں گے۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ کونسل کا فیصلہ متصور ہوگا۔

۶۔ کونسل حسب ضرورت اجلاس کرے گی لیکن ہفتے میں ایک اجلاس لازمی ہوگا جو ہفتہ کے پہلے یوم کار کو ہوگا اور اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک درپیش کام نپٹ نہ جائے۔

۷۔ کونسل کے اجلاس کے لیے کورم سات (۷) کا ہوگا اور اگر کورم نہ ہونے کی صورت میں اجلاس ہو رہا تو یہ سمجھا جائے گا کہ مسئلہ سپریم کورٹ کے پاس چلا گیا ہے اور اس کا فیصلہ سپریم کورٹ مذکورہ بالا طریق پر کرے گی۔

۸۔ وفاقی اور صوبائی حکومتیں کونسل کے فیصلوں پر فوراً عمل کریں گی اور اس فیصلہ کی پابندی ان تمام آئینی اور انتظامی حکام پر لازمی ہوگی۔ جو وفاق یا صوبوں کے سلسلہ میں کسی قسم کے فرائض ادا کر رہے ہوں گے۔ بشمول مسلح افواج، حکومت کارپوریشنوں، سرکاری ذرائع ابلاغ کے اور متعلقہ افراد، حکام اور اہلکاروں کا فرض ہوگا کہ وہ کونسل کے فیصلوں اور ہدایات پر عمل کریں۔

۹۔ کونسل کو اپنے طریق کار کے متعلق ضوابط بنانے اپنی کارروائی کو منضبط کرنے اور کمیٹیاں تشکیل کرنے کا اختیار ہوگا۔

۱۰۔ وفاقی حکومت وہ تمام سہولتیں فراہم کرے گی جو کونسل اور اس کے ارکان کے خیال میں ضروری ہوں گی اور مصارف وفاقی فنڈ سے پورے ہوں گے۔

مذکورہ بالا کو آئین پاکستان میں عارضی ترمیم کے طور پر بطور دفعہ ۱۵۴ الف میں شامل کیا جائے گا اور وزیراعظم کے انتخاب کے بعد یہ............نہیں رہے گا۔

شیڈول (ب)

ترمیم شدہ دفعہ

۱	۳	۳	۱	۴	۱۷	۱	۸	۱۹۳
۱	۹	۱۹۹	۱	۱۰	۲۰۰	۱	۱۱	۲۰۹
۱	۱۲	۲۱۲	۳	۲	۱۰	۳	۳	۲۳۲
۴	۲	۸	۴	۳	۱۷	۴	۴	۱۹
۴	۲	۵۴	۴	۸	۱۹۹	۵	۲	۱۰۱
۵	۵	۱۷۹	۵	۶	۱۸۰	۵	۷	۱۸۷
۵	۹	۱۹۵	۵	۱۰	۱۹۶	۵	۱۱	۱۹۹
۵	۱۴	۲۰۶	۵	۱۷	۲۸۰	۶	۲	۱۷۹
۶	۳	۱۹۵	۷	۲	۱۹۶الف	۷	۳	۱۰۱
۷	۴	۲۴۵						

پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے پیش کردہ دوسرا مسودہ

یہ سمجھوتہ وزیر اعظم پاکستان چیئرمین پیپلز پارٹی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور منتخب رکن قومی اسمبلی و صدر پاکستان قومی اتحاد مفتی محمود کے درمیان طے پایا۔ جنہیں بالترتیب آئندہ سطور میں فریق اوّل اور فریق ثانی بیان کیا جائے گا۔ اس سمجھوتہ کا متن حسب ذیل ہے:

جیسا کہ پاکستان کے پہلے عام انتخابات کے بعد جو مارچ ۱۹۷۷ء میں منعقد ہوئے سیاسی بحران پیدا ہو چکا ہے۔

اور جیسا کہ اس سمجھوتہ میں شامل فریقین کے درمیان ان کی نمائندہ حیثیت میں مذاکرات ہوئے جس میں پہلے فریق اوّل کی معاونت عبدالحفیظ پیرزادہ اور مولانا کوثر نیازی نے کی۔ نوابزادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد نے فریق ثانی کی معاونت کی۔

اور جیسا کہ فریق اوّل نے حالات کو پر سکون بنانے اور معمول پر لانے کے لیے پاکستان و قومی اتحاد کے تمام رہنماؤں کو رہا کر دینے کا حکم جاری کیا۔ کراچی ڈویژن اور لاہور حیدر آباد کے اضلاع سے مارشل لاء اٹھالیا۔ ان تمام افراد کی اعانت کی اجازت دی۔ جن کی جانیں ضائع ہوئیں یا شدید زخمی ہوئے۔ کرفیو اور دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے والے تمام افراد کی رہائی کے احکامات کے تحت زیر حراست تھے۔

اور جیسا کہ فریق ثانی نے احتجاجی تحریک معطل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے جو اس نے مارچ ۱۹۷۷ء کے پہلے انتخابات کے بعد شروع کی تھی۔

اور جیسا کہ دیانت دارانہ، منصفانہ اور صاف ستھرے انتخابات کے انعقاد کے لیے ضروری، پر امن اور باہمی اعتماد کا ماحول پیدا کرنے کے لئے فریقین نے یہ سمجھوتہ کیا ہے۔ اس سمجھوتہ کی شرائط حسب ذیل ہوں گی:

۱۔ پاکستان کی قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں مورخہ............ کو توڑ دی جائیں گی۔ قومی اسمبلی اس ضمن میں ضروری ترامیم لازماً منظور کرے گی۔ نیز ایسے قوانین بھی منظور کیے جائیں جو اس سمجھوتہ کے نتیجہ میں ضروری ہوں گے۔

۲۔ صوبائی وزراء اعلیٰ کی سربراہی میں قائم ہونے والی حکومتیں پیراگراف میں مندرجہ تاریخ پر کام کرنا بند کر دیں گی۔ اس کے نتیجہ کے طور پر ضروری ایسی آئینی ترامیم

قومی اسمبلی میں منظور کی جائے گی۔ جو آئین کے آرٹیکل ۲۴۴ کے ممکنہ حد تک قریب ترین ہوں۔

۳۔ قومی اسمبلی کے انتخابات ۱۷/ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو منعقد کیے جائیں گے۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات بھی اسی دن ہوں گے یا قومی اسمبلی کے انتخاب کے تین دن کے اندر اندر منعقد کیے جائیں گے۔

۴۔ سینٹ کے وہ ارکان جو ۵/ اگست ۱۹۷۷ء کو اپنے عہدہ سے ریٹائر ہوں گے اپنے عہدہ پر برقرار رہیں گے۔ سینٹ کے دیگر ارکان جنہیں قومی اور صوبائی اسمبلیوں نے منتخب کیا ہے۔ پیراگراف ۳ کے مطابق قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب کے بعد مستعفی ہو جائیں گے۔

۵۔ ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کے بعد احتجاجی تحریک گڑبڑ اور دیگر تمام قوانین بشمول امتناعی نظر بندی کے قوانین کے تحت گرفتار یا نظر بند کیے جانے والے افراد رہا کر دیئے گئے ہیں۔ انہیں فوراً رہا کر دیا جائے گا۔ سوائے غنڈوں اور سماج دشمن عناصر کے جن پر نہایت سنگین جرائم بشمول قتل، لوٹ مار، زنا بالجبر اور آتش زنی کے الزامات عائد کیے گئے ہیں، انہیں رہا نہیں کیا جائے گا۔ تاہم فریقین کے ایک ایک نمائندہ پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جائے گی جو ان کے خلاف الزامات کا معائنہ کرے گی۔ تا کہ یہ طے کیا جا سکے کہ ان میں سے کسے رہا کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ اس کمیٹی کے ارکان میں پیدا ہونے والے بھی کسی بھی اختلاف رائے کو عملدرآمد کونسل "Implementation Council" کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

۷۔ ۱۶ مارچ ۱۹۷۷ء کے بعد رونما ہونے والی تحریک یا گڑبڑ کے دوران متاثر ہونے والے ان تمام افراد کو معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ جو شدید طور پر زخمی ہوئے۔ جن کی جائیداد تباہ ہو گئی یا اسے شدید نقصان پہنچا۔ نیز اسی انداز میں جاں بحق ہونے والے افراد کے قانونی ورثا کو بھی معاوضہ دیا جائے گا معاوضہ کا تعین حکومت پاکستان کرے گی۔ ایسا معاوضہ یا امداد پارٹی کے ساتھ تعلق سے ماوراء ہو کر ان تمام افراد کو دی جائے گی جو جاں بحق ہوئے۔ جو شدید زخمی ہوئے، یا ان کی جائیداد تباہ ہوئی اور اسے نقصان پہنچا۔

۸۔ اس سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی آئین کے آرٹیکل ۲۳۲ اور آرٹیکل ۲۸۰ کے تحت نافذ کی جانے والی ہنگامی حالت فوراً ختم کردی جائے گی۔

۹۔ سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس ختم کردیا جائے گا۔ نیز اس قانون کے تحت وضع کیے جانے والے ضوابط اور احکامات بھی ختم کردیئے جائیں گے۔ تاہم اس قانون کے تحت دشمن کی جائیداد اور حصول جائیداد سے متعلق قانون اور ضابطہ برقرار رہے گا۔

۱۰۔ سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس کے تحت قائم ہونے اور کام کرنے والی ٹریبونل فوراً کام کرنا بند کردیں گے اور ان کے زیر سماعت مقدمات فوری طور پر عام عدالتوں میں منتقل کردیئے جائیں گے جہاں ان پر کارروائی عام قانون مطابق ہوگی۔

۱۱۔ سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی پاکستان آرمی ایکٹ میں ۲۱/اپریل ۱۹۷۷ء کے مطابق ترامیم جو ایکٹ x ۱۹۷۷ء کے تحت کی گئیں ختم کردی جائیں گی۔ تاہم ان کے نتیجہ وہ اپیلیں متاثر نہیں ہوں گی جو زیر سماعت ہوں گی یا زیر سماعت آئیں گی۔

۱۲۔ سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے چار ماہ بعد مسلح افواج صوبہ بلوچستان میں سول انتظامیہ کی امداد کے طور پر کام کرنا بند کردے گی۔

۱۳۔ عوامی نمائندگی "Peoples's Representation Act" کے قانون میں حسب ذیل ترامیم کی جائیں گی:

(الف) مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے نتیجہ میں دائر کی جانے والی اور زیر سماعت اپیلیں ختم ہوجائیں گی۔

(ب) آئندہ انتخابات کے نتائج الیکشن کمیشن کے اعلان سے قبل ریڈیو، ٹیلی ویژن سے نشر اور اخبارات میں شائع نہیں کیے جائیں گے۔

(ج) الیکشن کمیشن مسلح افواج اور سول آرمڈ فورسز بشمول پولیس کو انتخابی مہم کے دوران اور پولنگ کے موقع پر امنِ عامہ برقرار رکھنے کے لیے طلب کرسکے گا۔

۱۴۔ فریقین سمجھوتہ کے ایک ہفتہ کے اندر ایک ضابطۂ اخلاق تیار کریں گی۔ جس میں حسب ذیل امور شامل کیے جائیں گے:

(الف) انتخابی مہم کے [illegible] قواعد۔

(ب) انتخاب کے دوران تمام قانونی سیاسی سرگرمیوں کی بلا روک ٹوک اجازت۔

(ج) انتخابی مہم کے دوران اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے قواعد کار۔

(د) آزادی صحافت جس میں ان اخبارات کے ڈیکلریشن کی بحالی بھی شامل ہے جن کی اشاعت پر پابندی عائد کی جاچکی ہے۔

(ر) انتخابی مہم کے دوران ارتکاب جرم پر کسی بھی شخص کو گرفتار کیا جاسکتا ہے اور اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکے گی۔

(س) انتخابی مہم کے دوران عام جلسے منعقد کیے جاسکیں گے۔ جلوس نکالے جائیں گے۔

(ش) سرکاری تحویل میں موجود ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلہ کے مطابق غیر جانبداری اور معقول قائم رکھا جائے گا۔

۱۵۔ آئین پاکستان میں اس طرح ترمیم کی جائے گی کہ:

(الف) شیڈول میں طے شدہ ترامیم کو آئین میں شامل کیا جائے گا۔

(ب) پیراگراف ۱۶۔۱۷ کے مطابق الیکشن کمیشن کی تشکیل نو۔

۱۶۔ الیکشن کمیشن ایک چیئرمین اور چار ارکان پر مشتمل ہوگا۔ چیئرمین کے لیے وہی استعداد درکار ہوگی جس کا آئین کے آرٹیکل ۲۱۳ میں ذکر کیا گیا ہے۔ ایک رکن ہائی کورٹ کا جج ہوگا۔ یہ تقرریاں صدر پاکستان فریق اوّل کے مشورے سے کرے گا۔ تاہم فریق اوّل فریق ثانی سے مشورہ کرے گا۔

۱۷۔ ایک نیا چیف الیکشن کمشنر مقرر کیا جائے گا۔

۱۸۔ اس سمجھوتہ پر عملدرآمد کے دوران فریقین میں کوئی تنازعہ یا جھگڑا پیدا ہوجائے تو تصفیہ کے لیے عملدرآمد کونسل کے سامنے پیش کیا جائے گا جو پیراگراف ۱۹ کے تحت تحت وجود میں آئے گی۔

۱۹۔ ''عملدرآمد کونسل'' دس ارکان پر مشتمل ہوگی جس میں چیئرمین بھی شامل ہوگا۔ کونسل کی ہیئت اور طریق کار حسب ذیل ہوگا:

(الف) وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار بھٹو کونسل کے چیئرمین ہوں گے۔

(ب) چیئرمین کی غیر حاضری کے دوران مولانا مفتی محمود اجلاس کی صدارت کریں گے۔

(ج) مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور مولانا مفتی محمود میں سے ہر ایک چار چار افراد کو کونسل کے رکن کی حیثیت سے نامزد کرے گا جو پہلے عام انتخابات سے منتخب ہونے والی قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ کے ارکان یا منتخب ارکان میں سے ہوں گے۔

(د) کونسل کے متفقہ فیصلہ پر فریق اوّل عملدرآمد کرے گا۔ اس مقصد کے لیے وہ وزیراعظم کی حیثیت سے اپنے انتظامی اختیارات کو بروئے کار لائے گا۔

۲۰۔ عملدرآمد کونسل، دیانت دارانہ، منصفانہ اور صاف ستھرے انتخابات کے انعقاد اور ان کی نگرانی کرے گی۔ عملدرآمد کونسل اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے معاملات یا ان سے متعلقہ معاملات پر براہِ راست یا کسی فریق کی شکایت پر کارروائی کر سکے گی۔

۲۱۔ اگر عملدرآمد کونسل کسی متفقہ فیصلہ پر نہ پہنچ سکے تو وہ معاملہ ثالثی کے لیے سپریم کورٹ کے سامنے بھیج دیا جائے گا۔

۲۲۔ ایسے تمام معاملات جو پیراگراف ۲۱ کے تحت سپریم کورٹ کو بھیجے جائیں گے۔ ان کے فیصلہ کے لیے چیف جسٹس آف پاکستان سپریم کورٹ کے تین ججوں کو بطور ثالث مقرر کریں گے۔ چیف جسٹس خود اپنی ذات کو بھی بحیثیت ثالث مقرر کر سکیں گے۔

۲۳۔ چیف جسٹس کے متعین کردہ ثالث فریقین کے نامزد افراد کے موقف کی سماعت کریں گے اور ۷۲ گھنٹوں کے اندر اندر اس پر فیصلہ دیں گے۔ ثالثوں کے روبرو تمام تر سماعت اور کارروائی بند کمرہ میں ہوگی۔

۲۴۔ ثالث کارروائی کے دوران شہادتیں قلم بند کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔ نیز فیصلہ کے لیے نہایت مختصر وجوہات تحریر کریں گے۔

سمجھوتہ

یہ سمجھوتہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے جنہوں نے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد حکومت بنائی اور جنہیں آئندہ سطور میں فریق اوّل کہا جائے گا اور مولانا مفتی محمود کے درمیان پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے جنہیں آئندہ سطور میں فریق ثانی کہا جائے گا۔

جیسا کہ مارچ ۱۹۷۷ء کے پہلے عام انتخابات کے بعد پاکستان میں سیاسی بحران

پیدا ہوا۔

اور جیسا کہ پاکستان قومی اتحاد نے دعویٰ کیا کہ متذکرہ انتخابات میں بہت بڑے پیمانے پر حکومت نے اور انتظامیہ نے دھاندلی کی۔ جس کے نتیجہ میں رائے عامہ کو پریشان کیا گیا اور انتخابات کو مذاق بنا دیا گیا۔

اور جیسا کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے تردید کی ہے کہ انتخابات میں اس پیمانے پر دھاندلی نہیں کی گئی جس کا الزام پاکستان قومی اتحاد نے عائد کیا اور اس پر اصرار کیا کہ انہوں نے انتخابات میں ووٹوں کی اکثریت کے ذریعہ کامیابی حاصل کی ہے۔

اور جیسا کہ اس سمجھوتہ کے فریقین اس مسئلہ کا پرامن حل چاہتے ہیں۔

اور جیسا کہ برادر مسلم ممالک، خصوصی طور پر سعودی عرب، کویت، لیبیا اور متحدہ عرب امارات نے جھگڑے کو طے کرانے کی پیش کش کی ہے۔

اور جیسا کہ اس کوشش کے تابع فریقین کے مذاکرات ہوئے جن کے درمیان مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ اور مولانا کوثر نیازی نے فریق اوّل اور نوابزادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد نے فریق ثانی کی معاونت کی۔ لہٰذا اس نقطۂ نظر کے ساتھ کہ دیانت دارانہ، منصفانہ اور صاف ستھرے انتخابات کے انعقاد کے لیے ضروری سازگار ماحول، باہمی اعتماد اور سکون بحال کیا جائے نیز بدعنوانیاں کے ارتکاب کو دور کیا جائے۔ حسب ذیل سمجھوتہ طے پا گیا کہ:

(۱) اسمبلیوں کو توڑا جائے

قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں ۱۰ جولائی ۱۹۷۷ء تک توڑ دی جائیں گی۔ جن کے ساتھ ہی چاروں صوبوں کے وزراء اور حکومت غرض تمام عہدے ختم ہو جائیں گے۔

(۲) انتخابات

قومی اسمبلی کے انتخابات ۸/ اکتوبر ۱۹۷۷ء اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ۱۰/ اکتوبر کو منعقد ہوں گے۔

(۳) سینٹ

قومی اسمبلی یا صوبائی اسمبلیوں کے سینٹ کے لیے منتخب کردہ تمام ارکان کی رکنیت پیراگراف کے تحت اسمبلیوں کو توڑتے ہی ختم ہو جائے گی۔

(۴) عملدرآمد کونسل

(الف) اس سمجھوتہ کو پوری طرح اور دیانت دارانہ عملدرآمد کے لیے ایک عملدرآمد کونسل قائم کی جائے گی۔ جو ایسے فرائض انجام دے گی اور ان اختیارات کی حامل ہوگی جو اس سمجھوتہ کے شیڈول میں بیان کیے گئے ہیں۔

(ب) اس مقصد کے لیے کونسل انتخابات کے بعد صوبائی حکومتوں کی تشکیل تک ایک ایسی مماثل اختیارات استعمال کرے گی جو صدر، وفاقی حکومت اور صوبائی گورنروں اور حکومت کے درمیان موجود ہیں۔

(ج) کونسل کی منظوری کے بغیر قانون ساز اسمبلی کوئی قانون نہیں بنائے گی۔ صدر یا گورنر کوئی آرڈیننس، ریگولیشن یا حکم جاری نہیں کریں گے۔

(د) کونسل کو نظر ثانی کے اختیارات حاصل ہوں گے اور اگر ضروری ہو تو کونسل کو تمام کلیدی عہدوں پر جن میں وفاقی اور صوبائی وزارتوں کے سیکرٹری محکموں اور ڈویژن کے سیکرٹری، سرکاری محکموں کے سربراہ مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔ جن میں قانون نافذ کرنے والے ادارے، سیکورٹی اور تفتیشی ایجنسیاں، ڈویژنل کمشنر، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی شامل ہیں۔ مزید برآں تقرری اور ایک سے دوسرے مقام پر تبدیلی پر کونسل کو نظر ثانی کا اختیار حاصل ہوگا۔

(۵) صوبائی حکومتیں

چاروں صوبائی اسمبلیاں ٹوٹتے ہی صوبائی حکومتوں کے اختیارات اور ہدایات انتظامی اور قانون سازی کے اختیارات کونسل کے تابع ہو جائیں گے۔ جنہیں صوبائی گورنر استعمال کریں گے۔ جن کا تقرر سمجھوتہ کے فریقین کی باہمی رضامندی سے کیا جائے گا۔

(۶) بلوچستان

سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے تیس دن کے اندر مسلح افواج بلوچستان میں واقع چھاؤنیوں میں واپس بلالیا جائے گا۔ عوام میں اعتماد بحال کرنے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں گے اور ایسے حالات پیدا کیے جائیں گے کہ عوام اپنے اپنے رہائشی علاقوں میں واپس چلے جائیں تاکہ وہ انتخابات میں حصہ لے سکیں۔ ان تمام خاندانوں کو مناسب امداد مہیا کی

جائے گی جن کے افراد نے فروری ۱۹۷۳ء سے اب تک حکومت کے آپریشن کے دوران جانیں دی ہیں، کوئی شخص یا اس کا خاندان دوسرے علاقوں، اندرون پاکستان یا بیرون پاکستان سے اپنے گھر واپس آتے ہوئے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ ہراساں کیا جائے گا نہ ہی اس کے خلاف کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

(۷) آزاد جموں وکشمیر

آزاد جموں اور کشمیر اسمبلی ۱۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو توڑ دی جائے گی جس کے ساتھ ہی موجودہ صدر، وزیراعظم اور وزراء اپنے عہدے چھوڑ دیں گے اور ایک نیا نگران صدر آل جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس کے ساتھ باہمی معاہدہ کے بعد مقرر کیا جائے گا۔ اسے حکومت چلانے کے لیے ضروری تمام اختیارات دیئے جائیں گے۔ آزاد جموں وکشمیر کے عبوری آئین میں یک طرفہ طور پر کی گئی تمام ترامیم ختم کردی جائیں گی۔ آزاد کشمیر اسمبلی اور صدر کے لیے ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو انتخابات کرائے جائیں گے۔ الیکشن کمیشن کی تقرری اور دیگر تمام انتظامات آل جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس کی منظوری سے کیے جائیں گے۔

(۸) آئینی ترامیم

پاکستان کے آئین میں کی گئی تمام وہ ترامیم جو بنیادی حقوق کو متاثر کرتی ہیں، عدالتوں کے دائرہ اختیار کو محدود کرتی ہیں۔ اعلیٰ عدالتوں کے لیے ضرر رساں ہیں۔ جن کا ذکر شیڈول ب میں کیا گیا ہے۔ فوری طور پر منسوخ کردی جائیں گی۔

(۹) ہنگامی حالات کا خاتمہ

ہنگامی حالت کے نفاذ کے احکامات فوری پر ختم ہو جائیں گے۔ تمام بنیادی حقوق فوری طور پر واپس مل جائیں گے اور ان میں کمی نہیں کی جائے گی نہ ہی انہیں معطل یا ختم کیا جائے گا۔ ہنگامی حالت تاوقتیکہ کونسل کی منظوری حاصل کرلی جائے ایسی صورت میں نافذ کی گئی ہنگامی حالت کو کونسل کی عائد کردہ حدود اور پابندیوں کے تابع ہوگی۔

(۱۰) ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس کا خاتمہ

سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس اور اس کے تحت وضع کردہ ضوابط اور احکام ختم ہو جائیں گے۔ اس کے تحت قائم کیے گئے ٹربیونل ختم کرنا متصور ہوں

گے۔ تاہم دشمن کی جائیداد سے متعلق ضوابط روبہ عمل رہیں گے۔ امتناعی قوانین کے تحت نظر بند، سزایافتہ یا زیرِ سماعت مقدمات میں ملوث افراد رہا کردیئے جائیں گے۔ نیز اس کے خلاف زیرِ التواء ٹریبونل یا عدالتوں یا زیرِ تفتیش مقدمات فوری طور پر ختم تصور کیے جائیں گے۔ فریقین کے ایک ایک نمائندے پر مشتمل ایک کمیٹی اس پیراگراف کے تحت حکومت کی طرف سے دو ہفتے تک نہ کیے جانے والے اقدامات کا جائزہ لے گی۔ اس سلسلے میں پیدا ہونے والے اختلاف رائے کی صورت میں معاملہ کو حتمی طور پر طے کرنے کے لیے کونسل کے سپرد کردیا جائے گا۔ اس شق کے تحت نہ آنے والے معاملات اور مقامات عام عدالتوں میں منتقل تصور کیے جائیں گے جہاں ان پر عام قانون اور مروج طریق کار کے تحت کارروائی کی جائے گی۔

(۱۱) خصوصی عدالتیں اور ٹریبونل

تاہم خصوصی عدالتیں اور ٹریبونل جو کسی بھی قانو کے تحت فوجداری مقدمات کی سماعت کے لیے قائم کیے ہوں فوری طور پر ختم کردیئے جائیں گے۔ تمام افراد سیاسی سرگرمیوں کی بناء پر ایسی عدالتوں اور ٹریبونل سے سزائیں دی گئی ہیں، فوراً رہا کردیا جائے گا۔ اسی نوعیت کے تمام مقدمات پر جو خصوصی عدالتوں اور ٹریبونل کے روبرو زیرِ سماعت ہیں حکومت دوبارہ جائزہ لے گی اور ضرورت کے مطابق مزید کسی بھی اقدامات تجویز کرے گی۔ اگر مقدمہ کی کارروائی جاری رکھنا یا مقدمہ دائر کرنا مقصود ہو تو پھر یہ مقدمہ عام عدالت میں دائر کیا جائے گا۔ جہاں عام قانونی فوجداری کے تحت کارروائی کی جائے گی۔

(۱۲) آرمی ایکٹ ۱۹۵۲ء

سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی پاکستان آرمی ایکٹ ۱۹۵۲ء میں ایکٹ x ۱۹۷۷ء کے تحت کی گئی ترامیم واپس لے لی جائیں گی۔ فوجی عدالتوں کے تحت سزایافتہ افراد رہا متصور ہوں گے اور انہیں فوری طور پر رہا کردیا جائے گا۔

(۱۳) سیاسی کارکنوں کی رہائی

(i) تمام سیاسی رہنما اور کارکن:

(الف) جو سیکورٹی آف پاکستان ۱۹۵۲ء تحفظ امن عامہ آرڈیننس سندھ کرائم کنٹرول ایکٹ اور متحدہ سیفٹی ایکٹ، آرڈیننس ریگولیشنز اور ایسے ہی دیگر قوانین کے تحت نظر بند افراد۔

(ب) تفتیش، انٹروگیشن یا ایسے ہی کسی ضابطے کے تحت پولیس یا کسی دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے یا مسلح فوج کی زیرِ حراست افراد۔

(ج) ایسے افراد جن کے خلاف تعزیراتی قوانین کے تحت مقدمات درج کیے گئے ہوں۔

(د) جن کے خلاف مقدمات زیرِ سماعت ہیں۔

(ر) ایسے افراد جن کے خلاف انتخابات کے ضمن میں انتخابات کے مطالبہ، انتخابی سرگرمیاں یا یکم جنوری ۱۹۷۲ء سے سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر مقدمات درج کیے گئے۔ رہا تصور کیے جائیں گے اور فوری طور پر رہا کردیئے جائیں گے۔ ان کے خلاف تمام مقدمات خواہ عدالتوں میں زیرِ سماعت ہی کیوں نہ ہوں ختم کردیئے جائیں گے۔ نقل و حرکت پر پابندی کے احکامات بھی ختم کردیئے جائیں گے، جہاں ضروری ہوا، لاء آفیسر "Nolle Prosequi Law of ficar" کے مطابق بیان دیں گے۔

(ii) سیاسی رہنماؤں یا کارکنوں کے خلاف نئے مقدمات درج کیے جائیں گے۔ نہ ہی گرفتار یا نظر بند کیے جائیں گے نہ ہی ایسے افراد کو جو کسی بھی قانون کے تحت نظر بند ہیں، نظر بند رکھا جائے گا، نہ ہی کوئی مقدمہ قائم کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں گرفتار کیا جائے گا تاکہ اس شق کا تاثر زائل نہ ہو۔

(iii) اگر وفاقی یا صوبائی حکومت کی رائے یہ ہو کہ ان شقوں کا فائدہ کسی شخص کو نہیں دیا جاسکتا یا وہ اس تحفظ کا فائدہ کسی شخص کو نہیں دیا جاسکتا یا وہ اس تحفظ اور فائدہ کے حقدار نہیں ہیں۔ اس صورت میں دو ہفتوں کے اندر اندر فریقین کے ایک نمائندہ پر مشتمل کمیٹی کے سامنے پیش کرے گی۔ جو ایسے مقدمات یا افراد کے معاملات کا جائزہ لے گی کہ آیا وہ شخص اس فائدہ یا تحفظ کا حقدار ہے یا نہیں۔ اختلاف رائے کی صورت میں معاملہ فیصلہ کے لیے کونسل کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

(۱۴) امداد و تعاون

ان تمام افراد کو جو مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے نتیجہ میں رونما ہونے والے احتجاجی تحریک یا گڑبڑ کی بنا پر شدید زخمی ہوئے۔ ان کی جائیداد کو نقصان پہنچایا یا جائیداد تباہ

ہوگی۔ معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ نیز معقول معاوضہ ان افراد کے قانونی وارثوں کو بھی دیا جائے گا جو احتجاجی تحریک یا گڑبڑ کے دوران جاں بحق ہوئے۔ یہ معاوضہ حکومت پاکستان کونسل کے مشورے سے مقرر کرے گی اور اس معاوضہ کا تعین پارٹی تعلق سے بالاتر رہ کر کیا جائے گا۔

(۱۵) ملک بدر کیے جانے والے افراد

ان افراد کو جنہیں پاکستان سے باہر نکال دیا گیا ہے اور جنہیں پاکستان واپس آنے کی اجازت نہیں دی جا رہی انہیں واپس آنے کی اجازت ہوگی۔ وہ افراد جنہیں حکومت نے گرفتار کرلیا ہے یا اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور جنہیں ایک صوبے سے نکال کر کسی دوسری جگہ زیرحراست رکھا گیا ہے انہیں واپس ان کے صوبوں میں لایا جائے گا۔ نیز اس امر کی کونسل کو اطلاع دی جائے گی۔

(۱۶) حدود اور پابندیاں ختم

کوئی شخص گرفتار نہیں کیا جائے گا نہ ہی نظر بند رکھا جائے گا اور نہ ہی کسی شخص کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر جن کا تعلق انتخابات سے ہو، مقدمہ چلایا جائے گا۔ دفعہ ۱۴۴ کے تحت پابندیاں عائد نہیں کی جائیں گی اور نہ ہی اس قسم کے قوانین کے تحت سیاسی سرگرمیوں کو محدود کیا جائے گا۔ لاؤڈ سپیکر کے استعمال پر بھی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔

(۱۷) پریس

آزادی صحافت پر تمام پابندیاں فوری طور پر ختم کردی جائیں گی اور یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد منسوخ کیے گئے تمام اخبارات اور جرائد کے ڈیکلریشن بحال کردیے جائیں گے۔ نئے ڈیکلریشن نہایت آزادی سے دیئے جائیں گے۔ تمام صحافی، پرنٹر اور پبلشر جنہیں سزائیں دی گئی ہیں یا انہیں زیرحراست رکھا گیا ہے فوری طور پر رہا کردیے جائیں گے۔ ان کے پریس اور جائیداد واگزار کردی جائے گی اور ان پر عائد کردہ جرمانے کی رقوم بھی لوٹا دی جائیں گی۔ اخباری کوٹہ کی تقسیم میں امتیازی سلوک، سرکاری اور سرکاری اداروں کے اشتہارات کی تقسیم میں ہر قسم کی تمیز ختم کردی جائے گی۔

(۱۸) سرکاری ذرائع ابلاغ

سرکاری ذرائع ابلاغ کے ذریعے خبروں اور نظریات کی تشہیر میں توازن اور غیر جانب داری پیدا کی جائے گی۔ پاکستان ٹیلی ویژن، پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات و جرائد میں خبروں اور نظریات کی اشاعت میں پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد کو مساوی وقت، مواقع اور جائز مقام دیا جائے گا۔ یہ ادارے سیاسی جماعتوں اور کارکنوں کے کردار کشی سے اجتناب کریں گے۔ نیز یہ ذرائع کونسل کے کنٹرول میں ہوں گے اور کونسل کی ہدایت کی پابندی کریں گے۔

(۱۹) ٹریڈ یونین

قانون کے مطابق تمام ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور ان پر عائد پابندیاں فوری طور پر ختم کردی جائیں گی۔ زیرحراست مزدور اور کسان رہنماؤں کو فوری طور پر رہا کردیا جائے گا۔

(۲۰) الیکشن کمیشن

الیکشن کمیشن ایک چیئرمین اور چار ارکان پر مشتمل ہوگا جو پاکستانی قومی اتحاد کے مشورہ سے مقرر کیے جائیں گے۔ الیکشن کمیشن کو ایسے افسران اور ملازمین کے تقرر کا اختیار حاصل ہوگا جن میں عدالتی افسر بھی شامل ہوں گے اور جنہیں وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے ضروری تصور کرے۔ نیز الیکشن کمیشن کو نظم وضبط کی خلاف ورزی کرنے، بدعنوانیوں، غیر قانونی کارروائیاں کرنے والوں کو سزا دینے کے اختیارات بھی حاصل ہوں گے۔

(۲۱) الیکشن کمیشن کا اختیارات

الیکشن کمیشن کو کافی قانونی، مالیاتی اور انتظامی اختیارات حاصل ہوں گے۔ نیز اسے ایسے اختیارات بھی حاصل ہوں گے جن کے تحت وہ امتناعی اور حاکمانہ اور متعلقہ احکامات جاری کرسکے۔ کمیشن کو ہائیکورٹ کے اختیارات بھی حاصل ہوں گے جن کے تحت وہ افراد کو ضمانت پر رہا کرسکے گا۔ گرفتاری کے احکامات معطل کرسکے گا۔ نیز ایسے اقدامات بھی اٹھا سکے گا جن کے ذریعے انتخابات صاف ستھرے، دیانت دارانہ اور منصفانہ منعقد ہوسکیں۔ اس ضمن میں شیڈول ''سی'' میں مندرجات ترامیم کو فوری طور پر اپنایا جائے گا۔

(۲۲) الیکشن کمیشن کی امداد کے لیے مسلح افواج

عوامی نمائندگی کے قانون ۱۹۷۶ء میں مناسب ترامیم کی جائیں گی۔ نیز آئین، آرٹیکل ۲۴۵ میں بھی مناسب ترامیم ہوں گی تاکہ الیکشن کمیشن انتخابات منعقد کرنے کی خاطر اپنی مدد کے لیے مسلح افواج سے مطلوبہ افرادی قوت حاصل کر سکے۔ بشرطیکہ فیڈرل سیکورٹی فورس، رینجرز یا پولیس کا کوئی فرد انتخابات کی خاطر استعمال نہ کیا جائے۔

(۲۳) انتخابات کے نتائج

انتخابات کے نتائج کا صرف الیکشن کمیشن ہی اعلان کرے گا۔ ذرائع ابلاغ جس میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے زیر انتظام اخبارات شامل ہیں۔ نتائج کا اس وقت تک اعلان نہیں کریں گے جب تک انہیں الیکشن کمیشن کی طرف سے باقاعدہ دستخطوں کے ساتھ نتائج تحریری طور پر نہ دیے جائیں۔

(۲۴) انتخابی عذر داریاں اور اخراجات

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات سے متعلق تمام عذر داریاں فوری طور پر ختم ہو جائیں گی اس سلسلے میں کسی امیدوار کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے جو الیکشن کمیشن کو انتخابی اخراجات سے آگاہ نہ کر سکا ہو۔

(۲۵) انتخابات کے دوران بدعنوانی

پاکستان قومی اتحاد کونسل کو ایسے وفاقی اور صوبائی افسروں کی فہرست فراہم کر سکتا ہے جو ان کی رائے میں ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں شدید ترین بدعنوانیوں اور ظلم و تشدد کے مرتکب ہوئے تھے۔ کونسل ان الزامات کی تحقیقات کرے۔ جہاں جہاں ان پر الزامات ثابت ہو جائیں گے ان افراد کے خلاف انضباطی کارروائی کی جائے گی۔

(۲۶) اسلحہ کے لائسنس

(i) یکم جنوری ۱۹۷۷ء کے بعد جاری کیے جانے والے اسلحہ کے تمام لائسنس معطل کر دیے جائیں گے اور ان پر جاری کیا جانے والا اسلحہ قریب ترین فوجی اسلحہ خانہ میں جمع کرا دیا جائے گا۔

(ii) یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد جاری کیے جانے والے ممنوعہ بور کے اسلحہ کے تمام لائسنس، لائسنس حاصل کرنے والوں کے متعلق تمام تر تفصیلات سے ایک ہفتہ کے اندر کونسل کو باخبر کیا جائے گا۔ جس کے بعد کونسل مناسب اقدامات کرے گی۔

(۲۷) فیڈرل سیکورٹی فورس

فیڈرل سیکورٹی فورس کو فوج کے جنرل ہیڈ کوارٹر کی کمانڈ اور کنٹرول میں دے دیا جائے گا۔

(۲۸) مشکلات کو دور کرنا

انتخابات کے انعقاد تک صدر پاکستان کونسل کے مشورہ کے مطابق ایسے احکامات اور ہدایت جاری کریں گے جو اس ضمن میں درپیش مشکلات دور کرنے کے لیے ہوں گی۔ ان احکامات کے ذریعے آئین اور قانون میں ایسی ترامیم ہو سکیں گی۔ جس کے ذریعہ اضافہ ہو سکے یا کچھ حذف کیا جا سکے تاکہ جن کی کونسل کی ضرورت ہو۔

(۲۹) موجودہ حالت کا استقرار

(i) سمجھوتہ پر دستخط کرنے کے بعد اور انتخابات کے انعقاد تک حکومت سرکاری خزانہ کو اس طرح استعمال میں نہ لا سکے گی کہ اس سے انتخابات کو متاثر کیا جا سکتا۔

(ii) نہ ہی حکومت کونسل کی منظوری کے بغیر کسی سیاسی جماعت یا تنظیم پر پابندی عائد کر سکے گی۔

(iii) اس سمجھوتہ کو روبہ عمل لانے کے سوا آئین میں کسی قسم کی ترامیم نہیں کی جا سکیں گی۔

(۳۰) عملدرآمد

(i) آئین میں عبوری ترامیم اور ایسے قوانین جو سمجھوتہ پر عملدرآمد کے لیے ضروری ہوں گے۔ فریق اوّل کی ذمہ داری ہوں گے۔

(ii) اس سمجھوتہ پر عملدرآمد کے لیے وفاقی اور صوبائی حکومتیں ہر ممکن اقدام کریں گی اور کوئی ایسا اقدام نہ کریں اور نہ ہونے دیں گی جو اس سمجھوتہ پر عملدرآمد کی راہ میں حائل ہو سکے۔

پاکستان قومی اتحاد کا چوتھا اور آخری مسودہ

یہ سمجھوتہ پیپلز پارٹی کی طرف سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو جنہوں نے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد وزیر اعظم کی حیثیت سے حکومت بنائی اور جنہیں آئندہ سطور میں فریق اوّل کہا جائے گا اور پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے مولانا مفتی محمود جنہیں آئندہ سطور میں فریق ثانی کہا جائے گا، کے درمیان طے پایا۔

جیسا کہ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد پاکستان میں سیاسی بحران پیدا ہو چکا ہے اور جیسا کہ پاکستان قومی اتحاد کا یہ دعویٰ ہے کہ متذکرہ انتخابات میں بہت بڑے پیمانے پر حکومت اور انتظامیہ نے دھاندلی کر کے عوام کی رائے کو ٹھکرا دیا اور یوں انتخابات کو جعلی بنا دیا۔

اور جیسا کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے اس امر کی تردید کی ہے کہ پاکستان قومی اتحاد کے الزامات کے مطابق دھاندلی نہیں ہوئی اور اس امر پر اصرار کیا ہے کہ پیپلز پارٹی نے انتخابات اکثریتی ووٹ سے جیتے ہیں اور جیسا کہ اس سمجھوتہ کے فریقین اس صورت حال کے پیدا ہو جانے کے بعد اس کا پرامن حل تلاش کرنے کے خواہشمند تھے۔

اور جیسا کہ برادر مسلم ممالک، بالخصوص سعودی عرب، کویت، لیبیا اور متحدہ عرب امارات نے اس جھگڑے کو طے کرانے کی پیش کش کی۔

اور جیسا کہ ان کوششوں کے نتیجہ میں فریقین کے درمیان مذاکرات ہوئے جن میں مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ اور مولانا کوثر نیازی نے فریق اوّل اور نوابزادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد نے فریق ثانی کی معاونت کی، تاکہ دیانت دارانہ، منصفانہ اور صاف ستھرے انتخابات نیز بدعنوانیوں کے اجتناب کے لیے سازگار ماحول پیدا کیا جائے اور حالات کو پرسکون کیا جائے۔ اس لیے یہ معاہدہ طے پایا ہے جس کی شرائط حسب ذیل ہیں:

(۱) اسمبلیوں کا خاتمہ

قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں ۱۰ جولائی تک توڑ دی جائیں گی۔ جس کے ساتھ ہی صوبائی حکومتیں، وزراء اعلیٰ سمیت فوری طور پر کام کرنا بند کر دیں گی۔

(۲) انتخابات

قومی اسمبلی کے انتخابات ۸/ اکتوبر ۱۹۷۷ء اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ۱۰/ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو منعقد کیے جائیں گے۔

(۳) سینٹ

قومی یا صوبائی اسمبلیوں سے سینٹ کے تمام منتخب ارکان، جنہیں پہلے عام انتخابات کے بعد چنا گیا ہے، فوری طور پر اسی دن اپنے عہدہ سے دستبردار ہو جائیں گے، جس دن اسمبلیاں توڑ دی جائیں گی۔

(۴) عملدرآمد کونسل

(الف) اس سمجھوتہ پر دیانتدارانہ اور مکمل عملدرآمد کے لیے ایک عملدرآمد کونسل ہوگی۔ جسے آئندہ سطور میں کونسل کہا جائے گا۔ جو ایسے فرائض انجام دے گی اور ایسے اختیارات حاصل ہوں گے جن کی تفریح اس معاہدہ کے شیڈول "اے" میں کر دی گئی ہے۔

(ب) اس مقصد کے لیے عملدرآمد کونسل تاوقتیکہ انتخابات کے بعد صوبائی حکومتیں تشکیل نہ دے دی جائیں۔ صدر اور وفاقی حکومت کے وہ اختیارات استعمال کرے گی جو صدر، وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے درمیان موجود ہوتے ہیں۔

(ج) قانون ساز اسمبلی کوئی قانون نہیں بنائے گی۔ نہ ہی صدر یا کوئی کونسل کی منظوری کے بغیر کوئی آرڈیننس، ریگولیشن یا حکم جاری کریں گے۔

(د) کونسل کو نظر ثانی کے اختیارات حاصل ہوں گے اور ضرورت محسوس کرنے کی صورت میں کونسل تمام کلیدی عہدوں پر جن میں وفاقی اور صوبائی سیکرٹری ڈویژن اور محکموں کے سربراہ کی تقرری کرنے کی مجاز ہوگی۔ ان میں قانون نافذ کرنے والے ادارے، بشمول سیکورٹی اور تفتیش، ڈویژنل کمشنر، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی شامل ہیں۔ مزید برآں کونسل تمام کلیدی عہدوں کے لیے تقرریاں اور تبادلوں پر نظر ثانی کرے گی۔

(۵) صوبائی حکومتیں

چاروں صوبائی اسمبلیاں توڑ دینے کے بعد انتظامی اور قانون سازی کے تمام تر اختیارات کونسل کے کنٹرول میں ہوں گے۔ کونسل کے تابع اختیارات گورنر استعمال کریں گے۔ جنہیں سمجھوتہ میں شامل فریقین کی رائے سے مقرر کیا جائے گا۔

(۶) بلوچستان

سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے ۳۰ دن کے اندر اندر بلوچستان میں فوجوں کا پھیلاؤ ختم کردیا جائے گا اور انہیں بلوچستان میں واقع چھاؤنیوں میں واپس بلالیا جائے گا۔ عوام میں اعتماد بحال کرنے کے فوری اقدامات کیے جائیں گے کہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں تاکہ وہ انتخابات حصہ لے سکیں۔ ایسے تمام افراد کی بحالی کے لیے مالی اور انتظامی اقدامات کیے جائیں گے جو بلوچستان میں اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور اب تک حکومت کے آپریشن کے دوران جانیں دی ہیں، کسی شخص کو بھی خواہ وہ پاکستان سے باہر ہی کیوں نہ ہو یا پاکستان میں سے اپنے گھر کو واپس آتے ہوئے خوفزدہ یا تنگ کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

(۷) آزاد جموں وکشمیر

آزاد جموں اور کشمیر اسمبلی اور کونسل ۱۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو توڑ دی جائے گی جس کے ساتھ ہی موجودہ صدر، وزیراعظم اور وزراء اپنے عہدے چھوڑ دیں گے اور آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے مشورے سے ایک نگران صدر مقرر کیا جائے گا۔ جسے حکومت آزاد کشمیر کے تمام اختیارات دیئے جائیں گے۔ آزاد جموں اور کشمیر کے عبوری دستور میں یک طرفہ طور پر کی جانے والی ترامیم ختم کردی جائیں گی اور ۱۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو صدر اور آزاد کشمیر اسمبلی کے لیے نئے انتخابات کرانے ہوں گے۔ آل جموں اور کشمیر مسلم کانفرنس کی منظوری سے نیا الیکشن کمیشن مقرر کیا جائے گا۔

(۸) آئینی ترمیم

آئین پاکستان میں کی جانے والی وہ تمام ترامیم جو آئین کے تحت بنیادی حقوق متاثر کرتی ہیں، ہائیکورٹ کے اختیارات کو محدود کرتی اور ہائی کورٹ کی عدالتی قوت کے ضرر

رساں ہیں۔ جن کی نشان دہی اس سمجھوتہ کے شیڈول (ب) میں کی گئی ہے۔ فوراً ختم کردی جائیں گی۔

(۹) ہنگامی حالت کا خاتمہ

ہنگامی حالت کے اعلان کو فوری طور پر ختم کردیا جائے گا۔ تمام بنیادی حقوق لوٹا دیئے جائیں گے۔ انہیں محدود نہیں کیا جائے گا نہ ہی ختم یا معطل کیا جائے گا۔ نہ ہی سمجھوتہ پر عملدرآمد کے دوران ہنگامی حالت کے نفاذ کا دوبارہ اعلان کیا جائے گا تاوقتیکہ کونسل کی منظوری نہ حاصل کرلی جائے۔ نیز یہ ہنگامی حالت کونسل کی عائد کردہ حدود اور پابندیوں کے تابع رہے گی۔

(۱۰) ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس کا خاتمہ

سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس اور اس کے تحت بنائے گئے ضوابط اور جاری کیے جانے والے احکامات فوری طور پر ختم ہوجائیں گے۔ ان کے تحت قائم کیے جانے والے ٹریبونل ختم کیے جائیں گے۔ تاہم دشمن کی جائیداد سے متعلق ضوابط روبہ عمل رہیں گے۔ اس آرڈیننس یا رول کے تحت نظربند، سزایاب یا مقدمات میں ملوث افراد کو فوری طور پر رہا کردیا جائے گا۔ نیز زیر تفتیش یا زیر التوا مقدمات بھی ختم تصور ہوں گے۔ فریقین کے ایک ایک نمائندے پر مشتمل ایک کمیٹی دو ہفتے کے اندر تمام ایسے افراد کے مقدمات کا جائزہ لے گی جنہیں حکومت کی نظر میں اس پیراگراف کا فائدہ نہیں پہنچتا۔ اختلاف رائے کی صورت میں حتمی فیصلہ کے لیے معاملہ کونسل کے سامنے پیش ہوگا۔ جو اس پیراگراف کے تحت نہیں آئیں گے۔ انہیں عام عدالتوں میں مروجہ ضوابط اور شہادتوں کے ساتھ منتقل کردیا جائے گا۔

(۱۱) خصوصی عدالتیں اور ٹریبونل

تمام خصوصی عدالتیں اور خصوصی ٹریبونل جو کسی بھی قانون کے تحت بھی قائم کیے گئے ہیں، فی الفور ختم کردیئے جائیں گے۔ وہ تمام سیاسی کارکن جنہیں سیاسی وجوہ کی بنا پر ان عدالتوں اور ٹریبونل سے سزا ملی ہوگی، رہا کردیئے جائیں گے۔ اس نوعیت کے مقدمات جو خصوصی عدالتوں یا ٹریبونل کے سامنے زیر سماعت ہوں گے اور جو اس پیراگراف کے تحت پیش

آئے ان کا حکومت جائزہ لے گی۔ اگر مقدمہ جاری رکھنا متصور ہوا تو وہ عام فوجداری عدالت میں منتقل کر دیا جائے گا۔ جس پر مروجہ ضوابط کار اور قانون شہادت کے مطابق کارروائی ہوگی۔

(۱۲) آرمی ایکٹ ۱۹۵۲ء

سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی ایکٹ x ۱۹۷۷ء کے تحت آرمی ایکٹ میں کی گئی ترامیم ختم کر دی جائے گی اور اس قانون کے تحت فوجی عدالتوں سے جن کو سزائیں دی گئی ہیں، وہ رہا متصور ہوں گے، انہیں فی الفور رہا کر دیا جائے گا۔

(۱۳) سیاسی کارکنوں کی رہائی

(i) تمام سیاسی رہنما اور کارکن۔

(الف) امتناعی نظر بندی کے قوانین کے تحت نظر بند سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کو جن میں سیکورٹی آف پاکستان ایکٹ ۱۹۷۲ء تحفظ امن عامہ آرڈیننس، سندھ کرائمز کنٹرول ایکٹ، متعدد سیفٹی ایکٹ، آرڈیننس ریگولیشن اور مماثل قوانین بھی شامل ہیں۔

(ب) جنہیں تفتیش، پوچھ گچھ یا کسی بھی دوسری وجہ کی بنا پر پولیس یا کسی دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے نے حراست یا تحویل میں لے رکھا ہے۔

(ج) جن کے خلاف تعزیراتِ پاکستان کے تحت مقدمات درج کیے گئے ہیں۔

(د) جن کے خلاف مقدمات زیر سماعت ہیں۔

(ر) جنہیں انتخابی جرائم، انتخابات کے مطالبہ، انتخابی یا سیاسی سرگرمیوں کی بناء پر یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد سے اب تک سزا دی جاتی ہے رہا تصور کیے جائیں گے اور انہیں فوری طور پر چھوڑ دیا جائے گا۔ ان کے خلاف تمام مقدمات، وہ عدالتوں یا ٹریبونل میں زیر سماعت ہی کیوں نہ ہوں ختم کر دیئے جائیں گے۔ ان کی نقل و حرکت پر پابندی کے احکامات بھی واپس لے لئے جائیں گے اور جہاں ضروری ہوا لاء آفیسر یہ بیان دیں گے کہ زیر بحث مقدمہ میں ان کی ضرورت نہیں ہے خواہ یہ مقدمات اپیل کی سطح پر ہی کیوں نہ ہوں۔

(ii) سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کے خلاف نئے مقدمہ میں ملوث افراد کے خلاف کسی دوسرے قانون کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ تاکہ اس شق کو غیر موثر بنایا جاسکے۔ مقدمات قائم نہیں کئے جائیں گے، انہیں گرفتار نہیں کیا جائے گا، نہ ہی

انہیں نظر بند کیا جائے گا اور نہ ہی متذکرہ بالا قوانین کے علاوہ پہلے سے نظر بند زیر حراست اور

(iii) جہاں جہاں وفاقی یا صوبائی حکومت کا یہ نقطہ نظر ہو کہ اس شق کا فائدہ کسی شخص کو نہیں پہنچتا اور اسے یوں تحفظ نہیں دیا جاسکتا تو حکومت ایسے تمام افراد کی فہرست دو ہفتوں کے اندر ایک کمیٹی کے سامنے پیش کرے گی جو فریقین کے ایک ایک نمائندے پر مشتمل ہوگی۔ یہ کمیٹی ان مقدمات کا جائزہ لے گی اور یہ فیصلہ کرے گی کہ متعلقہ شخص کو یہ تحفظات یا فوائد مل سکتے ہیں یا نہیں۔ اختلاف رائے کی صورت میں معاملہ کونسل کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

(۱۴) امداد اور تعاون

تمام ایسے افراد کو معقول معاوضہ دیا جائے گا جو مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد احتجاجی تحریک یا گڑبڑ کی بنا پر شدید زخمی ہوئے۔ ان کی جائیداد تباہ ہوئی یا اسے نقصان پہنچا۔ نیز ان لوگوں کے قانونی ورثاء کو بھی معاوضہ دیا جائے گا۔ جنہیں نے جانیں دیں۔ معاوضے کا تعین کونسل کے مشورہ کے ساتھ حکومت کرے گی۔ یہ معاوضہ پارٹی تعلق سے بالاتر رہتے ہوئے متعین کیا جائے گا، ادا کیا جائے گا۔

(۱۵) ملک بدر کیے جانے والے افراد

وہ تمام پاکستانی جنہیں پاکستان سے باہر نکال دیا گیا ہے یا انہیں پاکستان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جا رہی انہیں پاکستان آنے کی اجازت ہوگی۔ ان کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ وہ تمام لوگ صوبوں میں زیر حراست لیے گئے ہیں اور انہیں اپنے صوبوں میں واپس لایا جائے گا اور کونسل کو اطلاع دینے کے بعد انہیں رہا کر دیا جائے گا۔

(۱۶) پابندیاں اور حدود باقی نہیں رہیں گی

کسی شخص کو اس بناء پر گرفتار، نظر بند نہیں کیا جائے گا نہ ہی اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی کہ اس نے انتخابات کے دوران سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا ہے، نہ ہی وہ دفعہ ۱۴۴ کے تحت پابندیاں عائد کی جائیں گی۔ یوں سیاسی سرگرمیوں اور لاؤڈ سپیکر پر پابندیاں برقرار نہیں رکھی جائیں گی۔

(۱۷) پریس

آزادی صحافت پر عائد تمام پابندیاں ختم تصور کی جائیں گی اور یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد جن اخبارات اور جرائد کے ڈیکلریشن منسوخ کردیئے گئے تھے، فوری طور پر بحال تصور کیے جائیں گے۔ پرنٹر، پبلشر اور صحافی جو زیر حراست ہیں فوری طور پر رہا کردیئے جائیں گے۔ ان کے پرنٹنگ پریس اور جائیداد اور ان سے وصول شدہ جرمانہ لوٹا دیے جائیں گے۔ اخبارات کے لیے سرکاری اور سرکاری تحویل میں موجود صنعتی اداروں، اشتہارات اور کاغذ کے کوٹہ میں تمیز ختم کردی جائے گی۔

(۱۸) سرکاری ذرائع ابلاغ

سرکاری ملکیت یا سرکاری تحویل میں موجود ذرائع ابلاغ میں خبروں اور نظریات کی اشاعت میں غیر جانب داری اور توازن قائم کیا جائے گا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن، پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات و جرائد پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد کی خبروں اور نظریات کے لیے قانون کے تحت برابر وقت اور مساوی رتبہ دیں گے۔ متذکرہ بالا ابلاغ کو سیاسی جماعتوں اور کارکنوں کی کردار کشی سے باز رہنا ہوگا۔ نیز وہ کونسل کے کنٹرول میں اور ہدایات کے تابع ہوں گے۔

(۱۹) ٹریڈ یونین

قانون کے مطابق تمام ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور ان پر عائد پابندیوں کو فوری طور پر ختم کردیا جائے گا۔ زیر حراست کسان اور مزدور رہنماؤں کو رہا کردیا جائے گا۔

(۲۰) الیکشن کمیشن

الیکشن کمیشن ایک چیئر مین اور چار ارکان پر مشتمل ہوگا جو پاکستان قومی اتحاد کے مشورہ سے مقرر کیے جائیں گے۔ الیکشن کمیشن کو ایسے افراد اور ملازمین کے تقرر کا اختیار حاصل ہوگا جنہیں وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے ضروری تصور کرے۔ کمیشن کو نظم وضبط کی خلاف ورزی کرنے، بدعنوانیوں، غیر قانونی حرکتوں کے خلاف تادیبی کارروائی کا اختیار بھی حاصل ہوگا۔

ماخذ: روزنامہ وفاق لاہور، اشاعت ۱۴، ۱۶، ۱۷ اور ۱۸ جولائی ۱۹۷۷ء

ضمیمہ ۸

دعوت اسلامی کی تشکیل

پاکستان میں محبت رسولؐ کے فروغ اور لوگوں کو سیرت طیبہ پر عمل پیرا کرنے کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی نے ۱۹۸۱ء میں اپنی رہائش گاہ پر علمائے کرام کا ایک اجلاس بلایا، جس کی صدارت علامہ سید احمد سعید کاظمیؒ نے کی اور اس میں مفتی وقار الدینؒ، عبدالمصطفیٰ الازہری، علامہ ارشد القادری سمیت بہت سے علمائے کرام شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ نوجوانوں میں عشق رسولؐ پیدا کرنے کے لیے ایک تنظیم قائم کی جائے، جس کا بنیادی کام لوگوں کو حضور پر نورؐ کی سنت پر عمل کرنے کی ترغیب دینا ہوتا کہ پاکستانی معاشرے میں حضور اکرمؐ کی سنت سے دوری کا جو رجحان پھیلتا جارہا ہے اس کو روکا جاسکے اور نوجوانوں کو سیر نبویؐ کے سانچے میں ڈھالنے کا انتظام ہو۔ ہر جگہ درود وسلام کی صدائیں گونجیں۔

اس تنظیم کا نام دعوت اسلامی تجویز کیا گیا اور مفتی وقار الدین کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ اس کام کا آغاز کریں اور پھر انہیں اس کام کے لیے جو بہت موزوں نوجوان نظر آئے، یہ کام اس کے سپرد کردیا جائے۔ ان دنوں مفتی وقار الدینؒ کے پاس مولانا الیاس قادری زیر تعلیم تھے۔ انہوں نے مولانا شاہ احمد نورانی سے اجازت لے کر مولانا الیاس قادری کو دعوت اسلامی کا امیر مقرر کیا۔ آج مولانا شاہ احمد نورانی کا لگایا ہوا دعوت اسلامی کا پودا تناور درخت بن چکا ہے۔ لاکھوں نوجوان دعوت اسلامی سے وابستہ ہیں۔ ہر سال صوبائی، ملکی اور بین الاقوامی سطح کا باقاعدہ سالانہ سہ روزہ اجتماع منعقد ہوتا ہے، جس میں لاکھوں، ہزاروں افراد شریک ہوتے ہیں۔

ماخذ:

۱۔ قیصر، سید محمد حفیظ، ایک عالم ایک سیاستدان: شاہ احمد نورانی صدیقی، کراچی ۲۰۰۱ء
۲۔ گفتگو ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی

ضمیمہ ۹

منشور جمعیت علمائے پاکستان (۱۹۸۶ء و مابعد)

پیش لفظ

برصغیر پاک و ہند میں اہلِ سنت و جماعت کے عقیدہ و مسلک کی مسلسل ساڑھے گیارہ سو سال حکمرانی رہی ہے۔ اس طویل عرصے میں اہلِ سنت و جماعت کا تشخص بطور قوتِ حاکمہ کے ہمیشہ یہ رہا کہ زیرِ تصرف مملکت میں قوتِ اقتدار کا مقصد اوّلین شریعت محمدیؐ کی حکمرانی اور اعلائے کلمۃ الحق۔

دورِ زوال میں جب مسلمانوں کے اندر قبائلی اور علاقائی تعصبات بھڑک اٹھے تو قوت اجتماعیہ میں زبردست دراڑیں پیدا ہوگئیں۔ مرکز کمزور ہوگیا اور صوبہ جات عملاً مطلق العنان ہوگئے۔ اس خانہ جنگی اور باہمی آویزش نے اقتدار کے لیے چپقلش پیدا کردی اور بنیا، برہمن، فرنگی اور غدارانِ ملت کے گٹھ جوڑ نے کہیں میر جعفر، لارڈ کلائیو اور امی چند کی ارواحِ خبیثہ کی شکل میں ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں ملتِ اسلامیہ کے نمائندہ سراج الدولہ کی شکست کا سامان فراہم کیا، تو ۱۷۹۹ء میں لارڈ ولزلی (فرنگی) پورنیا (بنیا برہمن)...... اور میر صادق (غدارِ ملت) کے گٹھ جوڑ نے اسلام کے مجاہد ٹیپو سلطان شہید کے مقابلے میں آکر حق و باطل کے معرکہ میں باطل کی ہمنوائی کی۔ علیٰ ہذا القیاس ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے بہادر شاہ ظفر کے مقابلے میں غدارانِ ملت مرزا الٰہی بخش، جاٹ مل (بنیا برہمن) اور لارنس نکلس وغیرہ (فرنگی) کے گٹھ جوڑ نے ابلیسی کردار ادا کر کے سقوطِ دہلی کے میدان کو ہموار کیا۔

جنگ آزادی میں علامہ فضل حق خیر آبادیؒ، احمد اللہ شاہ مدراسیؒ اور جنرل بخت خان جیسے شمع رسالت کے پروانوں نے باطل قوتوں کا مقابلہ کیا۔ اس کے بعد آج تک ایک طرف علامہ فض حق خیر آبادی۔ کے جانشینوں نے فرنگی استعمار کو ختم کرنے کے لیے جہدِ مسلسل سے مجاہدانہ کردار ادا کیا اور دوسری طرف فرنگی کے حامیوں نے استعمال کے وفادار اجیروں کی طرح

غدر و نفاق کا پارٹ ادا کیا۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور اس کے جانشینوں نے فرنگی کی حمایت کی اور علامہ فضل حق خیر آبادیؒ کے نقشِ قدم پر چلنے والے مجاہدوں نے باطل قوتوں کا مقابلہ، کیا اہلِ حق وصداقت کی یہ جدوجہد قیام پاکستان تک اہل سنت وجماعت کے ماتحت جاری ہی، حتیٰ کہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت احمد رضا خان بریلویؒ ان کے رفقاء اور خلفاء نے اسے سنی کانفرنس کے نام سے آگے بڑھایا۔ مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہم نے مسلمانوں کے جداگانہ وجود اور امتیازی تشخص کے لیے اتسیلاء وطن اور حق خود ارادیت کے نام سے تحریک کا آغاز کیا جو بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوئی۔ اس کے مقابلے میں مولوی اسماعیل دہلوی کے جانشینوں نے انگریز سے معاملات کے بعد ہندو کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا اور عصر حاضر میں جمعیت علمائے ہند نے موہن داس کرم چند گاندھی کے ساتھ مل کر دین کے بجائے وطن کو اساسِ اجتماعیت قرار دیا اور برصغیر کے چالیس کروڑ مسلموں اور غیر مسلموں کو متحدہ قومیت میں ضم کر کے اسلام کی بالادستی اور برتری کو عملاً ترک کردیا۔ ان نادانوں نے سابرمتی آشرم کے سوامی مسٹر گاندھی کی پڑھائی ہوئی منطق میں مسلم اکثریت کے صوبوں کو بھی فیڈریشن میں شامل کر کے بے اثر بنا دینا چاہا۔ دفاع، خزانہ، رسل و رسائل اور مواصلات کو مرکز کے سپرد کردیا جائے تو بنگال، آسام، پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کی حیثیت میونسپل کمیٹیوں کی سی رہ جاتی ہے اور یوں دس کروڑ مسلمانوں کی تباہی کا سامان کرنا چاہا۔ اگر پاکستان وجود میں نہ آتا تو دس کروڑ پاکستانی مسلمانوں کا بھی وہی حشر ہوتا آج بارہ کروڑ بھارتی مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔

متحدہ قومیت کے اس جاہلانہ تصور کا تجزیہ کرتے ہوئے حضرت علامہ اقبالؒ نے جب مولوی حسین احمد مدنی کا یہ بیان پڑھا کہ،

''قومیں اوطان سے بنتی ہیں''

تو کرب واضطراب میں تلملا کر مندرجہ ذیل اشعار ان کی زبان پر آگئے۔

عجم ہنوز نہ داند موزِ دیں ورنہ
زدیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر زمقامِ محمد عربی است

بمصطفیٰ بہ رساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اونہ رسیدی تمام بولہبی است

ہندو فرقوں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت بنانے میں کارلیس کے علاوہ فرنگی استعمار کے گماشتوں اور نمائندوں، بالخصوص لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ریڈکلف نے بھی تحریک پاکستان کی مخالفت کرتے ہوئے وہ گھناؤنا کردار ادا کیا جو تاریخ عالم میں فرنگی قوم کے لیے مستقلاً روسیاہی کا باعث بنا رہے گا۔

علماء اہل سنت جماعت نے اجمیر شریف، مراد آباد، لکھنؤ، دہلی اور بلاآخر ۲۶، ۲۷، ۲۸ اپریل ۱۹۴۶ء کو بنارس میں سنی کانفرنس منعقد کرکے، امت محمدیہ کو خیر الامم کا مستحق بنانے کے لیے اپنی مساعی جاری رکھیں۔ بنارس میں سنی کانفرنس اس ساری جدوجہد کا قصہ عروج تھا جس میں محدث علی پوری، پیر سید جماعت علی شاہ، شیخ الاسلام صاحبزادہ حافظ محمد قمر الدین سیالویؒ، پیر آف گولڑہ شریف، مبلغ اسلام علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ، صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادیؒ، سید محمد احمد محدث کچھوچھوی، صدر الشریعت مولانا امجد علیؒ (مصنف بہار شریعت)، غزالی دوراں علامہ سید احمد سعید کاظمی۔، ابوالحسناب مولانا محمد احمد قادریؒ، مولانا عبدالحامد بدایونی قادری۔، مولانا ابوالبرکات سید احمد قادریؒ جیسے عظیم رجالِ ملت نے برصغیر میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے احیاء اور سطوتِ ماضیہ کے قیام کے لیے تحریک پاکستان کی قلندرانہ انداز میں حمایت کا اعلان کرتے ہوئے یہاں تک فرمادیا کہ:

> ''خدانخواستہ، اگر قائداعظم محمد علی جناحؒ بھی مطالبۂ پاکستان سے ہٹ جائیں تو بھی ہم اس مطالبے سے دستبردار نہیں ہوں گے۔''

نیز اس موقع پر مملکتِ پاکستان کے لیے آئین وقانون مرتب کرنے کی خاطر ایک تیرہ رکنی کمیٹی بھی قائم کردی۔

بنارس سنی کانفرنس کے بعد اس کی تائید میں کراچی میں سنی کانفرنس منعقد ہوئی اور اس طرح سے برصغیر کے سواد اعظم اہل سنت و جماعت نے قیام پاکستان کے لیے عزم بالجزم کا اظہار کردیا۔ قیام پاکستان کے بعد سنی کانفرنس کو جمعیت علماء پاکستان میں ملا دیا گیا۔ اور ۱۹۴۸ء میں ایک عظیم الشان کنونشن میں جماعت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کے مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادریؒ بانی صدر، اور غزالی دوراں علامہ سید احمد سعید کاظمیؒ ناظمِ اعلیٰ منتخب ہوئے۔

جمعیت علماءِ پاکستان نے دولتِ خدادادِ پاکستان میں مقامِ مصطفیٰ کے تحفظ اور نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ جہادِ کشمیر ۱۹۴۷ء و ۴۸ء، ۴۹ء کی قرارداد مقاصد، ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت اور ۱۹۵۶ء میں تدوین دستور پاکستان کے لیے اس نے عظیم الشان پیش کیں۔ قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اور دار و رسن تک پہنچے۔ اس کے بعد ملک کے اندر شہری آزادیوں کی بحالی اور شریعت محمدی ﷺ کی بالادستی کے لیے سارے ملک میں کانفرنسیں منعقد کیں۔

۱۹۷۰ء میں جب سرخ استعمار کی شہ پر کمیونسٹوں نے اودھم مچایا اور ''ایشیا سرخ ہے، ایشیاء سرخ ہے'' کے نعرے لگانے شروع کیے، تو ۱۹۷۰ء میں دارالسلام (ٹوبہ ٹیک سنگھ) کے اندر ایک آل پاکستان سنی کانفرنس منعقد کرکے اشتراکی فتنے کی تہ بہ تہ سازشوں کو بے نقاب کرکے انہیں فنا کے گھاٹ اتار۔ اس سال جمعیت علماء پاکستان کو وسیع پیمانے پر منظم کیا گیا۔ شیخ الاسلام حافظ خواجہ محمد قمرالدین سیالویؒ اس کے صدر اور علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی نائب صدر منتخب ہوئے اور مولانا سید محمود احمد رضوی کو ناظمِ اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ اسی سال عمومی انتخابات میں جمعیت علماء پاکستان نے حصہ لیا اور آٹھ سیٹیں حاصل کرلیں۔ جمعیت علماء پاکستان نے تھوڑے عرصے میں اتنی اہمیت حاصل کرلی کہ وزارتِ عظمیٰ کے انتخابات میں متحدہ جمہوری محاذ نے علامہ شاہ احمد نورانی کو اپنا متفقہ امیدوار نامزد کیا۔

۱۹۷۴ء میں تحریکِ تحفظ ختم نبوت کے دوبارہ شروع ہرنے پر علامہ شاہ احمد نورانی، مولانا محمود احمد رضوی، مولانا عبدالستار خان نیازی اور ان کے رفقاء نے شاندار خدمات سرانجام دیں۔ بالآخر آئینی ترمیم کی شکل اختیار کرلی اور مسلمان کی تعریف میں عقیدۂ خاتمیت کو جزو لازم قرار دیا گیا۔ آج تک اسی ترمیم نے کفر و اسلام کے مابین ایک واضح حد فاصل قائم کر رکھی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں جب تحریک نظام مصطفیٰ چلی تو اس میں جمعیت علماء پاکستان نے سب سے زیادہ قربانیاں پیش کیں اور جب اکثر جماعتوں نے اسلام یعنی نظام مصطفیٰ کو منتہائے مقصود بنانے کے بجائے اسلام آباد کو اپنی منزل قرار دے دیا اور نامزد وزارتوں میں شامل ہوگئے تو جمعیت علماء پاکستان اپنے اصول پر قائم رہی اور وزارتوں کی پیش کش کو پائے حقارت سے ٹھکرادیا۔ علیٰ ہذا القیاس ۱۹۸۱ء میں جب صدر مملکت نے مجلس شوریٰ نامزد کی اور صوبہ جات اور مرکز میں وزارتوں کا تقرر کیا [illegible] موقع پر بھی جمعیت علماء پاکستان

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

کہہ کر، عطائے تو، بہ لقائے تو کا نعرۂ مستانہ بلند کیا اور آزمائش کی ہر گھڑی میں یہ جماعت کندن بن کر نکلی۔ ۱۹۸۵ء سے لے کر آج تک آمر مطلق نے ریفرنڈم اور عمومی انتخابات کا جو ڈھونگ رچایا اسے ایک لمحہ کے لیے وقعت نہ دی اور اسے ڈھونگ سمجھا۔

۱۹۸۵ء میں صدر کے خود ساختہ آئین کے ماتحت قائم شدہ حکومت اپنی پانچ سالہ میعاد پوری کرنے پر مصر ہے، اپوزیشن ان انتخابات کو خلاف آئین سمجھ کر بلا تاخیر آئین ۱۹۷۳ء کے ماتحت نئے انتخابات کا مطالبہ کر رہی ہے۔ جمعیت علماء پاکستان اس مطالبے میں سب سے بڑھ کر عزم بالجزم اور کوہ شگاف ارادے پر ڈٹی ہوئی ہے۔ ملک میں ساری جدوجہد کے اندر جو جماعتیں حصہ لے رہی ہیں انہیں تین طبقات میں مرقم کیا جاسکتا ہے۔

اول وہ گروہ جو دل سے نظریہ پاکستان اور نظریہ اسلام کو نہیں مانتا، اوٹ پٹانگ تاویلیں کرتا ہے، رائے عامہ کے دباؤ اور خود سے کھلم کھلا اپنے کفر کا اعلان نہیں کرسکتا۔ اس طبقے کو

کافر نتوانی، شد، ناچار مسلماں شد

کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا: طبقہ ان جماعتوں پر مشتمل ہے جو دین کو آقا نہیں مانتا بلکہ اسے اپنی پشت سیاسی اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاست، معیشت، تہذیب، تمدن، معاشرت اور بین الاقوامی نظریات پر اسلام کی حکمرانی نہیں۔ جب یہ طبقہ مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو اسلام کی دہائی دیتا ہے، لیکن جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو اسلام کو اپنے پروگرام سے خارج کر دیتا ہے۔

تیسرا: طبقہ ان جماعتوں پر مشتمل ہے جو زندگی کے ہر مسئلے میں اسلام کو حاکم مانتا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ اگر بعض قرآن کو منبع حق وصداقت مانتے ہیں تو سنت کو خارج کر دیتے ہیں۔ جو سنت کو کتاب اللہ کے ساتھ شامل کرتے ہیں تو فقہ کو خارج کر دیتے ہیں اور جو فقہ کو بھی شامل کرتے ہیں تو اس میں اجماع امت کو اہمیت نہیں دیتے، کچھ سنت صدیقینؓ کے انکاری ہیں تو کچھ سنت خلفائے راشدینؓ کے، کچھ

شیخین کریمین کو مانتے ہیں، مگر یہ خارجی دوسرے دو کو نہیں مانتے۔ کچھ ایک کو مانتے ہیں مگر رافضی بن کر پہلے تین خلفاء کو نہیں مانتے۔ کچھ صحابہ کرامؓ کو معیار حق نہیں مانتے، کچھ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے اجتہاد کو وقعت نہیں دیتے اور بعض بدبخت ایسے ہیں جو صلحائے امت، سلف صالحین اور اولیاء کاملین کے طرز زندگی سے انحراف کرتے ہیں اور یوں اہل اسلام میں ان تحرفی، انحرافی، اعتزالی اور خروجی طبقات نے انتشار، افتراق اور باہم آویزی کی مصیبت پیدا کر رکھی ہے۔ اس لیے یہ لوگ کسی طرح بھی ملت کے اجتماعی مفاد کے ترجمان نہیں ہوسکتے۔

ان سب طبقات سے ہٹ کر سوادِ اعظم اہل سنت و جماعت ملک کی غالب اکثریت پر مشتمل ایسی تنظیم ہے جو سیاست میں خلافت اعلیٰ منہاج نبوت، معیشت میں مساوات محمدیؐ اور اعتقادی لحاظ سے مقام مصطفیٰؐ کے تحفظ اور نظام مصطفیٰؐ کے نفاذ کی علمبردار ہے اور کتاب، سنت رسولؐ، سنت صدیقینؓ، سنت خلفائے راشدینؓ، سنت تبع تابعینؒ، سنت شہداءؓ، سنت صالحینؒ اور آئمہ اہل بیتؓ، آئمہ فقہؒ، آئمہ علم کلامؒ، آئمہ حدیثؒ، آئمہ تصوفؒ اور اجماع امت تمام کو آئینی، قانونی، دینی، تہذیبی، تمدنی، معاشی، معاشرتی اور بین الاقوامی معاملات و مسائل میں اپنے لیے وجوب الاتباع تصور کرتے ہیں۔ یہ ملک کے اندر ایک روحانی، فلاحی مملکت کو اپنا نصب العین قرار دے چکی ہے۔ اس کا ماٹو:

کس بنا شد درجہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبین ایں است و بس

الغرض جمعیت علماء پاکستان ہی وہ جماعت ہے جو عصر حاضر کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور ملک کی سالمیت، وحدت واستحکام کے ساتھ ساتھ ایک حق وصداقت کی علمبردار، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر معاشرہ قائم کرکے اقوام عالم کی قیادت وسربراہی اور عالم اسلام کی اخوت کا سامان فراہم کرسکتی ہے۔ آئندہ صفحات میں اس کا منشور پیش کیا جاتا ہے۔

محمد عبدالستار خان نیازی

منشور جمعیت علماءِ پاکستان

ابتدائیہ

جمعیت علماء پاکستان کے اکابرین اپنے اس عقیدے کا اعلان کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور اسی کا حکم پوری انسانیت کے لیے جواب التعمیل ہے۔

حضورِ اکرم، نورِ مجسم حضرت محمدؐ اللہ کے آخری نبی ہیں جن کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا۔ عشقِ مصطفیٰؐ ہمارے ایمان کا سرمایہ ہے اور مقامِ مصطفیٰؐ کا تحفظ اور عظمت رسولؐ کی پاسبانی ہمارا دینی فریضہ ہے۔

ہم پاکستان میں نظام مصطفیٰؐ کے نفاذ کے علمبردار ہیں، جس کی بنیاد خلاف علیٰ منہاج النبوت (یعنی خلافت راشدہ)

ہمارے نزدیک اسلام حضورِ اکرمؐ کی تعلیمات کو زندگی اور آخرت کے ہر پہلو میں ہر لحاظ سے غیر مشروط طور پر اپنانے اور نافذ کرنے کا نام ہے۔ حضورؐ کی تعلیمات کی تعبیر سے متعلق ہر اختلاف سلف صالحین کی فقہی رہنمائی میں اجماع سے طے کرانا واجب ہے۔ قرآن مجید یا اسلام کی کوئی ایسی تعبیر قابل قبول نہیں ہوگی جو خاتم النبیینؐ یا فقۂ حنفیہ سے انحراف کر کے پیش کی جائے۔

ہم پاکستان کے روشن مستقبل پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ یہ سرزمین اللہ کے فضل و کرم سے قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ ان وسائل کو ملک اور قوم کی بہتری کے لیے جاں فشانی اور دیانت داری سے بروئے کار لانا ضروری سمجھتے ہیں جنہیں بدقسمتی سے پامال کیا جارہا ہے۔ لہٰذا ہم عہد کرتے ہیں کہ:

ہم اس ملک میں نظامِ مصطفیٰؐ کو بلا تاخیر نافذ کریں گے تاکہ تمام ناروا پابندیوں، خوف و ہراس، معاشی بدحالی اور معاشرتی حقوق کا تحفظ ہوسکے۔

ا۔ مقاصد

جمعیت علماء پاکستان اس ملک میں نظامِ مصطفیٰؐ کے نفاذ کے لیے کوشاں ہے اور اسی نے پوری قوم کو اس مقدس پروگرام سے سب سے پہلے واضح طور پر آگاہ کیا۔

اس منزل کے حصول کے لیے ہم درج ذیل بنیادی مقاصد کی جدوجہد کا عزم کرتے ہیں:

۱۔ پاکستان میں قرآن و سنت کی مکمل پابندی کی جائے گی اور ہر مسلمان کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اسلامی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرسکے، تاکہ ایک مثالی اسلامی معاشرہ تشکیل پاسکے۔

۲۔ ملک کے تمام باشندوں کو مساوی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جائے گی۔

۳۔ ملک کے مختلف حصوں میں بسنے والوں کے مابین محبت اور اخوت اور ہمدردی کے جذبات بیدار کیے جائیں گے تاکہ نسلی، لسانی، علاقائی، فرقہ وارانہ اور طبقاتی تعصبات کا خاتمہ ہو۔

۴۔ ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کیا جائے جس میں ہر فرد سے انصاف ہو اور ملک کے مختلف حصوں کے باشندوں کے درمیان پایا جانے والا موجودہ تفاوت کم سے کم مدت میں ختم ہوجائے۔

۵۔ ظلم واستحصال اور ناانصافی کی ہر شکل کو مٹایا جائے گا۔

۶۔ زمین، محنت، سرمایہ اور دیگر ذرائع پیداوار کو تمام افراد کی بہتری کے لیے کام میں لایا جائے گا۔

۷۔ روز مرہ کے استعمال کی اشیاء کی قیمتوں کو عام آدمی کی قوتِ خرید کے اندر رکھنے کے لیے جامع منصوبہ بندی کی جائے گی۔

۸۔ ہر شہری کو غذا، لباس، مکان، تعلیم اور علاج کی فراہمی کی ضمانت دی جائے گی تاکہ ایک اسلامی فلاحی مملکت تسلیم پاسکے۔

۹۔ ہر شہری بلا امتیاز عہدہ و مرتبہ قانون کی نظر میں یکساں ہو۔ ایک ایسی آزاد عدلیہ قائم کی جائے گی جو کسی دباؤ کے بغیر انصاف کے تقاضے پورے کرسکے۔

۱۰۔ خواتین کو شریعت کے مطابق ان کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی حقوق دیئے جائیں گے تا کہ وہ معاشرے کی تعمیر میں مردوں کے ساتھ ساتھ موثر کردار ادا کرسکیں۔

۱۱۔ ہماری یہ انتہائی کوشش ہوگی کہ ملک کے تمام عہدوں پر وہی افراد فائز ہوسکیں جو بددیانتی سے پاک ہوں اور خود اپنی عملی زندگی ایمانداری، کفایت شعاری، عمدہ اخلاق اور سادہ بود و باش کا قابلِ تقلید نمونہ پیش کریں۔

۱۲۔ ایک ایسی آزادانہ خارجہ پالیسی اختیار کی جائے گی جو قومی امنگوں کے مطابق ملکی مفاد اور مکمل امن وسلامتی اور حقوق انسان کی ضامن ہو۔ مسلم ممالک کے ساتھ نہایت قریبی دوستانہ اور برادرانہ تعلقات کو فروغ دینے اور علماء اسلام کے اتحاد کو مضبوط تر بنانے کے لیے ایسے موثر اقدامات کیے جائیں گے تا کہ ایک ایسا اسلامی بلاک تشکیل پاسکے جسکی ایک مشترکہ پالیمنٹ ہو جو امت مسلمہ کے اجتماعی مفادات بالخصوص معاشی، سیاسی اور دفاعی معاملات سے متعلق ایک قابل عمل مشترکہ پالیسی وضع کرسکے۔

۱۳۔ جموں وکشمیر کے مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائے جائیں گے، تا کہ وہ اقوامِ متحدہ کی قرارداد کی روشنی میں آزادی کے ساتھ اپنے حق کا استعمال کرسکیں۔

۱۴۔ قبائلی علاقوں کے باشندوں کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق دیا جائے گا اور آزاد قبائل کی ترقی اور تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔

۱۵۔ طلباء اور نوجوانوں کے مسائل پر خصوصی توجہ دی جائے گی اور ان کے روزگار کا خاص نظام کا روضع کیا جائے گا۔

۱۶۔ ہر صحت منداور کام کے قابل شخص کے لیے روزگار کی فراہمی کا انتظام کیا جائے گا۔

۱۷۔ پاکستان میں معروف پارلیمانی طرزِ حکومت قائم کی جائے گی جو اسلامی شورائی نظام سے مطابقت رکھتی ہو جس کے انتخابات میں امیدواروں کے مقررہ حد سے زائد اخراجات پر پابندی ہوگی، اور ہر شخص اپنا حق رائے دہی مکمل آزادی سے استعمال کرسکے گا۔

۱۸۔ تمام عدالتیں اپنے فیصلوں میں شریعت محمدیؐ کی پابند ہوں گی۔

۱۹۔ مزارعین، زرعی، صنعتی مزدور، غیر ملک کاشت کار اور چھوٹے دکاندار جو اس ملک کا حقیقی سرمایہ ہیں، ان کے مسائل کے حل کو اوّلیت دی جائے گی۔

۲۰۔ ملکی انتظام کی موجودہ خرابیوں کو دور کر کے ایک ایسا انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے گا کہ اس کا ہر رکن دینی اور جمہوری تقاضوں کے مطابق قوم کا خادم بن کر اپنا فریضہ انجام دے سکے۔

۲۔ دستور:

۱۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی ان تمام ترامیم کو منسوخ کردیا جائے گا جن سے بنیادی حقوق متاثر ہوئے ہوں، یا وہ شریعت سے متصادم ہوں۔

۲۔ صدر، وزیر اعظم اور دیگر مرکزی اور صوبائی ارکانِ حکومت کے وہ تمام اختیارات ختم کردیئے جائیں گے جو حکومت میں نیابت اور امانت کے اسلامی اصولوں سے متصادم ہوں، یا جن کے ذریعے انہیں عام ملکی قوانین سے بالاتر قرار دیا گیا ہو۔

۳۔ اس امر کی ضمانت دی جائے گی کہ کسی شہری کی آزادی شواہد وثبوت کے بغیر سلب نہ کی جائے۔

۴۔ متناسب نمائندگی کے اصول پر ملک میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا جمہوری عمل جاری رکھنے کی ضمانت دی جائے گی۔

۵۔ صوبوں میں احساسِ محرومی ختم کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں گے۔

۶۔ اردو کو سرکاری زبان کے طور پر عملاً نافذ کیا جائے گا۔ عربی کو فروغ دیا جائے گا اور علاقائی زبانوں کو ان کا جائز مقام دیا جائے گا۔

۳۔ ملکی قوانین:

۱۔ غیر اسلامی اور غیر جمہوری قوانین منسوخ کردیئے جائیں گے۔

۲۔ عدالتی نظام میں اس طرح اصلاح کی جائے گی کہ ایک جامع موثر اور آزاد نظام عدل ہر شہری کو بلا تاخیر انصاف مہیا کرنے کی ضمانت دے سکے۔

۳۔ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے دستوری فیصلے کو موثر بنانے کے لیے فوری

طور پر ضروری قانونی قواعد وضوابط مرتب کیے جائیں گے۔

۴۔ شرعی اوامر اور نواہی کو قانونی شکل دے کر عملاً نافذ کیا جائے گا۔

۵۔ اسمگلنگ، منشیات کے کاروبار اور ملاوٹ کے مجرموں کو عبرت ناک سزا دی جائے گی۔

۴۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے اسباب کی تحقیقات:

ایک اعلیٰ اختیارات کا حامل عدالتی تحقیقاتی کمیشن قائم کیا جائے گا جو ۱۹۷۱ء کے سانحہ مشرقی پاکستان کی ذمے داری کا تعین کرے گا اور اس کے ذمہ دار افراد پر مقدمات چلا کر عبرت ناک سزائیں دی جائیں گی۔

۵۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تا ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کے معاملات کی تحقیقات:

ایک اعلیٰ اختیاراتی عدالتی کمیشن مقرر کیا جائے گا جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تا ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کی مندرجہ ذیل معاملات کی چھان بین کرے گا اور بدعنوانیوں کے مرتکب افراد پر حکومت مقدمہ چلا کر عبرت ناک سزا دے گی۔ تاکہ آئندہ اس قسم کی ملک دشمن حرکات کا ازالہ ہوسکے:

(الف) جو اختیارات عدالتِ عظمیٰ نے ۱۹۷۷ء میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو دیے تھے ان سے کس حد تک تجاوز کیا گیا اور کون افراد اس حد تک ملوث تھے؟

(ب) چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے دوبارہ انتخابات کیوں ملتوی کیے۔ اس التواء کے ذمہ دار کون تھے؟

(ج) سیاچین گلیشیئر پر بھارتی افواج نے کیوں اور کس طرح قبضہ کیا؟ اس سانحہ کے ذمہ دار کون افراد ہیں؟

(د) مارشل لاء کے دوران سیاسی اور غیر سیاسی سطح پر جو بھی ظلم زیادتی اور بدعنوانیاں کی گئی ہیں اس کی تحقیقات کی جائے گی۔

۶۔ انتظامیہ:

۱۔ انتظامیہ کو نظام مصطفیؐ کی ضروریات اور تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ضروری اصلاحات اور تعمیری تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں گی۔

۲۔ سرکاری ملازموں کو ملازمت کا تحفظ دیا جائے گا اور کسی بھی ملازم کو صفائی کا موقع دیئے بغیر ملازمت سے علیحدہ نہیں کیا جائے گا۔ نئے انتظامی ڈھانچے میں ماہرین فن اور پیشہ ورانہ قابلیت کے افراد کو اہمیت دی جائے گی۔ فنی اور پیشہ ورانہ وزارتوں اور محکموں کے اعلیٰ عہدیدار، ترجیحی بنیاد پر متعلقہ فن اور پیشے سے لیے جائیں گے۔

۳۔ سرکاری محکموں سے رشوت، خیانت، نااہلی، کام چوری اور دوسری بدعنوانیوں کو دور کرنے کے لیے فوری اور موثر تدابیر اختیار کی جائیں گی۔

۴۔ تنخواہوں کا تناسب ایک اور پانچ کے دائرے میں لایا جائے گا اور ماہرین اقتصادیات کا ایک مستقل کمیشن قائم کیا جائے گا جو اشیائے صرف کی قیمتوں کے پیش نظر حسب ضرورت تنخواہوں اور دیگر مراعات کی نئی شرح مقرر کرنے کا کام انجام دیتا رہے گا۔ کم تنخواہ پانے والے اہل کاروں کی تنخواہوں اور دیگر مراعات مثلاً رہائش وغیرہ کے انتظامات اور پنشن کی رقوم کا تعین اس طرح کیا جائے گا کہ ہر ملازم اور پنشنز باعزت اور باوقار زندگی بسر کرسکے۔

۵۔ انتظامیہ کے اخراجات کو کم کیا جائے گا۔ انتظامیہ کے افسران پر اپنی جائز آمدنی کے مطابق سادہ طرز زندگی اختیار کرنے کی پابندی ہوگی۔

۶۔ موجودہ گریڈوں کی تعداد کم کرکے ہر درجے میں تنخواہ، الاؤنس اور دیگر مراعات کا تعین اس طرح کیا جائے گا کہ تمام ضروریات زندگی عزت، سہولت اور کفایت شعاری کے ساتھ بآسانی پوری کی جاسکیں۔

۷۔ سول سروس اکیڈمی کے نصاب میں اس طرح ترمیم کی جائے گی کہ وہاں سے تربیت پاکر نکلنے والے افراد اپنے کو قوم کا خادم تصور کریں۔

۸۔ تنخواہ اور الاؤنس کے علاوہ رہائش، اندرونِ ملک علاج اور صرف سرکاری کام لیے ذرائع آمد ورفت وسفر کی سوا کوئی فرد بشمول صدر، وزیراعظم کسی اور ذاتی مراعات کا مستحق نہیں ہوگا۔

۹۔ (الف) اعلیٰ صوبائی اور وفاقی ملازمین کا تقرر پبلک سروس کمیشن کے ذریعے قابلیت اور استحقاق کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

(ب) ملازمین کے تقرر میں اہمیت اور تجربے کے ساتھ ساتھ اچھی شہرت دینی شعور عمدہ کردار اور خدا ترسی کو بھی پوری اہمیت دی جائے گی۔

(ج) صوبائی انتظامیہ کی آسامیوں پر متعلقہ صوبے کے افراد تعینات کیے جائیں گے۔ نیز ملازمتوں کی اس طرح ازسرِ نو تنظیم کی جائے گی کہ کسی ایک سروس کے افراد کو انتظامیہ میں بالادستی حاصل نہ ہو۔

۱۰۔ (الف) پولیس کے محکمے کو انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے ایک عوام دوست، خادم خلق اور فرض شناس ادارہ بنادیا جائے گا تاکہ پولیس کے ظلم اور زیادتیوں کی روک تھام ہوسکے۔

(ب) پولیس ملازمین کی معاشی حالت کو اس حد تک بہتر بنایا جائے گا کہ ہر ملازم باعزت، باوقار اور دیانت دارانہ زندگی بسر کرنے کے علاوہ اپنا فرض منصبی بلا خوف و لالچ دیانت داری اور جاں فشانی سے ادا کرسکے اور رشوت کا سدباب ہوسکے۔

(ج) پولیس عملے کی ترقی میں محکمہ جاتی امتحانات اور کارکردگی کے ساتھ اخلاق، کردار اور اسلامی، دینی شعور کو اہمیت دی جائے گی۔

۱۱۔ جیل خانہ جات کو قیدیوں کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کے لیے متعلقہ قوانین کو ازسرِ نو مرتب کیا جائے گا تاکہ جیل سے رہائی کے بعد قیدی اچھے شہری بن سکیں۔

۱۲۔ پاکستانی سفارت خانوں کی اصلاح کے لئے موثر اقدامات کیے جائیں گے۔ سفارت خانوں میں ایسے افراد کا تقرر کیا جائے گا جو نہ صرف امور خارجہ کے ماہر ہوں بلکہ اپنی سفارتی ذمہ داریاں بہ حسن وخوبی ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں اور پاکستان اور اسلام کی صحیح ترجمانی کرسکیں۔ سفارتی افسران بیرون ملک رہنے والے پاکستانیوں کی صحیح رہنمائی اور جائز مدد کرنے کے پابند ہوں گے۔

۷۔ احتسابِ عمومی:

حکومت، انتظامیہ کو خرابیوں سے پاک رکھنے کا ایک ایسا نظام قائم کرے گی کہ تحدید وتوازن کے ساتھ ہر شعبے کا، بشمول پارلیمنٹ، انتظامیہ اور عدلیہ اور مسلح افواج سے وابستہ افراد کے احتساب کا باضابطہ سلسلہ جاری رہے۔

۱۔ ایک محکمہ احتساب عمومی قائم کیا جائے گا، جس کا سربراہ عہدے کے لحاظ سے سپریم کورٹ کے جج کے برابر ہوگا اور جسے پارلیمنٹ مقرر کرے گی اور وہ اسی کے سامنے جواب دہ ہوگا اور اس کے قواعد وضوابط اسلامی شریعت کے مطابق خود محکمۂ احتساب عمومی مرتب کرے گا۔

۲۔ سرکاری ملازمین کے مالی حیثیت اور کردار کا مسلسل جائزہ لینے کا اہتمام احتساب عمومی کرے گا۔ ایسے افراد کا احتساب کیا جائے گا جو اپنی حیثیت سے بلند معیار زندگی بسر کررہے ہوں گے، یا ان کا کردار مطلوبہ معیار سے گرا ہوا ہو۔

۳۔ محکمہ احتساب کی شاخیں ملک بھر میں قائم کی جائیں تاکہ سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے اختیارات کے ناجائز وغلط استعمال کی شکایات کی سماعت وتفتیش ہر جگہ بہ آسانی ہوسکے۔

۴۔ چیف جسٹس آف پاکستان کے سفارش کردہ پینل میں سے پارلیمنٹ ایک ایسا ٹریبونل تشکیل دے گی جو ان سربراہانِ حکومت، وزراء، عوامی نمائندوں اور سرکاری ملازمین کے خلاف مقدمات کی سماعت کرے گا۔ جو محکمۂ احتساب عمومی ان کے خلاف ٹریبونل میں پیش کرے۔ اس ٹریبونل کو عدالتِ عالیہ کے اختیارات ہوں گے۔ اس کے فیصلے کے خلاف اپیل میں صرف سپریم کورٹ میں کی جاسکے گی۔

۸۔ عدلیہ

ایک با اختیار اور آزاد عدلیہ کے قیام کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر عمل میں لائی جائیں گی:-

۱۔ (الف) صدر مملکت چیف جسٹس آف پاکستان کی تقرری سپریم کورٹ کے جج صاحبان میں سے سنیارٹی اور اہلیت کی بنیاد پر کریں گے۔

(ب) ہائی کورٹ کے جج کی تقرر کے لیے متعلقہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور چیف جسٹس آف پاکستان، تین ناموں کی سفارش کریں گے جن میں سے صدر مملکت کسی ایک کا تقرر بطور جج ہائی کورٹ کرے گا۔ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا تقرر سنیارٹی اور اہلیت کی بنیاد پر ہوگا۔

۲۔ عدلیہ اپنا بجٹ خود تیار کرے گی اور وفاقی حکومت مطلوبہ اخراجات کو پورا کرنے کی ذمے دار ہوگی۔

۳۔ عدلیہ انتظامیہ سے کلیتہً علیحدہ ہوگی۔

۴۔ جوڈیشنل اکادمی قائم کی جائے گی جس میں سیشن جج اور عدالتوں کے دیگر عملے کے لیے تربیت نصاب کا اہتمام کیا جائے گا۔

۵۔ مقامی سطح پر چھوٹے تنازعات کے فیصلوں کے لیے پنچائتی نظام میں مناسب اصلاحات کی جائیں گی۔

۶۔ ایک مستقل قانونی کمیشن قائم کیا جائے گا جو عدالتی نظام وضوابط اور قوانین کو اسلام کے اصولوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے سفارشات کرے گا۔

۷۔ ہر عدالت پر لازم ہوگا کہ وہ اس کے سامنے پیش ہونے والے مقدمے کی اپیل کا فیصلہ تین ماہ کے اندر کردے۔

۸۔ احکام شرعی کی تشریح کے لیے فقہی بورڈ قائم کیا جائے گا۔ یہ بورڈ فقہ اسلامی کے ماہرین پر مشتمل ہوگا۔ جن کا تقرر پارلیمنٹ کی منظوری سے کیا جائے گا۔

۹۔ اقتصادی نظام

جمعیت علماءِ پاکستان کا یہ عقیدہ ہے کہ پوری کائنات کا مالک مطلق اللہ تعالیٰ ہے ہر شے اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔ بحیثیت نائب اور خلیفۃ اللہ، شرعی قوانین، حضور خاتم النبیین محمد کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے صادر فرمائے ہیں۔ ان قوانین کو مکمل طور پر نافذ کرنا اور ان پر دل و جان سے عمل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ جمعیت علماء پاکستان اس ملک کو نظام مصطفیٰ ﷺ کے اعلیٰ اصولوں کی روشنی میں مکمل طور پر اسلامی فلاحی ریاست بنانے کی خواہاں ہیں جس کے لیے درج ذیل اقدامات ضروری ہیں:-

۱۔ شریعت کے مطابق زکوٰۃ وعشر کے نظام کا مکمل نفاذ اور اس کی صولی اور تقسیم کے لیے امانت و دیانت کی حامل انتظامی ڈھانچہ کا قیام تا کہ بھوک اور افلاس کا خاتمہ ہوسکے۔

۲۔ انکم ٹیکس کے موجودہ جابرانہ اور ظالمانہ نظام کو ختم کر کے ٹیکس کا ایک ایسا منصفانہ

نظام قائم کیا جائے گا۔ جس کے ذریعے ہر قسم کی بدعنوانی اور ناانصافی کا خاتمہ ہوسکے۔

۳۔ وفاقی، صوبائی، بلدیاتی ٹیکسوں کی ادائیگی کے لیے ایسے نظام کا قیام تا کہ ٹیکس دہندگان اپنے تمام ٹیکس ایک ہی جگہ جمع کراسکیں اور انہیں ہر قسم کی پریشانی اور بد عنوانی سے نجات مل سکے۔

۴۔ خود کفیل معیشت کے لیے مثبت اقدامات کیے جائیں گے تا کہ بیرونی قرضوں پر انحصار ختم ہوسکے۔

۵۔ ایسی زرعی حکمتِ عملی جس سے ملک جلد از جلد غذا میں خود کفیل ہوسکے اور زرعی اجناس کی پیداواری لاگت میں کمی ہو۔

۶۔ کلیدی اور دفاعی صنعتوں کا قومی شعبے میں قیام۔

۷۔ ایسی واضح صنعتی حکمتِ عملی جس سے محنت اور سرمایہ کاری دونوں کا تحفظ ہو اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیداوار ہوسکے۔

۸۔ بے روزگاری کا انسداد اور افرادی قوت کی تنظیم۔

۹۔ منافع میں مزدوروں کی موثر شرکت۔

۱۰۔ نجی سرمایہ کاری کے لیے سازگار اور مستحکم فضا کا قیام اور تحفظ۔

۱۱۔ معاشرے میں دولت کی منصفانہ تقسیم تا کہ کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔

۱۲۔ معاشرتی انصاف کے اصولوں پر عمل کر کے استحصال کی تمام صورتوں کا خاتمہ۔

۱۳۔ ہر شہری کے لیے بنیادی ضروریاتِ زندگی اور ترقی کے مساوی مواقع کی فراہمی اور معاشی ترقی کے فوائد تک ملک کے تمام افراد کی رسائی ان مقاصد کے حصول کے لیے ہمارا پروگرام درج ذیل اجزاء پر مشتمل ہوگا:

(الف) زراعت، (ب) دیہی ترقی، (ج) شہری مسائل، (د) عام معاشی اصلاحات، (ر) صنعت وتجارت، (س) مزدوروں اور کم آمدنی والے افراد کے حقوق۔

(الف) زراعت

ملک کی بیشتر معیشت کا دارو مدار زرعی ترقی پر ہے، اس لیے زراعت کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے ایسے اقدامات اشد ضروری ہیں جن کے ذریعے نہ صرف پیداوار میں اضافہ ہوسکے بلکہ ملک خوشحالی اور ترقی کے سہارہ پر بھی گامزن ہو، ہمارا یقین ہے کہ پاکستان زرعی طور پر اس قدر ترقی یافتہ ہوسکتا ہے کہ اس کے ذریعے نہ صرف ہماری اپنی ضروریات پوری ہوسکیں گی۔ بلکہ ہم اناج کی اس قدر فاضل پیداوار بھی حاصل کرسکیں گے۔ کہ اس کے ذریعے ملک کے زرمبادلہ کے ذخائر میں خاطر خواہ اضافہ ہوسکتا ہے۔

۱۔ ملک میں لاکھوں ایکڑ قابلِ کاشت زرعی سرکاری اراضی بے کار پڑی ہوئی ہے، اسے ترقی دے کر کاشت کاروں، بے زمین ہاریوں اور کسانوں یا گزارہ یونٹ سے کم رکھنے والے مالکانِ اراضی میں تقسیم کردیا جائے گا۔ اس سلسلے میں مقامی لوگوں کا حق مقدم ہوگا۔

۲۔ جو قابلِ کاشت اراضی تین سال تک عمال بالا جواز زیر کاشت نہیں لائے جائے گی اسے لے کر مستحقین میں تقسیم کردیا جائے گا۔

۳۔ سرکاری اراضی کی پٹے داری ختم کردی جائے گی۔ جس پٹے دار کے پاس ۱/۲۵ ایکڑ سے زائد زمین ہوگی۔ اس زائد زمین کو مستحقین میں تقسیم کردیا جائے گا۔ ۱/۲۵ ایکڑ یا اس سے کم زمین کے پٹے داروں کو مالکانہ حقوق منتقل کردیے جائیں گے۔

۴۔ امدادِ باہمی کے اصول کے تحت کواپریٹو فارمنگ رائج کرنے کے لیے ہر ممکن مدد دی جائے گی۔

۵۔ سرکاری افتادہ زرعی زمینوں کی ملکیت، اسلامی قوانین کے مطابق اسی کی ہوگی جو اسے آباد کرے گا۔

۶۔ سیم اور تھور کے تدارک کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائے جائیں گے اور اسے اوّلین اہمیت دی جائے گی۔

۷۔ مزارعین کے حقوق کا پورا تحفظ کیا جائے گا اور زراعت کے نظام کو اسلامی قوانین کے مطابق بنایا جائے گا۔

۸۔ عشر کی ادائیگی کے ساتھ ہی مالیانہ معاف کردیا جائے گا اور آبیانہ کی شرح معقول اور مناسب سطح پر مقرر کی جائے گی جن کاشتکاروں اور مالکانِ اراضی سے آبیانہ وصول کیا جائے گا۔ حکومت انہیں نہری پانی کی فراہمی کی ذمے دار ہوگی۔

۹۔ عمدہ بیج کی فراہمی حکومت کی ذمے داری ہوگی، کیمیاوی کھاد، ڈیزل، بجلی، ٹریکٹر اور زرعی آلات مناسب نرخوں پر مہیا کیے جائیں گے اور ساڑھے بارہ ایکڑ تک کے مالکان کو آسان شرائط پر قرض حسنہ دیا جائے گا اور چھوٹے زمینداروں کو زیادہ سے زیادہ مراعات دی جائیں گی تاکہ ملکی پیداوار میں اضافہ ہوسکے۔

۱۰۔ زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے کارپوریٹ (شراکتی کاشت کاری) اور صنعتی کاشتکاری کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں گے۔

۱۱۔ زرعی اجناس کی خرید وفروخت کا ایسا منصفانہ نظام قائم کیا جائے گا جس سے کاشت کاروں اور صارفین دونوں کے جائز حقوق کا تحفظ ہوسکے اور پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوسکے۔

۱۲۔ کھیت مزدور کو روزگار اور ملازمت کا تحفظ دیا جائے گا اور اس کی اجرت مقرر کرتے وقت کام کی نوعیت اور اشیائے ضرورت کی قیمتوں کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

۱۳۔ جنگلات کی حفاظت اور توسیع اور صحیح استعمال کے لیے ضروری تدابیر اختیار کی جائیں گی۔

۱۴۔ مویشیوں کی پرورش، بھیڑ بکریوں کی پرداخت، ماہی پروری اور مگس پروری، ڈیری فارمنگ اور پولٹری فارمنگ وغیرہ کو احسن اور جدید طریقوں پر ڈھالا جائے گا اور اس کے لیے ہر قسم کی مالی اور فنی امداد مہیا کی جائے گی اور اسے صنعت کا درجہ دے دیا جائے گا۔

۱۵۔ زرعی اراضی کے ترقیاتی پروگرام کو صنعت کا درجہ دیا جائے گا۔

(ب) دیہی ترقی

۱۔ دیہات میں بے مکان خاندانوں کو کم سے کم مدت میں سات مرلے رہائشی پلاٹ تقسیم کرکے مستقل مالکانہ حقوق دیئے جائیں گے اور ان پلاٹوں پر مکان کی تعمیر

کے لیے قرضِ حسنہ جاری کیا جائے گا۔

۲۔ دیہات میں زرعی اور گھریلو صنعتوں کو تحفظ دیا جائے گا اور اس سلسلے میں قرضِ حسنہ جاری کیے جائیں گے تاکہ یہ صنعتیں فروغ پا سکیں اور اس طرح دیہات میں روزگار کے مواقع فراہم کر کے شہروں کی طرف آبادی کے بہاؤ کو روکا جاسکے۔

۳۔ دیہات میں آٹا، شکر، تیل اور دیگر ضروریات کی اشیاء کی مناسب قیمت پر فراہمی کا معقول اہتمام کیا جائے گا۔

۴۔ دیہی علاقوں کے اسکولوں میں زراعت کا مضمون نصاب میں شامل کیا جائے گا۔

۵۔ سیلابوں کے روک تھام کے لیے موثر اور مستقل انتظامات کیے جائیں گے۔ مناسب مقامات پر چھوٹے چھوٹے بند تعمیر کر کے پانی کے ذخائر آب پاشی کے لیے استعمال کیے جائیں گے۔

۶۔ ملک کے تمام دیہاتوں میں پانچ سال کے اندر بجلی کی فراہمی کا انتظام کر دیا جائے گا۔

۷۔ آئندہ نئے دیہات کی حد بندی چک بندی کے طریقے پر ہوگی۔

۸۔ دیہات کو پختہ سڑکوں کے ذریعے شہروں سے ملا دیا جائے گا۔

۹۔ دیہی علاقوں میں پینے کے پانی، تعلیم اور علاج کی سہولتیں کم سے کم مدت میں فراہم کی جائیں گی۔

(ج) شہری مسائل

۱۔ تمام شہروں میں معروف کچی آبادیوں کے غیر مالک مکینوں کو حقوق ملکیت دینے کے فیصلے کو کم سے کم مدت میں نافذ کیا جائے گا۔ اگر نجی اراضی پر کوئی کچی آبادی ہے تو ایسی اراضی کے مالکان کو متبادل اراضی یا معاوضہ دیا جائے گا۔

۲۔ ہر شہر میں آبادی کی شرح اضافہ کے مطابق مکانات کی تعمیر کے لیے جامع منصوبہ بندی کی جائے گی تاکہ مستقبل میں کچی آبادیوں کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہو۔

۳۔ بلدیاتی اداروں کو ترقیاتی اختیارات دیئے جائیں گے۔

۴۔ چنگی کی وصولی کا نظام ختم کر دیا جائے گا۔

۵۔ بلدیاتی اداروں کو زیادہ سے زیادہ ذمے داری سونپی جائے گی اور زیادہ سے زیادہ

اختیارات دیئے جائیں گے۔

۶۔ اور زیادہ سے زیادہ ۶۰۰ گز پر رہائشی مکان تعمیر کیا جاسکے گا۔

۷۔ بنیادی ضرورت کے تحت خود رہائشی مکانات پر جائیداد ٹیکس ختم کر دیا جائے گا۔

(د) عام معاشی اصلاحات

۱۔ ملک کی معاشی منصوبہ بندی میں عوام کے منتخب نمائندوں اور فنی ٹیکنیکی ماہرین کو شامل کیا جائے گا۔

۲۔ قومی سطح پر محنت کی عظمت کا احساس دلایا جائے گا۔ کام چوری اور دوسروں کی محنت پر زندگی گزارنے کی عادات کی حوصلہ شکنی کی جائے گی۔

۳۔ مہنگائی کی روک تھام اور عام اشیاء کی قیمتوں کو اعتدال پر لانے کے لیے بنیادی ضرورت کی اشیاء پر سے تمام ٹیکس ختم کر دیئے جائیں گے۔ قیمتوں میں استحکام اور اعتدال پیدا کرنے کے لیے ایک مستقل پرائس کمیشن قائم کیا جائے گا۔ جس میں صارفین کے نمائندے بھی شامل ہوں گے۔

(ر) صنعت و تجارت

۱۔ جوہری توانائی کے پروگرام کو اور ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے تمام بین الاقوامی وسائل کام میں لائے جائیں گے اور اس سلسلے میں ہر قسم کے دباؤ کا مقابلہ کیا جائے گا۔

۲۔ زرعی آلات اور ٹریکٹر سازی کے کارخانوں کے قیام کو اولیت دی جائے گی۔

۳۔ پرائیویٹ سیکٹر میں زیادہ سے زیادہ صنعتیں لگانے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

۴۔ کپڑے اور دوسری اہم صنعتوں کو تباہی سے بچانے کے لیے بلاتاخیر موثر اقدامات کیے جائیں گے۔

۵۔ صنعتوں کو تمام ملک خصوصاً پسماندہ علاقوں تک پھیلانے کی پوری کوشش کی جائے گی تاکہ ترقی کے فوائد چند علاقوں تک ہی محدود نہ رہیں۔ اس کے علاوہ ایسی صنعتوں جن کے لیے کسی علاقے میں خام مال موجود ہے، انہیں اسی علاقے میں کام کرنے کو ترجیح دی جائے گی۔

۶۔ ملک کو دفاعی لحاظ سے خود کفیل بنانے کے لئے اسلحہ سازی کی صنعت کو وسیع پیمانے پر ترقی دی جائے گی۔

۷۔ بجلی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے موثر اقدامات کیے جائیں گے۔

۸۔ کم سے کم مدت میں تیل، گیس اور دیگر معدنیات کے مزید ذخائر دریافت کر کے ملک کو خود کفیل بنانے کی جدوجہد کی جائے گی۔

۹۔ کاغذ کی صنعت کو فروغ دے کر ملک کو اس میں خود کفیل بنایا جائے گا۔

۱۰۔ نئی صنعتوں کے قیام کی منظوری کے طریقہ کار کو اس قدر سہل بنا دیا جائے گا کہ درخواست دہندہ کو صرف ایک ہی محکمے سے رابطہ قائم کرنا پڑے۔ اس سلسلے میں ساری کارروائی کی ذمے داری وزارتِ صنعت پر ہوگی جو تین مہینے کے اندر فیصلہ کرنے کی پابند ہوگی۔

۱۱۔ اشیائے تعیش، کاروں اور دیگر غیر ضروری چیزوں کی درآمد بالکل رکوا دی جائے گی، مقامی صنعتوں کے فروغ کے لیے ان اشیاء کی درآمد بھی بند کردی جائے گی جو پاکستان میں تیار ہو رہی ہیں۔ البتہ پاکستانی مصنوعات کی قیمتوں کی موثر نگرانی کی جائے گی۔

۱۲۔ پاکستان میں ہر محقق اور موجود کی بھرپور سرپرستی کی جائے گی۔

۱۳۔ کوئلہ، لوہا، تانبا، گندھک اور المونیم کی بنیادی اہمیت کے پیشِ نظر، پاکستان میں ان کی پیداوار میں اضافے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں گے۔

۱۴۔ بیرونی منڈیوں میں پاکستانی مال اور مصنوعات کی برآمد بڑھانے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کیے جائیں گے اور مصنوعات کے معیار کو بہتر بنایا جائے گا۔ برآمدات پر سے سرکاری اجارہ داری ختم کردی جائے گی۔

۱۵۔ ملکی تمام غیر ضروری کارپوریشنوں کو توڑ کر ان کے محکموں میں ضم کردیا جائے گا۔

۱۶۔ واپڈا کو توڑ دیا جائے گا۔ بجلی کی پیداوار (جنریشن) ترسیل اور ٹرانسمیشن وفاق کے ذمے ہوگی جبکہ تقسیم ڈسٹری بیوشن صوبوں کے سپرد کی جائے گی۔

(س) مزدوروں اور کم آمدنی والے افراد کے حقوق

۱۔ تعمیری اور صحت مند یونین سازی اور یونین سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ انجمن سازی اور سوداکاری کا غیر مشروط حق دیا جائے گا اور معقول وجہ بتائے بغیر برطرفی کو جرم قرار دیا جائے گا۔

۲۔ مزدوروں کو کارخانے کے منافع میں موثر شرکت دی جائے گی اور مزدور اور صنعتکار کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنایا جائے گا، ساتھ ہی پیداواری بونس اسکیم بھی نافذ کی جائے گی۔

۳۔ مزدوروں کی کم از کم تنخواہ مہنگائی اور ضروریاتِ زندگی کو مدنظر رکھ کر مقرر کی جائے گی۔ موجودہ تنخواہ میں اضافہ کیا جائے گا تاکہ مزدور باعزت اور باوقار زندگی گزار سکیں اور ایسا نظام نافذ کیا جائے گا جس سے پیداوار دینے والے مزدوروں کو اضافی پیداوار کے مطابق زیادہ منافع ملے۔

۴۔ مزدوروں کی سہولت کے پیشِ نظر مزدوروں کی تنخواہوں کی ہفتہ وار تقسیم کا نظام رائج کیا جائے گا اور محنت کشوں کی اجرت میں تاخیر کو جرم قرار دیا جائے گا۔

۵۔ ماہرین صنعت وتجارت اور ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں کے مشورے سے وفاقی اور صوبائی محکمہ صنعت کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے گا۔

۶۔ کسی صنعت کے اجراء کی اجازت دینے کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے کم آمدنی والے ملازمین اور مزدوروں کے لیے مطلوبہ رہائش، علاج کے لیے معقول سہولت اور بچوں کے لیے معیاری تعلیم کا انتظام کرے۔ جو صنعتیں پہلے سے کام کر رہی ہوں انہیں چھ ماہ کے اندر یہ شرط پوری کرنی ہوگی۔

۷۔ مزدوروں کے اہل خاندان کے فیئر پرائس شاپ قائم کی جائیں گی، جہاں سے وہ رعایتی قیمت پر اشیائے ضرورت خرید سکیں۔

۸۔ صنعتی عدالتیں مقدمات کا فیصلہ زیادہ سے زیادہ تین ماہ اور اپیل کا فیصلہ عدالت مجاز دو ماہ کے اندر کرنے کی پابند ہوگی۔

۹۔ قصبوں اور شہروں میں تانگے والوں، ریڑھی والوں، خوانچہ فروشوں، رکشہ اور ٹیکسی

ڈرائیوروں، چھوٹے دکانداروں اور دستکاروں کو پورا پورا کاروباری تحفظ دیا جائے گا ان پر پولیس اور غنڈہ عناصر کا دباؤ ختم کر دیا جائے گا اور کاروبار کی ترقی کے لیے بلاسود قرضے کی سہولتیں دی جائیں گی۔

۱۰۔ سماجی تحفظ کی اسکیم کے نفاذ کو اختیاری بنایا جائے گا اور نمائندہ ٹریڈ یونینوں کے مشورے سے ایسی اسکیم نافذ کی جائے گی۔

۱۱۔ مزدوروں، صنعت کاروں اور حکومت کے نمائندوں پر مشتمل بورڈ قائم کیا جائے گا، جو صنعتی قوانین میں تبدیلی، پیداوار میں اضافہ اور مزدوروں کے حقوق و مفادات کے بارے میں سفارشات مرتب کیا کرے گا۔

۱۲۔ تجارتی اداروں میں کام کرنے والوں کو بہتر شرائط ملازمت کے ساتھ روزگار کا تحفظ دیا جائے گا۔

۱۳۔ موٹر رکشا اور ٹیکسی خود چلانے والوں کو آسان اقساط پر موٹر کار اور رکشہ فراہم کیے جائیں گے تاکہ وہ خود مالک بن سکیں اور ان کا استحصال ختم ہو اور عوام کو بھی ٹرانسپورٹ کی سہولتیں میسر آ سکیں۔ عوام کی سہولت کے لیے سرکاری ٹرانسپورٹ کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ کمپنیوں کو بھی شہروں میں بسیں چلانے کی اجازت دی جائے گی۔

۱۴۔ حکومت ایک ایسا نظام کرے گی کہ اندرونی اور بیرونی تجارت پر حکومت کا کنٹرول کم سے کم کر دیا جائے گا۔

۱۵۔ پندرہ سال ملازمت کرنے کے بعد مزدور کو پنشن کا حق دیا جائے گا اور تیس سال ملازمت کرنے پر ہر مزدور پوری پنشن لینے کا حق دار ہوگا۔ جو مزدور ڈیوٹی کے دوران کسی وجہ سے معذور ہو جائے، اس کے مفت علاج کا انتظام کیا جائے گا اور اگر وہ اس کے باوجود بھی مکمل صحت یاب نہ ہو سکے اور کام کرنے کے قابل نہ رہے تو اسے پوری پنشن دی جائے گی۔۔

(۱۰) ذرائع ابلاغ اور نظریۂ پاکستان

ذرائع ابلاغ کی مکمل آزادی اور نظریہ پاکستان کے مکمل تحفظ کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر پر عمل کیا جائے گا:-

۱۔ نیشنل پریس ٹرسٹ توڑ دیا جائے گا۔

۲۔ پریس اور پبلیکیشن سے متعلق تمام جابرانہ قوانین ختم کر دیئے جائیں گے۔

۳۔ ڈیکلریشن کے اجراء حائل پیچیدہ رکاوٹوں کو ختم کر کے مقامی سطح پر مناسب اور ضروری سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

۴۔ صحافیوں، ریڈیو اور ٹی وی کے ملازمین کی شرائط ملازمت کو بہتر بنیا جائے گا۔

۵۔ اخبارات کو ان کی اشاعت کی تعداد کے مطابق اشتہارات دیئے جائیں گے۔

۶۔ ریڈیو اور ٹی وی کارپوریشن کو آزادی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے کا موقع دیا جائے گا اور ان پر سرکاری اجارہ داری ختم کر دی جائے گی۔

۷۔ ریڈیو اور ٹی وی کارپوریشنوں کو قومی اسمبلی کے ایک ایسے ادارے کے سامنے جوابدہ ٹھہرایا جائے گا جس میں حکمران پارٹی کے علاوہ حزبِ اختلاف کو بھی نمائندگی حاصل ہوگی۔

۸۔ ذرائع نشر و اشاعت کے بہتر استعمال اور ان کی نگرانی کے لیے ماہرین تعلیم، علمائے دین، ماہرین قانون اور عام زندگی سے تعلق رکھنے والے موزوں افراد پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جائے گی جو وقتاً فوقتاً ٹی وی اور حکومت کے اشاعتی پروگراموں کا تنقیدی جائزہ لے گی اور اصلاحی سفارشات کرے گی۔

۹۔ اسلامی معاشرتی قدروں کے مطابق ایک جامع قانون بنایا جائے گا اور فلم سنسر بورڈ میں تعلیم قانون اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے آگاہی رکھنے والے ماہرین کا تقرر کیا جائے گا۔

۱۰۔ اسلامی تعلیمات کو ریڈیو ٹی وی پر نشر کرنے کا اہتمام کیا جائے گا۔

۱۱۔ تعلیم

تعلیم کی مسلمہ اہمیت کے پیش نظر اس شعبے پر خصوصی توجہ کی جائے گی اور اس سلسلے میں انقلابی اقدامات کیے جائیں گے:-

۱۔ نظامِ تعلیم کو اسلام کے تقاضوں کے مطابق جدید ترین خطوط پر استوار کیا جائے گا اور قومی زندگی میں تفریق اور ناہمواری کا سبب بننے والے متعدد قسم کے نظام ہائے

تعلیم کو جلد از جلد ختم کر کے یکساں تعلیمی نظام رائج کیا جائے گا۔

۲۔ موجودہ تعلیمی نصاب پر نظر ثانی کر کے نظریاتی، سماجی، تمدنی اور دراقتصادی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے تعلیم کو بامقصد بنایا جائے گا تاکہ طالب علم اپنی ملی اور ملکی ذمے داریاں بہ طریق احسن پوری کر سکے۔

۳۔ تعلیمی نصاب وفاقی سطح پر تیار کیا جائے گا اور پورے ملک میں ایک ہی تعلیمی معیار قائم رکھا جائے گا۔

۴۔ ثانوی درجے تک مفت تعلیم دی جائے گی۔ پرائمری تک تعلیم لازمی ہوگی اور اس امر کو یقینی بنایا جائے گا کہ کوئی بچے داخلے سے محروم نہ رہیں۔ پسماندہ علاقوں کے بچوں کو وظائف دیئے جائیں گے۔

۵۔ فنی تعلیم کے فروغ اور طلباء کے طبعی رجحانات کے مطابق تعلیم دینے اور ان کی مناسب ماہرانہ رہنمائی کا انتظام کیا جائے گا۔ تعلیم یافتہ افراد کو ضمانت دی جائے گی۔ پاکستان کے صنعتی مراکز میں ایسے تربیتی ادارے قائم کیے جائیں گے جن کا تعلق متعلقہ صنعتوں سے ہوگا۔

۶۔ مسلمان طلباء کے لیے ہر شعبہ اور ہر مرحلہ میں علوم اسلامیہ اور نظریہ پاکستان کو لازمی مضمون قرار دیا جائے گا۔ پرائمری سرٹیفکیٹ، قرآن پاک ناظرہ مکمل کیے بغیر جاری نہیں ہوگا۔ بی اے تک اسلامیات کی تعلیم نہ صرف لازم ہوگی، بلکہ اس کا نصاب اس طرح ترتیب دیا جائے گا کہ ہر گریجویٹ اہم دینی امور سے کما حقہ واقف ہو جائے۔

۷۔ ملک میں علمی اور فکری نشو و نما کے لیے جگہ جگہ لائبریریاں قائم کی جائیں گی۔

۸۔ بے وسیلہ، ذہین طالب علموں کو اہلیت اور موزونیت کی بنیاد پر ہر قسم کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کی ذمے داری حکومت پر ہوگی۔

۹۔ نظریہ پاکستان اور تحریک پاکستان سے متعلق ایسی نصابی کتب تیار کی جائیں گی جس میں ۱۸۵۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک تحریک پاکستان کے صحیح عوامل و حقائق بیان ہوں، ان اکابر علماء اور قائدین کا خصوصی ذکر ہوگا جنہوں نے اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

۱۰۔ صنعتی اور زرعی مزدوروں کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کے لئے تربیتی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

۱۱۔ تعلیم بالغاں کے لئے مہم چلائی جائے گی جس کے تحت ہر شہری کو ایک مختصر مدت میں پڑھنا لکھنا سکھایا جائے گا۔

۱۲۔ ہر جامعہ کو قومی تعلیمی مقاصد کی حدود کے اندر پوری خود مختاری دی جائے گی۔

۱۳۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے قیام پر کوئی پابندی نہیں ہوگی، لیکن یہ حکومت کی نگرانی میں سرکاری قواعد و ضوابط کے مطابق کام کریں گے اور ان کی شرح فیس مناسب سطح پر رکھی جائے گی۔

۱۴۔ لڑکیوں کے لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک علیحدہ تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں گے۔

۱۵۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں صرف اہلیت کی بنیاد پر داخلہ دیا جائے گا۔ ہر سطح کے اساتذہ کے لئے قبل از ملازمت اور دورانِ ملازمت تربیت کا انتظام کیا جائے تاکہ جدید تدریسی طریقے پر اساتذہ کی رہنمائی ہو سکے۔

۱۶۔ کالج کے طلباء کے لیے فوجی تربیت لازمی قرار دی جائے گی۔

۱۷۔ اساتذہ کو معاشرے میں ان کا صحیح مقام دیا جائے گا اور وہ اپنے دائرہ کار میں ہر قسم کی مداخلت سے آزاد ہوں گے۔ انہیں ملازمت کا معقول تحفظ حاصل ہوگا۔ ان کے مشاہرے اتنے مقرر کیے جائیں گے کہ وہ معاشرے میں خوشحال اور باوقار زندگی بسر کر سکیں۔

۱۸۔ اساتذہ کی ترقی لازماً ان کے تدریسی تجربے اور تحقیقی نتائج کے ساتھ منسلک ہوگی۔

۱۹۔ طلباء کو رہائشی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ جامعات اور پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں کے ساتھ ہوسٹل کی بہترین سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

۲۰۔ ملک بھر میں معیارِ تعلیم کو بہتر بنانے، تعلیمی اداروں میں محاذ آرائی اور تشدد کے رجحان کے خاتمے اور ملک کے مستقبل کے معماروں کو صحیح معنوں میں زیرِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے تمام تعلیمی اداروں میں ادبی، علمی اور تحقیقی سوسائٹیوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

۲۱۔ دینی مدارس کو قومی تحویل میں نہ لینے کی ضمانت دی جائے گی۔

۲۲۔ علماء اور ماہرین تعلیم پر مشتمل ایک بورڈ قائم کیا جائے جو دینی مدارس کے نصاب کو جدید خطوط پر مرتب کرے گا۔

۲۳۔ دینی مدارس اپنے دائرہ کار میں آزاد ہوں گے۔ حکومت کی جانب سے ان کی موثر مدد اور سرپرستی کی جائے گی اور ان کی اسناد کو سرکاری سطح پر تسلیم کیا جائے گا۔ دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے سرکاری سطح کے اسکولوں اور کالجوں جیسی مراعات اور تنخواہ کا بندوبست کیا جائے گا۔

۲۴۔ مسلمانوں کے ہر مکتبہ فکر کو ان کے فقہ کے مطابق تعلیم کا حق حاصل ہوگا۔

۲۵۔ ایسے تمام رسائل، کتب اور دیگر لٹریچر پر پابندی ہوگی جس میں اللہ تعالیٰ، انبیاء، رسول اکرمؐ، خلفائے راشدین، بزرگانِ دین، اہل بیت کرام اور ازواج پر دانستہ یا نادانستہ، بالواسطہ یا بلا واسطہ حملہ کیا گیا ہو یا ان کی توہین کی گئی ہو۔

۲۶۔ کوئی تعلیمی ادارہ یا مذہبی تنظیم کسی قسم کی بیرونی امداد براہِ راست حاصل نہیں کر سکے گا اور نہ کسی نئے تعلیمی ادارے کو بیرونی سرمایہ سے قائم کیا جا سکتا ہے۔

۲۷۔ اس قسم کی بیرونی امداد وصول کرنے اور تقسیم کرنے کی ذمہ داری براہِ راست حکومت پر ہوگی۔

۲۸۔ تعلیمی اداروں میں کھیل کود کی مناسب سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

۱۲۔ قومی صحت

قومی صحت کے سلسلے میں ایک ایسا نظام رائج کیا جائے گا جس میں کوئی فرد بھی محض ناداری کی بنا پر مناسب علاج سے محروم نہ رہ جائے۔ اس مقصد کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر عمل میں لائے جائیں گی:-

۱۔ صفائی کے انتظامات بہتر بنائے جائیں گے۔ حفظانِ صحت کے اصولوں کو وسیع پیمانے پر تشہیر کی جائے گی اور کھیل کود اور ورزشوں کی قومی سطح پر حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

۲۔ ملاوٹ کرنے والوں کو بروقت اور برسرِعام عبرتناک سزا دی جائے گی۔

۳۔ دیہی علاقوں میں ہسپتال اور زچہ خانوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا۔ ایک منصوبے کے تحت دیہات میں ڈاکٹروں اور اطباء کا تعین کیا جائے گا۔ خاندانی منصوبہ بندی کے مراکز کو شفاخانوں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

۴۔ ہر ڈاکٹر پاکستان میں کم از کم دو سال قومی خدمت کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرونِ ملک جا سکے گا۔

۵۔ نرسوں کی شرائط ملازمت کو بہتر اور پرکشش بنایا جائے گا تاکہ بیرونِ ملک جانے کا موجودہ رجحان ختم ہو۔

۶۔ نجی اور سرکاری شعبے کے اشتراک سے اندرون ملک ادویہ تیار کرنے کے کارخانے لگائے جائیں گے علاوہ ازیں نجی شعبے میں ادویہ سازی کی اجازت ہوگی۔

۷۔ نجی شعبے میں ہسپتالوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور انہیں قومی ملکیت میں نہ لینے کی ضمانت دی جائے گی۔ البتہ یہ ہسپتال سرکاری قواعد وضوابط کے پابند ہوں گے۔

۸۔ یونانی طب اور ہومیوپیتھی علاج کو مکمل سرکاری سرپرستی فراہم کی جائے گی اور یہ شفاخانے بھی سرکاری اہتمام میں قائم کیے جائیں گے۔

۹۔ موجودہ غیر رجسٹرڈ ایلوپیتھک میڈیکل پریکٹیشنرز کو مناسب تربیتی کورس کے بعد قانونی تحفظ دیا جائے گا۔

۱۳۔ دفاع

افواج پاکستان کی عسکری صلاحیت میں زیادہ سے زیادہ اضافے کو اوّلیت دی جائے گی اور اس کے لیے حسب ذیل اقدامات کیے جائیں گے:-

۱۔ افواج پاکستان کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کیا جائے گا۔

۲۔ پاکستان کو اسلحہ سازی میں خودکفیل بنایا جائے گا۔

۳۔ نوجوانوں میں عسکری صلاحیت کے ساتھ ساتھ حب الوطنی اور اسلام کی خاطر جذبہ جہاد بیدار کیا جائے گا۔

۴۔ تمام صحت مند مردوں کے لیے لازمی فوجی تربیت اور خدمت کا قانون بلا تاخیر نافذ

کیا جائے گا کہ پوری قوم دفاع اور جہاد فی سبیل اللہ کے قابل بن سکے۔

۵۔ شہداء کے پسماندگان کی مکمل کفالت حکومت کے ذمے ہوگی۔

۶۔ فوج میں صوبائی کوٹہ مقرر ہوگا اور اس پر سختی سے عملدرآمد کیا جائے گا۔

۱۴۔ اقلیتیں

اقلیتوں کے بارے میں ہماری پالیسی یہ ہوگی:-

۱۔ سرکاری ملازمتوں، فنی اداروں اور پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں میں ان کے جائز حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

۲۔ ایسی جائیداد کو تحفظ دیا جائے گا جو اقلیتوں کی عبادت گاہوں سے منسلک ہوں۔

۳۔ اقلیتوں کو مکمل شہری اور قانونی تحفظ حاصل ہوں گے۔ حکومت ان کے جان و مال، عزت و آبرو اور شہری آزادی کے تحفظ کی پوری طرح ذمہ دار ہوگی۔

۴۔ اپنے معاشرے کی اصلاح کے لیے اقلیتیں جس قسم کے قوانین منظور کرانا چاہیں منظور کیے جائیں گے۔ بشرطیکہ یہ قوانین ملکی مفاد سے متصادم نہ ہوں اور اس سے دوسروں کی دل آزاری نہ ہوتی ہو۔

۵۔ اقلیتوں کے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں ہونے دی جائے گی۔ انہیں اپنے مذہب کے مطابق عمل کی آزادی ہوگی، البتہ کسی اسلامی اصول کے خلاف تبلیغ و اشاعت کی اجازت نہ ہوگی۔ اس سلسلے میں دستور میں دوسری ترمیم (۱۹۷۴ء) کے ضمن میں عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے قانون سازی کے فیصلے پر عملدرآمد کیا جائے گا۔

۶۔ اقلیتوں کو حدودِ قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی ہوگی۔ انہیں اپنے شخصی معاملات کو اپنے مذہبی قانونی یا رسم و رواج کے مطابق پورا حق حاصل ہوگا۔

۱۵۔ خارجہ حکمتِ عملی

پاکستان کی خارجہ پالیسی کے اصول یہ ہوں گے:-

۱۔ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہے، لہٰذا ہماری خارجہ حکمتِ عملی قرآن و

سنت کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگی اور ہم "اندر امن اور باہر امن" کے اصول پر سختی سے گامزن رہتے ہوئے اپنی پالیسی مرتب کریں گے۔

۲۔ عالم اسلام کے ساتھ قریب ترین برادرانہ روابط کو مضبوط اور مستحکم کیا جائے گا اور اس امر کی پوری کوشش کی جائے گی کہ عالمِ اسلام کا مکمل اتحاد وجود میں آئے اور تمام اسلامی ممالک ترقی و خوشحالی کے لیے ایک مشترکہ لائحہ عمل پر کام کریں اور ان میں سماجی، اقتصادی، معاشرتی، دفاعی تعاون و اشتراک ہو۔

۳۔ پڑوسی ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ بشرطیکہ یہ تعلق ہماری قومی مفادات اور ہماری خودمختاری پر اثر انداز نہ ہوں۔

۴۔ جموں و کشمیر کے عوام کو سلامتی کونسل کے فیصلے کے مطابق استصواب کے ذریعہ حق خود اختیار دلانے کی بھرپور جدوجہد کی جائے گی۔ اس مسئلے میں بھارت سے اس وقت تک حقیقی معنوں میں مصالحت، دوستی اور تعاون نہیں ہوسکتا جب تک جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو ان کا حق خودارادیت نہیں مل جاتا اور وہ آزادانہ طور پر اپنے مستقبل کا فیصلہ نہیں کرتے۔

۵۔ بھارت نے جن مقامات پر عیارانہ اور غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اس کے خلاف موثر اور باوقار اقدامات کیے جائیں گے تاکہ حیدرآباد، جوناگڑھ، مانا داور اور مانگرول کے مسئلے حل ہوسکیں۔

۶۔ دنیا کی بڑی طاقتوں امریکہ، روس کی کشمکش سے پاکستان کو الگ تھلگ رکھا جائے گا۔

۷۔ ہر قسم کی سامراجیت اور استعماری نظام کے خاتمے کے لیے انتہائی کوشش کی جائے گی۔

۸۔ ہماری امداد و تائید ہمیشہ مظلوم قوموں کے ساتھ ہوگی۔ غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کی معاشی آزادی کے لیے جدوجہد کی جائے گی۔

۹۔ یہودی امریکی سامراج کی سازش نے مسلمانوں کے ساتھ کھلی دشمنی کا ثبوت دیتے ہوئے بیت المقدس پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے۔ لہٰذا مسجد اقصیٰ کی بازیابی اور آزاد فلسطین مملکت کے قیام کے لیے ہر ممکن جدوجہد اور اس سلسلے میں فلسطینیوں کی تحریک آزادی کی حمایت اور مدد کی جائے گی۔

۱۰۔ مسلمان جہاں جہاں بھی مظلوم ہیں مثلاً ایتھوپیا، قبرص، یوگنڈا اور بھارت ان کے حقوق و مفادات کے تحفظ کی جدوجہد کی جائے گی۔

(ط) روس نے جارحیت کے ذریعے افغانستان پر قبضہ کیا ہوا ہے، روسی افواج کا انخلاء اور افغان مہاجرین کی باعزت طور پر اپنے وطن میں واپسی کو لازمی بنانے کے لیے ہر وہ تدابیر اختیار کی جائے گی جو اس مسئلے کے فوری حل کے لیے ممد و معاون ثابت ہو۔ (مخزونہ قاری زوار بہادر قادری، صدر جمعیت علمائے پاکستان پنجاب، لاہور)

ضمیمہ ۱۰

چیئرمین ملی یکجہتی کونسل مولانا شاہ احمد نورانی کا علماء کو لکھا گیا خط

محترم مولانا صاحب..............................

السلام علیکم!

مغربی استعماری طاقتیں اور صیہونیت امریکہ کی سربراہی میں مسلمانان عالم کے خلاف جو کچھ کر رہی ہے آپ کی روحانی اور سیاسی فراست سے یقیناً پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ عالم اسلام کے خلاف دشمنانِ اسلام، یہود، ہنود، عیسائی اور قادیانی جو کچھ کر رہے ہیں وہ توقع کے خلاف نہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بعض مسلم ممالک امریکہ اور اس کے حواریوں کی خوشنودی میں جان بوجھ کر اس ساز کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان مغربی استعماری قوتوں نے انسانی حقوق کی اپنی من مانی تعبیر کر کے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ مہم شروع کر رکھی ہے۔ توہینِ رسالتؐ کے مرتکب شخص کو سزا دینا ان کے نزدیک انسانی حقوق پر کاری ضرب ہے۔ لیکن اسرائیل اور نصرانی جو کچھ فلسطین اور بوسنیائی مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں نیز ہندو شدت پسند کشمیری مسلمانوں کی نسل کشی کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ امریکہ اور اس کے حواریوں کے نزدیک جائز اور درست ہے۔ امریکہ نے سوڈان، ایران، عراق اور لیبیا کو دہشت گرد ملک قرار دے دیا ہے۔ پاکستان بھی اس کی زد پر ہے۔ حکومت پاکستان نہ جانے کس خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ پاکستانی حکمران بھی اعلانیہ اسلام کی بنیادی باتوں سے اپنی برأت کا اظہار کر رہے ہیں۔ ناموسِ رسالتؐ جیسے اہم اور بنیادی مسئلہ پر معذرت خواہانہ انداز اختیار کر کے مسلمانوں کی ایمانی حمیت اور اسلامی غیرت کو للکار رہے ہیں۔ اس المناک صورت حال کے پیش نظر ملی یکجہتی کونسل نے متفقہ طور پر ۲۶ مئی ۱۹۹۵ء بروز جمعہ پورے ملک میں عالم اسلام کے ساتھ یکجہتی کا یوم منانے کا اعلان کیا ہے۔ لہٰذا آپ سے دردمندانہ درخواست کی جاتی ہے کہ آپ

۲۶ مئی ۱۹۹۵ء کو جمعہ کے خطاب میں مندرجہ ذیل موضوعات پر تقریر فرما کر اسلام دشمن طاقتوں کی سازشوں کو بے نقاب کریں:-

۱۔ ناموسِ رسالتؐ کی دینی اہمیت اور اس سے متعلق سزا کا تصور۔

۲۔ قبلہ اوّل کی سرزمین کو امریکہ کی جانب سے یہودیوں کے حوالے کرنے کے لیے امن کا ڈھونگ رچانا۔

۳۔ توہینِ رسالتؐ کی سزا سے متعلق موت سے کم سزا کا تصور ناقابل قبول ہے۔ حکومت پاکستان کو اس سزا سے متعلق کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

۴۔ امریکہ اور استعماری قوتوں کے نیو ورلڈ آرڈر جس کا مقصد صرف صیہونی عزائم کی تکمیل ہے، کے خلاف مشترکہ جدوجہد کے لیے مسلمانوں کو آمادہ کرنا۔

۵۔ ۲۷ مئی ۱۹۹۵ء بروز ہفتہ تحفظ ناموسِ رسالتؐ کے لیے کراچی تا خیبر مکمل ہڑتال کی اپیل کی جائے تاکہ ذات اقدس حضورؐ سے مکمل اطاعت کے عہد کی تجدید ہو اور اس عزم کا اعلان ہو کہ توہینِ رسالتؐ کی سزا کے مستوجب کو موت کے سوا کوئی اور سزا نہیں دی جاسکتی۔

والسلام

شاہ احمد نورانی صدیقی

چیئرمین ملی یکجہتی کونسل پاکستان

(مخزونہ: قاری زوار بہادر قادری، صدر جمعیت علمائے پاکستان پنجاب، لاہور)

ضمیمہ ۱۱

ملی یکجہتی کونسل کا منظور کردہ ضابطہ اخلاق

(اجلاس ملی یک جہتی کونسل لاہور مورخہ ۳۰/ اپریل ۱۹۹۵ء)

ملی یک جہتی کونسل کی ذیلی کمیٹی کا پہلا اجلاس ۴/ اپریل ۱۹۹۵ء کو اسلام آباد میں منعقد ہوا۔ شرکائے اجلاس کے اسمائے گرامی یہ تھے:

جناب پروفیسر ساجد میر	کنوینر
جناب مولانا ضیاء القاسمی	رکن
جناب مولانا عبدالمالک	رکن
جناب مولانا شبیر احمد ہاشمی	رکن
جناب علامہ محمد تقی نقوی	نمائندہ علامہ جواد ہادی صاحب
جناب مولانا گل انداز	نمائندہ پروفیسر خورشید صاحب

جناب قاضی عبداللطیف علالت کی وجہ سے شرکت نہ فرما سکے علامہ جواد ہادی بھی ایک قریبی عزیز علیل تھے اس لیے وہ بھی تشریف نہ لا سکے۔ جبکہ پروفیسر خورشید احمد صاحب بیرون ملک تھے تاہم موخر الذکر دونوں حضرات نے اپنے نمائندے بھیجے۔

اجلاس کھانے اور نماز کے وقفہ سمیت پانچ گھنٹے جاری رہا اور تمام شرکاء نے بڑے اچھے ماحول میں بحث و گفتگو میں حصہ لیا۔ اجلاس کا مقصد مختلف مکاتب فکر کے لیے ایک متفقہ ضابطہ اخلاق کی تشکیل و ترتیب تھا۔ اس مقصد کے لیے درج ذیل دستاویزات کو بنیاد بنایا گیا:

۱۔ ۳۱ علماء کے ۲۲ دفعات (۱۹۵۱ء)

۲۔ رپورٹ اتحاد بین المسلمین کمیٹی، زیر صدارت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی (۱۹۹۳ء)

۳۔ قومی و ملی یک جہتی کانفرنس کا خطبہ استقبالیہ از مولانا سمیع الحق (۲۴ مارچ ۱۹۹۵ء)

۴۔ ملی یک جہتی کونسل کا متفقہ اعلامیہ مجریہ ۲۳ مارچ ۱۹۹۵ء۔

۵۔ اعلامیہ وحدت، جاری کردہ پاکستان عوامی تحریک وتحریک نفاذ فقہ جعفریہ۔

۶۔ معاہدہ امن (لاہور) زیر اہتمام محکمہ اوقاف پنجاب۔

۷۔ مشترکہ اعلامیہ برائے امن مابین اہلسنت واہل تشیع (گوجرانوالہ)

۸۔ میثاق ملتان ۱۹۹۴ء۔

۹۔ سینٹ آف پاکستان کی کمیٹی برائے مذہبی واقلیتی امور کی فرقہ وارانہ اختلافات کے متعلق رپورٹ مجریہ ۱۹۹۴ء۔

غور وخوض اور بحث وتمحیص کے بعد ضابطہ اخلاق کے مندرجہ ذیل نکات پر اتفاق ہوا:

۱۔ اختلافات اور بگاڑ کو دور کرنے کے لیے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ تمام مکاتب فکر نظم مملکت اور نفاذ شریعت کے لیے ایک بنیاد پر متفق ہوں چنانچہ اس مقصد کے لیے ہم ۳۱ سرکردہ علماء کے ۲۲ نکات کو بنیاد بنانے پر متفق ہیں۔

۲۔ ہم ملک میں مذہب کے نام پر دہشت گردی اور قتل وغارت گری کو اسلام کے خلاف سمجھنے، اس کی پرزور مذمت کرنے اور اس سے اظہار برات کرنے پر متفق ہیں۔

۳۔ کسی بھی اسلامی فرقہ کو کافر اور اس کے افراد کو واجب القتل قرار دینا غیر اسلامی اور قابل نفرت فعل ہے۔

۴۔ نبی کرامؐ کی عظمت وحرمت ہمارے ایمان کی بنیاد ہے اور آنحضورؐ کی کسی طرح کی توہین کے مرتکب فرد کے شرعاً قانوناً موت کی سزا کا مستحق ہونے پر ہم متفق ہیں۔ اس لیے توہین رسالتؐ کے ملکی قانون میں ہم اس ہر ترمیم کو مسترد کریں گے اور متفق اور متحد ہو کر اس کی مخالفت کریں گے۔ عظمت اہل بیت اطہار وامام مہدی، عظمت ازواج مطہرات اور عظمت صحابہ کرام وخلفائے راشدین ایمان کا جز ہے۔ انکی تکفیر کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے اور ان کی توہین وتنقیص حرام اور قابل مذمت وتعزیر جرم ہے۔

۵۔ ایسی ہر تقریر وتحریر سے گریز واجتناب کیا جائے گا جو کسی بھی مکتبہ فکر کی دل آزاری اور اشتعال کا باعث بن سکتی ہے۔

۶۔ شر انگیز اور دل آزار کتابوں، پمفلٹوں اور تحریروں کی اشاعت، تقسیم وترسیل نہیں کی جائے گی۔

۷۔ اشتعال انگیز اور نفرت انگیز مواد پر مبنی کیسٹوں پر مکمل پابندی ہوگی اور ایسی کیسٹیں چلانے والا قابل سزا ہوگا۔

۸۔ دل آزار، نفرت آمیز اشتعال انگیز نعروں سے مکمل احتراز کیا جائے گا۔

۹۔ دیواروں، ریل گاڑیوں، بسوں اور دیگر مقامات پر دل آزار نعرے اور عبارتیں لکھنے پر مکمل پابندی ہوگی۔

۱۰۔ تمام مسالک کے اکابرین کا احترام کیا جائے گا۔

۱۱۔ تمام مکاتب فکر کے مقامات مقدسہ اور عبادت گاہوں کے احترام وتحفظ کو یقینی بنایا جائے گا۔

۱۲۔ جلسوں، جلوسوں، مساجد اور عبادت گاہوں میں اسلحہ خصوصاً غیر قانونی اسلحہ کی نمائش نہیں ہوگی۔

۱۳۔ عوامی اجتماعات اور جمعہ کے خطبات میں ایسی تقریریں کی جائیں گی جن سے مسلمانوں کے درمیان اتحاد واتفاق پیدا کرنے میں مدد ملے۔

۱۴۔ بیک وقت خطاب کر کے ملی یک جہتی کا عملی مظاہرہ کریں۔

۱۵۔ مختلف مکاتب فکر کے متفقات اور مشترکہ عقائد ونکات کی تبلیغ اور نشر واشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔

۱۶۔ باہمی تنازعات کو افہام وتفہیم اور تحمل ورواداری کی بنیاد پر طے کیا جائے گا۔

۱۷۔ ضابطہ اخلاق کے عملی نفاذ کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی بورڈ تشکیل دیا جائے گا۔ جو اس ضابطہ کی خلاف ورزی کی شکایات کا جائزہ لے کر اپنا فیصلہ صادر کرے گا اور خلاف ورزی کے مرتکب کے خلاف کارروائی کی سفارش کرے گا۔ (ماخذ: ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور اگست ۱۹۹۵ء)

ضمیمہ ۱۲

ملی یک جہتی کونسل کے اجلاس ۲۹ مئی ۱۹۹۵ء پشاور میں اتفاق رائے منظور ہونے والی قراردادیں

قرارداد نمبر ا:

تحفظ ناموس رسالت ﷺ

ملی یکجہتی کونسل کا یہ اجلاس ''تحفظ ناموس رسالتؐ'' کے سلسلے میں ملی یکجہتی کونسل کی اپیل پر ۲۷ مئی کی ملک گیر ''پہیہ جام مکمل اور پرامن ہڑتال'' پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے اور اسے کامیاب بنانے میں پاکستان کے ۱۲ کروڑ غیرت مند عوام کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ عوام نے اپنے گہرے دینی جذبہ اور عشق رسولؐ کا اظہار کر کے یہ ثابت کر دیا ہے، کہ اسلامی نظام کے علاوہ یہاں کوئی دین دشمن نظام لانے کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی اور اس ضمن میں مغربی ممالک کا کوئی بڑے سے بڑا دباؤ بھی پاکستانی قوم کو قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ عوام نے بھرپور انداز میں قانون توہین رسالتؐ سے متعلق اپنا متفقہ فیصلہ دے دیا ہے کہ یہ قانون ہمارے دین اور ایمان کا حصہ ہے۔ موجودہ قانون مکمل اور جامع ہے اس میں کسی قسم کی کوئی ترمیم خواہ وہ طریقہ کار سے ہی متعلق کیوں نہ ہو۔ برداشت نہیں کی جا سکتی۔ حکومت پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ اس لیے اس سے اس سلسلے میں کسی قسم کے مذاکرات کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر حکومت نے اس قانون یا اس کے نفاذ کے طریق کار میں کسی قسم کی ترمیم کرنے کی جسارت کی تو پاکستان کے عوام حکومت کے اس اقدام کے خلاف بھرپور احتجاجی تحریک شروع کر دیں گے۔

یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے، کہ گستاخ رسولؐ کے مرتکب جن دو ملزموں کو غیر قانونی اور غیر اخلاقی طور پر عدالت عظمیٰ کی جانب سے فیصلہ آنے سے پہلے ہی ملک سے باہر بھیج دیا گیا ہے قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر ان ملزمان کو ملک میں واپس لایا جائے۔ ملی یک جہتی کونسل کا یہ اجلاس تاریخی ہڑتال کو کامیاب بنانے کے سلسلہ میں علماء کرام

پورے ملک کے ٹرانسپورٹر حضرات، تاجر برادری، کاروباری انجمنوں، دینی و سماجی تنظیموں، مزدور تنظیموں، طالب علموں اور اساتذہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس پرامن ہڑتال کے سلسلے میں جن لوگوں کو لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد، لاڑکانہ اور بعض دوسرے مقامات سے گرفتار کیا گیا ہے، انہیں فوری طور پر رہا کر دیا جائے اور انتظامیہ اور پولیس کی جانب سے جہاں جہاں بھی پرامن مظاہرین پر بلاضرورت جبر و تشدد کیا گیا ہے، ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔

قرارداد نمبر ۲:

درگاہ چرار شریف کی بے حرمتی پر مذمت

ملی یکجہتی کونسل کا یہ اجلاس مقبوضہ جموں و کشمیر میں بھارت کی ظالمانہ کارروائیوں، بھارتی فوجی درندوں کی سفاکی، بچوں، عورتوں، بوڑھوں تک کے قتل عام، درگاہ چرار شریف کی بے حرمتی اور اس کی نواحی مسجد اور دینی مدرسہ اور پوری بستی کی تباہی و بربادی اور انہیں جلا کر راکھ بنا دینے، نیز کشمیر میں عرصہ دراز سے مسلمانوں کی نسل کشی کرنے پر پرزور احتجاج کرتا ہے اور بھارت کی شدید مذمت کرتا ہے۔

بھارت اقوام متحدہ کی قراردادوں کو پوری ڈھٹائی کے ساتھ نظر انداز کر رہا ہے۔ اجلاس حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ محض زبانی احتجاج کی بجائے وہ بھارت سے فوری طور پر تجارتی تعلقات منقطع کرنے میں پہل کرے، تاکہ عالم اسلام کے دوسرے ممالک سے بھی یہ اپیل کی جا سکے کہ وہ بھارت سے اپنے تجارتی اور معاشی تعلقات منقطع کر لیں، تاکہ بھارت کو اپنے بین الاقوامی وعدوں کو پورا کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔

قرارداد نمبر ۳:

تحفظ ناموس رسالت اور پنجاب اسمبلی

ملی یکجہتی کونسل کا یہ اجلاس پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے معزز اراکین کی طرف سے تحفظ ناموس رسالتؐ کے سلسلہ میں پیش کی گئی قرارداد کی انتہائی قدر کرتا ہے اور اس کی متفقہ منظوری پر پوری صوبائی اسمبلی مبارک باد پیش کرتا ہے اور ان کو اس اقدام پر انہیں خراج تحسین پیش کرتا ہے۔

نیز یہ اجلاس دوسری صوبائی اسمبلیوں سے بھی اپیل کرتا ہے کہ وہ بھی اپنے اجلاسوں میں ناموسِ رسالتؐ کے تحفظ کے سلسلے میں ایسی ہی قراردادیں منظور کرکے عوام کے جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کریں۔

قرارداد نمبر ۴:

مصری باشندوں کا اخراج، مذمت

ملی یکجہتی کونسل کا یہ اجلاس انتہائی دکھ کے ساتھ حکومت پاکستان کے اس اقدام کی مذمت کرتا ہے جس کے تحت چار مصری باشندوں کو جن کے پاس پاکستان میں قیام کے لیے قانونی دستاویزات موجود تھیں، مصر کی غیر جمہوری اور انسانی حقوق، حریت فکر اور شہری آزادی کو کچلنے والی حکومت کے حوالے کردیا ہے۔ جس کے ہاتھ بے گناہ مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں اور جو اسرائیل کی ناجائز ریاست کو خوش کرنے کے لیے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے خلاف مجرمانہ کارروائیوں میں مصروف ہے۔ ایسے اقدامات مغرب کی طاقتوں کو اس پالیسی کا حصہ ہیں، جو انہوں نے مسلمانوں کو ایک دوسرے علیحدہ کرنے، ان کے باشندوں کو ایک دوسرے مسلمان ملک میں آنے جانے اور ویزوں کے حصول میں مشکلات پیدا کرنے کے لیے اختیار کررکھی ہے، حکومت پاکستان اسی پالیسی پر گامزن ہے اور مغربی طاقتوں کی آلہ کار بنی رہی ہے۔ یہ اجلاس حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ فوری طور پر مصر کے ساتھ ہونے والے اس معاہدہ کو منسوخ کردے، جس کے تحت بے گناہ اور معصوم مصری بھائیوں کو سزائے موت دلوانے کے لیے اس بدنام زمانہ حکومت کے حوالہ کیا جارہا ہے۔

قرارداد نمبر ۵:

یوم یکجہتی عالمِ اسلام، علماء کو خراج تحسین

ملی یکجہتی کونسل کا یہ اجلاس ۲۶ مئی کو عالمِ اسلام کے ساتھ اظہار یکجہتی کا دن بھرپور انداز میں منائے جانے پر اللہ رب العالمین کا شکر ادا کرنے کے ساتھ تمام مکاتب فکر کے جید علمائے کرام، خطباء اور آئمہ مساجد کے تعاون پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

عالم اسلام کے ساتھ یوم یکجہتی کے اس موقع پر منبر رسولؐ سے اٹھنے والی پرعزم اور نہایت موثر آواز نے ثابت کردیا ہے کہ امت مسلمہ تمام تر علاقائی اور لسانی اختلافات سے

بالاتر ہوکر پوری طرح متحد یک جان اور یک آواز ہیں۔

اسلامیانِ پاکستان نے اپنے ایمانی جذبے اور دینی حمیت کا مظاہرہ کرکے یہ واضح کردیا ہے کہ امت مسلمہ ایران، سوڈان، الجزائر، لیبیا، عراق اور دیگر اسلامی ممالک کو دہشت گردی کے الزامات اور امریکی دھمکیوں نیز کشمیر، فلسطین، بوسنیا اور چیچنیا میں انسانی حقوق کی پامالی پر اقوام متحدہ اور مغربی طاقتوں کی بے حسی کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

ملی یکجہتی کونسل پاکستان کی مساجد کے آئمہ اور خطبا حضرات سے امید رکھتی ہے کہ وہ آئندہ بھی ملی اور ملکی مسائل پر قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے، منکرات کے خاتمے لیے اور عوام کی دینی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ملی یکجہتی کونسل سے تعاون فرماتے رہیں گے۔

قرارداد نمبر ۶:

امریکی سامراج کی مذمت......امریکہ کی امتیازی پالیسی

ملی یکجہتی کونسل کا یہ اجتماع حکومت امریکہ کے ان اقدامات کی مذمت کرتا ہے، جن کے تحت اس نے پاکستانی مصنوعات، خاص طور پر قالینوں کی امریکہ میں درآمد پر پابندی لگا دی ہے۔ حکومت امریکہ نت نئے بہانے تراش کر ترقی پذیر ممالک اور خاص طور پر اسلامی ممالک کے ساتھ امتیازی تجارتی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ حکومت امریکہ نے ایران، سوڈان، عراق، لیبیا اور شام کو دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کا الزام دے کر پہلے ہی اپنے انتقام کا نشانہ بنا رکھا ہے۔

حکومت امریکہ پاکستان پر امن ایٹمی پروگرام کی مخالفت ہے، کشمیری مجاہدین کی امداد کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کررہی ہے اور پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے راستے میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ پاکستان کو اقتصادی طور پر اپنا دست نگر بنانے کے لیے اب امریکہ نے پاکستانی مصنوعات کی امریکہ میں درآمد پر نئی پابندیاں لگا دی ہیں حالانکہ وہ اپنے آپ کو آزادانہ تجارت کا علمبردار ثابت کرنے کی کوششیں کررہا ہے۔ یہ اجلاس حکومت امریکہ کی دوغلی پالیسی کی مذمت کرتا ہے اور اسلامی ممالک اور خاص طور پر پاکستان کے خلاف اس کی امتیازی تجارتی پالیسی کی مذمت کرتا ہے اور متاثرہ اسلامی ممالک سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ سب مل جل کر حکومت امریکہ کی اس امتیازی سلوک کا مقابلہ کرے اور حکومت امریکہ کے خلاف جوابی تجارتی پابندیوں پر غور کریں۔ (ماخذ: ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور، اگست ۱۹۹۵ء)

ضمیمہ ۱۳

اقوام متحدہ کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر مولانا نورانی کی طرف سے سیاسی رہنماؤں کو لکھا گیا خط

السلام وعلیکم ورحمتہ و برکاتہ!

آپ کو معلوم ہے کہ اقوام متحدہ عالمی استعماری اسلام دشمن قوت کی ایجنٹ تنظیم ہے۔ اس کی تمام تر سرگرمیاں انسان اور اسلام دشمنی پر مبنی ہیں۔ یہ ادارہ اس لیے وجود میں آیا تھا کہ دنیا بھر کے انسانوں کو اپنے ملکوں میں داخلی استحکام اور عالمی سطح پر تمام حقوق فراہم کیے جائیں مگر یہ ادارہ رفتہ رفتہ امریکہ اور اس کے حامی استعماری سامراجیوں کا گڑھ بن گیا۔ آج عالم یہ ہے کہ صومالیہ، فلسطین، بوسنیا، چیچنیا، کشمیر اور بھارت کے اندر مسلمانوں کے خلاف خون آشام تحریکیں اور قتل مسلم کا شغل صبح شام جاری ہے۔ مگر اقوام متحدہ اور اس کے سیکرٹری جنرل مسٹر بطروس غالی خون مسلم کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ بعض ملکوں میں امن کے نام پر اقوام متحدہ کی افواج بھی مسلمانوں کے قتل عام میں شامل ہیں۔ دوسری طرف عراق اور لیبیا کے خلاف یک طرفہ اقتصادی پابندیوں سے ان مسلمانوں کے معصوم بچے، عورتیں اور بوڑھے ادویات کی نایابی سے بلک بلک کر مر رہے ہیں۔ ایران کے خلاف امریکہ اور استعماری طاقتوں کی بڑھتی ہوئی جارحیت اب خلیج فارس کو خون خون کرنے کی طرف مائل ہے۔ مسئلہ کشمیر میں اقوام متحدہ اپنی منظور کی گئی قراردادوں کے برعکس بھارتی بیا برہمن سامراج کا سرپرست ہے۔ بھارت کے اندر بابری مسجد کے انہدام سمیت اب تک لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا جا چکا ہے۔ مگر اقوام متحدہ امت مسلمہ کے خلاف عین اسی طرح کے مجرم کا کردار ادا کر رہا ہے، جس طرح بھارتی استعمار ادا کر رہا ہے۔ اندریں حالات ملی یکجہتی کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ چونکہ ۲۴/ اکتوبر اقوام متحدہ کا یوم قیام ہے اور اس ادارے کے قیام کو اس دن پچاس سال ہو جائیں گے۔ اس موقع پر یہ ادارہ اپنے قیام کا جشن منا رہا ہے اور اپنے نام نہاد انسانی خدمات کا ڈھنڈورا پیٹنے کا

پروگرام بنا چکا ہے۔ اس لیے انسان، اسلام ار مسلمانوں کے خلاف اقوام متحدہ کی جاحیت کے حقیقی خوں فشاں مناظر اقوام عالم کے سامنے رکھنے کے لیے اسی دن پاکستان بھر میں "یوم سیاہ" منایا جائے۔ اس کے لیے سیمینارز منعقد ہوں، مظاہرے کیے جائیں، سیاہ پرچم لہرائے جائیں، پاکستانی قوم مذہب و مسلک اور طبقاتی تفریق کے بغیر اس نام نہاد عالمی ادارے کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرے۔

میں آپ کے دروازہ دل پر دستک دے رہا ہوں کہ غیرت اسلامی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اپنے حلقہ اثر میں سیمینارز، جلسے اور سیاہ پرچم لہرانے کی تقریبات منعقد کر کے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں کے درد میں شریک ہوں اور اقوام متحدہ کے مظالم کے خلاف آواز حق بلند کریں۔

محترم علماء کرام و خطباء عظام سے گزارش ہے کہ جمعہ کے اجتماعات میں ملی یکجہتی کونسل کے مذکورہ پروگرام کو عوام تک پہنچانے اور اسلام دشمن ادارے اقوام متحدہ کے دجل و فریب سے قوم کو آگاہ فرمائیں۔

والسلام
شاہ احمد نورانی صدیقی
چیئرمین ملی یکجہتی کونسل، پاکستان

ماخذ: روزنامہ جنگ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۵ء

کتابیات

اُردو کتب

احمد، پروفیسر غفور، اور الیکشن نہ ہو سکے، جنگ پبلشرز، لاہور ۱۹۹۰ء۔

......، بے نظیر بھٹو، نامزدگی سے برطرفی تک، القمر لاہور ۱۹۹۵ء۔

......، پھر مارشل لاء آ گیا، جنگ پبلشرز لاہور، ۱۹۹۱ء۔

......، جنرل ضیاء کے آخری دس سال، جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۹۱ء۔

......، قومی اتحاد کیوں ٹوٹا، لاہور، س۔ن۔

احمد، خالد بشیر، تاریخ محاسبہ قادیانیت، لاہور، س۔ن

احمد، راؤ رشید، جو میں نے دیکھا، آتش فشاں، پبلشرز لاہور ۱۹۸۹ء۔

احمد، سیّد نور مارشل لاء سے مارشل لاء تک، لاہور ۱۹۹۳ء

احمد، عزیز الدین، پاکستان میں طلباء تحریک، مشعل، لاہور ۲۰۰۰ء

احمد، قاضی حسین پاکستان: حال اور مستقبل، منشورات لاہور ۲۰۰۲ء

احمد، قاضی ذوالفقار عوامی دور حکومت کا پہلا سال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۱ء

احمد، محمد مسعود، تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم، لاہور ۱۹۷۹ء۔

......، گناہِ بے گناہی، حیدر آباد، ۱۹۸۸ء۔

احمد، منیر، بحرانوں کا دور: نواز شریف کے عروج و زوال کی کہانی، تخلیقات لاہور ۲۰۰۰ء۔

......، بھٹو خاندان کا سیاسی قتل، تخلیقات لاہور ۱۹۹۸ء۔

......، پاکستان ٹوٹ جائے گا؟ تخلیقات، لاہور ۱۹۹۸ء۔

......، پاکستان کے سیاسی اتحاد، فرنٹیئر پوسٹ، پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۳ء۔

......، پاکستان میں امریکہ کا سیاسی کردار لاہور ۱۹۹۸ء۔

......، پاکستان میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کا کردار، گورا پبلشرز، لاہور ۱۹۹۹ء۔

......، پاکستان میں قیادت کا بحران، لاہور ۱۹۹۵ء۔

......، جنرل پرویز مشرف: جی ایچ کیو سے ایوان صدر تک، نگارشات لاہور ۲۰۰۱ء۔

......، ضیاء الحق کی سیاسی زندگی، لاہور ۱۹۹۵ء۔

......، غدار کون؟ گورا پبلشرز، لاہور ۱۹۹۵ء۔

......، فوج اور عدلیہ، لاہور، ۱۹۹۵ء

......، مارشل لاء کیوں لگا؟ لاہور، ۱۹۹۵ء

ارشد، مقبول، پاکستان میں فوجی بغاوتیں، فیکٹ پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء

اعوان، کے، ایچ، ضیاء الحق شہید، کچھ یادیں، کچھ باتیں، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۸۸ء

افضل، محمد میاں، سقوطِ بغداد سے سقوطِ ڈھاکہ تک، لاہور، س۔ن۔

اکبر خان، میجر جنرل، پاکستان میں پہلی فوج بغاوت، (مترجم عاصم جمال (فرنٹیئر پوسٹ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء۔

انجم، تجمل حسین، پاکستان کا تاریخی و سیاسی جائزہ (۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۲ء)، لاہور، ۱۹۹۳ء

انجم، زاہد حسین، الیکشن، ۱۹۹۷ء، نذیر سنز، پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۷ء

انجم، مرتضیٰ، پاکستان میں فوجی حکومتیں، دارالشعور، لاہور، ۲۰۰۱ء

انجم، وکیل، سیاستدانوں کی قلابازیاں، لاہور، س۔ن۔

......، سیاست کے فرعون، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۲ء

انصاری، ضیاء الاسلام، جنرل ضیاء الحق: شخصیت اور کارنامے، لاہور، ۲۰۰۱ء

ایڈووکیٹ، عتیق الرحمٰن طیارہ سازش کیس: نواز شریف، ایوان اقتدار سے عمر قید تک، دارالشعور، لاہور، ۲۰۰۰ء

بٹالوی، ڈاکٹر عارف، قائداعظم سے جنرل ضیاء تک، لاہور، س۔ن۔

بشیر، ایس ایم، مسلم لیگ: ۱۹۰۶ء سے ۱۹۹۲ء۔ تک، لاہور، ۱۹۹۳ء

بزمی، ممتاز حسین، زندانوں سے ایوانوں تک، لاہور، ۱۹۹۶ء

بھٹو، بے نظیر، ایک جنرل کب پسپا ہوتا ہے؟ (مترجم شاہد مختار)، لاہور، س۔ن۔

بھٹو، ذوالفقار علی، بھٹو کی سیاست، شبل پبلی کیشنز، کراچی، س۔ن۔

بھلی، محمد آصف، سیاستدان، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء

پاشا احمد شجاع، پاکستان کا آئین: تعارف و تجزیہ، سنگ میل، لاہور، ۱۹۹۵ء

پاشا، مصطفی کمال، تولے گئے مگر کم نکلے، انتخاب وطن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء

تقی الدین حافظ، پاکستان بدلتا سماج تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۲ء

.........، پاکستان کی سیاسی جماعتیں و تحریکیں، لاہور، س۔ن۔

تنویر، اشرف، میں: مولانا عبدالستار خان نیازی، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

تہامی، عابد، انتخابات ۱۹۹۰ء کا وائٹ پیپر، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

جاودانی، ادیب، پرائم منسٹر ہاؤس میں بھٹو کی آخری رات، مون پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن۔

جعفری، عقیل عباس، پاکستان کے سیاسی وڈیرے، گڈ بکس، لاہور، ۱۹۹۶ء

چراغ، محمد علی، پاکستان: تاریخ، جمہوریت، سیاسی، آئین، (۱۹۴۷ء۔ ۱۹۹۰ء)، سنگ میل، لاہور، ۱۹۹۳ء

چشتی، فیض علی، بھٹو ضیاء اور میں، جنگ پبلشرز، لاہور ۱۹۹۱ء

چوہدری ایم۔اے۔ کے، مارشل لاء کے سیاسی انداز، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

چوہدری، سردار محمد، نواز شریف: ٹیڑھی راہوں کا سیدھا مسافر، قومی پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۰ء

چوہدری، عبدالستار، بھٹو کی تقریریں، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

حسین، مجاہد، پاکستان کے تازہ سیاستدان، لاہور، ۱۹۹۷ء۔

خالد، ایم۔بی، ایوان صدر میں سولہ سال، لاہور، ۱۹۸۸ء

خان سردار عبدالقیوم، مذاکرات سے مارشل لاء تک، لاہور، ۱۹۸۸ء

خان، روئیداد، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، (مترجم، عمران احمد امتیازی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء)

درانی، مولانا محمد رفیق، مولانا نورانی کا مذہبی و سیاسی مقام، لاہور، ۲۰۰۴ء

ڈاکٹر، رفیق، پاکستان: فوج اور سیاست، دید شنید، پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۰ء

رملانی، ایم۔ایس۔ وینکٹے، پاکستان میں امریکی کردار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۸ء

رضوی، ڈاکٹر لیئین، الیکشن ۱۹۹۳ء، ڈھونس، دھاندلی، دھمکی اور سازش کی کہانی، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء۔

رفیع الدین، بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء

زائرنگ لارنس، پاکستان کا سیاسی بحران، (مترجم یوسف اعوان)، لاہور، ۱۹۸۳ء

ساگر، طارق اسماعیل، الیکشن ۱۹۸۸ء، مکتبہ نوائے وقت، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

سالک، صدیق، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، لاہور، ۱۹۸۸ء

سلیم، احمد، بھٹو اور کشمیر، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۲ء

.........، پاکستان میں مخلوط اور جداگانہ انتخابات کی سیاست، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء

.........، پاکستان سیاست کے پچاس کردار، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۷ء

.........، ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیورو کریسی، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

.........، چھ اگست کے بعد: انتخابی معرکوں اور محلاتی سازشوں کی کہانی: نگارشات، لاہور، ۱۹۹۰ء

.........، سلگتا ہوا سندھ، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء

.........، سیاستدانوں کی جبری نااہلیاں، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء

.........، غلام محمد سے غلام اسحاق خان تک: عدلیہ کا کردار، فرنٹیئر پوسٹ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء۔

.........، مہاجر قومی موومنٹ، تشکیل اور جدوجہد، سارنگ پبلی کیشنز، لاہور، س ن۔

.........، ہماری سیاسی تحریکیں، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۷ء

سہیل، اظہر، ایجنسیوں کی حکومت، لاہور، ۱۹۸۸ء

.........، پیر پگاڑا کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء

.........، سازشوں کا دور، لاہور، ۱۹۸۸ء

.........، سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء

شیخ، افتخار علی، پاکستان توڑنے والے، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۷ء

شیخ، نصیراے، پاکستان ایک قومی جمہوری ریاست کیوں نہ بن سکا، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۷ء

شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، لاہور، ۱۹۸۸ء

صادق، مولانا ابوداؤد شاہ احمد نورانی، جلد اول و دوم، گوجرانوالہ، س۔ن۔

صدیقی، جاوید احمد، نورانی سیاست، شبلی پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۸ء

صدیقی، نفیس، بھٹو سے بھٹو تک، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء

طاہر ستار، مارشل لاء کا وائٹ پیپر، لاہور، ۱۹۸۷ء

ظہیر، احسان الٰہی، سقوط ڈھاکہ، لاہور، ۱۹۹۷ء

عارف، جنرل کے ایم ضیاء الحق کے ہمراہ، (مترجم لیفٹیننٹ کرنل غلام جیلانی خان)، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۹ء۔

عثمان، پروفیسر محمد، و محمد مسعود اشعر پاکستان کی سیاسی جماعتیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء

علوی، حمزہ، پاکستان: ریاست اور اس کا بحران، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

علی، شوکت، بھٹو، ضیاء اور عوام، فرنٹیئر پوسٹ، پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء

علیمی، معین الحق (مرتب) علامہ شاہ احمد نورانی: عالم اسلام کی عظیم شخصیت، المجمع النورانی، جمدا شاہی بستی، یوپی انڈیا، ۲۰۰۴ء

فاروقی، اعجاز، پاکستان کا فکری بحران، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

فیروز احمد، ڈاکٹر، پاکستان: غلامی کے پچاس سال، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۷ء

قادری، ڈاکٹر محمد یونس (مرتب) عظیم مبلغ اسلام: شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی، خواتین اسلامی مشن، کراچی، ۲۰۰۳ء

قادری، خالد محمود، سچی قیادت، لاہور، ۲۰۰۴ء

قادری، صدیق خان جمعیت قیام سے اب تک، لائل پور، ۱۹۷۴ء

........، آئین میں مسلمان کی تعریف کس طرح شامل ہوئی، لائل پور، س۔ن۔

قدوائی، سید انور، علامہ احمد نورانی، ایک تاریخ، ایک عہد، حفیظ پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۴ء

قریشی، محمد فاروق، پاکستان میں جمہوریت کا زوال، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، س۔ن۔

قصوری، ضیاء المصطفیٰ، ارشادات نورانی، لاہور، ۲۰۰۴ء

قیصر، سید محمد حفیظ، ایک عالم۔ ایک سیاستدان: مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی، النور پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۱ء۔

کاشمیری، شورش، تحریک ختم نبوت: ۱۸۹۱ء سے ۱۹۷۴ء تک، لاہور، ۱۹۹۴ء

کریم، سید ارشد، پاکستان میں مقامی حکومتیں، لاہور، ۱۹۸۵ء

........، تقابلی سیاست کا تعارف، کراچی، ۱۹۸۵ء

کھوکر، انجم، پاکستان کی سیاست، ماضی، حال اور مستقبل، لاہور، ۱۹۹۷ء

گوہر، الطاف، ایوب خان: فوجی راج کے پہلے دس سال، لاہور، ۱۹۹۹ء

محمود، ڈاکٹر صفدر، آئین پاکستان ۱۹۷۳ء: تعارف و تجزیہ، شیخ غلام علی، لاہور، ۱۹۷۴ء

........، پاکستان تاریخ و سیاست، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء

........، پاکستان کی اہم سیاسی جماعتیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء

........، پاکستان کیوں ٹوٹا، سنگ میل، لاہور، ۱۹۸۷ء

........، سقوط مشرقی پاکستان و تاریخی و سیاسی تجزیہ، لاہور، ۱۹۷۲ء

مختار، شاہد، پاکستانی سیاست کی نصف صدی، شاہد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

........، پاکستان میں فوجی حکومتیں، لاہور، س۔ن۔

........، قائداعظم سے غلام اسحاق خان تک، لاہور، ۱۹۹۳ء

مرزا، سرفراز حسین، پاک بھارت تنازعہ کشمیر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء

مزدکی، انور، ولی خان کی سیاست، طارق پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۲ء

منیر، منیر احمد، المیہ مشرقی پاکستان کے پانچ کردار، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء

........، سیاسی اتار چڑھاؤ، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء

........، سیاسی جوار بھاٹا، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ قادیانی مسئلہ، لاہور، ۱۹۶۳ء۔

ملک عبداللہ، امریکہ فوج اور سیاستدان، دارالشعور، لاہور، ۲۰۰۱ء۔

........، بے نظیر، تین وراثتیں، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

ملک، عنایت الٰہی، پاکستان میں انتظامیہ کا زوال، مشعل، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

میر، حامد، بھٹو کی سیاسی پیش گوئیاں، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

ندیم، روش، پاکستان: برطانوی غلامی سے امریکی غلامی تک، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۳ء۔

نذر، بدیع الدین، پاکستان ادارے، عزیز پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۷ء

نظامی، قیوم، بے نظیر حکومت کے ۲۰ ماہ، پاکستان پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء

نقوی، علی جاوید، پاک بھارت تعلقات، صبیح پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۱ء

نورانی صاحبزادہ فیض الرسول رضا، افکار نورانی، مکتبہ اہل سنت لاہور، ۲۰۰۴ء۔

.........، یادوں کے نقوش، مکتبہ اہل سنت لاہور ۲۰۰۴ء

نورانی، غلام سرور شاہ احمد نورانی، جہلم، س۔ن۔

نورانی، مولانا بشیر القادری امام شاہ احمد نورانی صدیقی: ایک تعارف اور ایک جائزہ، ادارہ تحقیقات امام شاہ احمد نورانی، کراچی ۲۰۰۴ء

نورانی، مولانا محمد امین عہد رواں کی ایک عبقری شخصیت: علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی، بزم انوار القرآن، کراچی، ۲۰۰۴ء۔

ہاشمی، اشفاق، مفتی محمود کا دور حکومت، ہاشمی پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۴ء

ہاشمی، انوار حسین، الیکشن ۹۳ء اکیڈمی آف رائٹرز، اسلام آباد ۱۹۹۴ء

ہزاروی، مولانا محمد صدیق تحریک نظام مصطفیٰ، مقام مصطفیٰ کے دو نامور مجاہد، مکتبہ قادریہ، لاہور، س۔ن۔

یوسف، اقبال، کراچی پیپرز، سائبان، کراچی، ۱۹۹۵ء

انسائیکلو پیڈیاز

ایاز، مقصود، شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا، لاہور، ۱۹۸۷ء

سلیم، شیخ اسد، انسائیکلو پیڈیا تحریک پاکستان، لاہور، ۱۹۹۹ء

قاسم محمود، سید، شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا، لاہور، ۲۰۰۱ء

.........، انسائیکلو پیڈیا پاکستانی کا، لاہور، س ن۔

اردو انسائیکلو پیڈیا فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۴ء

اُردو اخبارات (قومی روزنامہ جات)

روزنامہ جنگ لاہور، کراچی

روزنامہ نوائے وقت لاہور، کراچی، راولپنڈی، ملتان

روزنامہ وفاق لاہور

روزنامہ خبریں لاہور

روزنامہ پاکستان لاہور

روزنامہ انصاف لاہور

روزنامہ اوصاف اسلام آباد

روزنامہ دن لاہور، کراچی

روزنامہ ایکسپریس لاہور، کراچی

روزنامہ امروز لاہور

روزنامہ اسلام کراچی

کراچی کے مقامی اُردو اخبارات (روزنامہ جات)

روزنامہ عوام

روزنامہ امت،

روزنامہ خاور

روزنامۂ جرأت

روزنامہ جسارت

روزنامہ جانباز

روزنامہ کائنات

روزنامہ ریاست

متفرق اخبارات (روزنامہ جات)

روزنامہ نیا بنگالہ کراچی (بنگالی)

ورچانہ وحدت (پشتو)

روزنامہ مشرق پشاور (اُردو)

روزنامہ سعادت فیصل آباد (اُردو)

رسائل و جرائد

ہفت روزہ چٹان، لاہور

ہفت روزہ افق، کراچی

ہفت روزہ زندگی، لاہور

ہفت روزہ طور کراچی

ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی

ہفت روزہ تعمیر وطن لاہور

ہفت روزہ فیملی لاہور

ہفت روزہ تکبیر کراچی

ہفت روزہ ایشیاء لاہور

ہفت روزہ احوال کراچی

ماہنامہ ترجمان اہل سنت کراچی

ماہنامہ ضیائے حرم بھیرہ شریف

ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور

ماہنامہ احوال و آثار لاہور

ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ

ماہنامہ کاروانِ حرم کراچی

سہ ماہی کاروانِ مصطفیٰ آزاد کشمیر

ماہنامہ کنز الایمان لاہور

ماہنامہ النعیم کراچی

سہ ماہی انوارِ رضا جوہر آباد

ماہنامہ الحامد ملتان

English News Papers.

The Daily Dawn Lahore, Karachi

The Daily News Lahore, Karachi, Islamabad.

The Daily Frontier Post, Islamabad.

The Daily The Nation Lahore, Karachi

The Daily Khalij Times, Karachi

The Daily Statesman, Peshawar.

انٹرویوز

ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی، ممبر، چیئر مین پرسن خواتین اسلامی مشن پاکستان۔

پروفیسر محمد احمد صدیقی، مرکزی سیکریٹری اطلاعات، جمعیت علمائے پاکستان، مدیر ہفت روزہ احوال۔

پروفیسر شاہ فرید الحق، سابق سینئر نائب صدر جمعیت علمائے پاکستان۔

مولانا مفتی جمیل احمد نعیمی، سابق صدر جمعیت علمائے پاکستان، صوبہ سندھ و بانی انجمن طلباء اسلام۔

قاری زوار بہادر قادری، صدر جمعیت علمائے پاکستان پنجاب، لاہور۔

لیفٹیننٹ جنرل (ر) خواجہ محمد اظہر، جمعیت علمائے پاکستان پنجاب، لاہور۔

علامہ سید شبیر احمد شاہ ہاشمی، مہتمم جامعہ مینار رضا، پتوکی

مولانا مفتی منیب الرحمٰن، چیئر مین مرکزی رویت ہلال کمیٹی۔

صاحبزادہ انس نورانی چیئر مین ورلڈ اسلامک مشن۔

ملک بشیر احمد نظامی۔ صدر جمعیت علمائے پاکستان، لاہور۔

غیر مطبوعہ مقالہ جات

بیگ ظفر اللہ، برصغیر پاک و ہند میں تحریک ختم نبوت ۱۸۸۷ء ۱۹۸۷ء

مقالہ برائے پی ایچ ڈی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، ۱۹۹۷ء۔

وسیر، محمد اقبال، پاکستان میں جاگیرداری نظام: ایک تاریخی جائزہ ۱۹۴۷ء۔۱۹۸۸ء

مقالہ برائے پی ایچ ڈی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور، ۲۰۰۰ء۔

ENGLISH BOOKS

Abbott, F., Islam, Critical Essays in Social Anthropology and Pakistan, Ithaca, Cornell University Press, New York, 1968.

Afzal, M. Rafique, Political Parties in Pakistan, 1947-1958, National Commission on Historical and Cultural Research, Islamabad, 1976.

Ahmad, A., Islamic Modernism in India and Pakistan, 1857-1964, Oxford University Press, New York, 1964.

Ahmad, A.S., Pakistan Society: Islam, Ethnicity, and Leadership, Oxford, New York, 1986.

Ahmad, Emajuddin, Bureaucratic Elite in Segmented Economic Growth; Pakistan and Bangladesh, University Press, Dacca, 1980.

____, Military Rule and the Myth of Democracy, Dacca, 1988.

Ahmad, I., Pakistan General Elections 1970, South Asian Institute Punjab University, Lahore, 1976.

Ahmad, Khurshid, Pakistan, Bangladesh and Politics of South Asia, Noorsi Publications, Karachi, 1973.

Ahmad, Manzuruddin (ed.), Contemporary Pakistan, Royal Publishers, Karachi, 1982.

_____i Pakistan, The Emerging Islamic State, Allied Book Corporation, Karachi, 1966.

Ahmad, Mumtaz, Bureaucracy and Political Development in Pakistan, National Institute of Public Administration, Karachi, 1974.

Ahmad, Muneer, Politics in Pakistan 1947-1958, Department of political science, University of Punjab, Lahore, 1960.

____, The Civil Servant in Pakistan, Oxford University Press, Karachi, 1964.

Ahmad, Mushtaq, Government and Politics in Pakistan^ Space Publishers, Karachi, 1972.

______, Pakistan at the Cross Roads, Royal Book Company,Karachi, 1985.

____, Politics in Crisis, Royal Book Company, Karachi, 1987.

Ahmed, Mujeeb, Jammiyat Ulema-I-Pakistan: 1948-1979,NIHCR, Islamabad, 1993.

Ahson, Syed Qadeer al, Politics and Personalities in Pakistan, Mohiuddin and Sons, Dacca, 1969.

Akhtar, Jamna Das, The Saga of Bangladesh, Oriental Publishers, Delhi, 1971.

Akhtar Rafique, Pakistan Year Book: 1987-88.

East and West Publishing Company, Karachi, 1988.

Ali, Tariq, Pakistan Military Rule or People's Power, William Morrow, New York, 1970.

Aman, Akhtar, Pakistan and the Challenge of History, Universal Books, Lahore, 1974.

Andrews, William G. and Ra'anan, Uri, The Politics of the Coup de'Etat: Five Case Studies, Van Noster and Reinhold Company, New York, 1969.

Anwar, Muhammad Rafi, Presidential Government in Pakistan, The Caravan Book House, Lahore, 1964.

Azam, Ikram, Pakistan's Security and National Integration, sang-e-Meel, Lahore, 1986.

Aziz, K. K., Party Politics in Pakistan, 1947-1958, National Commission on Historical and Cultural Research, Islamabad, 1976.

Bhardwaj, K.K., Pakistan March to Democracy and Liberalism, Anmol, New Delhi, 1996.

Bhatia, B. M., Pakistan's Economic Development: 1948-1978, The Failure of a Strategy, Vikas Publishing House, New Delhi, 1979.

Bhutto, Benazir, Da ughter of Destiny, Simon and Schuster, New York, 1989.

____, Daughter of the East: An Autobiography, Hamish Hamilton, London, 1988.

____, Pakistan: The Gathering Storm, Vikas, New Delhi, 1983.

Bhutto, Z.A., Foreign Policy of Pakistan, Pakistan Institute of International Affairs, Karachi, 1964.

____, If Iam Assassinated, Vikas Publishing House, New Delhi, 1979.

____, My Pakistan, New Delhi, 1979.

____, New Directions, London: Namora Publications, 1980.

______, Political Situation in Pakistan, Lahore, New Karvan Printers, 1968.

______, President of Pakistan: Speeches, and Statements, 1971-72, 4

vol., Department of Films and Publications, Karachi, 1972,1973.

____, Prime Minister of Pakistan: Speeches and Statements, Department of Films and Publications, Karachi, 1973,1974.

______, The Great Tragedy, Vision Publications, Karachi, 1971.

____, The Myth of Independence, Oxford University Press, London, 1969.

Binder, Leonard and others, Crises and Sequences in Political Development, Princeton University Press, Princeton, 1971.

____, Religion and Politics in Pakistan, University of California Press, Berkley, 1961.

Bokhari, I.H. and Thornton, T.P., The 1972 Simla Agreement: An Asymmetrical Negotiation, Foreign Policy Institute, Johns Hopkins University, Washington, 1988.

Braibanti, Ralph, Research on the Bureaucracy of Pakistan, Durham, Duke University Press, 1966.

I JMr*, Am Historical, Oxford

o Ae Making, OUP, 1986. ,1971-1977, London: The Macmillan:A Political Study, George Alien and Unwin

5 Foreign Policy: An Interpretation, rYOT*,NY: Institute of Pacific Relations, 1959.

_, Political Forces in Pakistan 1947-1959, N.Y., 1959.

____, Pakistan: Major Governments of Asia, N.Y., 1961,

_____, M. A., The Emergence of Pakistan, Columbia University Press, New York, 1967.

____, Pakistan and the Great Powers, Karachi, 1970.

Choudhry, G.W., Democracy in Pakistan, University of British Columbia, British Columbia, 1963

____, The Last Days of United Pakistan, Indiana University Press, Bloomington, 1975.

____, Pakistan: Transition from Military to

Civilian Rule, Scorpion, London, 1988.

____, Constitutional Development in Pakistan, second edition, Longman-Group, London, 1969.

Husain, Ahmad, Politics and people's Representation in Pakistan, Firoze Sons, Lahore, 1972.

Hussain, Arif, Pakistan; Its Ideology and Foreign Policy, 1966.

Hirshman, Albert, Journeys toward Progress, twentieth Century Fund, New York, 1963.

Hussain, Asaf, Elite Politics in an Ideological State: the Case of Pakistan, Dawson, Folkestone Kent, 1979.

Jahan, R., Pakistan: Failure in National Integration, New York, Columbia University Press, N.Y., 1972.

Khan, Asghar, Generals in Politics: Pakistan 1958-1982, Vikas, 1983.

Jalal, Ayesha, Democracy and Authoritarianism in South Asia, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 1995.

____, The State of Martial Rule: The origins of Pakistan's Economy of Defence, Cambridge University Press, Cambridge, 1990.

Janoivit/;, Morris, The Military in the Political Development of New Nations, Chicago University Press, Chicago, 1964.

Kamruddin Ahmad, The Social History of East

Pakistan, The Orient Book Centre, Dacca, 1967.

Karim, Arshad Syed, Pakistan: From Community to Nation, Karachi, Sa'ad Publications, 1984,

_, Pakistan: Search For Political Participation, Maktaba-e-Karachi, 1978.

Kkaa, Ataur Rahman, Ten Years of Destination, Dhaka, 1970.

Khan. Fazal Muqeem, Pakistan's Crisis in Leadership, Islamabad: Book Foundation, 1973.

____, The Story of the Pakistan Army, Oxford University Press, Karachi, 1963.

Khan, Lt Gen. Gul Hassan, Memories of the General GulHassan Khan, Oxford University Press, Lahore, 1993,

____, Shaheed-i-Islam: Muhammad Zia-ul-Haq, Indus Thomas Publishers, London, 1990

Khan, Sa'adullah, East Pakistan to Bangladesh, Law Times Publications, Lahore, 1975.

Korebi, Joseph, Danger in Kashmir, Princeton University Press, 1966.

Kumar, Satish, The New Pakistan, Vikas Publishing House, New Delhi, 1978.

Lamb, A., Birth of a Tragedy: Kashmir 1947, Oxford Books,-Herting Fordbury, 1994.

____, Kashmir: A Disputed Legacy, 1948-1990,

Oxford University Press, Karachi, 1992.

Lodhi, Maleeha, Pakistan's Encounter with Democracy, Vanguard, Lahore, 1994.

Loshak, David, Pakistan Crisis, Heinemann, London, 1971.

Ma h mood, Safdar,y4 Political Study of Pakistan, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1972.

Malik, Zahid, (ed.), Pakistan After 1971, Pakistan National Centre, Rawalpindi, 1974.

Munir, Muhammad, From Jinnah to Zia, Lahore, 1979.

Mukherji, Dileep, ZulfikarAli Bbutto: Quest for Power, Delhi: Vikas Publishing, 1972.

Muniruzzaman, Talukdar, Group Interests and Political Changes, New Delhi: South Asian Publishers, 1982.

Nordinger, Eric A., Soldiers in Politics: Military Coups and Governments, Englewood, 1977.

Qadri, Shamim Hussain, Judges and Politics, Jang, Lahore, 1990.

Qureshi, I.H., Pakistan: An Islamic Democracy, Lahore: Institute of Islamic Culture, 1956.

_____, The Struggle for Pakistan, University of Karachi Press, Karachi, 1965. , _____, Ulema in Politics, White Lion Publishers, London, 1976.

Qureshi, Muhammad Siddique, Political Culture in Pakistan, Dost Publications, Islamabad, 2002.

Rahim, J. A., Outline of a Federal Constitution for Pakistan, Lahore: Pakistan People's Party, 1969.

Rais, R.B., War without Winners, Oxford University Press, Karachi, 1994.

Rashid, Akhtar, Elections 19 77 and Aftermath: An appraisal, Islamabad.

Razvi, Mujtaba, The Frontiers of Pakistan, National Publishing House Ltd., Karachi, 1971.

Rizvi, Hasan Askari, The Military and Politics in Pakistan, Progressive Publishers, Lahore, 1974.

____, Pakistan under Challenge, London: Stacey Internationa], 1975.

Rushbrook Williams, L.F., East Pakistan Tragedy, Drake Publishers, New York, n.d.

____, Men Who Overturned Empires, Fighters, Dreamers and Schemers, Macmillan, 1987.

____, The State of Pakistan, London, 1962.

Salik, S., Witness to Surrender, Oxford University Press, Karachi, 1977.

Samad, Y.,,4 Nation in Turmoil, Sage, New Delhi, 1995.

Sayeed, K.B., Pakistan: The Formative Phase, Pakistan Publishing House, Karachi, 1960.

____, Politics in Pakistan: The Nature and Change of Direction, Praeger, New York, 1980.

____, The Political System of Pakistan, Oxford University Press, London 1967.

Schofield, Victoria. Bhutto: Trial and Execution, Cassell, London, 1979.

Shafiq, M., Islamic Concept of a Modern State: A Case Study of Pakistan, Islamic Book Foundation Distributors, Al-Ma'arif, Lahore, 1987.

Shahi, A., Pakistan's Security and Foreign Policy, Progressive Publishers, Lahore, 1988.

Siddiqui, K. B., Conflict, Crises and War in Pakistan, Praeger Publishers, New York, 1972.

Sisson, R. and Rose, L.E., War and Secession: Pakistan, India and the Creation of Bangladesh, Berkeley: University of California Press, 1990.

Smith, Donald Eugene (ed.), South Asian Politics and Religion, Princeton University Press, Princeton. 1966.

Smith, Bandell (ed.), Religion and Legitimation of Power in South Asia, E. J.Brill, Leiden, 1978.

Spencer Robert E., (ed.), Religion and Contemporary Change in Asia. University of Minneapolis Press, Minneapolis, 1971.

Stephen, Alfred, The State and Society: Studies in Comparative Perspective, Princeton: Princeton University

Press, 1978.

Stephan Alfred, Rethinking Military Politics: Brazil and Southern Core, Princeton: Princeton University Press, 1988.

Suleri, Z. A. Pakistan's Lost Years, Progressive Papers Ltd., Lahore: 1962.

Syed, Anwar EL, Pakistan: Islam, Politics and National Solidarity. New York: Praeger, n.d.

____, The Discourse and Politics of Zulfikar All Bhutto, London: Macmillan, 1992.

Taher Kheli, Shah, The United States and Pakistan: The Evolution of an Influence Relationship New York: Praeger, 1982.

Tinker, Hugh, Experiments to the Freedom in India and Pakistan, London, 1967.

____, India and Pakistan: Apolitical Analysis, Second edition, London, 1967.

Vatikolis, P., Islam in the State, London, 1987. Venkatarami, M.S., The American Role in Pakistan 1947-1958, New Delhi, 1982.

Walporte, Rupert, Power and Privilege: Influence and Decision Making in Pakistan, University of California Press, Berkeley, 1975.

Wheeler, Richard S., The Politics of Pakistan: A Constitutional Quest, Cornell University Press, 1970.

White, Lawrence, J., Industrial Concentration and Economic Power in Pakistan, Princeton University Press, Princeton, 1976.

Wilcox, W.A., Pakistan: The Consolidation of a Nation, New York, Columbia University Press, N.Y., 1963.

____, The Emergence of Bangladesh, American Enterprise Institute for Public Policy Research, Washington, 1973.

Wolpert, S., Zulfl Bhutto of Pakistan: His Life and Times, Oxford University Press, New York, 1993.

Wriggens, W. Howard, (ed.), Pakistan in Transition, University of Islamabad Press, Islamabad, 1988.

Yusaf, Hamid, Pakistan in Search of Democracy, 1947-1977, Afro-Asia Publications, Lahore, 1980.

Yusuf, K.F. Towards a Tri^Polar World, Tariq Publishing House, Lahore, 1975.

Zafar, S. M., Through the Crisis, Book Center, Lahore, 1970. Zafarullah Khan, Muhammad, The Agony of Pakistan Kent, Publications, London, 1974.

Zaheer, H., The Separation of East Pakistan, Oxford University Press, Karachi, 1994.

Zakaria, N., Parliamentary Government in Pakistan, Lahore: New Publishers, 1958.

Zaman, Dr. Hasan, East Pakistan Crisis and India.

Pakistan Academy, Dacca, 1971.

Zaman, Waheed-uz (ed.), The Quest for identity, University of Islamabad Press, Islamabad, 1976.

Zia-ul-Haq, General Muhammad, Introduction to Islamic Law, Printing Corporation of Pakistan Press, Islamabad, 1979.

Ziring, Lawrence, Pakistan: The Enigma of Political Development, Folkestone Kent, Dawson, 1980.

The Ayub Khan Era, Syracuse University Press, Syracuse, 1971.

Ziring, Lawrence, Ralph Braibanti and W. Howard Wriggens (eds.)- Pakistan: The Long View, Duke University Press, Durham, 1977.

GOVERNMENT PUBLICATIONS AND DOCUMENTS

A Collection of the Central Acts and Ordinances, 7947-/972,Manager of Publications, Karachi 1972.

A New Beginning: Reforms Introduced by the People's Government of Pakistan, Printing Corporation of Pakistan, Islamabad, 1972.

Election Commission of Pakistan, Report on General Elections, 1970-71, Vol 2. Karachi, 1975.

Government of Pakistan, White Paper on

Balochistan, Printing Corporation of Pakistan, Islamabad, 1974.

Government of Pakistan, White Paper on the Conduct of the General Elections in March 1977, Rawalpindi, 1978.

Government of Pakistan, White Paper on the Misuse of the Media, Government of Pakistan Press, Islamabad August 1978.

Government of Pakistan, The Tripartite PPP-NAP-JUI Accord, Karachi, 1972.

National Assembly of Pakistan Debates, Islamabad, 1972,1974 and 1976.

Provincial Assembly of Sind Debates, Karachi, 1972.

Report on Inquiry to Inquire into the Punjab Disturbances of 7P53,Lahore 1954.

The Parliament of Pakistan (Joint Sitting) Debates, 1974, Islamabad.

The Senate of Pakistan Debates, Islamabad, 1973 and 1976.







تحریک احیائے امت کے سیمینار میں قائد اہلسنت کے ہمراہ ادیب شہیر صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی بیٹھے ہیں جبکہ پروفیسر غفور احمد، ساجد علی نقوی اور سلمان طاہر بھی موجود ہیں


تاریخی سنی کنونشن ملتان کے موقع پر مدیر تسخیر سید احسان احمد گیلانی امام نورانی کو اپنا جریدہ پیش کر رہے ہیں


چوہدری شجاعت حسین، اعجاز الحق اور کامل علی آغا، قائد اہلسنت مولانا شاہ احمد نورانی کی خدمت میں



انہی بنیادوں پر وحدت اُمت کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر دکھائیں۔
یہی اس عہد کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔
عالم کفر، عالم اسلام کے اتحاد سے گھبرا رہا ہے اور اس کی بوکھلاہٹ بتا رہی ہے
کہ وہ اتحاد اُمت کے راستے کی رکاوٹ بننے سے باز نہیں آئے گا

مسلمانو! جاگو، اپنے اجتماعی دشمن کو پہچانو
نفاذ نظامِ مصطفیٰ ﷺ تحفظ مقامِ مصطفیٰ ﷺ اور فروغ محبت مصطفیٰ ﷺ
کیلئے اپنے حصے کا کردار ادا کرتے رہو
اللہ تعالیٰ آپ کی توفیقات میں برکات شاملِ حال فرمائے۔ **آمین**

......دعا گو و دعا جو......

محمد طاہر فاروق نورانی





1. حضرت قائد اہلسنت مولانا شاہ احمد نورانی کے سلسلہ طریقت میں داخل ہونے کے آرزومند حیدر آباد سندھ میں ان کے دست مبارک پر بیعت کر رہے ہیں
2. چار نسلوں سے حضرت قائد اہلسنت مولانا شاہ احمد نورانی کے خاندانی مرید ملک غلام یاسین نورانی اوران کا خاندان قائد اہل سنت اور صاحبزادہ محمد انس نورانی کے ہمراہ



1973ء کے آئین کی منظوری کے بعد حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے اراکین مولانا شاہ احمد نورانی اور ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ



مولانا شاہ احمد نورانی 1973ء کے آئین کے مسودہ پر دستخط ثبت کر رہے ہیں









حیدرآباد میں غلاف کعبہ کی زیارت کے موقع پر مولانا عبدالحامد بدایونی تقریر کر رہے ہیں۔
اسٹیج پر کمشنر حیدرآباد جناب ابونصر، ڈپٹی کمشنر جناب وسیم غلاف کعبہ کمیٹی کے اراکین اور حیدرآباد کے معززین بیٹھے ہوئے ہیں۔





قائد اہلسنت ٹاؤن ہال راچڈیل (برطانیہ) میں پہلی بار پاکستانی پرچم لہرا رہے ہیں قاری محمد زوار بہادر، مفتی منیر الرحمان، مولانا محمد اعظم، قاری محمد خان اور دیگر زعما بھی ہمراہ ہیں



دربار بری امام سرکار۔۔۔۔قائد اہلسنت مولانا شاہ احمد نورانی، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی پیر سید برکات احمد شاہ اور دیگر زعماء ملک و ملت کے استحکام کیلئے دعا کر رہے ہیں

Quarterly
Anwar-e-Reza
Jauhar Abad
Vol. 3 - No. 4 - 2009

حافظِ ایمان
از
فتنۂ قادیان

از قلم
مصنف کتبِ کثیرہ، شمشیرِ بے نیام، فاتحِ قادیان،
حضرت علامہ محمد پیر بخش رحمہ اللہ تعالیٰ

ترجمہ
جامع معقول و منقول آبروئے اہلِ سنّت
حضرت علامہ صاحبزادہ ابوالحسن واحد رضوی حفظہ اللہ تعالیٰ
(مدیر ریاض العلم اٹک)

ایک ایسی کتاب جو اعلیٰ حضرت مجدِ دِ دین وملت
الشاہ مولانا امام احمد رضا محدّثِ بریلوی قدس سرہ العزیز
سمیت عرب وعجم کے درجنوں مقتدر محدثین وفقہا
کے تائیدی دستخطوں سے منصّۂ شہود پر آئی اور اب اردو ترجمہ
کے ساتھ تقریباً ایک صدی کے بعد دوبارہ منظر عام پر آرہی ہے۔